

دس آنے

پاکستان میں نظام شریعت رائج ہونا چاہئیے -

لیکن یہ نظام شریعت ہوگا کیا ؟

(۱) اقتدار اعلیٰ خدا کا - اطاعت صرف اسی کی -

(۲) خدا کی اطاعت کے معنی ہیں اسکی وحی کی اطاعت -

(۳) ایک وحی قران میں ہے - لیکن وہ مجمل ہے -

(۴) اس اجمال کی تفصیل دوسری وحی میں ہے جس کا نام احادیث ہے -

(۵) لہذا خدا کی اطاعت سے مراد احادیث کا اتباع ہے -

لیکن.... احادیث غلط بھی ہیں اور صحیح بھی -

یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی ؟

یہ صرف.... مزاج شناس رسول بتا سکتا ہے ؟

یہ مزاج شناس کون ہیں ؟

اسکی تفصیل ادارہ طلوع اسلام کی تازہ ترین پیشکش

مزاج شناس رسول

میں دیکھئیے - ضخامت ۴۴۸ صفحات - مجلد معہ گرد پوش -

قیمت -/۴ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام - پوسٹ بکس نمبر ۲۳۱۳ - کراچی

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

...ٹ بکس نمبر ۳۱۳ — کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدل اشتراک
... آنے (پاکستانی)	سعید احمد	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
... آنے (ہندوستانی)		" (غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

...لد ۸ — جنوری سنہ ۱۹۵۵ء — نمبر ا

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنانے کی اسکیم جس رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے وہ اطمینان بخش اور حوصلہ افزا ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ جب کوئی صاحب ہمت کسی بات کا عزم کر لیتا ہے تو پھر رکاوٹیں خود بخود راستہ سے ہٹتی چلی جاتی ہیں ورنہ یہی مسئلہ اگر (مرحوم) مجلس آئین ساز کے سپرد کر دیا جاتا تو آپ دیکھتے کہ سات برس میں اس کی تمہید بھی طے نہ ہو پاتی۔

ہمیں اس صورتِ حالات سے جس قدر اطمینان ہے اس کے ساتھ ہی بعض باتیں ایسی بھی ظہور میں آ رہی ہیں جن سے ہمیں مستقبل میں بھی خطرات نظر آتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ایک وحدت کی اسکیم اس لئے قابلِ اطمینان اور موجبِ مسرت ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس طرح سرحدی، پنجابی، سندھی اور بلوچی کی موجودہ تفریق ختم ہو کر پوری کی پوری ملت امتِ واحدہ بن جائیگی لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس میں بعض شقیں ایسی رکھی جا رہی ہیں جو اس اہم مقصد کی راہ میں روڑے اٹکا اور کانٹے بکھیر دیں گی۔ مثلاً پہلی شق یہ ہے کہ اس نو تخلیق صوبہ کی پارلیمان میں استے فی صدی نیابت پنجاب کی ہوگی اور اتنی دوسرے صوبوں کی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ہم نے پنجاب اور سندھ، سرحد اور بلوچستان کی غیر فطری لکیروں ہی کو مٹا دیا تو پھر اس نیابت کیلئے ان لکیروں کو علیٰ حالہ قائم رکھنا چہ معنی دارد؟ اسی طرح ملازمتوں کے متعلق فیصلہ ہوا ہے کہ ان میں بھی پنجاب، سرحد، سندھ وغیرہ کا فی صدی تناسب علیٰ حالہ قائم رہے گا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ جب ۱۹۴۸ء میں حکومتِ پاکستان نے ملازمتوں میں صوبائی تناسب کے اصول کا اعلان کیا ہے تو ہم نے لکھا تھا اور اس کے بعد ہم اس تلخ حقیقت کو بار بار دہراتے رہے تھے کہ تفریقِ ملت کا یہ وہ زہریلا بیج ہے جس سے انتشار کا شجرۃ الزقوم اُگے گا اور ایک دن یہ قوم اس طرح ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹ جائیگی کہ پھر ان ٹوٹے ہوئے رشتوں کا جوڑنا محال ہو جائے گا۔ ہم نے اس سات سال میں دیکھ لیا ہے کہ اس شجر ملعونہ کو کس قسم کے پھل لگے اور قوم کیا سے کیا ہو گئی۔ لیکن ہم اس سے بھی تجربہ حاصل نہیں کر رہے اور مغربی پاکستان میں صوبوں کے وجود کو عملاً مٹا دینے کے بعد بھی ان کے اس زہریلے اثر کو بدستور باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ جب آپ کہیں گے کہ فلاں اسامی ایک پنجابی کے لئے مخصوص ہے تو اگرچہ مغربی پاکستان کے نقشہ پر پنجاب کا الگ خطہ دکھائی نہ دیگا لیکن وہ ذہنیت جو اس طرح ایک پنجابی کو سرحدی اور سندھی سے الگ کرتی ہے بدستور موجود رہے گی۔ یہیں تک نہیں بلکہ اس مخصوص اسامی کے امیدوار کو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ پنجابی ہے سندھی یا سرحدی نہیں ہے۔ آپ سوچئے کہ ان امتیازات کو اس طرح قائم رکھنے کے بعد یہ سمجھنا کہ ہم موجودہ صوبائی تفریق کو مٹا کر پوری قوم کو ایک ملت کے قالب میں ڈھال لیں گے کس قدر خود فریبی ہے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ کانٹوں میں الجھے ہوئے دامن کو جھٹکا دیکر نہیں چھڑانا چاہئے۔ اس سے خود دامن کے پھٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے ہم ہیں ایسے عناصر

ں انھیں مغربی پاکستان کی یہ وحدت بڑی ناگوار گذری ہے۔ ان عناصر کی تخریبی کارروائیوں کو غیر موثر کرنے کیلئے مصلحت کا یہی تقاضا تھا کہ انھیں
ئی مفاد کے تحفظ کا یقین دلا دیا جائے۔ وہ صوبجاتی نیابت جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اسی مصلحت کا نتیجہ ہے لیکن بایں ہمہ ہمارے نزدیک اس کیلئے دس
ل کا عرصہ بہت لمبا ہے اتنے طویل عرصہ تک صوبجاتی ذہنیت کو برقرار رکھنا وحدتِ ملت کے یکسر منافی ہو جائے گا اور تخریبی عناصر کو یہ موقع ملجائیگا کہ
ہ پکڑتے پکڑتے پہونچے تک جا پہنچیں۔ یعنی وہ ملازمتی تناسب کی آڑ میں اس افتراقی ذہنیت کو اس قدر ہوا دیتے رہیں کہ ایک دن (خدانہ کردہ)
دلوں کی پھر سے علیحدگی کے مطالبہ کا شعلہ بھڑک اٹھے۔ ہمارے نزدیک کہیں بہتر ہوتا کہ ملک کی تعلیمی حالت کا جائزہ لینے کے بعد ان علاقوں کو
مراعات دیدی جاتیں جو اسوقت تعلیم میں پسماندہ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان خطوں کی تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے پر خاص توجہ دی جاتی ہم گورنر جنرل
ن کردہ کونسل سے درخواست کرینگے کہ وہ اس مسئلہ پر نظرثانی کرے۔

ہماری تجویز یہ بھی ہے کہ کمشنریاں بناتے وقت کوشش یہ کی جائے کہ زیادہ سے زیادہ کمشنریاں مخلوط علاقوں پر مشتمل ہوں۔ مثلاً پنجاب اور صوبہ سرحد
ریاں اس طرح بنائی جائیں کہ ایک کمشنری میں کچھ حصہ موجودہ پنجاب کا اور کچھ حصہ موجودہ سرحد کا آجائے اس طرح چند علاقوں کے سوا (جن میں مخلوط قسم
نریاں بنانا ممکن نہ ہوگا) باقی علاقے مخلوط ہو جائیں گے۔ اور یہ چیز موجودہ تفرق سے وحدت کی طرف ایک اور قدم ہوگا۔

مغربی پاکستان کی وحدت کے بعد سب سے اہم مسئلہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے باہمی تعلقات کا ہے جیسا کہ ہم کئی بار لکھ چکے ہیں ہمارے نزدیک
ت موجودہ) اس مسئلہ کا حل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ دونوں علاقوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختار قرار دیکر مشترکہ مسائل مثل دفاع۔ سکہ، امور خارجہ
و کا نفیڈریسی کی شکل میں مرکز میں رکھ لیا جائے۔ ہمارے نزدیک یہ انتظام بھی زیادہ آسان اور عملاً سہولت بخش رہیگا کہ مشرقی اور مغربی دونوں بازو مرکز کے
ات کیلئے سالانہ رقوم دیدیا کریں اور مرکز کو وصولی (REVENUE) کے جھمیلوں سے فارغ کر دیا جائے۔ ہمارے نزدیک پاکستان کیلئے کسی مرکزی
ان کی بھی ضرورت نہیں۔ بہتر شکل یہ ہوگی کہ گورنر جنرل مشرقی اور مغربی پارلیمان سے اپنی صوابدید کے مطابق کچھ ایسے لوگوں کا انتخاب کرلیں جو ان کی
مشاورت کی حیثیت سے انکے ساتھ رہیں۔ ملک کے مشترکہ مفاد کے امور گورنر جنرل ان مشیروں کے مشورہ سے طے کر دیا کریں اور اس کی کابینہ ان
شدہ امور کے نفاذ کی ذمہ دار ہو۔

اتنا کچھ ہو چکنے کے بعد بھی وہ فتنہ اپنی جگہ پر بدستور موجود ہے جو پاکستان کی تباہیوں کا بنیادی موجب ہے۔ یہ فتنہ ہے ملک میں مختلف پارٹیوں کا وجود۔
سلام اسلام رٹنے کے باوجود مغرب کی جن لعنتوں کو سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں ان میں ایک بڑی لعنت پارٹی سسٹم ہے۔ اس لعنت کو
، درجہ ناگزیر سمجھتے ہیں اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ہمارے اسلام اسلام پکارنے والے ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ

جمہوری انداز کی حکومت صرف مختلف پارٹیوں کی بنیاد پر قائم ہو سکتی ہے۔ سیاسی پارٹیاں جمہوریت کی مشینری کے پرزے ہیں اور اگر یہ پارٹیاں کسی ایک پارٹی کے استبداد یا رائے عامہ کے فقدان کی وجہ سے نشوونما نہیں پاتیں تو سمجھ لیجئے کہ جمہوریت کے دعاوی سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔

ا ان حضرات کے نزدیک

کہ رسول اللہ صلعم کے عہدِ ہمایوں سے لیکر اس وقت تک اسلام کن مراحل میں سے گذرا ہے اور کیا سے کیا بنتا ہوا ہم تک پہنچا ہے۔

(۵) **عصرِ حاضر**: اس کے چار حصے ہوں گے۔ اقوامِ مغرب، جملہ ممالکِ اسلامیہ، ہندوستان کے مسلمان، اور پاکستان۔ ان تمام ممالک کے اہم وقائع اور ماجریات پر تبصرہ اور وہاں کی فکری، تمدنی اور سیاسی تحریکات کا تنقیدی تعارف ہوگا۔

(۶) **طالب علموں کے لئے**: سلیم کے نام خطوط کا جو سلسلہ اس وقت تک چلا آرہا ہے اور جو قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں بے حد مقبول ہوا ہے وہ علیٰ حالہٖ جاری رہے گا۔ اس کے علاوہ ملک کے تعلیمی مسائل کی طرف خاص توجہ دی جائے گی اور طالب علموں کی مشکلات کا حل سوچا جائے گا۔

(۷) **عورتوں کے لئے**: طاہرہ کے نام خطوط کا جو سلسلہ چلا آرہا ہے اور جس نے قوم کی بچیوں کی ذہنیت کو خالص قرآنی خطوط پر ڈھالنا شروع کر دیا ہے، علیٰ حالہٖ جاری رہے گا۔ اس کے علاوہ اس عنوان کے تحت یہ بتایا جائے گا کہ جب ایک عورت قرآن کو پڑھتی ہے تو وہ اس کے اندر اپنے متعلق کیا کچھ لکھا ہوا پاتی ہے۔ یہ سلسلہ عورتوں کے لئے بڑا مفید اور دلچسپ ہوگا۔

(۸) **عوام کے لئے**: عوام زیادہ تر یہ چاہتے ہیں کہ انھیں معلوم ہو کہ روزمرہ کی زندگی کے متعلق قرآن کے احکام کیا ہیں۔ ان کی طرف سے جو استفسارات موصول ہوتے ہیں۔ ان کے جوابات اس وقت باب المراسلات کے ماتحت شائع ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ کو اور وسیع کیا جائے گا اور زندگی کے تمام معاملات کے متعلق قرآن کے احکام بالالتزام پیش کئے جائیں گے۔ اس حصہ کی زبان ایسی عام فہم رکھی جائے گی کہ اس سے بچے بھی فائدہ حاصل کر سکیں۔

(۹) ان کے علاوہ لمعات اور حقائق وغیرہ وغیرہ بھی اسی انداز کے رہیں گے۔ نیز اہم عنوانات پر تحقیقاتی مضامین کیلئے بھی گنجائش رکھی جائے گی۔

یہ ہیں وہ موٹے موٹے عنوانات جو سردست ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ اس کے بعد جوں جوں مزید تقاضے ہمارے سامنے آتے جائیں گے ان میں اضافہ بھی ہوتا جائے گا اور ردوبدل بھی۔

پہلے پرچہ میں

عنواناتِ بالا کے علاوہ ہفتہ وار طلوعِ اسلام کے پہلے پرچہ میں ہم ان حضرات کو خاص طور پر مخاطب کریں گے جن کے ذمہ اب پاکستان کی آئین سازی کا کام لگایا جانیوالا ہے۔ انھیں بتایا جائے گا کہ سابقہ مجلسِ آئین ساز نے کیا کیا غلطیاں کیں اور انھیں کن کن گڑھوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔

السابقون الاولون

ہم نے پچھلے پرچہ میں لکھا تھا کہ جن حضرات نے محض اپنے خلوص کی بنا پر ہفتہ وار طلوع اسلام کے سلسلہ میں اپنی امداد پیش کی ہے۔ طلوع اسلام عمر بھر کے لئے ان سے رابطہ قائم رکھے گا اور پرچہ ان کی خدمت میں بلاقیمت حاضر ہوتا رہیگا ہماری یہ پیشکش ان حضرات کے لئے تھی جو اس اعلان سے پہلے امداد کا وعدہ کر چکے تھے۔ اس ضمن میں بعض دردمند حضرات نے لکھا ہے کہ طلوع اسلام جو پہلے ہی سے ایسی مالی دشواریوں میں مبتلا ہے اسے ایسی سخاوتوں پر نہیں اتر آنا چاہئے تھا۔ ان کے نزدیک ہماری یہ پیشکش ایک گونہ اسراف پر مبنی تھی۔ ہم اپنے ان مخلص دوستوں کی اس شکایت رنگین کی قدر کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی اتنا عرض کرنے کی اجازت ضرور چاہتے ہیں کہ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا (۴/۸۶) بھی قرآن ہی کا حکم ہے۔ وہ یقین مانیں کہ اس سے اسراف نہیں ہوگا بلکہ یہ حضرات بہترین رفقائے سفر ثابت ہوں گے۔ پھر ان میں سے بکثرت ایسے حضرات بھی تو ہیں جو ہماری اس پیشکش کے باوجود طلوع اسلام کو بلاقیمت لینا پسند نہیں کرتے۔

خریداران سے

دفتر کی طرف سے طلوع اسلام کے ہر ایک خریدار کو حساب کا کارڈ الگ الگ بھیجا جا چکا ہے۔ اس حساب میں جنوری ۱۹۵۵ء کے ماہانہ طلوع اسلام کی قیمت بھی شامل کر لی گئی ہے۔ ان میں سے جن حضرات کا نفی میں جواب نہیں آیا ان کی خدمت میں بقایا رقم کے لئے ہفتہ وار طلوع اسلام کا کوئی پرچہ بذریعہ وی پی بھیجا جائے گا۔

انگریزی طلوع اسلام

طلوع اسلام کے انگریزی ایڈیشن کے تقاضے بڑھ رہے ہیں۔ اس کے لئے ہم سردست تو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہفتہ وار طلوع اسلام (اردو) کے تھوڑے سے تجربے کے بعد حالات زیادہ صاف ہو جائیں گے۔ ایک بات ضرور ہے اور وہ یہ کہ اگر آپ حضرات نے اس کی توسیع اشاعت اور بالخصوص اس کیلئے اشتہارات حاصل کرنے میں خاص کوشش فرمائی تو ہمارے اگلے مراحل زیادہ آسان ہو جائیں گے۔

اچھا خدا حافظ۔ اب انشاء اللہ ہفتہ وار طلوع اسلام کے پہلے پرچہ میں ملاقات ہو گی۔ غالب نے ایسے ہی وقت کیلئے کہا تھا کہ

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

والسلام

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

کراچی

معارف القرآن

کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں لیکن ان میں سے پہلی تین جلدیں مدت سے نایاب ہیں۔ قرآنی ذوق رکھنے والوں کے پیہم تقاضوں کے پیش نظر جنابِ پرویز نے ان جلدوں پر نظر ثانی کی ہے اور (علاوہ دوسری تبدیلیوں کے) ان کی ترتیب کو بھی بدل دیا ہے۔ چنانچہ

معارف القرآن جلد دوم

اب اس سلسلہ کی پہلی کڑی قرار دی گئی ہے اور اس کا نام رکھا گیا ہے۔

ابلیس و آدم

اس میں انسانی تخلیق (نظریۂ ارتقاء) قصہ آدم۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی اور رسالت سے متعلق مباحث شامل ہیں۔

ایسے اہم عنوانات۔ قرآن کی تعلیم اور جنابِ پرویز کا قلم

آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ کتاب کیا ہوگی!

یہ کتاب بڑی تقطیع (۲۹×۲۲/۸) کے ۳۷۶ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کتاب چھپ کر شائع ہو چکی ہے اور روانگی شروع ہو رہی ہے۔ جس ترتیب سے فرمائشیں آئی تھیں اسی ترتیب سے اس کی روانگی ہو رہی ہے جن حضرات نے ابتک آرڈر نہیں دیا وہ اپنی فرمائش بہت جلد بھیج دیں جن حضرات کا روپیہ ہمارے پاس جمع ہے ان کو کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ جن حضرات نے منع نہیں فرمایا ہے ان سب کو کتاب از بھیجی جا رہی ہے۔ قیمت مجلد مع گرد پوش آٹھ روپے۔ (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی

طاہرہ کے نام

(بچے کی تربیت)

تم بھی کسقدر بھولی ہو طاہرہ! تمہیں اس پر تعجب ہو رہا ہے کہ سعیدہ بیس برس کی ہونے کو آئی اور اب بھی بچوں کی سی باتیں کرتی
یعنی تم نے یہ تصور کر رکھا ہے کہ جس طرح عمر کے ساتھ ساتھ بچے کا جسم بڑھتا ہے اسی طرح اس کے ذہن[1] میں بھی پختگی آتی جاتی ہے
بال یکسر غلط اور واقعات کے خلاف ہے۔ اگر جسمانی قوی کے ساتھ ساتھ ذہن میں بھی از خود پختگی آتی جائے تو ہمارے معاشرے کا
ہی کچھ اور ہو جائے۔ تمہیں جسقدر مصیبتیں دنیا میں نظر آتی ہیں ان کا بیشتر حصہ اس وجہ سے ہے کہ لوگوں کے جسم تو جوان ہو جاتے
لیکن ذہن بدستور بچوں کا سا رہتا ہے۔ اگر ذہن کے ساتھ جسم بھی بچوں جیسا رہے تو پھر بھی خیریت رہے۔ اس لئے کہ جہاں بچے کا
ن ناپختہ ہوتا ہے وہاں اس کی جسمانی قوت اور اختیار کی وسعت بھی بہت محدود ہوتی ہے۔ اسلئے وہ زیادہ خون خرابے کا موجب
بنتا۔ لیکن ذرا سوچو کہ جب جسم میں جوان آدمی کی قوت آجائے اور ہم اسے بالغ سمجھ کر اختیارات بھی سارے سونپ دیں لیکن ذہن
(MIN) اس کا رہے بچوں جیسا ناپختہ۔ تو اس کا نتیجہ کیا نکلیگا؟ وہی جو تم نے (FRANKINSTINE) کی پکچر میں دیکھا تھا۔
دیو کے جسم میں پاگل کا دماغ! ۔ اس فرق کے ساتھ کہ اسے تو ہر شخص پاگل سمجھتا تھا لیکن ناپختہ ذہن کے جوان آدمی کو کوئی پاگل نہیں
تھا۔ اسے صاحب عقل و ہوش سمجھا جاتا ہے۔ اسی تصور کے مطابق اس کے سپرد بڑی بڑی ذمہ داریاں کردی جاتی ہیں۔ اور جب
کے بعد اس سے بچوں کی سی حرکتیں سرزد ہوتی ہیں تو ہم جھنجھلا اٹھتے ہیں۔ یہ جھنجھلانا ہمارے خرمنِ امن وسکون میں گویا پہلی چنگاری
تی ہے۔ اس کے بعد اس سے اختلاف شروع ہوتا ہے۔ اختلاف تنازعہ کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ تنازعہ بڑھ کر فساد بن جاتا ہے۔ وہ
ان جسم کا بچہ، نہ اپنی جگہ چھوڑنا چاہتا ہے اور نہ اپنی روش بدلنا۔ روش کا بدلنا درحقیقت اس کے اختیار میں ہی نہیں ہوتا۔ اگر ہم نے
سے ایسے اختیارات دے رکھے ہوں جنہیں ہم آسانی سے واپس نہ لے سکیں تو ہماری بے بسی، زہر بن کر ہمارے رگ وپے میں سرایت
جاتی ہے۔ ہم اندر ہی اندر کڑھتے رہتے ہیں لیکن کر کچھ نہیں سکتے۔ اگر اس کے مقابلہ میں ہمارے پاس بھی قوت ہوتی ہے تو پھر دونوں قوتوں
ٹکراؤ ہوتا ہے جس سے معاشرے میں جہنم کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں۔ یہی شعلے آگے بڑھ کر عالمگیر جنگ کی شکل اختیار کرلیتے ہیں۔ یہ آئے
کے لڑائی جھگڑے۔ یہ سر پھٹول۔ یہ خون خرابے۔ یہ وحشت اور درندگی کے مظاہرے۔ یہ سب کیا ہیں! اسی اصل کی شاخیں کہ جسم
ہو جاتے ہیں اور ذہن بچوں کا سا ناپختہ رہتا ہے۔ اگر بچے کو مناسب غذا ملتی جائے تو اس کا جسم خود بخود بڑھتا جاتا ہے۔ ہماری

---

[1] ذہن یا ذہنیت سے مراد (MIND) ہے اور پختگی کا لفظ اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے جس میں (MATURE) کا لفظ استعمال
۔ پختہ ذہن سے مراد ہوگا (MATURE MIND) اور ناپختہ سے (IMMATURE)۔

بھول یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ جسم کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں پختگی بھی از خود آجاتی ہے۔ یہ غلط ہے۔ ذہن میں پختگی پیدا کرنے کے لئے بڑی محنت درکار ہوتی ہے۔ اس کے لئے تعلیم و تربیت کے خاص اہتمام کی ضرورت ہے۔ یہ وجہ ہے طاہرہ بیٹی جو میں تمہیں بار بار کہتا رہتا ہوں (اور کبھی کبھی اسے محسوس بھی کرتا ہوں کہ کہیں میرا اس طرح برابر کہتے رہنا تمہیں ناگوار ہی نہ گذرے۔ لیکن یہ بات ہی ایسی ہے کہ اس کے باوجود میں تمہیں برابر کہتا رہوں گا کہ) تم جاوید میاں (اللہ اسے ہر آفت سے محفوظ رکھے) کی جسم کی پرورش کی طرف تو اس قدر توجہ دیتی ہو لیکن اس کے ذہن کی تربیت کیلئے کچھ نہیں کرتیں۔ تم زیادہ سے زیادہ یہی کہو گی کہ میں اسے بدتمیز بچوں کے پاس بیٹھنے نہیں دیتی۔ بری عادتوں والے بچوں کے ساتھ کھیلنے نہیں دیتی۔ یہ ٹھیک ہے۔ اس سے اس میں بری عادتیں پیدا نہیں ہونگی لیکن کیا تم سمجھتی ہو کہ جس بچے میں بری عادتیں پیدا نہ ہوں اس میں اچھی عادتیں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں؟ میرا خیال ہے کہ تم زبان سے ایسا کہو یا نہ کہو، غیر شعوری طور پر تمہارے دل میں بھی یہی خیال جاگزیں ہے کہ بچے کو اگر بری باتوں سے محفوظ رکھا جائے تو اس کے دل و دماغ کی تعمیر "فطرت" کے عین مطابق ہوتی جائے گی اور وہ اس طرح دنیا بھر کی خوبیوں اور بھلائیوں کا پیکر بن جائے گا۔ یہ خیال غلط ہے۔ "فطرت" کے متعلق میں سلیم میاں کے ایک خط میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں[1]۔ غالباً تم نے وہ خط دیکھا ہوگا۔ لیکن اس میں بات کچھ فلسفیانہ سی تھی اس لئے شاید تم اچھی طرح سے سمجھ نہ سکی ہو۔ اس لئے تم اسی بات کو ایک اور انداز سے سمجھو۔ تم نے بچوں کو دیکھا ہے۔ (اور جاوید میاں کی تو ایک ایک نقل و حرکت تمہاری آنکھوں کے آئینے میں عکس اور دل کی لوح پر نقش ہے)۔ تم غور کرو کہ جب یہ (پیدا ہونے کے بعد) ہنوز خارجی اثرات سے محفوظ تھا تو اس کی "فطرت" کیا تھی؟ سب سے پہلے تو یہ کہ یہ بالکل جاہل تھا۔ اسے علم تھا تو اتنا ہی جتنا (مثلاً) بکری کے بچے کو ہوتا ہے۔ بھوک لگی تو دودھ پی لیا اس کے بعد سو گئے۔ دودھ ملنے میں ذرا دیر ہوئی تو لگے میانے۔ اس سے ذرا آگے بڑھے اور ہاتھ پاؤں ہلانے کی طاقت آئی تو بکری کے بچے جتنا بھی علم نہ رہا۔ بکری کا بچہ بھوک سے مر رہا ہو اور اس کے پاس ہی سبز مرچوں کا ڈھیر لگ رہا ہو۔ کیا مجال جو وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ جائے۔ لیکن انسان کے بچے کی یہ حالت ہے کہ مرچ ہاتھ میں آئی تو وہ منہ میں۔ نمک کی ڈلی اٹھائی تو وہ منہ میں۔ مٹی۔ راکھ۔ چونا۔ کوئلہ۔ الابلا جو ہاتھ میں آیا جھٹ منہ میں۔ تمہیں یاد ہے کہ جاوید میاں جب پیسہ نگل گئے ہیں تو وہ خود اور ہم سب کس مصیبت میں پھنس گئے تھے! کبھی تم نے بکری کے بچے کو بھی پیسہ نگلتے دیکھا ہے؟ جب یہ ذرا گھٹنوں لگے ہیں تو اور پریشانی بڑھی تھی۔ وہ آگ میں ہاتھ ڈال دیا۔ وہاں سے بچایا تو پانی کے ٹب میں جا گرے۔ وہ تو یوں کہو کہ اللہ کو زندگی اور ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک منظور تھی جو رانی کی نظر پڑ گئی ورنہ . . . . . (میں بیٹا! گئی بات کا ہیکو زبان پر لاؤں؟ ہر صاحب اولاد کو ایسی انہونی آفتوں سے محفوظ رکھے)۔ اس سے ذرا آگے بڑھے اور چلنا پھرنا، بھاگنا دوڑنا سیکھا تو اور آفت آئی! خود کوٹھے سے گرے۔ کبھی ساتھی کو دھکا دیکر گرا دیا۔ جو چیز ہاتھ میں آئی اسے اٹھا پھینکا۔ یہ پرچ ٹوٹی۔ وہ پیالی گرائی۔ جو چیز دوسرے ہاتھ میں دیکھی اس سے جا چھینی۔ اس نے نہ دینا چاہی تو کسی کو دانت کاٹا۔ کسی کو ناخنوں سے لہولہان کر دیا۔ اس مہترانی کے لڑکے کی آنکھ پھوٹتے پھوٹتے بچی تھی۔ توڑنا پھوڑنا۔ چھیننا جھپٹنا۔ مارنا پیٹنا۔ یہ ہوتی ہے بچے کی "فطرت" جسے وہ کسی سے سیکھتا نہیں

[1] دیکھئے "سلیم کے نام خطوط" میں سترہواں خط۔

اس کے اندر سے از خود پیدا ہوتی ہے۔ نفسیاتی طور پر دیکھو تو بچہ بڑا حاسد ہوتا ہے۔ یہ جو تم ہر خط میں لکھتی ہو کہ جاوید، ننھی بچاری کو بری طرح سے پیٹتا رہتا ہے تو اس کی وجہ بھی وہی حسد کا جذبہ ہے۔ ننھی کی پیدائش سے پہلے، سب کا پیار اکیلے جاوید میاں کے لئے تھا۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہ تھا۔ ننھی آئی تو انھوں نے اسے اپنی "مملکت" میں شریک تصور کر لیا۔ اب یہ ہر وقت اس بچاری کو اس سے نکالنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ بچہ ہر ایک کی توجہ کا واحد مرکز بننا چاہتا ہے۔ وہ (SELF — CENTRED) رہنا چاہتا ہے۔ اب ننھی ذرا بڑی ہوگی تو تم دیکھوگی کہ وہ عام طور پر بیمار رہا کرے گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہوگا! وہ جاوید کا مقابلہ طاقت سے تو نہیں کرسکے گی اسلئے وہ کمزور اور بیمار رہ کر سب کی توجہات کو اپنی طرف مرکوز کرلیگی۔ وہی (SELF-CENTRED) ہونے کا جذبہ! یہ ہے طاہرہ بیٹی! نقشہ اس انسانی بچے کا جسے خارجی اثرات سے محفوظ رکھکر اس کی اپنی افتاد پر چھوڑ دیا جائے۔ تم کہتی ہو کہ تم بڑی احتیاط کرتی ہو کہ جاوید میاں بدتمیز بچوں کے ساتھ کھیلے نہیں تاکہ اس میں بری عادتیں نہ پیدا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر تم اس کی پرورش تھرماس (THERMOS) کے اندر رکھ کر کرو تو بھی اس میں وہ عادتیں ابھریں گی جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے؟ کیا یہی عادتیں کچھ کم بری ہیں! اب تم سوچو کہ اگر بچوں کو (بقول تمہارے) بری عادتوں سے بچا بھی لیا جائے اور وہ مذکورہ بالا ذہنیت کو لیکر جوان ہوجائیں تو معاشرے میں اس قسم کے نوجوان کس قسم کے افراد بنیں گے؟ میں نہیں سمجھتا کہ ان کیلئے مجرم (CRIMINAL) کے علاوہ اور کونسا لفظ موزوں ہوسکتا ہے! یہ ہیں بیٹی! وہ افراد جن پر ہمارا معاشرہ بالعموم مشتمل ہے۔ وہ نوجوان (خواہ مرد ہوں خواہ عورتیں) کہ عمر نے جن کے جسموں کو بڑا کردیا ہے لیکن جن کے اندر ذہنیت (MIND) بچوں کی سی ہے۔ انہی میں سے کچھ اقتدار کی کرسیوں پر متمکن ہوجاتے ہیں کچھ مذہبی مسندوں پر براجمان۔ کچھ تجارت کی منڈیوں کو سنبھال لیتے ہیں کچھ صنعت و حرفت کے مرکزوں کو۔ کچھ آئین بنانے والے بن جاتے ہیں کچھ قانون کو چلانے والے۔ کچھ آنیوالی نسلوں کے معلم بن جاتے ہیں۔ کچھ جانے والوں کے مدح خواں۔ انہی کو دنیا مشاہیر اور ابطال سمجھنے لگ جاتی ہے حالانکہ یہ عام طور پر "پیرِ نابالغ" ہوتے ہیں۔ پختہ جسم کے اندر پختہ ذہن (MATURE MIND) بہت کم دیکھنے میں آئیگا۔

تم کہوگی کہ ہم ان بچوں کو علیٰ حالہٖ نہیں چھوڑتے۔ انھیں تعلیم بھی دیتے ہیں۔ لیکن ذرا سوچو کہ ہم انھیں تعلیم کس قسم کی دیتے ہیں؟ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ بچے کی تعلیم اس وقت شروع ہوتی ہے جب ہم اسے مدرسے بھیجتے ہیں۔ لیکن یہ غلط ہے۔ اس عمر تک تو بچہ بہت کچھ سیکھ چکا ہوتا ہے۔ تم نے دیکھا ہے کہ جاوید میاں وہی زبان بولتے ہیں جو تمہارے گھر میں بولی جاتی ہے اور تمہارے پڑوس کا بچہ وہی زبان بولتا ہے جو ان کے گھر میں بولی جاتی ہے۔ تم نے کبھی جاوید کو تختی کتاب دیکر اردو سکھانے کیلئے نہیں بٹھایا۔ وہ تمہاری (اردو) زبان بغیر سکھائے سیکھ گیا ہے۔ تو کیا تم سمجھتی ہو کہ جس دوران میں وہ بغیر سکھائے، چپکے ہی چپکے اردو بولنا سیکھ رہا تھا، اسوقت اور کچھ نہیں سیکھ رہا تھا؟ وہ چپکے ہی چپکے ان تمام باتوں کو سیکھ رہا تھا جو تمہارے ہاں دن رات ہو رہی تھیں۔ یہ تھی وہ تعلیم جسے وہ مدرسے میں جانے سے پہلے حاصل کر چکا تھا۔ اور اس تعلیم کا سب سے بڑا حصہ ان امور پر مشتمل تھا جسے اخلاقیات اور معتقدات کہا جاتا ہے۔ حیوانات میں اخلاقی ضابطہ (MORAL LAW) نہیں ہوتا۔ یہ امتیاز صرف انسان کو حاصل ہے۔ لیکن ذرا سوچو طاہرہ! کہ اس اتنے بڑے امتیاز کو ہم نے کس چیز پر بنیاد کیا ہے؟ وہ تعلیم جسے بچہ چپکے ہی چپکے گھر کے اندر اخذ کر لیتا ہے۔ (جیسا کہ میں نے تمہیں پہلے بھی ایک خط میں لکھا تھا)

ایک جینی کے بچے کو گوشت کے تصور سے متلی ہو جاتی ہے اور مسلمان بچہ ہڈی کو شیر مادر کی طرح چوستا ہے۔ ایک ہندو کو گائے کے گوشت کے نام سے جھرجھری آجاتی ہے لیکن مسلمان کے نزدیک اس سے زیادہ لذیذ کباب اور کسی گوشت کا نہیں ہوتا۔ ہمارے گھروں میں بچے چیونٹی مارنے کو بھی گناہ سمجھتے ہیں لیکن ٹھگوں کا بچہ بڑی بے تکلفی سے انسانی جان لے لیتا ہے۔ یہ ہے بنیادی تعلیم جسے حاصل کرنے کے بعد بچہ اسکول جاتا ہے۔ ان اسکولوں میں تعلیم کس قسم کی ملتی ہے اس کا اندازہ لگانے سے پہلے تم ذرا اپنے پچھلے خط کو سامنے لاؤ جس میں تم نے لکھا تھا کہ جاوید میاں کی غذا کا اسقدر خیال رکھا جاتا ہے لیکن اس پر بھی اس کے جسم میں خون اور توانائی پیدا نہیں ہوتی۔ میں نے تمہیں لکھا تھا کہ تم اسے کھانے کو تو سب کچھ دیتی ہو لیکن کبھی اس کا جائزہ بھی لیتی ہو کہ یہ کھانا پیٹ میں پہنچکر ہضم ہوتا اور جزو بدن بھی بنتا ہے یا نہیں۔ اگر یہ جزو بدن نہیں بنتا تو ایسے کھانے سے فائدے کی بجائے الٹا نقصان ہوتا ہے یہی حالت ہماری تعلیم کی ہے۔ ہماری تعلیم گاہوں میں بچے کے ذہن میں بہت سی معلومات (INFORMATION) تو ٹھونس دی جاتی ہیں لیکن اس کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا کہ بچہ ان معلومات کو اپنے کیریکٹر کا جزو بنانے کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ ہماری تعلیم سیرت نہیں سکھاتی۔ صرف معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ لہذا ہمارے نوجوانوں کا نقشہ کچھ اس قسم کا ہوتا ہے کہ عمر کے لحاظ سے قد اور جسم پورا۔ اس میں ذہنیت بچے کی اور پشت پر معلومات کا پنڈارا۔ اب ظاہر ہے کہ اس ذہنیت کا نوجوان جس طرح اپنی دولت، قوت، اختیارات کو بچوں کی طرح استعمال کریگا اسی طرح معلومات کے اس ذخیرے کا بھی استعمال کرے گا جسے اسکولوں اور کالجوں میں اس کی پشت پر لاد دیا گیا ہے۔ اب تم اس نوجوان کا تجزیہ کرو تو اس کے اجزائے ترکیبی یہ ملیں گے۔

(۱) عمر کے لحاظ سے بالغ لہذا ہر قسم کی ذمہ داریاں اٹھانے کے قابل۔

(۲) ذہنیت کے اعتبار سے بچہ جو ذمہ داری کے لفظ تک سے ناواقف ہوتا ہے۔

(۳) تعلیم کے لحاظ سے اسٹیشن کا قلی جو ایسے سامان کو اٹھائے لئے جاتا ہے جس میں اس کا اپنا کچھ بھی نہیں۔ اس کا حصہ صرف وہ مزدوری ہے جو اسے اس سامان کی حمالی میں ملے گی۔ اور

(۴) عقائد و تصورات وہ جو اس نے اپنے گھر کے ماحول میں غیر شعوری طور پر اخذ کئے تھے اور جن کی تائید میں اس کے پاس کوئی دلیل و برہان نہیں۔ ایسے عقائد، فائدہ مند ہونے کے بجائے الٹا نقصان رساں ہوتے ہیں۔ اسلئے کہ یہ عقائد نہ اس کے قلب کی گہرائیوں سے ابھرتے اور نہ ذہن کی روشنی میں پروان چڑھتے ہیں۔ یہ غیر شعوری طور پر ان سے وابستہ رہتا ہے اور جونہی اس کے سامنے ایسے دلائل یا زندگی کے تقاضے آتے ہیں جن پر وہ عقائد پورے نہیں اترتے تو یہ اس لبادے کو جھٹ سے اتار پھینکتا ہے اور پھر ان کے خلاف اس کے دل میں نفرت اور بغاوت پیدا ہو جاتی ہے اور اگر اس میں اتنی جرات نہ ہو کہ اس بغاوت کا اظہار علانیہ کردے تو اس کا سینہ منافقت کی آتش خاموش کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ جس کے تباہ کن نتائج بڑے دور رس ہوتے ہیں۔

اب تم نے سمجھا طاہرہ! کہ بچے والی ماں پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ لیکن ان ذمہ داریوں کو وہ مائیں کیا سمجھ سکیں گی جنہوں نے بچے کی غذا کے لئے گلیکسو کا ڈبہ منگا لیا۔ تربیت کے لئے جاہل آیا ملازم رکھ لی اور تعلیم کے لئے نرسری اسکول میں بھیجدیا اور خو

کہہ کر کلبوں میں گھومنا شروع کر دیا کہ کیا کیا جائے بیکار وقت ہی نہیں کٹتا۔ یا (جدید فیشن کے مطابق) کسی اصلاحِ معاشرہ کی انجمن (SOCIAL WELFARE SOCIETY) کی ممبر بن گئیں اور قوم کی اخلاقی پستی پر لیکچر دینے شروع کر دیئے۔ ایک فرض شناس ماں کے لئے تو ایک بچے کی پرورش، تعلیم اور تربیت کا کام اسقدر ہوتا ہے کہ وہ اسے کسی دوسری طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں دیتا۔ قرآن نے جب کہا تھا کہ فطری تقسیمِ کار کی رو سے اکتسابِ رزق مرد کے ذمہ ہے اور یہ اس کا فریضہ ہے کہ دیکھے کہ بیوی کی تمام ضروریات پوری ہو رہی ہیں، تو یہ اس لئے نہیں تھا کہ وہ عورت کو اپاہج یا مرد کا معاشی غلام بنانا چاہتا تھا۔ اس نے یہ اسلئے کیا تھا کہ وہ جانتا تھا کہ ایک فرض شناس ماں کو اکتسابِ رزق کی فرصت ہی نہیں مل سکتی۔ لہذا بیٹی! تمہیں ہر روز یہ دیکھنا ہوگا کہ جس رفتار سے بچے کے جسم کی پرورش ہو رہی ہے اور اس کا قد اور اعضا بڑھ رہے ہیں، اسی رفتار سے اس کا ذہن (MIND) پختہ (MATURE) ہوتا جا رہا ہے یا نہیں۔ اگر ایسا نہیں ہو رہا تو سمجھ لو کہ یہ بچہ بڑا ہو کر اپنے لئے مصیبت اور معاشرہ کے لئے وبالِ جان بن جائیگا۔ یاد رکھو انسانی بچہ میں صلاحیتیں ان گنت ہوتی ہیں اور ان کی تکمیل کے لئے کوئی آخری حد مقرر نہیں ہوتی۔ اگر ہم ساری عمر ان کی نشوونما کرتے رہیں تو وہ آگے ہی آگے بڑھتی جائیں گی ... تم سوچو کہ جس بچے کی صلاحیتیں دبی کی دبی رہ جائیں، کیا معلوم انسانیت اس کے کس قدر بیش بہا جوہروں سے محروم رہ جائیگی!

اب تم یہ پوچھوگی کہ یہ کس طرح سے معلوم ہو سکے کہ فلاں مرد (یا عورت) کی ذہنیت ناپختہ رہ گئی ہے؟ یہ معلوم کر لینا چنداں دشوار نہیں۔

(۱) جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ کسی معاملہ کو اس طرح حل کر رہا ہے جس طرح بچے معاملات (PROBLEMS) کو حل کرتے ہیں تو سمجھ لو کہ اس کے بالغ جسم میں ذہن بچے کا ہے۔ اگر تم اس نگاہ سے جائزہ لوگی تو تمہیں نظر آجائے گا کہ جنہیں تم پختہ عمر کے مرد یا عورتیں سمجھتی تھیں وہ درحقیقت بچے ہیں۔ یہی ہیں وہ "بچے" جو معاشرہ کی بیشتر مصیبتوں کا موجب ہوتے ہیں۔

(۲) اگر تم کسی مرد یا عورت کو دیکھو کہ اسے عمر کے کسی حصہ میں یہ اطمینان حاصل ہو گیا ہے کہ میں نے کافی علم حاصل کر لیا ہے اور اب مجھے مزید علم کی ضرورت نہیں تو سمجھ لو کہ وہ ذہن کے اعتبار سے بچہ ہے۔ بچہ ہر اسٹیج پر سمجھتا ہے کہ اس کا علم کامل ہے۔

(۳) بچہ قانون سے واقف نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کا پابند رہنا چاہتا ہے۔ قانون کے معنی عدالت کا قانون نہیں۔ اس کے معنی ہیں اصول کہ ہر کام کا ایک خاص نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ انگریزی میں اسے کہتے ہیں (WHAT-FOLLOWS-WHAT.) قرآن کی اصطلاح میں اسے قانونِ مکافات کہا جاتا ہے۔ دنیا میں صحیح نتائج تک پہنچنے کا یہی طریق ہے۔ اسے عرفِ عام میں سائنٹفک طریق کہتے ہیں۔ بچہ اس طریق سے واقف نہیں ہوتا۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ اس کی باتوں میں منطقی تسلسل (LOGICAL SEQUENCE) ہوتا ہے اور نہ اس کے کاموں میں۔ نظر ... یہی چیز جب تم بڑے میں دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ صرف (غیر اختیاری طور پر) عمر میں بڑھ گیا ہے ورنہ ذہن کے اعتبار سے وہیں کا وہیں ہے۔

(۴) انسان کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ (RATIONAL ANIMAL) ہے۔ (RATIONAL) کے معنی ہیں (RA...) کا حامل۔ اور (RATIO) کے معنی ہیں صحیح صحیح تناسب و توازن۔ لہذا انسان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی ہر بات میں

صحیح صحیح تناسب اور ہر کام میں ٹھیک ٹھیک توازن ہو۔ بچہ توازن اور تناسب سے واقف نہیں ہوتا۔ لہٰذا تم جس بڑے مرد یا عورت کو دیکھو کہ اس کی زندگی میں تناسب اور توازن نہیں، سمجھ لو کہ وہ ذہن کے اعتبار سے بچہ ہے۔

(۵) بعض لوگوں کو تم نے دیکھا ہوگا کہ تم ان سے کوئی بات کرو، وہ دو تین منٹ تک تو اسے بڑے غور سے سنیں گے لیکن اسکے بعد اس سے اکتا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگ جائیں گے۔ ان کی انتہائی خواہش ہوگی کہ یہ بات کسی طرح ختم ہو اور کوئی دوسری بات شروع۔ یہ اسلئے نہیں کہ دو تین منٹ کے بعد، وہ بات دلچسپ یا ان کے مفید مطلب نہیں رہی تھی۔ بات تو اسی طرح دلچسپ اور مفید تھی لیکن یہ کسی ایک بات پر زیادہ دیر تک اپنی توجہ کو مرکوز ہی نہیں رکھ سکتے۔ ان لوگوں کو تم دیکھو گی کہ یہ کسی کام کو تکمیل تک نہیں پہنچاتے۔ آج ایک کام شروع کیا اور اس میں اس جذب و انہماک سے مشغول ہو گئے کہ دیکھنے والوں نے سمجھا کہ یہ جب تک اسے ختم نہ کرلیں گے کھانا کھانے تک کے لئے بھی نہیں اٹھیں گے۔ لیکن دو چار دن کے بعد دیکھا کہ وہ اس کام کو چھوڑ کر کسی اور کام کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اسی طرح ان کی ساری زندگی گذر جاتی ہے ——— ناکام اور نامراد ——— ان کے مختلف کاموں کو دیکھئے تو کوئی یہاں پڑا ہے کوئی وہاں۔ یہ آدھا ختم ہوا تھا وہ تین چوتھائی۔ لیکن مکمل کوئی ایک بھی نہیں ہونے پایا۔ قابلیت ایسی کہ جو کام شروع کیا اس میں خاص ہنرمندی جھلکنے لگ گئی لیکن طبیعت ایسی کہ کسی پروگرام کو تکمیل تک نہیں پہنچا سکے۔

سمجھ لو کہ یہ سن رسیدہ بزرگ "کمسن نابالغ" ہیں۔ بالکل بچے ـ اسلئے کہ بچے کسی ایک کام پر زیادہ دیر تک ملتفت رہ ہی نہیں سکتے۔ ابھی یہ بات ہو رہی تھی۔ ابھی وہ ہونے لگی۔ ابھی وہ کھیل شروع ہوا تھا ابھی اس پر آ گئے۔ اگر جسم کے ساتھ ساتھ بچے کے ذہن کی نشو و نما نہ ہو تو اس کی یہ روش ساری عمر اس کے ساتھ رہے گی۔

یہاں اس بات کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ کسی آدمی کی تمام صلاحیتیں ناپختہ رہی ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ذہن کی ایک صلاحیت پختگی حاصل کر گئی ہو اور دوسری ناپختہ رہی ہو۔ اس قسم کے لوگ اور بھی زیادہ مشکل کا موجب بن جاتے ہیں۔ لوگ ان کی پختہ صلاحیت کو دیکھ کر انہیں پختہ ذہنیت کا انسان سمجھ لیتے ہیں اور جب زندگی کے دوسرے گوشوں میں ان کی ناپختہ ذہنیت کا مظاہرہ ہوتا ہے اُسوقت ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا کہئے؟

(۶) تم نے بچوں کو دیکھا ہوگا۔ مٹی کا گھوڑا ٹوٹ گیا تو رو رو کر ہلکان ہو گئے، اور کسی نے غبارہ لا کر دیدیا تو خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ ان کی خوشی اور غم کے پیمانے بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہی کیفیت ان بڑے آدمیوں کی ہوتی ہے جن کی ذہنیت ناپختہ رہ جاتی ہے۔ ذرا سی مخالف بات ہوئی یا اس کے ہونے کا وہم گذرا تو اس طرح افسردہ ہو کر بیٹھے ہیں گویا ان کی ساری کائنات لٹ گئی ہے۔ خود بھی جلتے بھنتے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی آزردہ کر رہے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر رو رہے ہیں۔ دوسری طرف اگر ذرا سی خوشی کی خبر سنی تو پھولے نہیں سما رہے ہیں۔ اور اگر آپ ان کے ساتھ اسی پیمانے کے اوچھے پن کا ثبوت نہیں دے رہے تو شکایت ہوتی ہے کہ انہیں تو ہماری خوشی بھی نہیں بھاتی۔

(۷) بچوں کی یہ خصوصیت بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے انتقام میں عدل کو کبھی ملحوظ نہیں رکھتے۔ ذرا کسی پر بگڑے تو بس

ں پر جھپٹ پڑے۔ یعنی ان کے نزدیک جرم اور سزا میں کسی نسبت کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ سزا سے ان کا مقصد اپنے جذبۂ انتقام کی سکین ہوتی ہے اور بس۔ یہی حالت ان بڑے لوگوں کی ہوتی ہے جن کے پیکر میں ذہن بچوں کا سا ناپختہ ہوتا ہے۔ جب ان کے ہاتھ میں اقتدار جاتا ہے تو جو شخص ان سے کسی بات میں ذرا سا بھی اختلاف رکھے اسے کچلنے میں اپنی ساری قوت صرف کر دیتے ہیں۔ اس میں عدل کا جذبہ رفرما نہیں ہوتا، انتقام کا ہوتا ہے۔ وہ مخالف کی تباہی پر اس طرح خوش ہوتے اور اس میں فخر محسوس کرتے ہیں جس طرح بچہ اپنے مخالف کو ھکا دیکر اپنے آپ کو فاتح و منصور تصور کرتا ہے۔

(۸) بچے کی یہ کیفیت بھی ہوتی ہے کہ اس کے پاس دس چیزیں ہوں لیکن اگر کسی دوسرے بچے کے پاس ایک چیز بھی ایسی ہے س کے پاس نہیں تو وہ اپنی دس چیزوں پر کبھی مطمئن نہیں ہوگا۔ اس کی پوری کوشش ہوگی کہ اس بچے کی وہ ایک چیز بھی اس کے پاس ئے یا کم از کم اس جیسی چیز اسے مل جائے۔ جن بڑوں کی ذہنیت ناپختہ ہوتی ہے ان کی بھی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ جو کچھ ان کے پاس ہے وہ اس سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ ہمیشہ ان چیزوں کی تلاش میں رہتے ہیں جو ان کے پاس نہیں ہوتیں خواہ انھیں ان کی فی الواقعہ رت ہو یا نہ ہو۔ چونکہ ہمارے زمانے میں اکثریت انہی "نابالغ بڑوں" کی ہے اسلئے مصنوعات کے سوداگران کے اس بچپن کا خوب فائدہ ہیں۔ اشتہار بازی (ADVERTISEMENT) کے معنی ہی یہ ہیں کہ ان "بچوں" کو ہر وقت یہ بتایا جائے کہ تمہارے پاس یہ بھی نہیں نہیں۔ اسی میں بازار کی گرمی کا راز ہے۔ آجکل بہت کم چیزیں ضرورۃً خریدی جاتی ہیں۔ بیشتر ان چیزوں کی خرید ہوتی ہے جن کے تہارات سے یہ احساس پیدا کر دیا جاتا ہے کہ تمہارے پاس یہ بھی نہیں، اور وہ بھی نہیں۔ تم طاہرہ! اپنی ملنے والیوں کے گھروں کو ئے لاؤ اور دیکھو کہ ان کے ہاں کتنی چیزیں ایسی رکھی ہیں جنہیں انھوں نے کبھی ایک دفعہ بھی استعمال نہیں کیا۔ یہ ان کے بکسوں اور اسی طرح جمع رہتی ہیں جس طرح جاوید میاں کے جوتے کے خالی ڈبے میں زنگار رنگ کے شیشے اور چینی کے ٹکڑے۔ لوہے کی سلاخ۔ ٹوپی کا پھندنا۔ سگرٹ کی خالی ڈبیا۔ مور کا پر۔ سلیٹ پنسل۔ چاک کا ٹکڑہ۔ کاغذ کی کترن اور سورج مکھی کا سوکھا ہوا احتیاط سے رکھے ہوتے ہیں اور وہ اس ڈبے ہی کو بھول چکا ہوتا ہے کہ کہاں رکھا ہے اور پھر اسی قسم کی "متاعِ گراں بہا" کے مصروف ہو جاتا ہے۔

مختصر الفاظ میں بچہ کی ذہنیت کی خصوصیات۔ جن لوگوں کی عمر کے ساتھ ساتھ ذہن کی پختگی میں اضافہ نہیں ہوتا ان میں یہی قائم رہتی ہیں اور (جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں) یہ چیز خود ان کیلئے مصیبت اور معاشرہ کیلئے فساد کا موجب بنتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ بڑے ہونے کے بعد اس روش میں تبدیلی پیدا کرنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہوتا ہے۔ اسلئے کہ ہمیں خود غیر شعوری والانہ زندگی میں لذت ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بچپن کی زندگی کو انسانی زندگی کا بہترین حصہ قرار دیتے ہیں اور پھر سے ں کے لوٹ آنے کی آرزوئیں ہمارے سینے میں مچلتی رہتی ہیں۔ لہٰذا انسان کی صحیح تربیت بچپن ہی کے زمانے میں ہو سکتی ہے، بہترین تربیت گاہ بچہ کا گھر ہے۔ جن گھروں میں اس نقطۂ نگاہ سے بچوں کی تربیت کا خیال رکھا جاتا ہے وہاں کے بچے شروع ں ذمہ داری، ہمدردی، محبت، ایثار، جرأت اور وسعتِ قلب کی خصوصیات لئے ہوئے پروان چڑھتے ہیں۔ جن

گھروں میں تربیت اچھی نہیں ہوتی وہاں بچہ کو ابتدا ہی سے خارجی سہاروں کا خوگر بنا دیا جاتا ہے جس سے اس کے دل میں خود اعتمادی کا
جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یا اسے بات بات پر جھڑکی سے اس قدر خوفزدہ کر دیا جاتا ہے کہ اس میں جرأت اور صداقت کے جذبات نشوونما
ہی نہیں پا سکتے۔ کہیں اسے ماں کا لاڈلا بنا دیا جاتا ہے جس سے وہ مردانہ خصائل سے محروم رہ جاتا ہے۔ اور کہیں وہ باپ کا منظور نظر بن جاتا
ہے تو اس میں زندگی کی لطیف حسیات کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ کہیں اس قسم کی باتیں کر کے کہ تمہارے ابا کی نوکری چھوٹ گئی تو کیا
بنے گا اور یہ مکان چھن گیا تو ہم کہاں جائیں گے، اسے بچپن ہی سے معاشیات کا غلام بنا دیا جاتا ہے اور کہیں اس کی ہر مانگ کو پورا کر کے اس کے
ذہن میں اس خیال کو راسخ کر دیا جاتا ہے کہ طبعی ضروریات کا پورا ہو جانا ہی زندگی کا مقصد ہے، اس سے زیادہ مقصود حیات کچھ نہیں۔
اس کے دل میں یہ ڈال کر کہ تمہارے ابا سب سے اچھے اور تمہارا گھر سب سے بہتر ہے اس کی نگاہ کو نسل، وطن اور قومیت کے تنگ دائرہ
میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ اور کہیں اسے یہ بتا کر کہ دنیا میں کچھ بھی اچھا نہیں اسے انسانیت کے مستقبل سے مایوس اور زندگی کا نوحہ خواں بنا دیا
جاتا ہے۔ کہیں اسے قدم قدم پر آئین و قواعد کا پابند بنا کر چلتی پھرتی مشین بنا دیا جاتا ہے اور کہیں اسے بالکل آزاد چھوڑ کر اس کے دل سے
قانون کا احترام اٹھا دیا جاتا ہے۔ کہیں اسے غلیظ اور کثیف ماحول میں رکھ کر اس کے دل سے تحسین جمال کے نہایت حسین جذبات فنا
کر دیئے جاتے ہیں اور کہیں اسے یہ کہہ کر کہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے سے اس کے کپڑے خراب ہو جائیں گے اس کے دل میں دوسرے
افراد سے نفرت اور خود ستائی کے جذبات کا تخم بو دیا جاتا ہے۔ کہیں اس کے کان میں یہ ڈال کر کہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطا است"
اندھی تقلید کا خوگر اور انسان سے بھیڑ بنا دیا جاتا ہے۔ اور کہیں اسے یہ کہہ کر کہ معاملات کے فیصلہ کیلئے اپنے دل سے پوچھا کرو
مستقل اقدار اور وحی کے غیر متبدل اصولوں سے بھی بے نیاز کر دیا جاتا ہے۔

اس سے تم نے دیکھ لیا ہوگا طاہرہ! کہ انسانیت کی تشکیل میں گھر کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ جس قسم کا گھر ہوگا اسی قسم کی قوم پیدا ہوگی
اور اسی سے تم سمجھ لو کہ ماں کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اقبال کے الفاظ میں، ماں

سیرت اقوام را صورت گر است

یہی وجہ ہے کہ عربی زبان میں امت کا لفظ ہی اُمّ سے نکلا ہے۔ پیدائش کے اعتبار سے بچہ بالکل جاہل ہوتا ہے۔ ماں اسے علم دیتی ہے۔ وہ
ہوتا ہے۔ ماں اسے زبان دیتی ہے۔ وہ بالکل غیر ذمہ دار ہوتا ہے، ماں اسے ذمہ داریوں کا احساس دلاتی ہے۔
ہوتا ہے، ماں اسے بہن بھائیوں سے محبت کرنا اور دوسروں سے ہمدردی کرنا سکھاتی ہے۔ وہ ہر چیز کے جزو کو
سکھاتی ہے۔ غرضیکہ پیدائش کے لحاظ سے بچہ صرف گوندھی ہوئی مٹی ہوتا ہے، ماں اسے جس قسم کے قالب میں چاہے

یہ ہیں بیٹی! تمہاری ذمہ داریاں۔ وہ ذمہ داریاں جو تم پر خود انسانیت کی طرف سے عائد ہوتی ہیں۔ خدا تمہیں ان ذمہ داریوں
کو ... سے کہنے کے قابل ہو سکو کہ میں نے نوعِ انسانی کے اس انبوہ کثیر میں ایک ایسے فرد کا اضافہ کیا ہے جس پر انسانیت کو ناز ہو گا
اور یہ کرنا ممکن ہے جبکہ تم قرآن سے رہنمائی لو۔ اسلئے کہ انسانیت کی تشکیل صرف ... کے قالب میں ہو سکتی ہے

پرویز
۱۸ دسمبر ۱۹۵۴ء

اسلام پر
مختلف غیر اسلامی ثقافتوں کے اثرات

(علامہ محترم احمد امین استاذ کلیۃ الآداب بالجامعۃ المصریہ)

[زیرِ نظر مضمون میں اس موضوع پر گفتگو کی گئی ہے کہ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں کون کونسی غیر اسلامی ثقافتوں کا اسلام پر اثر پڑا اور یہ اثرات کن ذرائع اور اسالیب سے مسلمانوں کے اندر داخل ہوئے۔ ان خارجی ثقافتوں میں سے یہودیت اور نصرانیت کا ذکر دسمبر کی اشاعت میں کیا گیا تھا۔ زیرِ نظر مقالہ میں ایرانی مذاہب کے اثرات سے بحث کی گئی ہے۔ طلوعِ اسلام]

جن عوامل کا ہم ذکر کرتے آرہے ہیں ان کے اثرات مختلف ثقافتوں کے امتزاج میں کافی دور رس تھے۔ ایرانی اور رومی عادات کا عادات کے ساتھ امتزاج ہوا۔ ایرانی اور رومی قانون کا ان احکام کے ساتھ امتزاج ہوا جن کو قرآن اور سنت نے واضح کیا تھا۔ ہندیوں کی حِکَم اور اہلِ روم کا فلسفہ، عربی حکم کے ساتھ مخلوط ہوتا گیا۔ ایرانی اور رومی طرزِ حکومت، عربی طرزِ حکومت کے ساتھ گھلتا ملتا چلا گیا۔ غرضیکہ زندگی کا ہر شعبہ، نظم سیاسی و اجتماعی، طبائعِ عقلیہ غرضکہ ہر چیز بڑی حد تک اس امتزاج سے متاثر ہوتی چلی گئی۔

چونکہ اقوامِ مفتوحہ، مدنیت، حضارت اور نظمِ سیاسی میں عربوں کی بہ نسبت زیادہ ترقی یافتہ اور نظمِ اجتماعی کے اعتبار سے عربوں سے کہیں مستحکم اور قوی تھیں اسلئے یہ طبیعی چیز تھی کہ ان کی مدنیت، حضارت اور نظمِ سیاسی کی سیادت قائم ہو جاتی۔ تاہم چونکہ عرب قوی اور غالب تھے اسلئے دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ انھوں نے اس نظمِ سیاسی کو جہاں تک وہ ان کی عقلیت کے مطابق ہو سکتا تھا اپنا لیا۔ مفتوحہ ممالک میں اسی نظام کی پیروی کی جاتی رہی جو فتح سے پہلے وہاں قائم تھا۔ مثلاً دفاتری نظام وغیرہ کو جوں کا توں رہنے دیا۔ ان دفاتر کی سرکاری زبان بھی عبدالملک ابن مروان کے زمانہ تک وہی رہی جو ان کی اصلی زبان تھی۔ (عراق اور ایران میں فارسی، شام میں رومی اور مصر میں قبطی)۔ ہمارا موضوع اس اجتماعی اور سیاسی نظام کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ ہمارا موضوع حیاتِ عقلیہ کو بیان کرنا ہے جس کی حالت بعینہ وہی تھی جو سیاسی نظام کی تھی۔ یہ امتزاج دراصل عقلِ عربی اور عقلِ اجنبی کا باہمی ازدواج تھا جس کے نتائج پہلی صدی کے بعد سے نمایاں طور پر سامنے آنے شروع ہو گئے۔

مفتوحین کی کثیر تعداد اسلام میں داخل ہو چکی تھی۔ ان لوگوں کے پاس حکمت، امثال، شعر، ادب غرضکہ کونسی چیز نہیں تھی۔ بلکہ ان کے علوم تو مدون صورت میں موجود تھے جن پر بڑی بڑی کتابیں بھی دستیاب ہو سکتی تھیں۔ انھیں علوم کو مدون کرنے اور علمی حصہ لینے کا سلیقہ بھی تھا۔ جب ان کے قدم اسلام میں جم گئے اور انھیں اطمینان و سکون کی زندگی نصیب ہوئی تو انھوں کی نسلوں نے اپنے علمی رجحانات کو اسلام کے ساتھ تطبیق دینے کی کوشش شروع کیں جس سے وہ ان کے آبا و اجداد صدیوں سے

مانوس چلے آرہے تھے جس کی وضاحت ہم آگے چل کر کریں گے۔

غضب یہ ہوا کہ اسلامی عقائد بھی اس امتزاج کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ کیا آپ گمان بھی کر سکتے ہیں کہ ایک ایرانی، شامی نصرانی رومی، یا قبطی جب اسلام میں داخل ہوا ہوگا تو اس کے وہ تمام عقائد جو آباء واجداد سے صدیوں سے وراثۃً ان میں چلے آرہے تھے قطعاً محو ہوگئے ہوں گے اور اس نے اسلام کو اسی طرح سمجھ لیا ہوگا جیسا کہ اسلام نے سمجھانا چاہا تھا؟ ہرگز نہیں! ایسا ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ علم النفس اس امکان کو تسلیم ہی نہیں کر سکتا۔ ایک ایرانی کے ذہن میں "الٰہ" کا جو تصور تھا وہ قطعاً ایک نصرانی رومی کے تصور سے مختلف تھا۔ پھر ان دونوں کا تصور ایک نصرانی مصری کے تصور سے اور بھی مختلف تھا۔ پھر مختلف ادیان میں جو الفاظ مستعمل تھے مثلاً جہنم، جنت، ابلیس، ملائکہ، آخرت، نبی، وغیرہ، ان کے معانی اور تصورات جو ایک قوم کے ذہن میں موجود تھے۔ وہ ان معانی اور تصورات سے قطعاً مختلف تھے جو دوسری قوم ... چکے تھے۔ ہم یہ گمان بھی نہیں کر سکتے کہ دوسری قوموں کے یہ لوگ جو اسلام میں داخل ہوئے تھے انھوں نے ان الفاظ کو ان کے تمام ... کے ساتھ ایسے ہی سمجھا ہوگا جیسا کہ اہلِ عرب سمجھتے تھے۔ ایسا کرنا تو ان لوگوں کے لئے بھی ممکن نہیں ہو سکتا تھا جو واقعی خلوصِ دل ... اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان الفاظ کو ہر قوم اپنی پرانی دینی تقالید کے ساتھ خلط ملط کر کے اور ملا جلا کر ہی سمجھ سکتی تھی ... نے اسلامی الفاظ کو ان الفاظ کے قریب تر کر کے سمجھنا تھا جو خود ان کے مانوس ادیان میں مستعمل چلے آرہے تھے۔ اس کے شواہد ایک دو ... تو اد میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً واقدی نے اپنی کتاب فتوح الشام میں نقل کیا ہے کہ شام کے ایک مسلمان آدمی نے دوسرے آدمی ... معاہدہ کیا تھا کہ وہ اس کی بکریاں چرا دیا کرے گا اور یومیہ اجرت یہ ہوا کرے گی کہ دوسرا آدمی اپنی بیوی کو ایک رات شب باشی کیلئے ... بھیجا کرے گا۔ حضرت عمرؓ کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے ان دونوں آدمیوں کو طلب فرمایا۔ دونوں نے اس امر کا اقرار کیا اور کہا کہ ... قطعاً اس کا علم نہیں تھا کہ ایسا معاملہ کر لینا بھی حرام ہے۔ ابن عبد ربہ نے عقد الفرید میں بیان کیا ہے کہ دین[۵۱] کے بارے میں جو شدت اور سختی ان موالی (آزاد کردہ غلاموں) میں پائی جاتی تھی بادیہ نشین عربوں میں اس کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا تھا۔ ان[۵۲] اقوام کے اثرات ... صدی ہجری کے اواخر میں ظاہر ہونے شروع ہوگئے تھے چنانچہ مختلف مذاہب اور فرقوں نے جنم لینا شروع کر دیا تھا جسے ہم آگے چل کر ... کریں گے۔ شاید یہی وہ چیز تھی جس کا فتوحات کے وقت حضرت عمرؓ کو سخت اندیشہ تھا۔ ابو حنیفہ دینوری نے اپنی کتاب "الاخبار الطوال" ... نقل کیا ہے کہ جنگ جلولاء میں مسلمانوں کو اس قدر مالِ غنیمت حاصل ہوا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور جنگی قیدی بھی کثیر تعداد ... ملے جن میں شرفاء فارس کی لڑکیاں بھی تھیں۔ لوگوں کا بیان ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے "خدایا! میں ان ... کی گرفتار شدہ عورتوں کی اولاد سے تیری پناہ مانگتا ہوں" چنانچہ صفین[۵۳] کے میدان کی زینت آگے چل کر انہی عورتوں کی اولاد سے قا... صحیح ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان سے اللہ کی پناہ مانگی تھی اور انھیں حق پہنچتا تھا کہ وہ ان سے پناہ مانگتے، نہ صرف ان سے پناہ مانگتے بلکہ تمام غلاموں اور ان کی پوری نسل سے پناہ مانگ سکتے تھے۔ کیونکہ ان لوگوں کی ایک خاص سیاسی عصبیت تھی جو عربی عصبیت سے نہ صرف ...

---

۵۱ یعنی ان کی اپنی تقلیدات کے بارے میں۔ ۵۲ العقد الفرید ج ۲ ص ۹۰-۹۱۔

۵۳ امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان جنگ کا میدان۔

تھی بلکہ اس کی مخالف بھی تھی۔ ان کی اپنی دینی تقلیدات تھیں جن کی طرف ان کا جھکنا لازمی تھا اور اس رجحان اور جھکاؤ کے
ساتھ وہ یقیناً اسلام کی عربی سادگی کے برخلاف ہی اپنا راستہ بنا سکتے تھے۔

سچ یہ ہے کہ یہ امتزاج نہایت ہی قوی اور شدید تھا۔ ان موالی اور ان جیسے اور لوگوں کا اثر زندگی کے ہر شعبہ میں موجود تھا۔ افواج
کے درمیان جسمانی جنگوں کی طرح اجتماعی مسائل میں بھی مختلف جنگیں برپا تھیں۔ مگر افسوس ہے کہ مورخین نے ان جنگوں کی تفاصیل
سے بحث نہیں کی حالانکہ تاریخ کا یہ اہم ترین موضوع تھا۔ اسلام اور دیگر مذاہب میں جنگ تھی۔ لغت عربی اور دیگر لغات میں جنگ تھی۔ عربی
آرزوؤں اور دیگر اقوام کی آرزوؤں میں جنگ تھی۔ عرب کے سادہ نظم اجتماعی اور ایرانی اور رومی نظم اجتماعی میں جنگ تھی۔ جسمانی جنگیں اگرچہ
ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کی فتوحات کے بعد تقریباً ختم ہو چکی تھیں۔ لیکن یہ دوسری جنگیں اس کے بعد عرصہ دراز تک قائم رہیں اور پوری
مملکت اسلامیہ ان مختلف جنگوں کی آماجگاہ بنی رہی جس میں مختلف تمنائیں اور آرزوئیں ایک دوسرے سے دست و گریباں تھیں۔ اہلِ
فارس اپنی قدیم مملکت کے ماتم گسار تھے اور ان کا یہ خیال تھا کہ وہ عربوں کے مقابلہ میں ہر حیثیت سے ترقی یافتہ تھے۔ رومیوں کا بھی یہی
خیال تھا۔ اہلِ مغرب اور اہلِ مصر اپنے استقلال کے خواب دیکھتے رہتے تھے۔ مختلف سیاسی نظام ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے۔ اہل فارس
کا ایک خاص نظام تھا۔ رومیوں کا اس سے مختلف نظام تھا۔ رومی قانون کی سیادت رومی مستعمرات میں تھی اور ایرانی قانون کی سیادت
ایرانی مملکت میں قائم تھی۔ ان کے مقابلہ میں اسلام تھا جس کا خود ایک قانون تھا جو بعض جزئیات میں ان سے موافقت کرتا تھا اور بعض
میں ان سے ٹکرا جاتا تھا۔ اہلِ فارس میں سے کچھ تو مجوسی تھے جو مجوسی ہی رہے۔ کچھ ایسے تھے جو مسلمان ہو گئے۔ رومیوں میں بہت سے نصرانی
تھے۔ بہت سے مسلمان ہو گئے تھے۔ ایسے ہی مصریوں میں سے کچھ نصرانی تھے اور کچھ مسلمان ہو چکے تھے۔ ان شہروں کے یہودیوں میں سے بھی کچھ
یہودی ہی رہے اور کچھ مسلمان ہو گئے۔ مختلف زبانیں بھی موجود تھیں۔ عربی، فارسی، قبطی، یونانی، عبرانی سب زبانیں بولی جاتی تھیں ——
یہ تمام رجحانات و میلانات ایک مستقل باہمی جنگ میں مشغول تھے اور پوری مملکت اسلامیہ میدانِ جنگ بنی ہوئی تھی۔ ہمیں افسوس
ہے کہ ان معنوی جنگوں کے واقعات ہم تک بہت کم پہنچ سکے ہیں۔ امت اسلامیہ آگے چل کر امت عربیہ نہیں رہی تھی جس کی زبان ایک، دین
ایک اور خیال ایک ہو جیسا کہ رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک میں تھا۔ بلکہ امتِ اسلامیہ مختلف امتوں، مختلف میلانات اور مختلف
خیالات کا مجموعہ بن چکی تھی جو آپس میں برسرپیکار تھیں۔ جنگ برابر چل رہی تھی کبھی اہلِ فارس فتحیاب ہوتے تھے اور کبھی اہلِ عرب
اور کبھی روم۔

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اہلِ عرب نظم سیاسی اور اجتماعی اور اس کے متعلقات مثلاً فلسفہ اور علوم کے میدان میں شکست کھا گئے تھے
مگر دو بڑی چیزوں میں وہ فتحیاب ہوئے —— زبان، اور دین —— ان کی زبان کی سیادت ان تمام ممالک میں تسلیم کر لی گئی تھی اور
اس کے مقابلہ میں ان ممالک کی اصلی زبانیں شکست کھا گئی تھیں۔ عربی ہی ان ممالک کی سیاسی اور علمی زبان بن چکی تھی۔ یہ فتح و کامرانی ان میں سے
اکثر ممالک میں آج تک بھی ان کی حلیف بنتی چلی آ رہی ہے۔ بعینہٖ یہی حال دین کا تھا۔ ان تمام ممالک میں دین اسلام کی سیادت تسلیم
کر لی گئی تھی اور ان کی بیشتر آبادیاں اسلام کی حلقہ بگوش ہو چکی تھیں۔ بہت کم ایسے لوگ باقی رہ گئے تھے جو اپنے اصلی دین پر قائم رہ گئے ہوں

ان دونوں عناصر ــــ زبان اور دین ــــ کی اس عظیم فتمندی کے باوجود، دونوں ہی باہمی مزاحمت ومنافست سے متاثر ہوئے؛ نہ رہ سکے۔ اور دونوں ہی کافی متاثر ہوئے۔ زبان میں وہ پہلا سا سلیقہ باقی نہ رہا اور غلطیاں عام ہوگئیں حتیٰ کہ ایسے قوانین کی ضرورت پڑ لگی جو ان غلطیوں کی گرفت کرسکیں۔ ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ عبداللہ ابن الاہتم نے بعض آزاد کردہ لوگوں کو دیکھا جو علم نحو میں باہمی مذاکرات کر رہے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ آج تم زبان کو درست کر رہے ہو حالانکہ تم ہی اسے سب سے پہلے خراب کرنے والے ہو۔ ابو عبیدہ کہتے: کاش عبداللہ بن الاہتم نے صفوان، خاقان اور مؤمل بن خاقان کی یاوہ گوئیوں اور غلط گفتاریوں کو سنا ہوتا (تو شاید وہ ان موالی کو سکتے) اسی طرح زبان عربی پر عجمی الفاظ عجمی ترکیبیں، عجمی خیالات، اور عجمی مضامین نے تسلط جمالیا۔ یہی کچھ تم دین کے متعلق کہہ سکتے ہو اگرچہ مظفر ومنصور ہوا لیکن متاثر ہوئے بغیر نہ بچ سکا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان فرقوں میں بٹ گئے اور مختلف مذاہب کی بنیادیں پڑنے لگیں حتیٰ کہ قرآن کی شرحیں ان بیانات سے ہونے لگیں جو دوسروں کے ہاں موجود تھے مثلاً ابتدائے آفرینش عالم سے متعلق افسانے اور قصص۔ یہ فرقے اکثر زبانوں سے ہی لڑتے تھے لیکن کبھی کبھار تلواروں تک بھی نوبت پہنچ جاتی تھی۔

اب ہم کچھ تفصیلات بیان کرتے ہیں تاکہ ان تحریکات سے متعلق ہمارے موضوع کی وضاحت ہو سکے۔ ہمارا یہ موضوع حرکت عقلیہ ہے ــــ اپنے وسیع ترین معنوں میں ــــ یعنی علم اور دین۔ اہل فارس کا ایک دین تھا۔ ان کی ایک حکمت تھی۔ ان کی ایک عقلیت تھی۔ اسی طرح اہل روم کا بھی دین، علم اور عقلیت تھی۔ امت اسلامیہ میں ان دونوں عوامل نے بہت گہرا اثر کیا ہے۔ آئندہ سطور میں انہی اثرات کو تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔

اہل فارس کا دین

اسلامی فتوحات سے فارس کا استقلال تو ــــ جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں ــــ جاتا رہا اور وہ مملکت اسلامیہ کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ اہل فارس کی کثیر تعداد عربوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر کچھ غلام بنالئے گئے اور عرب میں تقسیم کردیئے گئے تھے، اور کثیر تعداد اسلام میں داخل ہوچکی تھی۔ ان میں سے بہت سوں نے عربی زبان سیکھ لی تھی حتیٰ کہ ان کی دوسری عربی زبان میں اسی طرح گفتگو کرسکتی تھی جیسا کہ خود اہل عرب کی اولاد گفتگو کرسکتی تھی۔ لیکن اس سب کے برعکس وہ کلیتہً اپنے عقائد عربوں کے مثل نہ بن سکے۔ نہ ہی ان کی عقلیت اہل عرب کی عقلیت کو اختیار کرسکی۔ بلکہ ان لوگوں نے اسلام کی حلقہ بگوشی اختیار تو کی مگر خود اسلام کو اپنے فارسی رنگ میں رنگ دیا۔ اور اپنے پرانے دین کے تمام عقائد اور تقالید سے علیحدہ نہیں ہوسکے۔ انھوں نے کو اتنا ہی سمجھا جتنا کہ ان کے قدیمی دین نے سمجھنے کی اجازت دی جسے ان کی قوم نے پشتہا پشت سے قبول کر رکھا تھا، جس میں پیدا ہوئے اور بڑھے ہوئے تھے۔ ان میں سے بہت سوں نے عربی زبان تو سیکھ لی مگر اپنے فارسی خیالات کو نہیں چھوڑ سکے۔ اور ان اشعار اور ادبیات کو ترک نہیں کرسکے جو ان کی قوم میں چلے آرہے تھے۔ اس کا طبیعی اثر تھا کہ اسلام میں نئی تعلیمات اور نئے دینی رجحانات داخل ہوگئے جن کے اثرات بعد میں ظاہر ہوئے جس کا نمایاں ترین نمونہ اسلام میں شیعیت اور تصوف تھا۔ اسی کا ایک یہ بھی اثر تھا کہ ادب فارسی حکم، فارسی قصص اور فارسی خیالات میں ڈوب گیا۔

چونکہ اہل فارس ایک مؤثر اور پر اثر دین اور ادب کے مالک تھے اسلئے اختصار کے ساتھ پہلے ہمیں ان کے دین و ادب کا مع

رلینا چاہیئے تاکہ اس کے بعد ہم اس کے اثرات کو سمجھ سکیں۔ ہمیں ان کے دین کی ابتدا اور ان کے ادب کی اصل اور اسکی تدریجی ترقی سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ چیز ہمارے موضوع کیلئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ دولت ساسانیہ میں جسکی اسلام سے پہلے فارس پر حکومت تھی ان کے دین اور ادب کا کیا حال تھا جو سنہ ۲۲۶ عیسوی سے لیکر سنہ ۶۵۱ عیسوی تک برسر اقتدار رہا تآنکہ عربوں نے ان کے ہاتھوں سے حکومت لیلی اور اپنے والیوں اور گورنروں کے ذریعہ ان پر حکومت کی کیونکہ یہ دولت ساسانیہ ہی تھی جس کے اثرات کو دینی اور ادبی جہت سے مسلمانوں نے قبول کیا تھا۔

(۲) اہل فارس کا دین

اہلِ فارس ـــــ اور آرین نسل عموماً ـــــ اس میں مشہور چلی آرہی ہے کہ وہ ہمیشہ سے طبیعی مظاہر کی پرستش کی طرف مائل تھے۔ چنانچہ صاف آسمان، روشنی، آگ، ہوا، پانی جو آسمان سے برستا تھا، ان کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچتے تھے اور وہ ان کی پرستش کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ تمام چیزیں الٰہی کائنات (کائناتی دیوتا) ہیں۔ چنانچہ آفتاب کو وہ خدا کی آنکھ کہتے تھے اور روشنی کو خدا کا بیٹا۔ جیسا کہ تاریکی اور قحط سالی وغیرہ شریر اور ملعون کائناتی دیوتا تھے۔

ابتدائی دور ہی سے انھوں نے انسان کو نیکی (خیر) کے معبودوں اور دیوتاؤں کے سامنے جھکا رکھا تھا کہ وہ ان سے مدد مانگیں ان کیلئے نمازیں پڑھیں، ان کی حمد میں تسبیحیں پڑھیں اور ان کے سامنے قربانیاں پیش کریں۔

ان کا خیال تھا کہ نیکی کے دیوتا، بدی (شر) کے دیوتاؤں کے ساتھ دائمی جنگ میں مشغول ہیں اور انسانی نیک اعمال مثلاً نمازوں وغیرہ سے بدی کے دیوتاؤں کے مقابلہ میں نیکی کے دیوتاؤں کو ایک حد تک امداد حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ آگ کو انھوں نے روشنی کا رمز قرار دیا تھا۔ بالفاظ دیگر آگ نیکی کے دیوتاؤں کا رمز تھی۔ وہ اپنے معابد میں آگ روشن کرتے تھے اور ان معبودوں کی مدد سے اسے پھونکتے رہتے تھے تاکہ بدی کے دیوتاؤں کے خلاف ان کو طاقت حاصل ہو اور وہ ان پر فتحیاب ہو سکیں۔ یہ آگ ان کے نزدیک تازہ شعری تخیل کا منبع اور سرچشمہ تھا۔

(۱) زرتشت

پھر زرتشت (ZOROASTET) ـــــ اہل فارس کے نبی ـــــ آئے جنھوں نے لوگوں کو نئی تعلیمات کی طرف دعوت دی جسکی بنیاد کسیقدر اصلاح کے بعد پرانے دین ہی پر قائم تھی۔

خود زرتشت کا وجود ہی بہت سوں کے نزدیک محل شک اور منکرین و مثبتین کے مابین طویل نزاع کا موجب بنا ہوا ہے۔ جو لوگ ان کے وجود کو ثابت کرتے ہیں ان میں بھی ان کی زندگی کی تاریخ میں سنہ [illegible] قبل مسیح سے سنہ [illegible] قبل مسیح تک بیشمار مختلف اقوال ہیں۔ پروفیسر جیکسن (JACKSON) نے ان کی زندگی کے بارہ میں ایک قابل قدر کتاب لکھی ہے جس نے ان کے وجود کا اثبات کرنے والوں کے پلڑے کو جھکا دینے میں بڑا کام کیا ہے۔ وہ اپنی بحث میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ زردشت ایک تاریخی شخصیت ہیں۔ یونہی واہی تباہی فرضی افسانوی کردار نہیں ہے قبیلہ میڈیا ـــــ شمال مغربی فارس ـــــ کے چشم و چراغ تھے۔ ساتویں صدی قبل مسیح کے نصف کے لگ بھگ ان کو شہرت حاصل ہوئی اور تقریباً سنہ ۵۸۳ قبل مسیح میں ستتر سال کی عمر پاکر ان کا انتقال ہوا۔ ان کا وطن آذربائیجان تھا لیکن ابتدائی کامیابی ان کو ایران سے باہر جا کر بلخ میں حاصل ہوئی تھی۔ یعنی شہنشاہ بشتاسپ[1] کے زردشتی دین میں داخل ہو جانے کے بعد۔ ان کا دین بلخ سے

[1] اس کا نام شاہنامہ میں گشتاسپ لکھا ہے۔

ھکر تمام فارس میں پھیلتا چلا گیا۔

لیکن اس کے باوجود یہ تمام نتائج جن تک جیکسن پہنچے ہیں ہمیشہ محل نظر رہیں گے۔ زردشت کے پیرو بہت سی ایسی باتیں بھی نقل کر ے جوان کی ولادت کے وقت سے معجزات، خوارق عادات اور اشارات کی صورت میں ان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور یہ کہ وہ بچپن ہی ے تفکر اور تدبر میں لگ گئے تھے اور تنہائی اور گوشہ نشینی کی طرف ان کا رجحان بڑھتا جاتا تھا ـــــ اس دوران میں انھوں نے سات ب دیکھے تھے۔ ان خوابوں کے بعد انھوں نے اپنی رسالت کا اعلان کیا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ وہ خدا کے رسول ہیں۔ خدا نے انھیں اسلئے بھیج ، کہ دین کے ساتھ جو گمراہیاں منسلک ہو گئی ہیں وہ ان کو دور کر دیں اور حق کی طرف لوگوں کو ہدایت دیں۔ وہ عرصۂ دراز تک لوگوں کو دعو یتے رہے مگر تھوڑے سے لوگوں کے سوا کسی نے ان کی دعوت پر کان نہ دھرا۔ تب خدا نے ان کو وحی فرمائی کہ وہ بلخ کی طرف ہجرت کر جائیں انچہ وہاں پہنچکر شاہی محلات میں انھوں نے اپنی دعوت کو پھیلایا۔ اولاً وزیر کی اولاد اور خود ملکہ نے ان کی دعوت کو قبول کر لیا۔ شاہی ات کے دوسرے ذمہ دار لوگوں نے ان کا مقابلہ کیا لیکن خود بادشاہ ـــ بشتاسپ ـــ کے ان کے دین میں داخل ہو جانے سے مندی انہی کے حصہ میں آئی۔ بادشاہ نے اس نئے دین کو قبول کر لیا تو دوسرے لوگ بھی فوج در فوج ان کے دین میں داخل ہونے شروع ہو گئے

ردشت کی تعلیمات

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ زردشت سے پہلے اہل فارس نے اپنا دین دو بنیادوں پر قائم کر رکھا تھا۔ (۱) ایر دنیا کا ایک قانون ہے جس پر وہ چل رہی ہے اور اس کے طبیعی ظواہر ثابت اور موجود ہیں۔ (۲) یہاں مختلف دں ـــ نور و ظلمت، سرسبزی و قحط سالی وغیرہ ـــ میں تزاحم و تصادم ہو رہا ہے۔ زردشت کی تعلیمات بھی انہی دونوں بنیادوں پر مبنی بتہ ان سے پہلے ارواح خیر کی پرستش کی جاتی تھی جو کثیر التعداد تھیں۔ زردشت نے ان ارواح کو ایک خدا میں جمع کر کے توحید قائم کر دی۔ ا کا نام "اہورا مزدا" تھا۔ یہی کچھ انھوں نے بدی کی قوتوں کے متعلق کہا یعنی ان کو بھی انھوں نے ایک واحد چیز یعنی "دروج اہرمن" عصر کر دیا۔ اس طرح ان کے جدید مذہب میں صرف دو قوتیں باقی رہ گئیں۔ قوتِ خیر اور قوتِ شر۔

زردشت کی کتاب مقدس کا نام "افستا" (AVESTA) ہے جس کی ایک شرح ہے جس کا نام "زندافست" ہے۔ مسعودی نے کہا۔ اس کتاب کا نام "الابستا" ہے، جسے معرب بناتے وقت ایک قاف بڑھا لیا جاتا اور "الابستاق"[۵] کہا جاتا ہے۔ اسکی سورتوں کی تعداد اکیس۔ ہر سورت دو سو اوراق میں آئی ہے۔ یہ پرانی فارسی زبان میں لکھی ہوئی ہے جس کے معنی آج کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اس کی چند سورتیں موجود وفا تر جمہ کر کے منتقل کر لی گئی ہیں جو آج زردشتیوں کے پاس ہوتی ہیں اور جنھیں وہ اپنی نمازوں میں پڑھتے ہیں۔ کچھ سورتوں میں مبدا، عالم اور منتہ یا کے متعلق خبریں ہیں اور کچھ میں نصائح ہیں۔

افستا کی اصل اور اس کی سورتوں کے مصنفین کا سوال محققین میں ہمیشہ محل نزاع رہا جیسا کہ خود زردشت کی شخصیت محل نزاع بنی ر ستا، دولت ساسانیہ میں اکیس سورتوں پر مشتمل ہوتی تھی مگر آج ہمارے زمانے میں سوائے ایک مکمل سورت اور مختلف سورتوں کی منفرد

---

۵ یار کے ساتھ ہی نقل کیا گیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ایستاق" کی یا تصحیف ہے جو در اصل با ہے کیونکہ فارسی لغت میں فا کو ے بدل لیتے ہیں۔ لہذا اس کی صحیح کتابت "ابستاق" ہوگی۔

ت کے اور کچھ نہیں ملتا۔ جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ چند دینی شعائر و رسوم سے متعلق حصوں اور معابد زردشتیہ کے قوانین پر مشتمل ہے۔

مسلمانوں نے فتح کے بعد ان کے ساتھ اہل کتاب کا سا معاملہ کیا اور ان کی کتاب کو انھوں نے آسمانی کتاب کی طرح ہی شمار کیا ہے حضرت عمرؓ طرزِ عمل اسی کے مطابق رہا کیونکہ ان کے سامنے یہ حدیث نقل کی گئی تھی کہ ان کے ساتھ اہل کتاب کا سا معاملہ کرو۔ الخ۔

ان کی تعلیمات میں سے مشہور یہ ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اس دنیا کی دو اصل اور دو آلہ ہیں۔ خیر کی اصل "اہورا" یا "اہورا مزدا" ہے اور شر کی اصل ہرمن"[1] ہے اور یہ دونوں دائمی نزاع میں مشغول رہتے ہیں۔ ان دونوں اصلوں کو تخلیق کی قدرت حاصل ہے۔ چنانچہ خیر کی اصل نور ہے جس ، وہ تمام چیزیں پیدا کی ہیں جو خوشنما، خیر اور سودمند ہیں۔ اس نے نظام حق، نور، چوکیداری کا کتا، اور مرغ وغیرہ ایسے جانور جو فائدہ مند ہیں پیدا ئے۔ اور مومن کے ذمہ ضروری ہے کہ ان کے ساتھ عنایت کا برتاؤ کرے۔ شر کی اصل تاریکی ہے اور دنیا میں جتنی چیزیں شر ہیں اسی نے پیدا کی ہیں۔ ن نے درندہ جانوروں، سانپوں، اژدہوں، حشرات الارض اور ہوام کو پیدا کیا اور مومن پر فرض ہے کہ جہاں انھیں پائے قتل کر دے۔ ان ونوں روحوں کے درمیان جنگ برپا ہے جس میں کبھی ایک روح کو فتح حاصل ہو جاتی ہے اور کبھی دوسری کو لیکن آخری کامیابی خیر کی روح کو صل ہوگی۔ اس جنگ میں لوگ دونوں روحوں کی طرف بٹ جاتے ہیں۔ کچھ لوگ "اہورا" کی مدد کرتے ہیں اور کچھ لوگ "اہرمن" کی۔ یہ دونوں روحیں اتِ خود جنگ نہیں کرتیں بلکہ اپنی مخلوقات کے ذریعہ سے جنگ کرتی رہتی ہیں۔

انسان، ان دونوں روحوں کے درمیان محلِ نزاع بنا ہوا ہے۔ کیونکہ انسان کو "مزدا" نے پیدا کیا تھا لیکن اس نے اس کو ارادہ کے اعتبار سے زاد اور مختار پیدا کیا تھا۔ لہٰذا اسے یہ بھی قدرت تھی کہ وہ شریر قوتوں کے سامنے جھک جائے۔ انسان کو اسکی زندگی میں دونوں قوتیں اپنی طرف کھینچتی رہتی ہیں۔ ان میں سے جو شخص دینِ حق کا حلقہ بگوش ہو جاتا اور نیک کام کرتا ہے اور اپنے نفس اور بدن کو پاک رکھتا ہے وہ شر کی روح کو ذلیل کر دیتا ہے اور بھلائی کی روح کی امداد کرتا ہے اور اس طرح "مزدا" کی طرف سے ثواب کا مستحق ہوتا ہے ورنہ وہ شر کی روح کو قوت دیتا اور "مزدا" کو اپنے اوپر ناراض کر لیتا ہے۔

اس مذہب کے اہم ترین مبادی میں سے یہ امر بھی ہے کہ انسان کا شریف ترین پیشہ زراعت اور جانوروں کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ لہٰذا اس نے انسان کیلئے زراعت کو اور اپنے جانوروں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کو، نیز سعی و عمل کی زندگی گذارنے کو محبوب ترین مشغلہ بنا دیا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اپنے متبعین پر روزہ رکھنے کو حرام قرار دیدیا تھا کیونکہ اس سے انسان کے عملی قویٰ میں ضعف پیدا ہوتا تھا اور وہ انھیں قوی، تندرست اور کارکردگی میں مشغول دیکھنا چاہتا تھا۔

انھوں نے یہ تعلیم بھی دی تھی کہ پانی، ہوا، آگ اور مٹی پاک عناصر ہیں جن کا ناپاک ہونا جائز نہیں ہو سکتا۔ اسی کے مظاہر میں سے آگ کو مقدس قرار دیتا اور ایک رمزِ خداوندی بنا لینا تھا۔ ایسے ہی اس نے جاری پانی کو ناپاک کر دینا اور مردوں کو زمین میں دفن کرنا حرام قرار دیا تھا۔ وغیرہ ذلک۔

انسان کی دو قسم کی زندگیاں ہوتی ہیں، حیاتِ اولیٰ دنیا میں ہوتی ہے اور حیاتِ اُخریٰ موت کے بعد حیاتِ آخرت میں اس کا حصہ دراصل حیاتِ اولیٰ کے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے یہ تمام اعمال ایک کتاب میں نمبروار درج کئے جاتے ہیں۔ نیز اس کی برائیاں اور

---

[1] خیر کے خدا کو یزداں بھی کہتے ہیں چنانچہ ابو العلاء معری نے اپنے اشعار میں یزداں اور اہرمن ہی نقل کیا ہے۔

بداعمالیاں ایک دوسرے دفتر میں درج کی جاتی ہیں۔ موت کے بعد تین دن تک انسانی روح اپنے جسم کے اوپر منڈلاتی رہتی ہے اور اپنے دنیوی اعمال کے مطابق راحت و آرام یا شقاوت و بدبختی حاصل کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تین دنوں میں نفس کو مانوس کرنے کیلئے خاص دینی شعائر ادا کئے جاتے ہیں۔ حساب و کتاب کے بعد یہ روح ایک پل کے اوپر سے گذریگی جو جہنم کے دہانہ پر لگایا جائیگا۔ یہ مومن کیلئے تو چوڑا ہوگا جس پر اسے گذرنا آسان ہوگا لیکن کافر کیلئے یہ بال سے زیادہ باریک ہوگا۔ جو لوگ مومن ہوں گے اور نیک کام کریں گے وہ سلامتی کے ساتھ اس پل پر سے گذر جائیں گے اور "اہورا" سے ملیں گے جو انھیں خوش آمدید کہیگا اور بڑی عمدہ جگہ میں انھیں اتاریگا اور جو بدکار ہوں گے وہ جہنم میں گر جائیں گے اور "اہرمن" کے غلام بن جائیں گے۔ جن لوگوں کی نیکیاں اور بدیاں برابر سرابر ہوں گی تو ان کی روح "اعراف" میں چلی جائیگی جہاں وہ فیصلہ ہو جانیکے دن تک مقیم رہے گی۔

چنانچہ خدا نے انسان کیلئے اس کے مرنے کے بعد کی زندگی کے لئے تیار کر رکھا ہے وہ اس کی حیاتِ دنیوی میں اس کی نگاہوں سے مستور کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ خیر و شر میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ یہ خدا کی رحمت ہے کہ وہ اپنا رسول بھیجکر لوگوں کو ہدایت دیتا ہے۔ زردشتی اساطیر میں یہ بھی ہے کہ نبوت سب سے پہلے جمشید (شہنشاہِ فارس) پر نازل ہوئی تھی لیکن وہ اس بار کو اٹھا نہیں سکا چنانچہ زردشت نے اس بار کو اٹھایا چنانچہ خدا ان سے براہِ راست کلام فرماتا اور ان پر وحی نازل کرتا تھا۔

زردشت کی یہ بھی تعلیم ہے کہ قیامت کا دن قریب ہے اور اس زندگی کی انتہا کچھ زیادہ دور نہیں ہے عنقریب "مزدا" اپنی قوتوں کو جمع کر کے شر کے دیوتا کو فیصلہ کن شکست دیگا اور اسے اور اس کے پیروکاروں کو جہنم میں عذاب دیگا۔

فلسفۂ زردشت ان دینی تعلیمات کے پہلو بہ پہلو دینِ زردشتی میں ماوراءِ مادہ کے متعلق بھی بحثیں ملتی ہیں۔ لیکن ان کی بحث اس موضوع پر ایسی مکمل نہیں ہے جیسا کہ یونانیوں کے ہاں مکمل ملتی ہے بلکہ ایک جزئی سی بحث ہے جو منتشر طور پر ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بحثوں میں وہی خصوصیت ملتی ہے جو عربوں کے ہاں اسلام کے بعد ملتی ہے۔ یعنی ماوراءِ مادہ سے متعلق اپنی ان بحثوں کو دین کے ساتھ خلط کر دینا اور دونوں میں تطبیق دینے کی کوشش کرنا۔ انھوں نے اس موضوع پر کوئی الگ مستقل بحث نہیں کی جیسا کہ یونانیوں نے کی ہے۔

ان کی فلسفیانہ ابحاث میں سے ایک نفس کی بحث بھی ہے۔ دینِ زردشتی کی رائے میں نفسِ انسانی کو خدا نے عدم سے پیدا کیا ہے اور وہ حیاتِ ابدیہ سعیدہ حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ حیاتِ ارضی میں شر اور بدی سے جنگ کرتا رہا ہو۔ خدا نے اسے حریتِ ارادہ عطا فرمائی ہے۔ لہٰذا وہ خیر کو بھی اختیار کر سکتا ہے اور شر کو بھی۔ نیز یہ بھی کہ نفسِ انسانی کو مختلف قوتیں حاصل ہیں۔ (۱) ضمیر یا وجدان (۲) قوتِ حیات (۳) قوتِ حسیہ (۴) قوتِ روحانیہ (۵) قوتِ واقیہ یعنی قوتِ حافظہ وغیرہ۔

اس کے بعد یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ کیا دینِ زردشتی ایک ثنوی دین ہے؟ یعنی کیا ان کی رائے میں کائنات پر دو خدا حکومت کر رہے ہیں۔ ایک الٰہ خیر اور دوسرا الٰہ شر۔ اور ہر خدا کی اپنی مستقل ہستی ہے؟ یا کیا یہ دین توحید کا قائل ہے اور اس کی رائے میں کائنات پر صرف ایک ہی الٰہ حکمران ہے۔ اور یہ کہ کیا کائنات میں جو کچھ خیر اور شر پایا جاتا ہے اور ان دونوں قوتوں میں جو تنازع چلا آرہا ہے وہ درحقیقت ایک ہی الٰہ کے دو مظہر یا اس کے دو متضاد اثرات ہیں؟ محققین نے اس سوال کے جواب میں اختلاف کیا ہے۔ اکثر کی رائے تو یہی ہے

ثنوی دین ہے جیسا کہ زردشت کے ظاہر کلام سے متبادر ہوتا ہے۔ اسی رائے کی طرف بعض انگریز مصنفین کا بھی رجحان ہے۔ چنانچہ دائرۃ المعارف بریطانیہ (انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا) کے مصنف نے "زردشت" کے بارہ میں یہی کچھ لکھا ہے۔ لیکن بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ زردشت موحد ہیں۔ چنانچہ شہرستانی اور قلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں اور ان کے علاوہ کچھ دوسرے لوگوں نے بھی اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ پروفیسر ہوج (HAUG) فرماتے ہیں کہ زردشت لاہوتی اعتبار سے موحد ہیں اور فلسفی اعتبار سے ثنوی ہیں۔ غالباً ان کی اس بات کا مطلب یہ ہے کہ عقیدۂ دینی کے اعتبار سے تو ان کی رائے یہ ہے کہ کائنات کا آلہ ایک ہی ہے۔ لیکن جب وہ کائنات کے فلسفہ کی شرح کرتے ہیں اور کائنات کے خیر و شر سے گفتگو اور بحث کرتے ہیں کہ وہ کس طرح ایک دوسرے کو پیچھے ڈال رہے ہیں تو وہ اس اعتبار سے ثنوی بن جاتے ہیں اور ان کی رائے یہ ہو جاتی ہے کہ اس کائنات میں درحقیقت دو قوتیں کارفرما ہیں جن کا یہاں سکہ چل رہا ہے۔ . . . .

ان کے مذہب کو پڑھ لینے کے بعد غالباً آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ مسلمانوں میں ان کی تعلیمات نے کتنا بڑا اثر کیا ہے۔ مذاہب دینیہ پر گفتگو کرتے ہوئے ہم آگے اس کی وضاحت کریں گے۔ مگر اجمالی طور پر ہمیں یہاں اتنا تو بیان کر دینا ہی چاہئے کہ پل صراط کے بارہ میں عام مسلمانوں کا عقیدہ اسی طریقہ کا ہے جسے زردشت نے نقل کیا ہے، ایسے ہی اس طور پر اعراف کے متعلق عقیدہ اور جسم کے اوپر مرنے کے بعد روح کا تین دن تک منڈلاتے رہنے کا خیال اور اسی وجہ سے تیجے تک خاص خاص رسوم کی ادائیگی۔ یہ تمام عقائد زردشتی عقائد سے مکمل مشابہت رکھتے ہیں۔ ایسے ہی جبر و اختیار کے بارہ میں معتزلہ کی بحثیں اور نفس کی اقسام کے متعلق صوفیہ کے بیانات یہ سب کچھ دین زردشتی سے لیا گیا ہے اس موضوع سے ہم اس کے محل میں دوبارہ بھی گفتگو کریں گے۔

ب۔ مانی اور مانویت دینی مذاہب میں سے مشہور ترین مذہب —— جس کے متبعین بھی بکثرت تھے —— مانویت تھا۔ مانی —— اس دین کا بانی —— جیسا کہ البیرونی نے اپنی کتاب، الآثار الباقیہ میں لکھا ہے ۲۱۵ء یا ۲۱۶ء پیدا ہوا۔ اور سخت مخالفتوں کے علی الرغم اس کا دین ساتویں صدی ہجری یا تیرہویں صدی عیسوی تک زندہ تھا۔ اور ایشیا اور یورپ میں اس کے متبعین بکثرت موجود تھے۔ دینی آراء میں بھی اس کا کافی اثر پایا جاتا تھا۔ اس کی تعلیمات دراصل نصرانیت اور زردشتیت کا مجموعہ تھیں۔ —— جیسا کہ پروفیسر براؤن کا کہنا ہے —— زردشتی رنگ میں رنگی ہوئی نصرانیت کے بجائے نصرانیت کے رنگ میں رنگی ہوئی زردشتیت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اس کے متعلق معلومات کا سرچشمہ عربی اور یورپین کتابیں ہیں۔ براؤن نے عربی سرچشموں کی توثیق کی ہے اور انہیں صحت سے قریب تر قرار دیا ہے۔ عربی سرچشموں میں سے ابن حزم کی "الفصل فی الملل والنحل" اور شہرستانی کی "الملل والنحل" ابن الندیم کی "الفہرست" یعقوبی کی "التاریخ" البیرونی کی "الآثار الباقیہ" اور ابن نباتہ کی "شرح العیون" وغیرہ کتابیں ہیں۔

اس کے مذہب[1] کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا —— جیسا کہ زردشت نے کہا تھا —— دو اصلوں سے پیدا ہوئی ہے —— نور اور ظلمت۔ نور سے ہر بھلی چیز پیدا ہوئی اور تاریکی سے ہر بری چیز پیدا ہوئی۔ نور کو شر پر قدرت حاصل نہیں اور ظلمت کو خیر پر کوئی قدرت حاصل نہیں۔ انسان سے جو خیر سرزد ہوتی ہے اس کا سرچشمہ خیر کا خدا ہے اور جو شر صادر ہوتا ہے اس کا سرچشمہ شر کا خدا ہے۔ اگر انسان رحمت و شفقت کی نظر سے دیکھتا ہے تو یہ نظر خیر اور نور کی نظر ہوتی ہے اور اگر قساوت اور سنگدلی کی نظر سے دیکھتا ہے تو یہ شر اور ظلمت کی نگاہ ہوتی ہے۔

ایسے ہی تمام حواس کا حال ہے۔ اس دنیا میں خیر اور شر کا مکمل امتزاج ہو چکا ہے۔ مانی اور اس کے اصحاب نے اس امتزاج کی کیفیت کے بارہ میں وہ وہ باتیں کہی ہیں جنھیں خرافات کے نام سے یاد کرنا زیادہ صحیح ہوگا۔

اس بارہ میں وہ زیادہ تر زردشت کی تعلیمات سے باہر نہیں جاتا۔ جب کہ آپ خود دیکھ رہے ہیں —— لیکن امر جو ہری وہ زردشت کے خلاف چلا جاتا ہے یعنی زردشت کی یہ رائے تھی کہ موجودہ دنیا عالم خیر ہے۔ کیونکہ اس میں شر کے اوپر خیر کی فتح یا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ جبکہ مانی کی یہ رائے ہے کہ خیر و شر کا یہ امتزاج خود ایک شر ہے جس سے چھٹکارا حاصل کرنا واجب ہے۔ زردشت کی رائے یہ تھی کہ انسان کو طبعی زندگی گذارنی چاہیے لہٰذا شادی کرنا، اولاد پیدا کرنا، کھیتی باڑی کرنا، جانوروں اور ان کی نسل کی خبرگیری کرنا، اپنے بدن کو طاقتور بنانا حتی کہ روزے نہ رکھنا ضروری ہے۔ انسان اس قسم کی زندگی گذار کر شر کے دیوتا کے خلاف خیر کے دیوتا کی مدد کرتا ہے۔ لیکن مانی قطعاً ایک دوسرا ہی راستہ پیدا کرتا ہے جو رہبانیت سے زیادہ قریب ہے۔ مانی —— جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے —— حران میں ایک راہب تھا۔ اس کی رائے یہ ہے کہ اس دنیا میں نور کا ظلمت کے ساتھ امتزاج ایک شر ہے۔ چنانچہ اس نے نکاح کرنے کو حرام قرار دیا ہے تاکہ فنا جلد سے جلد آسکے۔ اس نے زہد کی دعوت دی اور ہمیشہ ہر ماہ سات دن کے روزے فرض کئے۔ بہت سی نمازیں فرض کیں۔ آدمی کھڑا ہو۔ وضو کرے اور آفتاب کی طرف منہ کرکے کھڑا ہو جائے۔ پھر کھڑا ہوا سجدہ کرے اور اسی طرح کرتا رہے تا آنکہ بارہ سجدے ہو جائیں۔ ہر سجدہ میں خاص دعائیں پڑھے۔ اس نے اپنے متبعین کو جانور ذبح کرنے سے منع کیا ہے کیونکہ اس میں جانوروں کو تکلیف دینا ہے۔ اس نے حضرت عیسیٰؑ اور زردشت دونوں کی نبوت کا اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ (یعنی مانی) وہی نبی ہے جس کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔

کہتے ہیں کہ ہرمز —— شہنشاہ ایران —— نے اس کے مذہب کی حلقہ بگوشی قبول کر لی تھی اور اس مذہب کی بہت تائید کی تھی چنانچہ اس کے بعد لوگ بکثرت اس کے دین میں داخل ہونے لگے لیکن جب ہرمز مر گیا اور بہرام اول اس کا جانشین ہوا تو وہ اس کی تعلیمات کی طرف مائل نہیں ہو سکا اور نہ وہ اسے پسند آئیں۔ اس نے مانی کو قتل کر دیا اور اس کے متبعین کو منتشر کر دیا۔ لیکن اس کی تعلیمات مر نہیں سکیں اور اس کے دین کے امام یکے بعد دیگرے پیدا ہوتے رہے۔ امام کا مرکز ابتداً بابل تھا پھر سمرقند منتقل ہو گیا۔ ابن الندیم نے کہا ہے کہ جب اہل فارس کی مملکت تتر بتر ہو گئی اور عربوں کی حکومت کو استحکام حاصل ہوتا گیا تو مانوی مذہب کے پیرو اپنے شہروں میں واپس آ کر رہنے لگے۔ خصوصاً ایرانی مملکت کے آخری آزمائشی دور اور سلاطین بنو امیہ کے دور حکومت میں ان کی واپسی بہت تیز ہو گئی۔ بالآخر مقتدر کے دور حکومت میں یہ لوگ فارس سے پھر بھاگے اور اپنی جانوں کے خوف سے خراساں کی طرف روپوش ہو گئے۔ جو بچے کھچے لوگ رہ گئے انھوں نے اپنی مانویت کو چھپایا اور بظاہر مسلمان بن کر اسلامی مقامات میں مقیم رہے۔ خود بغداد میں معز الدولہ کے زمانہ میں تقریباً تین سو آدمیوں کو میں پہچانتا تھا کہ وہ مانویت کے متبع ہیں لیکن آج ہمارے وقت میں پانچ نفوس بھی کہیں نظر نہیں آتے۔ اس کے بعد ابن الندیم نے ان کے کچھ رؤساء کے نام گنوائے ہیں جو بظاہر مسلمان بنے ہوئے تھے مگر بباطن زندیق تھے۔ چنانچہ ابن الندیم نے جعد بن درہم مروان بن محمد (بنو امیہ کا آخری خلیفہ) کا مؤدب تھا انہی لوگوں میں سے شمار کیا ہے۔ علاوہ ازیں خالد بن عبداللہ القسری بھی

ا ظ سے زندیق تھا۔ ایسے ہی صالح بن عبدالقدوس، بشار بن برد، مسلم الخاسر وغیرہ بھی۔ ابن الندیم کا بیان ہے کہ "برامکہ میں سوائے
ن خالد بن برمک کے سب کے سب زندقہ کے ساتھ متہم کئے جاتے تھے۔ اس مذہب کے لوگوں کی تحریرات میں تو یہں نے یہاں تک
ا ہے کہ مامون رشید بھی ان ہی میں سے تھا لیکن یہ ان لوگوں کا صریح جھوٹ ہے۔ بہر حال آجکل ان لوگوں کی ریاست سمرقند میں ہے"۔

یہ مذہب یورپ میں بھی جنوبی فرانس تک پھیلا۔ چنانچہ لوگوں کا بیان ہے کہ سینٹ (AUGUSTINE) عرصہ دراز تک مانوی مذہب
یروکار رہا ہے اس کے بعد اس نے نصرانیت کو اختیار کر لیا تھا۔

مسلمانوں میں علم کلام کا کافی بڑا حصہ ان کی تعلیمات سے متعلق ہے متکلمین ان کی آراء کو ذکر کرتے ہیں اور پھر ان کا رد کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں
مذہب کے متبعین نے بہت سے مسائل کھڑے کر دیئے ہیں۔ مثلاً معاد کی بحث کہ کیا وہ اجسام کے ساتھ ہوگا یا محض ارواح کے ساتھ
ا۔ آگے چل کر خود مسلمان اس بحث میں الجھ گئے اور مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔

یہاں دو مسائل قابل بحث ہیں۔

(۱) اسلام سے پہلے بھی اور اسلام میں بھی مانویت تختۂ مشق ستم کیوں بنی رہی؟
ں کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں۔ بہرام کو جس چیز نے مانی اور اس کے اصحاب کے قتل پر برانگیختہ کیا وہ عملی نقطۂ نظر تھا۔ زردشت عمل کی
ف دعوت دیتا تھا۔ اسکی تعلیمات قومیت اور جنگی رجحانات کی مؤید تھیں جو اس زمانہ کے ایرانی ذوق کے مطابق تھیں۔ مانی کی تعلیمات
کے بالکل برعکس تھیں۔ وہ زہد اور زندگی کی لذات سے نفرت اور جلد از جلد فنا کیلئے آنکی طرف میلان رکھتی تھیں۔ یہ تعلیمات ——
شبہ نہیں —— فارس جیسی جنگجو مملکت کیلئے انتہائی خطرہ کا باعث تھیں۔ اسکی تائید "الآثار الباقیہ" کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ
نے کہا تھا "یہ شخص دنیا کی تخریب کی دعوت دینے کیلئے نکلا ہے۔ اس سے پہلے کہ اسکی کوئی مراد پوری ہو سکے ضروری ہے کہ ہم خود اسی کی
ب کا سامان بہم پہنچا دیں"۔ اس پر اتنا اضافہ اور کر لو کہ یہ لوگ —— جیسا کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے —— اپنے دین کی طرف دعوت
میں بڑی جد و جہد سے کام لیتے تھے۔ اسلام یا نصرانیت کے لبادہ میں چھپ چھپ کر دعوت کی سہولتیں حاصل کرتے تھے اور مخالفت سے
ن ہو کر اپنا کام کرتے رہتے تھے۔

(۲) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ "زندقہ" کا لفظ عموماً مانی کے متبعین کیلئے استعمال کیا جاتا ہے تو کیا یہ لفظ ان کے ساتھ خاص ہے؟
ابن الندیم کی عبارتوں سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "زنادقہ" کا لفظ مانی کے اصحاب اور اس کے مذہب کے حلقہ بگوش لوگوں کیلئے
یا جاتا تھا یعنی یہ کوئی عام کلمہ نہیں تھا جو ہر کافر اور ملحد پر بول دیا جاتا ہو۔ خیاط معتزلی کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی کتاب "الانتصار" میں
س لفظ کو کسی خاص فرقہ پر دلالت کرنے کیلئے یہود و نصاریٰ کے ساتھ ساتھ استعمال کرتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ "ابن الراوندی کا بیان
ہے کہ ثمامہ نے بیان کیا کہ اکثر یہود و نصاریٰ اور مجوس اور زنادقہ اور دہریہ قیامت میں مٹی ہو جائیں گے اور جنت میں داخل نہیں ہونگے
. . . . . الخ خیاط نے اس لفظ کو اپنی کتاب میں تقریباً پانچ مرتبہ استعمال کیا ہے اور اسی طرح کی تعبیر میں وہ اس
ہے۔

ابن قتیبہ اپنی کتاب "المعارف" میں جاہلیت میں عرب کے ادیان پر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں "نصرانیت ربیعہ اور غسان اور کچھ قضاعہ کے خاندان میں تھی، یہودیت، حمیر، بنو کنانہ، بنو حارث بن کعب اور کندہ میں تھی، مجوسیت تمیم میں تھی، چنانچہ ان میں سے زرارہ، حاجب بن زرارہ اور اقرع بن حابس مجوسی تھے۔ زندقہ قریش میں تھا جسے ان لوگوں نے حیرہ والوں سے لیا تھا" ابن قتیبہ کی اس تعبیر سے ظاہر ہے کہ زندقہ سے مراد اہلِ فارس کے ادیان میں سے کوئی خاص دین ہے کیونکہ اس کے بعد وہ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ زندقہ کو قریش نے حیرہ والوں سے لیا تھا۔ حیرہ ——— جیسا کہ تمہیں معلوم ہے ——— اہلِ فارس کے اقتدارِ حکومت میں تھا۔ جوہری نے بھی صحاح میں اسی کے قریب قریب کہا ہے کہ "زندیق بت پرستوں میں سے ایک فرقہ ہوتا ہے یہ لفظ معرب ہے اس کی جمع زنادقہ ہوتی ہے۔ قَدْ تَزَنْدَقَ فعل آتا ہے اور زَنْدَقَۃٌ اسم ہے۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ زندقہ، نصرانیت اور یہودیت کی طرح کوئی خاص مذہب ہے اور علی العموم الحاد کے معنی میں اس کا استعمال کرنا ایک نوپیدا شدہ معنی ہیں جو بعد میں پیدا ہو گئے ہیں۔ لسان العرب میں ہے کہ "زندیق، بقاءِ دہر کے قائل کو کہتے ہیں یہ دراصل فارسی لفظ ہے اور "زندگر" کا معرب ہے یعنی بقاءِ دہر کا قائل"۔ احمد بن یحییٰ نے کہا ہے کہ کلام عرب میں زندیق کا لفظ نہیں تھا۔ اس (زندیق) کے مفہوم کو ادا کرنے کیلئے اہل عرب مُلْحِدٌ اور دُہرِیٌّ کے الفاظ بولتے تھے" لیکن کیا یہ لفظ ہر بت پرست قوم پر بولا جاتا ہے یا بت پرستوں کے کسی خاص مذہب مثلاً صرف مانویت پر بولا جاتا ہے؟ تو ابن قتیبہ کے کلام سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لفظ کسی خاص مذہب پر ہی بولا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے کلام میں اس کے بالمقابل مجوسی کا لفظ لائے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے کہا ہے کہ بنو تمیم مجوسی بن گئے تھے اور قریش زندیق بن گئے تھے۔ اگر زندقہ سے ان کی مراد علی العموم بت پرستی ہوتی تو اس جگہ اس مقابلہ کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ صحاح میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ جوہری نے کہا ہے کہ "زندیق بت پرستوں میں سے ہوتے ہیں۔ انھوں نے یوں نہیں کہا کہ زندیق بت پرست ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا یہ لفظ صرف مانویت ہی پر بولا جاتا ہے؟ آلوسی نے ابن الکمال سے نقل کیا ہے کہ یہ لفظ مزدکیت پر بولا جاتا ہے اور مزدک نے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا نام "زند" تھا اور مزدکیت، مانویت سے الگ کوئی مذہب ہے"۔ مگر یہ بیان غلط ہے کیونکہ مزدک نے "زند" نام سے کتاب نہیں لکھی۔ یہ دراصل "افستا" کی شرح کا نام ہے جو زردشت کی کتاب ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ دراصل "زندیق" فارسی زبان میں اس شخص کو کہتے ہیں جو "زند" کا اتباع کرتا ہو۔ اس کے بعد اس کا اطلاق مانویت پر کیا جانے لگا کیونکہ یہ لوگ بھی زند وغیرہ کتب مقدسہ کو مانتے ہیں اور تاویل کے طریقہ سے ان کی شرح اپنے مذہب کے مطابق کر لیتے ہیں۔ استاذ "بیقان" کہتے ہیں کہ الفہرست اور البیرونی کے کلام سے ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ مانوی مذہب کے پیرو "سماعین" کا لفظ ان لوگوں پر بولتے ہیں جو مانویت کے بلند ترین درجہ تک فائز نہیں ہو سکے۔ یہ لوگ ان تمام واجبات کو جسے یہ دین فرض قرار دیتا ہے مثلاً رہبانیت اور زہد وغیرہ کو بالالتزام ادا نہیں کرتے۔ اور ان کے مقابلہ میں "صدیقون" کا لفظ ان ترقی یافتہ لوگوں کے لئے بولا جاتا ہے جو بالالتزام ان تمام واجبات کو ادا کرتے ہیں۔ یہ لوگ مالداری پر فقر کو فضیلت دیتے ہیں۔ دنیا اور دنیوی ماحول سے گریز کرتے ہیں۔ صدّیق عربی لفظ ہے لیکن اس کی آرامی اصل موجود ہے۔ یعنی صدیقی (SADDIQAI) اہل فارس نے اس لفظ کو لیا اور زندیق بنا لیا۔ انھوں نے

ودال کی جگہ نون اور دال رکھ دیا جیسا کہ سَبَّاذ (SABBATH) کو یہ لوگ شنباذ (SHAN BATH) کہتے ہیں۔ ان کے
ی بنا پر یہ لفظ مانویت کی ایک خاص جماعت کیلئے تھا۔ پھر اس کا استعمال تمام مانویت پر ہونے لگا اور اس کے بعد علی العموم الحاد کے
یں مستعمل ہونے لگا۔ جیسا کہ امام ابو یوسفؒ سے نقل کیا جاتا ہے کہ وہ فرماتے تھے "تین آدمی تین چیزوں سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔
یم کی پیروی کرتا ہے وہ زندقے سے نہیں بچ سکتا۔ جو کیمیا کی تلاش کرتا ہے وہ فقر سے نہیں بچ سکتا اور جو عجیب و غریب حدیثیں تلاش
ہے وہ جھوٹ سے نہیں بچ سکتا۔ ؎۲

ج۔ مزدک سنہ ۴۸۷ء کے لگ بھگ فارس میں مزدک کا ظہور ہوا۔ طبری کہتا ہے کہ یہ نیشاپور کے رہنے والے تھے اور اس نے ایک
نئے ثنوی (دو خداؤں کے قائل) مذہب کی طرف دعوت دی۔ یہ بھی نور او ظلمت کے قائل تھے لیکن ان کا سب سے
بہ الامتیاز ان کی اشتراکی تعلیمات ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ تمام انسان پیدائشی اعتبار سے مساوی ہیں لہذا انھیں مساویانہ طور پر
ندگی بھی گذارنی چاہیئے۔ جن چیزوں میں سب سے زیادہ مساوات برتنی ضروری ہے وہ مال اور عورتیں ہیں۔ شہرستانی کا بیان ہے
دک لوگوں کو ایک دوسرے کی مخالفت کرنے، آپس میں بغض و حسد رکھنے اور لڑنے سے منع کرتے تھے۔ چونکہ اکثر یہ مخالفت اور بغض و
عورتوں اور اموال کی وجہ سے ہوتی ہے اس لئے انھوں نے عورتوں کو حلال اور اموال کو مباح قرار دے دیا تھا اور لوگوں کو ان
طرح شریک کر دیا تھا جیسا کہ وہ پانی، آگ اور گھاس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ طبری کا بیان ہے کہ "مزدک اور ان کے ساتھی
ہ کہ خدا نے زمین میں رزق اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ بندے اس رزق کو مساوی طور پر ہمدردانہ تقسیم کر لیں۔ لیکن لوگوں نے ایک
پر ظلم کرنا شروع کر دیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ مالداروں سے فقیروں کیلئے مال وصول کرتے ہیں اور دولت مندوں سے
ریبوں تقسیم کرتے ہیں۔ اور جس کسی کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ مال، عورتیں اور سامانِ تنعم موجود ہے وہ اس کا دوسروں سے زیادہ
ہیں ہے۔ کمینہ لوگوں نے ان تعلیمات کو آڑ بنا لیا اور غنیمت سمجھا۔ یہ لوگ مزدک اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ مل گئے اور تمام ملک
لاء میں گرفتار ہو گیا۔ ان کی قوت بڑھتی گئی حتی کہ یہ لوگ کسی کے گھر میں گھس جاتے اور اس کے مکان، عورتوں اور اموال پر قبضہ
قباذ کو بھی انھوں نے ان تعلیمات کا گرویدہ بنا لیا اور اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے ان کا ساتھ نہ دیا تو وہ اسے معزول کر دیں گے۔
صہ کے بعد حالت یہ ہو گئی کہ کوئی شخص اپنے بچہ کو نہیں پہچانتا تھا اور کوئی بچہ اپنے باپ کو نہیں پہچانتا تھا اور کسی کے پاس اتنا
وہ فراغبالی کی زندگی گذار سکے" طبری دوسرے مقام پر کہتے ہیں کہ مزدک نے جس امر کا لوگوں کو حکم دیا اور گرویدہ بنایا اور جس
نگیختہ کیا وہ اموال اور بیویوں میں مساوات کا نظریہ تھا۔ مزدک کہتے تھے کہ یہی وہ نیکی ہے جسے خدا پسند فرماتا ہے اور جس پر بہترین
بیتا ہے۔ اگر یہ امر جس پر وہ انھیں برانگیختہ کر رہے ہیں دین میں سے نہ بھی ہو تب بھی یہ شرافتِ کردار اور باہمی تراضی اور مساوات
ب تو ہے ہی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ" ؎۳

س سے ہمیں نظر آجاتا ہے کہ مزدک کی اشتراکی تعلیمات دنیا کی قدیم ترین اشتراکی تعلیمات میں سے ہیں۔ استاد "نولڈکہ" کہتے

فظہ ہو "براؤن" ——— ؎۲ العقد الفرید ج ۱ ص ۱۹۹ ——— ؎۳ تاریخ طبری ج ۲ ص ۸۵ و ما بعد۔

بلکہ "جو چیز مزدک کو جدید اشتراکیت سے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا دینی رنگ ہے جس میں انھوں نے اپنی تعلیمات کو رنگ لیا تھا۔"
اس کے علاوہ کچھ دوسری روحانی تعلیمات بھی تھیں۔ وہ قناعت اور زہد کی تعلیم دیتے تھے اور حیوانوں کو حرام قرار دیتے تھے کہ ان کو ذبح کرنا چاہیئے۔

ہزار ہا لوگوں نے ان کا مذہب قبول کر لیا۔ لیکن قباذ نے ان کو اور ان کے متبعین کو قتل کر دیا اور ان کے لئے ایک مذبح بنانے کی ترکیب اور ۵۲۳ء کے لگ بھگ قریب قریب ان کا استیصال ہی کر دیا۔

اس کے باوجود کچھ لوگ ان کے مذہب کی پیروی کرتے رہے حتیٰ کہ اسلام کے بعد بھی اصطخری اور ابن حوقل نے بیان کیا ہے کہ کرمان کے بعض دیہاتی دولت امویہ کے عہد تک مزدکیت کے پیرو تھے۔

صرف مالی جہت میں ہمیں ابوذر غفاری کی رائے اور مزدک کی رائے میں بڑی ہی مشابہت نظر آتی ہے۔ طبری بیان کرتے ہیں کہ ابوذرؓ شام میں کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہنا شروع کر دیا "مالدارو! فقیروں کی غمخواری کرو۔ ان لوگوں کو خوشخبری دیدو جو سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے کھلا نہیں چھوڑ دیتے کہ جہنم میں اس سونے چاندی سے ان کی پیشانیاں، پہلو اور پشتیں داغی جائیں۔" وہ یہی کچھ کرتے رہے حتیٰ کہ فقراء اور محتاج لوگ اس جیسی باتوں پر فریفتہ ہونے لگے اور مالداروں کے خلاف نفرت کے جذبات بھڑنے شروع ہوگئے حتیٰ کہ مالداروں نے شکایت کی کہ انھیں لوگوں کی طرف سے ایذائیں مل رہی ہیں۔" پھر حضرت معاویہؓ نے ابوذر غفاریؓ کو حضرت عثمانؓ کے پاس مدینہ منورہ بھیج دیا کہ کہیں وہ ان کے خلاف اہل شام کو خراب نہ کر دیں۔ جب حضرت عثمانؓ نے ابوذرؓ سے پوچھا کہ "اہل شام کو کیا ہوا، وہ تمہاری زبان درازی کی شکایتیں کرتے ہیں" تو ابوذرؓ نے جواب دیا کہ "مالداروں کو مال جمع نہیں کرنا چاہیئے۔" اس سے تم دیکھ رہے ہو کہ ان کی رائے اموال کے بارہ میں مزدک کی رائے کے بہت قریب تھی۔ سوال یہ ہے کہ یہ رائے ابوذرؓ تک کیسے پہنچی؟ طبری نے اس سوال کا جواب بھی ہم پہنچایا ہے[له]۔ وہ کہتے کہ ابن السوداء ابوذر غفاریؓ سے ملا اور انھیں ان باتوں سے برافروختہ کیا اور یہی ابن السوداء ابودرداءؓ اور عبادہ بن الصامتؓ کی خدمت میں بھی حاضر ہوا، لیکن ان دونوں نے اس کی باتیں نہیں سنیں بلکہ عبادہ نے اسے پکڑ کر امیر معاویہؓ کے پاس لیگئے اور ان سے کہا کہ بخدا یہی وہ شخص ہے جس نے ابوذر غفاریؓ کو تمہارے خلاف ورغلا دیا تھا[که]۔

ہمیں معلوم ہے کہ ابن السوداء وہ لقب ہے جو عبداللہ بن سبا کو دیا گیا تھا۔ یہ صنعاء کا ایک یہودی تھا جس نے حضرت عثمانؓ کے عہد میں اسلام ظاہر کیا اور اس کا مقصد مسلمانوں پر ان کے دین میں فساد ڈالنا تھا۔ اس نے مختلف شہروں میں اپنے بعض عقائد پھیلا دیئے جن کو ہم آئندہ بیان کریں گے۔ یہ بہت سے شہروں میں گھومتا رہا، حجاز، بصرہ، کوفہ، شام، مصر وغیرہ

له اگر فاضل مصنف اس سوال کے جواب کے لئے طبری کی بجائے قرآن کی طرف رجوع کرتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ حضرت ابوذرؓ نے یہ خیال خود قرآن ہی سے لیا تھا اور ان کے دلائل بھی قرآنی آیات ہی پر مبنی تھے۔ (طلوع اسلام)

که طبری جزء ۵ صلا۶ و مابعد۔

احتمال ہے کہ اس نے یہ نظریہ عراق یا یمن کی مزدکیت سے لیا ہو۔ اور ابوذرؓ نے اپنی اعتقادی نیک نیتی سے اسے قبول کر لیا ہو اور اسے
یہ کے رنگ میں رنگ لیا ہو جس کی طرف ان کی طبیعت کا شروع سے میلان تھا۔ کیونکہ وہ صحابہ میں متقی اور پرہیزگار ترین اور دنیا
ہد ترین شخصیت شمار کئے جاتے ہیں۔ اور وہ ان محبوب ترین شخصیتوں میں سے ہیں جنھوں نے صوفیت پر بھی بہت کافی اثر ڈالا ہے۔

اہل فارس کے دینی عقائد سے قریب تر جس کا اثر بعض مسلمانوں نے بھی قبول کیا ان کا یہ اعتقاد بھی تھا کہ وہ اپنے بادشاہوں کی
اس نگاہ سے دیکھتے تھے گویا کہ وہ کائنات الٰہیہ (کائناتی دیوتاؤں) میں سے ہیں جنھیں خدا نے لوگوں پر حکومت کرنے کیلئے منتخب فرما لیا
اور انھیں سیادت و امارت کے ساتھ ممتاز کر کے روح الٰہی کے ساتھ ان کی تائید فرمائی ہے۔ لہذا وہ زمین پر اللہ کا سایہ ہیں جسے
نے اپنے بندوں کی مصالح کے لئے قائم فرمایا ہے۔ لوگوں کے ان پر کوئی حقوق واجب نہیں ہوتے البتہ لوگوں پر بادشاہوں کا یہ حق
ب ہے کہ وہ ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کریں۔ یہ اسی قسم کا نظریہ ہے جو یورپ میں حق الٰہی (DIVINE RIGHT)
ام سے مشہور تھا۔ اور سولہویں اور سترہویں صدی میں جس کی سیادت وہاں قائم رہی۔ استاد براؤن کہتے ہیں کہ "حق الٰہی کے اس نظریے
، وہ قوت حاصل نہیں کی جیسا کہ فارس میں سلاطین ساسانیہ کے عہد میں اس نے حاصل کر لی تھی۔ اکاسرہ یہ خیال کرتے تھے کہ صرف
کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ تاج شاہی پہن سکیں کیونکہ ان کی رگوں میں خدائی خون گردش کر رہا ہے۔" استاد "نولڈکہ" نے اہل فارس کے
نظریہ کو قبول کر لینے پر جو دلیل دی ہے وہ ایک حکایت ہے جو کتاب "الاخبار الطوال" میں نقل کی گئی ہے۔ حکایت یہ ہے کہ بہرام چوبیں
شاہی خاندان سے نہ ہوتے ہوئے طلبگار حکومت تھا اور جس نے کسریٰ پرویز سے جنگ کی تھی اور جسے کسریٰ نے شکست دی
اور وہ بھاگ گیا تھا ــــــ بھاگتے ہوئے راستہ میں ایک گاؤں پر وہ گذرا اور شب گذاری کیلئے مع اپنے ساتھیوں کے اس
ں میں ایک بڑھیا کے مکان میں اس نے قیام کیا۔ ان لوگوں نے کھانا نکال کر کھایا اور جو بچ گیا وہ بڑھیا کو کھلا دیا۔ پھر شراب نکالی
بہرام نے بڑھیا سے پوچھا کہ تمہارے پاس کوئی شراب پینے کیلئے برتن بھی ہے؟ بڑھیا نے کہا کہ ہاں میرے پاس ایک چھوٹا سا کدو ہے
میا وہ کدو لے آئی انھوں نے اسے کاٹ کر اندر سے گودا نکال کر پیالہ بنا لیا اور اس میں شراب پینا شروع کر دی پھر کچھ نُقل نکالا
بڑھیا سے کہا کہ کوئی ایسی چیز ہے جس میں یہ نُقل رکھ لیں؟ تو بڑھیا ایک چھوٹی سی چھلنی لے آئی۔ اس چھلنی میں ان لوگوں نے نُقل
رکھ لیا۔ بہرام نے حکم دیا اور بڑھیا کو بھی شراب نوشی میں شریک کر لیا گیا۔ بہرام نے بڑھیا سے پوچھا "بڑی بی! تمہارے پاس کوئی
خبر بھی ہے؟ بڑھیا نے کہا "ہاں مجھے یہ خبر ملی ہے کہ کسریٰ روم سے اپنی فوجیں لیکر آ گیا ہے اور بہرام سے جنگ کر کے اسے اس نے
شکست دیدی ہے اور اس سے اپنا ملک واپس لے لیا ہے۔" بہرام نے بڑھیا سے پوچھا کہ "بہرام کے بارہ میں تم کیا کہتی ہو" بڑھیا نے
جواب دیا کہ "وہ تو نِرا احمق اور جاہل ہے، شاہی خاندان سے ہے نہیں اور بادشاہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔" بہرام نے کہا کہ "جب ہی
وہ کدو میں شراب پیتا اور چھلنی میں نُقل کھاتا ہے۔" چنانچہ فارسی میں یہ ضرب المثل مشہور ہو گئی۔

ہماری رائے میں یہ کوئی قوی استدلال نہیں ہے کیونکہ ہر حاکم خاندان جب چند نسلیں حکومت میں گذار لیتا ہے تو وہ ہر قوم کے

عوام میں اس حق کو اپنے لئے حاصل کرلیتا ہے۔ خواہ وہ اپنے بادشاہوں کی تقدیس کے قائل نہ بھی ہوں۔

اس رائے کی تائید میں اس سے کہیں بہتر وہ بیان ہے جو کتاب "التاج" میں موجود ہے کہ سلاطین ساسانیہ کو ان کی رعایا نے کبھی اپنے شعر، خطبہ، تقریظ یا کسی دوسرے موقعہ پر نہ ان کے ناموں سے یاد کیا نہ ان کی کنیتوں سے۔ یہ بات سلاطینِ حیرہ کے ہاں آکر پیدا ہوئی۔

اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ بادشاہ اپنے آپ کو بہت ہی اونچا لیجاتے تھے اور قوم بھی ان کو اسقدر اونچا سمجھتی تھی کہ لوگوں کی زبانوں پر ان کے نام یا ان کی کنیتوں کا آجانا حتی کہ اشعار میں بھی سخت بے ادبی اور گستاخی شمار کی جاتی تھی۔

یہ تھے اہلِ فارس کے دینی مذاہب، جو فتوحاتِ اسلامی کے بعد مملکت اسلامی میں سرایت کر گئے۔ ان میں سے بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے اور اپنے ان عقائد سے جو نسلاً بعد پشت سے وراثۃً ان میں چلے آرہے تھے خود کو جدا نہیں کرسکے اور زمانے گزر جانے کے ساتھ ساتھ ان کے پرانے نظریات اسلامی رنگ اختیار کرتے چلے گئے۔ چنانچہ شیعوں کا نظریہ حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کے بارہ میں قطعاً وہی ہے جو ان کے آباؤ اجداد کا نظریہ ساسانی بادشاہوں کے بارہ میں تھا۔ اہل فارس کی ثنویت (دو خداؤں کا نظریہ) وہ سرچشمہ ہے جس سے اسلام میں رافضیت سیراب ہوتی چلی آرہی ہے جسے معتزلہ نے رافضیوں وغیرہ کے دلائل کے رد کرنے کیلئے مزید حرکت دی۔ اس پر اتنا اضافہ اور کر لیجئے کہ زردشت، مانی اور مزدک کی تعلیمات مسلمانوں میں مختلف ادوار میں مختلف شکلوں میں برابر اپنی نمو کرتی رہیں چنانچہ دولت اموی کے آخری زمانہ میں اور دولت عباسیہ میں اس نے کافی سر نکالا اور مسلمان مجبور ہوئے کہ ان سے مناظرے کریں اور ان کے دلائل کو رد کر کے خود اپنے دین کی تائید منطق اور برہان سے کریں۔

ان مسائل کا ابھرنا کبھی کبھی خود مسلمانوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیتا تھا چنانچہ یہ خود مختلف مذاہب میں بٹ جاتے اور آپس پر جھگڑنے لگ جاتے تھے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے اسلام میں علم کلام کو پیدا کیا جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

افکارِ اسلامی کی تشکیلِ جدید

قارئین کو یاد ہوگا کہ حیدرآباد دکن کی "اکاڈیمی آف اسلامک اسٹڈیز" کی طرف سے ایک گشتی مراسلہ شائع ہوا تھا جسے ہم نے طلوع اسلام
یل ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں عنوانِ بالا کے تحت شائع کیا تھا اور اس پر اپنا تبصرہ بھی لکھا تھا۔ اس مراسلہ میں اکاڈیمی نے تجویز یہ پیش کی
تمام ممالک اسلامیہ کے اہلِ علم حضرات پر مشتمل ایک مجلس مرتب کی جائے جو احادیث کے مجموعوں کا از سرِ نو جائزہ لے اور اس کے بعد
حدیثوں کا ایک الگ مجموعہ شائع کرے۔ اس پر طلوع اسلام نے جو تبصرہ کیا تھا اسے آپ (اپریل ۱۹۵۴ء کے پرچہ میں) ایک دفعہ پھر
ظہ فرمالیجئے تاکہ آپ کی یاد تازہ ہو جائے۔

اب اکیڈیمی کی طرف سے (انگریزی زبان میں) ایک اور پمفلٹ موصول ہوا ہے جس میں انھوں نے ان جوابات کا جائزہ لیا ہے جو
ن ہندوستان، پاکستان، اور دیگر اسلامی ممالک کے اربابِ فکر و نظر کی طرف سے موصول ہوئے ہیں۔ اور اس کے بعد یہ بتایا ہے
ب کرنے کا کام کیا ہے۔

اس پمفلٹ میں انھوں نے بتایا ہے کہ ان حضرات کو جن کے جوابات موصول ہوئے ہیں چار گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو احادیث کے موجودہ مجموعوں کو علیٰ حالہ رہنے دینا چاہتے ہیں اور اس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کو جائز نہیں سمجھتے۔

وسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جن کے نزدیک سارے کا سارا ذخیرہ وضعی اور رد کر دینے کے قابل ہے۔ اسلام میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اسلئے کہ دین کے لئے قرآن کافی ہے۔

یسرا گروہ، ان لوگوں کا ہے جن کا یہ خیال ہے کہ ہمیں صرف اسلام کی روح کو لے لینا چاہئے اور قرآن یا احادیث میں بیان کردہ احکام و قوانین کو خیرباد کہہ دینا چاہئے۔ اور

چوتھا گروہ ان لوگوں کا ہے جو ایک طرف روایتی اسلام کے تقدس کے بھی قائل ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ مغرب کی تجدد پسندی بھی اختیار کرلیں۔

نقا گروہ وہ ہے جس کے متعلق اکیڈیمی نے لکھا ہے کہ وہ اکیڈیمی کے ہمنوا ہیں اور چاہتے ہیں کہ حدیثوں کے مجموعوں کی از سرِ نو
ن بین کی جائے۔

ہمیں معلوم نہیں کہ ان حضرات کی طرف سے اکیڈیمی کو کیا جوابات موصول ہوئے اور ان جوابات کی روشنی میں گروہوں کی یہ تقسیم
ہے یا نہیں۔ لیکن کم از کم ایک صاحب کا جواب تو ہمارے سامنے ہے اور اس جواب کی روشنی میں ہم یہ کہنے کی جراءت کر سکتے ہیں کہ

نہ ہی ان کا شمار صحیح گروہ میں ہوا ہے اور نہ ہی ان کے مسلک کی وضاحت ہوئی ہے۔ بلکہ ہمیں اندیشہ ہے کہ جو لوگ صرف اس پمفلٹ سے ان کے مسلک کا اندازہ لگائیں گے وہ کتنی بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ یہ جواب محترم پرویز صاحب کا ہے جن کے نظریہ سے قارئین طلوع اسلام اچھی طرح واقف ہیں۔ انھیں گروہِ ثانی میں شمار کیا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ بہتر ہوتا کہ اکیڈیمی ان تمام جوابات کو بجنسہٖ شائع کر دیتی جو انھیں موصول ہوئے تھے اور یہ چیز قارئین پر چھوڑ دیتی کہ وہ ان جوابات سے خود نتائج اخذ کرلیں۔ ہمارے لئے یہ دشوار ہے کہ ہم محترم پرویز صاحب کا پورے کا پورا جواب یہاں نقل کر دیں۔ (عدم گنجائش اس کی مانع ہے) ہم ان کے جواب کا ملخص پیش کرتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ یہ پرویز صاحب کا جواب ہے بلکہ اس لئے کہ حدیث کے متعلق یہ ایک مخصوص طرز فکر کا ترجمان ہے اور ہمارا خیال ہے کہ حدیث کے بارہ میں جب تک ان خطوط پر نہیں سوچا جائے گا اسلام کو موجودہ مشکلات سے نکالنے کی کوشش بارآور نہیں ہوسکے گی۔

محترم پرویز صاحب کے جواب کا ملخص یہ ہے کہ

(۱) حضور نبی اکرم صلعم انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن بدبختی سے ہماری تاریخ میں بہت سی ایسی چیزیں شامل ہو چکی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ یہ چیزیں وضعی روایات کی پیدا کردہ ہیں اور جب تک ہم انھیں اپنی تاریخ سے الگ نہیں کر دیں گے، حضور صلعم کی صحیح سیرت سامنے نہیں آسکے گی۔ ایسا کرنا چنداں دشوار نہیں۔ اسلئے کہ حضورؐ کی سیرت قرآن کے عین مطابق تھی اور قرآن ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ لہٰذا سیرت کے متعلق ہر وہ روایت جو قرآن کے خلاف ہو اور جس سے حضور کی شان میں طعن پایا جاتا ہو اس قابل ہے کہ اسے مسترد کر دیا جائے۔ یہ ہے وہ گوشہ جس میں محترم پرویز صاحب کے نزدیک حدیث کے ذخیرہ پر تنقید و تنقیح کی ضرورت ہے اور یہی وہ گوشہ ہے جس میں اکیڈیمی کی مجوزہ کوشش درخورِ ستائش ہے۔ اسی نظریہ کے ماتحت خود پرویز صاحب نے اپنی معرکہ آرا کتاب (معراج انسانیت) لکھی ہے جس میں سیرت نبی اکرم کو خالص قرآن کے آئینے میں پیش کیا گیا ہے۔

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ دین کے قوانین اور احکام کے بارہ میں حدیث کی پوزیشن کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ قرآن نے محدود احکام کی جزئیات متعین کی ہیں، باقی قوانین ایسے ہیں جن کے صرف اصول بیان کئے ہیں۔ یہاں سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کہ جو احکام قرآن نے خود بیان کر دیئے ہیں، کیا حدیث کی رو سے ان میں اضافہ یا رد و بدل کیا جا سکتا ہے؟ مثلاً قرآن نے کھانے پینے کی چند چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اور احادیث میں ان چیزوں کے علاوہ اور چیزوں کو بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ اضافہ کی مثال ہے یا قرآن نے ہر شخص کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے ترکہ کے متعلق وصیت کرے اور جو مال وصیت سے بچ جائے یا جس کے متعلق وصیت نہ کی جا سکی ہو اس کی تقسیم کے لئے اس نے حصے مقرر کر دیئے ہیں لیکن حدیث میں ہے کہ وصیت صرف ایک تہائی مال میں کی جا سکتی ہے اور وہ بھی رشتہ داروں کے لئے نہیں۔ یہ رد و بدل کی مثال ہے۔ سوال یہ ہے کہ حدیثوں میں جو اس قسم کے اضافے یا قرآنی احکام میں رد و بدل پایا جاتا ہے کیا وہ قرآن ہی کی طرح واجب الاطاعت قوانین ہیں؟ اگر یہ واجب الاطاعت نہیں تو ان حدیثوں کے

پرکھنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر یہ واجب الاطاعت ہیں تو اس میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کہ یہ قرآن کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اس لئے کہ یہ یا تو قرآن پر اضافے ہیں یا اس کے احکام میں ردوبدل۔

دوسرا سوال ایک مثال سے واضح ہو جائے گا۔ قرآن میں زکوٰۃ کا حکم ہے لیکن نہ اس کا کہیں نصاب دیا گیا ہے نہ شرح۔ حدیثوں میں زکوٰۃ کا نصاب اور اس کی شرح کے احکام ملتے ہیں۔ اگر زکوٰۃ کے متعلق یہ جزئی احکام جو احادیث میں ملتے ہیں قیامت تک کیلئے غیر متبدل ہیں تو آپ کو انھیں علی حالہ صحیح ماننا پڑے گا۔ کیونکہ ان میں بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ یہ قرآن کے مطابق ہیں یا نہیں۔ اور اگر یہ صرف وقتی احکام تھے تو ان کی بابت احادیث کو پرکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

محترم پرویز صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ قرآن کے احکام میں اضافہ یا ردوبدل کا کسی کو اختیار نہیں ہو سکتا اور جن چیزوں کو قرآن نے محض اصولاً بیان کیا ہے ان کی بابت اس کا منشا یہ نظر آتا ہے کہ ملت کا جو نظام علیٰ منہاج نبوت قرآنی قوانین کے نافذ کرنے کے لئے قائم ہو وہ اپنے زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق ان کی جزئیات میں ردوبدل کر سکتا ہے اس کیلئے ان کی دلیل یہ ہے کہ

(۱) اگر ان جزئیات کو غیر متبدل رکھنا ہوتا تو انھیں خود اللہ تعالیٰ متعین کر دیتا۔

(۲) رسول اللہ صلعم نے ان احکام کی جزئیات کو متعین فرمایا لیکن ان کا کوئی مستند مجموعہ مرتب فرما کر امت کو نہیں دیا بلکہ صحابہ کو ان کے لکھنے سے بھی روک دیا۔ اگر رسول اللہ صلعم کا یہ منشا ہوتا کہ یہ جزئیات قیامت تک کیلئے دین کے غیر متبدل قوانین کی حیثیت سے ہیں تو دین کے آخری پیغامبر ہونے کی حیثیت سے آپ کا فریضہ تھا کہ قرآن کی طرح ان جزئیات کا مستند مجموعہ امت کو دیتے۔

(۳) خلفائے راشدین نے بھی ان جزئیات کا کوئی مجموعہ مرتب نہ فرمایا اور یہ نہیں کہ یہ بات سہواً رہ گئی ہو بلکہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ سوال خاص طور پر زیر بحث آیا۔ قریب مہینہ بھر تک مجلس شوریٰ نے اس پر غور و فکر کیا اور اس کے بعد حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ ہمیں ایسا مجموعہ مرتب نہیں کرنا چاہیئے۔

ہمیں افسوس ہے کہ زیر نظر پمفلٹ میں نہ تو محترم پرویز صاحب کا پورا جواب نقل کیا گیا ہے اور نہ ہی ان کے مذکورہ بالا نظریہ کو حت سے پیش کیا گیا ہے بلکہ انھیں گروہ ثانی میں شامل کر کے انھیں ان لوگوں کے زمرے میں شمار کر دیا گیا ہے جن سے ان کا مسلک ،ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا مسلک مخصوص ہے اور ان ہر چہار گروہ سے الگ۔ پھر اکیڈیمی نے اتنا ہی نہیں کیا کہ جن لوگوں نے ی کے نظریہ کے خلاف کوئی مسلک پیش کیا ہے ان سے صرف اختلاف کا اظہار ہی کیا ہو۔ اس نے ان نظریوں پر تنقید بھی کی ہے پنی دانست میں انھیں باطل بھی ٹھہرایا ہے۔ ہمارے نزدیک اکیڈیمی کے لئے یہ بھی مناسب نہیں تھا کہ وہ اپنے نظریہ کو صحیح دے اور اس کے خلاف نظریوں کی از خود تردید شروع کر دے۔ اس تردید میں جس قسم کے دلائل دیئے گئے ہیں اس کا نمونہ ذیل میں ، کیا جاتا ہے۔ اس نکتہ کے متعلق کہ رسول اللہ صلعم نے ان جزئیات کا مستند مجموعہ امت کو کیوں نہ دیا لکھا ہے کہ

اگر رسول اللہؐ کے پاس دوسری مصروفیات کی وجہ سے اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ قرآن کے اصولی احکام کی جزئیات کا مجموعہ مرتب

فرمادیتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کا منشا یہ تھا کہ آپ کے بعد ان جزئیات میں تبدیلیاں ہو سکتی ہیں۔

ذرا غور فرمائیے کہ ایک رسول کی زندگی کا بنیادی اور اولین فریضہ ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ امت تک دین کو پہنچائے۔ اسی لئے قرآن نے رسول اللہ صلعم سے کہا کہ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ (۵/۶۷)۔ اے رسول جو کچھ تجھ پر نازل کیا جاتا ہے تو اسے لوگوں تک پہنچادے۔ اگر تو نے ایسا نہ کیا تو سمجھ لو کہ تم نے فریضۂ رسالت ہی کو ادا ... ظاہر ہے کہ اگر کسی رسول کو (اور رسول بھی ایسا جس کے بعد کسی نبی نے آنا ہی نہیں) اس کی زندگی کی دوسری مصروفیات اتنی فرصت نہ دیں کہ وہ دین کے غیر متبدل احکام و قوانین کو محفوظ شکل میں امت تک پہنچادے تو کیا یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس رسول نے اپنے فریضۂ رسالت کو خدا کے ارشاد کے مطابق ادا کر دیا؟ پھر اگر (معاذ اللہ) رسول اللہؐ کو اس کی فرصت نہیں ملی تھی تو کیا صحابہؓ کو بھی اس کی فرصت نہیں تھی کہ وہ دین کے اتنے اہم حصہ کو مرتب اور محفوظ کر لیتے، درآنحالیکہ امام ابن حزم کے قول کے مطابق حضرت عمرؓ کے زمانہ میں قرآن کے کم از کم ایک لاکھ نسخے مختلف شہروں میں موجود تھے۔ باقی رہا یہ کہنا کہ اس سے رسول اللہ کا منشا یہ نہیں تھا کہ ان کی تشریف بری کے بعد ان جزئیات میں تبدیلی ہو سکتی ہے تو اس کا کیا جواب ہے کہ یہ تبدیلیاں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں شروع ہو گئی تھیں اور انھوں نے یہ کہہ کر تبدیلیاں کی تھیں کہ رسول اللہؐ کے زمانے اور ہمارے زمانے کے حالات میں فرق آچکا ہے۔

اس کے بعد اکیڈیمی نے لکھا ہے کہ

> جیسا کہ پرویز صاحب نے کہا ہے اعمال و اقوال رسول اللہ صلعم کے متعلق جو کچھ ہم تک پہنچا ہے وہ صحیح اور غلط کا مجموعہ ہے۔ لیکن یقیناً یہ ناممکن نہیں کہ اس سے صحیح کو الگ کر کے قرآن کے مطابق کر لیا جائے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اکیڈیمی اس کام کو ناممکن نہیں سمجھتی۔ یہ دکھلانے کیلئے کہ اکیڈیمی نے یہ بات محض رسمی طور پر کہدی ہے ہم ا... صرف ایک حدیث کے متعلق پوچھتے ہیں کہ وہ صحیح ہے یا غلط اور قرآن کے مطابق ہے یا خلاف۔ حدیث میں ہے کہ چاندی اور ... میں زکوٰۃ کی شرح اڑھائی فیصدی ہے۔ اکیڈیمی سے درخواست ہے کہ وہ بتلائے کہ

(۱) یہ فیصلہ خود رسول اللہ صلعم کا ہے یا نہیں۔ اگر رسول اللہ کا ہے تو اس کی یقینی سند کیا ہے؟ (واضح رہے کہ سند کے یہ معنی نہیں کہ اس کے راوی ثقہ ہیں۔ اسلئے کہ خود اکیڈیمی نے لکھا ہے کہ احادیث کی جانچ پڑتال متون سے کی جائیگی نہ کہ اسناد سے۔ لہٰذا از روئے متن یہ بتایا جائے کہ یہ رسول اللہؐ کی حدیث ہے یا نہیں۔)

(۲) یہ قرآن کے مطابق ہے یا نہیں۔ اگر قرآن کے مطابق ہے تو اس کی دلیل کیا ہے؟

اکیڈیمی نے یہ بھی کہا ہے کہ ہمیں عبادات کو معاملات سے الگ کر لینا چاہیئے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ معاملات میں تو تبدیلیاں ہو سکتی ہیں عبادات میں نہیں۔ ہم اکیڈیمی سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ

(۱) ان کے پاس عبادات اور معاملات کی اس تفریق کیلئے سند کیا ہے؟

(۲) کیا ان کے نزدیک (مثلاً) زکوٰۃ عبادات میں شامل ہے یا معاملات میں؟

[واض]ح رہے کہ اکیڈمی خود بھی دوسرے مقامات پر لکھتی ہے کہ قرآن کا اسلام توجہ کی یکسوئی (CONTEMPLATION) کا مذہب نہیں۔ [او]ر رسومات (RITUAL-) کا۔ اس میں قانون اور مذہب میں کوئی فرق نہیں۔)

اس مقام پر اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ محترم پرویز صاحب کے نظریہ کے مطابق اسلامی نظام انہی جزئیات میں تبدیلی کریگا جن کی [تبدی]لی کے لئے زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات متقاضی ہوں گے۔ اب ظاہر ہے کہ حالات کی وہ کونسی تبدیلی ہوگی جس کا تقاضا یہ ہوگا کہ نماز [میں س]ورۂ فاتحہ کی جگہ سورۃ الناس پڑھی جائے یا پہلے سجدہ کیا جائے اور بعد میں قیام۔ یہی وجہ ہے کہ محترم پرویز صاحب نے اور [ط]لوع اسلام نے آجتک کبھی نماز میں کسی تبدیلی کے متعلق اشارہ تک بھی کیا ہے۔ البتہ طلوع اسلام یہ ضرور کہتا ہے کہ رسول اللہ ص کے [نقش] قدم پر جو قرآنی نظام قائم ہوا وہ امت میں وحدت پیدا کرنے کیلئے موجودہ اختلافات کو مٹا کر نماز کی ایک متفق علیہ شکل قائم [کرس]کتا ہے۔ اور نیز اس روح کو واپس لاسکتا ہے جس کے ختم ہونے سے ہمارے یہ اجتماعات صلوٰۃ بے جان رسم بن کر رہ گئے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے اپریل ۱۹۵۸ء کے طلوع اسلام میں لکھا تھا۔ ہم اکیڈمی کو مشورہ دیں گے کہ اگر انہوں نے فی الواقعہ کوئی مفید کام [کرنا] ہے تو وہ سب سے پہلے اپنے ذہن میں حدیث کی پوزیشن کے متعلق ان اصولی اور بنیادی امور کو متعین کرلیں جن کی طرف محترم پرویز [صاح]ب نے اپنے جواب میں توجہ دلائی ہے اور جنہیں ہم نے مختصر الفاظ میں او پر دہرایا ہے۔ جب تک آپ اس پوزیشن کے متعلق اپنے [ذہ]ن کو صاف نہیں کرلیں گے آپ کا کوئی قدم صحیح نتیجہ پیدا نہیں کرسکے گا۔ ہر اس شخص کو جو اپنے دل میں کسی اصلاح کا جذبہ رکھتا ہے اس [اص]ول کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ

باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

معاملہ کی باتیں

(۱) جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ یا کارڈ آنا ضروری ہے ورنہ عدم جواب کی شکایت معاف۔

(۲) خط و کتابت میں اپنے خریداری نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولئے ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔

حقائق و عبر

(۱) یُذَبِّحُونَ اَبْنَآءَھُمْ

دسمبر کے مہینہ کا سب سے بڑا جگر سوز، کرب انگیز، ہوش ربا اور ہولناک سانحۂ فاجعہ مصر ہر
اخوان المسلمین کے رہناؤں اور اراکین کا بے محابا قتل ہے، جنھیں سازش کے جرم میں پھان
لٹکا دیا گیا۔ پاکستان ہی سے نہیں بلکہ قریب قریب تمام اسلامی ممالک سے اس کے خلاف احتجاج کی صدائیں بلند ہوئیں لیکن م
مصر نے اِن میں سے کسی پر بھی کان نہ دھرا۔ ہمیں اس واقعہ سے اسقدر صدمہ گذرا ہے کہ ہم پر کئی راتوں کی نیند حرام ہوگئی۔ لیکن اس
سے متاثر ہونے اور اس کے خلاف لب کشائی کرنے کیلئے ہماری وجوہات ان سب سے مختلف ہیں جن کی بنا پر دوسرے لوگوں اور اد
کی طرف سے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ پاکستان میں (جیسا کہ ظاہر ہے) اس باب میں جماعتِ اسلامی سب سے
پیش رہی۔ ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے جو امین احسن صاحب اصلاحی نے اپنے متعدد بیانات میں پیش کئے۔ مثلاً انھوں نے عبدا
کے سلسلہ میں کہا:

> ان شہدار کی فہرست میں عبدالقادر عودہ کا بھی نام ہے۔ ان جیسا متبحر عالم شاید صدیوں میں بھی پیدا نہ ہوسکے۔ انھوں نے فقہ اسلامی اور
> دیگر قوانین کا تقابلی مطالعہ کیا اور اس موضوع پر بڑی گراں بہا کتابیں لکھی ہیں۔ اس قسم کی گراں پایہ ہستی کو پھانسی کے تختہ پر چڑھا دینے سے
> حکومتِ مصر نے ملت اسلامیہ کے دل میں ناسور پیدا کر دیئے ہیں۔ (ڈان ۹ر دسمبر ۱۹۵۴ء)

یہی وہ دلیل ہے جو جماعتِ اسلامی اور ان کے ہمنواؤں نے ان کے امیر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی سزا پر پیش کی تھی۔ انھوں نے
مودودی صاحب ایک جید عالم اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ اسلئے حکومت کو چاہیئے کہ انھیں بلاشرط رہا کر دے۔ ہم نے
بھی کہا تھا اور اب پھر دہراتے ہیں کہ یہ دلیل بے حد کمزور ہے۔ اگر کسی شخص نے فی الواقعہ ایسا جرم کیا ہے جس کی سزا صحیح قانون کی رو
موت ہے تو اس شخص کو محض اس بنا پر اس سزا سے نہیں بچایا جا سکتا کہ وہ شخص بڑا عالم اور بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ اس کے
تو یہ ہیں کہ جرائم کی سزائیں صرف جہلا اور گمنام لوگوں کیلئے رہ جائیں اور مشاہیر اور علماء جو جی میں آئے کرتے پھریں انھیں کوئی پوچھے؟

ہم نے مودودی صاحب کی سزا کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے جو کچھ لکھا تھا اسے ہم آج پھر دہراتے ہیں۔ ان سزاؤں کے خلاف ہمارا
نہیں کہ سزا پانے والے لوگ بین الاقوامی شہرت کے مالک اور جید عالم ہیں۔ ہمارا اعتراض یہ ہے کہ جن فوجی عدالتوں میں اور جس اقرا الفر؟
ان لوگوں کے مقدمات کی سماعت کے بعد انھیں سزائیں دی جاتی ہیں، ان سے نہ قانون کا منشاء پورا ہوتا ہے نہ عدل و انصاف کا تق
سب سے پہلی چیز تو یہ کہ فوج میں تربیت ہی اس انداز کی ہوتی ہے کہ وہ لوگ اس انداز سے حالات کا جائزہ لینے اور ان پر غور و فکر
قابل نہیں ہوتے جس طرح ایک باقاعدہ ملکی عدالت کا جج کر سکتا ہے۔ فوجی عدالتیں، فوج کا ڈسپلن قائم رکھنے کا کام

عام شہریوں کے مقدمات سننے اور صحیح فیصلہ دینے کی اہل نہیں ہوسکتیں۔ ہمارا اعتراض یہ تھا اور اسی کو اب ہم پھر دہراتے ہیں کہ یہ چیز حکماً بند
ں چاہئے کہ غیر فوجیوں کے مقدمات کی سماعت فوجی عدالتیں کریں۔ اگر کہیں حالات ایسے پیدا ہوجائیں کہ فوجی عدالتوں کے سوا چارۂ کار ہی نہ رہے
صورت میں بھی ایک تو فوجی عدالتوں کو سزائے موت دینے کے اختیارات نہیں ہونے چاہئیں اور دوسرے ان کے فیصلوں کی اپیل ملک کی عام عدالتوں
نی چاہئے۔ جن افراد یا اداروں نے مصر کے اس حادثہ پر اسقدر اضطراب کا اظہار کیا ہے ہم ان سے درخواست کرینگے کہ وہ نہایت استقامت سے
ئلہ کا تعاقب کریں اسے یو این او تک لیجائیں اور وہاں سے یہ احکام جاری کرادیں کہ حقوقِ انسانیت میں یہ بھی شامل ہے کہ کسی غیر فوجی کے مقدمہ
عت فوجی عدالت نہ کرے۔ اور اگر وہ سماعت کرے تو بہر حال اس کی اپیل ملک کی سول کورٹ میں ہوسکے۔ اگر ایسا ہوجائے تو یہ انسانیت کی
بڑی خدمت ہوگی۔

مفتیوں کے فتوے

نومبر کی آخری تاریخوں میں ایک مقدمہ کی روئیداد شائع ہوئی ہے جو کراچی کی ایک عدالت میں فیصل ہوا ہے۔ بات مختصراً یہ تھی
کہ قریب سات سال ہوئے ایک بالغ عورت کی شادی ایک شخص کے ساتھ ہوئی۔ غالباً میاں بیوی میں کچھ ان بن تھی۔
ں نے مفتی محمد شفیع صاحب کی طرف رجوع کیا۔ مفتی صاحب نے فتویٰ دیدیا کہ سابقہ نکاح فسخ ہوچکا ہے۔ چنانچہ لڑکی کے باپ اور بھائیوں نے اسکی شادی
دوسری جگہ کردی۔ لڑکی کے پہلے خاوند نے استغاثہ دائر کردیا اور عدالت نے ان سب کو عقد پر عقد ثانی کے جرم میں سزا دیدی۔ یہ عقد ثانی ملک کے
ن کے خلاف تھا۔ اس مقام پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کے عوام جاہل اور مذہب پرست ہیں وہ عام طور پر ملک کے قانون سے واقف نہیں ہوتے
ح طلاق وراثت وغیرہ کے معاملات میں شریعت کے فیصلہ کو آخری فیصلہ سمجھتے ہیں۔ جب کوئی مفتی انھیں اس کا فتویٰ دیدیتا ہے کہ فلاں چیز
یتِ حقہ کی رو سے جائز ہے تو وہ بلا توقف اس پر عمل پیرا ہوجاتے ہیں۔ لیکن اگر ان کا وہ عمل قانون کے خلاف ہوتا ہے تو وہ قانون کی گرفت میں آجاتے ہیں
کراہ لیکے تو ان واقعات میں اصل مجرم وہ مفتی ہوتا ہے جو انھیں اسکا فتویٰ دیدیتا ہے کہ جاؤ تمھیں اجازت ہے کہ شریعت کی رو سے ایسا کرلو۔ لیکن مفتی صاحب
ہو جاتے ہیں (جیسا کہ مفتی محمد شفیع صاحب نے عدالت سے کہا کہ) "موجودہ حکومت کے آئین میں ان کے فتوے کی کوئی قیمت نہیں"۔ اور جو نا واقف
اقیمت سمجھ کر اس کے مطابق عمل کرلیتے ہیں وہ سزا بھگتتے ہیں۔ یہ صورتِ حالات بڑی خرابیوں کی موجب اور حکومت کی فوری توجہ کی مستحق ہے۔ جب
ے فتوے کی کوئی قیمت ہی نہیں تو یہ فتوے دیتے ہی کیوں ہیں؟ اور انھیں فتویٰ دینے ہی کیوں دیا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں یا تو ان فتووں کو حکماً روکدینا
س قسم کا قانون بنادینا چاہئے کہ اگر کوئی مفتی ایسا فتویٰ دیگا جو ملک کے قانون کے خلاف ہو تو اس جرم کی سزا مفتی کو دیجائیگی نہ کہ ان لوگوں کو
سکے فتوی کے مطابق عمل کیا تھا۔

بٹ دشواریاں اسوقت تک ہیں جبتک ملک میں قرآنی نظام رائج نہیں ہوتا۔ اسوقت نہ موجودہ ٹائپ کے مفتیوں کی ضرورت رہیگی اور نہ کبھی یہ سوال پیدا
، کا قانون کیا ہے اور شریعت کا فیصلہ کیا۔ اسوقت ملک کا قانون اور شریعت ایک ہی چیز ہوگی اور اس کا انتظام حکومت کے ذمہ ہوگا کہ وہ
بتلائے کہ معاملہ متعلقہ میں قانون کیا ہے۔ مُلّا کی موت میں ملت کی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔

ن ودفائن

کچھ عرصہ ہوا حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی تھی کہ وہ تحقیقات کرے کہ ملک میں لوگوں نے کسقدر دولت دبا رکھی ہے جنہیں مفید
کاموں میں نہیں لگایا جا رہا۔ کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق دو ارب اور تین ارب روپے کے درمیان لوگوں نے دبا رکھا ہے جو کسی

مصرف میں نہیں آرہا۔ چنانچہ ہر صاحبِ فکر پریشاں ہے کہ جس ملک کی اس قدر دولت اس طرح بیکار پڑی ہو وہ ملک اقتصادی ترقی کس طرح کر سکتا ہے یہ صورتِ حالات فی الواقعہ پریشان کن ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس خرابی کا باعث کیا ہے اور اس کا علاج کیا۔ اس کا باعث ہے عدم تحفظ (IN-SECURITY) کا احساس یعنی یہ احساس کہ نہ معلوم کل کو کیا ہو جائے۔ اسوقت پیسہ وہی کام میں آئیگا جو اپنے ہاتھ میں ہوگا۔ جب تک کوئی فرد اپنے آپ کو معاشرہ میں محفوظ نہیں سمجھتا۔ روپیہ جمع کرنے کا جذبہ اس کے دل سے جا نہیں سکتا۔ قرآن نے روپیہ جمع کرنے والوں کی سزا جہنم لکھی ہے اور جہنم کفار کا ٹھکانا ہے۔ لہٰذا قرآن کی رو سے روپیہ جمع کرنا اور مسلمان ہونا دو متضاد چیزیں ہیں لیکن قرآن یہ حکم اسوقت دیتا ہے جب پہلے ایسا نظام قائم کر دیا جسمیں ہر فرد معاشرہ اور اس کی اولاد کی تمام ضروریاتِ زندگی کی ذمہ داری معاشرہ کے سر پر ہوتی ہے۔ اس نظام میں ہر فرد کو اس پر یقین ہوتا ہے کہ وہ اور اس کے پسماندگان ضروریاتِ زندگی سے کبھی محروم نہیں رہ سکتے۔ اس نظام کے قیام کے بعد روپیہ جمع کرنا، جائدادیں خریدنا، زمینیں سنبھالکر بیٹھ جانا سب ناجائز قرار پاجاتا ہے۔ جس حد تک کوئی معاشرہ اس نظام کی طرف بڑھیگا۔ اسی حد تک اس کے افراد اپنی دولت کو اجتماعی مفاد کے کاموں میں لگانے چلے جائیں گے اور ملکوں کو تو عقل کی تجرباتی دشواریوں کے بعد کہیں جا کر یہ چیزیں سمجھ میں آئی ہیں لیکن مسلمانوں کو زبانِ وحی نے از خود یہ بتا رکھا ہے۔ لیکن بدبختی ملاحظہ کہ آج مسلمان تمام اقوامِ عالم کے مقابلہ میں اس نظام سے سب سے زیادہ دور ہیں اور یہ اسلئے کہ مُلّا اسے بتا دیتا ہے کہ اگر اس روپیہ میں سے چالیسواں حصہ مجھے دیدو تو باقی سب عنداللہ حلال اور طیب ہو جائیگا۔

۴۔ بھلا بتایئے تو! اس عبارت کو پڑھیئے :۔

اقاصیص و روایت والی کتابوں کا زمانہ ختم ہو گیا۔ ہمارے علماء انہی کے عادی ہیں۔ ان کو اندازہ ہی نہیں کہ قرآن کو دنیا اب کس طرح سمجھنا چاہتی ہے۔ خدا کی بات، خدا ہی کی بات کی حیثیت سے سمجھ میں آئے۔ مطالبہ اس کا بڑھ رہا ہے لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ روایتوں کے بغیر قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوئی دوسری راہ ہی نہیں۔

اس عبارت کو آپ کسی مولوی صاحب کے سامنے پیش کر دیجئے۔ وہ تین چار گالیوں کے بعد نہایت غضب آلود انداز میں کہیگا کہ یہ وہی ملحد، بے دین، منکرِ حدیث طلوعِ اسلام ہے جو اس فتنہ کو پھیلا رہا ہے کہ قرآن کو سمجھنے کیلئے رسول اللہ صلعم کی حدیثوں کی بھی ضرورت نہیں لیکن آپ حیران ہونگے کہ یہ عبارت کسی منکرِ حدیث کی نہیں۔ یہ اقتباس ہے ایک خط کا جو سید مناظر احسن صاحب گیلانی نے عبدالماجد صاحب دریابادی کو لکھا اور جو اخبار صدق لکھنؤ کے ۳ر دسمبر کے پرچہ میں شائع ہوا۔ خط لکھنے والے اور مکتوب الیہ دونوں کٹر قسم کے مولوی ہیں لیکن آپ دیکھیئے کہ زمانہ کے تقاضے کس طرح مار مار کر ان لوگوں کو سیدھے راستے کی طرف لا رہے ہیں لیکن طلوع اسلام کا نام آپ ان لوگوں کے سامنے بھی لے دیجئے تو یہ ناک بھوں چڑھانے لگ جائیں گے محض اسلئے کہ طلوع اسلام غیر مولویوں کا پرچہ ہے اور مولوی صاحبان کسی غیر مولوی کو اس کا حق دینے کیلئے تیار نہیں کہ وہ مذہب کے معاملہ میں لب کشائی کر سکے۔ خدا کی بات، خدا کی بات کی حیثیت سے سمجھنے کا دعویٰ طلوع اسلام نے ہی کیا۔ دعویٰ ہی نہیں کیا بلکہ بات سمجھا کر بھی بتا دی۔ لیکن حرام ہے جو کسی مولوی کو اتنی توفیق نصیب ہوئی ہو کہ اس کے اعتراف میں اس نے ایک لفظ بھی کہا ہو۔ ہمارا خیال ہے کہ خدا کی کتاب کو اقاصیص و روایات کے جنگل سے نکالکر قرآن کو قرآن سے سمجھانے کی جو کوشش اولین میں سے سید محب الحق مرحوم اور علامہ جیراجپوری اور ان کے بعد طلوع اسلام کے صاحبِ فکر محترم پرویز صاحب نے کی ہے ہماری تاریخ کے کسی دور میں بھی اتنا کچھ نہیں ہوا ہوگا۔ لیکن اسکے باوجود مولویوں کی طرف سے ان کے حصہ میں گالیوں کے سوا اور کچھ نہیں آیا۔ لیکن خدا کی کتاب کی قوت دیکھیے کہ اب مولوی خود دہیں آرہا ہے ✦

اسلام

عصرِ حاضر میں

[طلوع اسلام کی نومبر ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں "شرعی قوانین کی تجدید" کے عنوان سے ایک مقالہ قارئین کی نظر سے گذر چکا ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ مختلف اسلامی ممالک میں ان قوانین کی جکڑ بندیوں کو ڈھیلا کرنے کیلئے جنھیں فقہ اور روایات نے غیر متبدل قرار دے رکھا ہے کس اضطراب کے مظاہرے ہو رہے ہیں۔ اس ضمن میں ہمارے سامنے ایک کتاب آئی جو اسی سال شائع ہوئی ہے۔ کتاب کا نام ہے اسلام (ISLAM) اور اس کے لکھنے والے ہیں پروفیسر الفریڈ گیلام (ALFRED GUILLAUME) یہ وہی فاضل مستشرق ہے جس نے (THE LEGACY OF ISLAM) جیسی کتاب کو ایڈیٹ کیا تھا۔ اس کتاب کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ مصنف کی زیرِ نظر کتاب کے ایک باب کا عنوان ہے: "اسلام ـــــ عصرِ حاضر میں"۔ اس میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ جہاں تک شرعی قوانین کا تعلق ہے ان پر نظرِ ثانی کرنے کے سلسلہ میں مختلف اسلامی ممالک میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اس مضمون کی افادیت کے پیشِ نظر ہم اس کا ترجمہ شائع کرتے ہیں جو ہمارے محترم دوست احمد محی الدین انصاری صاحب ریٹائرڈ جج ہائی کورٹ حیدرآباد دکن کے رشحاتِ قلم کا مرہونِ ہے۔ فاضل مصنف کی نگاہ قرآن پر نہیں اسلئے کہ انھوں نے قرآن کو لامحالہ مروجہ تفاسیر ہی کے ذریعہ سے سمجھا ہے۔ اسلئے قرآن کے بارہ میں وہ بہت سی غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ لیکن بایں ہمہ جس موضوع سے انھوں نے بحث کی ہے وہ اہم اور مفید ہے۔ امید ہے کہ قارئین اسے دلچسپی سے پڑھیں گے۔

طلوع اسلام]

مجھے تو کسی ایسے شخص کا علم نہیں ہے جسے سارے اقطاعِ عالم کے غیر معروف گوشوں میں بکھرے ہوئے مسلمانوں کا تو کیا کم از کم ایشیا بقیہ کے کروڑوں مسلمانوں کے متعلق ہی ایسی قابلِ وثوق معلومات حاصل ہوں کہ وہ اسلام پر بہ حیثیت مجموعی کوئی قابلِ اعتماد بیان دے سکے ظاہر ہے کہ ادھوری اور ناقص معلومات کی بنا پر عام طور پر رائے زنی کرنا کس قدر خطرناک اور گمراہ کن ہوتا ہے۔ پس ایسی صورت میں زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ زمانہ حال کے مسلمانوں نے خود اپنے مذہب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس پر غور کیا جائے اور اپنے دیکھے سنے ذاتی معلومات و واقفیت کو مکمل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایسی کوشش سے ممالکِ اسلامیہ کے ایک بڑے حصہ پر کچھ روشنی پڑ جائیگی۔ پھر بھی اکثر قابلِ لحاظ گوشے تاریکی میں رہ جائیں گے اسلئے کہ جن خطوں کے مسلمانوں کے متعلق نہ ابھی تک کچھ لکھا گیا ہے اور نہ ہی وہ خود قابل ہیں کہ اپنے متعلق کچھ بیان کر سکیں۔ ان کے بارے میں کوئی باوثوق رائے دینا ممکن نہیں ہوگا۔

ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زمانہ حال کے مسلمانوں پر جدید اکتشافاتِ سائنس، نئے فلسفہ اور نئی "تنقیدِ تاریخی" کا کس حد تک اثر پڑا ہے

جواب اس کا غالباً یہی ہوگا کہ صرف وہی افراد جنھوں نے مغربی روایات کی جامعات میں تعلیم پائی ہے اور ان مسائل کا کچھ وقوف رکھتے ہیں، ان سے کچھ اثر اندوز ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد بہت کم ہے لیکن اتنی کم بھی نہیں جسے بآسانی نظر انداز کر دیا جا سکے۔ ان لوگوں سے گفتگو کی جائے تو اکثر ایسے نظر آئیں گے جو قرآن کے بارے میں کوئی کلمۂ نہیں ظاہر کرتے اور روایات (حدیث) کے متعلق بھی ایک عمیق تنقیدی زاویۂ نگاہ رکھتے ہیں۔ اور بعض نے تو جیسا کہ آگے چل کر بتلایا جائیگا حدیث کے بارے میں نہایت بیباکی سے صاف صاف رائے ظاہر کر دی ہے۔ لیکن جہانتک قرآن کا تعلق ہے اسے ایک انسانی تصنیف مان لینا، خواہ وہ انسان الہام خداوندی (وحی) سے بہرہ مند ہی کیوں نہ ہو، ان کی جراٴت سے باہر ہے۔ علما کی قوت اور اقتدار سے وہ بہت مرعوب اور خوفزدہ ہیں۔ کیونکہ قرآن کے حرفاً و لفظاً لفظاً کلام الٰہی ہونے میں اگر انھوں نے ذرہ برابر بھی شک و شبہ کا اظہار کیا تو نہ صرف آئندہ سرکاری ملازمتوں اور ترقیوں کی راہیں ان کے لئے مسدود ہو جائیں گی بلکہ موجودہ عہدوں کا بھی خیر نہیں[1]۔ چنانچہ مصر کے ایک بڑے مدبر اور جید عالم طٰہٰ حسین کی مثال ان کے سامنے موجود ہے۔ اپنی ایک تصنیف میں انھوں نے حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ کے مکہ میں تشریف لانے کے واقعہ میں شبہ ظاہر کیا تھا اس کی پاداش میں انھیں جامعہ کی خدمت سے معزول کر دیا گیا ان کی بین الاقوامی شہرت اور اعلیٰ علم و تبحر کا بھی کوئی لحاظ نہیں کیا گیا اور ایک عرصہ کے بعد بمشکل انھیں اپنے عہدہ پر بحالی نصیب ہوئی[2]۔ ایک ایسے جید عالم و فاضل سے جس کی حب الوطنی اور ملک کی ترقی کا جوش و انہماک ملک میں ہر چہار سو مانا ہوا ہو جب ایسا برتاؤ کیا جائے تو ان کمتر درجہ کے بے وسیلہ لوگوں کا کیا حشر ہوگا جو اپنی عقل اور ضمیر کی پیروی کرنے کا ارادہ کریں[3]۔

مشرقی ممالک کے صدر مقامات پر آج ہر شخص ان کی فضا میں ہوائی جہاز اور سڑکوں پر موٹریں چلتی دیکھتا ہے۔ ان دونوں صبا رفتار سواریوں کے ہم دوش انہی سڑکوں پر اونٹ بھی نہایت اطمینان اور بے خوفی سے مصروفِ خرام نظر آتا ہے۔ اسے اس کا مطلق خیال نہیں گذرتا کہ سواریوں اور راہروؤں میں اس کی بے پرواخوش خرامی خلل انداز ہو رہی ہے یا راستہ مسدود ہو گیا ہے۔ اسی طرح ذہنی اور عقلی مسائل میں بھی ترقی پسند، ذی فہم افراد نئے انداز فکر اختیار کر کے ان سے استفادہ کرتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ہی قدامت پرست مُلّا جو عوام کے قلب و دماغ پر حکمرانی کرتا ہے اب تک اپنے اسلاف کی فرسودہ تعلیمات کو طوطے کی طرح رٹانے میں مشغول ہے۔ میں نے خود ۱۹۱۷ء میں مصر کی جامعہ ازہر میں دیکھا کہ طالب علموں کو جغرافیہ کا سبق (جدید نقشوں کے بجائے) قدیم جغرافیہ دانوں کے مرتب کئے ہوئے ایک پرانے نقشے کی مدد سے دیا جا رہا تھا۔ یہ تو خیر ایک پرانی بات ہے ابھی ابھی ۱۹۵۰ء میں اسی جامعہ کی مسجد میں میں نے گرامر کا ایک سبق سُنا جو کئی سو سال پہلے کی ایک

---

[1] جو مناصب یا فرائض مسلمانوں کے لئے مخصوص ہیں وہ ایسے لوگوں کو نہیں دیئے جا سکتے۔ اسلئے کہ قرآن کو انسانی تصنیف مان لینے کے بعد کوئی شخص مسلمان نہیں رہ سکتا۔ اس معاملہ میں مداہنت یا رعایت برتنے والی مملکت، اسلامی مملکت نہیں کہلا سکتی۔ (طلوع اسلام)

[2] ہمیں معلوم نہیں کہ طٰہٰ حسین کو کس جرم کی پاداش میں جامعہ سے الگ کیا گیا تھا اور پھر کن حالات میں انھیں اپنے عہدے پر بحال کیا گیا تھا۔ (ط)

[3] قرآن عقل و ضمیر کی پیروی پر پابندی عائد نہیں کرتا۔ وہ صرف یہ کہتا ہے کہ اگر تم دین کے محکمات میں سے (جو اجزائے ایمان ہیں) کسی سے انکار کرتے ہو یا اس کی صداقت میں تمہیں شبہ ہے تو تمہارا مقام غیر مسلموں کی صف میں ہے۔ جو حقوق انھیں حاصل ہیں وہی تمہیں حاصل ہونگے (طلوع اسلام)

ب صرف ونحو کی مدد سے رٹایا جارہا تھا۔ انھیں اس کا مطلقاً احساس نہ تھا کہ زبانِ عربی کی خصوصیات وفضائل کے اظہار کیلئے
شش(یں) اس انداز سے کی جارہی ہیں وہ سامی زبانوں کے حالیہ تحقیقی مطالعوں کے سامنے بالکل ہیچ اور ناکارہ بلکہ بعض پہلوؤں سے
کن ثابت ہوچکی ہیں یہ نظریہ یکسر غلط ہے اور اس کے نتائج بیکار۔

امت پرستی

امورِ دنیوی ہیں یا مسائل مذہبی ہیں، اور یوں دیکھو تو ان دونوں میں کوئی فرق ہی نہیں، اگر کوئی شخص اصلاح کا
بیڑا اٹھائے تو اسے روایت وقدامت کی ایک زبردست قوت کا مقابلہ کرکے تعطل وبے عملی کا سنگِ گراں اپنی
سے ہٹانا پڑتا ہے کیونکہ یہاں صرف قابلیت اور علم وفضل ہی کا سوال نہیں۔ روٹی کا مسئلہ بھی سامنے آجاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب
ی ایک نیا طریقِ تعلیم وتعلم اختیار کیا جائے گا۔ پرانے طریقِ تعلیم کے اساتذہ کی ضرورت باقی نہ رہے گی اور انھیں ایسے لوگوں کیلئے جگہ
لی کردینی ہوگی جو نئی تعلیم کے لوازمات سے آراستہ ہوں۔ اسلئے کوئی تعجب نہیں کہ ان لوگوں کو جو سوسائٹی کے پرانے جسد میں نئی روح
ونکنا چاہتے ہیں ایک شدید اور زبردست مخالفت سے دوچار ہونا پڑے کیونکہ ان کثیر التعداد ملاؤں، مفتیوں، قاضیوں وغیرہ کا کیا
وبست ہوگا جو بیکار بیٹھ جانے پر مجبور ہوں گے؟ اور اگر ایک بار یہ مان لیا جائے کہ موجودہ شریعت یا فقہ حضور اکرمؐ کی وفات کے
ند کی مرتب کی ہوئی چیز ہے اور محض مقدس اور محترم بنانے کیلئے اسے پیغمبر صلعم سے منسوب کردیا گیا ہے تو یہ ظاہر ہے کہ ایک بڑا گروہ
س نے اس کے طفیل صدیوں تک اپنی قوم کے قلب ودماغ پر حکومت کی ہے کسی اور پیشہ کی تلاش پر مجبور ہوگا یا زاویۂ گمنامی میں جا پڑیگا۔[1]
ہوسکتا ہے کہ ان میں سے اکثر دیانتداری کے ساتھ اپنے منصب اور کام کے تقدس اور اپنی صلاحیتوں کا اعتقاد رکھتے ہوں لیکن ان سے
یہ توقع تو نہیں کی جاسکتی کہ مغربی اندازِ فکر اور طریقِ مطالعہ کو جو مشرقی مذاہب اور مشرقی طریقِ حیات پر کڑی تنقید کرتا ہے بے چون وچرا
اختیار کرلیں گے۔ ہم لوگوں کیلئے تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ یورپ کی نشاۃِ ثانیہ اور اصلاحِ عام کے دور میں ہم اس سے بھگت چکے ہیں۔
اسلام بھی غالباً ایک اصلاحی دور کی دہلیز پر کھڑا ہوا ہے لیکن وہ لوگ بھی جو کسی نہ کسی اصلاحی اقدام کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں یورپ
کے دورِ اصلاحی کے بعد خود عیسائیت میں جو مذہبی فرقہ بندیاں پیدا ہوگئی ہیں ان سے بھڑک جاتے ہیں۔

---

[1] یہ مصیبت پاکستان میں ابھی سے نازک صورت اختیار کرچکی ہے۔ تقسیم ہند کے وقت، ہندوستانی مسلمان جوق درجوق پاکستان کی طرف آنے شروع ہوگئے۔ اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ان میں مختلف پیشوں کے لوگ تھے جنھوں نے یہاں پہنچکر اپنے اپنے پیشے اختیار کرلئے۔ لیکن مذہبی پیشواؤں (مساجد کے ائمہ۔ مذہبی مدرسوں کے اساتذہ۔ قاضی، مفتی وغیرہ) جو یہاں پہنچے تو ان کیلئے یہاں جگہ ہی نہ تھی۔ مساجد سب پُر تھیں۔ ہندو اور سکھ جو اپنی عبادتگاہوں کو خالی کرگئے تھے وہ انھیں الاٹ نہیں کی جاسکتی تھیں۔ کام انھیں کوئی آتا نہیں تھا۔ اب سوچئے کہ بیکاروں کا اتنا بڑا طبقہ جس نے وہاں ایسی زندگی بسر کی تھی کہ لوگ دیتے بھی تھے اور ہاتھ بھی چومتے تھے وہ یہاں کس طرح گذر اوقات کرتا۔ پاکستان کیلئے یہ مسئلہ (PROBLEM) بڑا غور طلب تھا چنانچہ ہم نے اسی زمانے میں اربابِ حل وعقد کی توجہ اس طرف منعطف کراتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر اس طبقہ کی معاش کا بندوبست نہ کیا گیا تو یہ قسم قسم کے فتنوں کا موجب بن جائیگا۔ افسوس کہ اربابِ اقتدار نے اس طرف توجہ نہ دی نتیجہ جس کا یہ ہوا کہ ملک ابتری اور پریشانی کی آماجگاہ بنا دیا گیا۔ اس مصیبت کا اب بھی یہ حل ہے کہ اس طبقہ کے جو لوگ اسوقت ملک میں بیکار ہیں ان کی معاش کا انتظام کیا جائے اور آئندہ کیلئے یہاں مذہبی مدرسے بالکل نہ کھلنے دیئے جائیں تاکہ یہ سلسلہ آگے نہ بڑھے۔ باقی رہی دینی تعلیم سو اس کا انتظام عام اسکولوں اور کالجوں میں کیا جائے۔ اگر قوم نے اب بھی اس طرف توجہ نہ دی تو یہاں بھی وہی کچھ ہوگا جو انڈونیشیا۔ ایران۔ مصر وغیرہ میں ہورہا ہے۔ (طلوعِ اسلام)۔

حدیث وروایات کا اعتبار اور تقدس جو مسلمانوں کی زندگی میں روح وروان کی حیثیت رکھتا ہے یوں تو کوئی ایک ہزار سال
تنقید کا ہدف بننا شروع ہوگیا تھا[1] مگر ان دنوں اس پر ایک تازہ حملہ شروع ہوگیا ہے اور نتیجۃً بہت سی پرانی باتیں ترک کردی گئی ہیں
بھی آزادی سے اختیار کیا جارہا ہے جو پرانی شریعت کی خلاف ورزی ہے اور حج وزکوٰۃ صدقات وخیرات کے پرانے طریقے اب چند ہی
باقی رہ گئے ہیں۔ یہی وہ اہم تبدیلیاں ہیں جو مسلمانوں کی روزمرہ زندگی میں نظر آرہی ہیں۔ تاہم قدامت پرستی کا دیو بھی سخت جان ہے اور
مرا نہیں۔ چنانچہ خود میرے ایک شاگرد کا یہ تلخ تجربہ اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ وہ ایک طلائی انگشتری پہنا کرتا تھا جو اس کے باپ نے اسے تحفہ
دی تھی۔ ایک امام نے دیکھ کر اسے بہت صلواتیں سنائیں۔ کیونکہ ایک حدیث کی رو سے ایسی اشیاء کا استعمال ممنوع سمجھا جاتا ہے۔ اس نے
امام کا برا بھلا سُن لیا مگر اپنی عزیز انگوٹھی کو جدا کرنا گوارا نہ کیا۔ خیر یہ تو ایک معمولی سی بات ہے۔ صرف روایات وحدیث کے متعلق زمانہ حال
مسلمانوں کے تصورات ہی میں نہیں بلکہ قانون کے عملی دائرے میں بھی بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں[2]۔ اب انہی دو امور کی طرف ہم متوجہ ہوتے ہیں۔

اس زمانہ میں روایاتِ قدیم پر جدید تاریخی تنقید کے اثرات کے متعلق ایک واضح اور بے لاگ رجحان کیلئے ہمیں صرف پاکستان کو دیکھ لینا چ
یوں تو تعلیم وتعلّم کے متعلق ایک جدید تصور بہت پہلے سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء) نے پیش کیا اور اسے اختیار کرنے پر زور دیا۔ اور ایک

سرسید احمد خاں

ایسے کالج کو بنانے اور چلانے کی کوشش کی جہاں مغربی تخیل اور مغربی اندازِ فکر کی خوبیاں ایک اسلامی ماحول میں مسلمانو
کے ذہن نشین کرائی جائیں۔ چنانچہ موجودہ علیگڈھ یونیورسٹی ان ہی کی کوششوں کی مرہونِ منت ہے۔ ان کا کہنا یہ تھ
اسلام اور سائنس میں کوئی سپردِ عناد ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ اس پر زور دیتے رہے کہ اسلام نیچر کے عین مطابق ہے۔ اسلئے انھوں نے اسلام
معجزاتی عنصر سے بھی یکسر انکار کر دیا اور مُلّاؤں کی شدید مخالفت کا پورا بوجھ برداشت کرتے رہے۔ جس مدرسہ کی انھوں نے بنیاد ڈالی تھی اس
اثرات مہتم بالشان اور عظیم ہوئے۔ ازانجملہ کثرتِ ازدواج، طلاق اور غلامی جیسی معاشرتی خرابیوں پر مخلص مسلمان سنجیدگی سے غور کرنے لگے
انھیں روایاتی طریقِ زندگی اور اس کی اسناد کے متعلق ایک ناقدانہ رجحان اختیار کرنا پڑا۔

سید امیر علی

ان کے بعد سید امیر علی آئے جو فرقۂ شیعہ کے عالم تھے۔ ان کی تصنیف 'اسپرٹ آف اسلام' سارے اسلامی ممالک میں بڑے شوق
سے پڑھی جاتی ہے جس میں وہ علما کی تعبیر وتفسیر کے بغیر قرآن کے بالراست مطالعہ کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ ان کی رائے میں
تفسیریں اسلاف کی غیر مستند تعلیمات پر مبنی ہیں۔ کثرتِ ازدواج کو بھی وہ قرآنی سند سے مطعون ٹھہراتے ہیں جس کی رو سے اگرچہ وقت وا
چار بیویوں کی حد تک اجازت دی گئی ہے مگر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کوئی شخص متعدد بیویوں کے ساتھ مساوات وعدل نہیں کرسکتا اسلئے اسے

---

[1] امام شافعیؒ نے اپنی تصنیف "کتاب الام" میں "منکرینِ حدیث" کی ایک طویل بحث نقل کی ہے۔ (طلوع اسلام)

[2] یہ تبدیلیاں "منکرینِ حدیث" ہی کی طرف سے نہیں ہو رہیں بلکہ حدیث پر ایمان رکھنے والوں کی طرف سے بھی ہو رہی ہیں۔ اس کی زندہ
پاکستان کی اسلامی جماعت ہے۔ یہ اپنی ہر نئی تحریر اور تقریر میں حدیث کے متعلق اپنے سابقہ موقف سے ہٹ جاتے ہیں۔ چنانچہ آج
ہے کہ ان میں سے کوئی بھی متعین طور پر نہیں بتا سکتا کہ آئین یا قوانین کے سلسلے میں حدیث کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔ ہم اس بات کو یونہی قیاساً نہیں
آپ ان سے کہئے کہ یہ کسی ایک جگہ واضح طور پر لکھیں کہ اس باب میں حدیث کا یہ مقام ہے۔ اور ہم بتائیں گے کہ یہ خود اس سے پہلے
خلاف کیا کچھ کہہ چکے ہیں۔ (طلوع اسلام)

ی پر اکتفا کرنا چاہیئے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جذباتِ انسانی کے معاملہ میں چونکہ عدل و مساوات ممکن ہی نہیں اسلئے قرآن کی اس اجازتِ مشروط
ددِ ازدواج کی ممانعت ہی تصور کرنا چاہیئے۔ (میری اس کتاب کا مقصد اگر مناظرہ و مباحثہ ہوتا تو میں یہ پوچھتا کہ جب شرط کی تکمیل ناممکن تھی تو شرط
ہی کیوں کی گئی اور کثرتِ ازدواج کو صراحتاً ممنوع کیوں نہیں کر دیا گیا اور جواز کی صورت رکھی ہی کیوں[۸۱]؟) مسلمان جو آجکل اس قعرِ مذلت میں
ے ہوئے ہیں اس کا سبب وہ یہ بتلاتے ہیں کہ ماضی کے جکڑبند نے ان کا گلا گھونٹ رکھا ہے اور آزادیِ فکر و خیال سلب کر لی ہے۔ آخر میں
وں نے اپنی یہ آرزو ظاہر کی ہے کہ اسلام کے علما و فضلا کی ایک مؤتمر اعتماد اور یقین کے ساتھ یہ اعلان کر دے کہ غلامی کی طرح کثرتِ ازدواج
منشائے اسلام کے منافی اور متضاد ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آزادیٔ فکر اور حقِ اجتہاد کو وہ علما ہی کی حد تک محدود رکھنے کے حامی ہیں۔ پردہ
ں عورتوں کو علیحدہ رکھنے کی رسم کے متعلق ان کا خیال تھا کہ بمقتضائے حالات حضورِ اکرمؐ نے عارضی طور پر اسے اختیار کیا تھا اور
شہ کے لئے اسے ایک دستورِ معاشرہ قرار دینا مقصود نہ تھا۔ چنانچہ قرآن میں کہیں اس کا ذکر بھی نہیں[۸۲]۔ یہ مصلح اپنی آزاد خیالی میں
نک بڑھ گیا ہے کہ دوسرے اس کی پیروی میں تامل اور پس و پیش کرنے لگے ہیں۔ حتیٰ کہ خود قرآن کو اس نے حضورِ اکرمؐ کی تصنیف قرار
ی ہے۔ اور اگرچہ اکثر مسلمان کچھ ایسا ہی عقیدہ رکھتے ہیں[۸۳]۔ اور گفتگو میں صاف اعتراف بھی کر لیتے ہیں مگر مجھے زمانۂ حال کے کسی
ے مسلمان مصنف کا علم نہیں جس نے اپنی تحریر میں ان سے اتفاق کیا ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی تاریخی وجہ اس اعتراف میں مانع ہو
لہ قرآن کے غیر مخلوق یعنی حرفاً و لفظاً کلام اللہ ہونے کا عقیدہ تیسری صدی ہجری تک ثابت نہیں کیا گیا تھا[۸۴]۔ علاوہ ازیں مجھے اس میں
شبہ ہے کہ مسلمانوں کی کوئی بڑی تعداد امیر علی کی اس رائے کی حمایت کر سکے گی کہ حضرت مسیحؑ کے ابن اللہ ہونے کے عقیدہ کے سوا اسلام
عیسائیت میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ بعد کی صدیوں میں اسلام نے جو شکل اختیار کر لی اس کی بہ نسبت قرآن عیسائیت
، بہت زیادہ قریب ہے۔

سال[؟] امیر علی کے بعد ایک عظیم شخصیت سر محمد اقبال (۱۸۷۶ء تا ۱۹۳۸ء) کی آتی ہے۔ وہ ایک بڑے شاعر تھے اور فارسی و اردو

ں فاضل مقالہ نگار کا یہ اعتراض بالکل صحیح ہے اور سید امیر علی اور ان جیسے اور حضرات کا معروضی انداز غلط۔ قرآن نے تعددِ ازدواج کی اجازت
ہے لیکن صرف انہی حالات میں جب معاشرہ میں کسی وجہ سے مثلاً جنگ وغیرہ سے یہ صورت پیدا ہو جائے کہ یتیموں اور بیواؤں کی تعداد بہت
جائے اور ان کی حفاظت اور پرورش کا تقاضا ہو کہ انھیں اجزائے خاندان بنا لیا جائے۔ عدل کی شرط کے ساتھ صرف انہی حالات میں تعدد
ج کی اجازت دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اجازت انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ یعنی اس بات کا فیصلہ معاشرہ کو کرنا ہوگا کہ ایسے ہنگامی حالات
گئے ہیں۔ قرآن میں ایسے حالات کے علاوہ اور کسی صورت میں تعددِ ازدواج کی اجازت نہیں۔ (طلوعِ اسلام)
ن، عورت کی بیباکی کو روکتا ہے لیکن اسے چاردیواری میں محبوس رکھنے یا لحافوں میں لپیٹنے کا حکم نہیں دیتا۔ (")
وقت ہمارے سامنے 'اسپرٹ آف اسلام' نہیں ہے۔ لیکن اگر سید امیر علی نے واقعی یہ کہا ہے تو اس سے ان کا اسلام باقی نہیں رہ سکتا (")
عقیدہ رکھتا ہے وہ قرآن کی رو سے مسلمان نہیں ہے۔ (")
صنف کو مسئلہ خلق و قدمِ قرآن کے سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔ جو لوگ قرآن کو مخلوق کہتے تھے ان کا عقیدہ یہ نہیں تھا کہ وہ رسول اللہؐ کی
یہ دونوں گروہ قرآن کو منزل من اللہ اور وحیِ خداوندی مانتے تھے۔ (طلوعِ اسلام)

ہر دو میں شعر کہتے اور فلسفیانہ مضامین انگریزی میں لکھا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں انھوں نے اپنے چھ لکچرز "اسلامی فکرِ مذہبی کی تشکیل جدید" عنوان سے شائع کئے۔ اگرچہ اقبال کا ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن و دماغ پر بہت کچھ اثر پڑا ہے لیکن اس میں شبہ ہے کہ انھوں نے جس چیز کا نام تجدید دیا ہے وہ فی الحقیقت تشکیلِ جدید متصور ہو سکتی ہے۔ چنانچہ جب وہ جزئیات اور تفصیلات کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی عبارت صاف اور واضح ہوتی ہے لیکن جب وہ عام اصول سے بحث کرتے ہیں تو تصوف اور شاعری ان کی تحریر پر غالب آجاتی ہے اور یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ان کے نظریوں کا ماحصل آخر ہے کیا؟ یہ تصور بھی درست نہ ہوگا کہ ان کی تصنیف الغزالیؒ کے احیاء العلوم سے جس میں مسلمانوں کے اعمال، ان کی حیاتِ باطنی اور مقاصد و عزائم کی ایک منظم اور مربوط تصویر نظر آتی ہے، کوئی مماثلت رکھتی ہے۔ ذیل میں ان کے لیکچروں کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے جس کے لئے میں نے پروفیسر گب کی واضح تصنیف "اسلام کے جدید رجحانات" سے استفادہ کیا ہے۔

اقبال اس پر زور دیتے ہیں کہ زمانۂ حال کے مسلمانوں کو یورپ کے فکر و خیال کا مطالعہ کرکے یہ طے کرنا چاہئے کہ جن نتائج پر یورپ پہنچا ہے وہ اسلامی فکرِ مذہبی کی نظرِ ثانی اور بشرطِ ضرورت تشکیلِ جدید کے لئے کہاں تک مفید و کارآمد ثابت ہوں گے۔ لیکن اسلامی نظام پر نظر کرتے وقت ماضی سے بالکلیہ قطعِ تعلق مفید و مناسب نہ ہوگا۔ مگر جب وہ خود ایسا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ روزمرہ کی عملی زندگی کو چھوڑ کر صوفیانہ تخیل کے خیالی زاویہ میں پہنچ جاتے ہیں اور جب وہ قرآنی تعلیم کے متعلق یہ بتاتے ہیں کہ وہ ایغوئے انسانی کو تخلیقی آزادی بہرہ مند قرار دیتی ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ جدید فلسفیوں کے بعض نظریوں سے متاثر[1] اور روایتی اسلام سے دور جا پڑے ہیں۔ زوالِ آدم کے بارے میں ان کی تعبیر کچھ مسیحی علمائے حال ہی کی نہج کی ہے۔ یعنی یہ زوال نہیں بلکہ عروج تھا۔ ادنیٰ جبلی خواہشات، خوگر انسان کا ایک آزاد و ذی شعور شخصیت کے حصول کے لئے جو شبہ اور انکار کی صلاحیت بھی رکھتی ہو اور بتدریج ایک ایسی کامل ایغو میں تبدیلی کا بھی جو حقِ اختیار و انتخاب سے بھی مستمند ہو۔ تقدیر کے معاملہ میں مسلمانوں کا اعتقاد، ان کے خیال میں، ایک اخلاقی ابتری اور ایسے لوگوں کی ایجاد جنھیں فلسفیانہ حقائق کا کوئی ادراک نہیں۔ غرض ان کی رائے میں یہ ایک ایسا عقیدہ ہے جسے مطلب پرستوں نے پیدا کیا اور غرض مندوں نے فروغ دیا ہے۔

جنت اور دوزخ کے متعلق ان کی تعلیم کچھ مانوس سی معلوم ہوتی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

دوزخ اور جنت محض کیفیات ہیں مقامات نہیں۔ قرآن شریف میں ان کا بیان ایک حقیقتِ باطنی کا مرئی بیان ہے۔ اس کے مفہوم میں دوزخ ایک دہکتی ہوئی آگ ہے جو انسان کے قلب پر مستولی ہو جاتی ہے یعنی ناکامی کا تلخ ترین احساس۔ اور جنت تحلیل و بربادی کی قوتوں کے مقابلہ میں کامرانی کی مسرت و انبساط کا نام۔ اسلام میں لعنتِ ابدی کوئی شے نہیں۔ اگرچہ دوزخ کے ساتھ قرآن کی بعض آیتوں میں ابدیت کا لفظ آیا ہے مگر اس کی قرآن نے خود توضیح کر دی ہے کہ وہ زمانہ کی ایک میعاد ہی ہے . . . .

. . قرآن کے تصور میں دوزخ اذیتوں اور عذابوں کا غار نہیں جو ایک خدائے منتقم کی طرف سے دیئے جا رہے ہوں بلکہ ایک شعوری

---

[1] یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس باب میں بعض جدید فلاسفہ قرآن کے اس تصور سے متاثر نظر آتے ہیں نہ یہ کہ اقبال جس نے اپنی فکر کا قرار دیا ہے ان فلاسفروں کے تصور سے متاثر ہے۔ (طلوعِ اسلام)۔

ن ہے کہ سخت سے سخت الیوم میں بھی رحمتِ خداوندی کے حیات بخش جھونکے کا پھر ایک بار ذوق و احساس پیدا کردے[1]۔ اسی طرح نا بھی صرف آرام اور تعطل محض نہیں کیونکہ حیات صرف ایک ہے اور مسلسل۔ . . . . آزاد الیوم کے ہر عمل سے ،نیا ماحول عالم وجود میں آتا ہے اور تخلیقی مظاہرے اور انکشاف کے نئے نئے موقعے بہم پہنچتے ہیں۔

ورت نہیں کہ یہ باتیں کس خطرناک حد تک کفر کے قریب آگئی ہیں[2]۔ اقبال کی نظروں میں انسان خود ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ہے کیونکہ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم (۱۱:۱۳)۔ اقبال کے نظریوں کے اس مختصر خلاصہ سے ناظرین پر واضح ۔انھوں نے مسلمانوں کے لئے چند اصول مرتب کر دیئے ہیں جو کسی حد تک آج کے مسیحی فکر و خیال سے مشابہ ہیں اور ایسی آیاتِ قرآنی پر ئی نسلوں سے مختلف تعبیر کی جاتی رہی[3]۔ لیکن یہ صاف محسوس ہونے لگتا ہے کہ جب ان کی تعبیر کے زمانۂ حال کے مقتضیات کے ی اطلاق کا سوال آتا ہے تو وہ راہ کترا جاتے ہیں کیونکہ انھیں اس بات کا پورا احساس ہے کہ ایسی مطابقت کا مسئلہ بڑا نازک ہے اور بہ داری نہایت گراں بار۔ اسلام نے صدیوں کے دوران میں ایک اجتماعی ضمیر اور مرضی عامہ پیدا کر رکھی ہے۔ اس لئے اس کے پیروؤں کو یر گریز نہیں کہ کھانے پینے، نہانے دھونے، پاکی و ناپاکی کے بے ضرر معاشرتی مسائل میں تغیر و تبدل کا نہ ہو سکنا بھی کچھ نہ کچھ قدر و قیمت یہ مختلف النسل مسلمانوں کی شیرازہ بندی میں بڑی حد تک ممد و معاون ہے۔ اسلئے قبل اس کے کہ اس میں کوئی دست اندازی کی جائے یت و اثر کا اندازہ کر لینا بھی ضروری ہوگا پھر آگے چل کر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ائمہ فقہ نے کبھی یہ دعوی نہیں کیا کہ ان کے بینہ وجوہ حتمی ہتم اور قطعی ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ آج کے آزاد خیال مسلمانوں کی نسل کا جدید زندگی کے بدلے ہوئے حالات میں بنیادی اصولِ موجودہ تجربوں کی روشنی میں تعبیر کرنے کے حق کا ادعا مجھے بالکل حق بجانب اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مشہور ترکی شاعر و ماہر عمرانیات ضیا ،نے ایک نظم لکھی تھی اور یہ سوال اٹھایا تھا کہ عورتوں کو قابلِ حقارت تصور کرنے کا شرع کو کیا حق حاصل ہے۔ طلاق۔ تفریق اور کے معاملات میں اسے مساویانہ حقوق کیوں نہ دیئے جائیں؟ اسپر اقبال کہتے ہیں کہ وہ یہ تو نہیں جانتے کہ شرع اسلام کی رو سے ان ں میں مساوات ممکن ہے یا نہیں لیکن انھیں معلوم ہے کہ ہندوستان کے کٹر مسلمانوں کی قدامت پرستی کے مدِ نظر ججوں کو بھی مستند کتب کی پیروی سے کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اقبال کے ان جرأت آمیز اقوال کے مدِ نظر جو پہلے گذر چکے ہیں، اقبال کا اس طرح کا . . . یہ عجز اور کمزوری رہے۔ ایک عورت کو جس نے باپ کے ترکہ سے بھائی کے حصہ کا نصف ہی پایا ہو محض یہ کہدینا کوئی تسلی نہیں دیتا کہ اسلامی قانونِ مرد کو عورت پر کوئی فوقیت نہیں ہے[4] اور یہ تصور اسلامی اسپرٹ کے بالکل خلاف ہے۔ میری رائے میں اقبال یہاں قرآن کے ن کو نظر انداز کر رہے ہیں۔

ک یہ تعبیر قرآنی نہیں۔ قرآن جہنم کو اصلاحی تدبیر کہیں نہیں کہتا۔ اس کے نزدیک جہنم سلسلۂ ارتقا میں پیچھے رہ جانے کی حالت کا نام ہے ہ جانے کا۔ (طلوعِ اسلام)

م کی رو سے۔ نہ کہ قرآن کی رو سے۔ (")

ت کے زیرِ اثر کی جاتی رہی ورنہ خالص قرآن کی رو سے یہ تعبیرات نئی نہیں ہیں۔ (")

ی کی نسبت بہن کا حصہ اسلئے نصف ہے کہ عورت کسی منزل میں بھی ہو قرآن نے اسکی ضروریاتِ زندگی کا کفیل مرد کو قرار دیا ہے۔ (")

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ [1] (۲/۲۲۸)

ایک مختصر سی نظم میں وہ کہتے ہیں:

میں بھی مظلومئ نسواں سے ہوں غمناک بہت — نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود (ضربِ کلیم)

یہ مجھے ایک ایسے شخص کی دلدوز آہ معلوم ہوتی ہے جو رسم و رواج اور بزرگوں کی ریت کی زبردست قوتوں سے دست و گریباں ہونے سے عاجز ہو۔

[اس کے بعد مصنف نے اس موضوع پر بحث کی ہے کہ حدیث کی صحیح پوزیشن کے متعلق پاکستان میں کس قسم کی بحثیں چھڑ رہی ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے ایک سلسلہ مضامین کا ذکر کیا ہے جو رسالہ اسلامک لٹریچر میں شائع ہوا تھا۔ ہم اس حصہ کو حذف کر رہے ہیں اسلئے کہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو قارئین طلوع اسلام کی نظروں سے نہ گذر چکی ہو۔ اگر طلوع اسلام انگریزی میں شائع ہوتا اور فاضل مصنف کی نگاہ سے اس میں پیش کردہ خیالات گزر جاتے تو انکو اس باب میں ایسی طویل گفتگو کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ بہرحال، اس کے بعد وہ ان تحریکات کا ذکر کرتے ہیں جن کی رو سے مختلف اسلامی ممالک میں تجدید فقہ کی اہمیت کا احساس بیدار ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:—]

تجدید فقہ

بعض ملکوں میں کچھ معاملات شرع کے دائرے سے خارج کر کے دنیوی عدالتوں کو ان کی سماعت کا اختیار دیدیا گیا ہے اور جو بھی تبدیلیاں اسلامی ملکوں میں ہوئی ہیں یا ہو رہی ہیں فی الجملہ گذشتہ ایک ہزار سال سے اب تک دیکھنے میں نہیں آئیں۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے ترکی نے شرعی قوانین کو کلیۃً خیرباد کہدیا ہے اگرچہ واقعتاً مذہب اسلام کے اثرات اس کے باشندوں عموماً اور ایشیائی حصہ میں خصوصاً خاطر خواہ گہرے ہیں اور نئے جمہوریہ دور میں بڑھتے ہی جائیں گے لیکن سرکاری طور پر وہ اب ایک غیر مذہبی حکومت بن گئی ہے۔

"ماڈرن ورلڈ" کے سلسلہ ادارایات اور بعض دوسری تحریرات میں میرے شریک کار مسٹر اینڈرسن نے بتلایا ہے کہ عرب ملکوں [illegible] طرح اسلامی شرع کی نظر ثانی ہو رہی ہے۔ مصر، سوڈان، شام، لبنان اور عراق سب جگہ اس تحریک کا آغاز ہو گیا ہے جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ کس طرح جدید زندگی کے تقاضوں اور انسانی تعلقات کے آزاد خیال اور روشن خیال پہلو ملحوظ رکھتے ہوئے شریعت کو جدید قانون سازی سے مطابق بنانے کی کامیاب کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ نہیں ہوا بلکہ کافی غور و خوض کے بعد تبدیلیاں عمل میں لائی جا رہی ہیں۔ اس دانشمندی و تدبر کیلئے یہ مصلحین مستحق صد ستائش جستجو اور تحقیق کے اصول پر کاربند ہیں اور اپنے جدید خیالات کی حمایت کیلئے صرف چار بڑے مذاہب فقہ ہی پر اکتفا نہیں کرتے فرقوں اور ظاہریوں کی کتب سے بھی استفادہ کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ اس طرح ہر خطہ اور ہر ملک میں جو مذہب یا مکاتب

---

[1] فاضل مصنف نے اس آیت کا مفہوم غلط سمجھا ہے۔ قرآن میں جس جگہ یہ آیت آئی ہے وہاں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ عورت، عدت کے دوران ... کر سکتی لیکن مرد کو حق حاصل ہے کہ اس دوران میں اسے واپس لے لے۔ بس یہ ایک درجہ ہے کہ جو مرد کو عورت پر حاصل ہے۔ اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا اسے بطور اصول کلی کے بیان کیلئے کہ مردوں کو عورتوں پر فوقیت حاصل ہے، غلط ہے۔ (طلوع اسلام)

ع کرتے رہنے کے ایک بہترین انتخاب کے اصول پر نئی قانون سازی شروع کی گئی ہے جیسا کہ پہلی نظر میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ طریقہ
یونکہ جہاں بعض متقنین کا یہ خیال ہے کہ جو شخص جس مکتب مذہبی میں پیدا اور بڑا ہوا ہے اسے ہمیشہ اسی کا پیرو رہنا چاہئے۔ دوسرے
ں کہ جزء جزء تو نہیں لیکن اگر وہ چاہے تو کلیتہً اپنا فقہی مذہب تبدیل کر سکتا ہے پھر ایک جماعت ایسی ہے جو جدید انتخابی طریق
ے اپنی تائید میں کچھ سابقہ نظائر بھی رکھتی ہے اور اس پر قائم ہے کہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ جملہ مسائل میں کسی ایک مکتب کا تابع
بجائے بعض مسائل میں کسی مکتب کی پیروی کرے اور دیگر مسائل میں دوسرے کی اگر اس کا ضمیر ایسی اجازت دے تبدیلیٔ مسلک کا یہ عمل
ہے۔ یہ حق بہرحال افراد کو حاصل ہوتا ہے مفتی اور قاضی کو نہیں جسے بہ لحاظ فرائض منصبی قوم کے کردار و عمل کے ذمہ دار نگراں
وام کی صحیح رہنمائی کے لئے اپنے ہی مکتب کے نظریوں کی تقلید کرنی اور کرانی لازم ہوتی ہے اور جس کو صرف صدرِ حکومت ہی
مقاصد پر اس فرض سے بری الذمہ کر سکتا ہے۔

م مسائل پر شدت کے ساتھ بحث مباحثہ اور ردّ و قدح ہوتی رہی ہے۔ آج کل کے قانون ساز حقِ اجتہاد کے تو مدعی نہیں لیکن وہ یہ
تے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ کیا ہے وہ سابق متقنین اور شارعین کی آراہی سے منتخب اور اخذ کیا ہوا ہے اور یہ انتخاب اس اصول پر ہوا ہے
رحال اقتضائے زمانہ کے مطابق ہونا چاہئے۔ ان کے وضع کئے ہوئے قانون جب 'اجماع' سے متصادم ہو جاتے ہیں جیسا کہ بعض وقت
تو وہ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ واقعی طور پر ایسا ہوا ہے کیونکہ یہ خود ثبوت طلب ہے کہ ایسا 'اجماع'[1] کبھی معرضِ وجود میں آیا تھا۔ ورنہ کہیں نہ
ئیا ہوتا کہ فلاں فلاں مسائل اجماعِ امت سے طے شدہ ہیں اور 'اجماع' اسی صورت میں مستند اور قابلِ پیروی ہوگا جب یہ ثابت ہو جائے
صحابۂ رسول نے مدینہ سے منتشر ہونے کے پیشتر کامل طور پر اتفاق کر لیا تھا۔

ل کے مصلحین نے جن مسائل کو اٹھایا ہے وہ ایک خصوصی اہمیت کے حامل ہیں اور نتائج میں دور رس۔ مثلاً اوامر و نواہی کے متعلق ان کا
بھی یہ طے ہونا ہے کہ ان میں کونسے حکمی ہیں اور کون سے اختیاری۔ کیا ان کا یہ مطلب ہے کہ فلاں کام ہرگز نہ کرو یا یہ کہ نہ کرنے ہی میں تمہاری
ان کا تعلق ضمیرِ انسانی سے ہے جس کی پرسش مرنے کے بعد آسمان پر ہوگی یا ایسے معاملات سے جن کی تحقیقات زندگی میں ارضی
؟ نیز یہ کہ آیا یہ احکامِ مقدس اب بھی قابلِ پابندی ہیں جبکہ وہ حالات اور شرائط مفقود ہو چکے جن کے تحت ان کا نفاذ

ر پر تو مسلمانوں کے تمام افعال و اعمال پر شریعت حاوی ہے لیکن عملاً رواجی قانون بھی اپنی جگہ پر قائم رہا۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے
ان ملک کے حکم سے احکامِ شرع نظر انداز کر دیئے گئے۔ تعزیری اور تجارتی معاملات میں خصوصاً ایسا ہوتا آیا ہے۔ قدیم سلطنت عثمانی
ں میں ڈھلے ہوئے تجارتی و تعزیری قوانین کوئی سو سال قبل ہی نافذ کئے گئے تھے۔ مصر میں بھی ۱۸۷۵ء میں نپولین کے کوڈ کی اساس پر

[1] اسلام میں بتایا جا چکا ہے اجماع کا وقوع تو ایک طرف اس کی آج تک کوئی جامع تعریف ہی متعین نہیں ہو سکی۔ (طلوعِ اسلام)
ارئین طلوعِ اسلام کے ذہن ان باتوں سے پریشان نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ یہ تمام امور طلوعِ اسلام کے صفحات پر اس طرح صاف
یں کہ ان کے متعلق اب شاید ہی کوئی ابہام باقی رہا ہو۔ (طلوعِ اسلام)

ایک ضابطہ دیوانی مدون ہوا اور اسی کے بعد سے مسلسل شرعی عدالتوں کا دائرہ عمل محدود ہوتا جا رہا ہے چنانچہ اب نکاح۔ طلاق۔ حضانت حقوق اقربا اور وراثت جیسے شخصی معاملات ہی پر انھیں اختیار سماعت حاصل رہ گیا ہے اور ابھی چندہی روز قبل سے بالوصیت کے مقدمات شرعی عدالتوں سے لیکر سول عدالتوں کے سپرد کر دیئے گئے ہیں۔

پسند اور انتخاب کی بنا پر شریعت کی نظر ثانی کوئی نئی چیز نہیں قابل احترام نظائر تاریخی اسکی حمایت میں موجود ہیں چنانچہ ایک مدت کا عرصہ ہوا استنبول کے شیخ الاسلام نے فتوی دیدیا تھا کہ ایک ایسی عورت کا نکاح جسے شوہر نے چھوڑ رکھا ہو بذریعہ عدالت فسخ کیا جا سکتا ہے۔ یہ فتوی مکتب حنفی کے جو سلطنت عثمانی کے سرکاری مذہب کی اساس تھے، سراسر خلاف تھا، اگرچہ بقیہ تین مذاہب فقہ اس کی اجازت دیتے تھے اسلئے حنفی حکام کو مجبور نہ کرنے کے خیال سے گورنمنٹ نے یہ طے کیا کہ معاملہ کسی دوسرے مکتب کے قاضی کے پاس غور اور تصفیہ کے لئے پیش کر دیا جائے۔ اسی طرح ۱۹۱۵ء میں ایک عورت کو فسخ نکاح کا اس بنا پر حق دیدیا گیا کہ اس کا شوہر بعض مخصوص امراض میں مبتلا تھا۔

اپیل کی عدالتیں

ایک بہت بڑی تبدیلی جو مشرق قریب میں ہوئی ہے وہ عدالہائے اپیل کا قیام ہے۔ شریعت کے انتظام میں تو کسی ایسی عدالت کی گنجایش نہ تھی اسلئے یہ ایک بدعت متصور ہوگی اور بدعات کو عام طور پر الحاد کا مترادف سمجھا جاتا ہے باایں ہمہ اس نئے انتظام کی چنداں مخالفت نہیں ہوئی کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت یہ مانتی ہے کہ اس میں مفاد عامہ مضمر ہے۔

مصر میں ایک اور انوکھا طریقہ شرعی احکام کو نظر انداز کرنے کا اختیار کیا گیا ہے یعنی احکام شریعت تو جوں کے توں اپنی جگہ پر قائم ہیں لیکن ججوں کو بعض قسم کے مقدمات کی سماعت سے ممنوع کر دیا گیا ہے۔ نابالغوں کی شادی مصریوں کو سخت ناپسند ہے لیکن وہ اس پر قید و بند مشکل عاید کر سکتے ہیں کیونکہ حضور اکرم نے حضرت بی بی عائشہؓ سے ایسی عمر میں نکاح کیا تھا جبکہ وہ ابھی بچہ ہی تھیں اور گڑیاں کھیلا کرتی تھیں[1]۔ اسلئے اس پر امتناع عائد کرنا دشوار تھا لہذا ۱۹۲۳ء میں انھوں نے یہ قانون پاس کیا کہ بجز اثبات نسب کے مقدمات کے عدالتیں کسی ایسے مقدمہ کی سماعت نہ کریں جن میں شادی کے وقت زوج کی عمر ۱۸ سال اور زوجہ کی عمر ۱۶ سال سے کم رہی ہو۔ عہدہ داران سرکاری کو ممانعت کر دی گئی ہے کہ متذکرہ صدر سے کم عمر والوں کے نکاح کی رجسٹری نہ کریں۔ اسی طرح ناپسندیدہ، نامعقول، اور مضرت رساں احکام شرعی کو معطل اور بے کار کر دینے کی تدبیروں کو اور وسعت دی جا سکتی ہے[2]۔ مثلاً اگر کسی شخص نے مصلحت عامہ کو نظر انداز کرتے ہوئے شرعی اجازت و رعایت سے فائدہ اٹھایا ہے تو اسے عدالتی انصاف رسانی سے محروم کر دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نابالغوں کے نکاح کی ہمت افزائی کرنے والے ایسا کرنے سے قبل دوبارہ سوچیں گے اور باوجود اسکے اگر انھوں نے شرعی رعایت سے فائدہ اٹھایا تو اس کی جوکھوں کے وہی ذمہ دار ہوں گے۔

ترکی کا قانون

زمانۂ حال کی سب سے اہم قانون سازی ترکی کے "قانون حقوق خاندانی" بابتہ ۱۹۱۷ء کی منظوری ہے۔ اس میں شبہ نہیں یہ قانون اب خود اس ملک میں موثر و نافذ نہیں جہاں یہ پاس ہوا تھا لیکن اس پر ایک بڑی حد تک شام، لبنان اور یردن

---

[1] یہ بالکل وضعی کہانی ہے۔ حضرت عائشہؓ نابالغ نہیں تھیں ۔ قرآن کی رو سے نکاح کی عمر ہی بلوغت کی عمر ہے نابالغ کا نکاح ہو ہی نہیں سکتا۔ (طلوع

[2] اس قسم کی حیلہ جوئیاں نہ تدبیریں اسلئے اختیار کرنی پڑتی ہیں کہ جرأت رندی سے اس کا اقرار نہیں کیا جاتا کہ دین اور رسول اللہ کی سیرت کی اصل قرآن اور صرف قرآن ہے اور جو کچھ قرآن کے خلاف ہے وہ غلط اور وضعی ہے۔ جب تک یہ ذہنیت پیدا نہ ہوگی دین کا کوئی معاملہ صحیح خطوط پر تشکیل نہیں ہو سکے گا۔ (ط)

ہوتا ہے۔ اس کی رو سے ایسے لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی ممنوع ہے جو ابھی سنِ بلوغ کو نہیں پہنچے اس کے ساتھ ایک توضیحی یادداشت بھی
...ل ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نکاح نابالغاں کے بارے میں یہ میلان انسانیت کے اصول پر مبنی ہے[1]۔ یعنی کس قدر افسوس اور دکھ کی بات
... ایسے بچے کو جسے بے فکری اور لاپرواہی سے گلی کوچوں میں کھیل کود میں مشغول رہنا چاہئیے بچے پیدا کرنے اور خانہ داری کی ذمہ داریاں سنبھالنے
...جبور کیا جائے! ظاہر ہے کہ ایسی افسوسناک شادیوں سے مائیں اعصابی امراض کا شکار ہو جاتی ہیں اور اولاد کمزور، نحیف و ناتواں۔ بغرض اس
...ن کے مجوزین اس رسم قبیح کو مسلمانوں کی موجودہ عام جسمانی ابتری کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ اس قانون کی رو سے یہ حکم بھی دیدیا گیا ہے کہ عقدِ
...ح سے قبل عام اشتہار ضروری ہے اور سیاہہ جات نکاح کی رجسٹری ایک مقررہ عہدہ دار کے روبرو لازم۔ با ایں ہمہ خواہ زوجین عمر قانونی سے
...م ہوں، محرمات شرعی کے دائرہ میں آتے ہوں یا چار بیویوں[2] کی موجودگی میں پانچویں بیوی کی جا رہی ہو، یا نکاح جبر کے تحت کیا جا رہا ہو نکاح
...سد نہیں قرار پاتا۔ نکاح صرف اسی صورت میں فاسد ہوتا ہے جب کوئی مسلمان عورت کسی غیر مسلم مرد سے بیاہ کرے! دوسرے تمام نکاح
...قاعدہ اور ہوس رانی میں شمار ہوں گے لیکن ناجائز اور فاسد نہیں[3]۔ اسی قانون کی رو سے مسلمان عورت کو یہ حق بھی دیا گیا ہے کہ وہ اپنے
...ح کے معاہدہ میں یہ شرط کرے کہ شوہر اس کی زندگی میں عقدِ ثانی نہ کرے گا۔ یہ شرط جائز ہوتی ہے اور معاہدہ درست۔ مصر میں بھی ایسی اصلاحات
...جزو قانون بنانے کی بارہا کوششیں ہوئی ہیں لیکن کامیاب نہ ہو سکیں۔ ایک بار تو یہ ملک کا قانون بن ہی گیا ہوتا اگر مخصوص اختیاراتِ شاہی کا
...ستعمال کر کے اسے منسوخ نہ کر دیا جاتا۔

قانوناً شوہر پر لازم ہے کہ بیوی کا مہر ادا کرے اور اس کے نان و نفقہ کا بندوبست کرے۔ نکاح سے میاں بیوی میں باہمی وراثت کا تعلق
...ی پیدا ہوتا ہے۔ بیوی پر لازم ہوتا ہے کہ میاں کے حقِ زناشوی کو پورا کرے بجز اس کے کہ وہ معذور ہو مثلاً بیماری، قید وغیرہ۔ کسی فریق کو یہ حق
...اصل نہیں کہ اپنے کسی رشتہ دار کو فریقِ ثانی کی صریح رضامندی کے بغیر ساتھ رکھے۔ اگر کوئی مرد اپنی زوجہ کے نان و نفقہ کا بندوبست کرنے میں
...غفلت و کوتاہی کرے تو بیوی عدالت سے استمداد کر سکتی ہے۔

میاں بیوی کے مابین طلاق واقع ہو جانے کی صورت میں ترکی کے اس قانونِ حقوقِ خاندانی نے حضانت کی اغراض کیلئے لڑکوں اور
...لڑکیوں کی عمر علی الترتیب سات اور نو سال سے بڑھا کر نو اور گیارہ سال کر دی ہے۔ سوڈان میں البتہ لڑکیاں شادی ہونے تک اپنی ماؤں کے ساتھ
...رہ سکتی جاتی ہیں۔ یہ تمام اصلاحات زیادہ تر چاروں مذاہبِ فقہ میں سے کسی زیادہ انسانیت پسند اور منصفانہ رائے پر مبنی کی گئی ہیں[4]۔

طلاق　اسی طرح مسلم ممالک میں عورتوں پر طلاق کے بارے میں جو ظلم اور ناانصافی ہو رہی تھی وہ ... حال میں بہت کچھ کم ہو گئی ہے۔ حنفی
فقہ کے تحت جو دنیائے اسلام کے بڑے حصہ میں نافذ ہے شوہر کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ زوجہ کو کسی سبب پر یا بغیر کسی سبب کے بھی
...ق دیدے۔ اس کے بعد پھر ان دونوں میں مکرر نکاح نہیں ہو سکتا۔ اگر شوہر اپنی حرکت پر منفعل ہو اور دوبارہ اسی عورت کو اپنی زوجیت میں

[1] قرآن کے اصول پر جو نکاح کی عمر ہی بلوغت قرار دیتا ہے۔ (طلوعِ اسلام)
[2] چار بیویوں کی کھلی چھٹی بھی قرآنی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔ (")
[3] کیسا مضحکہ انگیز قانون ہے یعنی نکاح تو ناجائز نہیں لیکن اس کے عملی نتائج ناجائز ہیں۔ (")
[4] فقہ کی کوئی دائمی حیثیت نہیں۔ ہر دور کے مسلمان اپنے لئے قرآن کی روشنی میں آپ فقہ مرتب کر سکتے ہیں۔ (")

لینا چاہے تو یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ عورت نے طلاق کے بعد کسی اور سے شادی اور ہمبستری کے بعد اس سے طلاق حاصل کر لی ہو۔ بیوی کو تین بار طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ کر علیحدہ کر سکتا ہے لیکن زوجہ کسی وجہ پر بھی اپنے شوہر کو طلاق نہیں دے سکتی۔[1] بجز اس کے معاہدۂ نکاح کے وقت اسے ایسا حق تفویض کیا گیا ہو۔ بدسلوکی۔ بے رحمانہ برتاؤ اور غفلت پرورش کی بنا پر بھی وہ تفریق عدالتی ڈگری حاصل نہیں کر سکتی۔ بیچاری زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتی ہے کہ اگر شوہر نے اسے چھوڑ رکھا ہو اور اس سے بدسلوکی اور بے رحمانہ برتاؤ کرتا ہو تو درخواست دیکر عدالت کو متوجہ کرائے بشرطیکہ اس کے کوئی گواہ بھی ہوں۔ شوہر اگر امراض متعدی یا امراض خبیثہ میں مبتلا ہو تب بھی اسے خلع کی ڈگری نہیں مل سکتی۔ نکاح بزمانۂ نابالغی اور خیارِ بلوغ کے قطع نظر بیوی کے لئے واحد بنائے خلع شوہر کا عنین ہونا ہے۔ برعکس مرد کے لئے طلاق کی یہ سہولت اور یہ کثرت! یہ حدیث تو بڑے فخر کے ساتھ نقل کی جاتی ہے کہ جائز باتوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے مگر اس کے باوجود پیروانِ حدیث کا یہ عمل ایک مغربی قاری کی سمجھ میں نہیں آتا۔[2]

ہمیں تو مذہب حنفی کی یہ خصوصیت کچھ عجیب سی لگتی ہے کہ دل لگی دل لگی میں بغیر نیت وارادہ کے جو طلاق دیدی گئی ہو وہ بھی اسی طرح حتمی اور موثر ہے جیسے عمداً دی ہوئی طلاق۔ جبر یا ناجائز دباؤ سے دی ہوئی طلاق کا بھی یہی حال ہے۔ یہ عجیب بات یہیں ختم نہیں ہوتی بحالتِ نشہ دی ہوئی طلاق بھی بشرطیکہ کسی اور نے مرد کو نشہ کی چیز پلائی ہو یکساں موثر ہوتی ہے۔ ان سب احکام کی تہہ میں یہ مفروضہ کارفرما ہے کہ طلاق ایک نہایت اہم چیز ہے اور ہر شخص کو اپنے افعال کا خمیازہ بھگتنا ہی چاہئے لیکن اس حجت میں اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ دل لگی ہو یا نشہ جبر سے طلاق دی جائے یا مرضی سے نقصان بہرحال عورت ہی کا ہے۔ طلاق کی اس مطلق العنان آزادی میں صرف ایک ہی رکاوٹ معلوم ہوتی ہے اور وہ ہے عورت کے ولی کا یہ حق کہ عقد نکاح کے وقت کثیر المقدار مہر مقرر کرے خواہ معجل ہو یا غیر معجل یعنی ایسی حالت میں واجب الادا جبکہ طلاق دی جائے یا شوہر فوت ہو جائے۔ اس تدبیر سے متمول طبقہ کی طلاق کی آزادی میں کچھ رکاوٹ ہو گئی ہے لیکن فلاحین پر جنہیں دو وقت کی روٹی ہی مشکل سے میسر ہوتی ہے اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

آج کے روشن خیال مسلمان اس صورتِ حال سے مطمئن نہیں ہیں چنانچہ ہندوستان میں ۱۹۳۹ء میں کچھ اصلاحی تدبیریں اختیار کی گئی ہیں۔ مصر کی مقننہ نے اس سے بھی دس سال قبل یہ قرار دیدیا تھا کہ بحالتِ نشہ یا ناجائز دباؤ سے دی ہوئی طلاق موثر نہیں سمجھی جائے۔ صورت ثانی الذکر کے متعلق بقیہ تین مذاہب کی بھی یہی رائے ہے لیکن صورت اول الذکر کی تائید کرنے والے اقلیت میں ہیں اور باقی یہ کہتے ہیں کہ ایسے شخص کو جو جانتا ہی نہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے اپنے الفاظ کا ذمہ دار نہیں قرار دینا چاہئے۔ اگرچہ اسے شراب جیسی ممنوعہ و حرام شے پینے کی حالت میں سزا دی جا سکتی ہے اور دینی چاہئے۔ طلاق مشروط کے متعلق بھی ایک نیا نظریہ اختیار کیا گیا ہے یعنی اگر کوئی شخص زوجہ سے کہدے کہ اگر تو ایسی ایسی حرکت کرے تو تجھ پر طلاق واقع ہو جائے گی اور وہ ایسی حرکت کر گذرے تب بھی طلاق منظور نہیں کی

---

[1] طلاق کے متعلق یہ سب قوانین قرآن کے خلاف ہیں۔ (طلوع اسلام)

[2] یہ اسلئے کہ جہاں ایک حدیث اس قسم کی ہے وہاں بیسیوں حدیثیں اس قسم کی بھی ہیں جن میں خاوند کو "خدا" کی حیثیت دی گئی ہے۔ اور تاریخ میں ایسے واقعات بھی درج ہیں کہ ہمارے بزرگترین ہستیوں نے سو سو عورتوں کو طلاقیں دیں۔ اس قسم کی وضعی احادیث اور من گھڑت تاریخ کے بعد کونسی چیز باقی رہ جاتی ہے (ط۔ ا)

اِس شاذ و غیر متوقعہ صورتِ حال کے کہ شوہر بہرحال رشتۂ ازدواج ختم کرنے پر تُلا ہوا ہو۔

یہ ابتک تسلیم کیا جاتا رہا ہے کہ جلسۂ واحد میں دی ہوئی تین طلاقیں بھی ہر آئینہ مؤثر ہوتی ہیں لیکن نیا قانون سابقہ عملدرآمد کی ید ہیں ہے یعنی یہ کہ ایک جلسہ میں دی ہوئی تین طلاقیں صرف ایک طلاق کے مساوی ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں رجوع جائز ہے اصلاحات سے عورت کا وہ خوف و ہراس اور آئے دن طلاق کا جو کھٹکا لگا رہتا تھا بہت کچھ کم ہو گیا ہے یہ ایک بڑی چیز ہے کیونکہ لقہ عورت کی حیثیت اور زندگی جسے بڑھاپے یا ادھیڑ عمر میں پھر شوہر میسر نہیں ہو سکتا۔ اسلامی ملکوں میں نہایت ذلیل اور خوار ہوتی ہے یا وہ عسرت و افلاس ہی میں چھوڑ دی جاتی ہے۔ باپ اگر زندہ ہو تو خیر وہاں جا کر جوں توں عمر کاٹ لے لیکن باپ نہ ہو یا مرد رشتہ دار ذی مقدرت نہ ہوں تو ظاہر ہے کہ ذلت و رسوائی کے علاوہ کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔ نئے قانون نے جو وقتِ واحد دی ہوئی تین طلاقوں کو ایک ہی شمار کیا ہے عدت یعنی حالتِ انتظار کو بھی لاحق کر دیا ہے جس کا دوران تین ماہ اور عورت کے ملہ ہونے کی صورت میں وضع حمل تک رہتا ہے۔ شوہر اس اثناء میں بیوی کی پرورش کا ذمہ دار ہے اور بیوی ابھی دوسرا عقد نہیں کر سکتی تہ مرد طلاق سے رجوع کر سکتا ہے۔ طلاق قطعی ہو جانے کے بعد اسی عورت سے مکرر عقد کے جواز یعنی حلالہ کے طریقہ کو آج کل کے لمان سخت مکروہ اور ناپسندیدہ تصور کرتے ہیں اور بعضوں نے تو اس کی صحت ہی سے انکار کر دیا ہے[۱]۔ اب طلاق صرف صحیح وقت ہی پر جا سکتی ہے اور عدت بہرحال ملحوظ رکھنی ضروری ہے۔ اگر طلاق ہر مہینہ میں ایک ہی بار دی جائے یہاں تک کہ تیسری طلاق واقع ہو کر[۲] قابل رجعت ہو جائے تو کم از کم یہ تو یقینی ہو جاتا ہے کہ میاں بیوی کی ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے کی توقع باقی نہ تھی۔ میرے خیال میں مصر قانون بہ نسبت دوسرے ممالک اسلامی کے زیادہ منصفانہ اور انسانیت پسندی کا حامل ہے۔

مصر میں اصلاحات مصر والوں کو طلاق سے پیدا ہونے والی معاشرتی خرابیوں کا پورا احساس ہے ۱۹۴۳ء و ۱۹۴۵ء میں جو مسودات قانون پیش ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر اچھی طرح غور کر لیا گیا ہے توقع ہے کہ ح کے نتائج دور رس ہوں گے۔ پہلی تجویز یہ ہے کہ مقامی قاضی کے استمزاج کے بغیر کسی طلاق کی رجسٹری ہی نہ کی جائے۔ اگر نی کو مطمئن کئے بغیر طلاق دیدی ہو تو گو وہ ناجائز نہ ہو گی لیکن وہ خود مستوجب سزائے جرمانہ و قید ہو سکے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے ہیں تو کوئی دست اندازی نہیں کی گئی لیکن اس کے اطلاق کو جبکہ وہ معاشرہ کیلئے ضرر رساں ہے قریب قریب ناممکن کر دیا گیا ہے بز یہ ہے کہ طلاق کو منظور کرنے کے قبل فریقین کے امور نزاعی و اخلاقی کی تحقیق کر کے ممکنہ کوشش دونوں میں صلح کرا دینے کی کر لینی چاہیئے ی مسودے ہی ہیں اور مقننہ کی منظوری کے محتاج۔

رتہائے ذیل میں عورتوں کو شوہروں سے خلع حاصل کرنے کا حق حاصل ہے[۳]۔ (۱) اگر وہ ان کی پرورش میں تساہل اور غفلت کریں

---

[۱] قرآن کے خلاف رسم ہے بلکہ انسانیت کے ہر شائستہ تصور کے خلاف جسے ہمارے مولوی صاحبان بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں۔ (طلوع اسلام)

[۲] یعنی ایک طلاق اور اس طرح تین طلاق کا قاعدہ بھی غیر قرآنی ہے۔ (ط)

[۳] ن کی رو سے عورت کو خلع لینے کا اسی طرح حق حاصل ہے جس طرح مرد کو طلاق دینے کا۔ (ط)

(۲) شدید جسمانی نقص یا عارضہ میں مبتلا ہوں۔ (۳) بدسلوکی اور ناروا برتاؤ کے مرتکب ہوں یا (۴) بیوی کو معلق چھوڑ دیں۔ و
کہ متذکرہ صدر مذاہب ثلاثہ بھی بیوی کا حق خلع مانتے ہیں جبکہ شوہر بیوی کو نان و نفقہ دینے میں عاجز ہو۔ ۱۹۲۰ء کا مصری قانون ا
دلائل اور مستثنیات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اگر شوہر افلاس و عدم استطاعت کا عذر کرے تو اسے ایک ماہ کی مہلت دیدی جاتی ہے
نفقہ دینے میں قصور اور غفلت پر عورت کو خلع مل جاتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شوہر سزا بھگت رہا ہو اور اس طرح نان و
سبیل کرنے سے عاجز ہو اور قید سے چھوٹنے پر غریب کو معلوم ہو کہ اس اثناء میں بیوی کو خلع مل چکی ہے!

نان و نفقہ کی مقدار بیوی کی حیثیت اور شوہر کی استطاعت پر منحصر ہوتی ہے اور جہانتک کہ نقائصِ جسمانی اور عوارضِ ذاتی
ہے ہم بتا چکے ہیں کہ فقہ حنفی کے نزدیک شوہر کا عنین ہونا ہی صرف ایک وجہ خلع کی ہے۔ بقیہ تینوں مذاہب امراضِ خبیثہ اور عوارض
بھی خلع کی اغراض کیلئے معقول وجوہ تصور کرتے ہیں۔ وہ دلیل یہ لاتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے خود ایک بیوی کو جذام کے شبہ پر علیحدہ کر
بحث ان کی یہ ہے کہ ایسے امراض جن سے کراہت ہوتی ہے اور آنے والے بچوں کی صحت و سلامتی کے لئے بھی موجب خطرہ ہیں یقیناً ایک
وجہ خلع کی متصور ہونے چاہئیں لیکن اگر عورت کو پہلے سے معلوم ہو کہ شوہر ان امراض میں مبتلا ہے تو اس صورت میں اس کی خلاصی کی
صورت نہ تھی لیکن اب نیا قانون ایسی صورتوں میں بھی تفریق کو جائز رکھتا ہے۔ نیز بدسلوکی بھی خلع کی ایک جائز وجہ قرار پا گئی ہے۔
ذہن نشین رہے کہ قرآن کی رو سے نافرمانی کی علت میں یا اصلاح کی خاطر شوہر بیوی کو سزا بھی دے سکتا ہے[1]۔ لیکن اس بارے میں کہ
کن صورتوں میں دی جا سکتی ہے اور اس کی نوعیت کیا ہو گی بہت کچھ اختلاف آراء ہے اور ہر فعل شوہر کا جو جائز سزا کی حد کے اندر ہو
نظر میں بھی بدسلوکی اور بیرحمانہ برتاؤ میں داخل نہیں ہوتا۔ الغرض اب صورتِ حال یہ ہے کہ شوہر کی بدسلوکی اور ناروا برتاؤ ثابت
اگر قاضی دونوں میں مصالحت نہ کرا سکے تو وہ عورت کو خلع دے سکتا ہے لیکن قاضی اگر اس کی درخواست منظور نہ کرے اور عورت د
استدعا کرے تو اسے دو ثالث مقرر کرنے ہوتے ہیں۔ یہ دونوں بھی میاں بیوی میں صلح و صفائی کرا دینے میں ناکام رہیں تو عدالت ان کی س
بذریعہ خلع تفریق کرا دے گی۔ اگر صورت یہ ہو کہ میاں نے بیوی کو چھوڑ دیا ہو لیکن اس کے نان و نفقہ کی سبیل کر دی ہو تو نیا قانون خلع
دینے سے قبل ایک دو سال کا توقف مناسب تصور کرتا ہے۔

ان نئے قوانین کے طفیل عورتوں کی مصیبت میں کچھ کمی ہو گئی ہے اور کٹر قدامت پرستوں کو چھوڑ کر عام طور پر ان اصلاحات کا خ
لیکن بہت سے مسلمان ان اصلاحات کو بالکل ناکافی سمجھتے ہیں اور دوسروں نے ان پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ نکاح کے صحیح تصور ا
غایت کے منافی ہیں اور فطرتی محبت اور باہمی رفاقت میں جو حقیقی منشائے نکاح ہیں یہ تبدیلیاں خلل انداز ہو رہی ہیں۔ وہ اس ۔
نہیں کرتے کہ بے رحمی و بدسلوکی یا شادی کے وقت شوہر کا عارضہ متعدی یا امراض خبیثہ میں مبتلا ہونا یا بیوی کو نان و نفقہ دینے
غفلت ایسے قصور ہیں جن سے ازدواجی زندگی باحسن الوجوہ ناممکن ہو جاتی ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ اگر بدنصیب شوہر ناگہاں او

---

[1] یہ حق شوہر کو نہیں صرف عدالت کو حاصل ہے جو مقررہ قوانین کے خلاف ورزی کیلئے مرد کو بھی سزا دے سکتی ہے۔ (طلوع ا
[2] اسلئے کہ ان اصلاحات میں بالعموم قدم قرآن کی طرف اٹھ رہے ہیں۔ کامل اطمینان کی صورت اسوقت پیدا ہو گی جب ہمارے قوانین
کے مطابق ہو جائیں گے۔ (طلوع اسلام)

بیٹھے اور بے مقدرت ہو جائے تو بیوی کا اسے چھوڑ جانا کہاں کا انصاف ہے؟ نیز اگر شوہر شادی کے بعد کسی مرض قبیح یا عارضہ خبیث بلائے اور یہ اس کے دانستہ اعمال کا نتیجہ نہ ہو تو بیوی کو خلع کی ڈگری دیدینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟ بلا شبہ یہ اعتراض اخلاقاً سکت ہیں لیکن یہ حقیقت اب بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ میاں تو بہر حال بیوی کو طلاق دینے میں آزاد ہے بشرطیکہ وہ قانونی شرائط نہ کرے۔

ہبہ بالوصیت کے معاملات میں مصر دوسرے تمام ممالک سے آگے ہے۔ وہاں اب یہ جائز ہے کہ ہر فرد اپنی جائیداد کا تیسرا حصہ کسی کے حق میں چھوڑ جائے خواہ وہ وارث ہو یا غیر اور اس کے لئے دوسرے ورثا کی رضامندی ضروری بھی نہیں۔ (بلاشبہ یہ فطرت انسانی خواہ مشرق میں ہو یا مغرب میں۔ ورثا سے یہ توقع کرنا کہ غیر کے حق میں انتقالِ ورثہ پر رضامند ہو جائیں بیجا ہی ہوگا۔ جیسا کہ ۱۹۴۵ء سے قبل انھیں حق تھا وہ ہرگز رضامندی نہ دیں گے) یہ جواز قانونی ان فتاوی کے بھی جو اجماعِ امت اور حدیثِ نبویؐ پر مبنی تصور نے بالکل خلاف ہے لیکن قانون سازوں نے اپنی تجویز کے وجوہ بتادیئے ہیں اور وہ کافی معقول ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر کوئی جائیداد الگ الگ علیحدہ اور معین کر کے جس طرح مناسب سمجھے اپنے ورثا میں تقسیم کر دے تو نزاع اور مقدمہ بازی ہی ختم ہو جاتی ہے اچھی چیز ہے علاوہ ازیں وصیت کنندہ کو اب یہ اختیار اور آزادی ہے کہ اپنی جائیداد کو تقسیم کرتے وقت . . . .

. . . ہر ہر وارث کی اپنی جائیداد اور دولت یا ناداری کا بھی خیال رکھے اور اپنی جائیداد اس طرح تقسیم کرے کہ سب ورثا کی حاجت کی سبیل ہو، ورنہ اگر وصیت تمام ورثا کی رضامندی کی محتاج ہی رہتی تو یقیناً ایسے ورثا جو سب سے زیادہ محتاجِ امداد تھے محروم۔ صاف صاف جرأت کے ساتھ بتادیتے ہیں کہ یہ قانون مصلحت و مفادِ عامہ پر مبنی ہے۔ اس بدعت کی تائید میں کوئی شرعی فتوے کئے جاتے لیکن قرآن شریف کی اس آیت کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین ین بالمعروف حقا علی المتقین۔ (۲/۱۸۰) کا حوالہ دیا گیا ہے جس کا منشا یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی جائیداد کے بارہ میں وصیت اپنے والدین اور اقربا کے مابین انصاف کے ساتھ۔ لیکن کثر لوگوں کا خیال ہے کہ اس آیت کو دوسری آیات سے جو وراثت و وصیت ہیں (۴/۱۲) منسوخ کر دیا گیا ہے۔ لیکن مصلحین اس حجت کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ ان کی مسئلہ آیت کی منسوخی کی کوئی شہادت ہے[1]۔ یہ تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ابن قتیبہ نے (المتوفی ۲۷۶ھ) اس مسئلہ سے کہ انتقالِ جائیداد بالوصیت قرآن کا حکم ہے ین کر لیا تھا کہ وہ آیت منسوخ شدہ ہے اور یہ حدیثِ نبوی کہ ہبہ بالوصیت وارث کے حق میں نہیں ہو سکتا ثابت کرتی ہے کہ ناسخ قرآن ہو سکتی ہے۔ لیکن اس نکتہ کو ان کے مخالفین نے کبھی تسلیم نہیں کیا اور اس کی تردید کرتے رہے[2]۔

---

[1] ہر شخص کو اجازت دیتا ہے (بلکہ حکم دیتا ہے) کہ وہ اپنی جائیداد اور مال کے متعلق جو وصیت مناسب سمجھے کرے۔ اس میں نہ تو مال کی تحدید ہے (کہ ⅓ حصہ تک وصیت کر سکتا ہے اس سے زیادہ نہیں) اور نہ ہی یہ کہ وہ ورثا کے حق میں وصیت نہیں کر سکتا۔ اگر اس کی وصیت نہ کی جائے تو اس کی تقسیم قرآن کے مقرر کردہ حصوں کے رو سے ہوگی۔ (طلوع اسلام)

[2] ماننے والے اسے صحیح تسلیم کرتے ہیں کہ حدیث قرآن کی ناسخ ہے اور اس پر قاضی۔ (")

قرآنی قانون وراثت میں کوئی بندوبست یتیم پوتے پوتی کیلئے نہیں ہوا ہے اس لئے نئے قانون میں حکم دیا گیا ہے کہ موصی نے خود اگر ا بچوں کے لئے کوئی انتظام نہیں کیا ہے تو عدالت کو چاہئے کہ انھیں ترکہ سے اسی قدر حصہ دلوا دے جو بصورت حیات ان کے باپ کو ملتا مگر یہ متروکہ کے ایک ثلث سے زیادہ نہ ہونا چاہئے لیکن اگر انھوں نے دادا کی حیات میں کوئی مال ہبۃً پالیا ہو تو ان کا حصہ معین کرتے وقت اس کا لحاظ ہونا چاہئے۔ اب تک چونکہ قرآن میں یتیم پوتے پوتیوں کے حق وراثت کے بارے میں کوئی ہدایت نہ تھی[۵۱] ان کے حرمان اور مصیبت کا لحاظ نہ ہوسکا لیکن مصری قانون نے اسے وصیت کے ذیل میں لاکر اس دشواری کا اچھا حل نکال لیا ہے جسے وہ مستحسن اور جائز بھی کرتے ہیں اور یہ سب اسی لئے ممکن ہوسکا کہ انھوں نے یہ ماننے سے بالکلیہ انکار کر دیا کہ وصیت کی آیت وراثت کی آیتوں سے منسوخ

اوقاف ناقابلِ انتقال اوقاف کا مسئلہ ہمیشہ نازک اور پیچیدہ رہا ہے۔ یورپ نے اس سے بہت کچھ مضرت اٹھائی ہے لیکن مسلما میں وقف ایک اہم مسئلہ شرعی ہے[۵۲] اس کی اصلاح و انتظام میں مفاداتِ حاصلہ کی سخت مزاحمت اور مخالفت کا کرنا ہوگا۔ مختصر طور پر وہ بندوبست جائیداد جسے وقف کے نام سے موسوم کرتے ہیں یہ ہے کہ ہر شخص اپنی جائیداد بطور خیرات جاریہ مذہبی ادارہ کو دوامًا دے سکتا ہے۔ یہ مذہبی اغراض یا مفاد عامہ مثلاً مسجد۔ مدرسہ۔ شفاخانہ وغیرہ کے لئے بھی ہوسکتا ہے اور دایمًا وقف الاولاد بھی ایسے ہبہ بالوصیت میں رجوع کرنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔ وقف کا انتظام ایک مہتمم کے تفویض ہوتا ہے جسے تنخواہ دی جاتی ہے۔ صدیوں کے دوران میں یہ اوقاف اتنے عظیم ہوگئے کہ ان کے انتظام کے لئے ایک علیحدہ وزارت قائم کر دینا پڑی۔ با۔ اس کے نظم و نسقِ اوقاف میں قسم قسم کی ابتریاں اور خرابیاں نمودار ہوتی رہیں[۵۳] اور نہایت کثیر المالیت جائداد کی آمدنی اور قیمت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی بدنظمی اور بددیانتی کے باعث واقفین کا حقیقی منشا اور مقصود فوت ہو جانے کے علاوہ ملک کو بڑے بڑے رقبہ جاتِ آراضی کے بیجا استعمال سے بھی نقصان اٹھانا پڑا۔ فی الحقیقت یہ ایک بڑی خرابی تھی کیونکہ سلطنت عثمانی کی تمام قابل کاشت آراضی کا تین چوتھا حصہ اوقاف کے زیرِ نگرانی آگیا تھا۔

یورپ کی حکومتوں نے تو بہت پہلے اس کا حل نکال لیا تھا[۵۴] چنانچہ الجیریا میں سارے اوقاف فرانسیسی قوانین کے تحت لائے گئے تاکہ آراضیات کی کاشت کا انتظام اچھا ہو اور زیادہ سے زیادہ متمتع کیا جاسکے۔ مراکش میں بھی وقف کی اراضیات کے قابضین کو بعض شرائط سخت مالکانہ حقوق دیدیئے گئے ہیں۔ ترکی میں وزارتِ اوقاف ۱۹۲۳ء میں تخفیف کر دی گئی اور حکم دیدیا گیا کہ تمام جائیداد اوقاف فروخت اور ساری رعایا کا مفاد ملحوظ رکھکر ان کی کاشت کا بندوبست کیا جائے۔ مصر میں اوقاف کی اصلاح محمد علی اعظم نے شروع کی۔ اس نے وقف کی تمام اراضیات کو ضبط کر لیا اور ان لوگوں کو جو ان سے مستفید ہوتے آئے تھے معاوضہ ادا کر دیا۔ یہاں ۱۹۲۴ء سے وزارت اوقا

---

۵۱ یہ فاضل مصنف کی قرآن سے بے خبری کی دلیل ہے۔ قرآن کی رو سے یتیم پوتا وراثت کیلئے اپنے باپ کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ (طلوع اسلام)
۵۲ قرآن کی رو سے وقف کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ بھی خلافِ قرآن رسم ہے۔ (")
۵۳ ہونی چاہئیں۔ جو قانون بھی قرآن کے خلاف ہوگا اس کا یہی نتیجہ نکلے گا۔ (")
۵۴ ان کے پاس اگر قرآن نہیں تو وہ کم از کم عقل سے تو کام لیتے ہیں اور تجربہ کے بعد جن امور کو نقصان رساں پاتے ہیں انھیں چھوڑ دیتے ہیں لیکن مسلما ان کا مولوی نہ قرآن کے قریب آنے دیتا ہے نہ عقل کے پاس۔ کیونکہ ان دونوں صورتوں میں مولوی باقی نہیں رہتا۔ (")

نٹ کے تحت آگئی ہے جس میں یقیناً مفادِ عامہ ہی مضمر ہے۔

یانِ اوقاف کی بلاشبہ مستحسن نیتوں کے علی الرغم مسلمانوں کو اس انتظام کی خرابیاں صدیوں سے دکھائی دے رہی ہیں حتیٰ کہ ماہل نت مہتمانِ اوقاف کے خلاف کوئی عہدہ دار سرکاری بھی مناسب کارروائی نہیں کر سکتا۔ پھر ملک کا نقصان علیحدہ ہے کیونکہ ں کی کاشت کا انتظام معقول نہیں ہوتا تھا اور بروقت نگہداشت نہ ہونے کی وجہ سے عمارتیں منہدم ہوجاتی ہیں۔ ملک اپنے تمام وسائل ادہ کرنے سے محروم ہوجاتا ہے اور درستی و اصلاح کا نہ کسی کو خیال آتا ہے اور نہ کوئی اس جانب قدم اٹھاتا ہے۔

۱۹۴۹ء میں حکومتِ شام نے آئندہ کیلئے اوقاتِ خاندانی کا طریقہ ہی مسدود کردیا ہے اور جو اوقاف اس مد میں جاری تھے ان کو بھی ڈالا۔ مصر میں بھی اس طریقہ کو بیخ و بنیاد سے اکھیڑ پھینکنے کا شدت سے مطالبہ ہوتا رہا لیکن علما کی مخالفت[۱] اسقدر شدید ہوئی کہ ں کو ہار مان کر ایک درمیانی راہ اختیار کرنی پڑی۔ ۱۹۴۶ء میں ایک عارضی قانون پاس کیا گیا جس سے بعض بدترین خرابیوں کا استیصال ء اور مفادِ عامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے بانیانِ وقف کے مقصود اور منشا کو پورا کرنے کے بھی وسائل اختیار کئے گئے ہیں۔ نئے قانون کے یقف اسی وقت موثر و جائز ہو سکتا ہے جبکہ اس کا شرعی عدالت کے ذریعہ اعلان کرادیا جائے۔ گو ایسے اوقاف کو اس قانون نے بن لگایا جو مساجد سے متعلق تھے۔ لیکن خاندانی اوقاف اب دائمی نہیں رہے ہیں صرف آئندہ کی دو نسلوں تک ان کا استفادہ محدود یقیناً نئے قانون کا یہ ایک زبردست اصلاحی اقدام ہے۔ اس کی تفاصیل کا تذکرہ چنداں سود مند نہ ہوگا اور یہ کہدینا کافی ہوگا ہیں ملک کے عظیم تر مفادِ عامہ کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ عماراتِ وقف کی نگہداشت اور مرمت کب اور کیسے ہوگی۔ فاضل آمدنی ح سرمایہ پر لگائی جائے گی اس سے مستفید ہونے والے کس حد تک متمتع ہوں گے۔ یہ اور ایسے ہی مسائل ہیں جن سے سو سال پہلے نمٹنے کی قع نہیں کی جاسکتی تھی اب ان سب باتوں کا بندوبست مصلحت و مفادِ عامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے کردیا گیا ہے۔

۱۹۴۹ء سے لبنان کا قانون بھی ان ہی خطوط پر عمل کر رہا ہے۔ سوڈان نے بھی اگرچہ عورتوں کو جائز حقوق دلوانے کی طرف ابھی تک رم نہیں اٹھایا ہے لیکن اوقاف کی حد تک مصری قانون کو اپنا نمونہ بنالیا ہے۔ حقوقِ خاندانی کے بارے میں مملکت اردن میں ایک ن بن گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ عثمانی قانون حقوقِ خاندانی کے خطوط ہی پر اس کی تشکیل ہوئی ہے اور مصر کی ترقیات کو بھی خاص پیش نظر رکھا گیا ہے۔ مثلاً یہ طے کردیا گیا ہے کہ شادی کے وقت لڑکے اور لڑکی کی عمر کم از کم علی الترتیب اٹھارہ اور سترہ سال کی ہونی ؛ اگرچہ عدالت کی خاص اجازت سے ایک پندرہ سالہ لڑکی کا عقد بھی ہو سکتا ہے۔ بعض اور تبدیلیاں بھی اصلاحی بیداری کی ہی کرتی ہیں۔ مثلاً طلاق اسوقت تک موثر اور قطعی نہیں سمجھی جاسکتی جب تک وہ تین علیحدہ علیحدہ مجالس میں مقررہ وقفوں سے ئی ہو۔ اب قاضی کسی ایسی لڑکی کا نکاح نہیں پڑھ سکتا جو زوج سے عمر میں بیس سال سے زیادہ چھوٹی ہو بجز اس کے کہ اسے اس ا پورا اطمینان ہوجائے کہ لڑکی بطیب خاطر اس رشتہ کو قبول کر رہی ہے اور اس پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا گیا ہے۔ ایک اور زیادہ پسندانہ اقدام یہ ہے کہ عورت کے اپنے معاہدۂ نکاح میں مخصوص شرائط درج کرانے کا حق تسلیم کرلیا گیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اسے بھی

---

[۱] علماء کی طرف سے ہر اس اقدام کی مخالفت ہوگی جو قرآن یا عقل سے قریب ہو اور جس میں نوعِ انسانی کا مفاد ہو۔ (طلوعِ اسلام)

شوہر کو طلاق دینے کا (تفویض) اختیار ہوگا یا یہ کہ شوہر اسے دوسرے شہروں میں لیجا کر نہ رکھ سکے گا یا یہ کہ وہ اس کی زندگی میں عقد ثا
کریگا۔ ظاہر ہے کہ ایسی شرطیں اگر معاہدۂ نکاح کی رجسٹری کے وقت درج کرادی جائیں تو ان پر ضرور عمل ہوگا ورنہ بیوی درخواست دیکر
فسخ کراسکے گی۔ فی الجملہ اُردن کے اس قانون سے عورتوں کی پوزیشن بہت درست ہوگئی ہے۔ نان ونفقہ واخراجاتِ زچگی کے ملنے ا
و بدسلوکی پر تفریق کے حاصل کرنے میں بڑی آسانی ہوگئی ہے۔ طلاق کے معاملہ میں یہ نیا قانون مصری قانون ہی کا اتباع کرتا ہے اور اگر
کوئی فرق ہے بھی تو وہ عورت ہی کے فائدے کیلئے ہے جو طلاق کے معاملہ میں بہت گھاٹے میں رہتی ہے۔

عراق میں البتہ اصلاحی عمل کی رفتار سست ہے۔ یہاں حکومتیں جلد جلد بدل جاتی ہیں اور شیعہ سنی کا خلفشار ہمیشہ سامنے
رہتا ہے۔ بریں ہمہ ۱۹۴۷ء میں عراق کی پارلیمنٹ کی عدالتی کمیٹی نے شخصی قانون کے ضابطہ کا ایک مسودہ منظور کرلیا ہے مگر پارلیمنٹ سے ا
توثیق نہیں ہوسکی ہے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ عراق کی حالت مصر کی سی نہیں جہاں علم اور تعلیم کا کئی نسلوں سے چرچا ہے اور اعلیٰ تہ

عراق و مُلّا

پھیل چکی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ عراق میں قدامت پرست ملاؤں کی مخالفت بھی زیادہ شدید ہے۔ یہاں بھی اگ
کی متذکرہ خطوط پر تشکیل ہوجائے تو علما کے فتووں کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ آج تو یہ سارے پیچیدہ شرعی مسائل ک
کرنے کے تنہا ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں۔ کل بے روزگار ہوکر گھر بیٹھ رہنے پر مجبور ہوں گے۔[1] جعفری (شیعہ) فرقہ کے مجتہدین ایسی قانون
اپنی پوزیشن پر ایک کھلا ہوا حملہ تصور کریں گے۔ اسوقت تو پارلیمنٹ نے اس پر غور ملتوی کرکے مسودہ ایک کمیٹی کے سپرد کردیا ہ
ملکی حالات کے لحاظ سے مناسب ترمیمات تجویز کی جائیں۔ امید کی جاسکتی ہے کہ اب زیادہ زمانہ نہ گذریگا اور یہ رپورٹ ایک
کی اساس ہوجائے گی۔ اب تک ہم جن ضوابطِ قانون پر غور کرتے رہے ہیں ان سے یہ بالکل مختلف ہوگا کیونکہ اسے شیعہ اور سنی
سے متعلق کرنا ہے۔ ان دونوں میں جہاں کہیں توافق ممکن نہ ہوسکا ضابطہ نے اجازت دیدی ہے کہ ہر دو اپنی اپنی روایات کے لحا
عمل کرسکتے ہیں۔ جہانتک سنیوں کا تعلق ہے حقوق خاندانی کے متعلق قانونِ عثمانی اور نیز مصر میں جو حال میں اصلاحیں عمل میں آئی
ان کی پیروی کرتا ہے۔ اس کی رو سے معاہداتِ نکاح اور شرائط طے شدہ کی رجسٹری لازمی قرار دی گئی ہے مگر یہ واضح نہیں ہے کہ آ
وحدتِ نکاح اور انسداد بیرحمی و بدسلوکی پر بھی مشتمل ہوسکیں گی یا نہیں اس کی رو سے نابالغ لڑکیوں کا عقد بذریعہ ولی ممنوع نہیں
مگر رخصتی اس کے سنِ بلوغ تک ملتوی رکھنا لازم ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ آسانی کے ساتھ یہ رکاوٹ دور اور شرط بیکار کردی جا
اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ضابطہ میں وہ معقول اور انسانیت پسند عنصر مفقود ہے جو ترکی اور مصر کے قانون میں موجود ہے۔ غیر مسلم
بیوی میں سے اگر ایک فریق اسلام قبول کرلے اور دوسرا ساتھ نہ دے تو نکاح خود بخود ساقط اور ازدواج کی تحلیل ہوجاتی ہے اسی طر
زوجین میں اختلاف پیدا ہوجائیں اور وہ امن چین سے زندگی بسر نہ کرسکیں تو اولاً ثالث ان کے مابین صلح وصفائی کی کوشش
ہیں اور جب وہ ناکام ہوجاتے ہیں تو قاضی طلاق کی ڈگری دے سکتا ہے۔ الغرض اگرچہ شیعہ اپنے مخصوص قانون پر عمل پیرا ہیں
طلاق کے بارے میں مصری قانون کو نمونہ کی حیثیت سے اختیار کرلیا گیا ہے لیکن بیوی خُلع اسی صورت میں طلب کرسکتی ہے ج

[1] اسی کا نام "اسلام خطرے میں ہے" رکھا جاتا ہے۔ (طلوع اسلام)۔

مِن خبیثہ میں مبتلا ہو یا بیوی کے نان و نفقہ کی سبیل کرنے میں قصور کرے۔

ت کے معاملہ میں یہ طے کیا گیا ہے کہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی جائیداد کا تیسرا حصہ جس کے حق میں چاہے وصیتاً چھوڑ جائے
شرعی احکام سے جیسی کہ اب تک ان کی تعبیر ہوتی رہی ہے یہ بھی ایک طرح کا اختلاف ہی ہے لیکن مصر سے یہاں کی صورت
ہے میں کچھ مختلف ہے کیونکہ جعفری فقہ میں تو ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں رعایا کا بڑا حصہ دو فرقوں میں
بہت آسان ہوتا ہے کہ ایک نصف آبادی کے مروجہ قانون کو دوسرے نصف سے بھی متعلق کر دیا جائے کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ
معاملہ میں سنی مقید ہے اور شیعہ آزاد یعنی اپنی جائیداد کا چند شرائط کے ساتھ جس طرح اس کا دل چاہے بندوبست کر سکے تو یقیناً
قہ کے شہریوں کے دل میں یہ خیال گذرے گا کہ انھیں بھی کیوں ایسی ہی آزادی نہ ہو۔

تمام تفصیلات سے پتہ چل سکتا ہے کہ معاشرۂ اسلامی کی تنقید جو اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی میں شروع ہو گئی تھی بتدریج قوی
ہے اور آہستہ آہستہ لیکن یقیناً مصلحین کے مساعی کامیاب ہوتے جا رہے ہیں۔ قانون کا ارتقائی عمل تو آہستہ آہستہ ہی ہوتا ہے
ری اور تیز اصلاحی اقدام کی توقع نہیں کی جا سکتی بالخصوص جبکہ روایات کہنہ اور پیشوایان مذہب کی ساری قوتیں ایک ایسی صلاح
پر صف آرا ہو گئی ہوں جو روایاتِ قدیم یعنی نظریاتی بنائے شریعت حقہ کے منافی اور مغائر معلوم ہوتی ہے، با ایں ہمہ بہت کچھ ہو چکا
ہونا باقی ہے وہ بھی ہو رہے گا۔ قانونِ اسلامی کو نہ صرف زمانۂ حال کے مقتضیات کے مطابق بلکہ نئے ضمیر کے موافق کرنے کے
بھی مصر کی ایک ذمہ دار اور مقتدر جماعت نے دو اور اصلاحی تجویزیں پیش کی ہیں۔ یہ تو ہم بتا ہی چکے ہیں کہ سنہ ۱۹۲۶ء میں وزارت
مسودہ قانون پسند کر لیا ہے کہ کوئی شخص بلا منظوری قاضی دوسرا عقد نہ کر سکے اور قاضی کو یہ ممانعت ہو گی کہ تاوقتیکہ اس امر کا
نہ ہو جائے کہ وہ شخص اپنے سارے متعلقین کی پرورش و نگہداشت باحسن الوجوہ کر سکے گا عقد ثانی کی منظوری نہ دے۔ یہ اطمینان مقدم
ی ہے کہ وہ دونوں بیویوں کے مابین عدل و مساوات اور یکساں برتاؤ مرعی رکھے گا۔ اس مسودہ میں یہ سفارش بھی کی گئی ہے
ں کو بلا منظوری عدالت اپنی بیوی کو طلاق دینے کا اختیار بھی نہ ہونا چاہئے اور عدالت کیلئے ضروری ہو گا کہ امور مابہ النزاع
ات کرے اور تفریق کا حکم دینے کے قبل فریقین میں صلح و صفائی کرانے کی پوری کوشش کرے۔ اس قاعدہ کی خلاف ورزی کرنے
جب سزائے قید و جرمانہ ہو گا۔ یہ ہر دو عمدہ مسودات قانون ابھی پارلیمنٹ کی توثیق اور منظوری کے محتاج ہیں۔

نیائے اسلام میں ابھی اصلاحی تعلق سے تیز گامی کی توقع قبل از وقت ہی ہے کیونکہ مخالفانہ ردعمل کی طاقتیں ابھی کافی قوی ہیں اور سوائے
بقیہ تمام اسلامی ممالک میں ان کے قدم مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔ سعودی عرب میں تو انھیں اقتدار کلی حاصل ہے بریں ہم علم اور تعلیم کی
اخبار وغیرہ کے اچھے اثرات کے ساتھ ساتھ یہ اصلاحات جہاں جہاں اختیار کر لی گئی ہیں ان کے نتائج کثرت سے کٹر مسلمانوں کو بھی چونکا دینگے
تیں کہ بالآخر ان بنیادوں کی جن پر ان کے قلعے قائم ہیں از سر نو جانچ پڑتال کرنے پر مائل کردیں۔

کے تقاضے خود مسلمانوں (بلکہ پوری نوع انسانی) کو کھینچ کھینچ کر قرآن کی طرف لا رہے ہیں اور وہ وقت قریب دکھائی دے رہا ہے جب انسان،
ساختہ قوانین کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر ایک خدا کے قانون کے سایہ تلے آجائیگا۔ (طلوع اسلام)

ناسخ ومنسوخ

ہم نے اس کا ذکر کردیا ہے کہ ملاؤں کی شدید مخالفت اور علما کے اس فتوے کے باوجود کہ ایک خاص آیت جس پر قا سانوں کا استدلال تھا دوسری آیت سے منسوخ ہوچکی ہے مصر میں ایک اصلاحی قانون پاس کرلیا گیا لیکن یہ بات تعجب خیز ہے کہ ایک ہزار سال سے یہ عقیدہ مضبوطی سے قائم ہے کہ قرآن کی بعض آیات دوسری آیات مابعد سے منسوخ ہوچکی ہیں اور شدت سے انھیں اس پر اصرار ہے چنانچہ درمیانی زمانے کے مصنفین یہاں تک کہ گئے ہیں کہ جن اصحاب کو ناسخ ومنسوخ کا پورا وقوف نہ انھیں تعبیر وتفسیر قرآن کے کوچہ میں قدم رکھنے کی بھی جرأت نہ کرنی چاہئے۔ نہ صرف جدید مصر کے لوگوں نے بلکہ اوروں نے بھی اس خلاف ایک شدید ردِ عمل کا مظاہرہ کیا ہے چنانچہ پاکستان کے جریدۂ "اسلامک لٹریچر" میں جس کا ہم پہلے حوالہ دے چکے ہیں جہاں مضمون نگار نے ایک سلسلہ مقالات میں ساری تائیدی شہادت پیش کی ہے تو دوسرے نے اس کا معقول جواب بھی دیا ہے اور یہ ثابت کی کوشش کی ہے کہ آیاتِ قرآنی کی تنسیخ نہ کبھی فی الواقع ہوئی اور نہ ہوسکتی ہے لیکن ہم خود جب اس مسئلہ پر غیر جانبدارانہ نظر ڈالتے ہیں ہمیں صاف دکھائی دیتا ہے کہ گو اس دعوے کی تائید میں جو حجتیں اور دلیلیں پیش کی جاتی ہیں سب صحیح اور معقول نہیں پر یہاں ہم دا شہادت بھی اس کی حمایت میں ہے اور خارجی شہادت بھی اور یہ عقیدہ بالکلیہ بے بنیاد نہیں۔[1]

اسبابِ زوالِ امت

ایک عظیم الشان سنہری دورِ عروج سے جو یہ زوال آگیا ہے اس کا موجودہ مسلمانوں کو نہایت تلخ احساس اور اکثر مصنفین نے اسبابِ زوالِ امت کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ مغربی تنقید کی بدولت[2] اہلِ تقدیر کا عقیدہ عورتوں کی کمتری کا تصور۔ اندھا دھند روایات کی تقلید۔ دیانتدارانہ اختلافِ رائے کی ناروا داری اور عام اخلاقی پستی ونا امیدی تعلیم سے ہر طرف بیزاری کا اظہار ہورہا ہے اور ایسی علامات کم نہیں ہیں کہ نئی نسل حتی الامکان اس زبوں حالی کا خاتمہ کرنے پر تل گئی۔ عورتوں کو قید وبند سے جس کے باعث وہ ہمیشہ کے لئے جہل اور مایوسی میں مبتلا ہوگئی ہیں رہائی دلوا کر انھیں موقع دینا چاہیے[3] کہ ا باہر نکلیں اور معاشرہ میں اپنا صحیح مقام حاصل کریں۔ ضرورت ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ کارِ اصلاح میں تعاونِ عمل کی ہمت افزائی اور غریب کسان کی گردن پر متمول زمیندار کا جوا باقی نہ رہنے دیا جائے[4] ورنہ اسلام ملاؤں اور کمیونسٹوں کے دو چکی کے پاٹوں

---

[1] قرآن کی رو سے ناسخ ومنسوخ کا عقیدہ بالکل بے بنیاد ہے۔ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں چونکہ طلوع اسلام میں یہ مسئلہ نہایت سے صاف ہوچکا ہے اس لئے ہمیں اس مقام پر اس بحث کے چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ اس وجہ سے ہم اپنے مضمون سے بھی اس بحث کو کرتے ہیں۔ اگر ہماری طرف سے جواب انگریزی میں لکھا جاسکتا اور اس طرح وہ فاضل مصنف کی نظروں سے گزر سکتا تو ہم اس پر اس وضاحت کرتے اور اس کی ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے جن کی بنیاد پر اس نے سمجھا ہے کہ قرآن کی رو سے یہ عقیدہ بے بنیاد نہیں۔ ا دلائل کم وبیش وہی ہیں جو ہمارے ہاں اس عقیدہ کے موید صدیوں سے دیتے چلے آرہے ہیں جن میں روایت پرستی اور اشخاص کے سوا اور کچھ نہیں۔ (طلوع اسلام)

[2] اور قرآن کے براہِ راست مطالعہ کرنے کی بدولت۔ (")

[3] یہ دعوت تو سب سے پہلے خود قرآن کی طرف سے دی گئی تھی۔ (")

[4] قرآن کی رو سے زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت جائز نہیں۔ (")

ہلپا کر رہ جائے گا۔ کیونکہ ملّا بھی سرمایہ داروں کے حامی اور پشت پناہ ہیں۔[۱]

بعض مصنفین تو اس قدر بکھر اکھڑا اور صاف کہدیتے ہیں اور موجودہ معاشرہ پر ان کی طعن و تشنیع اس قدر شدید ہے کہ ایک دو پشت پہلے کے
نزی بھی اتنی جرأت اور بیباکی نہیں دکھا سکتے تھے۔ فرق اسی قدر ہے کہ وہ اس مشورہ کو نہایت حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیتے ہیں کہ خود مذہب اسلام
ہ حد تک ان خرابیوں کا ذمہ دار ہے[۲] اور صرف مسلمانوں ہی کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں کہ وہ اپنے مذہب کے صحیح اصولوں پر نہیں چلتے۔

ان مصنفین کی تحریرات سے واضح ہوتا ہے کہ غلط اطلاعات کی بنا پر بعض مغربی مدبرین کا یہ خوف کہ مسلمان قومیں کمیونسٹ ہو جائیں گی بالکل بے اصل
ستان کی بالشویک حکومت کو یہ لوگ سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جہاں کے حکمرانوں نے اسلام پر ایک باضابطہ حملہ بول دیا ہے۔ مقامی لیڈر
یے جا رہے ہیں، مسجدیں منہدم ہو رہی ہیں اور قرآن کو آگ میں جلایا جاتا ہے اور یہ سب کام ایسے مسلمان نوجوانوں ہی سے لیا جاتا ہے جنھیں الحاد اور بیدینی
دی گئی ہے۔ وہاں سوویٹ کی گورنمنٹ نے جس شخص کو مسلمانوں کا پیشوا مقرر کیا ہے اور جس کا نام بھی چھپا نہیں رہا پولیس کا ایک زوردار جاسوس بیان
ا ہے۔ اس بارے میں ایک مصنف کا رجحان اس جملہ سے ظاہر ہے کہ روسی حکومت کے جوئے سے ترکستان کی خلاصی بلاشبہ اسلام کے احیا اور تقویت میں معاون ہوگی۔

آخر ملاؤں اور مفاد پرستوں اور مصلحوں کے مابین جو یہ جنگ جاری ہے اس کا انجام کیا ہوگا اس کا اندازہ کرنا بہت قبل از وقت ہے لیکن اگر
ریڈیو اور پریس کے ذریعہ سے اصلاح کے پیغام کو سننے والوں کا دائرہ وسیع اور وسیع تر ہوتا گیا[۳] تو آئندہ چند برسوں میں یہ توقع کی
ہے کہ آہستہ آہستہ اسلام کی نئی تعبیرات میں سرایت کرتی جائیگی اور مسلم معاشرہ دور رس اصلاحات سے ہمکنار ہو جائیگا کیونکہ اسلام کی تاریخ
۔ اسمیں زمانہ کا ساتھ دینے کی ایک بے مثل صلاحیت ہے نیز باہم متضاد اور ناقابل توافق فلسفیانہ تخیلات اور ایک دوسرے سے مخالف مذہبی
وجذب کر لینے کا غیر معمولی ملکہ[۴] جن باتوں کو اس نے تجربہ سے مضرت بخش اور بے سود سمجھا ترک بھی کر دیا ہے۔ البتہ ایک خطرہ ہمیشہ اس کے
ہے گا یعنی اس کی نئی آزاد اسپرٹ کے مقابلہ میں پرانی رد عمل کی قوتیں بھی جو جاہل عوام کو باسانی برانگیختہ اور اہل بصیرت کو لرزہ براندام کر دینے والے
ہ یعنی لعنت اور تکفیر کے ہتھیاروں سے لیس ہیں اپنا پورا زور دکھائیں گی۔ بہرحال یہ مرور ایام ہی سے معلوم ہوگا کہ فتح کا سہرا کس کے سر رہتا ہے۔[۵]

ہیں کوئی شبہ نہیں کہ اگر مسلمانوں پر ملا کی گرفت اسی طرح رہی تو ہماری ابھرنے والی نسل ملا کے اسلام سے تنگ آ کر کمیونزم کی لادینی کے آغوش
بلائے گی۔ اس کا صحیح علاج قرآن کا نظام ربوبیت ہے۔ (طلوع اسلام)
ا اسلام فی الواقعہ ان خرابیوں کا ذمہ دار ہے لیکن قرآنی اسلام نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ تمام نوع انسانی کی مشکلات کا حل اپنے اندر
ہے۔ (ط)
رآن کے سامنے آ جانے کے بعد نہ تو مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے اور نہ ہی مذہب کے سرمایہ داری اور لادینی نظام کا موئد۔ (ط)
ی نہیں! اگر قرآن کی صحیح تعلیم ان کے سامنے آ گئی تو ان کی حیات تازہ کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ریڈیو اور پریس سے مغربی خیالات عام ہو رہے
قرآن کی تعلیم۔ (ط)
یوں نہیں۔ یوں ہے کہ قرآن میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا اس طرح ساتھ دیتا جائے کہ اس کے غیر متبدل
اپنی جگہ سے نہ ہلیں اور انسانی آزادی پر بھی زد نہ پڑے۔ (ط)
ہی کے سر رہے گا۔ ملا تو اب چند دن کا مہمان ہے۔ روشنی آ جانے پر اندھیرے کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ (ط)

طلوع اسلام

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جن قوانین سے گلو خلاصی کے لئے مختلف اسلامی ممالک میں اسقدر کشمکش اور اضطرا پایا جاتا ہے وہ تمام قوانین ایسے ہیں جن کی بنیاد فقہ یا روایات پر ہے۔ جیسا کہ طلوع اسلام نے بارہا بتایا ہے۔ یہ قوانین انہی زمانوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر وضع کئے گئے تھے جن میں یہ مدون ہوئے تھے۔ ان قوانین سے یہ مقصود تھا کہ یہ ہمیشہ کے لئے علیٰ حالہٖ رہیں۔ قوم کی بدبختی کہ اس کے مذہبی پیشواؤں نے (جن کا وجود ہی غیر قرآنی ہے) ان قوانین کو ابدیت کی سند عطا کر دی اور یہ فیصلہ کر دیا کہ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا خیال بھی الحاد و بے دینی ہے۔ لیکن یہ غیر فطری جکڑ بندیاں کب تک چل سکتی تھیں۔ جن قوموں نے کچھ سوچنا شروع کیا انھوں نے اس سے نکلنے کی راہیں تلاش کرنا شروع کیں۔ انہی کا نام وہ ہیں جن کا ذکر اس مقالہ میں آیا ہے۔ چونکہ ان لوگوں کے سامنے بھی خالص قرآن نہیں اسلئے وہ اپنی ترمیمات کے بارہ میں بڑی جھجھک محسوس کر رہے ہیں۔ اور ان کا انداز ایسا معروضی سا ہے گویا انھوں نے ان تبدیلیوں سے کوئی بڑا جرم کیا ہے۔ اگر ان کے سامنے قرآن ہوتا تو وہ بڑی جرأت سے کہہ سکتے تھے کہ ہم قرآن کی روشنی میں اپنے لئے آپ قوانین مرتب کرنے کے مجاز ہیں۔ اس صورت میں وہ ایسا کرتے دل کے پورے یقین اور ذہن کی کامل جرأت کے ساتھ کرتے۔

یہی وہ صورتِ حال ہے جس سے ہم پاکستان کو بچانا چاہتے ہیں۔ مولوی کا تقاضا ہے کہ فقہ اور روایات کے جو قوانین چلے آ رہے ہیں انھیں علیٰ حالہٖ نافذ کرنا ایک اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ یہاں کے ارباب حل و عقد جب ان قوانین کو دیکھتے ہیں تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان سے ہم عملی دنیا میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یہ ہے وہ الجھن جس میں اس وقت ملت اسلامیہ پھنسی ہوئی ہے۔ طلوع اسلام اسی الجھن کا قرآنی حل پیش کرتا ہے اور وہ یہ کہ ہم اس کے خود مجاز ہیں کہ قرآن کریم کی روشنی میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق آپ قوانین وضع کریں۔ اگر ہم نے یہ روش اختیار کر لی تو ہمارا ہر قدم آگے بڑھے گا لیکن اگر ہم مولوی کے شور اور ہنگامے سے دب گئے تو ہم اسی جال میں پھنس جائیں گے جس سے نکلنے کے لئے دیگر اسلامی ممالک کے لوگ اس بری طرح سے پھڑپھڑا رہے ہیں۔ (طلوع اسلام)

رفتارِ عالم

کیا اشتراکی اور غیر اشتراکی دنیا ئیں اس کرۂ ارض پر ایک ساتھ رہ سکتی ہیں؟ یہ سوال بین الاقوامی سیاست کا نقطۂ ماسکہ بنتا جارہا ہے
یت یوں تو غیر اشتراکی نظام کی روادار نہیں ہوسکتی لیکن عملی سیاست میں اس نے مصلحت اس میں دیکھی ہے کہ غیر اشتراکی دنیا کو یہ یقین دلائے
کا مجرد وجود ہی اس کے لئے دعوتِ جنگ نہیں۔ یہ نظریہ پیش کرکے اشتراکی غیر اشتراکی اقوام مغرب کو یہ جھوٹی تسلی دینا چاہتے ہیں کہ وہ
واہ ہیں، نیز یہ کہ جنگ ایسی ناگزیر نہیں کہ اقوام مغرب اس کیلئے شبانہ روز تیاری کریں۔ زبانی جمع خرچ تو یہ ہے لیکن اشتراکیوں نے عملاً
یا ثبوت نہیں دیا جس سے معلوم ہو کہ وہ جینے اور جینے دینے کے قائل ہیں۔ اس نکتہ کی تفسیر ایشیا، یورپ اور اقوام متحدہ میں بڑی واضح
تی ہیں۔

بائی تصادم

دیکھا جائے تو سرخ چین نے ایسی طرح ڈال دی ہے کہ امریکہ ایشیا سے بالکل بے دخل ہو جائے۔ یہ تصادم پہلو بدل بدل کر
ایشیا میں نمودار ہو رہا ہے۔ امریکہ بے دخلی کے لئے تیار نہیں لیکن عملاً زیادہ مضبوطی سے قدم جما بھی نہیں سکا۔ کوریا میں امریکہ نے
رہ جنگ لڑی لیکن بالآخر اسے فتح حاصل کئے بغیر معاہدہ التوائے جنگ پر راضی ہونا پڑا۔ ہند چینی میں فرانس نے ہتھیار ڈال دیئے اور امریکہ کو
باد کرنا پڑا۔ اس سے چین کے حوصلے بڑھے اور اس نے ان جزائر پر حملے شروع کر دیئے جو فارموسا تک پہنچنے میں زینے کا کام دیتے ہیں۔ صورتِ
راب ہوتی دیکھ کر امریکہ نے ہمت کی۔ چنانچہ امریکہ اور فارموسا کے مابین ایک دفاعی معاہدہ طے پایا جس کا مقصد امریکی سکریٹری آف اسٹیٹ
الفاظ میں یہ ہے کہ امریکہ فارموسا کے اشتراکی قبضے میں چلے جانے پر رضامند نہیں ہوگا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا اس کا مطلب یہ ہے
وسا پر اشتراکی حملہ ہوا تو امریکہ چین پر جوابی حملہ کریگا؟ تو انھوں نے کہا کہ ہاں اس کا یہ ایک ممکن نتیجہ ہوسکتا ہے۔ اس معاہدہ کی رو سے
رموسا پر حملہ ہوا یا اس کی حکومت کو الٹا یا گیا تو امریکہ کارروائی کرے گا۔ چینی وزیر اعظم چو این لائی نے اس معاہدہ کو سنگین جنگی اشتعال انگیزی
یا ہے اور امریکہ کو خطرناک نتائج سے ڈرا کر یہ کہا گیا ہے کہ وہ فارموسا سے اپنی فوجیں واپس بلالے۔ روس نے اس مسئلہ کو فوراً اقوام متحدہ میں
دیا لیکن وہ امریکہ کے خلاف قرارداد مذمت منظور کرانے میں ناکام رہا۔

ادھر باہمی دفاع کے مذاکرات ہو رہے تھے، اُدھر چین نے ایک اور شوشہ چھوڑ دیا۔ کوریا کی لڑائی میں چین نے جو امریکی سپاہی جنگی قیدی بنائے
میں سے بعض ابھی تک رہا نہیں کئے گئے حالانکہ معاہدہ یہ تھا کہ جو جنگی قیدی اپنے گھروں کو واپس جانا چاہیں گے انھیں واپس جانے دیا جائیگا
اس نے ان میں سے گیارہ ہوابازوں کو جاسوسی کے الزام میں سزا دیدی ہے۔ اشتراکیوں کا کہنا یہ ہے کہ یہ ہواباز جنگی قیدی نہیں تھے بلکہ جاسوس
ہ کی شرط کے مطابق انھیں رہا نہیں کیا جا سکتا۔ امریکہ اور ان اقوام کا جو امریکہ کے ساتھ کوریا میں مصروف جنگ رہیں تقاضا یہ ہ
ا ہیں۔ جب چین نے اس کی پرواہ نہ کی تو امریکہ نے معاملہ اقوام متحدہ میں پیش کر دیا، جہاں روس کی مخالفت کے علی الرغم جنرل اسمبلی نے

اس مضمون کی قرارداد منظور کردی کہ جنرل اسمبلی چین کے اقدام کی مذمت کرتی ہے اور اسے کوریائی معاہدۂ امن کی خلاف ورزی قرار دیتی قرارداد میں سکریٹری جنرل کو اختیار دیا گیا کہ وہ قیدیوں کی رہائی کے لئے کوشش کریں اور ۳۱ دسمبر سے پیشتر تمام ارکان اسمبلی کو نتائج سے مطلع کریں۔ یہ قرارداد منظور ہوتے ہی سکریٹری جنرل مسٹر ڈاگ نے چینی وزیراعظم چواین لائی کو ایک تار بھیجا جس میں معاملہ مذکور سے متعلق ذاتی طور سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ قرارداد سے متعلق چینی وزیراعظم نے ایک جلا کٹا بیان شائع کیا جس سے عام طور سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ملاقات کرنے میں ناکام رہیں گے اور اس سے اقوام متحدہ کے وقار کو صدمہ پہنچے گا لیکن شدید ناقدانہ بیان دینے کے بعد چواین لائی نے پھر رضامندی کا اظہار کردیا۔ یہ ملاقات اس ماہ کے آخر میں یا جنوری میں ہوگی اور اس اعتبار سے بے مثال کہ اقوام متحدہ کا سکریٹری جنرل ایسے اشتراکی ملک میں معاملہ طے کرنے جائے گا جسے اقوام متحدہ نے ابتک رکن تسلیم نہیں کیا۔ اشتراکی چین کا یہ رویہ متضاد ضرور نظر آتا ہے لیکن یہ اس کی حکمت عملی کا اہم جزو ہے۔ وہ ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا رہا ہے کہ اقوام متحدہ کا رکن بن جائے لیکن کامیابی کی کوئی صورت ابھی تک نہیں نکل سکی۔ حال ہی میں امریکہ کی کوششوں سے جنرل اسمبلی نے یہ فیصلہ کیا کہ چینی رکنیت کے سوال کو مزید ایک سال کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔ چین چاہتا ہے کہ وہ جائز و ناجائز ذرائع سے اس سوال کو تازہ رکھے تاکہ شاید کوئی بات بن جائے۔ ہوابازوں کے سلسلہ میں بھی اس کی کوشش یہ ہے کہ اسے سودا بازی کا ذریعہ بنایا جائے۔ ایسے مسائل سے وہ ایک اور بھی فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ان کے بل پر دیگر اقوام بالخصوص ایشیائی اقوام کے دل میں یہ خیال جاگزیں کرانا چاہتا ہے کہ امریکہ نہ محض چین کے خلاف جنگی اقدامات کر رہا ہے بلکہ اس کی حدود میں جاسوسی کا جال بھی بچھا رہا ہے اور اس طرح انھیں امریکہ کے خلاف بدظن کرنا چاہتا ہے۔ اس بدظنی کے لئے گنجائش بھی کافی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہوابازوں کے معاملہ میں ہی امریکہ میں رائے عامہ پر یہانتک اثر ہوا کہ بعض حلقوں سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ اگر چین ہوابازوں کو رہا نہ کرے تو اس کی بحری ناکہ بندی کی جائے۔ یہ غنیمت ہے کہ صدر آئزن ہاور نے بڑے تحمل سے کام لیا اور اس مطالبہ کو ماننے سے انکار کردیا۔

ہوابازوں کا مسئلہ بہت ٹیڑھا ہے۔ چواین لائی نے ہر چند ڈاگ کو چین بلا لیا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان مذاکرات میں یہ مسئلہ طے ہو جائے۔ چین اس پر سودا بازی ضرور کریگا اور امریکہ اس کے لئے تیار نہیں۔ ان حالات میں تصفیہ کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر چین نے ہوابازوں کو رہا نہ کیا تو امریکہ کیا اقدام کریگا؟ اس کے متعلق اس وقت وثوق سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ بعض اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ اس صورت میں اقوام متحدہ سے مطالبہ کریگا کہ قوت استعمال کرکے چین کو رہائی پر مجبور کرے۔ یہ صورت جنگ کے مترادف ہے۔ کیا کوئی قوم جنگ کی طرح ڈالنے کے لئے تیار ہوگی؟

دفاعی تیاریاں

جنگ کی طرح پڑے یا نہ امریکہ اشتراکیت کے خلاف مدافعتی تیاریوں میں ضرور مصروف ہے۔ فارموسا سے معاہدہ انہی تیاریوں کے سلسلے کی اہم ترین کڑی ہے کیونکہ اس کی زد براہ راست چین پر پڑتی ہے۔ سیٹو کا معاہدہ جس میں پاکستان شامل ہے اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ ان دنوں میں ویٹ نام کے متعلق بھی ایک قسم کا معاہدہ ہوگیا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے ویٹ نام دو حصوں میں منقسم ہوگیا ہے۔ شمالی حصہ اشتراکیوں کے قبضے میں ہے اور جنوبی فرانس کے زیر اثر۔ التوائے جنگ کے معاہدہ کی رو سے دونوں حصوں میں جنگی تیاریوں میں مزید اضافہ نہیں کرنا چاہئے لیکن ان دنوں بعض انکشافات ایسے ہوئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ا

م وبیش تین ڈویژن فوج بڑھالی ہے۔ فرانس کے نزدیک یہ تیاریاں تشویشناک ہیں۔ اسے دیکھ کر وزیر اعظم فرانس کی خواہش یہ ہے کہ جنوبی م میں دفاع کی کوئی ایسی صورت پیدا کرلی جائے جس میں امریکہ کی معاونت بھی ہو۔ یہ خواہش بجا لیکن وہ کھلم کھلا امریکہ سے استمداد نہیں کر سکتے شتراکیوں کے لئے پھر سے جنگ شروع کردینے کا بہانہ بن سکتا ہے۔ نومبر کے تیسرے ہفتے میں وزیر اعظم فرانس نے امریکہ کے دورے کے دوران نوع پر تبادلہ خیالات کیا۔ اس کے بعد جو اعلامیہ شائع ہوا اس میں مذکور ہے کہ مسٹر مینڈس فرانس اور مسٹر ڈلیز اس پر متفق ہیں کہ باہمی سے ایسے طریق ہائے کار اختیار کریں جن سے ویٹ نام کو اپنی آزادی برقرار رکھنے میں مدد ملے۔ یہ دیکھنا ہے کہ ان کی عملی شکل کیا ہوگی لیکن امریکہ کے عزائم کا پتہ ضرور چلتا ہے۔

یشیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ روس کی پالیسی کے مطابق ضرور ہے گو یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں پالیسی سراسر روس کی ہے یا چین کی۔ ویسے قرائن سے رہ جاتا ہے کہ چین روس کا حلقہ بگوش نہیں بہت حد تک آزاد جا رہا ہے۔ فی الحال یہ آزادی بین الاقوامی سیاست میں روس کے حق میں جا رہی ہے پنا میدان یورپ بن گیا ہے۔ معاہدات پیرس، جن کا تفصیلی ذکر دسمبر کے طلوع اسلام میں آچکا ہے، حکومتی تصدیقوں کے مراحل سے گذر رہے ہیں کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ یہ تصدیق نہ ہو تاکہ ان پر عمل درآمد نہ ہو سکے۔ اس عمل کو روکنے کیلئے اس نے یہ تجویز پیش کی کہ تمام متعلقہ اقوام کی نفرنس ماسکو میں ہو۔ اس کے لئے اس نے ۲۳۔ اقوام کو مدعو کیا۔ امریکہ اس میں شامل تھا۔ اس کے ساتھ یہ تجویز بھی تھی کہ چین کو بہ حیثیت یا جائے۔ اسی طرح مشرقی جرمنی کو تو مدعو کیا گیا لیکن مغربی جرمنی کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اقوام مغرب پر اس دعوت کا چنداں اثر نہیں ہوا اور ان رویہ یہی رہا کہ ہاں ایسے مذاکرات ہونے چاہئیں لیکن معاہدات پیرس کی تصدیق کے بعد۔ اس سلسلہ میں روس نے جو یادداشت بھیجی جواب میں برطانیہ، امریکہ اور فرانس نے لکھا کہ معاہداتِ پیرس کی تصدیق کو ہرگز روکا نہیں جا سکتا۔ البتہ اس کے بعد دول اربعہ عظمیٰ کے خارجہ کی کانفرنس طلب کی جا سکتی ہے بشرطیکہ روس آسٹریا کے معاہدۂ امن پر دستخط کرنے کے لئے تیار ہو جائے اور وحدتِ متعلق اپنی حکمت عملی واضح کرے۔ روس نے اسے تسلیم نہیں کیا اور اس نے اقوام مغرب کو یہ جتلا دیا کہ اگر معاہدات پیرس کی تصدیق ردی، تو مجوزہ کانفرنس کو بھی ملتوی کیا جا سکتا ہے۔ کسی ایک بات پر اتفاق نہ ہو سکنے کی صورت میں ماسکو کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں سات اشتراکی یورپی ممالک تھے اور چین بحیثیت مبصر کے موجود تھا۔ کانفرنس میں جو تقریریں ہوئیں ان میں سارا زور اسی پر صرف کیا گیا کہ مغرب جرمنی کو مسلح کرنے سے باز نہ آئیں تو شرکاء مجبور ہوں گے کہ اپنی مدافعت کے لئے مشترکہ اقدامات کریں۔ چار دن کی "نشستند و گفتند" رنس نے اعلان کیا کہ ممکنہ حملہ کے خلاف پورے دفاعی انتظامات کئے جائیں گے، نیز متعلقہ ممالک کی افواج اور کمانوں کو یکجا کرنے کی جائیگی۔ گویا مغربی ناٹو کے مقابلہ میں ایک طرح کا اشتراکی ناٹو تشکیل کیا جائیگا۔ اس اعلان کا بھی مغرب پر چنداں اثر نہیں پڑا۔ کے خیال میں روس پہلے ہی اپنے ماتحت ممالک کی فوجوں کو اپنے اقتدار میں کر چکا ہے۔ اور وہ جنگی تیاریاں حتی الامکان کر رہا ہے، لہذا اس کی حکمت عملی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آتی۔

اقوام متحدہ میں ایٹمی توانائی کے پرامن استعمال پر شرق و غرب میں کافی چپقلش رہی۔ کوئی ایک سال ہوا صدر آئزن ہاور نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ایٹمی توانائی کا ایک ذخیرہ اقوام متحدہ کی تحویل میں کیا جائے اور اسے دنیا بھر میں ضروریات امن کے لئے

استعمال کیا جائے۔ اس تجویز پر روس اور امریکہ میں براہِ راست مذاکرات بھی ہوتے رہے لیکن کچھ تصفیہ نہ ہو سکا۔ اقوامِ متحدہ میں آخر روس کی کوشش یہ رہی کہ مجوزہ ذخیرے کا انتظام حفاظتی کونسل کے سپرد ہوتا کہ اسے حقِ استرداد (VETO) استعمال کرنے کا موقع ملتا رہے۔ اس کے برعکس امریکہ اسے جنرل اسمبلی کے سپرد کر دینا چاہتا تھا تاکہ اسے روسی استرداد کی زحمت سے بچایا جا سکے۔ کوئی تصفیہ نہ ہو سکنے کی صورت میں امریکہ نے سات اور اقوام کی مدد کے ساتھ ایک نیا منصوبہ تیار کیا اور یہ تہیہ کر لیا کہ روس شامل ہو یا نہ اس پر عمل درآمد کیا جائے۔ اس نئی تجویز پر بحث ہو رہی تھی کہ امریکی نمائندے نے یہ ڈرامائی اعلان کر دیا کہ امریکہ نے دو سو بیس پونڈ ایٹمی مواد دوسرے ممالک میں تجرباتی استعمال کے لئے اقوامِ متحدہ کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ دوسرے دن برطانوی نمائندے نے اعلان کیا کہ اس کی حکومت نے چالیس پونڈ ایٹمی مواد اسی طرح اقوامِ متحدہ کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ دو اعلانات روسی توقعات کے یکسر خلاف تھے اور بڑے فیصلہ کن ثابت ہوئے چنانچہ یہ قرارداد منظور ہو گئی (روس نے بھی اس سے اتفاق کیا) کہ اگلے سال تمام حکومتوں کی ایک کانفرنس طلب کی جائے جو ایٹمی توانائی کے پرامن استعمال کے ذرائع سوچے نیز جو ایٹمی مادہ امریکہ اور برطانیہ نے اقوامِ متحدہ کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا ہے اسے بھی استعمال کرنے کے طریق کار فیصل کرے۔ اس فیصلہ پر پوری طرح عمل درآمد کیا جائے تو اس سے بڑے دوررس نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس سے نہ محض ایٹمی توانائی کا پرامن استعمال شروع ہو جائیگا بلکہ وہ ممالک بھی ایٹمی تجربے کرنے کے قابل ہو جائیں گے جو اس وقت مواد، ماہرین اور سرمائے کی کمی کی بدولت ایسا کرنے کا گمان بھی نہیں کر سکتے۔

ممالکِ اسلامیہ کی کشمکش

دنیائے اسلام ایک کشمکش سے دوچار ہے۔ ایک طرف وہ طرح طرح کے داخلی خلفشار میں مبتلا ہے اور دوسری طرف عالمگیر قوتیں ان پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ مسلمان حکومتیں اندرونی طور پر مستحکم ہو جائیں تو وہ بیرونی قویٰ سے عہدہ برآ ہو سکیں گی لیکن فی الحال یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا گو بعض علامات ایسی نمودار ہیں جن سے بہتری کی امید وابستہ کی جا سکتی ہے۔ ٹیونس میں حکومت اور فرانس کے مابین جو تصفیہ ہوا تھا اس کے مطابق شورش و بدامنی بڑی حد تک ختم ہو گئی ہے۔ اس سے خود مختاری کے حصول کے لئے فضا زیادہ سازگار ہو جاتی ہے لیکن یہ دیکھنا ہے کہ خود مختاری کے لئے جو مذاکرات ٹیونس اور فرانس کے مابین ہو رہے ہیں، ان کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ اگر فرانس نے دیانتداری سے اس ملک کو خود مختاری دینے کی کوشش کی تو تنازع کا تصفیہ یقیناً ہو جائیگا لیکن اگر اس نے ذرا بھی بخل سے کام لیا تو اس علاقے میں امن کی توقع عبث ہوگی۔ ٹیونس کے ساتھ مراکو اور الجیریا میں بھی شورش برپا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ دہشت پسندی سے قوموں کی قسمتیں طے نہیں کی جا سکتیں لیکن اگر فرانس مصالحت پر آمادہ نہ ہو تو آزادی خواہوں کے پاس "بغاوت" کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا۔ مراکو اور الجیریا پر ٹیونس کے تصفیہ کا لامحالہ اثر پڑیگا۔ اگر ٹیونس کو خود مختاری مل گئی تو مراکو اور الجیریا کے لئے ایک راہ واضح ہو جائیگی۔ ٹیونس سے ادھر مصر میں حالات پھر ناگوار صورت اختیار کر گئے ہیں۔ درحقیقت شاہ فاروق کی برطرفی کے بعد جو جنگِ اقتدار مصر میں شروع ہوئی اس کا ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا۔ رفتہ رفتہ لیکن پورے زور سے کرنل ناصر حقیقی اقتدار کے مالک بنتے چلے جا رہے ہیں۔ جنرل نجیب سے وہ گلو خلاصی کرا چکے ہیں اور اخوان المسلمون کو نہ محض توڑ چکے ہیں بلکہ اس کے کئی ممتاز ارکان کو تختہ دار پر لٹکا چکے ہیں۔ اخوان کے قائد الہضیبی کو پہلے سزائے موت دی گئی تھی مگر بعد میں اسے عمر قید

یا گیا۔ اخوان مصر کا ازحد نازک معاملہ ہے۔ یہ جماعت بڑی منظم اور ہمہ گیر تھی اور اب تک وہ بظاہر فوجی حکومت کا ساتھ دیتی رہی ہے۔ اب اس
دام کے بعد حکومت مصر کی کیا پوزیشن ہو گی اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اتنا یقین ہے کہ حکومت کو بحالات موجودہ مستحکم نہیں کہا جا سکتا۔
اس عدم استحکام کا اثر دیگر ممالک عربیہ پر بھی پڑ رہا ہے۔ مصر اندرونی خلفشار سے پاک ہوتا تو اس کا بین الاقوامی سیاست میں بڑا عمدہ کردار ہوتا۔
سوڈان کا مسئلہ بھی حل کر چکا ہے اور سویز کا بھی۔ ان تنازعات کے تصفیہ کے بعد وہ قومی ارتفاع پر بھی کافی توجہ صرف کر سکتا تھا لیکن اب
کی تمام تر توجہ اندرونی کشمکش کی نذر ہو رہی ہے۔ اس سے نہ وہ صاف طور پر مغرب سے متعلق کوئی حتمی فیصلہ کر سکا ہے نہ دیگر ممالک عربیہ
متحدہ طور پر ایسا کر سکی ہیں۔ اس سے عربی وحدت کو کافی ضعف پہنچا ہے اور بہت حد تک مصر اس کا ذمہ دار ہے۔ مصر ہی کی بدولت مشرق وسطیٰ
کوئی دفاعی تنظیم قائم نہیں ہو سکی۔ حالانکہ ممالک عربیہ اس کے متمنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عراق نے از خود براہ راست امریکہ سے فوجی امداد طلب کی
ق اور اردن دونوں برطانیہ سے معاہدات کی ترمیم و اصلاح میں مصروف ہیں۔ اگر ممالک عربیہ متحدہ اقدام کر سکنے کے قابل ہوتے تو یہ ترمیمات
ف انداز سے سرانجام دی جا سکتی تھیں۔

بین الاقوامی حالات جس انداز سے پلٹا کھاتے چلے جا رہے ہیں ان کے پیش نظر امریکہ مشرق وسطیٰ سے متعلق اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنا چاہتا ہے
، وسطیٰ کے ممالک امریکہ سے دوستی کا دم بھرتے ہیں لیکن کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر پاتے۔ عرب لیگ کے سامنے عربی ممالک کی اجتماعی مدافعت کا
ر پیش ہوا تو یہی طے پایا کہ اس کی مدافعت از خود کی جائے حالانکہ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمام عربی ممالک مل کر بھی کوئی قابل ذکر
سلسلہ قائم نہیں کر سکتے جب تک کہ وہ امریکہ سے سامانِ جنگ اور سرمایہ کی مدد نہ لیں۔ ممالک اسلامیہ میں ترکی ایسا ملک ہے جو شاید اس
رم استحکام میں کچھ توازن پیدا کر سکے۔ ترکی اور مصر کے تعلقات کچھ عرصہ سے خراب چلے آ رہے ہیں لیکن اب ان میں خوشگواری کے آثار پیدا ہو رہے
کی وزیر اعظم عنقریب مصر جا رہے ہیں۔ اس سے کم درجے پر آمد و رفت ہو چکی ہے اس دورے کا نتیجہ کیا نکلے گا اس کا جواب وقت ہی دے سکتا ہے۔

عمل

۲۴ اکتوبر کو ہنگامی حالات کا اعلان کر کے اور مجلس دستور ساز کو ختم کر کے گورنر جنرل نے ملکی سیاست کو جس شاہراہ پر ڈال دیا تھا
اس کا دوسرا سنگ میل ۲۲ نومبر کو سامنے آیا جبکہ وزیر اعظم نے ایک نشری تقریر میں یہ انقلاب انگیز اعلان کیا کہ حکومت نے مغربی پاکستان
دں اور ریاستوں کو ملا کر ایک صوبہ بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس تبدیلی کو بروئے کار لانے کیلئے ماہرین کی ایک کمیٹی کو تفاصیل طے کرنے پر مامور
لیا۔ اس فیصلہ کی مزید تفصیل وزیر اعظم نے یکم دسمبر کی ماہانہ نشری تقریر میں بہم پہنچائی۔ اس میں انھوں نے بتایا کہ پنجاب نے وحدت مغرب
پہ قربانی کی ہے کہ ۵۶ فی صدی آبادی کے باوجود اس نے مغربی پاکستان کی مجوزہ اسمبلی میں صرف ۴۰ فی صدی نیابت قبول کر لی ہے تاکہ دوسرے
و یہ نہ سمجھیں کہ ایک یونٹ میں ان کے حقوق پامال ہوں گے یا ان کی حیثیت ثانوی ہو جائے گی۔ پنجاب کے اس ایثار کی وزیر اعظم نے بہت
ف کی، اور بات ہے بھی تعریف کے قابل۔ ذرا اس کا مقابلہ کیجئے بنگال کی نام نہاد اکثریت کے رویہ سے۔ برطرف شدہ مجلس دستور ساز
میں بنگالی اکثریت نے عددی برتری کے زور پر ملکی مفاد کو کچل کے رکھ دیا۔ اس نے اپنی برتری جتانے کا کوئی موقع فراموش نہیں کیا عام
کہ اس سے ملک و قوم کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچا ہو۔ اسی مذموم ذہنیت نے ملک کو اس قعر مذلت میں پہنچایا جس میں وہ ۲۴ اکتوبر کو پہنچ
وزیر اعظم نے اس کے ساتھ یہ بھی اعلان کیا کہ ۱۴-۱۵ دسمبر کو انھوں نے کراچی میں ایک کانفرنس طلب کی ہے جس میں صوبوں کے گورنر اور

وزرائے اعلیٰ وغیرہم شریک ہوں گے اور مناسب غور و خوض کے بعد اہم فیصلے کریں گے۔

ادھر ۲۲ نومبر کو وزیر اعظم نے ایک یونٹ بنا دینے کی تجویز کا اعلان کیا اور اُدھر ملک میں مرحبا کے نعرے بلند ہونے شروع ہو گئے اور اس تائید کے ساتھ اجتماعی تائید کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ خیرپور اسمبلی نے پہلے بھی اپنا فیصلہ وحدت کے حق میں دے رکھا تھا۔ اس کے بعد پنجاب نے متفقہ طور پر ایک قرارداد پاس کی جس میں تجویز وحدت کی پوری پوری حمایت کی گئی اور اس امید کا اظہار کیا گیا کہ اسے بہت جلد عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ پنجاب کے بعد صوبہ سرحد کی اسمبلی نے اس فیصلے پر صاد کیا۔ خیرپور اور صوبہ سرحد کی تائید اس اعتبار سے اہم ہے کہ انہی علاقوں سے مخالفت کی توقع کی جا رہی تھی۔ ۲۴ اکتوبر سے پیشتر وحدتِ مغرب کی مخالفت میں سب سے پیش پیش سندھ کا صوبہ یعنی بالفاظ دیگر سندھ کے اصحاب اقتدار تھے جو بلا استحقاق مناصب پر قابض تھے۔ لیکن سندھ میں جو سیاسی تبدیلی آئی اس سے ذہنیتوں میں بھی انقلاب پیدا ہو گیا یہاں تک کہ اا دسمبر کیلئے سندھ اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ بھی مقرر کر دی گئی جس میں وحدتِ مغرب سے متعلق رائے دینا تھی۔ سندھ کے وزیر اعظم نے ایک روز پیشتر وثوق سے کہدیا تھا کہ سندھ اسمبلی اس تجویز کی حمایت کرے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ایک سو چار میں سے ... ارکان نے اس کے حق میں ووٹ دیا۔ اور تو اور غیر مسلم حزبِ اختلاف نے بھی اس پر صاد کیا اور اسے سندھ کے لئے مفید ... کا حمایت کا اعلان کرنا تھا کہ ملک کی آنکھیں کھل گئیں اور یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو گئی کہ کوئی ذی ہوش اور وطن خواہ اس کی مخالفت کر ہی نہیں سکتا۔ ملک نے یک زبان ہو کر وحدت پر صاد کیا تو صوبوں کے گورنر اور وزرائے اعلیٰ اور ریاستوں کے نمائندے کراچی میں جمع ہوئے۔ اس کانفرنس کے انعقاد سے پیشتر نہ محض تمام مغربی پاکستان نے وحدت کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا بلکہ ماہرین کی کمیٹی اپنی رپورٹ بھی تیار کر لی تھی اور اس رپورٹ پر کابینہ نے غور بھی کر لیا تھا۔ اس کانفرنس کے خاتمہ پر گورنر جنرل نے ایک آرڈیننس جاری کیا جس کی رو سے مغربی پاکستان کی ایک مجلس انتظامی کی تشکیل کا اعلان کیا جس میں سندھ، پنجاب اور صوبہ سرحد کے گورنر اور وزرائے اعلیٰ، بلوچستان کے اے جی جی شریک ہوں گے۔ وزیر اعظم خیرپور، منسٹر بہاولپور اور وزیر اعظم قلات کو بہ حیثیت اپنے علاقوں کے نمائندوں کے کانفرنس کے ساتھ منسلک کیا جائے گا۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ ہو گا کہ وحدت مغربی پاکستان کے قیام کی تفاصیل طے کرے، لائحہ عمل اور دیگر متعلقہ معاملات کے متعلق مناسب فیصلے کرے۔ ان مقاصد کیلئے وہ جس قسم کی کمیٹی چاہے تشکیل کر سکتی ہے۔

وحدت کا نقشہ

گورنروں اور وزرائے اعلیٰ وغیرہ کی کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ یونٹ کا نقشہ بالکل صوبے کا سا ہو۔ یعنی ایک گورنر، ایک کابینہ، ایک اسمبلی اور ایک سکرٹریٹ۔ نئے صوبے میں پچاس اضلاع اور ایجنسیاں ہوں گی اور دس کمشنر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جائیں گے تاکہ وہ معاملات کو زیادہ حد تک مقامی طور پر خود ہی نپٹا سکیں۔ علاقے اور کراچی (ماسوائے وفاقی علاقہ) جو اس وقت مرکز کے تحت ہیں وہ سب نئے صوبے میں شامل ہوں گے۔ کراچی کا جو حصہ مرکز میں رہے گا وہاں ایک کمشنر متعین کیا جائے گا۔ ضمنی طور پر اس سے کراچی کی پوزیشن بالکل واضح ہو جاتی ہے اور یہ ڈر نہیں رہتا کہ مرکز ہونے کی حیثیت سے وہ ایک علیحدہ یونٹ بن جائے گا۔ یہ خدشہ حقیقی تھا کیونکہ جب سے ایک یونٹ کی تجویز کا اعلان ہوا ہے ا... اس کوشش میں تھے کہ کراچی علیحدہ یونٹ بن جائے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو نہ محض مغربی وحدت نا تمام رہ جاتی بلکہ جنگ اقتدا...

رجاتا۔ جو نیا صوبہ بنے گا اس کے اختیارات فی الحال ایک موجودہ صوبے کے برابر ہوں گے، البتہ بعد میں مرکز اور مشرق اور مغرب کے
بوں کے مابین تقسیم اختیارات کا تصفیہ ہوگا۔ قبائلی علاقے کے نظم و نسق میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوگی۔ نئی حکومت میں قبائلی
سلئے ایک ریذیڈنٹ وزیر مقرر کیا جائے گا۔ جو ان کی رفاہ پر خصوصی توجہ دیگا۔ مغربی پاکستان کی معاشی ترقی کیلئے یہ فیصلہ
لہ ایک نیم خود مختار "پاور اینڈ پراجیکٹ اتھارٹی" قائم کی جائے جو تمام ترقیاتی منصوبوں کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ ہائی کورٹ سے
ہ تک کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔ اس کا فیصلہ فیڈرل کورٹ کے مشورے سے ہوگا۔ اور اس کا بعد میں اعلان کر دیا جائیگا۔

رچھوٹے صوبوں کی تسلی کے لئے دس سال تک انھیں مناسب تحفظات دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے، اس لئے ملازمتوں میں موجودہ
تناسب باقی رکھا جائے گا۔ نیز جو ملازمتیں ضلعوں یا متعلقہ علاقوں تک محدود تھیں وہ بدستور سابق رہیں گی۔ یہ علاقائی تناسب
ہ تک رہے گا۔ ہوسکتا ہے کہ قبائلی علاقے کا تناسب دس سال کے بعد بھی رہے۔ یہ تحفظات اصولی نقطۂ نگاہ سے قابلِ اعتراض
ہیں لیکن چونکہ وحدت کے لئے جس انقلاب فکر و نظر کی ضرورت ہے وہ ہنوز تشکل نہیں ہوا اس لئے ان تحفظات کی ضرورت
ہے۔ البتہ ہمارے نزدیک دس سال کا عرصہ بہت لمبا ہے یہ تحفظات زیادہ سے زیادہ تین سال تک کے لئے ہوتے تو مناسب
جسقدر جلد ممکن ہو ہر پاکستانی بہ حیثیت پاکستانی معیار قابلیت کی بنا پر ہر شعبہ میں لیا جاتے۔

رنر جنرل نے بذریعہ آرڈیننس جو انتظامی کونسل مقرر کی ہے اس کا پہلا اجلاس منعقد ہو چکا ہے اس میں کونسل نے مسٹر گورمانی،
اب کو اپنا کنوینر مقرر کیا اور چار کمیٹیاں مقرر کیں جو متفرق مسائل متعلقہ کی تفاصیل طے کریں گی۔ کونسل کا آئندہ اجلاس پشاور میں
ر کو منعقد ہوگا۔

م — موجودہ مرکزی حکومت کی تکمیل کے سلسلہ میں جو اہم قدم اٹھایا گیا ہے اور جو ایک عرصے سے قیاس آرائیوں کا موضوع بنا ہوا
تھا، مسٹر سہروردی کی شمولیت ہے۔ مسٹر سہروردی نے پاکستان میں عوامی لیگ قائم کی لیکن جیسا کہ توقع کی جاسکتی تھی
زبِ اختلاف نہیں بن سکی۔ یہ طرفہ تماشا ہے (اور علیحدہ بحث کا موضوع) کہ پاکستان میں مسلم لیگ برسرِ اقتدار جماعت تھی
تہ رفتہ اس کی جماعتی حیثیت ختم ہو کے رہ گئی۔ اب یہ صورت ہے کہ مرکز میں مسلم لیگ کی حکومت بھی نہیں رہی۔ اس کے احیاء کی
جتنی کوششیں ہوئیں وہ کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکیں۔ اِدھر یہ جماعت ختم ہو گئی اور اُدھر کوئی دوسری جماعت ابھر نہیں سکی۔
سلے انتخابات کے سلسلہ میں پارٹیوں میں تحریک ضرور پیدا ہوگی لیکن مستقبل کے امکانات کیا ہیں وہ اس تبصرے کی حدود سے
ہیں۔ بہرکیف عوامی لیگ کی تنظیمی صورت یہ ہے کہ مسٹر سہروردی ابھی تک اس کے کنوینر ہیں۔ مغربی پاکستان کے صوبوں میں اس
خیں ہیں لیکن وہ اس حد تک مقامی شخصیتوں کی رہین منت ہیں کہ انھیں مرکزی جماعت کی شاخیں تکلفاً ہی کہا جاسکتا ہے
پاکستان کی عوامی لیگ مولانا بھاشانی کے زیر صدارت "مرکز" سے آزاد تھی۔ لیکن بنگال میں جب انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ
ت جماعتوں نے منفی اساس پر تعاون کر کے ایک متحدہ محاذ قائم کیا اور کامیابی حاصل کی۔ اس کامیابی میں مسٹر سہروردی کا بھی ہاتھ
وہ حصہ مولوی فضل الحق اور مولانا بھاشانی کی ذات کا تھا۔ کامیابی کے بعد اس نام نہاد "متحدہ" محاذ میں سر پھٹول شروع ہوا

ضمہ۔ میں لمعات بھی ملاحظہ کیجئے۔ وہ تجویز زیادہ موزوں نظر آتی ہے۔

اور بڑی مشکل سے مولوی فضل الحق نامکمل وزارت بنانے میں کامیاب ہوئے ۔ وہ وزارت بھی فضل الحق کی غیر ذمہ دار تقریروں ا
کی بدولت برقرار نہ رہ سکی۔ اس وقت سے لیکر اب تک متحدہ محاذ کے اختلافات اور شدت اختیار کر گئے۔ اس کے علاوہ مولوی فضل
خلاف فضا پیدا ہونا شروع ہوگئی اور کوششیں شروع ہوگئیں کہ وہ پھر سے وزارت مرتب نہ کر سکیں۔ مولانا بھاشانی کئی ماہ سے انگ
مقیم ہیں اور ان کی واپسی کا فی الحال کوئی امکان نہیں۔ ان حالات میں عوامی لیگ اور مسٹر سہروردی کی پوزیشن مستحکم ہوگئی اور مش
کے مستقبل کا دارومدار انہی کے فیصلہ پر ہوگیا۔ وہ ۱۲ ردسمبر کو پاکستان واپس آئے۔ ان کے آنے پر مشرقی پاکستان میں کافی ہل چل مچ گ
ارباب سیاست کی یہ کوشش تھی کہ وہ ان سے مل کر اپنے لئے جگہ پیدا کرلیں۔ متحدہ محاذ تو ایک طرف خود عوامی لیگ میں جنگ اقت
گورنر جنرل اور مسٹر سہروردی کی ملاقاتوں کے ساتھ مولوی فضل الحق اور گورنر جنرل کے مابین بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ یہ قابل ذکر ہے کہ کراچی میں ا
فضل الحق اور مسٹر سہروردی ایک دوسرے سے نہیں ملے۔ ان ملاقاتوں کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ مسٹر سہروردی کو مرکزی حکومت میں شریک کر لیا گ
انھیں قانون کا قلمدان دیا گیا ہے جس میں دستوری امور اور انتخابات بھی شامل ہیں ۔

مسٹر سہروردی کی شمولیت ان کے حزبی انتساب کی بدولت نہیں بلکہ جیسا کہ انھوں نے وزیر بننے کے بعد ایک بیان میں کہا موجودہ حکو
پارٹی حکومت نہیں لیکن ان کی شمولیت سے مشرقی پاکستان کی سیاست پر ضرور اثر پڑیگا اور ہوسکتا ہے کہ انہی کی رائے کو ترجیح دی جائے۔
کرنا قبل از وقت ہے کہ مشرقی پاکستان پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ ایک اطلاع سے پتہ چلتا ہے کہ گورنر جنرل اور مسٹر سہروردی عنقریب اس صو
کریں گے اور پھر کچھ فیصلہ کریں گے۔ مسٹر سہروردی کی شمولیت کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ موجودہ حکومت دونوں حصص ملک کی نمائندہ ہو گ
اب پیش نظر دستور کی تسوید زیادہ اعتماد سے کی جاسکے گی ۔

ہندوستان سے روابط

مسٹر سہروردی نے بھی اپنے بیان میں کہا ہے کہ وہ ہندوستان سے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کے
ہیں۔ اس سے پیشتر گورنر جنرل ایک ذاتی پیغام میں پنڈت نہرو کو باہمی تنازعات کے حل کی دعوت د
ہیں۔ ان کے وزیر اعظم نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور پنڈت نہرو کو دعوت دی کہ وہ جنوری میں کراچی آئیں اور مذاکرات کی طرح ڈالیں۔
نہرو نے جواب میں ملاقات پر رضامندی کا اظہار کیا ہے البتہ جنوری میں کراچی آنے میں معذوری ظاہر کی ہے کیونکہ وہ اس مہینے ہر
کاموں میں مصروف ہوں گے۔ اب یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ فروری میں دونوں وزرائے اعظم میں باقاعدہ ملاقات ہو جائیگی ا
باہمی کا نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ ویسے اس سے پیشتر اس ماہ کے آخر میں انڈونیشیا میں جو کولمبو ممالک کی کانفرنس ہو رہی ہ
دونوں کی ملاقات ہوگی اور مبادیات طے ہوسکیں گی۔ جنوری میں دونوں لندن کی دولت مشترکہ کی کانفرنس میں بھی ملیں گے اور مزید تبادلہ
کر سکیں گے۔ ہندوستان سے متعلق ایک اہم تنازع یعنی دریائی پانی کی تقسیم کے مسئلہ پر واشنگٹن میں پھر سے مذاکرات شروع ہوگئے ہیں۔
کئی ماہ سے تعطل میں پڑے ہوئے تھے۔ اس موقع پر عالمی بنک نے اپنی ان تجاویز کو شائع کردیا جس کی بنا پر مذاکرات شروع ہوئے ہیں
سرکاری طور پر پہلی بار شائع ہوئی ہیں لیکن اب تک جو اطلاعات اخبارات میں آچکی ہیں ان سے چنداں مختلف نہیں، ان کا ما حص
کہ چناب، جہلم اور سندھ کے پانی پاکستان کے حصے میں آئیں گے البتہ جہلم کا معمولی سا پانی جموں اور کشمیر میں استعمال ہوسکے گا۔

ور راوی کو استعمال کرے گا۔ عبوری دور کے لئے پاکستان ان دریاؤں کے ستعمال کا مجاز ہوگا۔ یہ عبوری دور اس وقت تک ہوگا جبتک
ہریں نکال کر اس پانی سے مستغنی نہیں ہوجاتا۔ بنک نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ پاکستان یا ہندوستان مجبور نہیں کہ ان تجاویز
س میں حسب ضرورت کمی بیشی کرسکتے ہیں گویا مفاہمت کی کافی گنجائش ہے لیکن ہندوستان سے بار بار مذاکرات کے ذریعہ تنازعہ
کوشش کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ

پھر وہیں لے چلا مجھے دیکھو دلِ خانہ خراب کی باتیں

تے تھے کہ "مومن ایک سوراخ سے کبھی دو دفعہ نہیں ڈسا جایا کرتا" لیکن ایک ہم "مومن" ہیں کہ ہر بار ناگ ڈسے جارہا ہے
راخ میں انگلی دیئے جارہے ہیں۔ سچ ہے۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے

طلوع اسلام



اپریل ۱۹۵۶ء

ادارۂ طلوع اسلام کراچی

[illegible]

١ [illegible]

٢ [illegible]

٣ حق اور باطل کا معیار قرآن [illegible]

٤ [illegible]

٥ [illegible]

٦ [illegible]

٧ [illegible]

٨ [illegible]

[illegible]

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

اگست سنہ ۱۹۴۷ء میں جب میں پہلی مرتبہ کراچی آیا تو موٹر گاڑی، ٹریمپے اور عام راہروؤں کی زبانی متعدد بار سعید منزل کا نام سنائی دیا۔ معلوم ہوا کہ وہ کراچی کے ایک قدیمی ڈاکٹر کا مکان ہے اور بہت مشہور۔ رفتہ رفتہ مکان کے ساتھ مکین کا نام بھی کانوں تک پہنچا لیکن عجیب متضاد خصوصیات کے ساتھ۔ "ڈاکٹر سعید! ڈاکٹر تو بہت قابل ہے۔ لیکن بڑا بدمزاج ہے۔" "اس نے کراچی کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود میں بڑا حصہ لیا ہے۔ لیکن بڑا سخت اور کرخت ہے!" "بڑا مخیر ہے لیکن بڑا ہی بدلحاظ ہے۔" "بڑا دیانتدار ہے۔ لیکن کچھ مذہبی سا آدمی ہے: وغیرہ وغیرہ۔

غالباً سنہ ۱۹۴۸ء کا ذکر ہے۔ ایک شام میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ باہر آکر دیکھا۔ تو ایک معمّر بزرگ ہیں۔ سرو قامت۔ چھریرا بدن (کمر نہیں ملکہ) شانوں کے درمیان خفیف سا جھکاؤ۔ سادہ لباس۔ ہاتھ میں طلوع اسلام کا پرچہ۔ کہا کہ میں پرویز صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا پرویز میرا ہی نام ہے۔ اندر تشریف لے آیئے۔ کہنے لگے۔ "تمہارے مکان میں باہر صحن ہے۔ صحن میں درخت ہیں، ہوا نہایت لطیف اور پاکیزہ ہے۔ قدرت نے تمہیں یہ کچھ دے رکھا ہے۔ اور تم ہو کہ کمرے کے اندر بند ہو اور مجھے بھی وہیں بلاتے ہو۔ باہر بیٹھو۔" اس ڈانٹ کی تختی میں کچھ ایسا خلوص اور شفقت، سادگی اور یگانگت تھی کہ میں بیساختہ مسکرا دیا۔ اور ایک لفظ کہے بغیر باہر آ بیٹھا۔ کہنے لگے۔ میری مذہبی تعلیم تو کچھ بے نہیں لیکن مذہب کے متعلق ہمیں جو کچھ بتایا جاتا ہے اس نے مجھے کبھی اپیل نہیں کیا۔ میرے دل نے کبھی نہیں مانا کہ وہ خدا کی طرف سے دیا ہوا مذہب ہو سکتا ہے۔ اس رسالہ میں میں نے تمہارا ایک مضمون دیکھا ہے۔ جس نے پہلی بار مجھے مذہب کی طرف کھینچا ہے۔ معلوم ہوا کہ تم کراچی میں ہو۔ اس لئے میں نے چاہا کہ تم سے براہ راست باتیں کی جائیں۔ یہ ہے میرے آنے کا مقصد۔" (کم و بیش ان کے یہی الفاظ تھے۔ بجز اس کے کہ انہوں نے پنجابی زبان میں بات کی تھی اور تسیں کہا تھا جو آپ اور تم دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے)

یہ تھی ڈاکٹر سعید صاحب سے میری پہلی ملاقات۔ اس کے بعد یہ سلسلہ آگے بڑھا۔ اور جوں جوں میں ان سے قریب ہوتا گیا میری حیرت بڑھتی گئی کہ لوگوں نے اس شخص کے متعلق کیا رائیں قائم کر رکھی ہیں۔ اور یہ درحقیقت ہے کیا! اتنا بلند انسان اور ایسا صاف و شفاف مسلمان! اس دور میں اس انداز کے انسان بہت کم دکھائی دیں گے۔ جس چیز کو سطح بین لوگوں نے بدمزاجی اور کرختگی سمجھ رکھا تھا۔ وہ درحقیقت ان کی بے پناہ اصول پرستی اور بے وجہ لائم حق گوئی اور انصاف

پڑ رہی تھی۔ جسے انہوں نے غصہ اور سختی یا ڈانٹ ڈپٹ قرار دے رکھا تھا۔ وہ دراصل انتہائی کرب والم کی چیخ تھی جو انسانیت کی زبوں حالی پر ان کے دل پُردرد کی گہرائیوں سے ابھرا کرتی تھی۔ وہ درحقیقت اقبال کے اس "مرد بزرگ" کی چلتی پھرتی تصویر تھے جس کے متعلق اس نے کہا ہے کہ

اس کی نفرت بھی عمیق اس کی محبت بھی عمیق — قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق

لوگوں کی سطحی نگاہیں جو جلاد کی چھری اور ڈاکٹر کے نشتر میں بہت کم امتیاز کرتی ہیں۔ اس مرد بزرگ کے آہنی پیکر کو دیکھتی تھیں لیکن اس کے اندر چھپے ہوئے سوز و گداز، درد و داغ، غم والم اور شفقت و محبت سے بھرے ہوئے قلب حساس کو نہیں دیکھ سکتیں۔ یہ مرد بزرگ اس حقیقت کی زندہ تفسیر تھا۔ کہ

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے — تنے محکم تر از سنگیں حصارے

درونِ او دلِ دردآشنائے — چو جوئے در کنارِ کوہسارے

باقی رہی ان کی "لامذہبیت" سو پہلے دن جب قرآن کا دیا ہوا صحیح دین ان کے سامنے آیا۔ اس وقت سے زندگی کے آخری سانس تک وہ اس کے والہانہ شیدائی رہے۔ اور انہوں نے عمر کا آخری حصہ اس دین کے سمجھنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے میں صرف کر دیا۔ قرآن ہی کا یہ رشتہ تھا۔ جس کی وجہ سے ان کے میرے ساتھ اس قسم کے تعلقات پیدا ہو گئے کہ انہوں نے میرے اور میرے متعلقین کے عوارض اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والی پریشانیوں کو قاطبتہً اپنے سر لے لیا۔ اور اس خود عائد کردہ ذمہ داری کو اپنی ضعیفی اور خرابیٔ صحت کے باوجود اس مردانہ ہمت سے پورا کرتے رہے۔ جس کی مثال بمشکل ملے گی۔ انہیں اپنے آرام اور سکون کا کوئی خیال نہیں ہوتا تھا۔ ہمیشہ اسی کی فکر رہتی تھی کہ مجھے آرام اور سکون کس طرح مل سکتا ہے۔

اتوار کی صبح وہ بالالتزام میرے ہاں تشریف لے آتے۔ میرے گھر میں ان کا مقام بزرگ خاندان کا سا تھا۔ اس لئے وہ تمام افرادِ خانہ کی دیکھ بھال کرتے۔ بچوں سے بالخصوص انہیں بڑی محبت تھی ان کے لئے وہ اپنی جیب میں ہمیشہ ٹافیاں رکھتے تھے۔ اس فریضہ سے فارغ ہونے کے بعد وہ اطمینان سے مکان کے صحن میں نیم کے درختوں کے سایہ تلے بیٹھ جاتے۔ اور قرآن کے متعلق مختلف باتیں پوچھنا شروع کر دیتے۔ رفتہ رفتہ اور ملنے والے بھی اس نشست میں شریک ہونے لگے۔ اور اسی نجی نشست نے بالآخر ہفتہ واری خطبات قرآنیہ کی شکل اختیار کر لی۔ جو اب کراچی کے قرآنی احباب کے لئے جزو زندگی بن چکے ہیں خطبہ کی ان مجالس کے بانی بھی ڈاکٹر صاحب تھے اور روح رواں بھی وہی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں تو جمعہ کی صبح سے اتوار کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ اور پھر سوموار کی صبح سے درس کے مضمون کو لوگوں تک پہنچانے میں لگا رہتا ہوں۔ قریب تین سال سے ان کی زندگی اسی نہج پر چل رہی تھی۔

جب گزشتہ ستمبر مجھے سرکاری مکان سے نکلنا پڑا۔ تو یہ چیز ڈاکٹر صاحب پر بڑی شاق گزری۔ ان کی آرزو یہ تھی کہ طلوع خطبات کا سلسلہ جلد از جلد میرے اپنے مکان میں شروع ہو جائے۔ چنانچہ رات دن ایک کر کے میرا مکان تیار کرایا

ِمارچ کی اتوار کی نشست اسی کے صحن میں ہوئی۔ اُس دن ڈاکٹر صاحب کی خوشی کا یہ عالم تھا، گویا ان پر دوبارہ جوانی آ رہی ہے
ا آئندہ اتوار کے اجتماع کے لئے خاص ہدایات دے کر رخصت ہوئے۔

۱۴ مارچ کی شام قریب چھ بجے مجھے اچانک اطلاع ملی کہ ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ حسب معمول پانچ
ے اپنے مکان کے صحن میں بیٹھے احباب سے باتیں کر رہے تھے کہ دل میں کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہوئی۔ خود ان کا بیٹا (ڈاکٹر) وہیں
جود تھا۔ گھر میں اپنا مطلب تھا۔ طبی امداد کا سارا سامان اور دوائیاں سامنے رکھی تھیں۔ لیکن قبل اس کے کہ ان میں سے کسی کے
ستعمال کی نوبت آتی۔ وہ مسکراتے ہوئے آغوشِ موت سے ہمکنار ہو گئے۔

۱۵ مارچ (جمعرات) کی صبح میں اپنے ہاتھوں ایک ایسے شفیق بزرگ، مخلص دوست، بلند انسان اور قرآن کے شیدائی
سپردِ خاک کر آیا، جو اپنے دور کی آخری نشانی تھے۔ مادرِ گیتی اس قسم کے فرزندانِ جلیل روز روز پیدا نہیں کیا کرتی۔

میرے دل کے زخم ابھی مولانا اسلمؒ کی وفات کے صدمہ سے مندمل نہیں ہونے پائے تھے۔ کہ اب میں ایک اور
لگسار بزرگ کی شفقتوں سے محروم ہو گیا۔ جب آلام و مصائب آتے ہیں تو تنہا نہیں آتے۔ ہجوم کر کے آتے ہیں۔ لیکن یہی واقع
ت و استقامت کے لئے اپنی پرکھ کے بھی ہوتے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

پرویز

تربیتی مرکز

ہفتہ وار طلوع اسلام کی آخری اشاعت میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ کو قائم رکھنے او
آگے بڑھانے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا تربیتی مرکز کھولا جائے۔ جس میں ہونہار اور صاحب ذوق تعلیم یافتہ نوجوانو
کی صحیح تعلیم و تربیت سے انھیں قرآن کا داعی اور پیام رساں بنایا جائے۔ اس تجویز کے سلسلہ میں اب تک متعدد نوجوانو
کے خطوط موصول ہو چکے ہیں۔ لیکن ان میں بیشتر ایسے ہیں۔ جنہوں نے محض جذباتی طور پر اس مقصد عظیم کے لئے اپنے آپ کو پیش
کر دیا ہے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اس کے لئے جذباتِ صادقہ کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کی شرط لاینفک ہے۔ یہ طالب علم ایسے ہونے چ
جو اتنا کچھ سمجھ سکنے کی صلاحیت رکھتے ہوں کہ عصر حاضر میں مختلف علوم کے ائمہ فکر کس مقام پر کھڑے ہیں۔ اور وحیٔ خداوندی
کونسی راہ نمائی دیتی ہے۔ نیز جو یہ سمجھ سکیں کہ صحیح اسلام کیا تھا۔ وہ کن کن ادوار سے گذرا۔ اور وہ کچھ کیسے بن گیا جسے ہم آج اسا
کہتے ہیں۔ جو زندگی کے تقاضوں اور انسانیت کی منزل مقصود سے متعلق افکار و مباحث کا احاطہ کر سکیں۔ اس قسم کی صلا
کے لئے ضروری ہے کہ وہ کم از کم علم کے ان شعبوں کے مبادیات سے واقف ہوں اور اپنی فکر و نظر کو قرآنی قالب
ڈھال لینے کا ولولہ اپنے اندر رکھتے ہوں۔ ان طالب علموں کے ضروری اخراجات کا ذمہ دار ادارہ ہوگا۔

جو طالب علم اس سے پیشتر ہمیں لکھ چکے ہیں۔ ان کے خطوط ہمارے سامنے ہیں۔ ان کے علاوہ جو طالب علم ان خصوص
کے حامل ہوں۔ اور اس تربیتی مرکز سے فائدہ حاصل کرنا چاہیں، وہ براہ کرم ہمیں اپنے ارادے سے بہت جلد مطلع فرما
کیونکہ مرکز کے افتتاح کے فیصلے اور طالب علموں کے انتخاب میں زیادہ تاخیر نہیں کی جا سکتی۔ مرکز میں قیام کی مد
اندازہ ایک سال کا لگایا گیا ہے۔ والسلام۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

۱۵۹ - ایل
۳

پی۔ای۔سی۔ایچ۔ سوسائٹی۔ کراچی

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

کراچی

ٹیلیفون نمبر:- ۴۱۴۸۸

بدل اشتراک سالانہ آٹھ روپے۔ ہندوستان سے سالانہ آٹھ روپے۔ غیر ممالک سے سالانہ ۲۰ شلنگ

قیمت فی پرچہ:- پاکستان سے بارہ آنے ۔ ہندوستان سے بارہ آنے

جلد ۹ — اپریل سنہ ۱۹۵۶ء — نمبر ۳

فہرست مضامین

دفتر کا پتہ:- ۱۵۹/۱ بلاک ۳ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی کراچی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لمعات

وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ اللّٰهِ (۱۴/۵)

یوں تو ہر دن خدا ہی کا ہوتا ہے۔ لیکن قوموں کی زندگی میں ایسے دن جب ان کا قدم غیر خدائی قوانین کی محکومی سے الٰہیہ کی اطاعت کی طرف اٹھے۔ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ قرآن نے انھیں ایّام اللہ (اللہ کے دن) کہہ کر پکارا ہے۔ یہ مفہوم سورۃ کی ابتدائی آیات سے واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ جہاں کہا گیا ہے کہ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ہم نے موسیٰ کو اپنے احکامات دے کر بنی اسرائیل کی طرف بھیجا۔ اور اس سے کہا کہ قوم کو غیر خدائی غلامی کی تاریکیوں سے نکال کر قوانین خداوندی کی روشنی کی طرف لے جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ ظلمات سے طرف لے جانا: قوم کو فرعون کی محکومیت سے نکال کر سینا کی آزاد فضاؤں کی طرف منتقل کرنا تھا۔ تاکہ وہ وہاں مناسب وتربیت کے بعد نظام خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اس کے بعد ہے وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰمِ انھیں ان وقائع خداوندی (انقلابات الٰہیہ۔ یا ایام اللہ) کی یاد دہانی کراؤ۔ اس لئے کہ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۱۴/۵) ان انقلاب آفریں واقعات میں ہر اس قوم کے لئے جو مستقل مزاج ہو اور آزادی کی قدر شناس۔ اپنے میں اسی قسم کا انقلاب پیدا کرنے کے لئے واضح نشانات راہ ہیں۔

مسلمانان پاکستان کی زندگی میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا دن وہی حیثیت رکھتا ہے۔ جو بنی اسرائیل کی قومی زندگی میں کی حیثیت تھی۔ جب وہ سرزمین مصر کو چھوڑ کر سینا کی وادیوں کی طرف منتقل ہوئے تھے۔ جس طرح بنی اسرائیل کی صورت انتقال مکانی اس مقصد کے لئے تھا کہ (۱) انھیں فرعون کی محکومیت سے نکال لیا جائے۔ اور اس کے بعد (۲) انھیں موقع بہم پہنچا دیا جائے۔ جس سے وہ اپنی زندگی کو اس قالب میں ڈھال سکیں۔ جس میں انسانیت اپنی تکمیل تک پہنچتی ہے کو نظام خداوندی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمانان پاکستان کو تقسیم ہند کی رو سے۔ انگریز اور ہندو کی غلامی سے نکا

ں ایسا خطۂ زمین میسر آ جائے۔ جس میں وہ قوانین الٰہیہ کے تابع آزادانہ زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔
لن قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکالنے کے لئے ان کی طرف خدا کا نبی آیا۔ جس نے آکر بتایا کہ ان کی
نصب العین کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس پروگرام میں یہ پہلی کڑی کس قدر اہمیت رکھتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ بنی
کا مصر سے نکلنا۔ اور ایک آزاد خطۂ زمین کی طرف منتقل ہونا۔ اس پہلی کڑی کا فطری نتیجہ تھا۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ جب
قوم کے سامنے "آیات اللہ" نہ آئیں "ایام اللہ" ظہور میں نہیں آ سکتے۔ صحیح انقلاب کے لئے صحیح راہ نمائی لاینفک ہے اگر
ہو۔ تو قوم کی نقل و حرکت اور سعی و عمل۔ انتشار و فوضویت تو پیدا کر سکتا ہے۔ انقلاب پیدا نہیں کر سکتا۔
لمانان ہند (و پاکستان) کی طرف اس مقصد کے لئے خدا کا کوئی نبی نہیں آ سکتا تھا۔ کیونکہ سلسلۂ نبوت، ذات رسالتمآب
ہ۔ لیکن خدا کی راہ نمائی قرآن کریم کے اندر موجود تھی۔ ضرورت کسی ایسے صاحب نظر کی تھی۔ جو اپنی قرآنی بصیرت سے یہ سمجھ
ن حالات میں یہ قوم گھر چکی ہے۔ ان میں ان کے لئے منزل مقصود اور کشادگی راہ کونسی ہے۔ اس قوم کی خوش بختی تھی کہ
ب ایسا دیدہ ور میسر آ گیا۔ جس نے اپنے مدت العمر کے قرآنی تدبر اور سیاست مدن میں مسلمانوں کے خصوصی موقف کے
مطالعہ کے بعد بیسویں صدی کے شروع ہی میں اعلان کر دیا کہ مسلمان اپنے دین کی بنا پر ایک جداگانہ قوم بنتے ہیں اس لئے

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

ن قرآنی تعلیم سے بے خبری کی بنا پر مغربی سیاست کی تقلید میں اشتراکِ وطن کو مدارِ قومیت قرار دیتے تھے۔ انھیں اس
نے بار بار بتایا کہ مغرب نے خدائے رب العالمین کو چھوڑ کر اپنی پرستش کے لئے نئے نئے 'خدا' تراشے ہیں۔ اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے　　　جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

پنوں اور بیگانوں سب کی طرف سے مخالفت ہوئی۔ بیگانوں کی طرف سے اس لئے کہ وہ اس آواز سے اپنی اکثریت
بت سلط کا خواب پریشان ہوتا دیکھتے تھے۔ اور اپنوں میں سے اکثر دین کی حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر اور
رخ، د مصالح کے پیش نظر اس کے مخالف تھے۔ لیکن وہ حکیم الامت ؒ ان مخالفتوں کی پروا کئے بغیر اپنے اس پیغام کو
رد... دور تک پہنچاتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اس نے دسمبر ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر قوم سے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ
ن... ور کے مطابق اسی صورت میں اسلامی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ جب ان کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ جہاں وہ قوانین
نافذ کر سکیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ان میں مسلمانوں
مستقل... قائم ہو۔
قرآن کی رو سے وہ نصب العین جو حکیم الامت علامہ اقبال نے قوم کے سامنے رکھا۔ صدیوں سے غلامی کی خوگر قوم نے
... حسین خواب اور ایک فلسفی کا ناقابل عمل تصور کہہ کر استہزاء و استخفاف کی ہنسی سے ٹھکرا دیا۔ بڑے بڑے مقدسین
... خلاد ... قرار دیگر خدا اور رسول کے نام پر اس کی مخالفت شروع کر دی۔ بعض ایسے بھی تھے۔ جنھوں نے مسلمانوں

لانہ قومیت کے اصول کی حد تک تو ساتھ دیا۔ لیکن مسلمانوں کی ایک آزاد مملکت کے تصور کی سخت مخالفت کی اور لسے "ز
بنا کر قوم کو اس سے دور رہنے کی تلقین کی۔ لیکن وہ دانائے راز کہ قرآنی بصیرت نے جس کی نگاہوں کے سامنے حقائق کو
ے کر دیا تھا۔ نہ سیاسی غوغا آرائیوں سے گھبرایا۔ اور نہ ہی ان مقدسین کے طعن و تشنیع سے پریشان ہوا۔ اس نے سنہ۱۹۳۰ء
اکہ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ ایسا ہونا مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ اگر انہوں نے اس کے لئے پوری جد
ںصب العین تک جلدی پہنچ جائیں گے۔ اگر انہوں نے تساہل برتا تو اس کی تشکیل میں دیر لگ جائے گی۔ لیکن الب
ے گا ضرور۔ ہندی سیاست میں اس کے بعد ایسے تغیرات واقع ہوئے تھے جس کے پیش نظر ایسا دکھائی دیتا تھا کہ اس
ین کا حصول ممکن نہیں ہوگا۔ لیکن حضرت علامہ کو اپنی بصیرت پر اس قدر اعتماد تھا کہ حالات کی نا مساعدت ان کے یقین
بکم تر کئے جاتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنی زندگی کے آخری سانس تک اس پیغام کو دہراتے اور افرادِ کاروان کے دل میں شمع تقد
ن سے روشن تر کرتے چلے گئے۔ کون نہیں جانتا کہ جب مارچ سنہ۱۹۳۸ء میں حسین احمد صاحب مدنی نے یہ اعلان کیا کہ "ق
سے بنتی ہیں" تو باوجودیکہ آپ اس وقت مرض الموت میں مبتلا تھے۔ آپ نے اپنے اس بیان میں جو ہماری تاریخ میں
کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اہم سوال کو اس فہم و بصیرت، جزم و یقین کے ساتھ حل کیا۔ اس نے کئی متذبذبین کے د
مرزِ استقامت پیدا کردی۔

پئے غور کیا کہ اس مردِ مومن نے اسوۂ انبیاء کرام کی اتباع میں قوم کو اس نصب العین سے کس طرح روشناس کرایا۔ جو ان
ادبی انقلاب کا موجب بنا۔ یہ انقلاب یعنی مسلمانانِ ہند کی انگریز اور ہندو کی محکومیت سے آزادی اور ان کا ایک آزاد خطۂ
ن استقلال، علامہ اقبال کی وفات کے بعد ظہور میں آیا۔ لیکن یہ محض وقت کا سوال تھا۔ اس کا بیج سنہ۱۹۳۰ء میں ڈالا جا
سنہ۱۹۰ء میں جب انہوں نے کہا تھا کہ بنائے ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے۔

یکن سنہ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا۔ وہ فقط اتنا تھا کہ مسلمانوں کو ایک خطۂ زمین مل گیا۔ جس پر انہیں یہ امکانی قوت حاصل
وہ اپنی ہیئت اجتماعیہ کو اس قالب میں ڈھال سکیں جو اللہ تعالیٰ نے تکمیلِ شرفِ انسانیت کے لئے متعین کیا ہے۔ آ
سرائیل کا مصر سے وادیٔ سینا کی طرف آنا۔ اسی ملبند مقصد کے حصول کی اولین منزل تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہ
ائیل کے واقعہ اور مسلمانانِ پاکستان کے اس انقلاب کی کڑیاں ایک دوسرے کے ساتھ متوازی چلی جاتی ہیں۔ بنی ا
ہتے تو بدقسمتی سے ان کے ساتھ سامری بھی آگیا۔ جس کے آنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ ایک مقدس، نامعِ مشفق کے لبا
قوم کو صحیح راستے سے بہکاتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جب ہندوستان کے مسلمان پاکستان کی طرف آئے۔ تو ان کے
مری آگئے۔ ان سامریوں کا شیوہ یہ ہے کہ یہ قوم سے زیورات مانگ کر لیتے ہیں۔ اور انہیں کو سلے بنا بنا کر
دیتے جاتے ہیں۔ قوم بنی اسرائیل، آلِ فرعون کے فریب سے بچ نکلی تھی۔ اس لئے کہ وہ کھلے بندوں سامنے آتے
پیغام اور نظام کی مخالفت کرتے تھے۔ لیکن ان کے لئے سامری کے فریب سے بچ جانا مشکل تھا۔ اس لئے کہ وہ حضر

تبع کی حیثیت سے ساتھ دیا تھا۔ اس کا رنگ اس کے اپنے الفاظ میں یہ تھا کہ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ (میں
رسول کے نقشِ قدم سے کچھ حصہ پالیا تھا۔ اور اسی نقاب میں بنی اسرائیل کے ساتھ آیا تھا فَنَبَذْتُهَا وَكَذَٰلِكَ سَوَّلَتْ
لِي نَفْسِي میرے نفس کی مفاد پرستیوں نے ایک اور خوشنما نقشہ میرے سامنے پیش کر دیا۔ اس کے لئے میں نے رسول کی
قدم کو اٹھا الگ کیا۔ اور بنی اسرائیل کو گوسالہ کی پرستش میں لگا لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ قومیں ان لوگوں کی مخالفت سے اتنی
تباہ نہیں ہوتیں۔ جو کھلے بندوں ان کے مقابلہ میں آتے ہیں۔ جتنی کہ وہ ان کے حربوں سے برباد ہوتی ہیں جو قبضۃ من اثر الرسول
کے مقدس نقابوں میں سامنے آتے ہیں۔ مودودی صاحب کے الفاظ میں (جو انھوں نے اسلام اور جاہلیت کے تصادم کے
سلسلہ میں لکھے تھے)

> کھلے دہریے یا مشرکین وکفار سامنے ہوتے تو مقابلہ شاید آسان ہوتا۔ مگر وہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار، صوم وصلوٰۃ پر عمل، قرآن وحدیث سے استشہاد تھا۔ اور اس کے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔ ایک ہی وجود میں اسلام اور جاہلیت کا اجتماع ایسی سخت پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے عہدہ برآ ہونا ہمیشہ جاہلیت صریحہ کے مقابلہ کی بہ نسبت ہزاروں گنا زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ عریاں جاہلیت سے لڑیئے تو لاکھوں مجاہدین سر ہتھیلیوں پر لئے آپ کے ساتھ ہو جائیں گے۔ اور کوئی مسلمان علانیہ اس کی حمایت نہیں کر سکے گا۔ مگر اس مرکب جاہلیت سے لڑنے جایئے۔ تو منافقین ہی نہیں۔ بہت سے اصلی مسلمان بھی اس کی حمایت پر کمر بستہ ہو جائیں گے۔ اور الٹا آپ کو موردِ الزام بنا ڈالیں گے۔
>
> (منصب تجدید کی حقیقت)

مسلمانانِ پاکستان کے ساتھ یہی ہوا۔ وہ ہندو اور انگریز رحتی کہ متحدہ قومیت کے مؤید نیشنلسٹ علماء تک) کے مقابلہ
میں تو کامیاب ہو گئے (کیونکہ وہ کھلے بندوں میدان میں آ گئے تھے) لیکن ان سامریوں کے دامِ تزویر کے حریف نہ ہو سکے
جنھوں نے خود اقبال سے جداگانہ قومیت کا تصور لے کر (قبضۃ من اثر الرسول کی طرح) مسلمانوں میں مقبولیت حاصل
کر لی تھی۔ لیکن جو ان کے ساتھ آئے اس لئے تھے کہ یہاں اس قرآنی نظام کے بجائے جسے نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا تھا اور
جس کے قیام کے لئے اقبال اس خطۂ زمین کے حصول کا آرزومند تھا۔ وہ خود ساختہ نظام قائم کر دیا جائے۔ جس میں
پیشوائیت کے مفاد کا تحفظ ہو۔ اور انھیں غلبہ واقتدار حاصل ہو جائے۔ بنی اسرائیل تو سحرِ سامری سے اس طرح بچ
گئے کہ ان میں حضرت موسےٰ موجود تھے۔ لیکن ہمارے سامری اس وقت میدان میں آئے۔ جب ہماری بدقسمتی سے علامہ
قوم میں موجود نہ تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتے۔ تو یہ میدان میں آنے کی جرأت ہی نہ کرتے۔ جس اقبال کے تین شعر حسین احمد مدنی
جیسی شخصیت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر گئے۔ یہ سامری ان کے ضربِ کلیمی کے حریف کس طرح ہو سکتے تھے۔ لیکن اس میں بھی

حاشیہ صفحہ ۔۔۔ پر دیکھئے۔

مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ اقبالؔ نے جس قرآن کا پیغام قوم تک پہنچایا تھا۔ وہ قرآن ہمارے پاس اپنی زندہ و تابندہ صورت میں موجود ہے۔ بس ضرورت اس کی ہے کہ جس طرح حضرت علامہ اس نصب العین کے متعلق قرآن کے پیغام کو مسلسل و پیہم پورے جزم و یقین اور جرأت و بے باکی کے ساتھ پیش کرتے رہے۔ اسی یقین و استقامت کے ساتھ قرآن کی آواز قوم تک پہنچائی جاتی رہے۔ طلوعِ اسلام جو حضرت علامہؒ کی یادگار میں جاری ہوا ہے۔ ان کے اس مشن کی تکمیل میں امکان بھر کوشش کئے جا رہا ہے اور زندگی بھر کئے جائے گا۔ اسے یقین ہے کہ جس طرح ہزار مخالفتوں کے باوجود پاکستان کا خطۂ زمین مسلمانوں کو مل کر رہا۔ اسی طرح اس خطۂ زمین میں سامریوں کی لاکھ گوسالہ سازیوں کے علی الرغم خدا کا متعین فرمودہ نظام قائم ہو کر رہے گا۔ اگر قوم نے اس کے لئے کوشش کی تو یہ جلدی وجود پذیر ہو جائے گا۔ اگر اس میں تساہل برتا تو دیر میں قائم ہوگا۔ لیکن قائم ہوگا ضرور۔ اقبالؔ کے دیدۂ تر کی بے خوابیاں۔ اور اس کے دل پر درد کی بیتابیاں۔ اس کے نالۂ نیم شب کا نیاز اور اس کی خلوت و انجمن کا گداز۔ اس کی امنگیں اور آرزوئیں اور امیدیں اور جستجوئیں کبھی رائگاں نہیں جا سکتیں۔ اس وقت تو یہ عالم ہے کہ قوم اقبالؔ ہی کو فراموش کئے جا رہی ہے (اور یہ کچھ منظم کوششوں سے کرایا جا رہا ہے) حتیٰ کہ حکومت پاکستان، جسے یہ سب کچھ اقبالؔ ہی کے دیئے ہوئے تصور سے ملا ہے۔ اقبالؔ کے یوم وفات (۲۱ اپریل) تک کو مملکت کی قابل یاد تقاریب میں شامل کرنے کے لئے تیار نہیں۔ (اف رے احسان ناشناسی اور قدر فراموشی!) لیکن جس کا ثبات جریدۂ عالم پر ثبت ہو چکا ہو۔ اس کی یاد کون سی قوت مٹا سکتی ہے؟ اقبالؔ کا جلایا ہوا دیا پھونکوں سے نہیں بجھایا جا سکتا۔ اسے اس نے تیل کے بجائے خون جگر کے قطرات سے فروزاں کیا۔ اور اپنے سینے کے فانوس میں جگہ دے کر زمانہ کے جھکڑوں سے محفوظ رکھا۔ یہ دیا جلتا رہے گا۔ اور روشن سے روشن تر ہوتا جائے گا۔ خواہ خفاشانِ ازلی کو اس کی روشنی کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔ اس لئے کہ یہ اکتساب ضیا کرتا ہے اس چشمۂ نور سے جسے خود خدا نے کتاب مبین اور سراجاً منیرا کہا ہے۔ اقبالؔ کی صحیح یادگار قرآن کے پیغام کو دنیا تک پہنچانا۔ اور دنیا میں قرآنی نظام کو قائم کرنا ہے۔ اور اسی میں سامریوں کی شکست ہے۔

اقبالؔ کا نام لینے والو! آؤ اقبالؔ کی صحیح یادگار اس طرح قائم کرو۔

(اگلے پرچہ میں) **دستورِ پاکستان** (اس کی کون کون سی شقیں قرآن کی رو سے قابل ترمیم ہیں)

(حاشیہ گذشتہ صفحہ)

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ　　ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است　　چہ بے خبر ز مقامِ محمدِؐ عربی است

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست　　اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

۲۳ مارچ

مملکتِ پاکستان کا پہلا آئین منظور ہو گیا۔ لیکن حکومت پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ اس آئین کا نفاذ ۲۳ مارچ سے کیا جائے سوال قریب قریب ہر ایک کی زبان پر ہے کہ مارچ کی تئیس تاریخ کو کیا خصوصیت حاصل ہے جس کی وجہ سے اسے یوم آئین قرار دیا گیا ہے۔ ہم میں سے جو لوگ گزشتہ بیس پچیس سال سے مسلمانان ہند و پاکستان کی سیاست سے باخبر رہے ہیں۔ انہیں یہ معلوم ہوگا کہ ہماری ملی تاریخ میں ۲۳ مارچ کو کیا خصوصیت حاصل ہے۔ لیکن ہماری ابھرنے والی نسل کے بچوں کے لئے یہ سوال ایک پہیلی سی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس تاریخ کی خصوصیت سے انہیں آشنا کرایا جائے۔ اور مسلمانان ہند و پاکستان کی تاریخ میں اسے اہم مقام دیا جائے۔ اس تاریخ (۲۳ مارچ) کا تعلق سنہ ۱۹۴۰ء سے ہے لیکن سنہ ۱۹۴۰ء تک پہنچنے سے پہلے دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء کا ذکر ضروری ہے جب ہمارے کاروان ملت نے شاہراہ زندگی پر ایک نیا موڑ مڑا تھا۔ بجائے اس کے کہ ہم اپنی تاریخ کے ان اہم سنگہائے میل کا تعارف جدید الفاظ میں کرائیں۔ یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ طلوع اسلام نے جن الفاظ میں ان کا سب سے پہلی مرتبہ تذکرہ کیا تھا۔ انہیں الفاظ کو یہاں دہرا دیا جائے۔ اس سے جہاں ان اہم وقائع کی اہمیت سامنے آجائے گی وہاں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ طلوع اسلام کس طرح کاروان ملت کا ہم رکاب رہا ہے۔

مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کے طلوع اسلام میں "صبح امید" کے عنوان سے حسب ذیل شذرہ شائع ہوا تھا۔

صبح امید

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ		(اقبالؒ)

سنہ ۱۹۳۰ء کا ذکر ہے مسلمانوں نے ایک مدت کی گہری نیند کے بعد کروٹ لی تھی۔ ایک عرصہ کے منجمد خون میں کچھ کچھ روانی کے آثار محسوس ہو رہے تھے۔ ایک زمانے کے جمود و تعطل کی برف کی سلیں حوادث زمانہ کی تمازت سے ذرا پگھلنی شروع ہوئی تھیں۔ ایک دشت زا بیابان میں کھوئے ہوئے قافلہ کے افراد میں اپنی متاع گم گشتہ کا کچھ نہ کچھ احساس زیاں پیدا ہو رہا تھا۔ لیکن فکر و نظر کی پریشانیوں کے باعث کوئی زندہ و پائندہ راہ عمل نظر نہیں آتی تھی۔ پاؤں آمادۂ سفر تھے۔ لیکن نہ منزل کا کوئی پتہ تھا۔ نہ نشان

راہ ہی دکھائی دیتا تھا۔ عوام تو ایک طرف، کشتیٔ ملت کے پختہ کار ناخدا بھی عام طور پر مخلوط و جداگانہ انتخاب، اور تخصیص نشستِ نیابت کے سود و زیاں کے پیچ در پیچ مسائل میں الجھ رہے تھے۔ ان کے مطالبات، مذہبی اور ثقافتی تحفظات کی حدود میں رہ چکے تھے۔ اور ان کی نگاہیں جمہوری نظام حکومت کی بظاہر درخشندہ افق پر جا کر رک چکی تھیں۔ بالعموم یہ وہ حضرات تھے جنہیں فطرت نے صرف "دانشِ برہانی" عطا فرمائی تھی۔ وہ دانش جو محض احوال و ظروف کے امیال و عواطف اور عواقب و نتائج کے تجارب و مشاہدات سے استنباطِ نتائج کے بعد ہی کسی فیصلہ پر پہونچا سکتی ہے۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ لیکن محشرستان انتشار و تشتت میں اللہ کا ایک بندہ ایسا بھی موجود تھا۔ جسے مبداءِ فیض کی کرم گستری نے دانشِ برہانی کے ساتھ "دانشِ نورانی" کی متاعِ گراں بہا سے بھی سرفراز فرمایا تھا۔ یعنی وہ دانش جو قرآن کریم کے حقائق و معارف پر تدبر سے ایک مردِ مومن کی نگاہوں میں وہ بصیرت پیدا کر دیتی ہے جس سے وہ ان نفسیاتی کیفیات کا مشاہدہ کر لیتا ہے جن سے اقوام و ملل کے مقدرات کے ستارے بنتے اور بگڑتے ہیں۔ اور ان مشاہدات سے اس کے آئینۂ ادراک میں آنے والے واقعات کی ایک "دھندلی سی تصویر" نظر آجاتی ہے۔ اس کی نگہ "دور رس آشیانہ" کی نظر فریب پائداری کے بجائے اس شاخ پر ہوتی ہے۔ جس پر وہ آشیانہ استوار ہوتا ہے۔[1] اس لئے وہ عام لوگوں کی طرح کبھی خوش آئند الفاظ کے سحر سے مسحور اور دعاوی کے شور سے مرعوب نہیں ہوتا۔ اس کی نگاہ حقائق پر ہوتی ہے۔ اور وہ انہی حقائق کی دوربین سے پردۂ افلاک کے پیچھے چھپے ہوئے حوادث کا نظارہ کرتا ہے:

ہاں! تو اس ہنگامہ زارِ انتشار و خلفشار میں یہ مردِ مومن جسے قسامِ ازلی نے اس قسم کی روشن بصیرت سے نوازا تھا، اٹھا۔ قافلے کے چند بکھرے ہوئے افراد کو یکجا جمع کیا اور کہا کہ آؤ! تمہیں بتاؤں کہ قرآن کریم نے تمہاری منزل کونسی متعین کر رکھی ہے۔ اور ہندوستان کے احوال و ظروف کے پیشِ نظر اس منزل تک پہنچنے کے لئے کونسی صراطِ مستقیم ہے۔ اس نے گرد و پیش کے حالات کا تجزیہ کیا۔ اور اس کے بعد کہا کہ:-

"اس سے ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان جیسے ملک میں ایک ہم آہنگ 'کل' کی تشکیل کے لئے بلند سطح کی فرقہ پرستی بالکل ضروری اور ناگزیر ہے۔ برعکس یورپین ممالک کے، ہندوستان میں جماعتی تشکیل کی بناء جغرافیائی حدود نہیں۔ ہندوستان ایک ایسا براعظم ہے جس میں مختلف النسل، مختلف اللسان۔ مختلف المذاہب انسانوں کی جماعتیں آباد ہیں۔ ان کے نظریۂ زندگی کی بنا کسی مشترک نسلی شعور پر نہیں ہے حتیٰ کہ ہندو بھی کوئی ایسی جماعت نہیں ہے۔ جس کے مختلف افراد میں فکر و نظر کی یکسانیت ہو۔ ہندوستان میں یورپین اصولوں کے مطابق جمہوریت کی تشکیل

---

[1] تمہاری تہذیب اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کریگی   جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا۔ ناپائدار ہوگا (اقبال)

نہیں ہو سکتی۔ جب تک یہاں مختلف فرقوں کی جداگانہ ہستی کو تسلیم نہ کر لیا جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کا یہ مطالبہ بالکل حق بجانب ہے کہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (MUSLIM INDIA) کو معرضِ وجود میں لایا جائے ...... میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری زیرِ سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے ...... ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ میں کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانوی راج قائم ہے (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ سلوک نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے۔ تو یہ آخر الامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا ...... یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انہیں بھی کہیں اپنے نشو و ارتقا کا موقعہ ملے۔ اس لئے کہ اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدت قومی کے نظامِ حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے۔ جس کا نقشہ ہندو اربابِ سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں۔ اور جس سے مقصد وحید یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انہیں غلبہ اور تسلط ہو"

(خطبۂ صدارت حضرت علامہ اقبالؒ علیہ الرحمۃ بتقریب سالانہ اجلاس مسلم لیگ الٰہ آباد منعقدہ ۱۹۳۰ء)

یہ ایک نئی آواز تھی جو ہندوستان کی فضا میں غلغلہ انداز ہوئی۔ یہ ایک انوکھا نصب العین تھا جو ہندی مسلمانوں کے لئے نیا اور انوکھا اس لئے کہ مسلمان صدیوں کی غلامی سے یہ بھول ہی چکا تھا کہ قرآن کریم کی رو سے ایمان و اعمال کا فطری نتیجہ استخلاف فی الارض ہے۔ اور مسلمان دنیا میں صرف اس لئے زندہ ہے کہ وہ خدا کی اس وسیع و عریض ارض پر حکومتِ خداوندی قائم کرے۔ چونکہ یہ آواز کانوں کو بالکل نامانوس معلوم ہوئی۔ اس لئے کسی نے اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ کسی نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ ایک شاعر کے عالمِ تصور کے حسین خواب ہیں۔ کوئی یہ سمجھ کر ہنس دیا کہ یہ ایک فلسفی کے طرفہ دماغ کی اپج ہے جو ہندوستان کو ایک ملک نہیں بلکہ مجموعۂ ممالک قرار دیتا ہے۔ جو یہاں کے باشندوں کو ایک قوم نہیں بلکہ لف اقوام کا مجموعہ خیال کرتا ہے۔ جو مسلمانوں کو ایک اقلیت نہیں۔ بلکہ مستقل بالذات جداگانہ قوم گردانتا ہے جو اس بیسویں صدی میں جمہوری نظامِ حکومت کو ہندوستان کے لئے ناقابلِ عمل ٹھہراتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جو ہندوستان

کے دو ٹکڑے کرکے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مستقل طور پر حدِ فاصل قائم کرنا چاہتا ہے۔

اس نے یہ سب کچھ سنا اور ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو گیا۔

وقت گزرتا گیا۔ حالات بدلتے گئے۔ اور ابھی دس برس بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ واقعات نے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ سیاست ہند کی گتھیوں کا حل سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ جو ۱۹۳۰ء میں اس دیدۂ بینا نے قوم کے سامنے پیش کیا تھا (رحمۃ اللہ تعالیٰ) آج یہ مسائل ایک ایک کرکے واضح اور بین طور پر سامنے آ چکے ہیں کہ ہندوستان ایک ملک نہیں بلکہ مجموعۂ ممالک ہے مسلمان ایک فرقہ نہیں بلکہ جداگانہ قوم ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی کشمکش کا تصفیہ فرقہ وارانہ انداز پر نہیں بلکہ بین الاقوامی حیثیت سے ہو سکتا ہے۔ بنابریں مغربی انداز کا نظام جمہوریت یہاں قابل عمل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس کا واحد علاج تقسیم ملک ہے۔ آج اس کے لئے گوشہ گوشہ سے آوازیں بلند ہو رہی ہیں مختلف اسکیمیں اور تجاویز پیش ہو رہی ہیں۔ ہر شخص اسی نہج پر سوچتا، اور اسی طریق عمل کو جادۂ مستقیم سمجھتا ہے۔ حتیٰ کہ خود ہندوؤں کا وہ طبقہ جو خود کو فریب میں مبتلا نہیں رکھنا چاہتا۔ وہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ ہندی مسائلِ سیاست کا حل اس کے سوائے کچھ اور نہیں۔ سی دت (سابق رکن آل انڈیا کانگرس کمیٹی) اپنے ایک مراسلہ میں لکھتے ہیں۔

"ان حالات میں میرا خیال ہے کہ ہندو مسلم تصفیہ کا حل یہی ہوگا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے۔ اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے ساتھ ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔ مسٹر جناح نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کرکے جس خیال کا اظہار کیا ہے۔ وہ میرے خیال میں اب نہیں تو کل حقیقت ہو کر رہے گا۔ بہرحال اگر یہ چیز بھی جلد طے ہو جائے تو کچھ برا نہیں۔ یوگوسلاویہ کے کروٹ اور سرب کی طرح اگر ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں میں بحیثیت، فرقے کے نہیں بلکہ بحیثیت دو قوموں کے سمجھوتہ ہو جائے اور مسلم اکثریت کے علاقوں میں ہندو اکثریت کے علاقے مداخلت نہ کریں اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان مداخلت نہ کریں تب بھی ہندوستان کا اجتماعی مفاد محفوظ رہ سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہ چاہیئے۔ البتہ اس میں مناسب ترمیم و اصلاح کرکے اسے اپنے حسب حال بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔" (مدینہ یکم فروری ۱۹۴۰ء)

اس میں شبہ نہیں کہ حوادث زمانہ کا ستایا ہوا مسلمان ضعف عزیمت و شدت انتشار کی وجہ سے ہنوز اپنے بازو میں وہ قوت محسوس نہیں کرتا۔ جو ان چٹانوں کو ریت کے ذروں میں تبدیل کر دے۔ جو اس کی منزل کے راستے میں حائل ہیں۔ جب اس نے اپنا نصب العین متعین کر لیا ہے۔ اور اس کے دل میں اپنے نصب العین تک پہنچنے کا عزم راسخ ہے۔

ارضی حوادث وموانع سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپ اسی نہج پر قدم اٹھاتے چلئے۔ چند دنوں کے بعد آپ دیکھ لیں گے
ن ایزدی (اسی مرد راہ بیں علیہ الرحمۃ کے الفاظ میں)

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش　　اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائیگی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں باد بہار　　نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائیگی
آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک　　بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائیگی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغام سجود　　پھر جبیں خاک حرم سے آشنا ہو جائیگی
نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور　　خون گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائیگی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے　　(اقبال ۱۹۱۲ء)

مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا وہ سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس نے علامہ اقبالؒ کے اس حسین خواب کو عزم ملی کی شکل عطا کر دی۔ اس تقریب پر طلوع اسلام نے قائد اعظم کی خدمت میں جو سپاسنامہ پیش کیا ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کا درج کیا جانا بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوگا۔ وہو ھذا۔

بہ شرف نظر
شیر بیشۂ بیباکی و حریت۔ ضیغم نیستان جرأت و بسالت۔ شاہین افلاک تدبر و سیاست۔ پروانۂ شمع اخوت و حمیت۔
ہ ملک و ملت۔ بطل جلیل ہندیاں۔ و قائد اعظم اسلامیان۔ عزت مآب محترم المقام جناب محمد علی جناح
ر۔

بہ تقریب سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ۔ بمقام لاہور

یت نواز!
تصور میں لایئے ایسے وقت کو کہ ایک وحشت انگیز ہولناک بیابان میں راہ گم کردہ مسافروں کا ایک قافلہ نشان منزل سے مایوس ہو کر ضعف عزیمت سے پاشکستہ بیٹھ چکا ہو۔ ایک درماندہ راہرو کی صدائے ہو آواز رحیل کا کام دے رہی تھی۔ فطرت کے اٹل قوانین کے ماتحت خاموش ہو چکی ہو۔ شام کا بھیانک سناٹا نے والی شب تیرہ و تار کی ہیبت انگیزیوں کا پیام جانکاہ دے رہا ہو غاروں میں چھپے ہوئے درندوں کے ت موت کو قریب تر لاتی نظر آ رہی ہو۔ درختوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے رہزنوں کی ریشہ دوانیاں، دامن

صحرا میں پھیلتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ بڑھتی چلی آرہی ہوں۔ وہ لوگ جن کی قیادت وسیادت پر بھروسہ تھا۔ برادرانِ یوسف کی طرح اپنے قافلہ کی گراں بہا متاع دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کی فکر میں ہوں۔ غرضیکہ ہلاکت یقینی اور تباہی اٹل معلوم ہوتی ہو۔ افرادِ قافلہ میں سے جن کے دلوں میں اس الم انگیز کیفیت کا احساس ہو۔ ان کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھ رہی ہوں کہ دُور۔ افقِ امید سے ایک شاہسوار رواں دواں۔ امیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لئے ان سوختہ سامانوں کی طرف بڑھتا چلا آئے۔ منتشر افرادِ کارواں کو پھر سے ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دے اور اپنوں اور بیگانوں کی تیار کردہ ہلاکت وبربادی کی گھاٹیوں سے بچاتا ہوا انھیں کسی محفوظ مقام کی طرف لے جانے کی فکر کرے۔ اندازہ فرمائیے کہ قلبی کیفیت اُس وقت ان راہ گم کردہ مسافروں کی ہوگی۔ وہی حالت آج ملتِ اسلامیہ (ہندیہ) کی ہے۔ تحریکِ آزادی کے آغاز میں مسلمانوں کی عمومی حالت یہ تھی کہ یہ ریت کے ذروں کی طرح بکھرے پڑے تھے کہ تیز ہوا کا جھونکا آتا اور ادھر سے ادھر اڑا لے جاتا، پانی کی رو آتی اور انھیں اپنے ساتھ بہالے جاتی۔ اس کاروانِ بے سالار کی متاعِ گراں بہا کو لوٹنے کے لئے چاروں طرف سے قوتیں ہجوم کرکے آرہی تھیں۔ غیر تو غیر خود اپنوں کی یہ حالت تھی کہ ان کی سحر طرازیاں اور فسوں سازیاں۔ ملتِ بیضا کو خدائے طورِ سینا سے ہٹا کر گوسالہ پرستی کی دعوت دیتی تھیں۔ غرضیکہ حالت یہ تھی کہ

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے تھے کسی مردِ راہ داں کے لئے

قوم کی صحیح راہنمائی کرنے والے ایک ایک کرکے چل بسے تھے۔ بزمِ ملت کی آخری شمع جس کی ضیا پاشیوں سے لاکھوں آنکھیں پرنور تھیں۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو بجھ چکی تھی[1]۔ اس کس مپرسی اور بیکسی کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے اس منتشر قافلہ کی شیرازہ بندی کے لئے آپ کی ذاتِ گرامی کو چن لیا۔ اور آپ کی نگہ دوررس نے اس قافلے کو بتایا کہ اس کے گردوپیش کس کس قسم کی خطرناک گھاٹیاں موجود ہیں۔ وہ گھاٹیاں کہ جن میں کہیں "متحدہ قومیت" کے دامِ ہمرنگ زمیں کبوترِ حرم کو پھانسنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔ کہیں کسی منبر سے یہ آواز آرہی تھی کہ قومیں مذہب سے نہیں اوطان سے بنتی ہیں۔ اور یوں اس طائرِ لاہوتی کے بال وپر کو غبار آلودۂ ارض وبوم بنا کر امتِ رسولِ کافۃ الناس کو جغرافیائی آب وگل میں محبوس کیا جا رہا تھا۔ کہیں "امرھم شوریٰ بینھم" کی حامل قوم کی نگاہوں میں مخلوط ا کے سراب کو آبِ حیوان بنا کر دکھایا جا رہا تھا۔ کہیں اس "ادلی الامر منکم" کی مامور جماعت کے لئے غیر مسلم امامت وقیادت کو عین دین قرار دیا جا رہا تھا۔ کہیں انگریز کے خلاف "متحدہ محاذ" کے طلسم سے کفار ومشرکین کی تولی کے جواز کے فتاویٰ شائع ہو رہے تھے۔ ایک طرف ایک مغنّیِ آتش نفس سرودگاہِ واردھا کی مستعار نے سے خواب آور گیت گا رہا تھا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں[2]۔ اسلئے اسلام کو کسی دوسرے

---

[1] حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ۔ [2] ابوالکلام آزاد۔

یت نہیں۔ دوسری طرف کچھ عدادندان مکتب، شاہین بچوں کے لئے اہماکی بازو شکن تعلیم کی اسکیمیں تیار کر رہے تھے
نے ذہن میں "رام راج" کے قیام کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ اور اس کے لئے انگریز سے شریفانہ معاہدے (GENTLEMAN'S AGREEMENT) استوار کر رہا تھا۔ ہندوؤں کے شور و غوغا سے متاثر انگریز بھی مسلمانوں کو بلا تامل ہندو کے ہاتھ میں دے دینے
تھا کہ وہ اپنی پانچ ہزار سالہ غلامی کا جذبۂ انتقام اس کے خون سے ٹھنڈا کرے۔ جو لوگ اغیار کے صفوں میں کھڑے ہو کر
سلامیہ کی نمائندگی کا دعوےٰ کر رہے تھے۔ ان میں اتنا سمجھنے کی بھی استطاعت نہیں تھی کہ بساط سیاست پر یہ آئینی مہرے کس
لائے جا رہے ہیں۔ ہندو خوش تھا کہ میں نے نو کروڑ فرزندان توحید کو اچھوتوں کی صف میں ملا دیا۔ انگریز راضی تھا کہ وہ
جس کے بے نیام ہونے کے خوف سے کلیجۂ صلیب میں ہمیشہ دھڑکن رہتی تھی اسے گنگا کی لہروں میں بہا دیا گیا کہ اس کس
عالم میں اور اس انتشار و تشتت کے وقت آپ آگے بڑھے۔ اور ہندوؤں اور انگریزوں کے ہر خفیہ منصوبے اور ہر اپشیہ
کو ایک ایک کر کے بے نقاب کر دیا۔ اور یوں ان کے تصورات کی حسین دنیا کو ایک خواب پریشان میں تبدیل کر کے
اور ساری دنیا پر اس حقیقت عظمیٰ کو واضح کر دیا کہ

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

جلیل القدر!

ہیں خوب احساس ہے کہ آپ کی منزل کس قدر کٹھن اور راستہ میں کس قدر مشکلات کا سامنا ہے۔ جہاں تک غیروں
ہے مسلمان جیسی منتشر قوم کے مقابلہ میں ہندوستان اور برطانیہ کی دو بڑی قوتوں کا متحدہ محاذ ہی کچھ کم سنگ گراں نہیں
یروں سے کہیں زیادہ مہیب اور جاں گداز مشکلات خود اپنوں کی پیدا کردہ ہیں۔ ان "اپنوں" کو بھی چھوڑیئے جو محض اپنی
اور رو بہیلی مصلحت کوشیوں کی خاطر نشرگاہ وار دھا (RADIO STATION) کے آلات مکبر الصوت (LOUD SPEAKER) بنے ہوئے ہیں۔ وہ تو اس مخالفت پر مجبور ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ ماتم تو ان "مخلص منافقین" کا ہے۔ جن کی
دعایت بیش ازیں نیست کہ

کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو

مقصد وحید اپنے طرۂ وجاہت کا قیام و بقا ہے۔ خواہ یہ آستانۂ خواجۂ یثرب سے وابستگی ظاہر کرنے سے حاصل ہو جائے
یا لیبی میں شمولیت سے۔ با ایں ہمہ نہ ان غیروں کا ہجوم مخالفت ایسا ہے کہ اس سے کچھ خوف کھایا جائے۔ اور نہ اپنوں میں
ن کی نوازشہائے بیجا اور دوسروں کے طعنہ ہائے دلخراش ایسے کہ ان کا غم کھایا جائے۔ کہ جو حق پر ہو اسے کسی کی مخالفت
پرواہ ہو سکتی ہے۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون تیری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ تیری آستیں میں ہے ید بیضا

جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب

حریت مآب !

ہمیں اس بات کا بھی علم ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ تنگ و دو حیات میں جو نصب العین آپ کے سامنے ہے وہ وہی ہے جو ہر مسلمان کی نگاہوں کے سامنے ہونا چاہیئے۔ جس کے دل میں بہ حیثیت مسلمان زندہ رہنے کی تڑپ اور اپنی نسلوں کو بہ حیثیت مسلمان زندہ رکھنے کی آرزو موجزن ہے۔ اور کسے معلوم نہیں کہ وہ نصب العین ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند (MUSLIM INDIA) کی تشکیل کے سوا اور کچھ نہیں جس طرح آپ احوال و ظروف کا صحیح جائزہ لیتے ہوئے قدم بقدم اس درخشندہ نصب العین کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ وہ آپ کی بلند نگہی اور حسن تدبر کا آئینہ دار ہے، سطح بین لوگوں نے آپ کو صرف ایک فاضل اور دیدہ ور مدبر کی حیثیت سے ہی پہچانا ہے۔ لیکن جن لوگوں کو آپ کے قریب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ مبدء فیض نے آپ کو اس قدر ذہن رسا کے ساتھ ساتھ کس قدر دل سوز و پر درد کی نعمتوں سے نوازا ہے

خرد نے تجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے تجھ کو حدیث رندانہ

اور قلب و نظر اور عشق و عقل کا یہی امتزاج ہے جو ایک ناخدائے کشتیٔ ملت کی متاع گراں بہا ہے۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

عالی مرتبت !

آپ یقین فرمایئے کہ جس قوم کی فلاح و بہبود آپ کی زندگی کا منتہی ہے۔ اس قوم کا سواد اعظم آپ کی قیادت و امارت پر کامل بھروسہ رکھتا ہے۔ اور ان کی خاطر آپ نے جو گراں قدر قربانیاں دی ہیں۔ ان کے دل میں ان کا پورا پورا احساس ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ سرزمین پنجاب جو ملت اسلامیہ کے اس اجتماع عظیم کی تقریب پر آپ کی تشریف آوری سے سرفراز ہونے والی ہے۔ اس میں آئینی نقطۂ نگاہ سے (CONSTITUTIONALLY) ابھی پراونشل لیگ کا قیام بھی عمل میں نہیں آسکا۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ یہ حقیقت آپ کی نگاہ سے مستور نہ ہوگی کہ پنجاب کا ایک ایک قریہ اور ہر قریے کے ایک ایک فرد کا دل آپ کی عظمت و عقیدت کا نشیمن بنا ہوا ہے۔ بس کسی ایک مرد خود آگاہ و خدا دوست کے مستانہ کی دیر ہے۔ یہ طوفان بلا انگیز کسی سے روکے نہیں رکے گا۔ اس وقت بچے گا وہی جو کشتیٔ ملت میں اخلاص سے سوار ہوگا۔ اور پکارنے والا پکارے گا کہ

لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ

سید القوم !

ادارۂ طلوع اسلام۔ جسے ہزارہا پرخلوص اور صحیح النظر مسلمانوں کی ترجمانی کا فخر حاصل ہے۔ اجلاس

ادارت پر آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتا ہے۔ اور متدعی ہے کہ جس نصب العین کی طرف آپ کا قدم
بڑھا ہے۔ قوم کو اس کی طرف اور تیز گامی سے بڑھاتے جائیے۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے اگر ضرورت پیش آئی تو
دیکھیں گے کہ قوم کس طرح کفن بردوش و سربکف آپ کی دعوت پر لبیک کہتی ہے۔

بانشۂ درویشی درساز و دمادم زن ::
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

ارکین ادارۂ طلوع اسلام

اس عظیم الشان تاریخی اجلاس میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو وہ ریزولیوشن پاس ہوا۔ جس میں پاکستان کو مسلمانان ہند کی سرگرمیوں کا نصب العین قرار دیا گیا۔ یہ ہے ۲۳ مارچ کی تاریخی اہمیت۔ اس ریزولیوشن سے جہاں غیر مسلموں کے دل میں تشویش و اضطراب کی ایک آگ بھڑک اٹھی۔ وہاں مسلمانوں کے دل میں فطری طور پر اس قسم کے سوالات پیدا ہونے شروع ہوئے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام سے مقصود کیا ہے؟ اس حکومت کی اصل و بنیاد کیا ہوگی؟ اور غرض و غایت کیا؟ حکومت میں اور دنیا کی دوسری حکومتوں میں فرق کیا ہوگا۔ یہ تھے وہ سوالات جو صدر مسلم لیگ (قائد اعظم مرحوم سے ۱۹۴۱ء) حیدرآباد (دکن) کے چند نوجوانوں نے پوچھے۔ سوالات اور ان کے جواب حسب ذیل تھے۔

سوال:- مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب:- جب میں انگریزی زبان میں مذہب کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور قوم کے محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن خدا اور بندے کی باہمی نسبت اور رابطہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم یا تصور نہیں ہے۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانین اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم الشان کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معاشی، غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآن کریم کی اصولی ہدایات اور سیاسی طریق کار نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسن سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر تصور ناممکن ہے۔

سوال:- اس سلسلہ میں اشتراکی حکومت وغیرہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:- اشتراکیت، بالشویکیت، یا دیگر اسی قسم کے سیاسی اور معاشی مسلک در اصل اسلام اور اس کے نظام

سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزاء کا سا رابطہ اور تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔

سوال:۔ ترکی حکومت تو ایک سیکولر اسٹیٹ ہے کیا اس سے اسلامی حکومت مختلف ہے؟ آپ کا اس باب میں کیا خیال ہے؟

جواب:۔ ترکی حکومت پر میرے خیال میں مادی حکومت (SECULAR STATE) کی سیاسی اصطلاح اپنے پورے مفہوم میں منطبق نہیں ہوتی۔ اب رہا اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز سو یہ بالکل واضح ہے۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کے لئے تعمیل کا مرکز قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے، نہ کسی پارلیمان کی، نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی، قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے (آپ جس نوعیت کی بھی چاہتے ہوں) بہرحال آپ کو علاقہ اور سلطنت کی ضرورت ہے۔

سوال:۔ وہ سلطنت ہند میں کس طرح نصیب ہو سکتی ہے۔؟

جواب:۔ مسلم لیگ، اس کی تنظیم، اس کی جدوجہد، اس کا رخ۔ اس کی راہ۔ سب اس سوال کے جواب ہیں۔

سوال:۔ جب آپ اسلامی اصول کے نصب العین اور طریق کار دونوں میں بہترین اور برترین حکومت کا یقین رکھتے ہیں۔ اور اعملاً یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو خود مختار علاقے اس لئے مطلوب ہیں کہ وہاں وہ اپنے ذہنی نصب العین اور تصورات زندگی کو بلا روک ٹوک بروئے کار اور روبہ ترقی لا سکیں۔ تو پھر اس میں کون سا امر مانع ہے کہ مسلم لیگ زیادہ تفصیل اور توضیح کے ساتھ اپنی جدوجہد کی مذہبی تعبیر و تشریح کرے۔

جواب:۔ دقت یہ ہے کہ جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بغیر اس بات کے سمجھے کہ کام کی نوعیت، تقسیم عمل اور اس کے اصل حدود کیا ہیں۔ ان امور کو صرف چند مولویوں کا خیال کر لیتی ہے۔ اور (اپنے حلقہ سے باہر) اہلیت و مستعدی کے باوجود مجھ میں یا آپ میں (یعنی کسی میں) اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ انہیں میں ان مولوی صاحبان میں (الاّ ماشاء اللہ) نہیں پاتا۔ اور اندر مشکل یہ کہ وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

ان جوابات سے واضح ہے کہ حصول پاکستان کی جدوجہد میں قائد تحریک کے ذہن میں آئین و نظام پاکستان کا کیا نقشہ تھا۔ اب مسلم لیگ کی تحریک ایک متعین نصب العین کو سامنے رکھ کر آگے بڑھی۔ یہ تحریک کس کس نشیب و فراز سے گذری۔ اس

ہے رضداکہے کہ ہماری اس ملی جدوجہد کی پوری تاریخ قلمبند ہو جائے، تو اس میں ان جانگداز مراحل کا تفصیلی تذکرہ جائے) اس کے چند اہم مقامات حسب ذیل ہیں۔

تجاویز اور مابعد

۲۲ مارچ ۱۹۴۲ء کو حکومت برطانیہ نے سر سٹیفورڈ کرپس کو چند تجاویز دے کر ہندوستان بھیجا تاکہ وہ ان کی بنا پر مساعیٔ جنگ کے لئے اہل ہند کا تعاون حاصل کر سکیں۔ ان تجاویز میں پاکستان کے اصولوں کو تسلیم کیا گیا۔ کانگریس نے (جیسا کہ ظاہر ہے) ان تجاویز کو مسترد کر دیا۔ اور اگست ۱۹۴۲ء میں کے خلاف عام بغاوت کی تحریک شروع کر دی۔ تاکہ وہ اس سے مرعوب ہو کر اصول پاکستان کو مسترد کر دے۔

ٹر راجہ گوپال اچاریہ اصول پاکستان کے حق میں تھے۔ انھوں نے اپریل ۱۹۴۴ء میں ایک فارمولا پیش کیا۔ تاکہ اس کی بنا پر لیگ اور کانگریس میں مفاہمت ہو سکے۔ ۱۰ جولائی ۱۹۴۴ء کو مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں قائد اعظم مرحوم نے ے کا تجزیہ کر کے بتایا کہ وہ کس طرح کانگریس کی قائدانہ حیثیت تسلیم کرانے کی عیارانہ کوشش ہے۔ ستمبر ۱۹۴۴ء میں مسٹر گاندھی اعظم میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی مفاہمت کے سلسلہ میں مذاکرات شروع ہوئے۔ جو ناکامی پر منتج ہوئے۔ ۱۹۴۵ء کے ں مرکزی اسمبلی کانگریس پارٹی کے لیڈر مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی اور محترم لیاقت علی خاں مرحوم نے ایک فارمولا تیار کیا ماہ پہلی بار دو قوموں کے نظریہ کو تسلیم کیا گیا۔ وائسرائے ہند لارڈ ویول اس فارمولا کی روشنی میں آئینی تعطل کو دور کرنے لندن گئے۔ اور انھوں نے جون ۱۹۴۵ء کو اپنی تجاویز کا اعلان کر دیا۔ کانگریس ان پر بھی رضامند نہ ہوئی۔

۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو لندن سے ایک وزارتی مشن ہندوستان بھیجا گیا۔ جس نے ملک کے مختلف نمائندوں سے بات چیت ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو اپنا فیصلہ شائع کر دیا۔ مسلم لیگ نے اسے بھی منظور کر لیا۔ لیکن کانگریس نے پہلے اسے تسلیم کر لیا۔ اور بعد ے مسترد کر دیا۔

۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو حکومت برطانیہ نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے اختیارات کلی عنقریب اہل ہند کے حوالے کر دیئے جائیں گے ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ان نئی تبدیلیوں کا تاریخی اعلان ہوا۔ ان کے مطابق ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان عملاً وجود میں آگیا۔ ۱۸ اگ کراچی میں آزادی کی پہلی عید منائی گئی۔ (اور اسی تاریخ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی قربانیاں شروع ہو گئیں) اب قریب ساڑھے آٹھ سال کے بعد پاکستان کا آئین منظور ہوا ہے۔ اس آئین کے نفاذ کے لئے ۲۳ مارچ کی مقرر کی گئی ہے۔ کیونکہ ۱۹۴۰ء میں اسی تاریخ کو پاکستان کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اس مملکت کو استحکام و عطا فرمائے۔ اور ہمیں اس قابل بنائے کہ ہم اس میں صحیح اسلامی نظام قائم کر سکیں۔ کہ حصول پاکستان کی اصل غایت ہے۔ باقی ہستانِ آذری۔

اب آپ سمجھے کہ ہماری ملی سرگزشت میں ۲۳ مارچ کی تاریخ کس قدر اہمیت رکھتی ہے۔ اس تاریخ کو ہمارا ملی شعار قرار پا جانا چاہیئے۔ وللہ الحمد۔

مجلس اقبال

مثنوی اسرار خودی

باب ہشتم

در حقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ

گذشتہ باب میں علامہ اقبال اس حقیقت کو بیان کرچکے ہیں کہ تصوف، جو قوموں کی رگِ حیات میں خون گرم کو یخ بستہ کرکے ان کو سوزِ آرزو اوران کے سینوں کو ولولۂ عمل سے محروم کردیتا ہے، اپنی اس کے اعتبار سے ذہنِ افلاطونی کی ایجاد ہے جس کے افسونِ خواب آ[ور] کہ اڑھائی ہزار سال سے قوموں کی قومیں ذوقِ عمل سے بے گانہ ہوکر تباہی کے جہنم میں گرتی چلی گئی ہیں، اور چلی جارہی ہیں۔ زیرِ نظر با[ب] اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ تصوف کا سب سے بڑا اثر قوموں کے شعروادب پر ہوتا ہے بلکہ یوں کہئے کہ تصوف کا زہر پھیلتا ہی شا[عری کے] ذریعے ہے۔ تصوف کی عمارت حقائق کی بجائے لطائف پر استوار ہوتی ہے۔ حقائق کا اثبات، دلیل و برہان اور علم و بصیرت کی رُو[سے ہوتا ہے] لیکن لطائف محض تشبیہات واستعارات کے زور پر اپنے آپ کو حقیقتِ ثابتہ کے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً تصوف کا ایک [دعویٰ] یہ ہے کہ کوئی شخص براہِ راست جلوۂ خداوندی سے بہرہ یاب نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے مرشد کی وساطت کی ضرورت ہے [۔ وہ] اس دعوے کو دلیل و برہان کی رُو سے ثابت نہیں کرتا بلکہ کہتا یہ ہے کہ اگر تم سورج کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھو تو آنکھیں خیرہ [ہو جاتی ہیں اور] تم اس کے جلال کی تاب نہیں لاسکتے۔ تم اسے نظر بھر کر دیکھ ہی نہیں سکتے۔ لیکن اگر پانی کا پیالہ بھر کر اس میں سورج کا عکس دیکھا [جائے تو اس] کا پورا قرص سامنے آجاتا ہے اور اس کا مشاہدہ کرنے میں آنکھوں کو ذرا بھی دقت نہیں ہوتی۔ اسی طرح جب تم جلالِ خدا [کو مرشد] کے آئینۂ جمال کی وساطت سے دیکھو تو وہی جلوہ جو اس سے پہلے نظارہ سوز تھا۔۔۔ قرۃ العین بن جائے گا۔

آپ نے دیکھا کہ اس ایک تشبیہ نے ذہن کو کس طرح ماؤف کردیا اور تصوف کا وہ دعوےٰ جو علم و برہان کی رُو[سے کوئی حیثیت] ہی نہیں رکھتا، کس طرح ایک مثبت حقیقت بن کر دکھائی دینے لگا۔ تصوف کی ساری عمارت اسی قسم کے لطائف

ن اور تشبیہات و استعارات کے سہاروں پر کھڑی رہتی ہے۔ اسی طرح ادب و شعر، تصوف کے خدام کی حیثیت سے اس کے سحر کو عام
بتے ہیں۔ علی حزیں نے تو کہا تھا کہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شعر ہم برائے تصوف لا ینفک
۔ لہذا جو قوم زندگی اور اس کی حرارتوں سے بہرہ یاب ہونا چاہے، اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے لٹریچر کو
یم سے پاک اور صاف کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو اس کی کوئی کوشش صحیح نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔
س مقام پر اس نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ادب اور شعر، بجائے خویش کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ یہ محض اظہار خیال کا ذریعہ
ہذا اگر کسی قوم کا ادب فالج زدہ ہے تو اس سے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس قوم کے تخیلات پر موت کا کابوس سوار ہے۔ یا اگر کسی قوم کے تصورات
یں توانائی اور حرارت نہیں، تو اس کا ادب ایک بیوہ کی نوحہ گری سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو قوم نکبت و زوال
ستانوں کی طرف کھنچی جا رہی ہو، اس کے افراد ہمیشہ ان اشعار پر سر دھنیں گے جن میں انتہائی درجہ کا حزن و یاس اور درد
و شر مردگی و افسردگی کی کفن پوش لاشیں پڑی ہوں۔ ان کے شاعروں میں وہ شاعر سب سے زیادہ داد کا مستحق سمجھا جائے گا جو ایک
کر کراہتے ہوئے اٹھے اور دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر کہے کہ حضور!

عالم کی فضا پوچھو محروم تمنا سے
بیٹھا ہوا دنیا میں اٹھ جائے جو دنیا سے

دعوے کو بطور کلیہ کے پیش کیا جاتا ہے کہ ادب و شعر کو اپنے نقطۂ عروج تک پہنچتے ہی زمانۂ انحطاط میں ہیں۔ زیر نظر باب
قبال نے اسی فریب کی نقاب کشائی کی ہے اور کھلے کھلے الفاظ میں بتایا ہے کہ جو ادب رزمگاہ حیات سے فرار کی راہیں
ر قلب انسانی کو جوشش عمل و کردار سے بیگانہ بناتا ہے، وہ ادب نہیں، برگ حشیش بلکہ نوید مرگ ہے۔ اس لئے کہ

گرم خوں انساں ز داغ آرزو
آتش ایں خاک از چراغ آرزو

ن مقصد کے حصول کی تڑپ ہی وہ قوت و حرارت ہے جس سے انسان کی رگوں میں زندہ اور گرم خون دوڑتا ہے۔ آرزو
چراغ ہے جس کی حرارت سے یہ خاک کا پتلا، آتش کا پرکالہ بن جاتا ہے۔

از تمنائے بجام آمد حیات
گرم خیز و تیز گام آمد حیات

تمنا سے بیگانہ ہو جائے تو وہ ایک ایسے ساغر کی طرح ہو جاتی ہے جو شراب سے خالی ہو۔ زندگی اگر محفل کائنات میں
تی ہے تو اس کی یہ کیفیت آرزو ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی قوت سے وہ برق رفتاری کے ساتھ اپنے ارتقائی مراحل
ہوئی آگے بڑھتی اور اوپر کو اٹھتی چلی جاتی ہے۔ (اس کے برعکس تصوف کی تلقین یہ ہے کہ سب سے بڑی متاع " دل بے
ہے!) حقیقت یہ ہے کہ

زندگی مضمونِ تسخیر است و بس
آرزو افسونِ تسخیر است و بس

زندگی کا مقصود و غایت، تسخیرِ کائنات ہے۔ بلکہ یوں کہیئے کہ زندگی عبارت ہی اس سے ہے کہ انسان نفس و آفاق کی قوتوں کو مسخر کرے۔ اس تسخیرِ کائنات کے لئے ایک ہی سحر اور تعویذ ہے۔ اور وہ ہے — آرزو

زندگی صید افگن و دام آرزو
حسن را از عشق پیغام آرزو

زندگی کا کام یہ ہے کہ وہ کائنات کے تمام عناصر کو شکار کرتی چلی جائے۔ لیکن شکار بغیر جال کے ممکن نہیں۔ زندگی کے پاس وہ جال جس سے وہ ہر شے کو شکار کر سکتی ہے، آرزو ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جس شکاری کے پاس جال ہی نہ ہو، وہ شکار کیا کر سکے گا؟

دوسرا مصرعہ بڑا ہی خوبصورت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ عشق حسن کی طرف ایک ہی پیغام بھیجتا ہے۔ اور وہ پیغام ہوتا ہے آرزو کا۔ عشق درحقیقت نام ہی آرزو کا ہے۔ اگر آرزو کی چنگاری باقی نہ رہے تو شعلۂ عشق خود بخود بجھ جاتا ہے۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ آرزو کس چیز سے پیدا ہوتی ہے؟ عشق کی خلاق تو آرزو ہے لیکن آرزو کی تخلیق کس سے ہو

از چہ رو خیزد تمنا دمبدم
ایں نوائے زندگی را زیر و بم

آرزو جس سے سرودِ حیات میں زیر و بم پیدا ہوتا ہے۔ جس سے جوئے زندگی متموج و متلاطم ہوتی ہے۔ یہ دمبدم پیدا کس سے ہوتی ہے؟ سوال آپ نے سن لیا۔ اب اس کا جواب دیکھئے۔ ارشاد ہے

ہر چہ باشد خوب و زیبا و جمیل	در بیابانِ طلب ما را دلیل
نقشِ او محکم نشیند در دلت	آرزوہا آفریند در دلت

کائنات میں ہر حسین و جمیل شے میدانِ طلب میں ہماری راہنما بن جاتی ہے۔ ہم اگر کسی صحرا میں راہ گم کردہ کھڑے ہوں تھکے ماندے کسی درخت کے سایہ تلے سستا رہے ہوں کہ اتنے میں دور سے کوئی نہایت حسین و جمیل شے دکھا دے تو وہ ایک تبسم زیرِ لبی سے، آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کر دیتی ہے کہ — جا اینجاست۔ اور انسان، تازہ ولولوں کی نئی دنیا اپنے آغوش میں لئے، اس کے حصول کے لئے والہانہ انداز سے پھر جادہ پیما ہو جاتا ہے۔ لہذا

حسن خلاقِ بہارِ آرزوست
جلوہ اش پروردگارِ آرزوست

حسن خود ہی بہارِ آرزو کا خلاق ہے اسی کا جلوہ اس کا پروردگار ہے۔ حسن خود آرزو کو بیدار کرتا ہے جس سے شرارِ عشق کا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار اس امر پر زور دیتا ہے کہ تم جلوہ گاہِ کائنات کا بغور مشاہدہ کرو۔ تمہیں اس کے ایک

حسن و زیبائی کارفرما نظر آئے گی اور یہی حسن تمہارے دل میں آرزوؤں کو بیدار کر دے گا۔ جس سے ذوقِ عمل کی نمود ہو گی۔
بات یہاں تک پہنچی ہے کہ زندگی نام ہے آرزو کا۔ اور آرزو پیدا ہوتی ہے خود حسن سے۔ اور

سینۂ شاعر تجلی زارِ حسن
خیزد از سینائے او انوارِ حسن

جلوہ گاہ شاعر کا دل ہے۔ یہی وہ طور ہے جس سے انوارِ حسن اٹھ کر افقِ کائنات کو آئینہ پوش بنا دیتے ہیں۔
اس سے واضح ہے کہ اقبال کے نزدیک شاعر کون ہے؟ وہ جو حسنِ کائنات کو سب سے زیادہ شدت سے محسوس کرے۔ یہ ظاہر ہے کہ حسن کائنات کی تحسین (APPRECIATION) محض جذبات (APPRECIA... سکتی۔ حسن نام ہے توازن و تناسب (BALANCE AND PROPORTION) کا۔ اور اشیائے کائنات ...ت و عمیق توازن اسی صورت میں بے نقاب ہو کر سامنے آسکتا ہے۔ جب انسان قانونِ فطرت کی گہرائیوں تک پہنچ کر اس ... کا بچشمِ خویش مشاہدہ کرے کہ ماتریٰ فی خلق الرحمٰن من تفٰوت (۶۷/۳) تخلیقِ خداوندی میں کہیں عدمِ توازن نہیں۔ ... ہے کہ یہ چیز انتہائی غور و فکر کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن اس غور و فکر کے بعد جس کی بنیاد تجربات و مشاہدات پر ہو۔ نہ کہ ... تصورات پر۔ ان تصریحات سے آپ خود سوچئے کہ "تجلی زارِ حسن" کس کا سینہ ہو سکتا ہے اور جسے علامہ اقبال نے شعر کی ...یں "شاعر" کہہ کر پکارا ہے۔ اسے دنیائے محسوسات میں کس نام سے تعبیر کیا جائے گا؟ ماہرِ علومِ فطرت جس کی فکر پاکیزہ ہو۔ ... ہے کہ قرآن نے (مومنین کے لئے) "علماء" کا لفظ ایک ہی مقام پر استعمال کیا ہے اور وہاں اس سے مراد ماہرینِ علومِ فطرت ... (ملاحظہ ہو $\frac{۳۵}{۲۷-۲۸}$)۔

اس قسم کے "شاعر" کے متعلق کہا ہے کہ

از نگاہش خوب گردد خوب تر
فطرت از افسونِ او محبوب تر

نگاہ، اشیائے کائنات کے حسن میں نت نئے اضافے کرتی رہتی ہے۔ وہ ایسا سحر پھونکتا ہے کہ اس سے عروسِ فطرت ... سے محبوب تر بنتی چلی جاتی ہے۔ اس کے تجربات، فطرت کے حجابِ مستور کی نقاب کشائی کرتے چلے جاتے ہیں اور اس کی جابکدستی ... مشاطگی میں مصروف رہتی ہے۔

از دمش بلبل نوا آموخت است
غازہ اش رخسارِ گل افروخت است

...کی دنیا کی طرف آئیے تو یہی وہ لوگ ہیں جن سے بلبل نے نواسنجی سیکھی ہے۔ اور انہی کا غازہ، عارضِ گل کی سرخی کا ...بنتا ہے یعنی عشق کی آتش بھی انہی سے بھڑکتی ہے اور حسن کی رنگینی بھی انہی سے ابھرتی ہے

سوز او اندر دل پروانہ ھا

عشق را رنگین از و افسانہ ھا

پروانے کے دل میں جو سوز و تپش نظر آتی ہے وہ بھی انہی سے ہے اور افسانۂ عشق کی رنگ آمیزی بھی انہی کے دم

بحر و بر پوشیدہ در آب و گلش

صد جہان تازہ مضمر در دلش

یہی وہ مرد حساس و بالغ نظر ہے جس کے آب و گل میں بحر و بر پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ہر آن اس کے دل میں ایک نئ

ملتی ہے۔ اس لئے کہ وہ رموزِ فطرت کو آشکارا کرنے اور حسن کائنات میں نادرہ کار اضافوں میں مصروف عمل رہتا ہے

کے تخیل (IMAGINATION) اور دور بینی (FAR-SIGHTEDNESS) کی یہ کیفیت ہوتی ہے

در دماغش نادمیدہ لالہ ہا

ناشنیدہ نغمہ ہا ہم نالہ ہا

وہ پھول جو ابھی شاخ کے پردوں میں پنہاں ہوتے ہیں، اس کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں، اور وہ نغمہ ہائے شادی او

غم جو سینوں میں مستور ہوں اور کسی کے لب تک بھی نہ آئے ہوں، اس کا قلب انہیں بھی سن لیتا ہے۔ یہ تو رہا اس کے احسا

دستوں اور گہرائیوں کا احساس۔ باقی رہی اس کی رفعتِ فکر، سو اس کی کیفیت یہ ہے کہ

فکر او با ماہ و انجم ہم نشیں

زشت را نا آشنا۔ خوب آفریں

اس کی فکر چاند اور تاروں سے ہم گوش رہتی ہے اور سب سے بڑی خصوصیت یہ کہ وہ ہمیشہ حسن و خیر کی تخلیق کرتا ہے، شر؛

سے واقف ہی نہیں ہوتا۔ یعنی خالی فکر کی بلندی ہی نہیں بلکہ قلب و نظر کی پاکیزگی بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ پھر اس کی

نظر صرف اس کی اپنی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ اس سے وہ نوع انسانی کی راہ نمائی کرتا ہے۔

خضر و در ظلمات او آب حیات

زندہ تر از آب چشمش کائنات

وہ خضر راہ بنتا ہے اور جو اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہے وہ حیات جاوید کے چشمہ تک جا پہنچتا ہے۔ نوع ا

درد و غم میں اس کی آنکھ سے جو آنسو ٹپکتا ہے اس سے مزرعِ کائنات کی سیرابی ہوتی ہے۔ اور وہ زندہ سے زندہ

ما گراں سیریم و خام و سادہ ایم

در رہِ منزل ز پا افتادہ ایم

اگر اس کی راہ نمائی میسر نہ ہو تو انسانیت راستوں میں ٹھوکریں کھاتی پھرے۔ سفر حیات میں اس کا ایک ایک

ے۔ ہر رہزن متاع ہستی اس کی ناپختگی اور سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر اسے لوٹ لے اس کی راہ نمائی کے بغیر ہم سب
مرہو۔ لیکن وہ ایسا نہیں ہونے دیتا۔

عندلیب او نوا پرداخت است　　حیلۂ از بہر ما انداخت است
تا کشد ما را بفردوس حیات　　حلقۂ کامل شود قوس حیات

ندلیب خوش نوا کو راستہ میں چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنے چہچہوں سے راستہ چلنے والوں کا دل بہلائے اور انہیں اپنے پیچھے لگالے
طرح انہیں فردوس حیات کی طرف لے جائے۔ اور یوں زندگی کی کمان، نصف دائرہ رہنے کے بجائے، پورا حلقہ بن جائے۔ جس
اور معاد (ابتدا اور انتہا۔ آغاز و انجام) کے گوشے ایک دوسرے سے مل جائیں اور منزل اور راستہ میں کوئی فرق ہی

کاروان ہا را درایش گامزن
در پئے آواز نالیش گامزن

پیام رحیل، کاروانِ انسانیت کو آمادۂ سفر کر دیتا ہے وہ اس کی نفیری آواز کے پیچھے پیچھے چلتا ہے اور اس طرح
خراماں، شاداں و فرحاں منزلِ مقصود تک جا پہنچتا ہے۔

چوں نسیمش در ریاضِ ما وزد
نرمک اندر لالہ و گل می خزد

س کی نسیم جاں فزا ہمارے چمنِ ہستی میں مست خرام ہوتی ہے تو وہ لالہ و گل کی نرم و نازک پتیوں تک میں بغیر
لور پر سرایت کر جاتی ہے اور اس طرح نہایت نرمی اور آہستگی سے پردوں کے اندر چھپی ہوئی تازگی کے لئے وجہ شگفتگی
تی ہے۔ اس سے دلوں کی کلیاں کھلتی ہیں اور آرزوؤں کے غنچے چٹکتے ہیں۔

از فریب او خود افزا زندگی
خود حساب و ناشکیبا زندگی

سر انگیزیوں اور کرشمہ خیزیوں سے زندگی میں افزائش و بالیدگی (SELF—DEVELOPMENT)
جاتی ہے۔ وہ ایک ایک سانس میں اپنا محاسبہ کرتی رہتی ہے اور اس کے دل میں ہر وقت آرزو کی تڑپ موجزن

اہل عالم را صلا بر خواں کند
آتش خود را چو باد ارزاں کند

کسی خاص گروہ، خاص جماعت، خاص خطہ ملک تک محدود نہیں رہتیں۔ وہ اپنے خوانِ نعمت پر ساری نوعِ انسانی

کو دعوت دیتا ہے۔ دعوت دینا کیا؛ وہ اسے اس طرح کھلا رکھتا ہے جس طرح ہوا ہر متنفس کے لئے ہر جگہ اور ہر وقت بلا قیمت موجود ہے ربوبیتِ عامہ اس کا مقصدِ حیات اور رحمۃ للعالمینی اس کا مطمحِ نگاہ ہوتا ہے۔

ان خصوصیات کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ جس ہستی کو اقبال نے "شاعر" کے نام سے پکارا ہے، کیا اس سے مراد شاعر ہیں جن کی غزلیں مشاعروں میں سنی جاتی ہیں؟ صاف ظاہر ہے کہ اقبال نے یہ ساری گفتگو استعارۃً کی ہے اور جسے اس "شاعر" سے تعبیر کیا ہے، وہ درحقیقت پیغامبرِ حیات ہے۔ اس زمرہ میں سب سے اوپر خود حضرات انبیاء کرام ہوتے ہیں اور ان کے نیچے ان کی اتباع میں، وہ تمام مصلحین، مفکرین اور ماہرینِ علوم فطرت جو انسانیت کو قوانینِ خداوندی سے آشنا کرتے اور انہیں زندگی کی غرض و غایت کا سراغ دیکر ان کے دل میں اس کے حصول کی تڑپ پیدا کرتے ہیں۔

ایک "شاعر" تو اس قسم کا ہوتا ہے اب دوسری قسم کے "شاعر" کا حال سنئے۔ واضح رہے کہ مثنوی کے سب سے پہلے ایڈیشن میں باب زیرِ نظر کی جگہ ایک اور باب تھا جس میں حضرت علامہ نے بتایا تھا کہ حافظ کی شاعری نے قوم کو کس قدر افیون زدہ بنا دیا۔ اس سے کس درجہ احتیاط لازم ہے۔ ہماری شخصیت پرست قوم بھلا اس قسم کی تنقید کو کس طرح برداشت کر لیتی۔ متصوفین نے اس کے خلاف طوفان برپا کر دیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ مثنوی کے دوسرے ایڈیشن میں ان اشعار کو حذف کر دیا گیا اور ان کی جگہ اس باب نے لے لی۔ اس باب کا جو حصہ اب سامنے آتا ہے، یہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے وہی ہے، جو حافظ کے متعلق کہا گیا تھا۔ لیکن اس پر ان لوگوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا جنہوں نے حافظ سے متعلق اشعار پر کہرام مچا دیا تھا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ اگر کسی کا نام لئے بغیر آپ اس پر کڑی سے کڑی تنقید کر دیں تو قوم کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا لیکن جونہی آپ نے اسلاف میں سے کسی کا نام لیا، ان کے جذبات عقیدتمندی بھڑک اُٹھے اور آپ کے خلاف شور مچ گیا۔ جو قوم سطحی جذبات میں بہہ چکی ہو اس کی کیفیت یہی ہو جاتی ہے۔ بہرحال دوسری قسم کے شاعر کے متعلق علامہ اقبال نے کہا ہے کہ

وائے قومے کز اجل گیرد برات

شاعرش وا بوسد از ذوقِ حیات

کس قدر بدبختی اور تباہی ہے اس قوم کی جس کا شاعر اسے ذوقِ حیات سے روگردانی اور حقائقِ زندگی سے فرار کی راہ سکھاتا ہے۔ یہ قوم زندگی کی توانائیوں سے بہرہ یاب ہونے کی بجائے موت کی برودت و افسردگی سے ہمکنار ہونے میں لذت محسوس کرتی ہے

خوش نماید زشت را آئینہ اش

در جگر صد نشتر از نوشینہ اش

اس کا آئینہ حسن کر ہر برائی کو بھلائی بنا کر دکھاتا ہے۔ اس کے شہدِ سخن کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بجائے اس کے کہ انسان کے سینے کے زخموں کو مندمل کرے، الٹا جگر میں سینکڑوں ناسور پیدا کر دیتا ہے۔

بوسہ او تازگی از گل برد ذوقِ پرواز از دلِ بلبل برد

، بدقسمتی سے کسی شگفتہ وشاداب پھول کا منہ چوم لے تو وہ افسردہ وپژمردہ ہو جائے۔ اس کی آواز بلبل کے کان تک پہنچ جائے
ہ کے دل سے اڑنے کی آرزو ہی مٹ جائے۔

سست اعصاب تو از افیون او
زندگانی قیمت مضمون او

کے شعر وپیام کی افیون قوائے عملیہ کو یکسر معطل کر دیتی ہے۔ وہ تمہیں مضامین تو عطا کرتا ہے لیکن ان کی قیمت میں تم
ندگی جیسی متاع بے بہا لے لیتا ہے۔ ان سے تمہارے رگ وپے میں موت کا زہر سرایت کر دیتا ہے۔

می رباید ذوق رعنائی ز سرو
جرہ شاہیں از دم سردش تذرو

ر سرو کی طرف دیکھے تو اس کے دل سے رعنائی وزیبائی کا ذوق ختم ہو جائے اس کی سرد آہوں سے عقاب جیسا
تیز صاحب بال وپر، چکور بن کر رہ جائے۔ اس کی تعلیم مجاہدین کو پاشکستہ راہبین بنا دے۔

ماہی واز سینہ تا سر آدم است چوں بنات آشیاں اندر یم است
از نوا بر ناخدا افسوں زند کشتیش در قعر دریا افگند

ں کی توہم پرستی کی رو سے، سمندر میں تین پریاں رہتی ہیں (جنہیں عربی میں بنات البحر اور انگریزی میں (SIRENS)
ہیں) ان کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا ہوتا ہے۔ جہازراں کی خوش آوازی کے سحر سے بے راہ ہو کر غرق ہو جاتے ہیں
اس قسم کے شاعر کو بس بنات البحر سمجھئے۔

نغمہ ہائش از دلت دزد ثبات
مرگ را از سحر او دانی حیات

کے خواب آور نغمات شیریں، تیرے دل سے ثبات واستحکام کی تمام قوتیں چرا کر لے جاتے ہیں۔ اور اس کی سحرآفرینی
نگاہوں کا زاویہ اس حد تک بدل جاتا ہے کہ انسان موت کو عین حیات سمجھنے لگ جاتا ہے۔

دایۂ ہستی ز جان تو برد
لعل عنابی ز کان تو برد

ترے دل سے زندہ رہنے کی آرزو سلب کر لیتا ہے۔ وہ تیری کان (معدن) سے لعل بدخشانی نکال لیجاتا ہے
اس طرح تجھے پیکر آب وگل سے زیادہ کچھ نہیں رہنے دیتا۔

چوں زیاں پیرایہ بندد سود را
می کند مذموم ہر محمود را

وہ اپنی پُرکاری سے ہر نقصان کو نفع بنا کر دکھاتا ہے۔ تم تباہ و برباد ہو رہے ہوتے ہو اور سمجھتے یہ ہو کہ ہم پھول پھل رہے ہیں۔ طرح وہ ہر قابلِ نفرت شے کو درخورِ ستائش بنا کر پیش کرتا ہے

دریمِ اندیشہ انداز و ترا
از عمل بیگانہ می سازد ترا

وہ تمہیں عمل کی دنیا سے بیگانہ بنا کر، تصورات کی افسانوی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں تم عالمِ تفکر میں بیٹھے اس خوش فہمی میں مگن رہتے ہو کہ لاینحل عقدوں کو حل کر رہے ہیں۔ حالانکہ کائنات کے عقدے عمل سے حل ہوتے ہیں۔ اس قسم کی فریب خوردگی سے نہیں۔

خستہ و ما از کلامش خستہ تر
انجمن از دورِ جامش خستہ تر

وہ خود تباہ و برباد ہوتا ہے اور ہمیں اپنے سے بھی زیادہ تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ وہ تنہا نہیں بھٹکتا۔ ساری کی محفل کو اپنے ساتھ گمراہ کر دیتا ہے۔

جوئے برقے نیست در نیسانِ او
یک سرابِ رنگ و بو بستانِ او

اس کا دامنِ سحاب برق پاروں سے یکسر خالی ہوتا ہے۔ بظاہر نظر آتا ہے کہ وہ گوہر پاش ابرِ بہار ہے لیکن درحقیقت ا[س سے] ایک قطرہ بھی سیراب کن نہیں ہوتا۔ اس کے باغ کے پھول سب کاغذی ہوتے ہیں۔ جن کا رنگ و بو حقیقی نہیں بلکہ مص[نوعی] ہے۔

حسن او را با صداقت کار نیست
در یمش جز گوہرِ تف دار نیست

حسن (Beauty) اور صداقت (Truth) ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں لیکن جس چیز کو وہ حسن کہہ کر پیش کرتا۔ صداقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ یکسر ملمع و تصنع ہوتا ہے۔ اس کے بحرِ فکر میں کوئی ایک موتی بھی ایسا نہیں ہوتا جس نہ ہو۔ اس کے جس سکے کو اٹھائیے، کھوٹا ثابت ہوتا ہے۔

خواب را خوشتر ز بیداری شمرد
آتشِ ما از نفسہا یش فسرد

اس کی تعلیم یہ ہے کہ نیند ہمیشہ بیداری سے بہتر ہوتی ہے۔ (لہٰذا موت، زندگی سے خوش تر)۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ پھونکو ں [سے آگ] بھڑکتی ہے لیکن اس کی پھونکوں میں ایسا زہر آلود اثر ہوتا ہے کہ ان سے رہی سہی چنگاریاں بھی خاکستر بن جاتی ہیں۔

قلب مسموم از سرودِ بلبلش   خفتہ مارے زیرِ انبارِ گلش

ئے چھپوں سے ریجاتے اس کے کہ دلوں میں شگفتگی پیدا ہو وہ اُلٹے) زہر آلود ہوجاتے ہیں۔ اس کے پھولوں کے ڈھیر کے نیچے
چھپے رہتے ہیں اس لئے کسی کو ان کے قریب بھی نہیں جانا چاہیئے۔

از خم و مینا و جامش الحذر

از مئے آئینہ فامش الحذر

ذ اس کے خم اور مینا اور جام مئے سے خدا کی پناہ۔ اس کی اس شراب سے ہزار بار توبہ جو بظاہر یکسر آئینہ کی طرح شفاف
ہے لیکن جس میں درحقیقت تلچھٹ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

ہے وہ شاعری جس نے مسلمان جیسی ہمہ تن عمل و حرارت قوم کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ اس میں نہ ایران و ہند کی کوئی تخصیص ہے
عراقی میں کوئی تمیز۔ حقیقی خرابی اس کی اصل میں ہے نہ کہ برگ و بار میں۔ یہ ہمارے تصوف زدہ ماحول کی تخلیق ہے اور
سے دور لے جانے کا ابلیسی حربہ۔ چنانچہ حضرت علامہ اگلے بند میں مسلمان سے یہ کہتے ہیں کہ اس شاعری نے تمہارے
یا کیا۔؟

کی تفصیل کے لئے آئندہ اشاعت کا انتظار کیجئے۔

مادۂ تاریخ وفات

علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری

ب صدر الدین صاحب مکان ۱۲ کوچہ ۱۰ لینگے روڈ۔ رام نگر لاہور۔ نے حضرت علامہ مرحوم کا مندرجہ ذیل مادۂ
یخ وفات ارسال فرمایا ہے جس سے حروف ابجد کے حساب سے ۱۳۷۵ھ تاریخ نکلتی ہے۔

مادۂ تاریخ یہ ہے۔

"علامۂ جید حافظ محمد اسلم"

۵ء ۱۳ھ

سلسلۂ اصلاح و تذکیر

قرآنی معاشرہ

باہمی تعلقات کے متعلق قرآن کی تعلیم

از محترم عمر احمد عثمانی صاحب

قوموں کی زندگی میں اس کے کردار کیریکٹر، اور خصائص و امتیازات کو جو اہمیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں کسی قوم کا اپنا کردار ا کیریکٹر ہی ہوتا ہے جس سے وہ دوسری اقوام میں ممتاز نظر آتی ہے۔ جب کسی قوم کا کردار ہی فنا ہو جائے تو وہ قوم تادیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ا اپنی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ غیر محسوس طریقہ پر دوسری اقوام میں جذب ہوتی چلی جاتی ہے۔

تاریخ کے اوراق پلٹئے اور برعظیم پاک و ہندیا میں بسنے والے مسلمانوں کی ایک صدی پہلے کی حالت کا جائزہ لیجئے۔ اور پھر اس حالت آج کی حالت سے موازنہ کیجئے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ سلطنت و حکومت سے محروم ہو کر انگریز کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ جہالت ان ان پر غالب تھی ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے بعد وہ ہر جگہ انگریزی مظالم کا شکار تھے۔ نہ ان کی جانیں محفوظ تھیں نہ عزت و آبرو۔ اس تحر کی ناکامی سے مایوسیوں نے ان پر غلبہ پا لیا تھا۔ لیکن بایں ہمہ، ہم دیکھتے ہیں کہ اس معاشرہ میں اوپر کے مخصوص طبقہ کو چھوڑ کر طور پر عوام کی اخلاقی حالت ایک خصوصیت ضرور رکھتی تھی۔ اس خصوصیت کا اثر تھا کہ ہم نے اپنے بچپن کے زمانہ تک ہندوؤں کی زبا یہ سنا کرتے تھے کہ دیکھئے صاحب! یہ مسلمان ہو کر بھی جھوٹ بولتا ہے! یعنی اس زمانہ کے افراد نے اپنے کردار سے اس حقیقت کو مسلّمہ کے طور پر پیش کر دیا تھا کہ مسلمان جھوٹ نہیں بولا کرتے۔ اسی طرح انفرادی اخلاق کے دوسرے شعبوں میں بھی مسلمانوں اپنی خصوصیات کو ایک بڑی حد تک قائم رکھا تھا۔

آج ہم آئینی طور پر انگریز کی غلامی سے آزاد ہو چکے ہیں اور سلطنت خداداد پاکستان کے آزاد شہری ہیں۔ ایک صدی کے مقابلہ میں علم و فن میں بھی ہم نے کافی ترقی کی ہے۔ تنگ نظری اور جہالت کے جال سے اگرچہ ہم پوری طرح پر نہیں نکل بلاشبہ اب سے سو سال پہلے کے مقابلہ میں ہماری حالت بدرجہا بہتر ہے مایوسی کی جگہ امیدیں ہیں۔ ناکامیابی کی جگہ کامیا میں زرعی طور پر ہماری حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ صنعتی میدان میں بھی ہم نے رقابل ذکر بہی۔ لیکن بہر حال، نمایاں

ے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ایک چیز کی کمی ہیں ہر جگہ نظر آتی ہے اور وہ کردار اور کیریکٹر کا فقدان ہے۔ برعظیم ہند و پاک
سلمانوں ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں ہر جگہ مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ خود غرضی، چالاکی، فریب، جھوٹ، تن
ں ہمارے وہ خصائص ہیں جو ہم سب میں مابہ الاشتراک ہیں۔ اس میں نہ مسٹر کی قید ہے نہ مُلا کی۔ نہ کالج کی نہ مدرسہ کی، نہ کرسیٔ قیادت
سجادۂ خانقاہ کی۔ بدقسمتی سے اس حمام میں سب ننگے ہیں۔

انیسویں اور بیسویں صدی علمی اور فنی لحاظ سے بڑی اہم صدیاں ہیں۔ جدید تحقیقات و اختراعات اور نت نئے انکشافات و تجربات
ہت سی ان پرانی اقدار کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے جن پر قوموں کے کردار اور کیریکٹر کی بنیاد ہوتی ہے۔ یورپ اس باب میں خوش
ب تھا کہ اسے بروقت ایسے راہنما مل گئے جو پرانی اقدار کے فنا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی قوموں کو نئی اقدار دیتے چلے گئے اس لئے
پ کی اقوام کو پرانی بنیادوں کی جگہ وہ نئی بنیادیں ملتی چلی گئیں جن پر ان کے کردار اور کیریکٹر کی تعمیر ہوتی رہی۔ مگر مشرق اس باب
نہایت مفلس ثابت ہوا۔ جدید و قدیم کے اس تصادم نے جہاں پرانی اقدار کی بنیادیں ہلا دیں وہاں ان کو کوئی نئی بنیادیں مہیا نہ کی
سکیں۔ ان میں کچھ ہمارا یا ہمارے قومی راہنماؤں کا قصور بھی نہیں تھا۔ وہ علمی اور فنی اعتبار سے ابھی تک اس مقام تک نہیں پہنچ
ے تھے جہاں پہنچ کر جرأت و بیباکی کے ساتھ انسان خود آگے قدم بڑھاتا اور اپنے لئے اپنی نئی دنیا خود تعمیر کرتا ہے۔ ان کے سامنے اپنے ہاں
قدیم اقدار تھیں جو گلستان سعدی یا اخلاق جلالی وغیرہ پر مبنی تھیں یا پھر یورپ کی وہ جدید اقدار تھیں جو سائنٹفک تحقیقات یا مادیت
ستی نے اس کو مہیا کی تھیں۔ علمی تحقیقات اور فنی تجربات کے اس ریلے کے سامنے پرانی اقدار تادیر قائم نہیں رہ سکتی تھیں۔ چنانچہ نہیں رہ سکیں
جدید اقدار کو مشرق اس لئے نہیں اپنا سکا کہ وہ اس کی طبیعت اور مزاج کے خلاف تھیں۔ مشرق کی طبیعت اور مزاج میں مذہب کا خمیر
ہا سال سے یوں رچا بسا چلا آرہا ہے کہ اسے اس سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔

ان پرانی اقدار پر جو ہمیں سعدی، رومی اور تفتازانی سے وراثت میں ملی تھیں۔ ہمارا ایمان اس لئے باقی نہ رہ سکا کہ علم و تجربہ نے ان کی
ملیاں ہم پر واضح کر دی تھیں اور جدید اقدار پر ہم اس لئے ایمان نہ لا سکے کہ ان میں ہمیں کھلا ہوا شرک اور بے دینی نظر آرہی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم
دار اور کیریکٹر کے لحاظ سے بالکل ہی دیوالیہ ہو کر رہ گئے۔

رہنمایان قوم کا فرض تھا کہ وہ وقت کی اس ضرورت کو ہر وقت محسوس کرتے اور جو پرانی بنیادیں ختم ہوتی جا رہی تھیں ان کی جگہ قوم
نئی بنیادیں مہیا کرتے جاتے۔ خدا کی زندہ کتاب (قرآن کریم) ان کے پاس موجود تھی جو ہر سفر حیات میں ہمارے لئے دلیل راہ بن سکتی
ہے۔ مگر شاید ابھی اس کا وقت ہی نہیں آیا تھا کہ ہم اپنی ہر راہ نمائی کے لئے قرآن کی طرف رجوع کرنا سیکھیں۔

طلوع اسلام کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ اس نے یہ آواز اٹھائی کہ ہمیں اپنی مشکلات کے حل کے لئے خدا کی اس زندہ کتاب
طرف رجوع کرنا چاہیئے جس پر خود رسول اللہ صلعم اور آپ کے صحابہ نے عمل کر کے دنیا میں وہ بلند مقام حاصل کر لیا تھا کہ آج تک کوئی
س مقام تک نہیں پہنچ سکی۔ خدا نے اس کی آواز میں برکت عطا فرمائی اور ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ اب آہستہ آہستہ وہ طبقہ
لفظی طور پر اس کی مخالفت کو "جہاد عظیم" سمجھ رہا ہے، معنوی طور پر اس کا ہم نوا ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس نے بھی قرآن کا نام لینا شروع

کر دیا ہے اس سے توقع بندھتی ہے کہ وہ دن دور نہیں جب یہ لوگ مل کر قرآن کے ساتھ آجائیں اور واعتصموا بحبل اللہ جمیعا کا پیکر بن

* * * * * *

حالیہ اشاعت سے طلوع اسلام میں "قرآنی معاشرہ" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا جا رہا ہے جس میں بتایا جائے گا کہ قرآن کریم مسلمانوں کا کس قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس میں ایک فرد کا دوسرے فرد کے ساتھ اور دوسری اقوام کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہونا چاہیئے۔ قرآن کریم کی یہ وہ معاشرتی ہدایات ہیں جو ہمارے قومی کردار اور انفرادی صحیح تعمیر کر سکتی ہیں۔ یہ وہ اقدار ہیں جو یقینی اور اٹل ہیں۔ ان کی بنیادوں پر جو کیریکٹر اور کردار تعمیر ہوگا وہ یقیناً دنیا کے بڑے انقلاب کا مقابلہ کر سکے گا اور بڑے سے بڑے تھپیڑے بھی اس کی بنیادوں کو متزلزل نہیں کر سکیں گے۔

معاشرہ میں سب سے پہلا تعلق وہ تعلق ہے جو اولاد کو اپنے ماں باپ کے ساتھ ہوتا ہے اس لئے سب سے پہلے ہم اس شق کو لیتے ہیں۔

والدین

اولاد کا اپنے والدین کے ساتھ نہایت گہرا تعلق ہوتا ہے وہی اس کی تولید کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اولاد کا بچپن ایسا ہوتا ہے کہ اسے پروان چڑھنے کے لئے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماں باپ ہی ہوتے ہیں جو اس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے اور اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھاتے ہیں۔ پھر جس کی تعلیم و تربیت کا وقت آجاتا ہے تو وہ حسب مقدور اس فریضہ کو بھی ادا کرتے ہیں اور بچہ کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ دنیا میں اپنا مقام حاصل کرلے اور صحیح معنوں میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو کر سفر زندگی شروع کر سکے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اولاد جوں جوں بڑی ہوتی جاتی ہے والدین کی عمر انحطاط پذیر ہوتی جاتی اور ان کے قوائے عمل مضمحل ہوتے جاتے ہیں ان کی صلاحیتیں پژمردہ اور ان کی قوتوں میں کوتاہی آتی جاتی ہے۔ جیسا کہ کل اولاد کو اس کی ضرورت تھی کہ والدین اسے سہارا دیں آج والدین کو اس کی ضرورت ہے کہ ان کی اولاد انہیں سہارا دے۔ اس مقام پر غور کیجئے کہ حیوان اور انسان میں فرق ہے۔ حیوان بھی اپنے بچوں کی پرورش اسی جذب و انہماک سے کرتے ہیں جس سے انسان اپنے بچوں کی پرورش کرتا ہے۔ گویا اولاد کی پرورش کا جذبہ حیوان اور انسان دونوں میں مشترک ہے اور جبلت کا تقاضا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس پر زور دینے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ماں باپ کو چاہیئے کہ اولاد کی پرورش کیا کریں۔ لیکن حیوانات میں اولاد کا کوئی تعلق ماں باپ کے ساتھ باقی نہیں رہتا وہ بڑھاپے کے زمانے میں ماں باپ کے کسی کام نہیں آتی۔ گویا ماں باپ کے کام آنا حیوانی جبلت کا تقاضا نہیں۔ اس لئے قرآن کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ اولاد سے تاکید کرے کہ وہ ماں باپ کی ضعیفی کے زمانہ میں ان سے حسن سلوک سے پیش آئے تاکہ انسانی معاشرہ میں توازن قائم رہ سکتا ہے چنانچہ ارشاد ہے،

واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا وبالوالدین احسانا...... (۴/۳۶)

خدا ہی کی اطاعت وفرماں پذیری اختیار کرو اور اس کی اطاعت میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اور والدین کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرو۔

ں کی یہ ہدایت ہمارے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ اقوام گذشتہ کو بھی اسی قسم کی ہدایات دی جاتی رہی ہیں۔

واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل لا تعبدون الا اللہ وبالوالدین احسانا.. (۲/۸۳)

اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ تم خدا کے سوا کسی کی اطاعت وفرماں پذیری اختیار نہیں کرو گے اور والدین کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرو گے۔

یا بلکہ وحی الٰہی کا یہ حتمی فیصلہ ہے جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی کہ انسان کو ہمیشہ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک سے ہی پیش آنا چاہیئے۔

وقضی ربک الا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا.......... (۱۷/۲۳)

تیرے پروردگار نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی ہستی کی اطاعت اور فرماں پذیری اختیار نہ کرو اور اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہو۔

ووصینا الانسان بوالدیہ حسنا۔ ...... (۲۹/۸)

اور ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنے کا حکم دیا ہے۔

ا تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کو کس قدر اہمیت دی ہے کہ توحید الوہیت سرا حکم یہی دیا گیا ہے کہ والدین کے ساتھ "احسان" کیا جائے۔ احسان کے معنی یہی نہیں ہیں کہ روپیہ پیسہ سے ان کی مدد ئے بلکہ احسان کے معنی یہ ہیں کہ جتنی جتنی کمی ان میں آتی جا رہی ہے اس کو تم اپنی محنت سے پورا کرتے جاؤ تاکہ ان کی زندگی ان نہ رہ جائے۔ اس کا حسن ختم نہ ہو جائے۔ ان کی زندگی آخر تک توازن بدوش رہے کیونکہ احسان نام ہے حسن پیدا ا اور تناسب کے بغیر حسن کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ں کی اطاعت؟

یہ موضوع ذرا نازک سا ہے۔ اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے۔ قرآن کی رو سے اطاعت کی دو قسمیں ہیں۔ سمجھنے کے لئے ایک کو اطاعت مطلق اور دوسری کو اطاعت مقید کہہ لیجئے۔ اطاعت مطلق کسی کی فرماں برداری غیر مشروط کی جائے اس اطاعت اور فرماں برداری کو قرآن عبادت کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ قوانین خداوندی کے سوا کسی اور کی نہیں کی جا سکتی۔ حتیٰ کہ رسولوں کو بھی یہ حق نہیں کہ وہ انسانوں سے اس قسم کی اپنی کرا سکیں۔ محولہ بالا آیات میں بھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ اس قسم کی اطاعت کو خدا کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے اور حصر کے ساتھ

حکم دیا گیا ہے کہ اس قسم کی اطاعت خدا کے سوا کسی اور کی نہ کی جائے۔ اگر اس قسم کی اطاعت میں کسی دوسری ہستی کو شریک کیا جائے تو وہ قرآن کی میزان میں شرک ہے۔ اطاعت کی دوسری قسم یعنی مقید اطاعت یہ ہے کہ خدا نے اپنی وحی کے ذریعہ سے انسانوں کے لئے حدود (Boundry Lines) مقرر کر دی ہیں ان کے اندر رہتے ہوئے کسی کی اطاعت کی جائے۔ اس قسم کی اطاعت کا حکم رسول اور اولی الامر (مرکز ملت اور ارکان حکومت) کے لئے دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے

قل اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم........ (۵۹)

اے پیغمبر اسلام کہہ دو کہ خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ اور ان ارباب حکومت کی اطاعت کرو جو تم میں سے ہوں۔

جہاں تک اس دوسری قسم کی اطاعت یعنی مقید اطاعت کا تعلق ہے تو یہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ والدین کے لئے اس قسم کی اطاعت کا کہیں اس طرح حکم نہیں دیا جیسا کہ رسول اور ارباب حکومت کی اطاعت کا صراحتاً حکم دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے اس باب میں ایک ایسی روش کو تجویز کیا ہے جس کی مثال دنیا کے مذاہب و اخلاق میں کہیں نہیں ملتی۔ دنیا کے ضابطۂ اخلاق کو دیکھئے۔ ہر جگہ یہی لکھا ملے گا کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے۔ لیکن قرآن میں آپ کہیں لکھا نہیں ملے گا۔ بات یہ ہے بھی بالکل واضح۔ قرآن اس کی صراحت کرتا ہے (اور تجربہ اس کی تائید) کہ انسان جوں جوں انحطاط کی عمر میں پہنچتا ہے اس کی عقل میں کمی آتی جاتی ہے اور (قرآن کے الفاظ میں) جو کچھ اس نے پہلے سیکھا ہوتا ہے وہ بھی بھولتا جاتا ہے۔ اب آپ سمجھئے کہ قرآن کبھی اس کا حکم دے سکتا ہے کہ ایک انسان جس کے قوائے ذہنی عروج پذیر ہیں جو نئے نئے تجربات حاصل کرتا ہے دن آگے بڑھتا ہے اس انسان کے فیصلوں کے تابع چلے جس کی عقل اپنے ہی ہو چکی ہے جو اس سے پچاس برس پیچھے کا ہے جس کا علم پرانا ہو چکا ہے۔ قرآن کبھی ایسا حکم نہیں دے سکتا۔

اس میں شبہ نہیں کہ جب تک ایک بچہ، بچپن کے زمانہ سے گزرتا اور سن شعور تک نہیں پہنچتا، وہ اپنے ماں باپ کے کا محتاج ہوتا ہے۔ اس عمر میں اسے یقیناً ان کے کہنے کے مطابق چلنا چاہیئے۔ لیکن اس زمانے میں بھی اگر وہ کوئی ایسی بات جو احکام خداوندی کے خلاف جاتی ہو تو اسے اس سے انکار کر دینا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اس باب میں حضرت ابراہیم کے مسلک کو بطور اسوہ پیش کرتا ہے۔ جنہوں نے اپنے باپ سے برملا کہہ دیا ہے کہ میں تمہارے بتوں کی پرستش نہیں کر سکتا اور رام چندر کی روش کو بطور نمونہ پیش نہیں کرتا جنہوں نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ باپ محض اپنی بیوی کی پاسداری سے ایک غلط حکم دے رہا ہے اس حکم کی تعمیل میں بن باس قبول کر لیا)۔ اسی لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اگر والدین کسی بات کا حکم دیں جو خدا کے حکم کے خلاف ہو تو ان کی اطاعت نہیں کرنی چاہیئے

خدا کے حکم کے مقابلہ میں والدین کی اطاعت نہیں کی جا سکتی

ووصینا الانسان بوالدیہ حسنا ۵ و ان جاھداک لتشرک بی ما لیس

لك به علم فلا تطعهما!...... (۲۹/۸)

ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت فرمائی ہے۔ لیکن اگر وہ تم سے اس کی کوشش کرنے لگیں کہ تم میرے ساتھ کسی ایسی ہستی کو شریک کرو جس کا تمہیں کوئی علم نہیں ہے تو پھر ان کی اطاعت نہ کرو۔

سے واضح ہو گیا کہ اگر والدین اس قسم کے حکم دینے لگیں جو خدا کی مقرر کردہ حدود سے متجاوز ہوں تو وہاں ان کی فرماں برداری ختم یسے امور میں خدا کے احکام کی بجا آوری ضروری ہوگی اور والدین سے صاف کہہ دینا ہوگا کہ میں ان معاملات میں آپ کے احکام لغاقام ہوں البتہ یہ مناسب نہیں ہوگا کہ اس کے بعد ہم ان سے حسن سلوک سے پیش نہ آئیں۔ چنانچہ دوسری جگہ اس کو ہے جہاں فرمایا:

وان جاهداك على ان تشرك بي ما ليس لك به علم فلا تطعهما وصاحبهما

في الدنيا معروفا واتبع سبيل من اناب الي...... (۳۱/۱۵)

اگر ماں باپ تم سے یہ کوشش کرنے لگیں کہ تم میرے ساتھ ان ہستیوں کو شریک ٹھہراؤ جن کا تمہیں کوئی علم نہیں ہے تو ان کی اطاعت نہ کرو مگر دنیا میں ان کے ساتھ وہی برتاؤ قائم رکھو جو جانا پہچانا اور معروف ہو اور ان لوگوں کی راہ کی پیروی کرو جو میرے قوانین کی طرف ہمہ تن متوجہ رہتے ہیں۔

ے معاملات میں وہی جانا پہچانا برتاؤ کرتے رہنا چاہیئے جو ایک شریف معاشرہ میں اولاد اپنے ماں باپ کے ساتھ کرتی ہے۔

روں کی حق تلفی کیلئے
کی اطاعت نہیں کیجا سکتی

ایسے ہی اگر والدین ایسے احکام دینے لگیں جن سے دوسرے اہل حقوق کی حق تلفی ہوتی ہو اور عدل و انصاف کے تقاضوں کا خون ہوتا ہو تو وہاں بھی والدین کے احکام کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ گھر میں ساس بہو، نندوں اور بھاوجوں اور دیورانی اور جٹھانی کی نہیں بنتی۔ ان صورتوں میں ساس اور خسر ایسا رویہ اختیار کر لیتے ہیں کہ وکی حق تلفی بلکہ بسا اوقات اس پر ظلم ہونے لگتا ہے ماں باپ کی عموماً یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ اولاد بھی ان کی اس روش کا ے اور اس ظلم میں وہ بھی ان کے ساتھ شریک ہو۔ قرآن کی ہدایت ایسے معاملات میں یہ ہے کہ ایک مؤمن کو معاشرہ میں ماف کو قائم کرنے والا ہونا چاہیئے۔ اسے سمجھنا چاہیئے کہ وہ عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ایک نگراں رکھتا ہے اس میں خواہ اسے خود اپنی مرضی اور والدین اور اعزا و اقربا کی مرضی کو قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس کا فرض عدل و انصاف کی میزان کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھے اور اس کی ہدایت کے مطابق عمل پیرا رہے۔

يا ايها الذين امنوا كونوا قوامين بالقسط شهداء لله ولو على

انفسكم او الوالدين والاقربين. (۴/۱۳۵)

اسے پیروانِ دعوتِ ایمانی! عدل وانصاف کو قائم کرنے والے اور خدا کے لئے نگراں بن کر رہو خواہ
اس قیام اور نگرانی کی زد خود تمہارے اپنے والدین اور اقربا کے خلاف ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔

لہٰذا ایک مؤمن کو عدل وانصاف کی میزان سے کر ہمیشہ یہ دیکھتے رہنا ہوگا کہ والدین کے حقوق کیا ہیں اور بیوی بچوں کے حقوق کیا ہیں ان حقوق کے درمیان ایسا نظم وضبط اور توازن قائم رکھنا چاہیئے کہ کسی ایک کی وجہ سے دوسروں کی حق تلفی نہ ہوتی ہو

بے عقلی کی باتوں میں والدین کی اطاعت نہیں کی جا سکتی

جیسا کہ پہلے اجمالاً کہا جا چکا ہے والدین جب سن رسیدہ ہو جاتے ہیں تو بعض اوقات وہ ایسی بے عقلی کی باتیں کرنے لگتے ہیں جو ایک صاحب عقل وہوش آدمی نہیں کرتا۔ وہ ایسے ایسے بے تکے احکام صادر کرنے لگتے ہیں جو سراسر خلاف مصلحت ہوتے ہیں۔ اور بعض اوقات اولاد کے مستقبل کو تیرہ وتار کر ڈالتے ہیں۔ وہ ان کی زندگی کو مشکلات ومصائب کی آماجگاہ بنا کر اسے اجیرن کر دیتے ہیں۔ اولاد جب سن رشد کو پہنچ جائے اور اپنے بُرے بھلے کو خود سمجھنے لگے تو محض اس وجہ سے کہ وہ اس کے والدین کے احکام ہیں جانتے بوجھتے ایسے احکام کی پیروی نہیں کرنی چاہیئے۔ ہمیں یہ حقیقت اپنے سامنے رکھنی چاہیئے کہ سن رسیدہ ہو جانے کی وجہ سے جہاں ان کے دیگر قوائے عملیہ انحطاط پذیر ہو جاتے ہیں۔ وہیں ان کے قوائے عقلیہ بھی بڑی حد تک مضمحل ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ایسے معاملات میں انسان کو خود عقل وہوش سے کام لے کر قدم اٹھانا چاہیئے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔

ومن نعمره ننکسه فی الخلق افلا یعقلون ۝ (۳۶/۶۸)

اور ہم جن لوگوں کی عمریں لمبی کر دیتے ہیں، پیدائشی طور پر ہم انہیں بالکل اوندھا کر دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ اتنا بھی نہیں سمجھتے۔

عمر جوں جوں بڑھتی جاتی ہے انسان پیدائشی طور پر اوندھا ہوتا جاتا ہے۔ وہ بڑھاپے میں بالکل بچوں جیسی باتیں کرنے لگتا ہے یعنی وہ عقل سے کم کام لیتا ہے اور جذبات سے زیادہ۔ لہٰذا انسان کو اپنے معاملات کے فیصلے عقل وہوش کی روشنی میں کرنے چاہئیں۔ والدین کے متعلق یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ اب ان کے انحطاط کا زمانہ آگیا ہے۔ لہٰذا ضروری نہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہوں وہ عقل وشعور کا بھی تقاضا ہو۔ ان کی باتیں سنو اور عقل وشعور کی میزان میں ان کا وزن کرو۔ اگر ان کی ہدایات تقاضائے عقل کے مطابق ہوں تو ٹھیک ورنہ سمجھ لو کہ یہ بیچارے معذور ہو چکے ہیں۔

والدین سے حسن سلوک اور شاہ وفرمانی کے سلسلہ میں قرآن نے حضرات انبیاء کرام کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ چنانچہ حضرت یحییٰ کے تذکرہ کے ضمن میں ہے

وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝ (۱۹/۱۴)

وہ اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنے والے تھے اور سرکش نہیں تھے۔

ت عیسیٰ کے متعلق فرمایا کہ انہوں نے اعلان کیا کہ

وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا ٥ (۳۲/۱۹)

خدا نے مجھے اپنی والدہ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا بنایا ہے اور مجھے

جبار اور بدبخت یا سنگدل نہیں بنایا۔

شکر

انسان کے ہر عمل کا ایک مقصد اور نتیجہ ہوتا ہے۔ ماں باپ سالہا سال تک بچہ کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں جو مصائب جھیلتے رہتے ہیں۔ ان کا بھی کوئی مقصد اور نتیجہ ہونا چاہیئے اس کے کچھ تقاضے ہونے چاہئیں۔ اس کی وجہ سے بچہ پر کچھ ذمہ داریاں ہونی چاہئیں۔ اولاد کا فرض ہے کہ وہ ماں باپ کی ان کوششوں اور مساعی کے بھرپور نتائج پیش کرے۔ قرآن والدین کے لئے شکر کا حکم دیتا ہے مگر شکر کے معنی یہ نہیں کہ زبان سے شکریہ ادا کرکے اولاد سبکدوش ہو جائے بلکہ شکریہ کے معنی ہیں پورے پورے نتائج پیدا کرنا ان جائز آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کرنا جن کے ماتحت اس کے ماں باپ ان مشکلات و مصائب کو جھیلتے آئے ہیں ان کی اس سعی و عمل کی قدر شناسی کرنا جو انہوں نے اس کی صحیح تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں کی ہے یعنی صحیح معنوں میں وہ کچھ بن جانا جو اس تعلیم و تربیت کا مقصد ہو۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ
وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ
إِلَيَّ الْمَصِيرُ ٥ (۳۱/۱۴)

ہم نے انسان کو اس کے والدین کے متعلق بھی حکم دیا ہے۔ جیسے ماں باوجودیکہ ضعیف پر ضعیف ہوتی جا رہی ہوتی ہے مگر وہ اس کے حمل کی دشواریوں کو برداشت کرتی اور پھر دو سال تک دودھ پلانے کے بعد اس کا دودھ چھڑاتی ہے کہ وہ ہمارے انعامات اور والدین کے احسانات کی پوری پوری قدر شناسی کرے کیونکہ بہرحال انجام کے لحاظ سے ہمارے قانون ہی کی طرف ہر چیز کو لوٹنا ہوگا۔

اپنی محنت کے ماحصل کو والدین کیلئے کھلا چھوڑ دینا ضروری ہے

اسلامی معاشرہ میں سرمایہ اندوزی تو جائز ہی نہیں۔ ہر مسلمان کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی محنت کے ماحصل کو کھلا رکھے اور جہاں ضرورت دیکھے وہاں اس کو صرف کر دے۔ کیونکہ اسلامی معاشرہ میں انسان اپنی محنت کے ماحصل کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اس کا امین ہوتا ہے۔ اسے اس میں سے اپنے لئے اتنا ہی لینے کی اجازت ہے جتنے کی اسے ضرورت ہو۔ اور اس کے بعد جتنا کچھ اس کی ضرورت سے بچ جائے وہ ان لوگوں کا حق ہے جو اپنی ضروریات کے مطابق حاصل نہیں کر سکتے اور ان لوگوں میں سب سے مقدم ترین حق والدین کا ہے۔ قرآن کریم نے جہاں ان لوگوں کا تذکرہ فرمایا ہے جن کے لئے ہمیں اپنی محنت کے ماحصل کو کھلا رکھنا چاہیئے۔ ان میں سب سے پہلے والدین ہی کو رکھا گیا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۚ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۲/۲۱۵)

اے پیغمبر اسلام! لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا کچھ مفاد عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دیں۔ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ جو اموال تم کو مفاد عامہ کے لئے کھلے رکھنے چاہئیں وہ والدین، قریبی رشتہ دار، یتامیٰ، مساکین، اور مسافروں کے لئے ہیں۔ اور جو کچھ بھلائی تم کرتے ہو تو خدا اسے بخوبی جانتا ہے۔

قرآن کریم کی اس آیت نے جہاں یہ بتا دیا کہ کن لوگوں کے لئے ہمیں اپنے محنت کے ماحصل کو کھلا رکھنا چاہیئے اور ان کی ترتیب کیا ہونی چاہیئے وہیں اس طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ یہ تو بتایا جا سکتا ہے کہ ہمیں کن کن موقعوں پر خرچ کرنا ہو گا مگر اسے متعین کر کے نہیں بتایا جا سکتا کہ کتنا کچھ خرچ کرنا ہو گا۔ کیونکہ اس کا مدار حالات پر ہے جو بدلتے رہتے ہیں۔

والدین کے ساتھ سخت کلامی کرنا جائز نہیں

بعض مرتبہ والدین اس عقلی انحطاط کو پہنچ جاتے ہیں کہ وہ بے عقلی کی باتیں کرنے لگتے ہیں کہ ان باتوں پر غصہ آجانا چاہیئے۔ مگر اولاد کو زیب نہیں کہ وہ اپنے جذبات پر کنٹرول نہ رکھے اور آپے سے باہر ہو جائے۔ اسے یہ چیز ہمیشہ مدنظر رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنی کبر سنی کی وجہ سے ایسے مرحلہ پر پہنچ چکے ہیں جہاں پہنچ کر وہ معذور ہو جاتے ہیں۔ وہ جو کچھ بے عقلی کی باتیں کرتے ہیں عمداً نہیں کرتے۔ وہ اپنے نزدیک عقل کا تقاضا سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ لہٰذا نرمی اور ملاطفت کے ساتھ انہیں سمجھا دینا چاہیئے اور عزت و احترام کے ساتھ گفتگو کرنی چاہیئے۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ
الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰـهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (۱۷/۲۳)

اور تیرے نشوونما دینے والے نے یہ حکم دیا کہ تم اس کے سوا کسی کی بھی اطاعت و فرماں پذیری اختیار نہ کرو۔ اور والدین کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک کے ساتھ پیش آؤ۔ اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑی عمر کو پہنچ جائیں اور بڑھاپے کی وجہ سے بے عقلی کی باتیں کرنے لگیں، تو ان کو بُرا بھلا نہ کہو اور نہ ہی ان کو جھڑکو۔ بلکہ ان سے عزت و احترام کے ساتھ گفتگو کرو۔

والدین کے ساتھ ہمیشہ فروتنی سے پیش آؤ

ان کے ساتھ نرمی سے پیش آنا چاہیئے اور اس حقیقت کو نہ بھولنا چاہیئے کہ ایک زمانہ ہم پر بھی ایسا گزرا ہے جبکہ ہم بے عقل و شعور تھے اور اسی قسم کی بے عقلی کی باتیں ہم بھی کیا کرتے تھے۔ مگر ان والدین نے ان بے عقلی کی باتوں پر ہمیں ڈانٹا ڈپٹا نہیں تھا بلکہ ہمارے اس قسم کی بے عقلی کی باتوں پر وہ ہنس کر خاموش ہو جایا کرتے تھے بلکہ بعض وقت اس سے خوش ہوتے تھے۔ اب، اگر ہمارے والدین بڑھاپے کی وجہ سے اس قسم کی بچوں جیسی باتیں کرنے لگتے ہیں تو ہمیں اس پر ڈانٹ ڈپٹ نہیں کرنی چاہیئے کہ یہ معذور ہیں۔ اور معذور پر غصہ

واخفض لهما جناح الذل من الرحمة وقل رب ارحمهما كما ربيانى

صغيرا ٥ (۱۷/۲۴)

اور رحمت کے تقاضے کے مطابق انکسار اور فروتنی کا پہلو ان کے لئے ہمیشہ جھکائے رکھنا چاہیئے اور کہنا چاہیئے کہ اے پروردگار ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ ان دونوں نے مجھے اس وقت پروان چڑھایا تھا جبکہ میں بہت چھوٹا تھا۔

غلط روش زندگی پر والدین کو ضرور کردینی چاہیئے

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم والدین کو کچھ کہو ہی نہیں اور ان کے سامنے ہر وقت بھیگی بلی بنے رہو۔ سخت کلامی۔ توہین اور جھڑکنا جائز نہیں ہے۔ لیکن اگر تم دیکھ رہے ہو کہ ان کی روش زندگی غلط خطوط پر جا رہی ہے اور خدا نے ستہ دکھا دیا ہے تو تمہارا یہ بھی فریضہ ہے کہ تم ان کو ان کی غلط روش زندگی پر مناسب طریقہ سے ٹوک دو اور انہیں بتاؤ کہ ان کی نہیں ہے۔ اس روش کو انہیں چھوڑ دینا چاہیئے۔ اور اس کے بجائے صحیح روش زندگی اختیار کرنی چاہیئے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّىْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ٥ (۷/۶۴)

اور یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ آذر سے کہا تھا کہ کیا تم ان بتوں کو اپنا آلہ بنا رہے ہو۔ اگر ایسا ہے تو میں تمہیں اور تمہاری پوری قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔

اوم کی نوبت پہنچ جائے اور تمہیں نظر آ رہا ہو کہ تمہارے والدین خود تمہیں بھی صحیح روش زندگی پر چلنے نہیں دیتے اور تمہارے حائل ہوتے ہیں تو ایسی صورت میں ان سے کنارہ کش ہو جانا چاہیئے۔

اذ قال لابيه يٰابت لم تعبد ما لا يسمع ولا يبصر ولا يغنى عنك شيئا ٥ يٰابت انى قد جاءنى من العلم ما لم يأتك فاتبعنى اهدك صراطا سويا ٥ يٰابت لا تعبد الشيطن ۚ ان الشيطن كان للرحمٰن عصيا ٥ يٰابت انى اخاف ان يمسك عذاب من الرحمٰن فتكون للشيطن وليا ٥ قال اراغب انت عن الهتى يٰابرٰهيم ۚ لئن لم تنته لارجمنك واهجرنى مليا ٥ قال سلم عليك سأستغفر لك ربى انه كان بى حفيا ٥ واعتزلكم وما تدعون من دون الله وادعو ربى ۔ عسى ان لا اكون بدعاء ربى شقيا ٥ (۱۹/۴۳-۴۸)

یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا تھا۔ ابا جان! آپ ان چیزوں کی پیروی کیوں کرتے

ہیں جو سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کو کوئی فائدہ پہنچا سکتی ہیں۔ اباجان! مجھے علم و بصیرت کی وہ دولت مل گئی ہے جو آپ کو نہیں ملی۔ آپ میرا اتباع کیجئے، میں آپ کو سیدھے اور صحیح راستہ کی رہنمائی کر دوں گا۔ اباجان شیطان کی اطاعت نہ کیجئے، شیطان تو حقیقتاً خدا کا بڑا ہی نافرمان ہے اباجان مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں خدا کی طرف سے آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے اور اس طرح آپ شیطان کے دوست نہ بن جائیں (یہ باتیں سن کر) باپ نے کہا۔ اے ابراہیم! کیا تم میرے معبودوں سے روگردانی کر رہے ہو؟ دیکھو، اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا۔ کچھ عرصہ کے لئے تم مجھے چھوڑ دو (میں دیکھتا ہوں کہ اس عرصہ میں تم اپنی روش ٹھیک کر لیتے ہو یا نہیں) ابراہیم نے کہا کہ اباجان میں آپ کے لئے سلامتی ہی کی آرزوئیں رکھتا ہوں اور اپنے پروردگار سے تمہارے لئے سامانِ حفاظت ہی مانگتا رہوں گا۔ میرا پروردگار مجھ پر بہت ہی مہربان ہے۔ اور میں تم لوگوں سے اور ان معبودانِ باطل سے کنارہ کش ہو جاؤں گا جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو۔ میں تو اپنے پروردگار ہی کو پکارتا رہوں گا۔ یقیناً اپنے پروردگار کو پکارنے سے (زندگی کی کامرانیوں سے محروم) نہیں رہ سکوں گا۔

لیکن اس کنارہ کشی کے ساتھ ساتھ ان کے لئے نیک آرزوئیں ضرور باقی رہنی چاہئیں۔ آپ نے محولہ بالا آیات میں دیکھا ابراہیم علیہ السلام اپنے والد سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے بھی

سَلَامٌ عَلَيْكَ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ

میں آپ کے لئے اس کے باوجود بھی سلامتی کی آرزوئیں رکھتا ہوں اور اپنے پروردگار سے آپ کے لئے سامانِ حفاظت ہی کا طلبگار رہوں گا۔

فرماتے ہیں۔ لہذا کنارہ کش ہو جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم ان کے بدخواہ اور دشمن بن جائیں۔ ہمیں ان کی گمراہی پر افسوس ہونا چاہئیے اور یہ خواہش ہمیشہ رکھنی چاہئیے کہ کاش وہ راہِ راست پر آ جاتے۔ ان کی گمراہی پر ہمارا دل کڑھنا چاہ خیرخواہ کی طرح ان کے لئے نیک خواہشات اپنے دل میں رکھنی چاہئیں۔

اس مضمون کو قرآن کریم نے دوسری جگہ مزید وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے جہاں فرمایا۔

قد كانت لكم اسوة حسنة فى ابراهيم والذين معه اذ قالوا لقومهم انا برآؤ منكم ومما تعبدون من دون الله۔ كفرنا بكم وبدا بيننا وبينكم العداوة والبغضاء ابدا حتى تؤمنوا بالله وحده الا قول ابراهيم لابيه لاستغفرن لك وما املك

لك من الله من شيءٍ .... (۲۸ـ۴)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تم لوگوں کے لئے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں کی زندگی میں پیروی کے لئے اچھا نمونہ ہے جب انہوں نے اپنی قوم سے صاف صاف کہدیا کہ ہم تم سے اور ان ہستیوں سے جن کی تم خدا کے سوا اطاعت اور فرماں پذیری اختیار کئے ہوئے ہو بالکل بری ہیں۔ ہم اس روش زندگی کا انکار کرتے ہیں۔ ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت اور بغض کا تعلق واضح ہوگیا ہے اور یہ تعلق اس وقت تک باقی رہے گا جب تک تم تنہا اللہ پر ایمان نہ لے آؤ۔ البتہ ابراہیم نے اپنے باپ سے یہ ضرور کہا تھا کہ میں تیرے لئے سامان حفاظت کا طلبگار ضرور رہوں گا لیکن خدا کی طرف سے تیرے لئے کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا۔

...ہیں قرآن کریم نے اس چیلنج کا ذکر کیا ہے جو حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں نے اپنی قوم کو دیا ہے۔ چیلنج کے الفاظ پر غور فرمائیے ...خ اور کتنا صاف چیلنج ہے صرف برأت اور قطع تعلق ہی کا اعلان نہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ نفرت اور عداوت کا بھی اعلان ہے مگر ...و جو حضرت ابراہیم اپنے والد سے پھر بھی اپنی ان نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہیں کہ میں تمہارے لئے سامان حفاظت کا طلبگا...ں گا۔ اگرچہ جو بات تمہیں قانون خداوندی کی رو سے پیش آجائے تو مجھے اس کی قطعاً قدرت نہیں ہے کہ میں اس کو روک دوں ...اپنے دل میں تمہارے لئے نیک آرزوئیں ضرور رکھوں گا۔ چنانچہ یہ نیک آرزوئیں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کے لئے برابر ...اور ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے دل میں اپنے باپ کے لئے اس سے بڑھ کر اور نیک آرزو کیا ہو سکتی تھی کہ خدائے تعالیٰ اس ...کی توفیق عطا فرماوے۔ لیکن ایک نبی کا کام ہدایت کی کوشش اور تمنا رکھنا ہوتا ہے۔ صحیح راستے پر لگا دینا نہیں ہوتا۔

انك لا تهدي من احببت ولكن الله يهدي من يشاء (۲۸ـ۵۶)

جسے تم چاہو اسے تم ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ ہدایت تو خدا کے قانون کے مطابق ہی مل سکتی ہے اور اسے ہی مل سکتی ہے جو ہدایت لینا چاہتا ہو۔

...ں کو مرتے وقت اپنے ...ں کیلئے وصیت کرنی چاہیئے

اگر خدا نے تمہیں مال دیا ہے اور تمہاری موت کا وقت قریب آگیا ہے تو مرتے وقت بھی والدین کے حقوق کو بھولنا نہیں چاہیئے۔ اگر والدین ضرورتمند ہیں اور تمہارے مال کی انہیں ضرورت ہے تو تم پر واجب ہے کہ ان کے لئے اور دیگر رشتہ داروں کے لئے مناسب وصیت کر جاؤ تاکہ تمہارے بعد ...راب نہ ہو اور وہ تمہاری اس وصیت سے اپنی زندگی کے باقی دن آسانی سے پورے کر سکیں

كتب عليكم اذا حضر احدكم الموت ان ترك خيرا ن الوصية للوالدين والاقربين بالمعروف۔ حقا على المتقين ۝ (۲ـ۱۸۰)

جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آ جائے تو اگر وہ مال چھوڑ کر مر رہا ہو تو تم پر یہ واجب ٹھہرا دیا گیا ہے کہ اپنے والدین اور اقربا کے لئے معروف طریقہ پر وصیت کر جاؤ۔ یہ چیز ان لوگوں پر واجب ہے جو اپنی زندگی کو خدا کے قوانین سے ہم آہنگ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

لہٰذا صرف اتنا ہی ضروری نہیں کہ زندگی بھر تم اپنے والدین کی خدمت کرتے رہو اور ان کے حقوق ادا کرتے رہو۔ بلکہ اگر خدا نے تمہیں اور وسعت دی ہے تو مرتے وقت بھی ان کو فراموش نہ کرو۔ نہ صرف ان کو بلکہ ان کے ساتھ دوسرے ضرورتمند اعزا و اقربا کو بھی جتنا مناسب معلوم ہو ان کے لئے وصیت کر دو۔

یہاں دو باتوں کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ قرآن نے تقسیم وراثت کے جو قوانین مقرر کئے ہیں، وہ مرنے والے کی وصیت کو پورا کرنے کے بعد ہی نافذ العمل ہوں گے۔ قرآن کی رو سے مرنے والے کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ترکہ کی جس طرح سمجھے تقسیم کی وصیت کر جائے۔ دوسرے یہ کہ انفاق اور ورثہ وغیرہ کے احکام اس دور سے متعلق ہیں جب ہنوز قرآنی نظام قائم نہ ہوا ہو۔ اس نظام میں ان احکام کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

البتہ نتائج اعمال میں تم والدین کے کام نہیں آسکتے

مگر اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ والدین کا حسن سلوک ہمارے ساتھ اور ہمارا حسن سلوک والدین کے ساتھ صرف دنیوی معاملات تک ہی محدود رہ سکتا ہے۔ جہاں تک نتائج اعمال کا تعلق ہے نہ ماں باپ اپنی اولاد کے کام آسکتے ہیں اور نہ اولاد ماں باپ کے کچھ کام آسکتی ہے۔ نتائج اعمال پر مرتب ہوتے ہیں اور وہ ویسے ہی ہوں گے جیسے ہمارے اپنے اعمال ہوں گے۔ اگر ہم نے صلاحیت بخش کام کئے ہیں تو ان کے عمدہ نتائج ہمیں حاصل ہوں گے اور اگر غیر صلاحیت بخش کام کئے ہیں تو ان کے برے نتائج کو بھی ہمیں بھگتنا پڑے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم غیر صلاحیت بخش کام کرتے رہے ہیں لیکن چونکہ ہمارے ماں باپ صلاحیت بخش کام کرتے رہے ہیں اسلئے ان کے اعمال کے نتائج سے ہمیں کچھ حصہ مل جائے۔ یا ہمارے ماں باپ غیر صلاحیت بخش کام کرتے رہے ہوں تو ہمارے صلاحیت بخش اعمال میں ان کو کچھ حصہ مل جائے۔

يا ايها الناس اتقوا ربكم واخشوا يوما لا يجزي والد عن ولده ولا مولود هو جاز عن والده شيئا ان وعد الله حق فلا تغرنكم الحيوة الدنيا ولا يغرنكم بالله الغرور (۳۱/۳۳)

اے افراد نسل انسانی! اپنے اعمال کو خداوندی قوانین سے ہم آہنگ رکھو اور اس دن سے ڈرتے رہو جبکہ نہ باپ اپنے بیٹے کے کام آسکے گا اور نہ بیٹا کچھ اپنے باپ کے کام آسکے گا۔ یاد رکھو خدا کا یہ وعدہ حقیقت پر مبنی ہے لہٰذا تمہیں دنیوی زندگی سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے اور خدا کے قوانین کے متعلق کسی فریب میں نہیں رہنا چاہیئے۔

سمجنا چاہیئے کہ جس طرح دنیوی زندگی میں باپ اپنی اولاد کے کام آجاتا ہے اور اولاد اپنے باپ کے کام آجاتی ہے ایسے ہی دوسری زندگی میں
ں اپنے اپنے اعمال کے مطابق ہر شخص کو نتائج کا سامنا کرنا ہوگا کوئی ایک دوسرے کے کام آسکے گا۔

اں باپ کے مرجانے کے بعد جو کھانے پکا پکا کر خیرات کئے جاتے ہیں یا فاتحہ دلوائی جاتی ہے یا قرآن پڑھ پڑھ کر بخشے جاتے ہیں یا حج بد ل
پہنچایا جاتا ہے ان کا کوئی فائدہ مرنے والوں کو نہیں پہنچتا۔ فائدہ صرف ان اعمال کا پہنچتا ہے جو کسی نے خود کئے ہوں۔

والدین پر کئے گئے انعامات کا احسان مند ہونا چاہئے

اولاد کا تعلق اپنے ماں باپ کے ساتھ کچھ اس قسم کا ہے کہ اولاد اپنے ماں باپ کے مال سے بھی استفادہ کرتی ہے، ان کے علم اور تجربے سے بھی فائدہ اٹھاتی ہے، ان کی صلاحیتوں سے بھی مستفید ہوتی ہے۔ غرضیکہ ان کی ہر چیز سے استفادہ کرتی ہے۔ لہذا جو انعامات ہمارے والدین پر کئے جاتے ہیں بالواسطہ وہ ہم پر
تے ہیں اس لئے ہمیں ان انعامات کا بھی احسان مند ہونا چاہیئے جو اگرچہ ہم پر براہ راست نہیں کئے گئے ہیں۔ لیکن ہم نے ان سے
اہے اور استفادہ کیا ہے لہذا جن انعامات خداوندی سے ہمارے والدین بہرہ یاب ہوئے تھے۔ ہمیں ان کا بھی شکر گزار ہونا
کہ اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں تو ہمارے والدین کما حقہ ہماری صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے قابل نہ ہو سکتے۔ اس لئے وہ انعامات ہمارے
ہی پر نہیں ہیں بلکہ خود ہم پر بھی ہیں۔

ووصینا الانسان بوالدیہ احسانا حملتہ امہ کرھا ووضعتہ کرھا
وحملہ وفصالہ ثلثون شہرا حتیٰ اذا بلغ اشدہ وبلغ اربعین سنۃ
قال رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علی وعلی والدی وان
اعمل صالحا ترضاہ واصلح لی فی ذریتی انی تبت الیک وانی من المسلمین
اولئک الذین نتقبل عنہم احسن ...... ما عملوا ونتجاوز عن سیأتہم
فی اصحاب الجنۃ۔ وعد الصدق الذی کانوا یوعدون (۴۶ / ۱۵—۱۶)

ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کی ماں تکلیف کے ساتھ اسے پیٹ میں اٹھائے رہی ہے اور تکلیف کے ساتھ ہی وضع حمل کے مرحلوں سے گزرتی ہے۔ پورے تیس مہینوں تک حمل اور دودھ پلانے کا سلسلہ قائم رہتا ہے حتیٰ کہ جب آدمی اپنی پوری توانائی کو پہنچ جاتا ہے اور چالیس سال کا ہو جاتا ہے اور بارگاہ الہٰی میں یوں تمنا پرداز ہوتا ہے کہ اے میرے پرورش کرنے والے! مجھے اس کی توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کے بھرپور نتائج پیدا کروں جو تو نے خود مجھ پر کی ہیں اور ان نعمتوں کے بھی جو تو نے میرے والدین پر فرمائی ہیں اور مجھے توفیق دے کہ میں وہ صلاحیت بخش کام کروں جنہیں تو پسند کرتا ہے اور میری اولاد میں بھی صلاحیت بخشی کی استعداد عطا فرما۔

میں تیری ہی طرف رجوع ہوتا ہوں۔ اور میں تیرے فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کے
توازن بدوش اعمال ہم قبول کر لیتے ہیں اور غیر توازن بدوش اعمال سے درگزر کر دیتے ہیں۔ ان کا ٹھکانہ
جنتی معاشرہ والوں میں ہوتا ہے۔ یہ خدا کا سچا وعدہ ہے جو ہمیشہ نوعِ انسانی سے کیا جاتا رہا ہے۔

والدین کی خدمت

اولاد کو چاہیئے کہ وہ والدین کی جتنی ہو سکتی ہو خدمت بجا لائے گھر کے کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹائے اور اگر والدین کام کاج کرنے کے قابل نہ رہے ہوں تو گھر کا کام کاج خود کرے۔ قرآن کریم نے حضرت شعیب علیہ السلام کی دو صاحبزادیوں کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے بھاگ کر مدین تشریف لائے تو

وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدَانِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ قَالَتَا لَا نَسْقِىْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ ۝ (۲۸/۲۳)

موسیٰ نے دیکھا کہ لوگوں کے پیچھے دو عورتیں کھڑی ہیں جو اپنے جانوروں کو پانی سے روک رہی ہیں۔ موسیٰ نے پوچھا کہ تمہیں کیا ہوا (تم جانوروں کو پانی کیوں نہیں پلاتیں ان کو کیوں روک رہی ہو) ان دونوں نے جواب دیا کہ ہم اس وقت تک پانی نہیں پلا سکتے جب تک چرواہے پانی پلا کر اپنے جانوروں کو واپس نہ لیجائیں۔ کیونکہ ہمارا باپ بہت ہی بوڑھا آدمی ہے۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن نے ان مختصر سے الفاظ میں کتنی بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ باپ بہت ہی بوڑھا آدمی ہے اس دونوں لڑکیاں خود جانوروں کو پانی پلانے آتی ہیں۔ عورت کمزور ہوتی ہے اس لئے اسے ایسی سرزمین بے آئین میں جہاں کا قانون (Might is Right) کے مطابق جس کی لاٹھی اس کی بھینس پر عمل پیرا ہو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ طاقتوروں سے پہلے اپنے جانوروں کو پانی پلانے کی جرأت کر سکے۔ جانور تو بہر حال جانور ہیں وہ اس حقیقت کو تو نہیں سمجھتے۔ پانی ان کے سامنے آتا ہے تو وہ اس کی وجہ سے پانی کی طرف بڑھنے کے لئے زور لگاتے ہیں اور یہ دونوں ناتوان لڑکیاں اپنے جانوروں کو پانی کی طرف بڑھنے سے روک رہی ہیں۔ یہ تھا وہ نقشہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہاں دیکھا۔ یہ نقشہ کچھ قوم شعیبؑ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں تھا۔ آج ہر جگہ جہاں حدود الٰہی کے مطابق زندگی بسر نہ ہوتی ہو آپ بعینہٖ یہی نقشہ پائیں گے۔ اس حقیقت سے صرف نظر کر کے آپ صرف استاد دیکھئے کہ حضرت شعیب علیہ السلام چونکہ کافی بوڑھے ہو چکے تھے اور اس قابل نہیں تھے کہ اپنے جانوروں کو خود لیجا کر انہیں پانی پلا سکیں اس لئے آپ کی صاحبزادیاں یہ کام انجام دے رہی ہیں۔ اس لئے اس مثال کو سامنے رکھتے ہوئے اولاد کا فرض ہے کہ گھر کی ضروریات پورا کرنے کے لئے اگر والدین اس قابل نہ رہے ہوں کہ وہ کوئی کام کر سکیں تو اولاد کو یہ کام خود کرنے چاہیئں اس میں لڑکوں اور لڑکیوں کی کوئی قید نہیں ہے۔ اگر کسی کے ہاں نرینہ اولاد نہ ہو تو لڑکیوں کو بھی یہ فریضہ انجام دینا چاہیئے۔

لدین کا احترام

ماں باپ قابلِ احترام ہستیاں ہیں اس لئے ان کے ساتھ ہمیشہ عزت و احترام کے ساتھ ہی پیش آنا چاہیئے ان کو معزز جگہ پر بٹھاؤ۔ اپنے سے اونچا نہیں تو کم از کم انہیں اپنے سے نیچا بھی نہ رکھو۔ نم انہیں اپنے سے بہتر کھلا پلا نہیں سکتے تو کم از کم جیسا خود کھاتے پہنتے ہو ویسا ہی ان کو بھی کھلاؤ اور پہناؤ۔ قرآن کریم نے حضرت ب اور ان کے کنبہ کی مصر میں تشریف آوری کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

فلما دخلوا علیٰ یوسف اوی الیہ ابویہ وقال ادخلوا مصر ان شاء اللہ امنین ورفع ابویہ علی العرش...... ($\frac{12}{100-99}$)

جب یہ لوگ مصر میں داخل ہوئے تو یوسف نے اپنے والدین کو اپنے پاس جگہ دی اور ان سے کہا کہ آپ لوگ انشاء اللہ مصر میں امن و امان کے ساتھ داخل ہوں۔ اور یوسف نے اپنے والدین کو اپنے پاس تخت پر بٹھایا۔

ت و احترام یہی نہیں کہ ماں باپ تمہارے پاس آئیں تو تم انہیں عزت و احترام کی جگہ پر بٹھا دو۔ بلکہ تمام معاملات میں ان کے نہ یہی سلوک کرنا چاہیئے خوراک۔ لباس۔ رہنے سہنے، غرضیکہ تمام باتوں میں اس عزت و احترام کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ یہ نہیں ان باپ کو اس طرح رکھا جائے جیسے نوکروں کو رکھا جاتا ہے ان کو اس طرح کھلایا پلایا جائے جیسے نوکروں کو کھلایا پلایا جاتا ،۔ یہ چیز قطعاً غلط ہے اور منشائے خداوندی کے خلاف ہے۔

یہ ہے اس تعلق کی صورت جو قرآنی معاشرہ میں ماں باپ کے ساتھ ان کی اولاد کی ہونی چاہیئے۔ مندرجہ بالا تصریحات ، ہمارے سامنے وہ تمام حدود آگئی ہیں جو قرآن نے اس سلسلہ میں قائم کی ہیں۔ ہمیں ان حدود کے اندر نہایت احتیاط کے نہ متوازن زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ افراط اور تفریط کا قطعاً شکار نہ ہونا چاہیئے۔ قرآن کا کمال یہی ہے کہ اس کی تعلیمات میں نراط ہے اور نہ تفریط۔ (اگلی کڑی آئندہ)

اسلام کی سرگزشت

(گزشتہ قسط میں اس امر سے بحث کی جا رہی تھی کہ — :
اسلامی فتوحات کے زیرِ اثر بین الاقوامی اختلاط سے مسلمانوں کی عقلی اور دینی زندگی پر کیا نتائج مرتب ہوئے اور مسلمانوں کی زندگی کے کن کن شعبوں کو انھوں نے متاثر کیا۔ یہ بحث ہنوز جاری ہے۔)

ممالکِ مفتوحہ کا اسلام میں داخلہ

اسبابِ اختلاط میں سے دوسرا بڑا سبب یہ تھا کہ ممالکِ مفتوحہ کی کثیر تعداد اسلام میں داخل ہو گئی تھی۔ اور وہ عربوں کے ساتھ اس طرح گھل مل گئے تھے کہ عرب ہی معلوم ہونے لگے تھے۔ بلاذری کی فتوح البلدان میں ہے کہ خسرو پرویز نے دیلم کے علاقہ کی طرف آدمی بھیجکر چار ہزار آدمی منگائے تھے۔ جو اس کے خاص اور مقربین میں سے شمار ہوتے تھے۔ آخر تک ان کا یہی مرتبہ رہا۔ رستم کے ساتھ یہ لوگ قادسیہ کے مقام پر شریکِ جنگ تھے۔ جب رستم مارا گیا۔ اور ایرانی فوج کو شکست ہو گئی۔ تو وہ آپس میں کہنے لگے کہ ہمارا حال ان ایرانیوں کی طرح تو ہے نہیں۔ تو یہاں کوئی ٹھکانا بھی نہیں ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ ہمارا برتاؤ بھی کچھ اچھا نہیں رہا۔ ہماری رائے تو یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ ان کے مذہب میں شامل ہو جائیں۔ اور اس طرح عزت حاصل کر لیں۔ چنانچہ یہ لوگ ایرانیوں سے الگ ہو گئے۔ سعدؓ کو جب اس کی اطلاع ہوئی۔ تو انھوں نے تحقیقِ حال کے لئے حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ کو ان کے پاس بھیجا۔ انھوں نے ان سے پوچھ گچھ کر کے حضرت سعدؓ کو آکر اس کی اطلاع دی۔ چنانچہ حضرت سعدؓ نے ان کو امان دیدی۔ اور وہ مسلمان ہو گئے۔ اور مدائن اور فتح جلولاء میں یہ لوگ حضرت سعدؓ کے ساتھ ہو کر شریکِ جنگ ہوئے۔ پھر وہاں سے واپس ہوئے۔ اور کوفہ میں مسلمانوں کے ساتھ آکر بس گئے[1]۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

لوگوں کے اسلام میں داخل ہونے کے مختلف اسباب ہوتے تھے۔ کچھ لوگ تو نیک نیتی اور سچائی کے ساتھ اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ کیونکہ اسلامی عقائد کی سادگی، اور ان کا سہل الفہم ہونا ان کے دلوں کو اپیل کرتا تھا۔ کچھ لوگ محض جزیہ سے بچنے کے لئے اسلام لے آتے تھے۔ کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ جو لوگ اپنے پرانے مذہب پر قائم رہیں گے۔ ان پر جزیہ لگا دیا جائے گا۔

---

[1] فتوح البلدان ص ۲۸۰۔ طبع یورپ۔

جائیں گے۔ ان سے جزیہ معاف کر دیا جائے گا۔ جزیہ سے بچنے کی خاطر جو لوگ مسلمان ہو رہے تھے۔ ان کی ہولناک ق گورنروں کو تشویش میں ڈال دیا تھا۔ چنانچہ حجاج ابن یوسف کے عاملوں نے حجاج کو لکھا کہ خراج کا انتظام درہم برہم ہے۔ ذمی لوگ دھڑا دھڑ مسلمان ہوتے جا رہے اور شہروں میں آکر بستے جا رہے ہیں۔ اس پر حجاج نے ایسے لوگوں سے ہونے کے باوجود جزیہ وصول کیا۔ چنانچہ بصرہ کے قراء اس زیادتی پر آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے[1] بعض لوگ محض لئے اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ کیونکہ اسلام ارباب حکومت کا دین تھا۔ اس دین کے ساتھ جس کی نسبت ہوتی تھی جاتا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے مذاہب حلقہ ہائے حکومت میں ناپسندیدہ اور مکروہ سمجھے جاتے تھے۔ اگرچہ کسی نے دینی شعائر کی ادائیگی سے روکا نہیں جاتا تھا۔ بلکہ انھیں اس کی پوری آزادی حاصل تھی۔ ان وجوہات میں اتنا ریجیئے، کہ انفرادی طور پر کچھ حکام ایسے بھی تھے جو ذمیوں کے بارے میں اسلام کی تعلیمات اور چشم پوشی کے احکام پر عمل نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کو بُری طرح ستاتے تھے۔ لوگ اس وجہ سے بھی اپنے مذہبوں کو چھوڑ کر اسلام میں نے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

ہمی اختلاط

امتزاج و اختلاط کا تیسرا بڑا سبب سکونتی مقامات میں اختلاط تھا۔ فتوحات کے بعد جو شہر مفتوح ہوئے۔ وہ فاتحین اور مفتوحین دونوں کا یکساں مسکن بنے۔ حرکت اجتماعیہ اور اقتصادیہ میں عربوں اور دونوں نے برابر کا حصہ لیا۔ ولہوسن (WELLHAUSEN) کا بیان ہے کہ کوفہ کی نصف سے زیادہ آبادی موالی (آزاد ں) پر مشتمل تھی۔ یہ موالی مختلف پیشے، حرفے اور تجارت کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تر لوگ اپنی جنس اور زبان کے اعتبار تھے۔ یہ لوگ کوفہ میں اسیران جنگ کی صورت میں لائے۔ اس کے بعد مسلمان ہو گئے۔ اور ان کے مالکوں یعنی عربوں نے دکر دیا۔ چنانچہ یہ عربوں کے موالی یعنی آزاد کردہ غلام تھے۔ اس طرح وہ آزاد تو ہو گئے۔ مگر اس کے بعد بھی انھیں اپنے مالکوں اور حفاظت کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یہ لوگ صلح اور جنگ دونوں صورتوں میں عربوں کے حاشیہ نشین اور ان کے متبعین ار ہوتے تھے۔ یہی حال باقی تمام شہروں کا تھا کہ ہر شہر میں عربی عنصر اور اجنبی عنصر پوری طرح خلط ملط ہو گئے تھے۔ ایران، مغرب غرضیکہ تمام ممالک میں یہی صورت تھی۔ حتیٰ کہ خود جزیرۂ عرب بھی اپنی آبادی کے اعتبار سے خالص عرب نہیں رہا وہ ہر قسم کے مسلمانوں کا ایک جزیرہ بن گیا تھا۔ مدینہ منورہ جو عظیم تر فتوحات کے عہد ـــــ یعنی حضرت عمرؓ کے عہد خلافت تھا۔ وہاں مختلف قوموں کے ایلچی اور سفیر آتے تھے۔ دیگر اقوام کے ضرورت مند لوگ حاضر ہوتے رہتے تھے۔ وہاں ی بھی لائے جاتے تھے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ کی یہ ہدایات اس بارے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی تھیں کہ مال غنیمت اور اسیران مفتوحہ علاقوں میں تقسیم نہ کیا جائے۔ بلکہ دار الخلافہ میں تمام چیزیں بھیجدی جائیں۔ اور یہاں آکر وہ تقسیم کی جائیں۔ جس کا کہ مدینہ منورہ اور اس کے آس پاس کا علاقہ غیر عربی عناصر سے پُر ہو چکا تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کی شہادت کی سازش

---

[1] ابن الاثیر ص۱۵۹ جلد ۴۔

بھی ان ایرانیوں نے ہی ترتیب دی تھی۔ جو مدینہ منورہ میں سکونت پذیر تھے۔ جس کو ابولؤلؤہ ایرانی نے عملی جامہ پہنایا تھا۔ اس اضافہ یہ بھی کر لیجئے کہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ دونوں ایسے شہر تھے۔ جہاں زمین کے ہر اطراف وجوانب سے حجاج اور زائرین جو اسلا داخل ہو چکے تھے۔ ہر سال آتے رہتے تھے۔ ان امور نے مل کر جزیرہ عرب کو تمام مسلمانوں کے درمیان ایک مقام مشترک بن جہاں مختلف عناصر یا ہم گر مختلط ہوتے تھے۔ اور اس کی حالت بھی اس سے قطعاً مختلف نہیں رہی تھی۔ جو دیگر مفتوحہ مما تھی۔ فرق صرف اتنا ہی تھا کہ جزیرہ عرب میں عربی عنصر کی آبادی ذرا زیادہ تھی۔ اور ممالک مفتوحہ میں غیر عربی ع آبادی زیادہ تھی۔

امتزاج واختلاط میں ان تمام اسباب وذرائع نے پورا پورا کام کیا۔ چنانچہ ایرانی اور رومی عادات، عربی عادات کے مختلط ہوئیں۔ ایرانی اور رومی قانون ان احکام کے ساتھ مختلط ہوا۔ جن کو قرآن وسنت نے بیان کیا تھا۔ ایرانی حِکَمْ اور فلسفہ کا عربی حِکَمْ کے ساتھ امتزاج ہوا۔ ایرانی اور رومی طرز حکومت کا عربی طرز حکومت کے ساتھ اختلاط ہوا۔ مختصر یہ ہے کہ اور نظم سیاسی واجتماعی کے تمام گوشے۔ حتیٰ کہ طبائع عقلیہ بھی بڑی حد تک اس امتزاج سے متاثر ہوتی چلی گئیں۔

چونکہ مفتوحہ اقوام مدنیت وحضارت کے لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ اور نظم اجتماعی کے اعتبار سے زیادہ قوی تھیں۔ ا اس کا طبعی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ ان کی مدنیت وحضارت اور نظم اجتماعی کی سیادت قائم ہو جائے۔ البتہ چونکہ عرب فاتح ہونے کی سے قومی عنصر کی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے اتنا ہی کیا کہ اس نظام میں اعتدال پیدا کر کے اسے ایسا بنا لیا جائے جو ان کی سے متفق ہو سکے۔ چنانچہ ممالک مفتوحہ میں اس نظام کی سیادت برقرار رہی جس کی پیروی فتح سے پہلے کی جاتی تھی۔ مثلاً د وغیرہ اسی حالت پر باقی رہا۔ جس پر وہ اب تک چلا آرہا تھا۔ حتیٰ کہ خود دفاتر کی زبان بھی عبدالملک بن مروان کے عہد تک وہی اس علاقہ میں فتح اسلامی سے پہلے ہوتی تھی۔ ہمارا موضوع یہاں اس نظم سیاسی اور اجتماعی کو بیان کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا موضوع عقلیہ کا بیان ہے۔ مگر حیاتِ عقلیہ کی حالت بھی بعینہٖ وہی کچھ تھی جو نظم اجتماعی اور سیاسی کی تھی۔ یہ امتزاج جو عرب او دیگر اجنبی اقوام میں برپا تھا۔ ایک قسم کا عملی تخلیط تھا۔ جس کے نتائج کچھ ہی زمانہ کے بعد برآمد ہو گئے۔

ان مفتوحہ اقوام میں سے بہت سے لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان کے اپنے حِکَمْ، امثال، شعر وادب کے ذ تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے لوگ بھی تھے۔ جن کے ہاں علوم مدوّن شکل میں موجود تھے۔ اور ان پر بڑی بڑی کتابیں تھیں علوم کی تدوین اور بحث وتحقیق کا سلیقہ تھا۔ جب یہ لوگ اسلام پر ثابت قدم ہو گئے اور انھیں سکون واطمینان ن تو انھوں نے اور ان کی اولادوں نے اپنے عملی مناہج کو جن سے وہ اور ان کے آباؤ اجداد مانوس چلے آرہے تھے۔ اسلام کرنا شروع کر دیا۔ جس کی وضاحت ہم آگے چل کر کریں گے۔

انتہا یہ ہے کہ اسلامی عقائد بھی اس امتزاج کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ کیا اس کا گمان بھی کیا جا سکتا

رانی، شامی، نصرانی۔ رومی یا قبطی جب اسلام میں داخل ہوتا ہوگا تو وہ تمام عقاید جو آبا و اجداد سے صدیوں سے ان میں
لے آ رہے تھے۔ یکبارگی مٹ جاتے ہوں گے۔ اور اس نے اسلام کو اسی طرح سمجھ لیا ہوگا۔ جیسا کہ اسلام اپنی تعلیمات سے[1] سے
چاہتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ اس کا امکان ہی نہیں۔ علم النفس اسے تسلیم نہیں کرتا۔ ایرانی کے ذہن میں الٰہ کا جو تصور تھا۔ وہ
رسے قطعاً مختلف تھا جو ایک رومی، نصرانی کے ذہن میں ہوتا تھا۔ اور یہ دونوں تصورات اس تصور سے قطعاً جدا گانہ
ے جو ایک مصری نصرانی کے ذہن میں ہوتا تھا۔ اسی طرح وہ الفاظ جو مختلف ادیان میں مستعمل ہوتے آئے ہیں۔ جیسے جہنم،
بلیس۔ ملائکہ۔ آخرت۔ نبی وغیرہ۔ ان کے معنی ہر مذہبی فرقہ کے نزدیک ان معنوں سے مختلف ہوتے تھے۔ جو دوسرے
وں کے نزدیک ان کے معنی ہوتے تھے۔ لہٰذا یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ دوسری قوموں کے جو لوگ اسلام میں داخل
ے۔ انھوں نے ان الفاظ کو بالکلیہ اسی طرح سمجھ لیا تھا۔ جس طرح انھیں عربوں نے سمجھا تھا۔ حتیٰ کہ ان میں سے جو لوگ
ے ساتھ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ انھوں نے بھی اس قسم کی چیزوں کو اپنی پرانی دینی تقلیدات کے ساتھ آمیز کر کے
۔ بلکہ قرآن کریم کے ان الفاظ کو اپنے ان الفاظ کے قریب کر کے ہی سمجھا ہوگا۔ جو خود ان کے پرانے ادیان میں مستعمل
کے شواہد بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً ازدی نے اپنی کتاب فتوح الشام میں بیان کیا ہے کہ شام کے ایک آدمی نے دوسرے
ناہدہ کیا کہ وہ اس کی بکریاں چرا دیا کرے گا۔ جس کا معاوضہ یہ ہوگا کہ بکری کا مالک اپنی بیوی کو رات کے وقت اس
بدیا کرے گا کہ وہ اس کے ساتھ شب باشی کرے۔ حضرت عمرؓ نے ان دونوں آدمیوں کو طلب کیا۔ تو ان دونوں نے
۔ انھیں اس امر کے حرام ہونے کا کوئی علم ہی نہیں تھا — یا مثلاً ابن عبدربہ نے عقد الفرید میں بیان کیا ہے کہ دین کے
ن قدر تشدد موالی کے اندر نظر آتا تھا۔ بادیہ نشین عربوں میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں تھا[1]

م میں ان قوموں کے اثرات پہلی صدی ہجری کے آخر میں نظر آنے لگے تھے۔ جب کہ مختلف مذاہب کا ظہور ہونے لگا تھا۔
ل کے ساتھ آئندہ بیان کریں گے۔ شاید یہی سبب تھا جس کی وجہ سے حضرت عمرؓ ان فتوحات کے حاصل ہونے پر خوفزدہ
حنیفہ دینوری نے اپنی کتاب "الاخبار الطوال" میں لکھا ہے کہ "جنگ جلولاء میں مسلمانوں کو اتنا مال غنیمت اور اسیران
ے کہ اس سے پہلے کبھی ہاتھ نہیں آئے تھے۔ اس جنگ میں شرفاء ایران کی بہت سی لڑکیاں بھی گرفتار ہو کر آئی تھیں۔
نا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ خدایا میں جلولاء کی گرفتار شدہ عورتوں سے تیری
ں — اس کے بعد وہ ان عورتوں کے بچے ہی تو تھے جو جنگ صفین میں صف آرا تھے۔" صحیح ہے انھوں نے ضرور
مانگی ہوگی۔ اور انھیں ان سے بلکہ تمام موالی اور ان کی اولاد سے پناہ مانگنا ہی چاہیئے تھی۔ کیونکہ ان لوگوں کی
یت تھی وہ عربی عصبیت سے ایک جداگانہ بلکہ مخالف عصبیت تھی۔ ان کی اپنی دینی تقلیدات تھیں۔ جن کی طرف
ضروری تھا۔ اور اس طرح ان کی راہ اسلام کے عربی اور سادہ رجحانات کے خلاف ہی ہو سکتی تھی۔

فرید ص ۹۱-۹۰۔ ۲۵۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ امتزاج نہایت ہی قوی اور شدید قسم کا امتزاج تھا۔ موالی اور دیگر اجنبی اقوام کے اثرات ہر شعبہ میں چھائے ہوئے تھے۔ اب اجتماعی مسائل میں یہاں ویسی ہی جنگ برپا تھی جیسی اب سے پہلے فوجوں کے اجسا چکی تھی۔ لیکن مورخین نے اس جنگ کی تفاصیل بیان نہیں کیں۔ حالانکہ ان کو بیان کر دینا زیادہ ضروری تھا۔ عربی دیگر زبانوں میں جنگ تھی۔ عربی آرزوئیں اور دوسری قوم کی آرزوؤں میں جنگ تھی۔ عرب کے سادہ نظم اجتماعی اور دوسر نظم اجتماعی میں جنگ تھی۔ جسمانی جنگیں اگرچہ ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمان رضی اللہ عنہم کی فتوحات کے ساتھ تقریباً ختم ہو چکی یہ دوسری جنگیں اس کے بعد بھی عرصہ دراز تک قائم رہیں۔ اسلامی مملکت ان جنگوں کے لئے ایک وسیع میدان بن گ میں مختلف آرزوئیں ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبان تھیں۔ ایرانی لوگ اپنی پرانی مملکت کی طرف جھکا ؤر سمجھتے تھے کہ وہ عربوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ رومیوں کا بھی یہی حال تھا۔ مغرب اور مصر استقلال و آزادی کے ایرانیوں کے ہاں ایک خاص نظام تھا۔ رومیوں کا ان سے الگ نظام تھا۔ رومی قانون رومی مستعمرات میں چل رہا تھا۔ اور مملکت ایران میں رائج تھا۔ اسلام جو قانون دیتا تھا۔ وہ بعض صورتوں میں ان سے موافق ہوتا تھا۔ اور بعض صورتوں میں ان جاتا تھا۔ ایرانیوں میں کچھ مجوسی تھے جو مجوسی ہی رہے۔ اور کچھ ان میں سے مسلمان ہو گئے۔ روم میں کچھ نصرانی تھے۔ اور کچھ میں سے بھی مسلمان ہو چکے تھے۔ مصر میں نصرانی لوگ تھے۔ جن میں سے کچھ لوگ مسلمان بھی ہو گئے تھے۔ ان تمام ملکوں اور میں یہودی بھی آباد تھے۔ جن میں کچھ یہودی مسلمان ہو گئے تھے۔ زبانوں میں سے اسلامی مملکت میں عربی، فارسی، قبطی اور عبرانی سب زبانوں کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ تمام رجحانات اور زبانیں مسلسل جنگ میں مبتلا تھیں۔ اور مملکت اسلامیہ میدان جنگ تھا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم تک اس جنگ کی تفصیلات میں سے قدر قلیل ہی پہنچ سکا ہے۔ امت اسلامیہ اب عربیہ نہیں رہی تھی۔ جس کی زبان ایک، دین ایک، رجحان ایک اور خیال ایک تھا۔ جیسا کہ رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک آتا تھا۔ بلکہ امت اسلامیہ اب تمام امتوں کا۔ تمام رجحانات اور تمام زبانوں کا مجموعہ تھی۔ جو آپس میں ایک دوسرے سے بر تھیں۔ اس جنگ کا نتیجہ فیصلہ کن نہیں تھا۔ کبھی ایرانیوں کو فتح ہوتی تھی۔ کبھی عربوں کو فتح ہوتی تھی۔ اور کبھی رو

واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ عربوں کو نظم سیاسی اور اجتماعی اور ان کے متعلقات مثل فلسفہ اور علوم وغیرہ میں شکست فاش لیکن انھوں نے دو بڑی چیزوں میں فتح حاصل کر لی۔ یہ دو بڑی چیزیں زبان اور دین تھا۔ ان کی زبان ان تمام چھا گئی۔ اور اس کے مقابلہ میں ان ممالک کی اصلی زبانوں کو شکست فاش نصیب ہوئی۔ عربی زبان ہی سیاست کی علم کی زبان قرار پا گئی۔ عربوں کی یہ فتحمندی زیادہ تر ان ممالک میں آج تک ان کی حلیف بنی چلی آ رہی ہے۔ یہی حال کہ دین اسلام ان تمام ممالک پر چھا گیا۔ اور وہاں کی آبادیاں مسلمان ہو چلی گئیں۔ ان ممالک میں بہت ہی کم لوگ ایسے با جو اپنے اصلی دین پر قائم رہے ہوں —— ان دونوں عناصر یعنی زبان اور دین کی فتحمندی کے باوجود —— یہ بھی حقیقت واقعہ ہے کہ باہمی جنگ کے اثنا میں دین اور زبان دونوں ہی متصادم زبانوں اور ادیان سے متاثر ہ

یں وہ سلیقہ ہی باقی نہیں رہا۔ اور اس میں غلطیاں عام ہوگئیں حتےٰ کہ ایسے قوانین کی ضرورت پڑگئی جو اس میں ضبط اور
ئم کرسکیں۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ عبداللہ بن الاتہم کا گذر تو الی میں سے چند لوگوں پر ہوا جو علم نحو کا تذکرہ کر لیے تھے
للہ بن الاتہم نے کہا کہ اب تم زبان کو ٹھیک کر لیے ہو۔ حالانکہ سب سے پہلے تم نے ہی اسے خراب بھی کیا تھا۔ ابوعبیدہ
ر کاش عبداللہ ابن الاتہم نے صفوان، خاقان اور مومل بن خاقان کا غلط تلفظ سنا ہوتا[۱]: ایسے ہی عربی زبان پر
ے عجمی الفاظ، عجمی ترکیبیں۔ عجمی خیال اور عجمی مضامین غالب آتے گئے۔ بالکل یہی حالت دین کے بارے میں بھی کہی
ہے کہ وہ بظاہر اگرچہ متمدن ہوگیا تھا۔ لیکن۔ وہ دیگر ادیان سے متاثر ہونے سے نہ بچ سکا۔ اور مسلمانوں میں متعدد
بن گئے۔ اور نئے نئے مذہبوں کی داغ بیل پڑگئی۔ خود قرآن کریم کی تفسیر ابتدا، خلقت وغیرہ کے ان قصوں سے کی جانے
جو دوسری مذہبی کتابوں میں وارد ہوئے تھے[۲] یہ فرقے کبھی کبھی باتوں کے ذریعہ سے جنگ کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی سیج پچ
ں کے ساتھ نبرد آزما ہو جاتے تھے۔

عقد الفرید جلد ۲۔ [۲] لیکن اس تمام اختلاط و امتزاج اور تخالف و تزاحم میں ایک چیز تھی۔ جو اپنی اصلی حالت پر باقی رہی۔ اور وہ تھے
کے الفاظ جو آج تک اپنی اصلی شکل پر باقی ہیں۔ لہذا آج اس دین کو جسے رسول اللہؐ نے دنیا کو دیا تھا۔ اپنے اصلی رنگ میں سمجھنے کا
ا طریقہ اور ذریعہ ہے۔ اور وہ یہ کہ دین کا سرچشمہ خالص قرآن کو قرار دیا جائے۔ اور قرآن کو خود قرآن ہی سے سمجھا جائے۔

(طلوع اسلام)

حقائق و عبر

۱۔ سنت خلفائے راشدین

آپ قریب آٹھ سال سے مسلسل طلوع اسلام اور جماعت اسلامی کی آویزش دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ اس میں آپ نے ایک بنیادی چیز ملاحظہ کی ہوگی۔ کہ حدیث و سنت کے متعلق جماعت اسلامی والے بھی کم و بیش وہی عقائد رکھتے ہیں۔ جنھیں طلوع اسلام پیش کرتا ہے۔ لیکن جماعت اسلامی والے اپنی مصلحتوں کے مطابق رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ اور موقعہ اور محل کے لحاظ سے مختلف باتیں کہتے رہتے ہیں۔ اپنے آپ کو حامی حدیث اور متبع سنت اور طلوع اسلام کو منکر حدیث مشہور کرتے ہیں۔ اور ان کی یہی وہ روش ہے۔ جس کی ہم شدت سے مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً طلوع اسلام کا مسلک یہ ہے کہ قرآنی اصولوں کی جن جزئیات کو رسول اللہؐ نے متعین فرمایا تھا۔ اگر وہ نظام یہ دیکھے کہ تغیر حالات سے ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ تو وہ ایسی تبدیلی کرسکتا ہے۔ جماعت اسلامی والے اس کو انکار حدیث اور انکار سنت قرار دے کر اپنی تحریروں اور تقریروں میں طلوع اسلام کو گردن زدنی ٹہراتے ہیں۔ لیکن جب حرفاً یہی کچھ ان کے امیر کہتے ہیں۔ تو ان کے خلاف ایک لفظ بھی کسی کی زبان پر نہیں آتا۔ اسی طرح جب طلوع اسلام نے کہا کہ اس باب میں جو پوزیشن حضرات خلفائے راشدینؓ کی تھی۔ جب اس قسم کا اسلامی نظام پھر قائم ہوگا۔ تو اس نظام کی بھی وہی حیثیت ہوگی اور اس مرکز کے فیصلے "سنت خلفائے راشدین" میں شامل ہوں گے۔ اور ان کی اتباع سنت رسول اللہ کی اتباع ہوگی تو اس پر بھی جماعت اسلامی نے شور مچا دیا کہ طلوع اسلام فتنہ پرداز ہے۔ اور عام انسانوں کو خلفائے راشدین کا ہم پلہ بناتا ہے۔ چنانچہ امین احسن صاحب اصلاحی نے یہاں تک لکھ دیا کہ

> آپ کو معلوم ہے کہ اللہ تعالے نے ہم سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ ہم ابوبکر صدیقؓ اور عمرؓ کی حکومت کی طرح ایک حکومت قائم کردیں۔ نہ بندوں کو اس بات کی طاقت حاصل ہے۔ نہ خدا نے اس کی تکلیف دی ہے۔ (چراغ راہ مئی ۱۹۵۳ء)

اب یہی امین احسن صاحب اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ خلفائے راشدین میں کون کون شامل ہیں۔ ترجمان بابت فروری ۱۹۵۶ء میں تحریر فرماتے ہیں۔

> اس حدیث میں دیکھ لیجئے۔ "سنت الخلفاء الراشدین" کے الفاظ صاف موجود ہیں۔ بلکہ راشدین

کے بعد "مہدیین" کا اضافہ بھی ہے۔ اس میں نہایت واضح الفاظ میں حضور نے اپنی سنت کے ساتھ خلفائے راشدین کی سنت کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ اور اپنی سنت کی طرح اس پر قائم رہنے کی وصیت بھی فرمائی ہے۔۔۔ اس لفظ کے اندر وہ تمام خلفائے راشدین داخل ہیں۔ جو آپ کی امت کے اندر پیدا ہونے۔ <u>یا آئندہ پیدا ہوں گے</u>۔ اور حکومت کے فرائض صحیح اسلامی طریق پر انجام دیں گے۔

۔۔۔ کر لکھتے ہیں۔

چنانچہ "تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ اس (خلافت علیٰ منہاج نبوت) کے بعد اچھے حکمراں بھی پیدا ہوئے۔ اور برے بھی پیدا ہوئے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ اب یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ آئندہ کبھی اس دنیا میں خلافت علیٰ منہاج نبوت کا دور نہیں آئے گا۔ نہ نقل میں ہمیں کوئی چیز ایسی ملتی ہے جو اس کا دروازہ بند کرتی ہو۔ اور نہ عقلاً اس کا آنا کسی طرح محال اور مستبعد قرار دیا جا سکتا ہے۔"

۔۔۔ام نے بھی یہی کہا تھا کہ خلافت علیٰ منہاج نبوت اب بھی قائم ہو سکتی ہے۔ اور جب ایسی خلافت قائم ہوئی تو اس کے فیصلے ۔۔۔ل اللہ اور سنت خلفائے راشدین میں شامل ہو ۔۔۔ئیں گے۔ لیکن طلوع اسلام اس کہنے کی وجہ سے منکر حدیث اور مرتد ۔۔۔ اور امین احسن صاحب

عالم، بلند نظر اور متبحر عالم جس کی نگاہ خاک کے ذروں کا بھی جائزہ لیتی ہے اور مہ و انجم کی گذرگاہوں کا بھی سفر کرتی ہے۔ دس بیس نہیں ہزاروں راتیں صرف قرآن کریم کے مطالعہ میں بسر کی ہیں۔ جس کی ذات قرآنی علوم کے لئے قابل وثوق سند ہے۔ قرآن کا مفسر اور حدیث و فقہ میں جس کی ژرف نگاہی مسلم۔ (فاران کراچی جون ۱۹۵۳ء)

۔۔۔م اور لونڈیاں

محترم نعیم صدیقی صاحب چراغ راہ بابت مارچ ۱۹۵۶ء میں مسٹر سہروردی پر تنقید کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

اس ذہن میں اسلام کی جو ڈراؤنی تصویر سنی سنائی باتوں اور مستشرقین کی تحقیقاتوں نے بھر دی ہے۔ وہ ان اجزا پر مشتمل ہے (۱) اسلامی ریاست ہوگی تو جنگی قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنایا جائے گا......

۔۔۔ے اندازہ ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کو اب اپنی حکومت قائم کرنے کے امکانات قریب تر نظر آرہے ہیں۔ (طلوع اسلام)

یعنی جنگی قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنانا حقیقی اسلام کا جزو نہیں بلکہ مستشرقین کی تحقیق ہے اور سنی سنائی باتوں
ہم محترم صدیقی صاحب کو ان کی اس حق گوئی پر مبارک باد دیتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان سے یہ بھی پوچھنا چاہتے
اب ان کا اپنے امیر سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے متعلق کیا ارشاد ہے۔ جنہوں نے (طلوع اسلام کی مخالفت میں) صفحا
صفحات اس "حقیقت" کو ثابت کرنے میں لکھا رکھے تھے (اور وہ اب ان کی مستقل تصنیف کا جزو ہیں۔ اور ان کی تفسیر
شامل) کہ اسلامی حکومت میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنایا جائے گا۔: کیا ہم صدیقی صاحب سے اس کی تو
کہ وہ اپنے امیر کے خلاف بھی حق گوئی کا ثبوت دیں گے؟ لیکن یہ مشکل ہے۔

۳۔ اب تو آپ سمجھ گئے؟

جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے دورِ ملوکیت میں آہستہ آہستہ بہت سی غیر اسلامی باتیں
میں داخل ہو گئیں۔ تو یہ سوال اکثر ذہنوں کو پریشان کر دیتا ہے کہ جب اس زما
ہمارے اسلاف میں اتنے اتنے بڑے علماء اور جلیل القدر ائمہ موجود تھے۔ تو انہوں نے ان باتوں کے خلاف لب کشائی کیوں نہ
یہ سوال تاریخ سے متعلق ہے۔ اس لئے اس کی بابت حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا کس طرح ہوا۔ لیکن جو کچھ اب ہمارے
ہو رہا ہے۔ اس سے تو ہم جان سکتے ہیں کہ بڑے بڑے علماء اور مجتہدین کی موجودگی میں کس طرح وہ باتیں عین کتاب و سنت
کے مطابق تسلیم کر لی جاتی ہیں۔ جنہیں یہ حضرات اس سے پہلے خود خلافِ شریعت قرار دیا کرتے تھے۔ مثلاً یہ حقیقت کسی سے
نہیں کہ پاکستان کے تمام علماء اس پر متفق تھے کہ (۱) اسلام میں جنگی قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنایا جا سکتا ہے اور (۲) اگر
مسلمان اپنا مذہب چھوڑ دے تو اس کی سزا موت ہے۔ وہ ان دونوں چیزوں کو کتاب و سنت کی رو سے صحیح ثابت کرنے میں ایڑی
کا زور لگاتے تھے۔ اور جو شخص ان کی صحت میں شبہ کرتا۔ وہ اسے دائرۂ اسلام سے خارج بتلاتے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا!۔

پاکستان میں نیا دستور بنا جس میں اس بنیادی اصول کو تسلیم کیا گیا کہ اس میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف
اور اس دستور میں یہ دونوں شقیں رکھی گئی ہیں کہ (۱) کسی کو غلام اور لونڈی نہیں بنایا جائے گا۔ اور (۲) ہر شخص
مذہب کی آزادی ہوگی۔

اور پاکستان کے تمام علماء کرام نے اس آئین کو اسلامی قرار دے کر حکومت کو مبارکباد کے تار بھیجے۔ اور ان میں سے کسی
نے (یا در کھیے، کسی ایک نے بھی) اتنا نہیں کہا کہ یہ دونوں شقیں خلافِ شریعت ہیں۔۔

ہمارے بعد یہی علماء کرام (آنے والوں کے نزدیک) "سلفِ صالحین" قرار پائیں گے۔ اور ان کے نام سلام و رحمت
لئے جائیں گے۔ اور اس بات کو بطور سند اور دلیل پیش کیا جائے گا۔ کہ اگر یہ چیزیں خلافِ شریعت ہوتیں تو اس زمانے
ایسے جلیل القدر علماء کرام خاموش کس طرح رہتے۔ اور جب کوئی شخص مودودی صاحب کی وہ کتابیں پیش کرے گا۔ جن
انہوں نے ان دونوں چیزوں کو کتاب و سنت کے خلاف ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ تو گرم رو عقیدت مند فو
(باقی ص

نقد ونظر

آپ نے میلوں ٹھیلوں میں بھگدڑ مچتے تو دیکھی ہوگی۔ لیکن اس کا خیال نہیں کیا ہوگا کہ وہ مچتی کیسے ہے! اس کا طریقہ
ان ہے۔ ایک شخص بھاگنا شروع کر دیتا ہے۔ بھاگتا چلا جاتا ہے۔ اور چلاتا جاتا ہے کہ "آگئے آگئے"۔ اس کے پیچھا در
بھاگنا اور "آگئے آگئے" کا شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف سے لوگ بھاگنا شروع کر دیتے
ور اس طرح بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ کوئی کسی سے نہیں پوچھتا (نہ ہی خود کھڑے ہو کر سوچتا ہے) کہ لوگ کیوں بھاگ رہے
ن آگئے ہیں؟ کیا ہو گیا ہے۔ یہ پریشانی کیوں ہے؟

یہ بھگدڑ جہلا ہیں مچا کرتی تھی۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ اب ہمارے علمی اور مذہبی طبقوں میں بھی اس قسم کی بھگدڑ مچنا شروع
ہے۔ بات یوں ہوئی کہ جب جماعت اسلامی والوں نے یہاں اپنا مقدس جال پھیلانا شروع کیا تو انھیں سب سے زیدہ
طلوع اسلام کی طرف سے محسوس ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ ان کے عزائم سے باخبر ہے۔ اور خریدا جا نہیں سکتا۔ اس لئے
کی نقاب دری میں ہر ممکن کوشش کرے گا۔ اس کی روک تھام کے لئے آسان طریقہ یہی ہو سکتا تھا کہ اس کے خلاف
ت تراشے جائیں۔ اور اسے بدنام کر دیا جائے۔ چنانچہ "غیر مذہبی" طبقہ میں تو انھوں نے مشہور کرنا شروع کر دیا کہ طلوع اسلام
ی کا پرچہ ہے۔ اور مذہبی طبقہ میں یہ مشہور کر دیا کہ یہ "منکر حدیث" ہے۔ یہ دوسرا حربہ چونکہ جذباتی تھا۔ اس لئے زیادہ موثر
ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے بھگدڑ مچ گئی۔ "طلوع اسلام منکر حدیث ہے"۔ "پرویز منکر شان رسالت ہے۔ یہ کہتے ہیں
از نہ پڑھو۔ ان کے اسلام میں تو ہی دن کے روزے فرض ہیں۔ ان کے نزدیک سیرت رسول اللہؐ کی کوئی حیثیت ہی
ور تھا جو چاروں طرف سے اٹھنا شروع ہو گیا۔ مضامین لکھے جا رہے ہیں۔ پمفلٹ شائع ہو رہے ہیں۔ کتابوں پر کتابیں
چلی آ رہی ہیں (تجارت کی فروغ کے لئے یہ طریقہ بڑا کامیاب ہوتا ہے) لیکن کوئی اللہ کا بندہ یہ کچھ کہنے والوں سے
پوچھتا (نہ ہی خود کھڑے ہو کر سوچنے کی زحمت گوارا کرتا ہے) کہ طلوع اسلام نے یہ کچھ کہاں لکھا ہے۔ پرویز نے ایسا
ا ہے؟ بھگدڑ میں کون اس قسم کے سوال کرتا، اور کون سوچنے کھڑا ہوتا ہے!

ام کا حدیث نمبر | اس بھگدڑی ہراسانی کا تازہ شاہکار، مجلہ الاعتصام کا حدیث نمبر ہے جو بڑے سائز اور بڑی ضخامت سے شائع ہوا ہے۔ الاعتصام جمعیت اہل حدیث کا ترجمان

ہے جنھیں سنت رسول اللہؐ کی شدت کے ساتھ اتباع کا دعویٰ ہے۔ ہم ارکان الاعتصام سے باادب دریافت کرنا چاہ
کیا سنت رسول اللہؐ نے انھیں یہی سکھایا ہے کہ کسی کے خلاف الزام عائد کرنے کے لئے محض سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیا
اس کے ثبوت میں کسی سند کی ضرورت نہ سمجھی جائے۔ حتیٰ کہ جرم کا اعلان کرنے اور سزا کا فیصلہ سنانے سے پہلے مجرم کا بیا
بھی سامنے نہ رکھا جائے؟ سنت رسول اللہؐ کے متعلق پرویز صاحب اور ادارۂ طلوع اسلام کا جو مسلک ہے۔ اسے
جامع مضمون میں قلمبند کر کے پمفلٹ کی شکل میں شائع کر دیا تھا۔ اور اس پمفلٹ کی ایک کاپی الاعتصام کی خدمت
کر گذارش کی تھی کہ آپ اسے اپنے ہاں شائع فرمادیں۔ اور اس میں جو باتیں غلط نظر آئیں۔ اس پر تنقید فرمائیں۔ اگر
انھوں نے اپنے ہاں شائع نہیں کیا (حتیٰ کہ اس کا ذکر تک بھی نہیں کیا)۔ اور طلوع اسلام کی طرف ایسی باتیں منسوب
ہیں جو اس نے کبھی نہیں کہیں۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

ہماری دوسری درخواست ارباب الاعتصام سے یہ ہے کہ علمی گفتگو میں متانت اور ثقاہت کو ہاتھ سے نہیں چھ
چاہیئے۔ اگر آپ کسی کو غلطی پر سمجھتے ہیں۔ تو اسے اس کی غلطی پر متنبہ کیجئے۔ گالیاں تو نہ دیجئے۔

ضرورتِ حدیث

اس سلسلہ میں احمدیہ انجمن اشاعت اسلام، لاہور نے، اپنے امیر محترم صدر الدین ص
کی کتاب بعنوان "ضرورتِ حدیث" شائع کی ہے۔ جس کا انداز وہی ہے۔ جو ان
کے دوسرے لٹریچر کا ہوتا ہے۔ ہم اس کتاب کا تعارف نسبتاً تفصیل سے کرانا چاہتے ہیں۔
کتاب کے شروع میں لکھا ہے۔

> ان کا (یعنی ان کے خیال میں "منکرین حدیث" کا) عقیدہ ہے کہ حضور نبی کریمؐ کی اطاعت
> بحیثیت صدر ریاست یا بطور مرکز ملت تھی۔ اس لئے اب آپؐ کی جگہ مرکز ملت کی اطاعت کرنا یا
> اسمبلی کی اطاعت کرنا مسلمانوں کا فرض ہو گیا ہے۔ اور اسی کو اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کی اطاعت
> یقین کیا جائے گا۔ یعنی خدا اور رسول سے مراد وہ مرکز ملت ہو گا۔ جو قوانین نافذ کیا کرے گا۔

محترم صدر الدین صاحب کی خدمت میں گذارش ہے کہ آپ نے ہمارے مسلک کو صحیح طور پر بیان نہیں کیا۔ ہمارا
ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت اس نظام کی رُو سے ہوتی تھی۔ جسے رسول اللہؐ نے متشکل فرمایا تھا۔ حضورؐ کی وفا
بعد اس نظام کو حضورؐ کے خلفاءؓ (جانشینوں) نے قائم رکھا۔ اس لئے ان کی اطاعت "بمنزلہ" خدا اور رسول کی
کی تھی۔ یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہا۔ اب اگر اسی قسم کا نظام پھر سے متشکل ہو جائے جیسے رسول اللہؐ نے
تھا۔ یعنی قرآنی احکام کو عملی منہاج نبوت نافذ کرنے والا نظام تو خدا اور رسول کی اطاعت کا عملی مفہوم اس نظ
ہو گا یہ خیال "منکرین حدیث" کا نہیں بلکہ خود رسول اللہؐ کی ان احادیث سے بھی یہی ثابت ہے۔ جنھیں ا

وجہ سے صحیح قرار دیا جا سکتا ہے چنانچہ مشکوٰۃ (کتاب الامارۃ والقضاء) میں (بحوالہ بخاری اور مسلم) یہ حدیث موجود ہے کہ

رسول اللہ نے فرمایا کہ جس شخص نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔ اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی۔ اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

لم کے حوالے سے) یہ حدیث بھی کہ

رسول اللہ نے فرمایا کہ اگر تمہارے اوپر کسی نکٹے غلام کو حاکم بنایا جائے۔ اور وہ تم پر کتاب اللہ کے مطابق حکمرانی کرے تو تم اس کی اطاعت کرو۔ اور اس کا حکم مانو۔

سلام بھی یہی کہتا ہے۔ اور آپ یہ سنکر حیران ہوں گے کہ خود محترم مصنف کا بھی یہی عقیدہ ہے۔ چنانچہ آپ صفحہ ۲۴۹ مانتے ہیں۔

حضور نبی کریم نے حکام وقت کی فرمانبرداری کرنے پر زور دیا ہے۔ اور امیر کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ لیکن جب حاکم وقت یا امیر یا خلیفہ احکام الٰہی سے انحراف کرے تو اس کے خلاف احتجاج کرنا بھی نہایت ہی ضروری قرار دیا۔

سلام بھی یہی کہتا ہے کہ اطاعت اسی نظام کی کی جائے گی۔ جو امت کو احکام الٰہی کے مطابق چلائے گا۔ اور یہ اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت کے ہوگی۔

س کے بعد محترم مصنف فرماتے ہیں۔

مذکورہ بالا اعتقادات کے علاوہ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جب حضورؐ نے قرآنی حکومت کو متشکل فرمایا تو حضور کے سامنے صرف عربوں کی قوم تھی۔ اور اس قوم کو مدنظر رکھتے ہوئے حضور نے قوانین مرتب کئے تھے۔ لہٰذا ان قوانین کو عمومیت کا رنگ نہیں دیا جا سکتا۔ پرویز صاحب نے اپنے اس خیال کی تائید میں اپنے پیرو مرشد علامہ اقبال کی تحریر پیش کی ہے۔ علامہ صاحب لکھتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے سامنے ان کی اپنی قوم کے عادات و خصائل تھے۔ اور ان ہی کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضور نے قرآن کے اصولوں کی تفسیر فرمائی تھی۔ اور اپنے زمانے ہی کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ نے قرآنی اصولوں کی تفصیلات کو مرتب فرمایا تھا۔ . . . . اس لئے اگر آج یہ ثابت بھی ہو جائے کہ فلاں حدیث یقینی طور پر صحیح ہے۔ تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ رسول اللہ نے اپنے زمانے میں اس طرح عمل کیا تھا۔

انہ صاحب مدت ہوئی پیری اور مرشدی کے چنگل سے آزادی حاصل کر چکے ہیں۔ وہ اللہ کے سوا کسی کو مرشد نہیں مانتے۔ یہی (طلوع اسلام)

> لیکن بعد میں کسی وقت اگر مرکز ملت یہ سمجھے کہ اس حدیث میں ردوبدل کی ضرورت ہے تو اس میں وہ ردوبدل کر سکے گا۔ اور اسے حق ہوگا کہ وہ قرآنی اصولوں کی بنا پر ضروری جزئیات خود مرتب کرے۔ جس طرح رسول اللہؐ نے اپنے ماحول اور اپنے زمانے کی ضروریات کے پیش نظر ان اصولوں کی جزئیات مرتب فرمائی تھیں۔ یہ خیالات بالبداہت غیر معقول ہیں اور تعلیمات قرآنیہ اور دنیائے اسلامیہ کے مسلمہ عقائد کے خلاف ہیں۔

آپ نے تنقید ملاحظہ فرمائی؟ "یہ خیالات بالبداہت غیر معقول ہیں"۔ بتلایئے! اس دلیل کا کوئی کیا جواب دے۔

"تعلیمات قرآنیہ کے خلاف ہیں"۔ اس کے لئے قرآن کی سند کی ضرورت ہے۔

"دنیائے اسلام کے مسلمہ عقائد کے خلاف ہیں"۔ محترم مصنف کو جوش مخالفت میں یہ یاد نہیں رہا کہ یہ دلیل خود ان کے خلاف جاتی ہے۔ اگر اس بات کو بطور اصول مان لیا جائے کہ جو بات دنیائے اسلام کے مسلمہ عقیدہ کے خلاف ہو۔ وہ غیر معقول ہوتی ہے کہ اس کا کیا جواب ہے کہ آج (بجز مرزائی حضرات کے) دنیا کے تمام مسلمانوں کا مسلمہ عقیدہ ہے کہ مرزا احمد صاحب اپنے دعوے میں جھوٹے اور مفتری علی اللہ تھے۔

اب اس دعوے کی دلیل ملاحظہ ہو۔ آپ فرماتے ہیں۔

> منکرین حدیث یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ چودہ سو سال سے مسلمانوں کے دلوں میں جو عشق رسول کریمؐ کے متعلق اور حضورؐ کے ارشادات کے متعلق تمکن ہو چکا ہے۔ وہ بے بنیاد ہے اور اسلام کی حقیقت جو ائمہ محدثین نے سمجھی تھی۔ اور جنہوں نے بخاری و مسلم و ابن ماجہ و ابو داؤد و ترمذی و موطا و نسائی ایسی بے نظیر کتابیں نہایت محنت و مشقت اور اخلاص کے ساتھ تیار کر کے دین کی ترویج کی تھی۔ ان کی وہ ساری کی ساری محنت عبث ہے۔ اور ائمہ اربعہ یعنی امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبل کی تمام عمر کی محنت محض بیکار ہے۔ اور ان کے علم و فضل اور تقویٰ کی قطعاً کوئی قدر و منزلت باقی نہیں ہے۔ اور اس طرح سے وہ عظیم الشان تفاسیر جن کی وجہ سے قرآن کریم کے معانی و معارف اسلامی دنیا پر روشن ہوئے۔ وہ سب ناقابل اعتماد ہیں کیونکہ ان کی بنیاد بھی علم حدیث پر ہے۔ اور وہ شروح جو جلیل القدر علماء نے کتب احادیث کے معانی واضح کرنے کے لئے لکھی تھیں۔ وہ قابل اعتبار نہیں ہیں۔ نیز یہ کہ مصر نے جو صدیوں سے اسلامی کتب کی اشاعت پر کمر باندھ رکھی ہے۔ وہ بے سود کام ہے۔

دلیل آپ نے ملاحظہ فرمالی! کیا اسے اس دعوے کے ساتھ کوئی ربط اور تعلق ہے۔ جس کی تردید میں اسے پیش کیا گیا ہے! ہم طویل عبارت کو اس لئے نقل کو بیاہے کہ وہ لوگ جو یہ کہا کرتے ہیں کہ احمدی حضرات (بالخصوص لاہوری) جو مشرقی اور مغربی علوم

کتے ہیں۔ اور یورپ جاکر تبلیغ اسلام کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ اور مسلک غلط کس طرح ہو سکتا ہے۔ وہ بچشم خویش دیکھ لیں
راست کے پاس اپنے دعاوی کے دلائل کس قسم کے ہوتے ہیں۔

ں عقیدے کے متعلق محترم مصنف نے لکھا ہے کہ "اسے پرویز کے پیرو مرشد اقبال نے پیش کیا ہے" اور جیسے وہ بالبداہت
یہ تعلیمات قرآنیہ اور دنیائے اسلام کے مسلمہ عقائد کے خلاف؛ اور نہایت ضرر رساں۔ اور نہایت ہی دل آزار اور دین کو
سے اکھاڑ پھینکنے والا" قرار دے رہے ہیں۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ علامہ اقبال نے اس عقیدہ کو امام ابوحنیفہؒ اور
اللہ محدث دہلوی کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ وافسوس ہے کہ جناب مصنف علامہ اقبال کی عبارت کے اس
ذف کر گئے ہیں کیا وہ فرمائیں گے کہ امام ابوحنیفہؒ اور شاہ ولی اللہ کے متعلق ان کا کیا خیال ہے؟ اور آگے بڑھیئے
رف اقبال، امام ابوحنیفہ اور شاہ ولی اللہ دہلوی ہی کا نہیں۔ خود حضرت عمرؓ کا بھی یہی خیال تھا۔ اور اسی پر وہ اپنے
ت میں عمل پیرا رہے۔ کتب احادیث و آثار میں بیسیوں واقعات ایسے ملتے ہیں۔ جن میں حضرت عمرؓ نے رسول اللہؐ کی متعین
زئیات اور صادر فرمودہ فیصلوں میں اپنے زمانہ کے اقتضاآت کے مطابق ردو بدل کیا۔ چنانچہ ان میں سے ایک فیصلہ کے
ث کرتے ہوئے) امام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ

> عہد حضرت عمرؓ کی سیاست کا تقاضا یہی تھا کہ بیک وقت دی ہوئی تین طلاقوں کو بائنہ مان لیا جائے۔ حالانکہ رسول اللہؐ کے زمانے میں ایسی طلاق کو تین نہیں بلکہ ایک طلاق ہی تصور کیا جاتا تھا۔ (طلوع اسلام)

سلام یہی کہتا ہے کہ دین میں تعین جزئیات کا صحیح منشاء وہی ہے۔ جسے حضرت عمرؓ نے اختیار کیا۔ اور جس کی تائید امام
امام ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہ نے کی۔ (اور جس کے متعلق علامہ اقبال کا جرم صرف اس قدر ہے کہ انہوں نے ایسے
نقل کر دیا) حضرت عمرؓ کا یہ مسلک قرآن کی تعلیم اور منشائے رسالت کے عین مطابق تھا۔ اور ملت اسلامیہ میں جب پھر
ظام علیٰ منہاج نبوت قائم ہوگا۔ تو وہ اسی مسلک کو اختیار کرے گا۔

یہاں ایک دلچسپ بات سنیئے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ محترم مصنف نے علامہ اقبال کی عبارت نقل کر کے اس پر تنقید کی ہے! اس
شاشیہ پر ہمیں یہ عبارت ملتی ہے۔

> "ایک منکر حدیث نے اپنے پیرو مرشد علامہ اقبال کی عبارت اپنے عقیدے کی تائید میں پیش کی ہے کہ حضور نبی کریمؐ کے نظریے تو عالمگیر تھے۔ لیکن ان کے اعمال اپنی قوم کے ساتھ ہی وابستہ تھے.....
> خدا جانے کیوں یہ نہایت درجے کی بے ادبی اور گستاخی اقبال کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ مریدنے اپنے مرشد کو بے ادب ہی نہیں کم علم بھی ثابت کر دکھایا ہے۔"

ن کو علامہ اقبال اور طلوع اسلام کے خلاف جو بغض ہو سکتا ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ لیکن پُرلطف بات یہ ہے کہ خود

اقبال کی عبارت کے متعلق کہتے ہیں کہ اسے اقبال کی طرف کیوں منسوب کیا گیا ہے؟ باادب گذارش ہے کہ دیانت یہ ہے کہ جس کی عبارت ہو اسے اسی کی طرف منسوب کیا جائے۔

طلوع اسلام کے مسلک کے متعلق زیر نظر کتاب میں بس اتنا ہی حصہ ہے۔ جو اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ کتاب سو صفحات ان باتوں کی تردید میں ہیں۔ جن میں سے کوئی بات بھی طلوع اسلام نہیں کہتا۔ یا ایسی باتیں جو محض جذباتی ہیں۔

مثلاً تحریر ہے۔

> یہ لوگ قرآن کریم کی واضح تعلیمات کے خلاف جہاد میں مصروف ہیں۔ قرآن کریم حضور نبی کریم کے حالات کا مطالعہ کرنے کی تاکید کرتا ہے۔

محترم مصنف نے اپنی کتاب میں پرویز صاحب کا نام خصوصیت سے لیا ہے۔ مندرجہ بالا الزام اس پرویز کے خلاف عا[ئد کیا] جا رہا ہے۔ جس نے اپنی ساری زندگی قرآنی تعلیم کو عام کرنے میں صرف کر دی ہے۔ اور جس کی ایک کتاب (معارف القرآن) [اس] وقت تک پانچ ضخیم جلدوں میں شائع ہو کر اندرون اور بیرون ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ [نبی] اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ پر جس پرویز کی ضخیم تصنیف (معراج انسانیت) ہزاروں نوجوانوں کو ذاتِ رسالتمآبؐ کے علوم[تبت کا] گرویدہ بنا چکی ہے۔

ہم محترم مصنف سے گذارش کریں گے کہ کسی کے خلاف الزام دھرنے سے پہلے اس کے متعلق صحیح معلومات تو ہم پہنچا لینی [چاہئیں] یا مثلاً ارشاد ہے۔

> ان کا رسول اللہؐ کے لئے مختلف حیثیتیں قائم کرنا پرلے درجے کی گستاخی ہے اور اس قسم کی سعی نہایت درجے نقصان رساں ہے۔ کبھی ان کو رسولِ خدا اور کبھی ان کو امام اور کبھی ان کو امیر اور کبھی ان کو صدر ملت اور کبھی انسان محض قرار دینا بالکل باطل اور غیر معقول اور بے حد مضر ہے۔ اور خدا کی منشا کے بالکل خلاف کیونکہ (دلیل کو بغور ملاحظہ فرمائیے۔ طلوع اسلام) خدا نے ان کے حق میں ورفعنا لک ذکرک فرمایا ہے۔ اور انہیں قیام محمود پر کھڑا کیا ہے (ص ۲۴)

یہ کہنا تو ان حضرات کے لئے کافی نہیں ہوگا کہ کم از کم حضورؐ کی شہری حیثیت کا فرق خود اللہ تعالیٰ نے بھی کیا ہے۔ لیکن [ا]ن کے لئے سند ہونا چاہیئے کہ اس حیثیت کا امتیاز خود ان کے امیر اول (محترم محمد علی مرحوم) نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ تفسیر القرآن میں آیہ ما ینطق عن الہویٰ کے تحت لکھتے ہیں۔

> وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوىٰ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحىٰ (۵۳ ۔ ۲ ۔ ۳) میں (ھو) کی ضمیر کو نطق کی طرف لینا اس لئے درست نہیں کہ یہ کسی کے نزدیک بھی مسلم نہیں کہ آپ کا سارا کلام یا کم از کم

نبوت کے بعد کا ہی سارا کلام وحی سے تھا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ آپ کا اجتہاد بھی وحی خفی کی روشنی سے تھا۔ مگر پھر بھی اس تعلق کو مسائل دین پر محمول کرنا پڑے گا۔

(۱) حضور کا سارا کلام وحی کی رو سے نہیں تھا۔

(۲) حضور کا اجتہاد وحی خفی کی روشنی سے تھا۔ مگر وہیں تک جہاں تک دینی مسائل کا تعلق ہے۔

وحی خفی کی بحث کو چھوڑیئے کہ قرآن تو ایک طرف خود عہد رسالتمآب میں بھی اس اصطلاح کا کہیں وجود نہیں ملتا) مذکورہ اقتباس سے اتنا تو واضح ہے کہ محترم محمد علی مرحوم حضور کے اس کلام میں جو دینی مسائل سے متعلق تھا۔ اور اس میں جو مسائل سے متعلق ہوتا تھا۔ فرق کرتے ہیں۔ اسی کو حضور کی شہری حیثیت کہتے ہیں۔ لہٰذا اگر یہ گستاخی ہے تو سوچئے کہ آپ اپنے متعلق کیا فرما رہے ہیں۔

تیرے نشتر کی زد شریانِ قیسِ ناتواں تک ہے

تو رہی حضور کی امیر یا امام امت کی حیثیت۔ سو اس کے لئے بھی طلوع اسلام تنہا مجرم نہیں۔ طلوع اسلام کا کہنا یہ ہے کہ قرآن نے جہاں نظم اجتماعی کے سلسلہ میں اللہ و رسول کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس سے مفہوم نظام اسلامی اور اس نظام کا مرکز ہے۔ اس باب میں "اسلاف" کے اقوال ملاحظہ فرمایئے۔ امام ابن جریر طبریؒ سورہ انفال کی آیت (قل الانفال للّٰه والرسول) کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ "یہ وہ اضافے ہیں جو امام وقت بعض یا کل فوج کے لئے کرتا ہے (زیادات یزیدها الامام لبعض الجیش او جمیعهم) اسی طرح امام رازیؒ نے آیت (انما جزاء الذین یحاربون اللّٰه ورسوله (۵/۳۳)) کے تحت امام ابوحنیفہ کا یہ قول نقل کیا ہے فالامام مخیر فیه بین هذه الاشیاء امام کو اختیار ہے کہ تینوں سزاؤں میں سے جو سزا چاہے دے۔ اسی آیت کی تفسیر میں علامہ جلال الدین سیوطیؒ درمنثور میں یہ روایت درج کرتے ہیں کہ "سعید بن مسیب حسن بصری اور ضحاک نے کہا ہے کہ محارب کے معاملہ میں امام کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔ اسی طرح نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے فتح البیان میں "اللہ اور رسول کے خلاف جنگ" کے متعلق لکھا ہے کہ:

> حضرت ابن عباس، سعید بن المسیب، مجاہد، عطاء، حسن بصری، ابراہیم نخعی، ضحاک اور ابو ثور نے کہا ہے کہ جس نے اسلامی مملکت (قبۃ الاسلام) میں ہتھیار اٹھایا۔ اور راستوں کو پرخطر کر دیا۔ اور پھر وہ گرفت میں آ گیا۔ تو اس کے بارے میں مسلمانوں کے امام کو اختیار ہے کہ جو سزا چاہے دے)

واضح ہے کہ "اللہ اور رسول" سے مراد امام ملت اسلامیہ لینا دین میں "فتنہ انگیزی" نہیں۔ بلکہ یہ وہ مفہوم ہے جو اسلاف سے ثابت ہے۔

احادیث کی حفاظت کے متعلق محترم مصنف فرماتے ہیں:۔

ان فرائض کی ادائیگی کے متعلق جو ارشادات یا احادیث حضور کی زبان سے صادر ہوئیں ان کی حفاظت بھی اللہ تعالےٰ نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ (ص۲۹۴)

قرآن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے اسے نازل کیا۔ اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ اس ذ نتیجہ ہے کہ قرآن کا ایک ایک لفظ ایک کتاب کی شکل میں محفوظ چلا آرہا ہے۔ اور امت میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو کہ فلاں آیت فی الواقعہ قرآن کی آیت ہے یا نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر احادیث کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے لی تھی۔ تو وہ کونسی کتاب ہے۔ جس کی ایک ایک حدیث کے متعلق تمام مسلمانوں کا ایمان ہے کہ وہ لفظاً لفظاً کا ارشاد ہے۔ اور جس کی کسی حدیث کے متعلق یہ سوال نہیں اٹھا کہ وہ فی الواقعہ قول رسول اللہ ہے یا نہیں۔ بخاری شر الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔ اس کی اور دیگر صحاح کی احادیث کے متعلق خود (سابق) امیر جماعت احمدیہ مرحوم) فرماتے ہیں۔

میرے نزدیک سب سے ضروری بات یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ احادیث قصص گو وہ صحیح بخاری یا صحاح میں ہوں۔ اس قابل نہیں ہوتیں کہ ان کے ایک ایک لفظ کو نبی کریم (ص) کی طرف وثوق کے ساتھ منسوب کیا جا سکے۔ (تفسیر ص۱۱۵)

فرمایئے! کیا اللہ تعالےٰ کی حفاظت کا نتیجہ یہی ہونا چاہیئے تھا!

اور آگے بڑھئے۔ حدیثوں کے متعلق خود مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ

جو شخص حکم ہو کر آیا ہے۔ اس کو اختیار ہے کہ حدیثوں کے ذخیرہ میں سے جس انبار کو چاہے۔ خدا سے علم پاکر قبول کرے۔ اور جس ڈھیر کو چاہے۔ خدا سے علم پاکر رد کر دے۔ (تحفہ گولڑویہ)

فرمایئے! جس مجموعہ کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالےٰ نے لے لیا ہو کیا اس کی حالت ایسی ہوگی کہ اس میں انبار در انبار ایسی ہوں جو رد کر دینے کے قابل ہوں؟ کیا قرآن کی بھی یہی کیفیت ہے کہ کوئی حکم۔ خدا سے علم پاکر۔ اس کے جس حصے کو چاہے رد کر دے۔ اور جس حصے کو چاہے قبول کرے!

اور اگر آپ یہاں محمود احمد صاحب کی روایت کو قابل یقین خیال فرماتے ہیں تو حدیثوں کے متعلق میرزا صاحب کا یہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

حضرت مسیح موعود فرمایا کرتے تھے کہ حدیثوں کی کتابوں کی مثال مداری کے پٹارے کی ہے جس طرح مداری جو چاہتا ہے۔ اس میں سے نکال لیتا ہے۔ اسی طرح ان سے جو چاہو نکال لو۔

(الفضل۔ بابت ۱۵ر جولائی ۱۹۲۴ء)

یث کے مجموعوں کی حیثیت میرزا صاحب کے نزدیک. جن کے متعلق امیر جماعت احمدیہ کا ارشاد ہے کہ ان کی حفاظت کی
) اللہ تعالےٰ نے رکھی تھی۔

یہ ہے اس تصنیف کا اجمالی سا تعارف جسے امیر جماعت احمدیہ (لاہور) نے منکرین حدیث کے رد میں شائع کیا ہے۔
کی مدافعت میں ان حضرات کی یہ تڑپ و خلش. غم و غصہ اور ہراسانی و پریشانی قابل فہم ہے. مرزا صاحب کے تمام دعاوی
یثہ روایات پہ ہے۔ اگر یہ حضرات روایات کو دین تسلیم نہ کریں تو میرزا صاحب کے دعاوی کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں
م ایسا لکھنے میں محض قیاس یا سوءِ ظن سے کام نہیں لے رہے ہیں۔ ایک حقیقت کا بیان کر رہے ہیں۔ اور وہ حقیقت خود
ہ کتاب کے سواحل سے اچھل اچھل کر باہر آ رہی ہے۔ چنانچہ اس میں ایک تفصیلی باب "پیش گوئیاں اور کشوف و رویا"
ن سے ہے. جس کا آغاز ان سطور سے ہوتا ہے۔

اب ان احادیث پر بحث کی جائے گی۔ جن میں پیش گوئیاں اور کشف و رویا کا ذکر ہے. جن
لوگوں نے حدیث کے اس حصہ کا انکار کیا ہے۔ ان کے سامنے کوئی ملبند مقصد نہیں. بلکہ ان کا مقصد
کسی ایسی ہستی کا انکار کرنا ہے. جس نے نمایاں طور پہ خدمت دین کر دکھائی ہے۔ ظاہر ہے کہ
یہ مقصد نہایت گرا ہوا ہے۔ ان خیالات کا سرچشمہ حسد بھی ہے۔ اور کم ظرفی بھی۔ (ص ۱۲۹)

طلع۔ اب حسن مطلع ملاحظہ ہو۔ عنوان ہے۔

بعثت مجددین کے متعلق حضور کی پیش گوئیاں

اس کے نیچے یہ عبارت درج ہے۔

مذکورۃ الصدر بصائر کی روشنی میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک اور پیش گوئی کا ذکر کرنا
ضروری معلوم ہوتا ہے یہ پیش گوئی حدیث میں درج ہے ۔ حضور نے فرمایا۔

ان اللہ یبعث لھذہ الامۃ علیٰ راٴس کل مائۃ سنۃ
من یجدد لھا دینھا۔

یعنی اللہ تعالےٰ امت مرحومہ کی بھلائی کے لئے ہر سو سال کے سر پر ایک مجدد مبعوث کیا کرے گا
جو اس کے دین کی تجدید کیا کرے گا۔ اس پیش گوئی کی صداقت پرکھنے کا سب سے زیادہ صحیح طریق یہ
ہے کہ مدعی مجددیت کی صحبت سے فیضیاب ہونے والے اشخاص کو دیکھا جائے۔ اور اندازہ لگایا
جائے کہ آیا وہ خدا پرست بن گئے ہیں۔ اور ان کے اخلاق پسندیدہ نظر آتے ہیں۔ آیا ان میں
تقویٰ و طہارت پیدا ہو گیا ہے ...... (ص ۱۵۵)

اس کے بعد لکھا ہے کہ ۱۸۹۴ء میں (ماہ رمضان میں) چاند اور سورج دونوں کو گرہن لگا۔

> یہ واقعہ مدعی مجددیت و مہدویت (؟) کی صداقت پر نہایت ہی واضح اور نہایت ہی روشن اور نہایت ہی موثر شہادت ہے۔ اس واقعہ کو شہادت کیونکر قرار دیا جاتا ہے؟ اس لئے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیش گوئی کی تھی کہ آخری زمانے کے مہدی کی سچائی کو ظاہر کرنے کے لئے ماہ رمضان میں سورج اور چاند دونوں کو گرہن لگے گا۔ (ص۱۵۷)...... منکرین حدیث پر حجت قائم کرنے کے لئے یہ ایک ہی واقعہ کافی ہے (ص۱۵۸)

اور کتاب کے آخری صفحات میں درج ہے کہ۔

> مرزا غلام احمد (نے لکھا ہے کہ) حضور کے دین کی تجدید کرنا میرا فریضہ ہے۔ اور انہوں نے لکھا ہے کہ باب وحی نبوت بالکل مسدود ہے۔ اس لئے اب کسی شخص پر جبرئیل وحی نبوت لے کر نازل نہیں ہو سکتا۔ ہاں وحئ ولایت امت کے اولیاء پر نازل ہوتی ہے۔ اور ان اولیاء میں سے میں ایک ہوں۔ اور اس وحئ ولایت کا جاری رکھنا (جس کی کوئی سند قرآن سے نہیں مل سکتی طلوع اسلام) محض اس لئے ہے کہ تاکہ ایمان تازہ ہوتا رہے۔ اور تاکہ دین متین کی تجدید و تائید ہوتی رہے (صفحہ۱۶۳)

لہٰذا ان حضرات کا روایات کے بارے میں جوش اور شدت قابل فہم ہے۔

حکایتِ قدِ آں یار دل نواز کنم ۔۔۔ بایں فسانہ مگر عمرِ خود دراز کنم

اس ضمن میں ہم ان تمام حضرات کی خدمت میں جو اس باب میں دلچسپی رکھتے ہیں، باادب گذارش کریں گے میں حدیث کے صحیح مقام کا سوال خالص دینی اور علمی ہے۔ اس لئے اس کے متعلق گفتگو بھی دینی اور علمی انداز سے ہونی ہو سکتی ہے آپ کو کسی کے مسلک سے اختلاف ہو اور آپ اسے غلطی پر سمجھیں۔ لیکن اس کی غلطی کے ازالہ کے لئے گالیوں آنا۔ اور ہنگامہ برپا کرنا نہ مؤثر طریق ہے۔ نہ کبھی قابل ستائش عمل۔ حدیث کے بارے میں طلوع اسلام کے سامنے ہیں۔ وہ مختصر الفاظ میں یہ ہیں کہ

(۱) اگر رسول اللہؐ کے ارشادات دین کا جزو لاینفک تھے اور انہیں امت کے لئے قیامت تک کے لئے واجب بننا تھا تو کیا یہ چیز حضورؐ کے فریضۂ رسالت میں داخل نہ تھی کہ آپ ان ارشادات گرامی کا ایک مستند مجموعہ امت کو دے جاتے تاکہ ان کے متن کے متعلق کسی کو اختلاف نہ ہوتا؟ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس قسم کا مجموعہ حضورؐ نے مرتب نہ کیا۔ حضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ نے بھی ایسا نہیں کیا۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

تب روایات و آثار سے پتہ چلتا ہے کہ کئی ایک معاملات میں حضرت عمرؓ نے نبی اکرمؐ کے فیصلوں میں ردوبدل کیا (مثلاً ت ثلاثہ کے معاملہ میں) اگر رسول اللہؐ کے یہ فیصلے مبنی بر وحی تھے۔ اور قیامت تک کے لئے اٹل اور غیر متبدل۔ تو حضرت ایسا کیوں کیا۔ اور دیگر صحابہ کبارؓ (بلکہ ان کے بعد بھی امت) نے حضرت عمرؓ کے ان فیصلوں کی مخالفت کیوں نہ کی؟ ت عمرؓ ایسا کرنے کے مجاز تھے۔ تو اگر اس قسم کی خلافت علیٰ منہاج نبوت اب قائم ہو جائے۔ تو خلیفۂ برحق اپنے زمانے کے ے کے مطابق سابقہ فیصلوں میں ضروری تبدیلی کرنے کا مجاز ہوگا یا نہیں ہوگا۔ اگر نہیں تو کیوں نہیں؟

ہیں ہماری اشکال جن کے متعلق ہم ایک ایک سے درخواست کر چکے ہیں کہ وہ براہ کرم ان کے حل سے ہمیں مطلع فرمائیں۔ اری ان گزارشات کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ البتہ گالیاں ہر ایک نے دی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہی ایسی ایسی باتیں ہماری سوب کی ہیں۔ جنہیں ہم نے کبھی نہیں کہا۔ ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ نماز روزہ تو ایک طرف، عام فقہی مسائل تک میں کسی فرد احاصل نہیں کہ ان میں کوئی ردوبدل کرے۔ اگر حالات کے تقاضے سے ان میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت ہوگی۔ تو یہ (حضرت عمرؓ کی طرح) صرف وہ نظام کر سکے گا جو علیٰ منہاج نبوت قائم ہوگا۔ یہ ہے طلوع اسلام کا مسلک۔ اگر یہ مسلک ں رو سے غلط ہے تو ہم ان کے شکرگزار ہوں گے۔ جو ہم پر ہماری غلطی واضح کر دیں گے۔

حقائق و عبر (ص۵۵ سے آگے)

گے کہ ان کی کتابوں میں کسی شرارت پسند نے یہ باتیں بعد میں ملا دی ہوں گی۔ اور نرم زد یہ کہہ کر آنکھیں بند کر لیں گے کہ ے بزرگان گرفتن خطاست۔

اس ایک واقعہ سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اگر اس دور میں جب حکومت کی طرف سے ان امور کے متعلق کوئی سختی نہیں مصلحت کوشیاں علمائے کرام کے لبوں پر اس طرح مہریں لگا سکتی ہیں تو گذشتہ زمانے کی ملوکیت میں کیا کچھ نہیں ہوتا ہوگا! ئے: انسانی دستبرد سے اگر کوئی چیز محفوظ رہ سکتی ہے۔ تو وہ صرف خدا کی کتاب ہے۔ اس لئے کسی بات کے اسلامی لامی ہونے کا معیار وہی کتاب ہو سکتی ہے۔ نہ کہ اشخاص۔

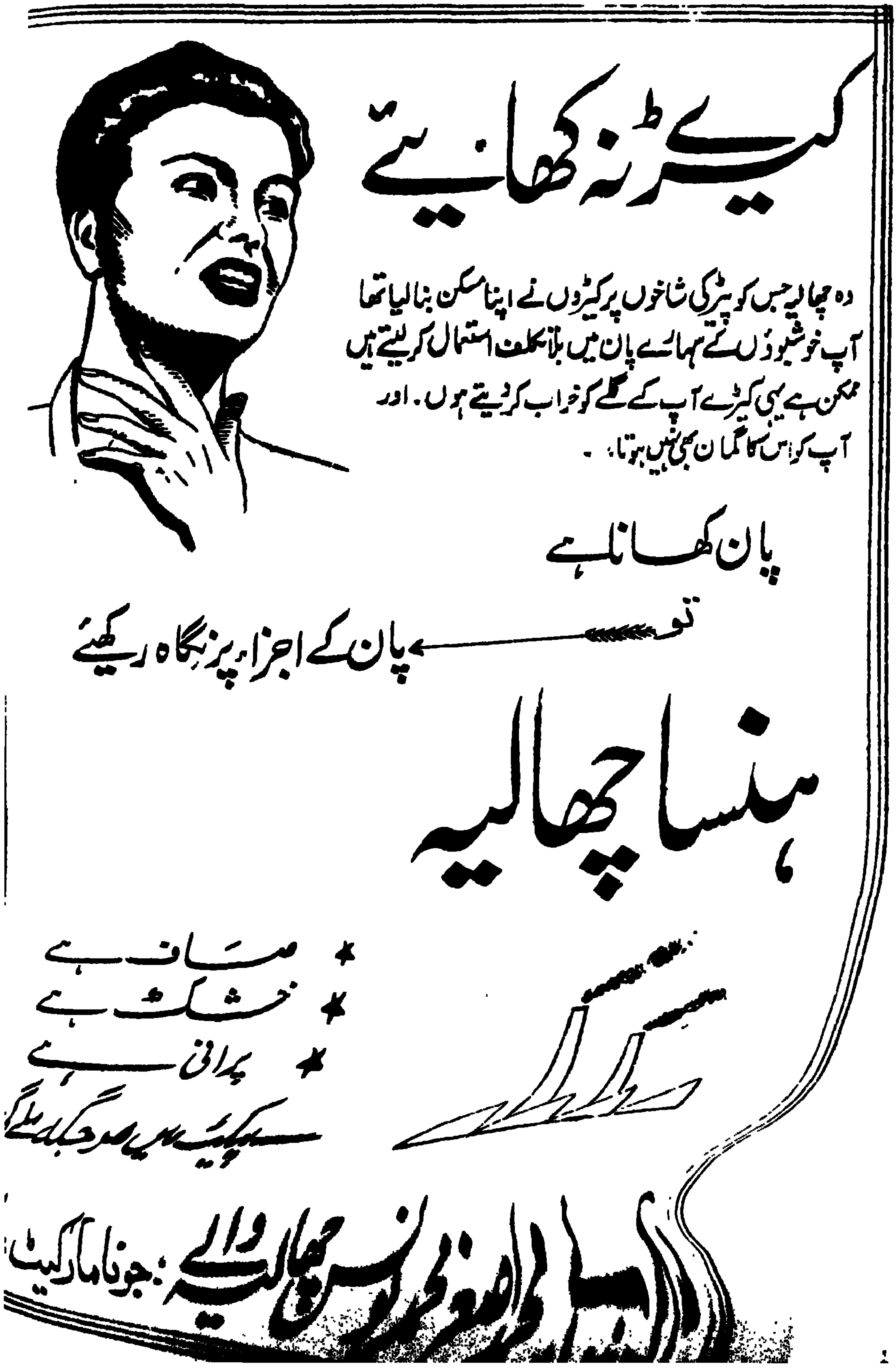
ع اسلام پہنچنے کے لئے ۱۔ ایسی بس میں بیٹھئے جو جمشید روڈ سے آگے سوسائٹی کی طرف جاتی ہے سے کہئے کہ وہ آپ کو اسلام آباد کے چوراہہ پر اتار دے (جسے اب طلوع اسلام چوک بھی کہتے ہیں) اس چوراہے سے ب کی طرف گئی ہے۔ اس پر چوتھا مکان دفتر طلوع اسلام ہے۔


خوشگوار
صحت
کیلئے
میسواک ٹوتھ پیسٹ
استعمال کیجئے
MISWAK

چھوٹا مسواک ٹوتھ برش




Guaranteed
No Animal
Bristles
میسواک
انگلینڈ میں بنا ہوا


کیڑے نہ کھائیے
وہ چھالیہ جس کو پیڑ کی شاخوں پر کیڑوں نے اپنا مسکن بنالیا تھا
آپ خوشبوؤں کے سہارے پان میں بلا تکلف استعمال کرلیتے ہیں
ممکن ہے یہی کیڑے آپ کے گلے کو خراب کردیتے ہوں۔ اور
آپ کو اس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔
پان کھانا ہے
تو
پان کے اجزاء پر نگاہ رکھیئے
ہنسا چھالیہ
صاف ہے
خشک ہے
پرانی ہے
پیکٹ میں ہر جگہ ملے گی
محمد یونس چھالیہ والے: جونا مارکیٹ


آپ نے کبھی سوچا؟
شگفتگی، طراوت اور تبسم کے پیچھے کیا کار فرما ہے!
گرم دوڑتا ہوا لہو۔ اگر وہ ذرا بھی سرد ہو جائے تو آپ زرد پڑ جاتی ہیں۔
اسکی وجہ؟ آپ کی استعمالی اغذیہ میں اہم حیاتین کی قلت
کے تدارک کیلئے آپ کو مرغن غذاؤں کی نہیں بلکہ ......
وِم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب)
کی ضرورت ہے جسے آپ کی صحت، توانائی اور تازگی کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اپنی
شگفتگی کو برقرار رکھنے کے لئے آج ہی وِم وائٹ خریدیے۔
ایک گرانقدر طبی تحفہ۔ ایک حیرت انگیز سائنسی تجربہ۔ امریکہ میں بنا ہوا ہر دوا فروش سے ملتا ہے
VIM VITE
25 VITAMINS
& MINERALS
آپ رشک کرتے ہیں!
کسی مضبوط اور متناسب جسم کو دیکھ کر۔ کیونکہ آپ اکثر ایسی صحت کے اسباب
ڈھونڈ نہیں پاتے۔ آیئے ہم آپ کی مشکل حل کریں کیا آپ اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں
کہ آپ کی غذا نظام جسمانی کی قطعی ضروریات کو پورا کر رہی ہے؟ کیا آپ کو حیاتین ٹھیک
طور پر مہیا ہو رہی ہیں؟ یقیناً کوئی تشفی بخش جواب آپ کے پاس نہیں۔
وِم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب)
ایک گرانقدر طبی تحفہ۔ ایک حیرت انگیز سائنسی تجربہ آپ کی مشکل کا حل ہے۔ جسے
استعمال سے آپ تیزی سے ایک توانا اور قابل رشک صحت تعمیر کر سکیں گے۔
آپ کی صحت کا ضامن۔ امریکہ میں بنا ہوا ہر دوا فروش سے ملتا ہے۔
توانا اور بشاش دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے آپ صحت افزا اور
کی تلاش کرتے ہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر بچے ماں باپ سے ورثہ
لیتے ہیں۔ یا پھر بالخصوص ماں کے دودھ سے محروم رہتے ہیں۔ اور
بازاری دودھ کے سہارے پروان چڑھتے ہیں ان صورتوں
کے علاوہ بھی انکی صحت ضروری حیاتین کی کمی کے باعث
ہوتی ہے اور کوئی بھی مرض غلبہ پا سکتا ہے۔
بچہ کو ان تمام خدشات سے محفوظ رکھنے کے لئے
وِم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب) خریدیے
جو ان تمام چیزوں کے پیش نظر تیار کیا گیا ہے صحت کی مکمل ضمانت ہے۔
کے اندرونی نظام کا محافظ۔ امریکہ میں بنا ہوا۔ ہر دوا فروش سے ملتا ہے


DURA-GLOSS
Nail Polish
MADE IN U.S.A.
ڈوراجلوس
ناخون کی پالش
تزئینِ حسن کے لئے
ناخون کی آرائش ضروری ہے
ڈوراجلوس
خوش رنگ۔ دیدہ زیب۔ چمکدار اور
خوشبودار پالش ہے۔
ہر بڑے دوکاندار سے ملتی ہے

سلیم کے

نام خطوط

از۔ پرویز

نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق جو ش
پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ۔ مدلل اور
جواب۔ بڑا سائز۔
صفحات ۴۰۸۔ قیمت۔ چھ ر

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

کراچی

ٹیلی فون نمبر ۳۱۴۸۸

قیمت فی پرچہ پاکستان سے بارہ آنے
ہندوستان سے بارہ آنے

ہندوستان اور پاکستان سے سالانہ آٹھ روپے غیر ممالک سے سالانہ ۲۰ شلنگ

جلد ۹ | مئی سنہ ۱۹۵۶ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

... کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پنڈت جواہرلال نہرو نے پھر کہا کہ کشمیر ہندوستان کا حصہ ہے۔ اس لئے وہاں استصواب کا سوال پیدا نہیں ہوتا، اور ملک کی فضا میں ایک ارتعاش پیدا ہوگیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا نہرو نے ایسا پہلی مرتبہ کہا ہے جو اس کا بیان ہمارے لئے اس طرح باعثِ تعجب و وجہِ اضطراب ہو رہا ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ عوام کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ کشمیر کا مسئلہ ایسا نہیں کہ آٹھ سال کے عرصہ میں اس کے متعلق جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے اسے عوام نے اس قدر جلد فراموش کر دیا ہو۔ ہندوستان، پاکستان کے متعلق جو کچھ کر رہا ہے ایک متعین پالیسی اور طے شدہ پروگرام کے مطابق کر رہا ہے۔ کشمیر کے متعلق اس نے پہلے دن سے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جونا گڑھ، مانا ودر اور حیدرآباد کی طرح ہتھیا لے گا۔ لیکن چونکہ یہ ذرا سخت ہڈی تھی اسے ہضم کرنے کے لئے اسے وقت درکار تھا۔ اس آٹھ سال کے عرصہ میں اس کی تمام حیلہ تراشیاں اور بہانہ سازیاں اسی مقصد کے حصول کے لئے تھیں۔ اقوامِ متحدہ کی طرف مراجعت۔ ایڈ منڈ اور تعطل، سیکورٹی کونسل، باہمی مذاکرات سے معاملہ کا تصفیہ، تقسیم کی تجویز اور استصواب وغیرہ سب خواب آور دوائیاں تھیں جو یکے بعد دیگرے پاکستان کو کھلاتا چلا گیا۔ لیکن اس کے یہ عزائم ایسے گہرے اور دبیز پردوں میں چھپے ہوئے نہیں تھے جو دیکھنے والوں کو نظر نہ آسکتے۔ وہ جو کچھ کر رہا تھا اسے اندھے بھی دیکھ سکتے اور بہرے بھی سن سکتے تھے۔ اس لئے یہ کہنا کہ ہم اس کی خبر داروں دینے کے فریب میں آگئے اور ہمیں معلوم نہ ہوسکا کہ اس کے دلی ارادے کیا ہیں، اگر فریبِ نظر نہیں تو فریبِ نفس ضرور ہے۔ ہمارے ہاں سب جانتے تھے کہ اس باب میں ہندوستان کے عزائم کیا ہیں اور وہ کس طرح مرورِ زمانہ سے اپنی تقویت کا سامان بہم پہنچاتا چلا جا رہا ہے۔ اگر کوئی یہ وہ لوگ نہیں جانتا تھا تو اس قسم کی سطحی نگاہ رکھنے والے کو حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ زمامِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے کر ملک کو اپنی معصوم حماقت طفلانہ سادہ لوحی کی بھینٹ چڑھا دے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اہم عقدوں کی کشود کے لئے جس قسم کی مومنانہ فراست اور قلندرانہ جرأت درکار ہوتی ہے اس کا ہمارے ہاں فقدان تھا لیکن اس کے کھلے کھلے اعتراف کی بجائے ذمہ دار حضرات میں سے ہر ایک کی کوشش کسی نہ کسی طرح بات ٹلتی رہے تاکہ تصفیہ اُس کے وقت میں نہ لٹکے۔ کسی اور کے زمانہ میں اُبھرے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ہم آج اس مقا

بے ننگے ہیں۔ جہاں نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کا صحیح منظر کھل کر سامنے آگیا ہے۔

ئلہ کشمیر کی اہمیت ایسا موضوع نہیں جس پر تفصیل سے کچھ لکھنے کی ضرورت ہو۔ علاوہ اس کے کہ کشمیر پاکستان کے لئے رگ جان ثیت رکھتا ہے، اس خطۂ زمین کی پچاسی فیصدی آبادی (مسلمانوں) کو حق خود اختیاری سے بنوکِ شمشیر محروم رکھنا دنیائے اخلاق ب اتنا بڑا جرم ہے کہ بھارت کو اس سے باز رکھنے کے لئے پاکستان کو اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینا چاہیئے۔ لگے دنوں یراعظم (پاکستان) نے اپنی ایک تقریر میں کہا (اور محترم وزیر خارجہ نے اس کا اعادہ کیا) کہ پاکستان کے مقابلہ میں ہندوستان سامانِ حرب و ضرب، اسباب رسل و رسائل، وسائل پیداوار، ذرائع معیشت، آلات صنعت و حرفت، آبادی، رقبہ، دولت زیادہ ہے اس لئے پاکستان، ہندوستان کے خلاف جارحانہ کارروائی کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ یہ درست ہے لیکن ان بیانا بہت بڑا سہو ہو گیا۔ ہمیں ہندوستان کو (اور اس کے بعد ساری دنیا کو) بتانا یہ چاہیئے کہ یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک مادی اسباب ق ہے، پاکستان ہندوستان کے مقابلہ میں کمزور ہے لیکن اخلاقی طور پر پاکستان کا مؤقف اتنا قوی ہے کہ ہندوستان ی مادی قوتیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے ابھی تک اس کا کماحقہٗ احساس نہیں کیا کہ کسی معاملہ میں اخلاق ق بجانب ہونے میں کتنی بڑی قوتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ قرآن نے جب کہا تھا کہ تمہارے سو آدمی فریق مقابل کے ہزار آدمیوں پر لب ہوں گے تو اس نے اسی اخلاقی قوت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اپنے عوام میں اس اخلاقی قوت کی بیداری اور کے لئے بھی کچھ نہ کر سکے۔ حالانکہ یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ہمارے عوام میں اس قسم کی صلاحیتیں ہندوؤں کے عوام کے مقابلے یں زیادہ اور بہتر ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے ہاں پارٹی بازی کی لعنت ایسی شدت اختیار کر گئی ہے کہ ہمارے ارباب حل و عقد وقت جوڑ توڑ کی نذر ہو جاتا ہے اور تعمیری کاموں کے لئے انہیں فرصت ہی نہیں ملتی۔

بہرحال سوال یہ ہے کہ جس مقام پر ہم اس وقت کھڑے ہیں اس میں ہمارے لئے کشادگی راہ کیا ہو؟ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں ن حرب و ضرب اور دیگر وسائل و ذرائع کا تعلق ہے، ہم ہندوستان کے مقابلہ میں پیچھے ہیں۔ لیکن دورِ حاضرہ کی سیاست کا انداز یہ ہے کہ دنیا ئی قوم بھی (خواہ وہ کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو) دوسروں کے مقابلہ میں خود مکتفی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی قوم حلیف تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ اپنی اندرونی صلاحیتوں کے ساتھ جس قوم کے حلیف اچھے ہوں گے وہی قوم طاقتور سمجھی جائے گی۔ اس کا ر قوم کی خارجی پالیسی پر ہوتا ہے۔ ہمیں اس امر کا بلا تامل اعتراف کر لینا چاہیئے کہ اس وقت تک ہم اپنے صحیح خارجی تعلقات استوار کرنے ری طرح ناکام رہے ہیں۔ سب سے پہلے تو دیکھئے کہ ہمارے دائیں اور بائیں اس قدر وسیع اسلامی ممالک پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک طرف ق تک کا وسیع و عریض خطہ۔ دوسری طرف انڈونیشیا کی عظیم اسلامی مملکت۔ لیکن غور کیجئے کہ ان تمام ممالک میں کتنے ایسے ہیں جن ستداری پر ہم پورا بھروسہ کر سکتے ہیں۔ مسلم ممالک کے بعد غیر مسلم حکومتوں کو لیجئے تو ان میں سے کتنی ہیں جو ہندوستان کے مقابلہ میں دل ری طرفدار ہیں؟ روس کے مقابلہ میں امریکہ سے فوجی امداد لینے کا فیصلہ یقیناً بہتر تھا لیکن واقعات نے بتا دیا ہے کہ امریکہ صرف فوجی حد تک ہمارے ساتھ ہے۔ جہاں کسی معاملہ میں ہندوستان کے ساتھ تصادم کا سوال پیدا ہو وہ ہمارا ساتھ نہیں دیتا خواہ ہم کتنے

بھی حق بجانب کیوں نہ ہوں۔ روس ہمارا حلیف نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ اس کی رفاقت اشتراکی اثرات سے مشروط ہوتی ہے
اشتراکیت کے فلسفہ کو کبھی قبول نہیں کر سکتے۔ اگر وہ اپنی حکمت عملی کو بدل لے اور سیاسی تعلقات کو اپنے اشتراکی تصورات سے نہ
تو بات اور ہے۔ ان حالات میں ہم سمجھتے ہیں کہ چین ایک ایسا ملک ہے جس کے اشتراکی تصورات "مذہبی جنون (...CISM)
کی حد تک نہیں پہنچے۔ اس لئے اس سے سیاسی اتحاد میں اشتراکی جراثیم کے دخیل کار ہونے کا اندیشہ نہیں۔ اگر چین کے ساتھ
طور پر ہمارا سیاسی اتحاد ہو جائے تو ہمارے نزدیک یہ اقدام ہمارے لئے مفید رہے گا۔ ہم اس وقت اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر
گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے لیکن ہمارا خیال ہے کہ عالمی سیاست کی بساط جن لوگوں کی نگاہوں کے سامنے ہے وہ ہم
ہوں گے کہ چین کے ساتھ ہمارا سیاسی اتحاد بڑے دور رس نتائج کا حامل بن سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی افغانستان کی نزاعی گتھی کو سلجھانے کی طرف بھی ہمیں زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس میں
کہ افغانستان اس وقت بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا ہے جن کی وجہ سے وہ حقائق کو ان کے اصلی رنگ میں دیکھ نہیں سکتا لیکن
کے باوجود ہمارا خیال ہے کہ اس مسئلہ کو سلجھایا جا سکتا ہے۔ مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے افغانستان کے ساتھ ہماری موجودہ کشمکش
ختم ہونا نہایت ضروری ہے۔

لیکن ان سب سے کہیں زیادہ ضروری یہ ہے کہ ملک کے معاشرتی اور معاشی حالات جو دن بدن خراب سے خ
ہوتے چلے جا رہے ہیں انہیں کس طرح سدھارا جائے۔ جہاں تک ہمارے معاشرتی حالات کا تعلق ہے زندگی کا کوئی گوشہ
نہیں جس میں ناسور نہ پڑ چکے ہوں۔ باقی رہا ہمارا معاشی نظام سو اس کی حالت اور بھی زبوں ہے۔ ملک میں سرمایہ داری کا وہ
مستحکم سے مستحکم ہوتا چلا جا رہا ہے جو یورپ میں آج سے دو تین سو سال پہلے کارفرما تھا۔ اور جس نے اسے تباہیوں کے جہنم
دیا ہے۔ ملک کی ساری دولت گنتی کے چند گھرانوں میں سمٹتی چلی جا رہی ہے اور نچلے اور اوپر کے طبقہ میں اتنا بعد
ہے کہ ان میں کوئی قدر مشترک نظر ہی نہیں آتی۔ مختصراً آج ہماری حالت وہ ہے جس کا نقشہ بہت پہلے اقبال نے ان
کھینچا تھا کہ

خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر　　　تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے غریب حال مست　　　بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی
دانش و دین و علم و فن، بندگیٔ ہوس تمام　　　عشقِ گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی

"عشق گرہ کشائے کا فیض عام" کرنے کے لئے بڑے باہمت انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے باہمت انسان کی
قابل نوکِ نشتر کو ناسور کی گہرائیوں تک لے جائے اور مریض کی چیخ پکار اس کی گرفت کو ذرا سا بھی ڈھیلا نہ ہونے دے
ناسوروں کا علاج اسی قسم کے معاشرتی و معاشی آپریشن سے ہو سکتا ہے۔ مرہم پٹی سے نہیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا
کے اندر ان قوتوں کو بیدار نہیں کر سکتے جو ہندوستان کے مادی ساز و براق کی زیادتی کی حریف ہو کر اسے بتا دے کہ

بے دست و پائیم کہ ہنوز از دوِ عشق
سوداست درسرم کہ بہ ساماں برابر است

ردنیا ایک بار پھر یہ تماشا دیکھ لے کہ ـــــ مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔
ہمارے لئے اپنی خارجی حکمت عملی کی اصلاح و استواری کے ساتھ ساتھ ان داخلی کمزوریوں کا علاج بھی نہایت ضروری ہے۔

---

(۲)

ملم لیگ

آپ نے شیخ چلی کا وہ قصہ سنا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا۔ اندر سے کنڈی لگا لی۔ اور پھر خود ہی رونے لگ گیا کہ میں باہر کیسے نکلوں! شیخ چلی کسی خاص زمانے میں خاص مقام پر پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ ہر انے میں ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ کہیں کم۔ کہیں زیادہ۔ پاکستان میں ان کا خاصا زور ہے اور ان کی اکثریت ارباب مسلم لیگ میں ملتی ہے۔

مسلم لیگ اپنی موت مر رہی تھی۔ اس کی یاد قصۂ پارینہ ہو چلی تھی۔ اس کی وجہ سے پیداشدہ جھگڑے جھمیلے بھی رفتہ رفتہ ختم ہو رہے تھے نہ معلوم دفعۃً بعض لوگوں کے جی میں کیا آیا کہ انھوں نے کراچی میں لیگ کا جلسہ رچایا اور اس میں سردار عبدالرب نشتر کو اس کا صدر منتخب یکے پھر اس سوتے فتنے کو جگا دیا۔ نشتر صاحب کے انتخاب پر چاروں طرف سے نعرہ ہائے تبریک و تہنیت بلند ہوئے۔ یوں محسوس ہوا گویا لستان نے اس فردوس گم گشتہ کو پھر سے پالیا ہے جس کی تلاش میں جنت سے نکالا ہوا آدم اس طرح مارا مارا پھر رہا تھا۔

لیکن ابھی ان نعروں کی صدائے بازگشت بھی فضا کی پہنائیوں میں گم نہ ہونے پائی تھی کہ خود انہی حضرات کی طرف سے چیخ پکار ںا شروع ہو گئی کہ مسلم لیگ خواہ مخواہ حکومت کی چلتی گاڑی میں روڑے اٹکاتی ہے۔ اور صدر مسلم لیگ اپنے آپ کو وزیر اعظم سے بھی نچلا سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف نشتری گروہ ہے جس کا دعویٰ یہ ہے کہ پارٹی حکومت میں، پارٹی کے صدر کی حیثیت بادشاہ گر کی ہوتی ہے۔ پارلیمان کے اندر پارٹی اور اس کے لیڈر کو صدر کی مرضی کے مطابق چلنا چاہیئے۔ چنانچہ دونوں پارٹیاں اب میدان میں اتر ئی ہیں۔ اور ایک دوسرے کو زک دینے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کر رہی ہیں۔ اس طوفانِ بدتمیزی میں نہ صدر مملکت کے احترام کا ال رکھا جا رہا ہے نہ وزیر اعظم کے مقام کا پاس۔ نہ کوئی صوبے کے گورنر کو سمجھتا ہے نہ وزیر اعلیٰ کو۔ یہ سب کچھ اس وقت شروع وگیا تھا جب دنیا کے چالیس ممالک کے نمائندے اسلامیہ جمہوریہ پاکستانیہ کے جشن جمہوریت میں شرکت کے بعد ہنوز اپنے ملکوں ں واپس نہیں پہنچے تھے۔ اور اس موقعہ پر ہو رہا ہے جب بھارت پاکستان کی سرحدوں پر فوجیں جمع کر رہا ہے اور کشمیر کا مسئلہ اپنے زک ترین دور سے گذر رہا ہے۔

لیکن جو کچھ ہو رہا ہے نہ خلاف توقع ہے نہ غیر معقول۔ یہ لازمی نتیجہ ہے پارٹی بازی کا اور گروہ بندی کا جسے قرآن نے انسانیت کی ب سے بڑی لعنت قرار دیا ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ تشکیل پاکستان کے بعد طلوع اسلام نے سب سے پہلے جو آواز اٹھائی تھی وہ یہ تھی کہ اب مسلم لیگ ختم کر دینا چاہیئے اور اس کے ساتھ ہی ملتِ اسلامیہ میں پارٹیوں کے وجود کو قانوناً ممنوع قرار دیدینا چاہیئے۔ ہم نے کہا تھا کہ ہندوستان

ب دو قومیں بستی تھیں۔ ایک مسلم اور دوسری غیر مسلم۔ وہاں اس کی ضرورت تھی کہ مسلم قوم کی نمائندہ جماعت الگ ہو۔ یہ جماعت م
ل تھی۔ حصول پاکستان کے بعد وہ مقصد ختم ہو گیا جس کے لئے مسلم لیگ وجود میں آئی تھی۔ اب یہاں پوری کی پوری ملت ایک
ل حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے ملت کے اندر کسی پارٹی یا جماعت کی ضرورت نہیں۔ ملت کے اندر مختلف پارٹیوں کے وجود کو قرآن
قرار دیتا ہے۔ اگر ہم نے مسلم لیگ کو اسی طرح زندہ اور قائم رکھا تو دوسری پارٹیوں کو اپنے وجود اور بقا کے لئے سند مل جائے گی
لت پارٹیوں میں بٹ کر تباہ ہو جائے گی۔ اسلام توحید کا پرستار ہے اس لئے اس کی ملت، وحدت کی مظہر ہے وہ کوشش ج
ل وحدت کو توڑے غیر اسلامی ہے اس لئے اب مسلم لیگ کو باقی رکھنے کی کوشش کرنا غیر اسلامی اقدام ہے لیکن طلوع اسلام
آواز کو کسی نے نہ سنا اور مسلم لیگ کو پاکستان کی بخشندہ۔ قائد اعظم کا ترکہ اور نہ معلوم کیا کیا القاب عطا کر کے ایک "مقدس بت" بنا دیا
مقصد صرف یہ تھا کہ وہ انگور کی بیلیں جو اپنے بل بوتے پر کھڑی نہیں ہو سکتیں۔ اس شاہ بلوط کے سہارے قائم رہ سکیں۔ اس آٹھ
کے عرصہ میں مسلم لیگ نے اور اس کی تقلید میں ملک کی دوسری پارٹیوں نے، ملت میں جس قدر تشتت و انتشار پیدا کیا ہے وہ کسی چشم
سے پوشیدہ نہیں۔ اس باب میں مسلم لیگ خصوصیت سے اس لئے پیش پیش رہی ہے کہ باقی پارٹیاں اقتدار کے حصول کے لئے کو
تھیں لیکن اس پارٹی کے ہاتھ میں اقتدار اور وزارت کی کرسیاں تھیں۔ ان کرسیوں کے حصول اور تقسیم کے لئے عجیب عجیب قسم کے
استعمال کئے جاتے تھے۔ کبھی فیصلہ ہوتا کہ صدر مسلم لیگ اور وزیر اعظم کا منصب ایک ہی شخص کے پاس ہونا چاہیئے۔ کبھی طے پاتا کہ نہیں
لیگ کے کسی عہدیدار کو حکومت کا کوئی منصب قبول نہیں کرنا چاہیئے۔ کبھی غیر لیگیوں کو راز درونِ مے خانہ کی شرکت کا اہل قر
جاتا۔ اور کبھی انہیں اچھوت قرار دے کر نکال باہر کیا جاتا۔ مختصراً یہ کہ اس آٹھ سال میں یہی تماشے ہوتے رہے اور ملت ٹکڑوں ٹکڑوں
میں بٹتی چلی گئی۔ (سابقہ) محمد علی وزارت کے ٹوٹنے کے بعد مسلم لیگ گمنامی کے گوشے میں چلی گئی تھی اور حساس قلوب نے اطمینان کا س
لیا تھا کہ یہ عروسِ ہزار داماد اب ابدی نیند سو جائے گی۔ لیکن قوم کی بدنصیبی کہ اس مردہ لاش کو پھر اکھیڑ لیا گیا اور ابھی نشتر صاحب کو جنہ
لیگی وزارت سے باہر نکالا گیا تھا، اس کا صدر بنا دیا گیا۔ اب وہ "الہ دین کا دیو" دوبارہ بوتل میں بند ہونا نہیں چاہتا اور شیخ با
مچلے ہیں۔ ان بھلے آدمیوں سے پوچھیے کہ ہیں کہا کس نے تھا کہ بوتل کا کارک کھول کر اس دیو کو باہر نکالئے۔ اب آپ نے
ہاتھوں سے یہ کچھ کیا ہے تو اس کی لکد کوبیاں بھی برداشت کیجئے۔

جب عشق کیا ہے تو صبر بھی کر اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے۔

اس "بھوتوں کے ناچ" کا اثر اگر یہیں تک رہتا تو بھی خیر تھا۔ لیکن اس کی سب سے بڑی زد مغربی پاکستان کی سیاست پر پڑی۔
مغربی پاکستان کی وحدت جن جانگسل مراحل سے گزر کر وجود میں آئی تھی اس کی یاد سے اب بھی روح کانپ اٹھتی ہے۔
وحدت کے بعد اطمینان ہو چلا تھا کہ ملت مزید انتشار سے بچ جائے گی۔ لیکن اب وہاں لیگی اور غیر لیگی کا شاخسانہ چھیڑ کر اس
کو تباہ کرنے کی ٹھان لی گئی ہے۔ ملت سے پارٹیوں کا وجود ختم ہو جانے کا عملی مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ذمہ داریوں کے لئے معیار انتخا
اور قابلیت قرار پا جاتا ہے اور اس میں پارٹی اور غیر پارٹی کے افراد کا سوال باقی نہیں رہتا۔ ملت کے سب سے زیادہ اہل اور قابل افرا

ں انھیں چن لیا جاتا ہے اور قومی امانتیں ان کے سپرد کر دی جاتی ہیں۔ جب تک وہ اپنی ذمہ داریوں کو دیانت اور قابلیت سے تے رہتے ہیں انھیں ان کی کرسیوں پر بحال رکھا جاتا ہے۔ جب وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں، ان کی جگہ ان سے راد کو دیدی جاتی ہے۔ اس کے برعکس پارٹی بازی میں یہ ہوتا ہے کہ پارٹی سے باہر کوئی کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو اس پر پارٹی نابنۂ نالائق اور نااہل کو ترجیح دی جاتی ہے اور وہ کچھ ہی کیوں نہ کرے، جب تک وہ پارٹی برسراقتدار رہتی ہے وہ بھی اپنی پر مسلط رہتا ہے بس اس شرط کے ساتھ کہ وہ پارٹی کا وفا شعار ہے۔ عام حالات میں بھی ملت کے اندر انتخاب کا یہ طریق بدترین ہو جب حالت یہ ہو کہ قوم میں قابل اور دیانت دار افراد کی کمی قریب قریب نقدان کی حد تک پہنچ چکی ہو، اس وقت تنگ انتخاب ن کی چار دیواری سے باہر نہ جانے دینا اپنے ہاتھوں ہلاکت مول لینا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ پارٹی سسٹم کی حکومت میں ایسا وتا ہے۔ اور چونکہ جمہوری انداز حکومت میں پارٹی سسٹم ناگزیر ہے اس لئے ان نتائج و عواقب سے مفر نہیں۔ لیکن سوال یہ کہ مغرب کا جمہوری انداز اور پارٹی سسٹم کیا خدا کا مقرر کردہ ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی؟ یہ سسٹم جس انداز غرب میں چل رہا ہے ہم اس کے متعلق اس وقت بحث نہیں کرنا چاہتے۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ جن حالات سے ہم ہے ہیں ان میں اس انداز حکومت کے نقصانات اس قدر بدیہی ہیں کہ ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جب واقعہ یہ ہو تو س قدر مضرت رساں طریق حکومت سے محض اس لئے چمٹے رہنا کہ یہ مغربی انداز جمہوریت کی لاینفک شرط ہے، حماقت نہیں ر کیا ہے۔

اندریں حالات ہم ارباب لیگ سے ایک مرتبہ پھر وہی گذارش کریں گے جسے ہم نے ۱۹۴۸ء میں پیش کیا تھا۔ اور جسے کے بعد ہم اس تکرار و اصرار سے دہراتے رہے ہیں کہ آپ مسلم لیگ کو ختم کیجئے اور ملک کو پارٹی بازی کی لعنت سے نجات دلایئے ن کی پوری ملت ایک پارٹی ہے۔ اس پارٹی کے اندر اور پارٹیاں مت پیدا کیجئے۔ نئے دستور کے تحت ملک میں بغیر پارٹی بیس انتخابات ہوں اور ایوان میں جو جوہر قابل کو اراکین کی اکثریت کی تائید حاصل ہو اسے وزارت تشکیل کرنے کے لئے کہا جائے س کے بعد جو مسائل ایوان کے سامنے آئیں، ان پر آزادانہ بحث و تمحیص کے بعد آزادانہ فیصلہ لیا جائے۔ اس میں کسی ممبر پر کوئی دی پابندی نہ کی جائے۔ آپ اپنے ہاں اس کا تجربہ کر کے دیکھئے تو سہی! کیا عجب کہ اس کے خوشگوار نتائج کو دیکھ کر مغربی رتیں بھی آپ کی تقلید کرنے لگ جائیں۔ آپ نے ہر معاملہ میں مغرب کی امامت کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لینے ہی کو ذہب کیوں بنا رکھا ہے؟ اگر آپ امامتِ امم کے منصب جلیلہ کے سزاوار نہیں بنتے تو کم از کم مغرب کی اندھی تقلید غلامانہ ذہنیت سے تو چھٹکارا حاصل کیجئے۔ ہمیں آزادی اس لئے ملی تھی کہ ہم اپنے تصورات کے مطابق اپنا معاشرہ متشکل کریں ہم نے ذہنی طور پر غلام کا غلام ہی رہنا ہے تو جسمانی آزادی سے اس سے زیادہ اور کیا حاصل ہو سکے گا کہ ہمارے ہاں کے گھرانے دولت و اقتدار کے مراکز بن جائیں۔ لیکن صحیح آزادی کے ثمرات و برکات اس سے کہیں زیادہ گراں یا ہوتے ہیں۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

اس لئے ہماری درخواست یہ ہے کہ آپ اس پارٹی سسٹم کو ختم کیجئے، پوری کی پوری ملت کو ایک پارٹی سمجھئے اور اس طرح اپنی تنگ دامانی کو حدود فراموش وسعتوں میں بدل دیجئے۔ قرآن کا پیغام اور اقبال کی روح ہم سے بار بار کہہ رہی ہے کہ

تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

ایک ضروری اطلاع

محترم پرویز صاحب کی صحت، جو ایک عرصہ سے خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی، اب اس نقطہ پر پہونچ گئی کہ انہیں مجبوراً کام چھوڑ کر کراچی سے باہر چلے جانا پڑا۔ موجودہ پروگرام کے مطابق وہ جولائی کے شروع میں کراچی واپس تشریف لائیں گے۔ مستفسرین کی خدمت میں گذارش ہے کہ اس دوران میں ان کے نام پر کوئی خط نہ لکھیں۔ استفسارات مدیر طلوع اسلام کے نام بھیجیں۔

معاملہ کی باتیں

(۱) خط وکتابت میں اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔

(۲) جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا جوابی لفافہ لکھیئے۔

(۳) تمام پرچے نہایت احتیاط کے ساتھ ہر مہینہ کی ۳۰ تاریخ کو حوالۂ ڈاک کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے آپ کا پرچہ آپ تک نہیں پہنچ سکا تو ۱۰ تاریخ تک ادارہ کو مطلع کر دیجئے۔

(۴) آپ کا چندۂ خریداری ختم ہو جانے پر آپ کو اطلاعی کارڈ بھیجا جاتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے آپ رسالہ کی سرپرستی آئندہ جاری نہ رکھ سکیں تو ادارہ کو مطلع کر دیجئے۔ ورنہ آپ کو وی۔ پی بھیجا جائے گا جس کا وصول کرنا آپ کا اخلاقی فریضہ ہوگا۔

(۵) رقم کی ترسیل کے سلسلہ میں بہ نسبت وی۔ پی منگانے کے منی آرڈر سے رقم بھیجئے۔ علاوہ کفایت کے یہ محفوظ ترین طریقہ بھی ہے کیونکہ وی۔ پی کے ذریعہ سے جو رقم وصول ہوتی ہے اس میں عموماً بہت تاخیر ہو جاتی ہے۔ اور ادارہ اس وقت تک رسالہ آپ کے نام جاری نہیں کر سکتا جب تک اس وی۔ پی کی رقم ڈاکخانہ سے وصول نہ ہو جائے اس کے برعکس منی آرڈر سے رقم بھیجنے میں آپ غیر ضروری اخراجات اور بلاوجہ زحمت انتظار سے بچ سکتے ہیں۔

(۶) تبدیلیٔ پتہ یا رسالہ نہ ملنے کی شکایت کے خطوط پر فوراً تعمیل کر دی جاتی ہے البتہ ان خطوط کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی لیکن اگر آپ کو اس کی رسید کی اطلاع بھی حاصل کرنی ہو تو جوابی کارڈ بھیجئے۔

دستورِ پاکستان

(اس کی کون کونسی شقیں قرآنی نقطۂ نگاہ سے قابلِ ترمیم ہیں)

یہ مقامِ شکر ہے کہ ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء سے مملکتِ پاکستان کو اپنا آئین مل گیا۔ اور اس طرح ہم نے ۱۹۳۵ء کے اس دستور سے نجات پائی جو انگریز سے آزادی حاصل کر لینے کے بعد بھی ہمارے سر پر بدستور مسلط تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ انسانوں کا بنایا ہوا کوئی آئین یا قانون بھی اپنے پہلے روز سے ہی مکمل نہیں ہوتا۔ یہ نقائص و معائب تجربہ آہستہ آہستہ اس کی خامیوں کو ابھار کر سامنے لاتا ہے۔ اور اگر نیت بخیر ہو تو مزید غور و خوض سے ان خامیوں کو دور کیا جاتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ موجودہ دستور کو (جیسا کچھ بھی یہ ہے) نہایت تدبر و دیانت سے چلایا جائے۔ اور جہاں جہاں اس کی خامیاں نظر آئیں۔ انہیں آئینی طور پر دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس دوران میں ہمارے پاس بے شمار استفسارات آئے ہیں جن میں دریافت کیا گیا ہے کہ منظور شدہ دستور کی کون کونسی شقیں قرآنی نقطۂ نگاہ سے قابلِ اصلاح ہیں۔ قارئینِ طلوعِ اسلام سے پوشیدہ نہیں کہ جس دن سے تدوینِ دستور کا کام شروع ہوا، طلوعِ اسلام اس موضوع پر مسلسل و متواتر لکھتا چلا آیا ہے۔ اس نے شرح و بسط سے بتایا کہ اسلامی دستور کے بنیادی خد و خال کیا ہیں۔ اور پاکستان کی موجودہ حالت میں اس کا نفاذ کس طرح ہو سکتا ہے۔ اس نے مجلسِ آئین سازی کی مختلف کوششوں کو میزان میں تولا اور ان کا صحیح صحیح وزن بتایا۔ ہمارا اندازہ یہ ہے کہ اس آٹھ سال کے عرصہ میں طلوعِ اسلام ہزاروں صفحات اس موضوع پر لکھ چکا ہے۔ اس لئے کہ اس کے نزدیک پاکستان سے مفہوم ہے وہ آئین جس کے مطابق اہلِ پاکستان کے معاشرہ کی تشکیل ہے۔ اس کے باوجود ہمارا خیال تھا کہ منظور شدہ دستور کی مختلف شقوں کا قرآنی نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کر کے ایک خود مکتفی جائزہ لیا جائے۔ تاکہ ایک طرف ان ہزاروں صفحات میں پھیلی ہوئی تفاصیل سمٹ کر بیک نگاہ سامنے آجائیں۔ اور دوسری طرف یہ ہو جائے کہ اس میں کون کون سی تبدیلی سے قرآنی مقصود و منشا سے قریب تر آئے گی۔ تاکہ جو حضرات اس میں کسی ترمیم کی کوشش کرنا چاہیں۔ ان کے لئے بات آسان ہو جائے۔ ہم چاہتے تھے کہ یہ تبصرہ اس وقت کیا جائے جب آئین کے بعد پہلی مجلس (نیشنل اسمبلی) متشکل ہو جائے۔ لیکن ایک تو استفسارات کی کثرت نے، اور دوسرے اس حقیقت نے کہ ۲۳ مارچ

کے بعد سابقہ مجلس دستور ساز ہی نیشنل اسمبلی کی حیثیت اختیار کر جائے گی۔ ہمیں اپنے سابقہ خیال میں تبدیلی پر مجبور کر دیا
یہ تبصرہ بلا تاخیر شائع کیا جاتا ہے۔ واضح ہے کہ اس تبصرے میں ہم بڑے اختصار سے کام لیں گے۔ اس لئے کہ وہ امور
جن کا اس میں ذکر آئے گا۔ ایسے ہیں جن کے متعلق ہم تفصیلی طور پر پہلے بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ یوں سمجھئے۔ —— کہ یہ تبصرہ
کا خلاصۂ مبحث (summary) ہے۔

چونکہ طلوع اسلام کی نہ کوئی پارٹی ہے۔ اور نہ ہی اس کے پیش نظر کوئی سیاسی اغراض و مصالح۔ اس لئے اس میں ہر
جاتا ہے۔ وہ پارٹیوں کی رعایت یا مخالفت سے بلند ہو کر، خالص تحقیقاتی نگاہ سے لکھا جاتا ہے۔ صرف اس پابندی کے
کہ جو کچھ لکھا جائے وہ ہماری بصیرت کے مطابق قرآنی تعلیم کے مطابق ہو۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

تمہیداً یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ کسی دستور کے بنیادی نقاط یہ ہوتے ہیں کہ اس میں قانون سازی کے لئے کیا ا
کئے گئے ہیں۔ اور مملکت کی غرض و غایت اور مقصود و منتہیٰ کیا قرار دی گئی ہے۔ یہی نقاط دستور کی اصل و بنیاد ہوتے ہیں
امور ان کی شرح و تفاصیل یا اس مقصد کو بروئے کار لانے کی مشینری کے مختلف اعضاء و عناصر۔ لہٰذا ہمارے اس تبصرہ میں
اسی اصل و بنیاد پر مرکوز رہے گی۔ اور دیگر تفاصیل و جزئیات کو زیادہ اہمیت نہیں دی جائے گی۔

پیش لفظ

ہمارے دستور میں سب سے پہلے ایک پیش لفظ (Preamble) ہے جو اس کا محور ہے۔ اس پیش لفظ کے پہلے
ایک ایسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ جو ہمارے نزدیک اسلامی آئین، یا اسلامی نظام اور ہیئت اجتماعیہ کی جان ہے۔
وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہمارے واضعین دستور اس حقیقت کبریٰ کو محض (ملاؤں کی طرح) تبرکاً زیب عنوان نہ
بلکہ اسے دستور کی اصل و بنیاد قرار دیتے۔ اور ہر مقام پر اس مرکزی نقطہ کو سامنے رکھتے تو اس
اہم حصے اس شکل سے مختلف ہوتے۔ جس میں یہ اب منظور کیا گیا ہے۔ اور اس وقت اس کے مین

بنیادی نقطہ

ہونے میں دو آراء ہو نہ سکتیں۔ وہ حقیقت جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ ان الفاظ میں پنہاں ہے۔ جو پیش لفظ
فقروں میں وجہ شادابی قلب و نگاہ بنتے ہیں۔

وہ اختیارات جنہیں باشندگان پاکستان ان حدود کے اندر رہتے ہوئے استعمال کرینگے
جو ان کے لئے ان کے خدا نے متعین کر دی ہیں، ایک مقدس امانت ہیں۔

"ان حدود کے اندر رہتے ہوئے اختیارات کا استعمال جو خدا نے متعین کی ہیں"؛ یہ ہے اسلامی دستور کی اصل
قرآنی معاشرہ کی روح رواں۔ اسلامی نظام پابندی اور آزادی کے حسین امتزاج کا نام ہے۔ پابندی ان حدود

ے اپنی کتاب میں متعین فرمادیا ہے۔ اور ان کے اندر رہتے ہوئے اس امر کی کامل آزادی کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں
اپنے لئے قوانین خود مرتب کریں۔ ان کی حکومت، ان کی ڈیماکریسی، ان کا سیاسی نظم، ان کا معاشرتی نقشہ، ان کا
سب اسی آزادیٔ مشروط کے آئینہ بردار اور اس شجر طیب کے برگ وبار ہوتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک شق بھی معدوم
جائے۔ تو وہ آئین ونظام اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ یعنی اگر پابندیوں کی حدود، کتاب اللہ سے آگے بڑھ جائیں تو
ہو جائے گی۔ اور اگر آزادی کی وسعتیں، حدود اللہ سے آگے بڑھ جائیں تو وہ طاغوتی سرکشی قرار پا جائے گی۔
اندازہ لگا لیا ہوگا کہ آئین کے پیش لفظ کا جو فقرہ اوپر درج کیا گیا ہے وہ کس طرح صحیح اسلامی نظام کا ترجمان ہے۔
یہ ہے کہ یہ فقرہ ہمارے دستور میں فقط زیب عنوان بن کر رہ گیا ہے۔ دستور کی مختلف شقوں کا معیار ومدار نہیں بن
بں اس کے یکسر خلاف جاتی ہیں (جیسا کہ آئندہ چل کر معلوم ہوگا)

یکسانیت

(۲) پیش لفظ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ
افراد مملکت کو تمام امور میں یکساں مواقع بہم پہنچائے جائیں گے
(Equality of opportunity

ت بلند اور یہ ضمانت بڑی انسانیت ساز ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عملاً اس سے مقصود کیا ہے؟ مثلاً آپ نے قانون بنا دیا کہ
ے سے بڑے منصب کا دروازہ ہر فرد مملکت کے لئے کھلا ہوگا۔ بشرطیکہ وہ اس معیار تعلیم پر پورا اترے جو اس منصب کے
ہے۔ بہت خوب! پھر آپ نے یہ قانون بھی بنا دیا کہ اسکولوں اور کالجوں میں ہر ایک بچہ تعلیم پا سکے گا۔ کسی پر ان کا دروازہ
گا۔ یہ بھی بہت اچھا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس غریب کے پاس ان اسکولوں اور کالجوں کے اخراجات کے لئے پیسے ہی
و اپنے بچے کو تعلیم کیسے دلا سکے گا۔ اور جب اس بچے کی تعلیم ہی نہیں ہوگی تو مملکت کے مناصب ومدارج کے کھلے ہوئے دروازے
کام آسکیں گے؟ نظری طور پر وہ بے شک سب کے لئے کھلے ہوں گے۔ لیکن عملاً ان میں صرف دولتمندوں کے بچے ہی داخل
۔ اس لئے سوال "مواقع کی یکسانیت" کا نہیں بلکہ ذرائع کی یکسانیت کا ہے۔ قرآنی نظام تمام افراد کے رزق (یعنی سامان
بہم پہنچانے کی ذمہ داری لیتا ہے۔ اور اسی کو صحیح معنوں میں مواقع کی یکسانیت کہا جا سکتا ہے (تفصیل اس اجمال
کی آگے آئے گی)

مملکت

(۳) پیش لفظ کے آخر میں لکھا ہے کہ اس دستور کی تدوین سے مقصد یہ ہے کہ پاکستان کے باشندے
مرفہ الحال ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ لوگوں کی مرفہ الحالی نہایت ضروری ہے۔ اور کسی مملکت
ار خود سعد تحسین ہے۔ لیکن قرآنی نظام اس سے ایک قدم آگے جاتا ہے۔ وہ مرفہ الحالی کو حصول مقصد کا ذریعہ قرار دیتا
خوش مقصد قرار نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک مقصد انسانی ذات (Human personality) (
استحکام ہے۔ مملکت کے وجود کا جواز ہی افراد کی ذات کا نشوونما ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما کے مفہوم یہ ہے کہ فرد

کے اندر جس قدر صلاحیتیں رکھی گئی ہیں۔ مناسب تعلیم و تربیت، سازگار ماحول اور فضا سے ان کی پرورش کی جائے۔ اور نمو کے پورے پورے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ جس قوم کے افراد کی مضمر صلاحیتیں نشوونما نہیں پاتیں اور اس طرح انہیں ذات نصیب نہیں ہوتی۔ اس کی مرفہ الحالی کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اس وقت پاکستان کے اوپر کی طبقہ کی مرفہ الحالی میں کسے کلام ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود ان میں کتنے ہیں جن کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما بھی ہو چکی ہے یا ہو رہی ہے؟ نشوونما تو ایک طرف ان میں کتنے ہیں جنہیں ان صلاحیتوں کا احساس بھی ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ انسانی ذات کی نشوونما کے لئے سامان زیست کی فراہمی نہایت ضروری ہے لیکن (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) سامان زیست ان صلاحیتوں کی نشوونما کا ذریعہ ہے۔ مقصود بالذات نہیں۔ لہذا اسلامی مملکت کی غایت، افراد کی ذات کی نشوونما قرار دینا چاہیئے۔ جس کے لئے ان کا مرفہ الحال ہونا ضروری ہے۔

باب دوم

(بنیادی حقوق)

دستور کا سب سے اہم حصہ وہ باب ہے جس کا تعلق بنیادی حقوق سے ہے۔ بنیادی حقوق سے وہ چیزیں مراد ہیں جنہیں ہر فرد بطور استحقاق (as of right) مملکت سے طلب کر سکتا ہے۔ اور اگر مملکت ان کے مہیا کرنے میں کوتاہی کرے تو اس کے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کیا جا سکتا ہے۔ لہذا دستور کا یہی وہ حصہ ہے جس کا افراد مملکت سے سب سے گہرا تعلق ہے۔

بنیادی ضروریات زندگی قرآن نہایت واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ جو نظام اپنی نسبت خدائے رب العالمین کی طرف کرتا ہے۔ اس کی کم از کم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ تمام افراد مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرے۔ لہذا ایک اسلامی مملکت میں افراد کا سب سے پہلا بنیادی حق ضروریات زندگی کا مہیا ہونا ہے۔ چونکہ کوئی مملکت اتنے بڑے فریضہ سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ جب تک ملک کے وسائل پیداوار اس کی اپنی تحویل میں نہ ہوں۔ اس لئے قرآن کی رو سے وسائل پیداوار افراد کی ذاتی ملکیت کے بجائے ملت کی مشترکہ تحویل میں رہتے ہیں۔ انہی سے وہ مملکت افراد کی ضروریات زندگی بہم پہنچاتی ہے۔ اور انہی سے ان کی صلاحیتوں کی نشوونما (تعلیم و تربیت وغیرہ) کا انصرام کرتی ہے۔ جو ایک اسلامی مملکت میں افراد کا دوسرا بنیادی حق ہے۔ لیکن ہمارے دستور میں ان میں سے کوئی حق بھی بنیادی حقوق کی فہرست میں شامل نہیں۔ درحقیقت بنیادی حقوق کی یہ فہرست اس چارٹر پر مبنی ہے جسے اقوام متحدہ (یو۔ این) نے مرتب کیا تھا۔ اور جس کی یاد میں ہر سال ایک دن منایا جاتا ہے۔ قرآن کے عطا کردہ بنیادی حقوق یو۔ این۔ او کے چارٹر سے بہت آگے جاتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہمارا ذہن ابھی ان تنگنائیوں سے نکلنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

(۲) بنیادی حقوق کی فہرست میں ایک شق (شہ) یہ بھی ہے کہ

ل

تمام افراد قانون کی نگاہ میں برابر ہیں۔ اور اس کی حفاظت کے یکساں مستحق۔

یہ شق نہایت عمدہ ہے۔ اور قرآن کے منشا کے مطابق۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس غریب کے پاس عدالت تک پہنچنے کے لئے ہے ہی نہ ہوں۔ اسے یہ شق کیا فائدہ پہنچا سکے گی؟ موجودہ عدالتی نظم و نسق کی رُو سے انصاف حاصل کرنا درحقیقت انصاف یدنا ہے۔ جس شخص کے پاس اس کی قیمت نہ ہو۔ وہ اس مارکیٹ تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ کتنے حقدار ہیں جو اپنے حقوق سے پنے محروم رہ جاتے ہیں کہ ان کے پاس دادخواہی کے لئے دام نہیں ہوتے! قرآن کی رُو سے مملکت کا بنیادی فریضہ ل گستری ہے۔ اس لئے افراد کو عدل حاصل کرنے کے لئے کچھ خرچ نہیں کرنا چاہیئے۔ اور یہ چیز ان کے بنیادی حقوق کی فہرست ں داخل ہونی چاہیئے۔

(۳) شق ۴(۳) میں یہ کہا گیا ہے کہ حبس امتناعی (Preventive Detention)

بس بلا مقدمہ

کی مدت تین ماہ سے زائد نہ ہوگی۔ لیکن اگر مشاورتی بورڈ اس کی سفارش کرے تو یہ مدت بڑھائی ی جاسکتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مصالح مملکت کے پیش نظر ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن میں کسی کو امتناعی طور پر نظر بند کرنا ضروری سمجھا نے۔ لیکن اثبات جرم کے بغیر کسی کو قید کرنا یا نظر بند رکھنا قرآنی منشا کے خلاف ہے۔ اس کے لئے عدالت میں مقدمہ چلنا ضروری ہے۔ خواہ بہ تقاضائے مصلحت اس مقدمہ کی کارروائی کو صیغہ راز میں رکھا جائے۔

اسی طرح زیر تفتیش ملزموں کو پولیس کی حراست میں رکھنا بھی غلط ہے۔ انہیں ایسی جگہ زیر حراست رکھنا چاہیئے جو پولیس کے اثر سے باہر ہو۔ اس قسم کے مقدمات میں پولیس کی حیثیت درحقیقت ایک فریق کی ہو جاتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ فریقین میں سے ایک کو دوسرے کی حراست میں دے دینا۔ انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ عدل و انصاف کے معاملہ میں ایک اسلامی مملکت کو عام انداز سے ہٹ کر خاص روش اختیار کرنی چاہیئے۔ جس میں ہر فرد مملکت کو اطمینان اور یقین ہو کہ اس پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہو سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی اور غلامی کی پرکھ کا اولین میزان عدالت کا احاطہ ہوتا ہے۔ اگر وہاں خالصۃً قانون کی حکمرانی ہے۔ تو یہ صحیح معنوں میں آزادی ہے۔ لیکن اگر وہاں قانون پر دانستہ یا نادانستہ دیگر میلانات و عواطف اثر انداز ہوتے ہیں۔ تو یہ غلامی ہے۔

(۴) شق ۲۷ میں یہ کہا گیا ہے کہ پندرہ برس تک مملکت کی کچھ اسامیاں (POSTS) بعض علاقوں

علاقائی تناسب

کے لئے مخصوص رکھی جائیں گی۔ تاکہ ملازمتوں میں ان علاقوں کی نمائندگی پوری ہو جائے۔

یہ شق قرآنی منشاء کے خلاف ہے۔ قرآن جنت میں داخلہ کے لئے صلاحیت کو لاینفک شرط قرار دیتا ہے۔ اور اس میں کسی قسم ی رعایت کی گنجائش نہیں رکھتا۔ اس سوال پر ذرا جذبات سے ہٹ کر غور کیجئے۔ اگر ایک قابل باپ اپنے نالائق بیٹے کو کسی

سامی پر تعینات کر دیتا ہے۔ تو ہم میں سے ہر شخص اس کی مذمت کرتا ہے۔ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس لئے کہ اس شخص نے صلاحیت
) بجائے کسی اور شے کو معیارِ انتخاب بنا دیا ہے۔ لیکن اگر بعینہٖ یہی کچھ کسی خاص علاقہ کے لوگوں کے سلسلہ میں کیا جائے۔ تو اسے قابل
تراض نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ مملکت کو جو نقصان اس نالائق بیٹے کے انتخاب سے پہنچا ہے۔ وہی نقصان اس علاقہ کے نالائق افراد کے
تخاب سے پہونچے گا۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن عدل کے ساتھ احسان کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن احسان کے معنی ہیں کسی کی کمی (ficiency
د پورا کر کے اس کے توازن و تناسب کو بحال کر دینا۔ اگر کوئی علاقہ پس ماندہ ہے۔ تو اس سے احسان کے معنی یہ ہوں گے کہ اس
علاقہ میں دوسرے علاقوں کے مقابلہ میں تعلیم و تربیت کے خاص انتظامات کئے جائیں۔ اور اس طرح ان لوگوں کو دوسرے لوگوں کی
سطح پر لایا جائے۔ نہ یہ کہ وہاں کے نااہل لوگوں کو حکومت کی مشینری کے پرزے بنا کر اسے ایسا کمزور کر دیا جائے کہ ساری مملکت
کا توازن ہی بگڑ جائے۔

مذہبی فرقے شق ۱۸(ب) میں مذہبی فرقوں کے حقوق کا ذکر ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کے مذہبی فرقوں کا تعلق ہے
اس کے متعلق شق ۱۹۸(۴) کے ضمن میں گفتگو کی جائے گی۔

حقوق اور فرائض اس باب کے خاتمہ پر ایک اصولی نقطہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔ اس میں جس قدر حقوق
کا ذکر ہے۔ ان میں سے ہر ایک اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ مصالحِ عامہ، ضوابط
اخلاق یا قوانین مملکت سے متصادم نہ ہوں۔ مثلاً ہر شخص کو اظہار خیالات کی آزادی ہوگی۔ بشرطیکہ وہ ان پابندیوں کو نہ توڑیں۔ جو
اس باب میں عائد کی جائیں۔ یا مثلاً کسی شخص کی جان نہیں لی جائے گی۔ بشرطیکہ قانون کا ایسا تقاضا ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ حقوق مش
ہوتے ہیں۔ لیکن اسلامی آئین میں ان سب کے لئے ایک ہی شرط کافی ہوتی ہے۔ اور وہ یہ کہ "بشرطیکہ ان کا استعمال حدود اللہ
اندر رہتے ہوئے کیا جائے"۔ یہ وہ بنیادی شرط ہے جو آئین پاکستان کے پیش لفظ کے پہلے فقرہ میں موجود ہے (اور جس کا ذکر
آچکا ہے) حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم قرآن سے مشورہ کریں۔ تو وہ ہمیں حقوق انسانیت اور ان سے متعلق حدود کا ایک ایسا جامع
تصور دیتا ہے۔ جس کے بعد ہمیں کہیں اور سے کچھ مستعار لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ نیز قرآن جہاں حقوق کی فہرست دیتا
اس کے ساتھ ہی فرائض کی تفصیل بھی بیان کر دیتا ہے۔ افرادِ مملکت کے صرف حقوق ہی نہیں ہوتے۔ فرائض بھی ہوتے ہیں
اور حقوق درحقیقت ان فرائض کی سرانجام دہی کا صلہ ہوتے ہیں۔ البتہ دو حقوق ایسے ہیں۔ جو بلا مشروط ہیں۔ یعنی افراد مملکت
کی ضروریاتِ زندگی (رزق) کی بہم رسانی اور عدل گستری۔ ان سے کسی فرد کو کسی حالت میں بھی محروم نہیں کیا جا سکتا
نہ ان پر کسی قسم کی شرط عائد کی جا سکتی ہے۔ مملکت کا ہر فرد اپنی ضروریاتِ زندگی اور انصاف حاصل کرنے کا ہر حال
میں مستحق ہے۔

باب سوم

(مملکت کے اصولِ ہدایت)

اصولِ ہدایت کی آئینی یا قانونی پوزیشن کچھ نہیں ہوتی۔ محض واعظانہ حیثیت ہوتی ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جو اہم باتیں ستور کے اندر ہونی چاہیئے تھیں۔ وہ اصولِ ہدایت کے اندر شامل کردی گئی ہیں۔ اس سے بنظرِ غائر آئین بڑا خوش آئند بن گیا ہے۔ لیکن عملاً اس کا نتیجہ وہ مرتب نہیں ہوگا۔ جو ایسے آئین کا ہونا چاہیئے۔ مثلاً اس باب میں یہ کہا گیا ہے کہ مملکت اس امر کی کوشش کرے گی کہ

(۱) ملک سے ناخواندگی کو دور کرے۔

(۲) افرادِ مملکت کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرے۔

(۳) ملک کو مرفہ الحال بنائے۔ اور دولت اور وسائل پیداوار کو چند افراد میں مرکوز نہ ہونے دے۔

(۴) افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریات زندگی مہیا کرے۔ وغیرہ وغیرہ

ظاہر ہے کہ یہ چیزیں اسلامی مملکت کے بنیادی فرائض میں داخل ہیں۔ اور ان کا مہیا کرنا مملکت کی اولین ذمہ داری۔ لہٰذا ان کا صحیح مقام، خود آئین کا متن ہے نہ کہ اصولِ ہدایت، جن کی آئینی حیثیت کچھ نہیں۔ یہ ہمارے زیرِ نظر آئین کا بنیادی سقم ہے۔ اور جب تک یہ سقم دور نہیں ہوتا۔ اسے اسلامی نہیں کیا جا سکتا۔ اور تو اور جہاں تک مسلمانوں کی زندگی کو قرآن و سنت کے مطابق بنانے کا سوال ہے۔ اس کے لئے بھی اتنا ہی کہا گیا ہے کہ مملکت اس کے لئے کوشش کرے گی۔ حالانکہ پاکستان کے حصول، قیام اور بقا کا بنیادی مقصد ہی یہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ ذمہ داریاں ایسی ہیں جنھیں ایک نوزائیدہ مملکت ایک دن میں پورا نہیں کر سکتی۔ یہ بتدریج پوری ہوں گی۔ لیکن آئین میں یہ بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ مملکت کا نصب العین ہے۔ جس تک پہونچنے کے لئے بتدریج قدم اٹھائے جائیں گے۔

فواحش کا سدِ باب

اس باب میں یہ بھی لکھا ہے کہ مملکت کوشش کرے گی کہ

(۱) عصمت فروشی، قمار بازی۔ شراب اور دیگر مسکرات کے استعمال کو روکا جائے اور

(۲) ربوٰا کو جلد از جلد ختم کیا جائے۔

یہ وہ فواحش اور نواہی ہیں۔ جن سے قرآن نے حتماً روکا ہے۔ اس لئے انھیں ختم کرنا، اسلامی مملکت کا اولین فریضہ ہے بنا بریں ان کا صحیح مقام بھی آئین کا متن ہونا چاہیئے۔ نہ کہ اصولِ ہدایت کے مواعظِ حسنہ۔ نیز یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان دو چار نواہی کے خصوصی ذکر کی کیا ضرورت تھی۔ جب آئین میں یہ شق موجود ہے کہ پاکستان میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نافذ نہیں ہوگا۔ اور موجودہ قوانین کو کتاب و سنت کے مطابق کیا جائے گا۔ تو مذکورہ صدر امور کا خصوصی ذکر محض تکلف ہے۔

کیا "کتاب وسنت" والی شق ان امور کو خود بخود محیط نہیں ہو جائے گی؟۔

(۳) زکوٰۃ شق ۲۵ (۲) میں درج ہے کہ مملکت زکوٰۃ، اوقاف اور مساجد کی تنظیم کا مناسب انتظام کرے گی۔

جہاں تک زکوٰۃ کا تعلق ہے۔ یہ شق ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ اسلامی مملکت جو ٹیکس وصول کرتی ہے۔ زکوٰۃ اس سے کوئی الگ شے ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں۔ اسلامی مملکت کے عاید کردہ ٹیکس ہی کو زکوٰۃ کہتے ہیں (بلکہ صحیح تر الفاظ میں اسلامی مملکت کے تمام محاصل کا اصطلاحی نام زکوٰۃ ہے۔ کیونکہ ان سے مقصود اور غایت انسانی کی نشوونما ہے۔ اور یہی اس لفظ کے بنیادی معنی ہیں) حکومت کے ٹیکس اور زکوٰۃ کے الگ الگ ہونے کا تصور اس وقت پیدا ہوا۔ جب ہمارے ہاں (بدقسمتی سے) عیسائیت کی طرح سیاست کو مذہب سے الگ کر لیا۔ اس وقت سے حصہ خدا کے لئے اور قیصر کا حصہ قیصر کے لئے؛ مقرر ہوا۔ ہم تو آج ہر شخص منبر اور اسٹیج سے پکارتا رہتا ہے کہ ہمارے ہاں مذہب اور سیاست میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن اس دعوے کے باوجود ہماری عملی حالت یہ ہے کہ ہم زکوٰۃ کو خدا کا ٹیکس تصور کرتے ہیں۔ اور جو کچھ اسلامی حکومت وصول کرتی ہے اسے مملکت کا ٹیکس سمجھتے ہیں۔ اور اس ثبوت میں منبر اور اسٹیج دونوں ہیں۔ چنانچہ ہمارا زیر نظر دستور اہل سیاست نے پاس کیا ہے۔ اور ارباب مذہب نے اس کے اسلامی ہونے کی سند عطا کی ہے۔ دونوں میں سے کسی نے اس پر غور نہیں کیا کہ مذہب اور حکومت کی یہ تفریق یکسر غیر اسلامی ہے۔

اوقاف اسی طرح قرآن کی رو سے اوقاف کی بھی دینی حیثیت کچھ نہیں۔ قرآن ایک مردہ کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ ابد تک زندوں پر اپنی مرضی چلائے۔ اوقاف کے موجودہ املاک بلاشبہ مملکت کی تحویل میں چلے جانے چاہئیں اور آئندہ کے لئے وقف کا غیر قرآنی تصور ختم کر دینا چاہیئے۔

مساجد باقی رہی مساجد سو ان کی حیثیت محض پرستش گاہوں کی نہیں۔ وہ ملت اسلامیہ کے تنظیمی مراکز ہیں۔ اس لئے انہیں ملت کے تنظیمی پروگرام میں یہی حیثیت دی جانی چاہیئے۔

باب چہارم
(وفاقی حکومت)

غیر مسلموں کی پوزیشن شق ۲۵ (۱) میں یہ درج ہے کہ مجلس مقننہ کا رکن ہر فرد مملکت ہو سکتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی مملکت کی مجلس مقننہ میں غیر مسلموں کو شامل کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس سوال کا جواب بڑا آسان ہے۔ اسلامی مملکت میں مجلس مقننہ کا فریضہ یہ ہوتا ہے (اور اس کی صراحت خود ہمارے دستور میں موجود ہے) کہ وہ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے، (یا ہمارے دستور کے الفاظ میں قرآن وسنت کے مطابق) قوانین مرتب

اہر ہے کہ ایک غیر مسلم ملت اسلامیہ کے لئے حدود اللہ (یا کتاب و سنت) کی روشنی میں کس طرح قانون مرتب کر سکتا یا ایسے
کی تدوین میں شریک ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن انہیں شریک مملکت نہیں کرتا۔ بلکہ اس اعتبار سے کہ وہ اسلامی منہاج
کی صداقت کے معترف نہیں ہوتے، انہیں شریک راز کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ لہٰذا ایک غیر مسلم اسلامی مملکت
س مقننہ اور اجرائیہ کا رکن کبھی نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی مملکت کے غیر مسلم باشندے ان مجالس کے انتخاب میں حصہ لے سکتے ہیں۔
(بلکہ آجکل تو اکثر) طبائع کو یہ چیز بڑی ناگوار گذرے گی۔ اور وہ اسے انتہائی تنگ نظری پر محمول کریں گے۔ اور اسے اصول
یت کے خلاف قرار دیں گے۔ سو پہلی چیز تو یہ ہے کہ دین کے معاملہ میں ہماری ناگواری یا خوشنودی کا کوئی سوال ہی نہیں
یے اصول اٹل ہیں۔ اور وہ کسی کی ناگواری کی بنا پر بدلے نہیں جا سکتے۔ لہٰذا اس سوال کو اس پہلو سے دیکھنا چاہیئے کہ کیا
کا اس باب میں یہی فیصلہ ہے۔ اگر اس کا یہی فیصلہ ہے تو مسلمان کا شیوہ اس فیصلہ کے سامنے سر جھکا دینا ہوگا۔ خواہ اس
انی رجحانات و احساسات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن کا فیصلہ اس باب میں بالکل واضح ہے۔ اور اس میں دو آرا کی گنجائش
یں۔ لہٰذا بات بالکل صاف ہے۔ لیکن اس کے باوجود، مقام صد حیرت ہے کہ قرآن کے ایسے کھلے ہوئے فیصلہ کی موجودگی
آئین ان لوگوں نے پاس کر دیا ہے۔ جو اپنی مجلس کا آغاز بھی قرآنی آیات سے کرتے تھے۔ اور جنہوں نے آخر میں خیر و برکت کی
ں بھی قرآنی آیات ہی کے الفاظ میں مانگی تھیں۔ اور اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز یہ کہ ملک کے ارباب مذہب میں سے کسی نے
س کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا۔ حالانکہ ان میں سے اکثر اس سے پیشتر اپنی تحریروں اور تقریروں میں اسے اسلام کے خلاف
یا کرتے تھے۔

باقی رہا تنگ نظری کا طعن۔ سو مغرب کی فراخ نگہی کے معیار کے مطابق تو اس زمانے میں کسی مملکت کا مذہب کی بنیاد پر
م ہونے کا دعوے ہی ہزار تنگ نظری کی ایک تنگ نظری ہے۔ لہٰذا اگر تنگ نظری کے طعن سے بچنا ہے تو پھر مملکت کے
ہب اسلام کا نام لینا بند کر دو۔ جس طرح دنیا کی کشادہ نظر قومیں اپنے سیاسی معاملات کا حل سوچتی ہیں۔ اسی طرح آپ بھی
، پھر یہ 'خدا اور رسول' کیسا۔ اور 'کتاب و سنت' کیا؟

تیسری بات ہے آئین جمہوریت کی۔ سو جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں۔ اسلام میں جمہوریت کا تصور بھی زندگی کے دیگر
ں کی طرح حدود اللہ کی پابندی سے مشروط ہے۔ ہمارے ہاں کوئی جمہوریت قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ حدود اللہ سے
ت ہے۔ لہٰذا اسلامی مملکت کی مجالس مقننہ کی ترتیب و تشکیل کا جو تصور اوپر بیان کیا گیا ہے۔ وہ اسلامی جمہوریت کے
مطابق ہے۔ اگر وہ مغربی جمہوریت کے خلاف ہے تو ہوا کرے۔ ہم نے پاکستان اسلامی جمہوریت کے قیام کے لئے حاصل
ہے۔ نہ کہ مغربی جمہوریت کے لئے۔ اگر ہمارے نزدیک مغربی جمہوریت ہی قابل قبول ہوتی۔ تو ہمیں ہندوستان سے کٹ کر الگ
ست بنانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

کس قدر مقام تاسف ہے کہ آج ہمارے ذمہ دار حضرات میں کوئی شخص ایسا نہیں (نہ لیڈروں میں نہ مولویوں میں) جو مصلحت

کوششوں سے بے نیاز ہو کر دنیا کو بیباکانہ بتائے کہ اسلامی ہیئت اجتماعیہ کا تصور کیا ہے اور اس میں غیر مسلموں کی پوزیشن کیا

(۲) ارکانِ اسمبلی کے حقوق شق ۵۶(۳) میں لکھا ہے کہ کنسٹی ٹیوشن اسمبلی کا ممبر اسمبلی میں جو جی میں آئے سو کہے۔ اس پر اس کے سلسلہ میں کوئی مقدمہ نہیں چلایا جائے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ارکانِ اسمبلی کو اظہار خیال کی آزادی ہونی چاہیئے۔ لیکن نہ ایسی آزادی کہ انہیں قانون کی حد سے بالا سمجھا جائے۔ اگر کوئی شخص عام مجمع میں ایسی بات جو قانون کی گرفت میں آتی ہو تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر وہی بات اسمبلی کے اجتماع میں کہے۔ تو اس پر قانونی مواخذہ کیوں نہ ہو۔ قرآن سے اس قسم کا کوئی اشارہ نہیں ملتا جس کی رو سے کوئی ایسا مقام بھی ہو سکتا ہے۔ جہاں جرم کا ارتکاب جرم نہ ہو۔ لیکن اگر کسی مصلحت سے ارکان اسمبلی کو اس قسم کی آزادی دینی ضروری ہو۔ تو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ اسمبلی کی کارروائی کو اخبارات میں شائع نہ کیا جایا کرے۔ تاکہ قابلِ اعتراض باتوں کی عام اشاعت تو نہ ہو۔ اگر کوئی ممبر اسمبلی میں مملکت کے خلاف بغاوت انگیز تقریر کرے۔ تو اسے اسمبلی کی چار دیواری تک محدود رکھا جائے۔ اسے ملک میں تو نہ پھیلایا جائے۔

نواں باب

(عدالت)

عدالت کے جج نہ عدالت عالیہ کے چیف جسٹس کے لئے اور نہ ہی دوسرے ججوں کے لئے مسلمان ہونے کی شرط رکھی گئی۔ آپ سوچئے کہ جس مملکت کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہو۔ اور اسی قانون کے مطابق مقدمات کے فیصلے ہونے ہوں۔ اس میں غیر مسلم جج ایسے فیصلے کس طرح کر سکیں گے؟ جج کے لئے قانون کے الفاظ ہی دلیل راہ نہیں ہوتے اس کے لئے قانون کی روح سے واقفیت۔ اس معاشرہ کے مزاج کا صحیح صحیح ادراک جس میں وہ قانون نافذ ہو۔ اور اس کے ضمیر کا گہرا احساس، جس سے اس قانون کے تقاضے ابھرتے ہیں بھی ضروری ہے۔ اور یہ ایک غیر مسلم کے لئے ناممکن ہے۔

(۲) قانون کی تعبیر شق ۱۵۶(۱) میں مذکور ہے کہ اگر مرکزی اور صوبائی حکومت میں آئین کی تعبیر کے بارے میں اختلاف ہو۔ تو اس کا فیصلہ عدالت عالیہ کرے گی۔ لیکن اگر کسی فرد کے حقوق کے متعلق آئین کی تعبیر کا سوال درپیش ہو۔ تو اس کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا کہ اس کا فیصلہ کون کرے گا۔ ظاہر ہے کہ افراد کو بھی یہ حق ملنا چاہیئے کہ وہ اختلافی معاملات میں عدالت عالیہ کا دروازہ کھٹکھٹا سکیں۔ افراد کو اس حق سے کیوں محروم رکھا جائے

دسواں باب

(ملازمت)

شق ۱۷۹ میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس کا عملاً مفہوم یہ ہے کہ پاکستان کا ہر شہری ہر اسامی کے لئے منتخب ہو سکتا ہے۔ اس کی تائید باب دوم شق ۱۷(۱) سے بھی ہوتی ہے۔ جو بنیادی ... سے متعلق ہے۔

...ت کی اسامیاں

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کو شریک راز نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ایسی کلیدی اسامیاں ... تعلق رازہائے مملکت سے ہو۔ غیر مسلموں کے لئے کھلی نہیں رکھی جا سکتیں۔

...زمین کی اپیل

رائج الوقت قوانین کی رو سے ملازمین کے متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ یا تو ان کا دفتر کر دیتا ہے یا زیادہ سے زیادہ پبلک سروس کمیشن سے مشورہ لے لیا جاتا ہے حتیٰ کہ ... کی صورت میں ... اپیل بھی کسی ثالث تک نہیں پہنچتی۔ یہ صورت حالات بڑی غیر تسلی بخش ہے۔ جس میں ملازمین قاطبۃً اپنے دفتر کے ... رحم پر رہتے ہیں۔ زیر نظر آئین میں بھی اس صورت حالات میں ترمیم و اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ یہ چیز ... گستری اور داد خواہی کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔ جب کسی ملازم اور اس کے دفتر میں تنازعہ ہو تو اس کا فیصلہ ... کے دفتر کو نہیں بلکہ کسی ثالث کو کرنا چاہیئے۔ جس کے نزدیک فریقین کی حیثیت مساوی ہو۔ یا کم از کم اسے کسی ... کے پاس مرافعہ (اپیل) کا حق ہی حاصل ہو۔

بارھواں باب

(اسلامیات)

...اب و سنت

ہم جیسا کہ شروع میں لکھ چکے ہیں کسی مملکت کے آئین کے دو پہلو سب سے زیادہ اہم اور بنیادی ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں قانون سازی کے اصول کیا متعین کئے گئے ہیں۔ اور دوسرا یہ کہ اس میں ... لت کی غرض و غایت کیا قرار دی گئی ہے۔ زیر نظر باب کا تعلق قانون سازی کے اصولوں سے ہے۔ اس لئے یہ بڑا اہم ہے۔

ہماری بدقسمتی ہے (اور اسی چیز نے مسلمانوں کو اقوام عالم میں اس قدر پس ماندہ بنا رکھا ہے) کہ ہم زندگی کے اہم مسائل ... کا فہم و بصیرت اور تدبر و تفکر سے مطالعہ نہیں کرتے۔ بلکہ انھیں ہمیشہ سطحی جذبات کے تابع رکھتے ہیں۔ قوم کا گروہ عظیم ... ہل اور اس لئے اندھی تقلید کا خوگر ہے۔ ان کی مہار مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں ہے۔ جن کا مفاد اسی میں ہے کہ قوم کو ... ہل رکھا جائے۔ اس لئے جس گوشے سے فہم و بصیرت اور عقل و فکر کی آواز اٹھے۔ وہ اسے دبانے کے لئے بصد جوش ... روش اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور (دیگر معاملات میں ان کے باہمی اختلافات کتنے ہی کیوں نہ ہوں) اس مخالفت میں متحد و متفق ہو جاتے ہیں۔

آپ اپنی تاریخ پر غور کیجئے۔ ہر زماں اور ہر مقام میں اسی حقیقت کا اعادہ نظر آئے گا۔ اب ظاہر ہے کہ جس قوم کو صدیوں تک سوچنے
اور غور کرنے سے باز رکھا جائے۔ اس میں غور و فکر کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ یہی حالت ہماری ہو چکی ہے۔

ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایک مملکت اسلام کی بنیادوں پر اپنا آئین مرتب کرنے کے لئے اٹھی تھی۔ یہ موقعہ بڑا مبارک اور یہ فال بڑی نیک تھی۔ طلوع اسلام نے پہلے دن سے تحریک پاکستان کا ساتھ ہی اس لئے دیا تھا کہ اس سے ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے گی۔ جس میں ہم صحیح اسلامی بنیادوں پر آئین مرتب کر کے اس قرآنی معاشرہ کو پھر سے قائم کر سکیں گے۔ جو ہمارے قرنِ اول میں بایں ہمہ زیبائی و رعنائی قائم ہوا تھا۔ اور جسے دوبارہ دیکھنے کے لئے آسمان آج تک چکر کاٹ رہا ہے۔ اس مقصد کے لئے طلوع اسلام نے اپنی قرآنی بصیرت کے مطابق بتایا کہ ایک اسلامی مملکت کا مقصود و مطلوب کیا ہوتا ہے۔ اور اس میں قانون سازی کے اصول کیا ہوتے ہیں۔ اول الذکر شق کے متعلق اس نے بتایا کہ قرآن کی رو سے اسلامی نظام کی غرض و غایت یہ ہے کہ وہ تمام افراد مملکت کی ضروریات زندگی کے بہم پہنچانے کی کفیل ہو۔ اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما سے ان کی ذات کے ارتقاء اور استحکام کی ذمہ دار بنے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے وسائل پیداوار افراد کی ملکیت کے بجائے ملت کی مشترکہ تحویل میں رہیں تاکہ خدا کی صفت رب العالمینی مشہود و محسوس انداز میں سامنے آ جائے۔ قرآن سے یہ چیز بالکل واضح ہے۔

دوسری شق کے متعلق اس نے بتایا کہ اسلام ثبات اور تغیر (Permanence and Change) کے امتزاج کا نام ہے۔ اس نے زندگی کے وہ بنیادی اصول و اقدار عطا کر دیئے ہیں۔ جو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء اور تغیراتِ زمانہ سے ناآشنا ہیں۔ وہ اپنی جگہ پر محکم اور اٹل رہتے ہیں۔ وہ خارجی تبدیلیوں سے اثر پذیر نہیں ہوتے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بتایا کہ زمانہ کے تقاضے اور انسانی ضروریات بدلتی رہتی ہیں۔ اس لئے معاشرے کا جو پیکر کسی ایک دور میں موزوں و مناسب ہوتا ہے وہ دوسرے دور میں غیر موزوں ہو جاتا ہے۔ زندگی کے اس حصے کا تعلق تغیرات سے ہے۔ اسلامی نظام سے مقصود یہ ہے کہ ہر دور کے مسلمان خدا کے متعین کردہ غیر متبدل اصولوں کے اندر رہتے ہوئے اپنے اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق اپنے لئے قوانین خود مرتب کریں۔ اور اس طرح ثبات و تغیر کے امتزاج سے زندگی کے راستوں میں آگے بڑھتے اور بلند ہوتے چلے جائیں۔ واضح رہے کہ "اپنے زمانے میں خود قوانین مرتب کرنے" سے مراد یہ نہیں کہ ہر نئی حکومت سابقہ حکومتوں کے تمام فیصلوں کو منسوخ کر کے ازسرِنو قانون سازی شروع کر دے۔ دنیا کی کوئی حکومت بھی ایسا نہیں کر سکتی۔ مطلب اس سے یہ ہے کہ کسی دور کی حکومت جہاں یہ دیکھے کہ کسی سابقہ فیصلہ میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ وہ اس میں تبدیلی کر دے۔ باقی قوانین علیٰ حالہ جاری رہیں۔ اس نظام حیات یا ضابطۂ زندگی کا نام ہے دین اسلام۔ اس کے برعکس، ایک نظامِ زندگی وہ ہے۔ جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں نہ کوئی مستقل قدر ہے۔ نہ غیر متبدل اصول۔ انسان اپنی مصلحتوں کے مطابق جو انداز زندگی چاہے اختیار کرے۔ اسے مادیت (Materialism) کہا جاتا ہے جس پر مغربی تہذیب کی عمارت استوار ہے۔ دوسرا نظام وہ ہے جس میں یہ کہا جاتا ہے کہ معاشرہ کی جو جزئیات ایک دفعہ متعین ہو گئیں۔ ان میں کبھی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ جو کچھ اسلاف سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اخلاف کو وہی کچھ کرتے رہنا چاہیئے۔ اس

ی قسم کا تغیر و تبدل گناہ ہے۔ اسے عام مفہوم کے مطابق مذہب یا دھرم یا (Religion) کہتے ہیں۔ اور پیشوائیت (Priestcraf) اس کی محافظ اور علمبردار ہوتی ہے۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ اسلام نہ مغربی انداز فکر کے مطابق ہب ہے۔ اور نہ ہی مشرقی اسلوب زندگی کے مطابق دھرم یا مذہب۔ وہ دونوں کے خلاف دین ہے۔ جس میں ثبات و تغیر دونوں تزاج ہوتا ہے۔

قرآن نے ربوبیت عامہ کو معاشرے کی ذمہ داری قرار دے کر سرمایہ داری کے تصور کو ختم کر دیا۔ اور دھرم کو دین سے بدل کر ائیت کے ادارے (Institution) کو مٹا دیا۔ لیکن جب مسلمانوں کی نگاہوں سے قرآن اوجھل ہوا تو ان دونوں نیت کش سانپوں نے اپنے اپنے بلوں سے پھر سر نکالا۔ اس مقام پر ایک اور حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ سرمایہ داری صرف تبداد کے زور پر قائم رہ سکتی ہے۔ اس کے پاس دولت اور اس کی بنا پر حاصل کردہ قوت کے سوا کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ اگر غریبوں مزدوروں کے سر سے قوت کے ڈنڈے کو ہٹا کر انہیں تھوڑے سے وقت کے لئے بھی آزادانہ سوچنے کا موقعہ دیدیا جائے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ سرمایہ داری ظلم و استبداد کے سوا اور کچھ نہیں۔ لہذا سرمایہ داری کی مسلسل کوشش یہ رہی ہے کہ عوام زادانہ سوچنے کا موقعہ ہی نہ دیا جائے۔ اس کے لئے اس کے پاس قوت کا ڈنڈا ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ قوت خواہ کتنی ہی برادر قاہر کیوں نہ ہو زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھی جا سکتی۔ قوت کو برقرار رکھنے کے لئے ایک مسلسل تناؤ (Tension) کی رورت ہوتی ہے۔ جو بجائے خویش مستقل عذاب ہوتا ہے۔ اس لئے سرمایہ داری کو اس مقصد کے حصول کے لئے کسی اور آسرے ضرورت ہوتی ہے۔ یہ آسرا پیشوائیت بہم پہنچاتی ہے۔ وہ عوام سے کہتی یہ ہے کہ

(۱) امیر اور غریب کی تفریق خدا کی طرف سے ہے جس نے مختلف افراد کی تقدیر (قسمت) متعین کی ہے اسی کے مطابق رزق کی تقسیم ہوتی ہے۔

(۲) دولت اور جائداد کی ذاتی ملکیت پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ نہ ہی غریبوں کو دولتمندوں پر رشک کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اللہ کے مقرب غریب ہی ہوتے ہیں۔

(۳) یہ تمام امور مذہب سے متعلق ہیں۔ اور مذہب انسانی عقل و فکر سے ماوراء ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں سوچ بچار کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ہمیں جو کچھ اسلاف سے ملے اس پر آنکھیں بند کر کے چلتے رہنا چاہیئے۔

ائیت اس طرح عوام کو ان کی حالت پر مطمئن رکھ کر ان سے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سلب کر لیتی ہے۔ اس طرح سرمایہ داری ت کے استعمال کے بغیر اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ آپ تاریخ کے صفحات کو الٹ کر دیکھئے ہر جگہ سرمایہ داری (ملوکیت) پیشوائیت کا چولی دامن کا ساتھ نظر آئے گا۔ لہذا جب مسلمانوں میں سرمایہ داری نے پھر سے سر نکالا تو اس کے ساتھ ہی پیشوائیت میدان میں آگئی۔ اور اس نے دین کو دھرم سے بدل دیا۔

طلوع اسلام نے جب آئینِ پاکستان کے سلسلہ میں قرآن کے پیش کردہ دین کی طرف دعوت دی تو سرمایہ داری اور

پیشوائیت کی دونوں قوتیں پورے جوش وخروش سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ چونکہ بے نقاب سرمایہ داری ہمیشہ بدنام رہی۔ اس دور میں وہ بدنام سے بدنام تر ہو چکی ہے) اس لئے وہ کھلے بندوں کبھی سامنے نہیں آتی۔ ہمیشہ پیشوائیت کے سا تلے آگے بڑھتی ہے۔ موسیٰ (علیہ السلام) کے مقابلے کے لئے فرعون خود مقابلے کے لئے نہیں آتا۔ ہامان کے مندروں کے ساحر آگے بڑھاتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ پیشوائیت کے پاس اپنے مسلک کی تائید میں علم وبصیرت اور دلائل وبراہین نہیں ہو فریق مقابل کے خلاف عوام کے جذبات کو بھڑکاتی ہے۔ اور ہنگامہ خیزیوں اور غوغا آرائیوں سے اس کی آواز کو ا کا "جہادِ عظیم" شروع کر دیتی ہے۔ تدوین آئین کے سلسلہ میں طلوع اسلام نے جس مسلک کو پیش کیا تھا۔ اس کے خلاف کے جذبات کو مشتعل کر دینا اور بھی زیادہ آسان تھا۔ طلوع اسلام نے کہا یہ تھا کہ

(۱) قرآن کریم نے (بجز چند مستثنیات) دین کے صرف اصول بیان کئے ہیں۔ ان کی جزئیات متعین نہیں کیں۔ اس لئے کہ اصول ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتے ہیں۔ اور جزئیات زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً قرآن نے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے تو اس کی جزئیات کہیں متعین نہیں کیں۔ مقصد یہی تھا کہ ملت کا اسلامی نظام ان جزئیات کو خود متعین کرے۔ اور حسب ضرورت اس میں تبدیلیاں کی جائے

(۲) ان جزئیات کو سب سے پہلے رسول اللہؐ نے متعین فرمایا۔ حضورؐ کے بعد آپؐ کے خلفائے راشدینؓ نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر جہاں جہاں ضرورت سمجھی۔ ان میں تبدیلیاں بھی کیں اور اضافے بھی۔

(۳) نہ رسول اللہؐ نے اور نہ ہی خلفائے راشدینؓ نے اپنے ان فیصلوں کو محفوظ کر کے ان کا مجموعہ امت کو دیا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ ان کا منشاء یہ تھا ہی نہیں کہ یہ فیصلے ابدالآباد تک غیر متبدل رہیں اگر یہ فیصلے دین کا جزو تھے۔ اور قیامت تک کے لئے امت کے لئے اسی شکل میں واجب العمل، تو کم از کم حضورؐ کا یہ فریضہ رسالت تھا کہ ان کا مستند مجموعہ محفوظ شکل میں امت کو دیا جاتا۔

ان تصریحات کے بعد طلوع اسلام نے کہا تھا کہ اب اگر پاکستان اپنا نظام علیٰ منہاج نبوت وخلافت راشدہ قائم کر ہے۔ تو اسے قانون سازی کے لئے یہ اصول مقرر کرنا چاہیئے کہ۔

(۱) سب سے پہلے قرآنی اصولوں اور اپنے زمانے کی ضرورتوں کو سامنے رکھا جائے۔

(ب) ہماری مروجہ شریعت میں جو جزئیات ایسی ہیں جو قرآنی اصولوں کے مطابق ہیں۔ اور ہماری ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ انھیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے۔ لیکن جو قرآن کے کسی اصول کے خلاف ہوں یا ہمارے زمانے کے تقاضوں کو پورا نہ کرتی ہوں، ان میں مناسب رد وبدل یا حک و اضافہ کر لیا جائے۔ اور

[illegible]

یہ تھا مختصر الفاظ میں وہ مسلک جو طلوع اسلام نے پیش کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس مسلک میں پیشوائیت کی کہیں گنجائش نہیں رہتی۔ پیشوائیت اپنے آپ کو لاینفک (Indispensable) اس طرح بناتی ہے کہ

(۱) وہ پہلے یہ عقیدہ منواتی ہے کہ مذہب میں جو فیصلہ ایک دفعہ ہو چکا ہے۔ وہ غیر متبدل رہتا ہے۔ اور امت کے لئے اس پر من وعن عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

(۲) یہ فیصلے کسی ایک جگہ مدون شکل میں موجود نہیں۔ سینکڑوں کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ پھر ان میں تضاد بھی ہے۔ بعض ان میں غیر مستند بھی ہیں۔ ان کا علم علماء ہی کو ہو سکتا ہے۔ لہذا جب کوئی معاملہ سامنے آئے۔ تو اس کے متعلق علماء ہی سے پوچھنا چاہیئے کہ اس کے متعلق شریعت کا فیصلہ کیا ہے۔ اس فیصلہ کو "کتاب وسنت" کا فیصلہ کہا جائے گا۔

لہذا پیشوائیت کی طرف سے اس مسلک کی مخالفت ہونی ضروری تھی۔ چنانچہ انہوں نے اس کی مخالفت کی اور جی بھر کر مخالفت کی۔ اس کے لئے اگر وہ یہ کہتے کہ ہم اس لئے مخالفت کر رہے ہیں کہ اس سے ہماری ہستی ختم ہو جاتی (یا خطرے میں پڑتی) ہے۔ تو کوئی ان کا ساتھ نہ دیتا۔ اس لئے انہوں نے کہنا یہ شروع کیا کہ اس سے (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خود ذات رسالتمآب کی رسالت ختم ہو جاتی ہے! آپ سوچئے کہ وہ کون سا مسلمان ہے کہ جب اس سے یہ کہا جائے کہ فلاں شخص (پناہ بخدا) رسول اللہؐ کی رسالت ختم کرنے کے درپے ہے۔ تو اس کا خون کھولنے لگ جائے۔ پیشوائیت اپنی حفاظت کے لئے ہمیشہ خدا اور رسولؐ کے نام کو سپر بناتی ہے۔ ملک کے ارباب بست وکشاد میں اکثر حضرات ایسے ہیں جو طلوع اسلام کے پیش کردہ مسلک کو دین کی صحیح تعبیر سمجھتے ہیں۔ لیکن پیشوائیت نے اس ہنگامہ خیزی کو اس حد تک پہنچا دیا کہ انہوں نے بھی پیشوائیت کا ساتھ دینے میں ہی مصلحت سمجھی۔

اور اس طرح ہمارا یہ آئین جسے دین خداوندی کا منشور بننا تھا، بدقسمتی سے پیشوائیت کے خود ساختہ مذہب کا صحیفہ بن کر رہ گیا۔ چونکہ اس وقت فضا ایسی پیدا کردی گئی ہے۔ جس میں کسی کو غور وفکر سے کام لینے کی فرصت ہی نہیں۔ اس لئے اس وقت لوگوں کے لئے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اس قسم کے غلط اسلامی آئین کے نقصانات کس قدر دور رس ہوتے ہیں۔ اس وقت ہمارے ہاں مذہبی طبقہ میں دو قسم کے لوگ موجود ہیں۔ ایک وہ ہیں جن کا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کے متعلق پہلے سے کوئی نہ کوئی فیصلہ موجود نہ ہو۔ ان میں سے ایک جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ فیصلے احادیث کے اندر ہیں اور احادیث کے متعلق یہ فیصلہ بھی پہلے سے ہو چکا ہے کہ ان میں سے کونسی صحیح اور کونسی غلط ہیں۔ جن احادیث کو صحیح قرار دیدیا گیا ہے۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ دوسری جماعت وہ ہے۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ فیصلے فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اور چونکہ فقہ میں اجتہاد مطلق کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس لئے اس حد تک ان فیصلوں میں کوئی ردوبدل نہیں ہو سکتا۔

اگر قانون سازی کے سلسلہ میں یہ گروہ غالب آگیا (خواہ وہ اہل حدیث کا ہو یا اہل فقہ کا) تو آپ کا قانون جامد اور منقبض ہو کر رہ جائے گا۔ اور چونکہ یہ زمانے کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکے گا۔ اس لئے کچھ وقت کی کشمکش کے بعد ملک کو مجبوراً یہ روش اختیار کرنی پڑے گی کہ مذہب کا دائرہ شخصی قانون (پرسنل لاء) تک محدود ہے۔ اس سے باہر سیاست کا دائرہ شروع ہو جاتا ہے۔ اور سیاسی امور سے متعلق معاملات، مذہب کی دخل اندازی کے بغیر طے پاتے ہیں یعنی مذہب و سیاست کی وہ تفریق جو ہمارے دور ملوکیت میں پیدا ہو گئی تھی۔ بدستور جاری رہیگی۔

دوسرا طبقہ ہمارے ہاں جماعت اسلامی یا ان کے مؤیدین پر مشتمل ہے۔ یہ سیاسی جماعت ہے جس کا مقصد اپنی ڈکٹیٹرشپ کا قیام ہے۔ مذہب کو اس مقصد کے حصول کے لئے بطور آلہ کار استعمال کیا جاتا ہے۔ قانون سازی میں "سنت" کو یہ بھی لابدی قرار دیتے ہیں لیکن ان کے ہاں اس کی تعبیر عجیب و غریب ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ

(۱) سنت رسول اللہ احادیث کے مجموعوں سے اخذ کی جاتی ہے۔

(۲) احادیث کے موجودہ مجموعوں میں غلط اور صحیح ہر قسم کی احادیث مخلوط ہیں۔

(۳) ائمہ حدیث نے صحیح اور غلط حدیثوں کی جو تقسیم کر رکھی ہے۔ وہ کلیتہً قابل اعتماد نہیں کونسی حدیث صحیح ہے اور کونسی غلط اس کا فیصلہ "مزاج شناس رسولؐ" کی جوہری نگاہ کر سکتی ہے۔

(۴) اور یہ "مزاج شناس رسولؐ" ان کے امیر سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب ہیں۔

یہ کچھ تو وہ اس وقت تک کہتے تھے۔ اب وہ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین۔ تم پر میری سنت اور خلفائے راشدین مہدیین کی اتباع واجب ہے۔ اس وقت تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ اس حدیث میں خلفائے راشدین سے مراد اولین خلفائے اربعہ (جا نشینان رسول) ہیں۔ اسی بنا پر سنت رسول اللہ میں سنت خلفائے اربعہ کو بھی داخل سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب جماعت اسلامی نے اس حدیث کی تعبیر یوں کی ہے کہ

> خلفائے راشدین میں یہاں متعین اور مخصوص اشخاص مراد نہیں بلکہ آپ کے وہ جانشین مراد ہیں۔ جو آپ کے بعد آپ کی امت کی زمام کار اپنے ہاتھوں میں سنبھالیں گے۔ اور حضور ہی کے طریقہ پر اپنے فرائض سرانجام دیں گے۔ اس لفظ کے اندر وہ تمام خلفائے راشدین داخل ہیں جو آپ کی امت کے اندر پیدا ہوئے یا آئندہ پیدا ہوں گے۔ اور حکومت کے فرائض صحیح اسلامی طریق پر انجام دیں گے۔

(ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۵۶ء صفحہ ۳۳۳)

اس کے ساتھ مودودی صاحب کے اس اعلان کو دیکھئے جو انہوں نے اپنی سرگودھا کی تقریر میں کیا تھا کہ

اس وقت جماعت اسلامی نے دو بڑے کام کئے ہیں۔ پہلا کام جماعت نے یہ کیا ہے کہ اس نے ملک میں قابلِ اعتماد کیریکٹر رکھنے والوں کو منظم کیا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کی اس وقت ہمارے ملک کو بڑی ضرورت ہے۔ (الاعتصام۔ ۱۵ر جولائی ۱۹۵۵ء)

یعنی جماعت اسلامی نے ملک کے قابلِ اعتماد کیریکٹر والے لوگوں (صالحین) کو چن چن کر اپنے اندر شامل کر لیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ملک میں "حکومت کے فرائض کو صحیح اسلامی طریق پر انجام دینے والے" لوگ جماعت اسلامی کے افراد ہی ہو سکتے ہیں۔ باقی لوگوں کی اکثریت کی حالت یہ ہے کہ "ان کے کیریکٹر اور کردار پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ قومی امانت اور کوئی کام ان کے سپرد کر کے انسان مطمئن نہیں ہو سکتا۔ کوئی قول اور قرار اس خطرے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا کہ قول و اقرار کرنے والے صاحب اپنے قول سے پھر نہ جائیں۔ اس کیفیت میں ملک کی عظیم اکثریت مبتلا ہے۔" (ایضاً) جب اقتدار اس جماعت کے ہاتھ میں آئے گا۔ تو اسے خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جائیگا۔ اور ان کے فیصلے سنتِ خلفائے راشدین میں داخل ہوں گے۔ جن کی اتباع ہر مسلمان پر از روئے کتاب و سنت واجب ہو گی۔

آپ سوچئے کہ جس ملک میں اس قسم کی مذہبی ڈکٹیٹرشپ قائم ہو جائے اس کا حشر کیا ہو گا؟ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے اربابِ حل و عقد نے سوچا ہی نہیں کہ وہ آئین کی اس شق کی رو سے کتنے بڑے خطرے کو دعوت دے رہے ہیں۔

(۲) مذہبی فرقے کتاب و سنت کی اس تعبیر کا لازمی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کے مختلف مذہبی فرقوں کو آئینی حیثیت عطا کر دی جائے۔ چنانچہ شق (ب ۱۹۸(۳)) میں انھیں یہ حیثیت دیدی گئی ہے۔ اس شق میں یہ کہا گیا ہے کہ جس فرقے سے کوئی شخص متعلق ہو گا۔ اس کے لئے کتاب و سنت کی اسی تعبیر کو صحیح قرار دیا جائے گا۔ جو تعبیر اس فرقے کے نزدیک صحیح ہو گی۔ لیکن اس آئین کی رو سے پاکستان کے ہر مسلمان کو قانوناً کسی نہ کسی فرقے سے متعلق ہونا پڑے گا۔ حالانکہ قرآن کریم بہ نص صریح فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ اربابِ مذہب میں سے کسی نے اس شق کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ لیکن وہ اس کے خلاف آواز کس طرح اٹھاتے۔ یہ شق تو خود انہی کی تجویز کردہ ہے۔ چنانچہ "اکتیس علماء" نے جو مسودۂ قانون مرتب فرمایا تھا۔ اس میں اس شق کو خاص طور پر درج کیا گیا تھا۔

آپ نے غور کیا کہ جس چیز کو قرآن واضح الفاظ میں شرک قرار دیتا ہے۔ وہ ہمارے اربابِ شریعت کے نزدیک کس طرح متفقہ طور پر عینِ اسلام بن جاتی ہے؟

(۳) ایک اہم سقم ان اصولی اعتراضات کے علاوہ اس باب میں ایک ایسا سقم ہے۔ جو آگے چل کر بڑی دشواریاں پیدا کر دے گا۔ دستور کی یہ شق یوں ہے کہ

(۱) ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں کیا جائے گا۔ جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔ اور موجودہ تمام

قوانین کو کتاب و سنت کے مطابق بنا دیا جائے گا۔

(۲) اس پر عملدرآمد صرف حسب ذیل طریق سے ہوگا۔ یعنی

(۳) ایک کمیشن بٹھایا جائے گا جو کتاب و سنت کے مطابق قوانین کی فہرست مرتب کرے گا۔ یہ فہرست صوبائی اور مرکزی مجالس مقننہ کی راہ نمائی کا کام دے گی۔

ذہن کر لیجئے کہ ایسی فہرست مرتب کر کے مجالس مقننہ کے پاس بھیجدی گئی۔ کمیشن اپنا کام سرانجام دے کر برخاست ہو گیا اس کے بعد کوئی ایسا معاملہ سامنے آیا جس کے متعلق اس فہرست میں کچھ نہیں کہا گیا۔ تو اس کے متعلق کیا ہوگا؟ کیا پھر کمیشن بٹھایا جائے گا۔ اور اس کی رپورٹ مجالس مقننہ کے پاس بھیجی جائے گی۔ آئین کی مندرجہ بالا شق کی رو سے اس کے سوا کوئی دوسری صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ کیونکہ اس میں لکھا ہے کہ کتاب و سنت سے متعلق شق پر عمل کرنے کا صرف یہی طریق ہے۔ بہرحال یہ طریق کار کا سقم ہے۔ اصولی اسقام وہ ہیں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ آپ ان تصریحات پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ اور پھر سوچئے کہ طلوع اسلام اس آٹھ سال کے عرصہ میں جس معاملہ کی طرف جس تکرار و اصرار سے توجہ دلاتا رہا ہے۔ اس کی نوعیت اور اہمیت کیا ہے۔ اور اس پر اس کے خلاف جو طوفانِ سب و شتم اٹھایا اور کہرام طعن و تشنیع مچایا گیا ہے۔ اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔ وہ خطرات جن کی طرف طلوع اسلام نے بار بار توجہ دلائی ہے، جب عملاً سامنے آئیں گے تو ہو سکتا ہے کہ اُس وقت ہم نہ ہوں۔ لیکن ہماری آنے والی نسلیں کم از کم اتنا تو دیکھ لیں گی کہ اُس وقت کسی نے قوم کو ان خطرات سے آگاہ کر دیا تھا۔

*

حرفِ آخر یہ ہے مختصراً ہماری (بصیرت کے مطابق) دستورِ پاکستان کا تجزیہ قرآنی روشنی میں۔ جیسا کہ ہم شروع میں کہہ چکے ہیں ہم نے اس تبصرے کی ضرورت اس لئے سمجھی ہے کہ جو لوگ دل سے آرزومند ہیں کہ ہمارا آئین اسلامی بنیادوں پر استوار ہو انہیں معلوم ہو جائے کہ موجودہ دستور میں (اس نقطۂ نگاہ سے) کیا کیا خامیاں ہیں۔ اور یہ کس ترمیم کے بعد اسلامی بن سکتا ہے۔ چونکہ اس دستور میں آئینی طور پر ترمیمات کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس لئے آئینی جدوجہد سے ایسا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا وہی لوگ کر سکیں گے جو پہلے اچھی طرح سے خود سمجھیں کہ بات ہے کیا۔ اور پھر وہ اتنی ہمت بھی رکھتے ہوں کہ تمام مخالفتوں کے باوجود پوری جرأت کے ساتھ اسے پیش کر سکیں۔

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر

بہرحال طلوع اسلام تو اپنی بے بضاعتی کے باوجود اس مہم کو جاری رکھے گا ہی۔ وبیدہ التوفیق۔

جمہ از احمد امین مصری مترجمہ محترم عمر احمد عثمانی صاحب

اسلام کی سرگزشت

باب سوم ——— ایرانی اور ان کے اثرات

(گذشتہ اقساط میں اس سے بحث کی گئی تھی کہ ——— اسلامی فتوحات کے زیر اثر بین الاقوامی اختلاط سے مسلمانوں کی عقلی اور دینی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ اور مسلمانوں کی زندگی کے کن کن شعبوں کو انہوں نے متاثر کیا۔ اب ہم اپنے موضوع سے متعلق مختلف حرکات ——— حرکت عقلیہ وغیرہ (جو اپنے وسیع معنوں میں علم اور دین دونوں کو شامل ہے) ——— کے متعلق ذرا تفصیل سے بیان کریں گے ——— ایران کا ایک دین تھا۔ ان کی ایک حکمت تھی۔ ان کی اپنی ممتاز عقلیت تھی۔ اسی طرح رومیوں کا بھی ایک دین، علم اور عقلیت تھی۔ اور ان دونوں نے امت اسلامیہ پر بڑے ہی گہرے اثرات مرتب کئے تھے۔ اب ہم ان دونوں کے اثرات کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔)

فصل اول

ایرانیوں کا دین

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ اسلامی فتوحات کے بعد ایران کی خود مختاری ختم ہو چکی تھی۔ ایران اسلامی مملکت کا ایک حصہ ن چکا تھا۔ لاتعداد ایرانی عربوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے جن میں سے کچھ غلام بنا لئے گئے۔ اور عربوں میں تقسیم کر دیئے گئے[1]۔ ایرانیوں کی اکثریت مسلمان ہو گئی۔ اور انہوں نے عربی زبان سیکھ لی۔ حتیٰ کہ دوسری ہی نسل میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے۔ جو عربوں کی طرح بے تکان عربی بول سکتے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی تمام باتوں میں عربوں کے برابر ہو گئے تھے۔ ان کے عقائد عربوں کی طرح

---

[1] ہم تاریخ کے اس بیان کو صحیح نہیں سمجھتے۔ (طلوع اسلام)

نہیں تھے۔ ان کی تمنائیں، اندیشے، جذبات، رجحانات عربوں کی طرح نہیں تھے۔ اور نہ ہی ان کی عقلیت عربوں کی طرح تھی۔ انھوں نے اسلام کو قبول تو کیا مگر اسلام کو ایرانی رنگ میں رنگ دیا۔ وہ پرانے دین کے جملہ عقائد و تقلیدات سے الگ تھلگ نہیں ہوگئے۔ انھوں نے اسلام کو اسی قدر سمجھا جس قدر ان کا پرانا دین جو ایران کی قوم پشتہا پشت سے چلی آ رہی تھی۔ انھیں سمجھنے کی اجازت دیتا تھا۔ اسی پرانے دین کے عقائد و تقلیدات میں وہ جوان اور بوڑھے ہوئے تھے۔ ان کی اکثریت نے عربی زبان بھی سیکھ لی تھی لیکن وہ اپنے ایرانی تخیلات کو تو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اور اپنی قوم کے اشعار، امثال اور حکم کو تو نہیں بھلا سکتے تھے۔ اس کا فطری نتیجہ یہی تھا کہ اس راستے سے اسلام میں کچھ نئی تعلیمات اور نئے دینی رجحانات داخل ہو جائیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد ہی اس کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ اسلام میں ان اثرات کا واضح ترین نمونہ تشیع (شیعی مذہب) اور تصوف تھا۔ نیز یہ بھی اسی کا اثر تھا کہ ادب عربی اس کے ایرانی ضرب الامثال اور حکم، ایرانی کہانیوں اور ایرانی تخیلات میں بری طرح سے ڈوب گیا۔

اس زمانہ میں ایرانیوں کا ایک موثر دین اور بااثر لٹریچر موجود تھا۔ مختصراً ہمیں ان کے دین اور لٹریچر کا جائزہ لینا چاہیئے۔ تاکہ ہم اس کے اثرات کو سمجھ سکیں۔ ہمیں یہاں ان کے دین اور لٹریچر اور ان کے تدریجی ارتقاء کا ابتدائی دور سے جائزہ لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ ہمارے مقصد کے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں ہوگا۔ بلکہ ہمیں یہاں ان کے دین اور لٹریچر کے صرف اس حصہ کا جائزہ لینا ہے جو ساسانی دور حکومت میں پایا جاتا تھا۔ یہی خاندان اسلام سے پہلے ایران پر برسر حکومت تھا۔ اس کی حکومت سنہ ۲۲۶ء سے لے کر سنہ ۶۴۱ء تک قائم رہی۔ تا آنکہ عربوں نے ان کے ہاتھ سے حکومت چھین لی۔ اور ایران کو اپنے زیر نگیں کر لیا۔ یہ دولت ساسانیہ ہی تھی جس نے دینی اور ادبی ہر جہت سے مسلمانوں پر براہ راست اثر ڈالا تھا۔

ایرانیوں کا دین

ایرانی۔ بلکہ آریائی نسل عموماً۔ اس بات میں مشہور چلے آتے ہیں کہ یہ لوگ دوسری اقوام کی بہ نسبت مظاہر طبیعیہ کی پرستش کی طرف زیادہ رجحان رکھتے ہیں۔ صاف آسمان، روشنی، آگ، ہوا، بارش کا پانی ان کے لئے بڑے ہی جاذب نظر ہوتے ہیں۔ اور وہ ان کی پرستش اس عقیدے کے ماتحت شروع کر دیتے ہیں کہ یہ الوہیتی کائنات ہیں۔ چنانچہ وہ سورج کو اللہ کی آنکھ اور روشنی کو اللہ کا بیٹا سمجھتے اور انہی ناموں سے پکارتے ہیں۔ جیسا کہ تاریکی اور قحط سالی کو بھی الوہیتی کائنات سمجھتے اور انہیں شریر اور ملعون گردانتے ہیں۔

اپنے ابتدائی دور سے انھوں نے انسان کو بھلائی کے دیوتاؤں کے سامنے کھڑا کر رکھا ہے۔ جن سے وہ مدد مانگتا ہے۔ ان کے لئے نمازیں پڑھتا ہے۔ ان کی تسبیح و تحمید کرتا ہے۔ اور ان کے سامنے قربانیاں پیش کرتا ہے۔

ان کا خیال ہے کہ خیر اور بھلائی کے دیوتا ہمیشہ شر اور برائی کے دیوتاؤں سے برسر پیکار رہتے ہیں۔ اور انسانوں کے اعمال یعنی ان کی نمازیں وغیرہ شر کے دیوتاؤں سے جنگ کرنے میں خیر کے دیوتاؤں کی مدد و اعانت کرتے ہیں۔ آگ کو انھوں نے روشنی کا رمز قرار دیا ہے۔ بالفاظ دیگر آگ ان کے ہاں خیر کے دیوتاؤں کا ایک مظہر ہے۔ جسے وہ اپنی عبادت گاہوں میں روشن رکھتے اور ان کی امداد کے لئے اسے برابر پھونکتے رہتے ہیں۔ تاکہ خیر کے دیوتاؤں کو قوت حاصل ہو۔ اور وہ شر کے دیوتاؤں پر فتحمند ہو سکیں۔ یہ آگ ان

کہاں ایک شاعرانہ سرسبز خیال کا سرچشمہ تھی۔

(۱) زردشت (ZOROASTER)

اس کے بعد زردشت — ایرانی نبی — آگیا۔ جس نے چند نئی تعلیمات کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ ان تعلیمات کی بنیاد اسی پرانے دین پر تھی جس میں چند اصلاحات کر دی گئی تھیں۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک زردشت کا وجود ہی محل شک بنا ہوا ہے۔ جن لوگوں نے زردشت کا وجود ثابت کیا ہے ان میں پھر اس میں سخت اختلاف ہے کہ وہ کس زمانہ میں تھے۔ یہ تاریخی اقوال چھ ہزار سال قبل مسیح سے لے کر چھ سو قبل مسیح تک چلے جاتے ہیں۔ پروفیسر جیکسن (JACKSON) نے ان کی زندگی کے بارے میں ایک قابل قدر کتاب تصنیف کی ہے۔[1] اس کتاب نے زردشت کے وجود کو ثابت کرنے والوں کے پلڑے کو جھکانے میں بڑا کام کیا ہے۔ پروفیسر جیکسن اپنی تحقیق میں اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ زردشت ایک تاریخی شخصیت ہیں۔ فرضی وجود نہیں ہیں۔ وہ قبیلہ میڈیا سے تعلق رکھتے تھے (جو ایران کے مغربی شمالی حصہ میں آباد تھا) ساتویں صدی مسیحی کے نصف کے لگ بھگ ان کا دین ظاہر ہوا تھا۔ ان کی وفات سنہ ۵۸۳ء قبل مسیح میں ہوئی جبکہ ان کی عمر تقریباً ستر سال کی تھی۔ ان کا وطن آذر بائیجان تھا۔ لیکن ان کو ابتدائی کامیابی بلخ میں حاصل ہوئی جبکہ شہنشاہ گشتاسپ[2] ان کے دین میں داخل ہو گیا۔ اور اس کے بعد ان کا دین بلخ سے لے کر تمام ایران میں پھیلتا چلا گیا۔

تاہم پروفیسر جیکسن کے بعض نتائج تحقیق ایسے ہیں۔ جن میں کافی بحث کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔ زردشتی دین کے پیرو بہت سے معجزات اور خوارق عادات و بشارات بیان کرتے ہیں۔ جو ان کی پیدائش کے ساتھ معرض وجود میں آئے تھے۔ ان لوگوں کا بیان ہے کہ وہ بچپن ہی سے تدبر اور تفکر کی طرف مائل تھے۔ گوشہ نشینی ان کو مرغوب تھی۔ اس گوشہ نشینی کے دوران میں انھوں نے سات خواب دیکھے۔ اور ان خوابوں کے بعد انھوں نے اپنے رسول ہونے کا اعلان کیا۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں جنھیں خدا نے اس لئے بھیجا ہے کہ دین کے ساتھ جو گمراہیاں لاحق ہو گئی ہیں وہ ان کو دور کر دیں اور حق کی طرف لوگوں کی ہدایت کریں۔ وہ عرصہ دراز تک لوگوں کو دعوت دیتے رہے۔ لیکن چند لوگوں کے سوا ان کی دعوت کو کسی نے قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد ان کو وحی کی گئی کہ وہ بلخ کی طرف ہجرت کر جائیں۔ جہاں پہونچ کر انھوں نے شاہی محلات میں اپنی دعوت کو پھیلایا۔ چنانچہ ابتداً وزیر کے بیٹوں نے اور پھر ملکہ نے ان کے دین کو قبول کر لیا۔ شاہی محلات کے دوسرے لوگوں نے ان کا مقابلہ کیا۔ اور بہت جھگڑا کیا۔ لیکن جب خود بادشاہ بھی یعنی گشتاسپ بھی ان کے دین میں داخل ہو گیا۔ تو زردشت کو مخالفین کے مقابلہ میں زبردست تقویت حاصل ہو گئی۔ بادشاہ نے جب اس نئے دین کو اختیار کر لیا۔ تو لوگ فوج در فوج ان کے دین میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔

زردشت کی تعلیمات

گزشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ زردشت سے پہلے ایرانیوں نے اپنے دین کی بنیاد

---

[1] اس کتاب کا نام LIFE OF ZOROASTER ہے۔

[2] شاہنامہ میں اس بادشاہ کا نام گشتاسپ آیا ہے۔

دو امور پر رکھی تھی۔

(۱) اس دنیا کا ایک قانون ہے۔ جس پر وہ چلی جا رہی ہے۔ اور اس کے کچھ طبعی ظواہر ہیں جو اپنی جگہ پر ثابت ہیں۔

(۲) یہاں مختلف قوتوں یعنی نور اور ظلمت، شادابی اور قحط سالی وغیرہ میں باہمی نزاع اور تصادم چلا آرہا ہے۔

زردشت کی تعلیمات بھی انہی دونوں بنیادوں پر مبنی ہیں۔ البتہ ان سے پہلے ایرانی بہت سی ارواح خیر کی پرستش کیا کرتے تھے۔ جن کی تعداد کافی تھی۔ زردشت نے ان کو ایک خدا میں جمع کر کے توحید پیدا کردی۔ اور اس کا نام "اَھُورَا مَزْدَا" رکھا یہی کچھ قوائے شر کے بارے میں بھی انھوں نے کہا۔ اور ان سب کو ایک چیز میں منحصر کر دیا۔ جس کا نام "دروج اھرمن" رکھا اس طرح ان کے نزدیک صرف دو قوتیں باقی رہ گئیں۔ ایک قوتِ خیر اور دوسرے قوتِ شر۔

زردشت کی ایک کتاب مقدس بھی ہے۔ جس کا نام افستا (AVESTA) ہے۔ اس کی ایک شرح بھی ہے۔ جس کا نام "زندافست" ہے۔ مسعودی نے کہا ہے کہ اس کتاب کا نام "الابستا" ہے جب اسے معرب بنالیتے ہیں۔ تو اس میں قاف بڑھا لیتے ہیں۔ اور "الابستاق[۱]" کہتے ہیں۔ اس کی سورتوں کی تعداد اکیس ہے۔ اور اس کی ہر سورت دو سو ورق پر آئی ہے۔ یہ کتاب قدیم فارسی زبان میں ہے۔ اس زبان کو سمجھنے والا آج کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ موجودہ فارسی زبان میں اس کی کچھ سورتیں منتقل کردی گئی ہیں۔ جو آج پارسی لوگوں کے ہاتھوں میں موجود ہیں۔ جنھیں وہ اپنی نمازوں میں پڑھتے ہیں۔ ان میں سے بعض سورتوں میں عالم کے مبداء اور منتہا کے متعلق بیان ہے۔ اور بعض سورتوں میں نصیحت کی باتیں درج ہیں۔

افستا کی اصل اور اس کے حقیقی مصنفین کا مسئلہ خود زردشت کے وجود کی طرح محققین کے مابین ہمیشہ سے محل بحث رہا ہے۔ "برسیرل" کا کہنا ہے کہ "افستا دولت ساسانیہ کے عہد میں ایک تصنیف تھی۔ جس میں اکیس سورتیں تھیں۔ لیکن آج ہمارے زمانے میں ان میں سے صرف ایک مکمل سورت اور مختلف سورتوں کی چند آیات باقی رہ گئی ہیں۔ یہ جو کچھ ہم تک پہنچا ہے۔ صرف چند مقطعات پر مشتمل ہے۔ جن کا تعلق شعائر دینی اور زردشتی معابد کے قوانین سے ہے۔

فتح کے وقت مسلمانوں نے ان سے وہی معاملہ کیا جو اہل کتاب کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ انھوں نے ان کی کتاب کو ایسا ہی شمار کیا ہے گویا وہ ایک آسمانی کتاب ہے۔ حضرت عمرؓ کا یہ طرزِ عمل اس لئے تھا کہ ان کے سامنے رسول اللہ صلعم کی یہ حدیث بیان کی گئی تھی کہ "مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب کا سا برتاؤ کرنا"۔

ان کی تعلیمات میں مشہور یہی ہے کہ زردشت کہا کرتے تھے کہ اس دنیا کی دو اصلیں یا دو خدا ہیں (۱) خیر کی اصل وہ "اھورا" یا "اھورا مزدا" ہے اور (۲) شر کی اصل اور وہ "اہرمن" ہے۔ یہ دونوں مسلسل جنگ میں لگے رہتے ہیں۔

---

(۱) مسعودی میں یا کے ساتھ اسی طرح لکھا گیا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الابستاق میں یا غلط ہے اور صحیح با ہے۔ کیونکہ فارسی زبان میں فا عادۃً با سے بدل جاتی ہے۔ لہٰذا اس لفظ کی صحیح کتابت "الابستاق" ہوگی۔

دونوں اصلیں یا دونوں خدا تخلیق کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ چنانچہ خیر کی اصل تو نور ہے جس نے ہر وہ چیز پیدا کی ہے۔ جو اچھی ہے، بھلی ہے اور نافع ہے۔ چنانچہ اس نے نظام کو پیدا کیا۔ حق کو پیدا کیا۔ روشنی کو پیدا کیا۔ پہرہ دینے والے کتے کو اور مرغ کو پیدا کیا۔ اور مومن کا فریضہ ہے کہ ان چیزوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے۔ اور اس کے برعکس شر کی اصل ظلمت اور تاریکی ہے۔ اس نے وہ تمام چیزیں پیدا کیں جو دنیا میں بری ہیں۔ چنانچہ اس نے درندہ جانوروں کو، سانپوں اور اژدہوں کو حشرات الارض اور ہوام کو پیدا کیا۔ مومن کا فریضہ ہے کہ جہاں انہیں پائے قتل کر دے۔ ان دونوں روحوں کے درمیان مسلسل جنگ برپا ہے جس میں کبھی اس کو فتح ہوتی ہے۔ اور کبھی اس کو۔ لیکن آخری فتح خیر کی روح کو ہی حاصل ہوگی۔ اس جنگ میں انسان ان دونوں روحوں کے درمیان بٹ جاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو "اہورا" کی مدد کرتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں جو "اہرمن" کی مدد کرتے ہیں۔ یہ دونوں روحیں بذات خود جنگ میں حصہ نہیں لے رہی ہیں بلکہ اپنی اپنی مخلوقات کے ذریعہ سے جنگ کر رہی ہیں۔

ان دونوں روحوں کے درمیان انسان محل نزاع بنا ہوا ہے۔ کیونکہ اسے مزدا نے پیدا کیا ہے۔ لیکن مزدا نے اسے ارادہ کا آزاد پیدا کیا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے قطعاً ممکن ہے کہ وہ شریر قوتوں کا تابع فرمان ہو جائے۔ انسان کو اس کی زندگی میں دونوں قوتیں اپنی اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ اگر اس نے دین حق کو قبول کر لیا۔ اور نیک اعمال کئے اور اس طرح اپنے بدن اور روح کو پاک و صاف کر لیا۔ تو اس نے شر کی روح کو ذلیل کر دیا۔ اور خیر کی روح کی مدد کی۔ اور اس طرح مزدا کی طرف سے ثواب کا مستحق ہو گیا۔ ورنہ اس نے شر کی روح کو قوت بہم پہنچائی۔ اور اپنے اوپر مزدا کو ناراض کر لیا۔

زردشتی مذہب کے اہم ترین مبادی میں سے یہ عقیدہ بھی ہے کہ انسان کا افضل ترین عمل زراعت اور چوپایوں کی خدمت ہے۔ چنانچہ اس مذہب نے لوگوں میں کھیتی باڑی کو محبوب اور مقبول ترین پیشہ بنانے میں بڑا کام کیا۔ لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ اپنے چوپایوں کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ لوگوں کو سعی و کاوش اور عمل کا شوق دلایا حتےٰ کہ اپنے متبعین پر روزہ رکھنے کو حرام قرار دیدیا کیونکہ اس سے ان کی قوت عملیہ میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ اور زردشتی دین انہیں طاقتور اور عملی پیکر بنا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔

زردشت کی یہ بھی تعلیم تھی کہ پانی۔ ہوا۔ آگ اور مٹی پاک عناصر ہیں۔ جن کے لئے ضروری ہے کہ وہ ناپاک نہ ہوں۔ اسی کے نظام میں سے آگ کی تقدیس کا عقیدہ اور اس کو بطور رمز کے اختیار کر لینا ہے۔ بہتا پانی ان کے نزدیک ناپاک نہیں ہو سکتا نیز زمین میں مُردوں کا دفن کرنا حرام ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

انسان کی دو زندگیاں ہیں۔ ایک حیات اولیٰ ہے۔ جو دنیا میں ہوتی ہے اور دوسری حیات اخروی ہے جو موت کے بعد ہوتی ہے۔ حیاتِ آخرت میں انسان کا حصہ دراصل ان اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جو اس نے اپنی دنیوی زندگی میں کئے ہوتے ہیں اس کے تمام اعمال ایک نامۂ اعمال میں درج کئے جاتے ہیں۔ اور اس کی برائیاں ایک الگ دفتر میں شمار کی جاتی ہیں۔ موت کے بعد تین روز تک روح انسانی اپنے جسم کے اوپر منڈلاتی رہتی ہے۔ اور اسے سعادت و شقاوت اپنے اعمال کے مطابق نصیب ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے تین دن تک خصوصیت کے ساتھ خاص دینی شعائر ادا کئے جاتے ہیں۔ تاکہ روح عالم

آخرت سے مانوس ہو سکے۔ حساب کے وقت روح انسانی ایک راستہ پر سے گزرے گی جو جہنم کے دہانہ پر نصب کر دیا گیا ہوگا۔ یہ راستہ مومن کے لئے وسیع و عریض ہوگا۔ جس پر سے گزرنا آسان ہوگا۔ اور کافر کے لئے بال سے زیادہ باریک ہوگا۔ جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہوں گے۔ وہ سلامتی کے ساتھ اس راستہ پر سے گزر جائیں گے۔ اور "اہورا" سے ملاقات کریں گے۔ "اہورا" ان سے بہت اچھی طرح ملاقات کرے گا۔ اور انھیں عزت کے مقام پر اتارے گا۔ لیکن جو ایمان نہیں لائیں گے اور جنہوں نے نیک عمل نہیں کئے ہوں گے۔ وہ جہنم میں گر پڑیں گے۔ اور اہرمن کے غلام بن جائیں گے۔ اگر اس کی نیکیاں اور بدیاں برابر سر برابر ہوں گی۔ تو اس کی روح اعراف میں جا کر رہے گی۔ تا آنکہ فیصلہ کا دن آ جائے۔

دنیوی زندگی میں انسان کی نگاہوں سے وہ تمام نعمتیں اوجھل کر دی گئیں ہیں۔ جو اس کے لئے مرنے کے بعد دوسری زندگی میں خدا نے تیار کر رکھی ہیں۔ انسان میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ نیکی اور بدی میں تمیز کر سکے۔ یہ خدا کی رحمت ہے کہ وہ اپنے رسول بھیجتا ہے۔ جن کے ذریعے سے وہ لوگوں کو ہدایت دیتا ہے۔ زردشتی قصوں کہانیوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ نبوت ابتداءً جمشید شہنشاہ ایران پر نازل کی گئی تھی لیکن وہ اس بار کو اٹھا نہیں سکا۔ اور ان کی جگہ زردشت نے اسے اٹھا لیا۔ چنانچہ خدا ان سے باتیں کرتا اور ان پر وحی نازل کرتا تھا۔

زردشت کی تعلیم یہ بھی تھی کہ قیامت کا دن قریب آ چکا ہے۔ اور اس زندگی کی انتہا کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ وقت جلد آ رہا ہے جب "مزدا" اپنی قوت کو مجتمع کر کے شر کے دیوتا پر فیصلہ کن حملہ کرے گا۔ اور اسے شکست دے کر اسے اور اس کے فرماں برداروں کو جہنم میں عذاب دے گا۔

زردشت کا فلسفہ

ان دینی تعلیمات کے پہلو بہ پہلو دین زردشتی میں ہمیں وہ بحثیں بھی ملتی ہیں جن کا تعلق ماوراء مادہ ہے۔ لیکن اس باب میں اس کی بحثیں ایسی جامع نہیں ہیں — جیسا کہ یونانیوں کے ہاں ہمیں ملتی ہیں — بلکہ محض جزئی بحثیں ہیں جو ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں۔ ان بحثوں میں ہمیں وہ خصوصیت بھی ملتی ہے جو اسلام کے بعد عربوں میں بھی ہمیں نظر آتی ہے۔ یعنی یہ لوگ ماوراء مادہ سے متعلق بحثوں کو دین کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ اس کی مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ماوراء مادہ سے متعلق وہ یونانیوں کی طرح مستقل بحث نہیں کرتے۔

زردشتیوں نے جو فلسفی بحثیں کی ہیں۔ ان میں روح انسانی کی بحث بھی شامل ہے۔ دین زردشتی کی رائے میں نفس انسانی کو خدا نے عدم سے پیدا کیا اور اس میں یہ استطاعت رکھدی ہے کہ اگر وہ زمینی دنیا میں شرور سے جنگ کرتا ہے تو طرح حیات سرمدی اور حیات سعیدہ حاصل کر سکتا ہے۔ خدا نے اسے ارادہ کی آزادی بھی عطا فرمائی ہے۔ وہ اپنے اختیار ارادہ سے خیر کو بھی پسند کر سکتا ہے اور شر کو بھی۔ نفس انسانی میں مختلف قوتیں ہیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں (۱) ضمیر اللہ (۲) قوت حیویہ (۳) قوت عقلیہ (۴) قوت مدحیہ (۵) قوت حافظہ وغیرہ۔

اس کے بعد یہ مسئلہ قابل غور ہے کہ آیا دین زردشت ثنوی دین ہے۔ جس کے خیال میں دنیا پر دو خداؤں کی حکمرانی ہے

ہے ایک الٰہ خیر کی اور دوسرے الٰہ شر کی۔ اور یہ کہ ہر الٰہ کی اپنی ایک مستقل ذات ہے۔ یا دین زردشت موحد دین ہے جس کے خیال میں ایک ہی خدا کی حکمرانی چل رہی ہے۔ اور دنیا میں جو کچھ خیر و شر نظر آتا ہے۔ یا ان دو برسرپیکار قوتوں کے متعلق جو کچھ ہم بیان کرتے ہیں۔ وہ در اصل ایک ہی خدا یا الٰہ کے دو مظہر یا دو اثرات ہیں؟ اس سوال کے جواب میں محققین میں بڑا اختلاف ہے۔ اکثر محققین کی رائے یہی ہے کہ یہ دین ثنوی دین ہی ہے۔ جیسا کہ اس کی ظاہری عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ اسی رائے کی طرف یورپ کے بعض مصنفین کا رجحان بھی ہے۔ چنانچہ دائرۃ المعارف البریطانیہ (انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا) میں بہت سے محققین نے مادۂ زردشت کے ماتحت انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو زردشت کو موحد تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ شہرستانی کی یہی رائے ہے اور قلقشندی نے بھی صبح الاعشیٰ میں اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔ پروفیسر ہوج (HAUG) کہتے ہیں کہ "زردشت لاہوتی جہت سے تو موحد ہیں مگر فلسفی جہت سے ثنوی ہیں"۔ پروفیسر ہوج کا مطلب ان کے اس قول سے غالباً یہی ہے کہ وہ دینی عقیدے کی جہت سے تو یہی سمجھتے تھے کہ عالم کا الٰہ ایک ہی ہے۔ لیکن جب وہ فلسفۂ عالم کی شرح کرنے پر آتے تھے۔ اور دیکھتے تھے کہ یہاں خیر اور شر میں برابر تصادم ہو رہا ہے۔ اور اس سے کیا کیا نتائج مرتب ہو رہے ہیں تو وہ ثنوی بن جاتے ہیں۔ اور اس خیال کے مؤید بن جاتے ہیں۔ کہ اس عالم میں دو قوتیں کارفرما ہیں۔

زردشتی دین ہی ایران کا سربرآوردہ مذہب تھا۔ اور کیانیوں (ACHAEMENIAN) کے عہد میں ایران اور اس کے اردگرد کے علاقہ پر یہی دین چھایا ہوا تھا۔ اسکندر نے ۳۳۱ قبل مسیح میں فتحیابی حاصل کی تو اس سے جہاں کیانیوں کے خاندان حکومت کو پسپائی نصیب ہوئی۔ وہیں زردشتی دین کو بھی کافی صدمہ اٹھانا پڑا لیکن کچھ عرصہ کے بعد ساسانیوں کے عہد حکومت میں جو ۲۲۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ دین زردشتی نے حیات نو حاصل کی۔ اور اسلامی فتوحات کے عہد تک یہ ایران کا یہی مذہب رہا۔ اسلامی فتوحات کے بعد بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ البتہ کچھ لوگ ابتداءً خلیج فارس کے جزیروں میں بھاگ گئے۔ اور پھر وہاں سے انہوں نے ہندوستان کا رخ کیا۔ چنانچہ آج تک بمبئی میں ان کی جماعت موجود ہے۔ جو پارسی (PARSEES) کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ آج تک اپنے اسی زردشتی دین پر قائم ہیں۔ اس کے علاوہ فتوحات اسلامیہ کے بعد خود ایران میں بھی بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جو اپنے قدیم مسلک پر قائم تھے۔ چنانچہ ایران کے ہر صوبے میں ان کے آتش کدے فتوحات اسلامی کے بعد سے ابتدائی تین صدیوں تک باقی تھے[1]

---

[1] تیسری صدی ہجری کے آخر اور آٹھویں صدی مسیحی کے آخر میں ساسان امیر بلخ جو زردشتی تھا مسلمان ہو گیا۔ اور اس نے ایک اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی جو دولت ساسانیہ کے نام سے مشہور ہے۔ ۳۰۱ھ میں اہل دیلم کی ایک بڑی جماعت جو زردشتی تھے۔ ناصر الحق ابو محمد کے ہاتھ پر اسلام میں داخل ہوئی (۳۱۲ھ) ابو محمد الحسن بن علی تھے ۔۔۔ ان کا تعلق اس علوی خاندان سے تھا۔ جس کی حکومت بحر قزوین کے جنوبی کنارہ (باقی اگلے صفحہ پر)

سطور بالا میں ان کے مذہب کا اجمالی تذکرہ پڑھنے کے بعد آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مسلمانوں پر انہوں نے کتنا گہرا اثر چھوڑا تھا اس کی مزید وضاحت ہم آگے چل کر کریں گے۔ جہاں ہم دینی مذاہب پر کلام کریں گے۔ تاہم اجمالاً یہاں ہم اتنا کہہ دینا چاہتے ہیں کہ پل صراط کے بارے میں عام مسلمانوں کا عقیدہ اس تفصیل کے ساتھ جو زردشت نے بیان کی ہے۔ نیز اعراف کے بارے میں بھی مسلمانوں کے عقائد، جسم کے اوپر روح کے منڈلاتے رہنے کا تصور۔ اور اس مقصد سے تین دن تک خصوصی شعائر و مراسم کی ادائیگی یہ تمام ایسے عقیدے ہیں۔ جو دین زردشتی سے پوری پوری مشابہت رکھتے ہیں۔ اسی طرح جبر و اختیار کے بارے میں معتزلہ کے اقوال روح اور نفس کی اقسام کے بارے میں صوفیوں کے ارشادات — معاف فرمایئے گا — سب کا سب اسی دین سے ماخوذ ہے اس موضوع پر ہم انشاءاللہ کسی دوسرے مقام پر جہاں اس کا موقع ہوگا، مزید روشنی ڈالیں گے۔

(حاشیہ بقیہ گذشتہ صفحہ) پر قائم تھی۔ اہل دیلم اور اہل طبرستان کو اسلام کی طرف دعوت دی جسے اکثر لوگوں نے قبول کر لیا۔ ان میں سے کچھ بت پرست تھے اور کچھ زردشتی تھے۔ سنہ ۱۰۰۳ء (سنہ ۳۹۴ھ) میں مشہور شاعر مہیار دیلمی نے امام شریف رضی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ مہیار دیلمی آتش پرست تھا۔ اس سے پہلے دوسری صدی ہجری کے شروع (آٹھویں صدی مسیحی کی ابتداء) میں عبداللہ ابن المقفع زردشتی مذہب سے اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔ بعض زردشتی ایران میں اب تک بھی موجود ہیں۔ قریبی زمانہ میں ان کا اندازہ لگایا گیا تھا تو معلوم ہوا کہ ایران میں تقریباً ۵۸۰۰ افراد اب تک بھی آگ کی پرستش کرتے ہیں۔

مجلسِ اقبال

(باب ہشتم ۔ مسلسل)

زیرِ نظر باب کے گذشتہ حصہ میں علامہ اقبال نے یہ بتایا ہے کہ شاعر کس طرح قوم کو افیون گھول گھول کر پلاتے رہتے ہیں اور اس طرح ان
اِئے عملیہ کو مضمحل، ان کے حوصلوں کو پست اور دلولوں کو سرد کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ براہِ راست مسلمان سے مخاطب ہوتے
اور اسے کہتے ہیں کہ

اے زپا افتادۂ صہبائے او
صبحِ تو از مشرقِ مینائے او

ِشاعر کی شراب نے تجھے بھی میدانِ زندگی میں پاؤں سے اکھیڑ دیا۔ اس کے نشے سے تیرے پائے ثبات میں لغزش آگئی۔ تو اپنے
ِم سے گر گیا۔ تیری دنیا کی صبح، خدا کی کتاب منیر کے درخشندہ آفتاب کے بجائے انہی شاعروں کی شراب کی صراحی سے روشن ہے۔

اے دلت از نغمہ ہائش سرد جوش
زہرِ قاتل خوردۂ از راہِ گوش

ِشاعر کے نغموں نے تیرے سینے کی حرارتوں اور دل کے ولولوں کو یکسر ٹھنڈا کر دیا۔ اس نے تجھے کانوں کے راستے زہرِ ہلاہل پلایا
ِ تو موت کی نیند سو گیا۔

اے دلیلِ انحطاط انداز تو
از نوا افتاد تارِ سازِ تو

ِ تیری زندگی کے ہر انداز اور اسلوب سے تیری پستی اور زوال ہویدا ہے۔ تیری صورت سے پتہ چل جاتا ہے کہ تو دنیا میں کس قدر
ِ ذلیل و خوار ہو چکا ہے۔ اس کے لئے نہ کسی تحقیق کی ضرورت ہے نہ تفتیش کی۔ نہ دلیل کی حاجت ہے۔ نہ شہادت کی کَفیٰ بِنَفْسِكَ
الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا دیکھ، تیری اپنی ذات تیرے حساب کتاب کی آئینہ دار ہے۔ تیرے سازِ زندگی کے تار اتر چکے ہیں اس

لئے ان سے جو آوازیں نکلتی ہیں، وہ نغمۂ ہستی سے ہم آہنگ نہیں۔ نہ ان کا سُر درست ہے نہ تال۔ اور چونکہ موسیقی نام ہی سُروں کی ہم آہنگی کا ہے۔ اس لئے بزمِ کائنات میں تیرا ساز بہت بے سُرا ہو چکا ہے تو زمانہ کے ساتھ چلنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ اس شاعر نے تیری حالت یہ کردی ہے کہ

آں چناں زار از تن آسانی شدی
در جہاں ننگِ مسلمانی شدی

تو قوتِ عمل سے محروم ہو چکا ہے۔ اور تن آسانی نے تجھے سخت ضعیف و ناتواں بنا دیا ہے اور تیرا وجود خود اسلام کے لئے باعثِ شرم ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اپنے اندر اس قدر کشش و جاذبیت رکھتا ہے کہ اسے جس قوم کے سامنے پیش کیا جائے ہو نہیں سکتا کہ وہ اس سے متاثر نہ ہو۔ لیکن آج جس قوم کے سامنے اسلام کا نام لو، وہ فوراً کہہ دیتی ہے کہ اگر یہ دین اتنا ہی زندگی بخش اور نتیجہ خیز ہے تو دنیا میں مسلمانوں کی حالت ایسی کیوں ہے؟ اس طرح مسلمانوں کی زبوں حالی سے خود اسلام بدنام ہو رہا ہے۔ آج تیری کمزوری و ناتوانی کا یہ عالم ہے۔

از رگِ گل می تواں بستن ترا
از نسیمے می تواں خستن ترا

تیرے جکڑ دینے کے لئے رگِ گل سی نرم و نازک "زنجیر" بھی کافی ہے۔ اور تجھے گھائل کر دینے کے لئے بادِ نسیم کا ہلکا سا جھونکا بھی بہت ہے۔ اقبالؒ نے یہاں طنزاً جن چیزوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کی تفاصیل معلوم کرنا چاہو تو ہمارے شعراء کی نازک خیالیوں پر ایک نگاہ ڈالو۔ کہیں سے آپ کو یہ آواز سنائی دے گی کہ

تنم از ضعف چناں شد کہ قضا جست و نیافت
نالہ ہر چند صدا داد کہ در پیرہن است

اور کہیں سے یہ شکایت کہ

غنچہ چٹکا تو ایسا سر میں دھمک ہوتی ہے

لیکن اگر ہم اس افسانوی دنیا سے حقیقت کی طرف آئیں تو وہاں مسلمانوں کی عملاً یہی حالت ہو چکی ہے۔ انہیں محکومی اور غلامی کی زنجیروں میں مقید رکھنے کے لئے کسی بڑی طاقت کی ضرورت نہیں۔ یورپ میں جو قومیں کسی گنتی شمار میں بھی نہیں، وہ بڑے بڑے ممالک کو اپنے پنجۂ استبداد میں اس طرح دبائے ہوئے ہیں کہ ان سے رستگاری کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی۔ ذرا سوچئے کہ یہودیوں جیسی رسوائے عالم قوم، جو دو اڑھائی ہزار سال سے دربدر مارے مارے پھر رہی تھی۔ وہ پورے عالمِ اسلامی کے قلب میں خنجر بھونک کر بیٹھی ہے۔ اور مسلم ممالک کی تمام تڑپ اور پھڑک ان میں بال بھر جنبش نہیں پیدا کر سکی۔ اسرائیل کی قوت "رگِ گل" کیا تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ لیکن مسلمان کو پکڑنے اور جکڑنے کے لئے یہ بھی کم نہیں۔

مسلمان کی اس کمزوری اور ناتوانی کی طرف اشارہ کرنے کے بعد حضرت علامہ پھر اسی مضمون کی طرف رجوع کرتے ہیں جسے انہوں نے اس سے پہلے شعر میں چھیڑا تھا۔ یعنی یہ کہ مسلمان کا وجود خود اسلام کے لئے باعث ننگ ہو چکا ہے اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں

عشق رسوا گشتہ از فریاد تو
زشت رو تمثالش از بہزاد تو

تیری فریاد سے دنیا میں خود عشق رسوا ہو گیا ہے۔ تو ایسا مصور ہے کہ تیرے موئے قلم نے عشق کی اس قدر حسین و جمیل تصویر کو بد نما بنا دیا ہے۔

زرد از آزار تو رخسار او
سردیٔ تو بردہ سوز از نالۂ او

بیماری اور ناتوانی نے عشق کے تمتماتے رخسار پر بھی زردیاں چھڑک دی ہیں۔ تیرے سینے کی سردی نے خود عشق کی نالہ کو حرارت سے محروم کر دیا ہے۔

خستہ جاں از خستہ جانی ہائے تو
ناتواں از ناتوانی ہائے تو

بے کسی اور بے بسی۔ خستگی اور بیچارگی۔ پستی اور زبوں حالی سے دنیا اس نتیجے پر پہونچ رہی ہے کہ اسلام کی وجہ سے اللہ بن (معاذاللہ) اس قابل ہی نہیں کہ زندہ قوموں کے لئے دلیل راہ بن سکے۔ جو اس کی اتباع کرے گا، اس کا بھی وہی حشر ہونے گا جو مسلمانوں کا ہوا ہے۔

اس کے بعد علامہ اقبال پھر اسی موضوع کی طرف عود کرتے ہیں۔ جس سے انہوں نے اس بند کا آغاز کیا تھا۔ یعنی اس قسم کے شعر نے مسلمان کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ اسی شاعر اور شاعری کے متعلق وہ کہتے ہیں۔

گریۂ طفلانہ در پیمانہ اش
کلفت آہے متاع خانہ اش

شاعر (یا مصنوعی عاشق) کی کیفیت کیا ہے؟ یہ ہجر کے صدموں سے بچوں کی طرح سسکیاں لیتا ہے اور آنسو بہاتا ہے ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں جب سارا عالم سوتا ہے۔ اسے جب دیکھو نالہ و فریاد کرتا اور ٹھنڈی آہیں بھرتا دکھائی دے گا نے جھوٹے رونے سے ساری قوم کو سیاہ پوش بنا دیتا ہے۔

سرخوش از دریوزۂ میخانہ ھا
جلوہ دزد روزن کاشانہ ھا

شراب خانوں سے بھیک مانگتا ہے۔ اور اس طرح حاصل کردہ شراب کے نشہ میں مست رہتا بلکہ اس پر فخر کرتا ہے کہ

شریف کعبہ رہا ہے کئی برس اے شیخ
یہ تیرا ب جو گدا ہے شراب خانے کا

اس کی دنائت کا یہ عالم ہے کہ محبوب کے گھر کے روشندانوں اور دروازوں کی درازوں سے جھانک کر لذت دید حاصل کرتا ہے۔

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ

ناخوشے۔ افسردۂ۔ آزردۂ
از لکد کوب نگہباں مردۂ

جب دیکھئے تو یہ عالم کہ — حسرت برس رہی ہے رخ نامراد پر — جب سنئے تو یہ کیفیت — کہ ایک بات کہے اور دو گھڑی روئے — جب حالت پوچھئے تو یہ جواب کہ اب تو جی یہ چاہتا ہے کہ — آئے مجھے ہنسی بھی تو میں رو دیا کروں۔ ہمت اور غیرت کا یہ عالم کہ یار کے دروازے پر دربان سے پٹ کر آ گئے۔

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

حالت یہ کہ

از غماں مانند نے کاہیدۂ
وز فلک صد شکوہ برلب چیدۂ

فرضی غم و اندوہ سے سوکھ کر کانٹا ہو رہے ہیں۔ جب دیکھئے فلک ناہنجار کی ستم رانیوں کا شکوہ لب پر ہے۔ خود بھی رو رہے ہیں۔ دوسروں کو بھی رلا رہے ہیں۔ افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را۔

لاجرم دیکیں جوہر آئینہ اش
ناتوانی ہمدم دیرینہ اش

اس کی آئینۂ سخنی کی آب و تاب تملق اور خوشامد کی رہین کرم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ بے حد کمزور اور ناتواں ہوتا ہے۔ اور خوشامد کے سوا اور کچھ جانتا ہی نہیں۔

پست بخت و زیر دست و دوں نہاد
نامزاو نا امید و نامراد

یب اور کمزور، اور اس وجہ سے کمینہ فطرت۔ نالائق۔ نامراد اور ہمیشہ ناامید۔

شیونش از جانِ تو سرمایہ برد
لطفِ خواب از دیدۂ ہمسایہ بُرد

کی اپنی حالت تو یہ تھی ہی۔ اس کی مسلسل گریہ وزاری اور شیون وفریاد سے خود تیری حالت یہ ہوگئی کہ تجھ میں بھی متاع رگی اور سوزِ حیات کی کوئی رمق باقی نہ رہی۔ وہ خود تو راتوں کو جاگتا ہی تھا۔ اس کی آہ وزاری نے ہمسایوں کی نیند بھی خراب ی۔ وہ بیچارے رہ رہ کر پکار اٹھتے کہ

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ لو آج کی شب بھی سو چکے ہم

یہ نقشہ ان شاعروں کا۔ اور یہ ہے ماحصل اس شاعری کا جس سے مسلمان صدیوں سے متاثر چلا آرہا ہے۔ اور جس نے ں کی حالت یہ کر دی ہے کہ بصورت بیں حالم مپرس۔ علامہ اقبال نے یہ کچھ شاعر کے متعلق بھی کہا ہے۔ اور چونکہ شاعر اپنے پ کو عشق کا ترجمان کہتا ہے۔ اس لئے یہی کچھ انھوں نے خود عشق کی بابت کہا ہے جسے یہ شاعری پیش کرتی ہے۔ اس جہت ے مندرجہ صدر اشعار کا روئے سخن اس 'عشق' کی طرف بھی ہے جس کی تفصیل ہماری شاعری سے مرتب ہوتی ہے۔ اس اعتبار ے انھوں نے اس بند کے آخری شعر میں کہا ہے کہ

وائے بر عشقے کہ نارِ او فسرد
در حرم زائید. در بت خانہ مُرد

س قدر قابلِ تاسف ہے حالت اس عشق کی جس کی آگ اس طرح بجھ جائے۔ آہ! وہ عشق جس نے حریم کعبہ میں جنم لیا ور وہ بت خانہ میں پہنچ کر اس طرح مرگِ بے شرف کا شکار ہو گیا۔

اس شعر سے پھر یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ عشق سے حضرت علامہ کا اشارہ خود اسلام کی طرف ہے۔ ایک وہ اسلام تھا جس کا سرچشمہ کعبہ تھا۔ یعنی خالص اسلام جو کسی غیر قرآنی تصور سے ملوث نہیں ہوا تھا۔ وہ اسلام زندگی اور توانائی کا علمبردار ور حرکت و حرارت کا پیامبر تھا۔ لیکن وہی اسلام جب عجم کے بتکدوں میں پہنچا تو خود بھی راکھ کا ڈھیر بن گیا۔ اور جس قوم نے اسے اپنے سینے میں جگہ دی وہ بھی مردہ ہو گئی۔

س کے بعد حضرت علامہ مسلمان سے کہتے ہیں کہ ــــ پس چہ باید کرد؟ ان حالات میں تمہیں کیا کرنا چاہیئے۔ تمہاری بازآفرینی کی شکل کیا ہے؟ اس مرض کا علاج کیا ہے؟ فرماتے ہیں کہ

اے میانِ کیسہ ات نقدِ سخن
بر عیارِ زندگی اورا بزن

بات بالکل صاف، سادہ اور واضح ہے۔ جو کچھ سرمایۂ سخن تیرے پاس ہے تجھے جو کچھ اسلاف سے ورثہ میں ملا ہے۔ وہ

نثر میں ہے یا نظم میں ــــ اس لئے کہ شاعری صرف نظم میں ہی نہیں ہوتی۔ نثر میں بھی ہوتی ہے۔ جہاں انسان حقائق سے الگ ہوکر لطائف میں کھو گیا۔ سمجھ لیجئے کہ اس نے شاعری شروع کردی۔ اس لئے جو کچھ بھی تمہیں اسلاف سے ملا ہے، اسے سامنے لاؤ زندگی کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھو۔ اگر وہ اس معیار پر پورا اترتا ہے تو زرِ خالص ہے۔ اگر پورا نہیں اترتا تو کھوٹا سکہ ہے۔ اسے اٹھا اٹھائے پھرنے سے کیا حاصل؟ موجودہ "سرمایہ" چونکہ مقدار میں بہت بڑا اور وزن میں بہت بھاری ہے۔ اس لئے قوم اس فریب میں مبتلا ہے کہ ہم بڑی متاعِ گراں بہا کے وارث ہیں۔ اس فریب سے نکلنے کا طریق یہ ہے کہ اس "متاعِ گراں بہا" کو کسوٹی پر کس کر دیکھو۔ تمہیں نظر آجائے گا۔ کہ اس میں بیشتر حصہ تانبے کا ہے جسے تم سونا سمجھ کر سنبھال سنبھال کر رکھ رہے ہو۔ خالص سونا بہت کم ہے۔ لہٰذا اس نظر فریب تانبے کو الگ کرو اور صرف زرِ خالص کو اپنے پاس رکھو تاکہ معلوم ہوسکے کہ تمہارے پاس وہ متاع اور وہ جنس کس قدر ہے۔ جس کی بازارِ حیات میں کچھ قیمت ہے۔

حضرت علامہ نے یہاں "عیارِ زندگی" کہہ کر حقائق کے سمندر کو ایک گہرِ آبدار میں محصور کردیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیامِ اقبال کی بلندی، گہرائی اور گیرائی کا راز ہی ان کے انتخابِ الفاظ میں ہے۔ وہ بڑی سے بڑی حقیقت کے اظہار کے لئے ایسا لفظ منتخب کرتے ہیں جسے جوں جوں کھولتے جایئے۔ زمانے کے طرۂ پُرپیچ و خم کی طرح اس کی وسعتیں حدود فراموش ہوتی چلی جاتی ہیں قرآن نے اپنے پیام کے متعلق کہا ہے کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی آواز پر لبیک کہو۔ جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف دعوت دے جو تمہیں زندگی عطا کرتی ہے۔ یعنی قرآن کا پیغام حیات بخش ہے۔ یہ قوموں کو زندگی عطا کرتا ہے۔ یہ "عیارِ زندگی" پر پورا اترتا ہے۔ اسی کو اقبال نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ

اے میانِ کیسہ ات نقدِ سخن
بر عیارِ زندگی او را بزن

جو کچھ تمہارے ہاں متوارث چلا آرہا ہے، اسے قرآن کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھو۔ اگر وہ اس پر پورا اتر آیا۔ تو تم دیکھو گے کہ وہ زندگی کے تقاضوں کا ساتھ دیتا چلا جائے گا۔ یعنی عیارِ زندگی، اور عیارِ قرآن ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ جو قرآن کی محک پر پورا اترتا ہے۔ وہ زندگی کے معیار پر بھی پورا اترتا ہے۔ اور جو زندگی کے تقاضوں کا ساتھ دیتا ہے اسے تم قرآن کے مطابق پاؤ گے۔ اسے یاد رکھو کہ عمل کی راہبری ہمیشہ فکر سے ہوتی ہے۔ جس قسم کی کسی قوم کی فکر ہوگی۔ اسی قسم کے اس قوم کے عمل ہوں گے۔ ہمارے اعمال جو ہمیں پستی اور انحطاط کی اس حد تک لے گئے ہیں۔ درحقیقت نتیجہ ہیں اس غلط فکر کا جو ہزار برس سے ہمارے ہاں متوارث چلی آرہی ہے۔ یہ فکر زندگی کی راہوں کو روشن نہیں کرتی۔ تاریک سے تاریک تر کرتی چلی گئی ہے۔ اور کرتی چلی جائے گی۔ زندگی کے راستے، فکرِ روشن ہی سے جگمگاتے ہیں۔ اسی کو قرآن نے ایمان علیٰ وجہ البصیرت قرار دیا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ ۔

فکرِ روشن بیں عمل را رہبر است
چوں درخشِ برق پیش از تندر است

جس طرح پہلے بجلی کی چمک پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد اس کی گرج کی آواز آتی ہے۔ اسی طرح عمل کی گرج اور کڑک سے پہلے فکرِ صحیح (ایمان) کی چمک نہایت ضروری ہے۔ اس کی ضرورت زندگی کے ہر شعبے میں ہے۔ ادب میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ ادب کا اثر قوموں کی حیاتِ اجتماعیہ پر بڑا گہرا ہوتا ہے۔

فکرِ صالح در ادب می بایدت
رجعتے سوئے عرب می بایدت

ادب میں فکرِ صالح کی ضرورت لاینفک ہے۔ "فکرِ صالح" سے مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے تصورات و نظریات کو عجم کے غیر اسلامی اثرات سے یکسر پاک اور صاف کر کے فکرِ اسلامی کے اولین اور واحد سرچشمہ (قرآن) کی طرف رجوع کریں۔ اس کے علاوہ فکرِ صالح کہیں اور سے نہیں ملے گا۔

دل بسلمائے عرب باید سپرد
تا دمد صبحِ حجاز از شامِ کُرد

ان معشوقانِ عجمی سے دل ہٹا کر پھر سے سلمائے یثرب کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور اس طرح شامِ عجم سے صبحِ حجاز کی نمود ہو جائے۔ دوسرے مصرعہ میں شیخ حسام الحق ضیاء الدینؒ کے اس مقولہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ أَمْسَيْتُ كُرْدِيًّا فَأَصْبَحْتُ عَرَبِيًّا یعنی میں گذشتہ شب تک کُرد تھا جب صبح اٹھا تو عرب ہو گیا۔ شیخ ضیاء الحق مولانا روم کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ چنانچہ مثنوی رومی میں ان کا تذکرہ کئی جگہ آیا ہے۔ اس کے بعد علامہ اقبال کہتے ہیں۔

از چمن زارِ عجم گل چیدۂ — نوبہارِ ہند و ایراں دیدۂ
اندکے از گرمیٔ صحرا بخور — بادۂ دیرینہ از خرما بخور

تو نے عجم کے باغوں ہی سے گل چینی کی ہے۔ تم نے ہندوستان اور ایران کے گلکدوں کی بہاریں ہی دیکھی ہیں۔ اب ذرا اس سے منہ موڑ کر عرب کے صحرا کی طرف آؤ۔ وہاں کی حرارت افروز فضا سے اپنے سینوں کو گرمجوش کرو۔ عجمی تاکستانوں کی شراب ہوش ربا کو چھوڑو اور کھجور کے بادۂ صاف و شیریں سے اپنی گم کردہ ہوشی کی بازیابی کا سامان پیدا کرو۔ یہ ہے ادب کا کام۔

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا، وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

اس سے تمہارے یخ بستہ سینوں میں از سرِ نو حرارت پیدا ہو گی۔

سرپکے اندر بر گرمش بدہ
تن دمے با صرصرِ گرمش بدہ

فکرِ عجم کی برفانی سِلوں سے تمہارے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی جم گیا ہے۔ اس میں حرکت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ صحرائے عرب کی گرم لوؤں کے تھپیڑے کھائے جائیں۔ تاکہ تمہارے سینوں میں ولولے بیدار اور بازوؤں میں قوتِ عمل کی نمود ہو۔

مدتے غلطیدۂ اندر حریر
خو بہ کرپاس درشتے ہم بگیر

ایک عرصۂ دراز تک تو نرم و نازک ریشمی لباس میں ملبوس رہنے کی وجہ سے بڑا نازک مزاج ہو چکا ہے۔ عجمی تکلفات نے تجھ سے سپاہیانہ زندگی بسر کرنے کی صلاحیت سلب کر لی ہے، جہاد جو مومن کی زندگی کا مرکزی نقطہ ہے۔ اس کا تصور بھی تیری روح کو کپکپا دینے کے لئے کافی ہے۔ قرآن کی تعلیم یہ تھی کہ تو دنیا کی ہر پرخطر وادی میں مسکراتا ہوا جادہ پیما ہو جائے اور ہر مشکل اور مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرے۔ کیونکہ مشکلات درحقیقت انسانی خودی کی محکمیت کے پرکھنے کا ذریعہ ہوتی ہیں لیکن مشکلات وہ نہیں جو انسان خود پیدا کرلے۔ یا اس کی ذاتی اغراض کے حصول کی راہ میں آئیں۔ بلکہ وہ مشکلات و موانع جو باطل کی طرف سے حق کی راہ میں حائل ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی مجاہدانہ زندگی وہی بسر کر سکتا ہے جو سختیاں جھیلنے کا عادی اور مشکلات برداشت کرنے کا خوگر ہو۔ عجمی تصورات نے مسلمان کو اس قسم کی زندگی سے بیگانہ بنا کر اسے پرلے درجے کا کاہل انگار اور تن آسان بنا دیا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ یہ پھر سے سخت و درشت زندگی بسر کرنے کا عادی بنے۔ اور یہ کچھ قرآن کے عطا فرمودہ تصورِ حیات اور اس کے متعین کردہ اسلوبِ زندگی ہی سے ہو سکتا ہے۔

قرنہا بر لالہ پا کوبیدۂ — عارض از شبنم چو گل شوئیدہ
خویش را بر ریگِ سوزاں ہم بزن — غوطہ اندر چشمۂ زمزم بزن

تو ایک عرصۂ دراز سے زندگی کو پھولوں کی سیج سمجھتا چلا آ رہا ہے۔ تو اس قسم کی آرام و چین کی زندگی بسر کرنے کا عادی ہو چکا ہے۔ ان راہوں میں چلنا جن میں پھول بچھے ہوں اور صبح اٹھ کر قطراتِ شبنم سے منہ دھونا۔ عجمی اندازِ فکر نے تیری زندگی کو یہ کچھ بنا دیا ہے۔ اب تو اس راحت طلبی اور آرام کوشی کی زندگی کو چھوڑ۔ صحرا کی گرم گرم ریت پر سونے کی عادت ڈال اور عجمی قطراتِ شبنم کے بجائے کعبہ کے آبِ زمزم سے چہرے کے گرد و غبار کو دور کرنے کا اسلوب سیکھ۔ یعنی اپنے ادراک کو تمام غیر قرآنی تصورات سے پاک کر کے پھر سے اس مجاہدانہ زندگی کی طرف آ جا۔ جسے اسلام نے مومن کا صحیح شعار بتایا ہے۔

مثلِ بلبل ذوقِ شیون تا کجا
در چمن زاراں نشیمن تا کجا

ب تک رونے دھونے میں لگا رہے گا۔ آہ و نالہ اور گریہ و فریاد کی زندگی تا کجا! فلک ناہنجار کے شکوے اور قسمت کے گلے کب تک؟ یہ زندگی مردوں کے شایانِ شان نہیں؛ اسے مومن کا شعار نہیں کہا جا سکتا۔ مومن کی زندگی تو ایک طرف، اس کی آخری لمحات میں بھی یہ حالت ہوتی ہے کہ — چو مرگ آید تبسم بر لب اوست۔ اس لئے تجھے مومن کی زندگی اختیار کرنی چاہیئے۔ تیری یہ حالت اس لئے ہو چکی ہے کہ تو نے اپنی ساری زندگی فریب رنگ و بو کے گلستانوں میں بسر کی ہے اس سے اپنا آشیانہ اٹھا — تو شاہین ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں۔

اے ہما از یمنِ دامت ارجمند　　　آشیانے ساز بر کوہِ بلند

آشیانے برق و تندر در برے　　　از کنامِ جرہ بازاں برترے

تنے عرصہ کی غیر قرآنی زندگی سے تیرا مقام ہی درحقیقت تیری نظروں سے اوجھل ہو چکا ہے۔ تیرا مقام وہ تھا کہ اگر ہما جس کا سایہ لوگوں کو بادشاہ بنا دیتا ہے، تیرے دام میں پھنس کر تیرا شکار ہو جاتا تو وہ اسے اپنے لئے وجہ صد ہزار سعادت اور باعث صد ہزار افتخار سمجھتا۔ ہما بلند ترین فضاؤں میں اڑتا ہے۔ تیرا مقام اس سے کہیں زیادہ بلند تھا۔ یہ زندگی تیرے لئے باعث ننگ و عار تھی کہ تو درخت کی سب سے نچلی شاخوں پر آشیانہ بناتا اور پھر وہاں سے بھی گر کر با صد آہ و زاری پکارتا کہ

صبا شکستہ پروں کی دعائیں لیتی جا
جھکا دے اور ذرا شاخ آشیانے کی

تیرا مقام یہ ہے کہ تو پہاڑ کی بلند ترین چٹانوں پر آشیانہ بنائے۔ اور آشیانہ بھی وہ نہیں جسے بجلی کی ایک جھپک جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے۔ وہ آشیانہ جو سینکڑوں بجلیاں اور ہزاروں رعد آسا بلائیں اپنے آغوش میں لئے ہو۔ ایسا آشیانہ جو شاہین و عقاب کی قیام گاہوں سے بھی بلند ہو۔ ایسا بلند کہ وہاں سے انسان اپنے مقدرات کے ستارے بھی جھک کر دیکھے؛ ایسا آشیانہ بنا

تا شوی در خوردِ پیکارِ حیات
جسم و جانت سوزد از نارِ حیات

تاکہ تو کشمکشِ حیات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکے۔ تیری خودی اس قدر مستحکم ہو جائے کہ تو موت سے بھی نہ مر سکے؛ تیرا جسم و جان نارِ حیات میں جلنے کے بعد کندن بن کر نکلے۔ انسان کے لئے ایک نئی زندگی، ایک پائندہ و تابندہ زندگی حاصل کرنے کا یہی طریق ہے۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

لیکن یہ حیاتِ تازہ۔ یہ نشاۃ ثانیہ یہ بازآفرینی۔ قرآن کے آبِ حیات کے علاوہ اور کسی سرچشمہ سے نہیں مل سکتی۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

یہ تھے علامہ اقبال کے انقلابی تصورات ہماری شاعری کے خلاف۔ لیکن کس قدر ستم ظریفی ہے کہ ہنوز اقبال کا کفن بھی میلا نہیں ہونے پایا کہ ہم نے اسے پھر سے انہی شاعروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ جنہیں وہ موت کے پیامبر اور قبرستانوں کے مجاور قرار دیتا تھا۔ اب ہمارے ہاں اقبال کا مصرف صرف اس قدر رہ گیا ہے کہ جب ہمارے ریڈیو کا کوئی پروگرام وقت سے پہلے ختم ہو جائے تو اس کے چند اشعار دہرا دیئے جائیں۔ یا جمعرات (پیروں فقیروں کے دن) طبلے کی تھاپ نہیں بلکہ (معاذ اللہ) دھائیں سے قوالوں کے فلک شگاف گلے سے اس کے پیغام کو جہنم گوش بنایا جائے۔ یعنی اسے اس قوالی کا موضوع بنا جائے، جسے اقبال نے خود افیون قرار دیا تھا۔

اف! کس قدر گہری اور تیز تھی طنز اس مرد دیدہ ور کی جس نے قوم کی حالت کا اندازہ لگا کر اپنے متعلق کہا تھا کہ اک مرد تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا :

باب المراسلات

تراویح

لکھنؤ (بھارت) سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔

• احناف کہتے ہیں کہ رمضان میں روزانہ بیس تراویح سنت مؤکدہ ہیں۔ اور اہل حدیث وشیعہ اس کے قائل نہیں۔ اہل حدیث کے نزدیک تراویح اور تہجد ایک ہیں۔ اور ان کی تعداد آٹھ رکعات ہیں۔ وہ بیس تراویح کو بدعت کہتے ہیں۔ اس مسئلہ پر احناف اور اہل حدیث میں لڑائیاں بھی ہوئی ہیں۔ اور ہوتی ہیں۔ آپ کی تحقیق تراویح کے بارے میں کیا ہے؟ ......

احناف اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ سے قبل تراویح کا دستور ہی نہ تھا لیکن اس کے باوجود تراویح کے تارک کو گنہگار بتلاتے ہیں۔ اس کی اصلیت کیا ہے؟

طلوع اسلام | تراویح کا ذکر قرآن کریم میں نہیں ہے۔ آیا ان کی ابتداء رسول اللہ کے زمانہ سے ہوئی تھی یا حضرت عمرؓ کے زمانہ سے تاریخ کا سوال ہے۔ اور اس باب میں اہل تشیع اور اہل تسنن حضرات کا اختلاف اور ان کی بحثیں سب کو معلوم ہیں۔ پھر یہ سوال کہ آیا ان کی رکعتوں کی تعداد آٹھ ہے یا بیس، خود اہل التسنن کے ہاں اختلافی ہے۔ اور ان کی بحثیں بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ طلوع اسلام ان بحثوں میں نہیں الجھا کرتا۔ جن امور کا ذکر قرآن میں نہیں۔ ان کے متعلق اس کا مسلک واضح ہے۔

اسلام، قرآنی حدود کے اندر ضبط خویش کی زندگی کا نام ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان (مسلمان) کو معلوم ہو کہ وہ حدود کیا ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ ضبط نفس کا خوگر ہو۔ رمضان کا مہینہ ان ہر دو امور کے پیدا اور مستحکم کرنے کا ایک موسمی ذریعہ ہے۔ دور حاضر کی اصطلاح میں اسے ٹریننگ کیمپ یا (REFRESHER COURSE) کہئے۔ روزہ انسان کو ضبط خویش سے مجاہدانہ زندگی کا خوگر بناتا ہے۔ اور اس کے لئے اس مہینے کا تعین جس میں نزول قرآن کی ابتدا ہوئی تھی۔ اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ اس ٹریننگ کے کورس میں اس کا خاص انتظام ہونا چاہیئے کہ مجاہدین کے سامنے پورا قرآن آجائے۔ تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ دنیا میں تلوار اور قرآن کا رشتہ کیا ہے۔ اور یہ کس طرح ایک دوسرے کے محافظ بنتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دور اول کے اسلامی انتظام نے قرآن کو بیک وقت ذہنوں میں مستحضر کرنے کے لئے یہ طریقہ تجویز کیا تھا۔ جسے اب محض حصول ثواب کے لئے ادا کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ جس طرح سے اب تراویح میں قرآن دہرایا جاتا ہے۔ اسے نہ سنانے والا حافظ سمجھتا ہے کہ میں کیا پڑھ

رہا ہوں۔ اور نہ سننے والے مقتدی سمجھتے ہیں کہ ہم کیا سن رہے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جس قرآن کے الفاظ صرف دہرائے یا سنے جائیں۔ اور انہیں سمجھا نہ جائے۔ اس سے قرآن کا مفہوم سامنے نہیں آسکتا۔ اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے لئے زندگی کا کون سا نظام متعین کرتا ہے۔ جب خلافت علیٰ منہاج نبوت قائم ہوگی۔ تو یہ دیکھنا اس کا کام ہوگا کہ ہمارے ان مروجہ طریقوں میں کہاں کہاں اصلاح کی ضرورت ہے۔ "گناہ اور ثواب" کا صحیح مفہوم بھی اسی وقت سامنے آئے گا۔

---

(۲) قرآن و حدیث

ہمارے ہاں کے نیم مذہبی مفاد پرستوں نے حدیث کے بارے میں ایسا خلط مبحث کر دیا ہے کہ اس سے عوام کے ذہن میں (جن میں مساجد کے ائمہ بھی شامل ہیں) عجیب عجیب الجھاؤ پیدا ہو رہے ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں اکثر اس قسم کے استفسارات آتے رہتے ہیں کہ اگر ہم حدیث کو نہ مانیں تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ موجودہ قرآن رسول اللہ پر خدا کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ ان استفسارات کو دیکھ کر ہمیں رہ رہ کر افسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے محض اپنے ذرا سے مفاد (قلیل) کی خاطر عوام کے دلوں کو کس کس قسم کے شکوک کی آماجگاہ بنا دیا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ ان مستفسرین کو اس کا بھی علم نہیں کہ حدیث کو ماننے اور نہ ماننے کا مطلب کیا ہے؟ "فلاں شخص یا گروہ حدیث کو نہیں مانتا" یہ ایک فقرہ ہے جسے آجکل عام طور پر دہرا دیا جاتا ہے۔ بغیر اس بات کے سوچنے کے کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ اعتراض کی صحیح شکل یہ ہونی چاہیئے کہ فلاں شخص یا گروہ حدیث کے متعلق یہ عقیدہ یا مسلک رکھتا ہے۔ جو یوں غلط ہے۔ اس طرح استفسار زیر نظر کی صحیح شکل بھی یہ ہونی چاہیئے کہ فلاں شخص حدیث کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے۔ اگر اس عقیدے کو صحیح مان لیا جائے۔ تو پھر اس کا کیا ثبوت دیا جائے گا کہ موجودہ قرآن رسول اللہ پر خدا کی طرف سے نازل ہوا تھا۔

اب آیئے اصل اعتراض کی طرف۔ ان اعتراض کرنیوالوں کے دل میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ اگر حدیثوں کے متعلق یہ مان لیا جائے کہ ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ رسول اللہ کی ہیں تو پھر یہ کیسے سمجھا جائے گا کہ رسول اللہ پر قرآن خدا کی طرف سے نازل ہوا تھا۔ اور موجودہ قرآن وہی ہے جو رسول اللہ پر نازل ہوا تھا۔ یہ باتیں تو احادیث ہی سے ملتی ہیں۔

یہ کتنا غلط ہے کہ یہ باتیں صرف احادیث کے اندر ملتی ہیں۔ یہ باتیں خود قرآن کے اندر موجود ہیں کہ

(۱) قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا..... اَلْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ..... تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ

(۲) قرآن محمدؐ پر نازل ہوا تھا وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ (۴۷/۲)

(۳) قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔ اس لئے اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹) اس لئے ہمارا موجودہ قرآن [illegible] ہے جسے خدا نے محمدؐ پر نازل کیا

اس سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ان امور کی داخلی شہادات خود قرآن کے اندر موجود ہیں۔

اب رہا یہ سوال کہ ہم کس طرح ثابت کر سکتے ہیں کہ [illegible] نے بتایا کہ یہ خدا کا کلام ہے

لیا۔ اس لئے ہم ایسا ماننے کے لئے حدیث کے محتاج ہیں۔
ذرا سوچئے کہ اس اعتراض (یا دلیل) کے معنی کیا ہیں۔ یعنی چونکہ فلاں حدیث میں یہ آیا ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے۔ اس لئے
انتے ہیں۔ اگر اس میں ایسا نہ لکھا ہوتا تو ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہی نہ تھا کہ قرآن خدا کا کلام ہے۔
یہ دیکھئے کہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ یہ بات خود قرآن کے اندر موجود ہے کہ قرآن منزل من اللہ ہے۔ اب آگے بڑھیئے
ایک مسلمان کا تعلق ہے۔ اس کے لئے اس کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ اس کا ثبوت تلاش کرے کہ قرآن خدا کا کلام ہے۔
ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے اور محمدؐ اس کے سچے رسول ہیں۔ اگر اسے اس میں ذرا سا بھی شبہ ہے تو وہ مسلمان نہیں کہلا
رملوں کے زمرے میں شامل ہو جائے گا۔
ہے غیر مسلم۔ ان کے متعلق سوچئے کہ اگر کوئی غیر مسلم آپ سے کہے کہ ثابت کیجئے کہ قرآن خدا کا کلام ہے تو کیا آپ اسے یہ کہینگے
حدیث میں آیا ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے۔ اس لئے اس سے ثابت ہو گیا کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ کیا کسی غیر مسلم کے لئے یہ
جائے گی؟ حدیث تو ایک طرف، اس سے تو اگر آپ یہ بھی کہیں کہ خود قرآن کے اندر لکھا ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ تو
لیے یہ بھی اس دعوے کے اثبات کی دلیل نہیں ہوگی۔ اس کے لئے دلیل وہی ہے جسے قرآن نے بطور دلیل پیش کیا ہے
ہے کہ اگر ان لوگوں کو اس بات میں شبہ ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے تو ان سے کہو کہ اس قرآن کی کسی ایک سورۃ کے مثل بنا
ایسا نہیں کر سکیں گے۔ یعنی ان میں سے جو لوگ صاحبانِ علم و بصیرت ہوں گے۔ اور وہ تعصب سے خالی ہو کر قرآن پر غور
وہ خود اس نتیجے پر پہونچ جائیں گے کہ یہ فی الواقعہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ جیسا کہ قرآن نے اس زمانے کے اہل کتاب کے
کہ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (۲/۱۴۶) وہ قرآن کو اس طرح پہچانتے ہیں۔ جس طرح وہ
پہچانتے ہیں) لیکن جو لوگ از خود اس طرح قرآن پر غور کرنا نہ چاہیں۔ ان کے لئے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ
ران کی کوششیں آج تک کوئی ایسا نظام زندگی وضع نہیں کر سکیں۔ جو قرآن کے کسی ایک شعبے کا بھی جواب ہو۔ اس بات
یرت اور علم و برہان کی رو سے ثابت کرنا ہوگا۔ یہی ایک غیر مسلم کے لئے اس امر کی دلیل ہوگی کہ قرآن انسان کا کلام
کلام ہے۔
ب چار برس ہوئے ہم نے پاکستان بھر کے علمائے کرام کی خدمت میں گذارش کی تھی کہ وہ اس موضوع پر تفصیل سے لکھیں کہ اسلام کی تعلیم کس طرح
دا انسانی ذہن اس کی مثال کیوں پیش نہیں کر سکتا۔ ان تفصیلی مضامین کو ہم طلوع اسلام میں شائع کریں گے۔ آپ حیران
ن میں سے کسی ایک نے بھی اس موضوع پر ایک سطر بھی لکھ کر نہیں بھیجی۔ نہ ہی ہمیں بھیجی، اور نہ ہی (جہاں تک ہمیں معلوم ہے)
جگہ شائع کی۔ لیکن چار برس مسلسل طلوع اسلام کو گالیاں دینے میں صرف کر دیئے۔ اس میں بھی اگر کسی نے کچھ کیا، تو اسی نے
ضرات (معاذ اللہ) اسلام کا بدترین دشمن قرار دے رہے ہیں۔ "انسان نے کیا سوچا؟" اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے اس
اس کی دوسری جلد [illegible] شائع ہو جائے گی۔ تو یہ کتاب غیر مسلم کے لئے مسلمانوں کے اس دعوے کی دلیل

ہوگی کہ قرآن فی الواقعہ خدا کا کلام ہے۔ ذہن انسانی اس کی مثل لا نہیں سکتا۔ دوسری صورت اس کی یہ ہے کہ قرآن کا بتایا ہوا نظام عملاً متشکل کر دیا جائے۔ اس کے نتائج دنیا کو خود بتا دیں گے کہ یہ ضابطۂ حیات فی الواقعہ بے مثل و بے نظیر ہے۔ طلوع اسلام اس قسم کے نظام کی تشکیل کے لئے ہی برابر دعوت دے رہا ہے۔ رسول نے قرآن کو اسی طریق سے اپنے مخاطبین کے سامنے پیش کیا تھا۔ اور ان سے منوا لیا تھا کہ وہ فی الواقعہ خدا کا کلام ہے۔ اور اسی طریقہ سے حضورؐ کی سنت کے پیرو اسے دنیا کے سامنے پیش کریں گے۔ اور مولوی اس طریق پر قرآن پیش کرنے والوں کو "منکرین سنت" قرار دیتا چلا جائے گا۔ اس لئے کہ اسے خود اس کی توفیق نہیں کہ وہ قرآن کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کر سکے۔ اس کے لئے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔

آخر میں ہم ان حضرات سے جو دین سے دلچسپی رکھتے ہیں، ایک مرتبہ پھر گذارش کریں گے کہ وہ یہ کہنے سے پہلے کہ "طلوع اسلام حدیث کو نہیں مانتا" خود طلوع اسلام سے پوچھ لیا کریں کہ حدیث کے متعلق اس کا مسلک کیا ہے۔ یہ مسلک ایک چھوٹے سے پمفلٹ میں درج ہے۔ جس کا عنوان ہے "سنت رسول اللہ" اسے پڑھ لینے سے آپ بہت سی بے معنی الجھنوں سے بچ جائیں گے۔

۳۔ فسخ نکاح

حیدر آباد (دکن) سے ایک محترم خاتون لکھتی ہیں۔

"طلوع اسلام" میں عائلی قوانین کے سوالنامے اور آپ کے بصیرت افروز جواب نظر سے گذرے آپ ہمیشہ ہی مظلوم بہنوں اور بیٹیوں کے حقوق کے لئے لڑتے آئے ہیں۔ مگر پھر بھی قرآن اور اس کے قوانین کو پس پشت ڈال کر ایسے مسائل میں سماج کو ہمیشہ سامنے رکھا جاتا ہے۔

نکاح کی تو بنیاد ہی باہمی موافقت پر ہے۔ مگر باوجود اختلافِ مزاج اور انتہائی تلخ اور ناخوشگوار ازدواجی زندگی کے مجھے فسخ نکاح کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ہمیشہ سماج اور اخلاق کا ناجائز دباؤ ڈال کر بجبر و اکراہ زندگی گذارنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ کیا آپ اس باب میں مفصل نہیں لکھ سکتے کہ سماج کیا ہے اور اس کا یہ بے جا دباؤ کہاں تک جائز ہے؟ نہ جانے کتنی مظلوم بہنیں بے جا شرم و حیا کو توڑ کر کسی جرأت مندانہ اقدام سے مجبور ہیں اور اپنی زندگی گھٹ گھٹ کر گذار رہی ہیں۔ بلند آپ اس جھوٹے سماج اور اس کی پابندیوں کے خلاف کچھ لکھیئے۔ تاکہ ہم میں ہمت اور جرأت پیدا ہو۔

طلوع اسلام طلوع اسلام کی تو زندگی کا فریضہ یہ ہے کہ ہمارے سماج میں جس قدر غیر قرآنی باتیں آچکی ہیں، ان کے خلاف آواز بلند کرے۔ وہ اپنے اس فریضہ کی ادائیگی میں مسلسل و پیہم مصروف سعی و عمل ہے۔ لیکن اس قسم کی باتیں صرف لکھنے سے دور نہیں ہوا کرتیں۔ یہ دور ہوتی ہیں حکومت کے قوانین سے۔ ہندوستان کی حکومت کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پاکستان مملکت کے لئے ایک موقع آیا تھا کہ وہ اپنے آئین کی بنیاد قرآن پر رکھ لیتی۔ تاکہ اس کے تابع جس قدر قوانین بنتے۔ وہ ہمارے سماج کی ان زنجیروں کو توڑ ڈالتے جن میں انسانیت صدیوں سے جکڑی چلی آرہی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ دستور سازی کے مرحلۂ اول

یں یہ کام نہیں ہو سکا۔ اس میں قرآن پر ملا غالب آگیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مظلوم انسانیت (وہ مرد ہوں یا عورتیں) بدستور
ان انوں کے خود ساختہ قوانین کی زنجیروں میں جکڑی رہے گی۔ لیکن طلوع اسلام بدستور اپنی کوششوں میں مصروف رہے گا کہ اگر آئین
سازی کے پہلے مرحلہ میں ایسا نہیں ہو سکا تو اس کے بعد کسی اور مرحلے میں ایسا ہو جائے۔ یاد رکھئے نوع انسانی نسرت اس دن صحیح
آزادی کا سانس لے سکے گی۔ جب اس پر خدا کے قانون کے علاوہ کسی اور کا قانون مسلط نہ ہو گا۔ لا الٰہ الا اللہ کا یہی عملی مفہوم ہے

---

۴. جھنڈے کی سلامی

جالپور جٹاں سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔

" آج یہاں مختلف مکاتیب فکر سے تعلق رکھنے والے اصحاب جشن جمہوریہ کا پروگرام مرتب کرنے کے لئے ٹاؤن ہال میں اکٹھے ہوئے۔ اس اجتماع ضدین میں جو جو موشگافیاں ہوئیں۔ انھیں بیان کرنا تضیع اوقات ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک بات اتنی اہم ہے جسے سنکر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ مجلس میں جب قومی جھنڈے کی سلامی کی تجویز پیش ہوئی۔ تو جماعت اسلامی کے نمائندوں نے اعتراض کیا کہ جھنڈے کو سلامی دینا کفر اور بت پرستی میں شامل ہے میں ایک سابق فوجی ہوں۔ اس لئے میرے دل میں جو قومی جھنڈے کی عزت و احترام ہو گا۔ اسے آپ بخوبی جانتے ہونگے اس "اسلامی انکشاف" پر مجھے بہت حیرانگی اور سخت صدمہ پہنچا۔ پاکستان کے لاکھوں سپاہی (جو عموماً سادہ مسلمان ہوتے ہیں) اگر قومی پرچم کی سلامی کو کفر سمجھ لیں۔ تو پھر اس کے نتائج بڑے خطرناک اور تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ جس سے ملک کی سلامتی اور بقا کو نقصان پہنچ سکتا ہے کیا ادارہ طلوع اسلام یا جناب پرویز طلوع اسلام کے آئندہ شمارے میں اس پر روشنی ڈالیں گے؟"

طلوع اسلام جھنڈا یا پرچم کسی مملکت یا نظام کی محسوس نشانی یا علامت (SYMBOL) ہوتا ہے۔ اسے عربی زبان میں شعار کہتے ہیں جب کوئی شخص جھنڈے کی تعظیم کرتا ہے۔ تو وہ اس ڈنڈے یا اس کے اوپر لہرانے والے کپڑے کی تعظیم نہیں کرتا جس سے وہ جھنڈا ترتیب پاتا ہے۔ وہ درحقیقت اس مملکت یا نظام کی تعظیم کرتا ہے جس کی علامت وہ جھنڈا ہوتا ہے۔ پاکستانی جھنڈے کی تعظیم کے معنی ہوں گے "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کی تعظیم۔

قرآن نے شعائر اللہ کی تعظیم کا حکم دیا ہے۔ اور اسے "دلوں کے تقوے" سے تعبیر کیا ہے وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ (۲۲/۳۲) اور ان کی بیحرمتی سے بڑی شدت سے روکا ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ (۵/۲) قرآن نے خانہ کعبہ اور حج سے متعلق مختلف چیزوں کو شعائر اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ صفا و مروہ کی پہاڑیاں اور وہ جانور جنہیں حج کے موقع پر مکہ میں ذبح کیا جائے۔ "شعائر اللہ" قرار دیئے گئے ہیں۔ خانہ کعبہ دنیا میں اس نظام کا مرکز ہے جس کی بنیاد خدا کی توحید (یعنی ایک خدا کے قانون کی اطاعت) پر ہے۔ اور حج اس نظام کے نمائندگان کا اجتماع

ہے۔ لہٰذا یہ تمام چیزیں جنھیں "شعائر اللہ" کہا گیا ہے۔ اس مملکت یا نظام کی نمائندہ علامت ہیں۔ جو خدا کی توحید کا علم بلند کرنے کے لئے قائم کی جائے۔

حصولِ پاکستان کی تحریک اور مملکت پاکستان کا قیام اس منشاء اور دعوے کی رو سے ظہور پذیر ہوا کہ مسلمانوں کو ایک ایسا خطۂ زمین چاہیئے۔ جس میں وہ اسلامی تصورات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اب اس مملکت نے اپنے آئین میں شروع میں کہہ دیا ہے کہ ہمارا نصب العین یہ ہے کہ ہم حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے اپنے اختیارات استعمال کریں۔ جس مملکت کے سامنے نصب العین یہ ہو (یہ الگ بات ہے کہ اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے وہ کن مختلف مراحل سے گذرتی ہے) اس مملکت کے پرچم کی تعظیم اسی طرح شعائر اللہ کی تعظیم میں داخل ہوگی جس طرح اس خطۂ زمین کا تحفظ مسلمانوں کا دینی فریضہ ہوگا۔ پاکستان میں رہتے ہوئے جو لوگ اس پرچم کا احترام نہیں کرتے۔ ان کے دل میں اس مملکت اور نظام کا احترام نہیں جس کی یہ پرچم نمائندگی کرتا ہے۔ اسی کو بغاوت کہتے ہیں۔ پرچم کی تعظیم بت پرستی نہیں ہوتی۔ بت پرستی میں بت کو یا تو خود خدا سمجھا جاتا ہے۔ یا خدا کا مظہر۔ اس لئے اس کی پرستش شرک ہے۔ پرچم کو نہ خدا سمجھا جاتا ہے۔ نہ خدا کا مظہر۔ اور نہ ہی اس کی پرستش کی جاتی ہے۔ اس کی فقط تعظیم کی جاتی ہے۔ البتہ اس تعظیم کے اظہار کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیئے۔ جو خدا کے لئے مخصوص ہو۔ مثلاً سجدہ کرنا۔

نقد و نظر

انسان نے کیا سوچا؟

محترم پرویز صاحب کی عظیم کتاب "انسان نے کیا سوچا؟" پر جریدہ "ٹائمز آف کراچی" میں حسبِ ذیل تبصرہ شائع ہوا ہے۔ اصل تبصرہ انگریزی زبان میں ہے۔ جس کا اردو ترجمہ پیشِ ناظرین ہے۔

"یہ سوال کہ اسلام کسی سیاسی نظام کی بنیاد بن سکتا ہے یا نہیں۔ ایک عرصے سے معرضِ بحث میں چلا آرہا تھا۔ تاآنکہ موجودہ صدی کے ربعِ اول کے آخر میں، ترکوں نے الغائے خلافت سے اس کا جواب نفی میں دیدیا۔ اس وقت ہمارے سامنے یہ سوال نہیں کہ اس تجربہ نے جو دنیائے اسلام میں پہلا تجربہ تھا، کیا نتائج پیدا کئے۔ اس وقت ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ترکوں کے اس فیصلہ سے عام طور پر سمجھا یہ گیا کہ لادینیت (SECULARISM) نے اسلامیت پر غلبہ پا لیا ہے۔

لیکن ترکوں کے اس فیصلہ نے اس اہم سوال کا آخری فیصلہ نہیں کر دیا۔ ان کے فیصلے کے سات سال بعد علامہ اقبال نے اپنے مشہور خطبہ میں یہ مطالبہ پیش کیا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک جداگانہ خطۂ زمین ملنا ضروری ہے۔ تاکہ وہ اس میں اسلامی انداز کی مملکت قائم کریں۔ اپنی زندگی کی تشکیل اپنے نصب العین کے مطابق کر سکیں۔ اسلامیانِ ہند نے اس مطالبہ سے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ یعنی انہوں نے کہا کہ اسلام ایک سیاسی نظام کی بنیاد بن سکتا ہے۔

مسلمانانِ ہند (یعنی پاکستانی مسلمانوں) نے اپنے لئے جو یہ راستہ منتخب کیا۔ تو اس کی عقلی توجیہہ کیا تھی؟ یعنی انہوں نے کس دلیل کی بنا پر کہہ دیا کہ مسلمانوں کی مملکت لادینی نہیں ہو سکتی۔ اس کا مدار اسلام پر ہونا چاہیئے۔ زمانہ کی طرف سے یہ چیلنج تھا کہ تم ثابت کرو کہ وہ نظام جو انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود تک لے جائے۔ خالص عقل کی بنیادوں پر قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے وحی کی بھی ضرورت ہے۔ یہ چیلنج ابھی تک شرمندۂ جواب نہ ہوا تھا۔ اب اس کا جواب قرآنک ریسرچ سنٹر کے ڈائرکٹر پرویز صاحب نے اپنی دو کتابوں میں دیا ہے۔ جن میں کی پہلی کتاب شائع ہو چکی ہے۔ اور اس وقت ہمارے زیرِ نظر ہے۔ انہوں نے اس جامع سوال کو اپنے سامنے رکھا ہے کہ کیا عقلِ انسانی کے مقابلہ میں وحی وہ محکم بنیادیں عطا کر سکتی ہے جن پر انسانی معاشرے کی عمارت استوار کی جا سکے؟

یہ تو رہا سوال۔ اس کا جواب کیا ہے؟ اس کا جواب کہیں سے گھڑا گھڑایا نہیں مل سکتا۔ اس کے جواب کے لئے فقط اتنا کہہ دینا کافی نہیں کہ اسلام ایک بے مثل اور بے نظیر نظامِ حیات ہے جسے عقلِ انسانی فرداً فرداً یا اجتماعی طور پر کبھی مرتب نہیں کر سکی

اس کے لئے یہ بتانا ضروری ہوگا کہ عقلِ انسانی نے آج تک اس باب میں کیا کیا تجربات کئے ہیں۔ اور ان تجربوں کا نتیجہ کیا رہا ہے۔ اس طریق سے اس سوال کا جواب پیش کرنا بڑی صبر آزما کوہکنی چاہتا ہے۔ ایسی صبر آزما کہ اس کے تصور سے روح کانپ اٹھے لیکن پرویز جیسا فرہاد اس قسم کی صبر آزما کوہکنی سے کبھی نہیں گھبراتا۔ وہ کسی اور ہی مٹی کا بنا ہوا ہے۔ اس نے اپنی ساری عمر اسی کوہکنی میں صرف کی ہے۔ اس نے شمعِ اقبال سے کسب ضیاء کرنے کے بعد علوم حاضرہ کی روشنی میں قرآن پر غور و فکر کرنا شروع کیا۔ اور اس کے لئے قدیم اور جدید جس قدر معلومات کی ضرورت پیش آئی۔ انہیں حاصل کیا۔ اس چیلنج کا جواب وہی دے سکتا تھا۔ جو اس قدر وسیع علم رکھتا ہو۔ اور جس نے قرآن کا اس انداز سے مطالعہ کیا ہو۔ اس کام کے لئے پرویز کی اہلیت پر کیسے کلام ہو سکتا ہے؟

زیر نظر کتاب میں مصنف اپنے قارئین کو ان تمام راہوں میں اپنے ساتھ لئے جاتا ہے۔ جن سے انسانی فکر آج تک گذرا ہے۔ اس نقطہ پر خصوصی توجہ دلاتے ہوئے کہ ان مفکرین کی فکری کوششوں نے زندگی کے اہم اور بنیادی مسائل کو سلجھانے میں کیا کیا کچھ کیا ہے۔ اس سفر کا آغاز مصنف اس باب سے کرتا ہے کہ ذہنِ انسانی نے خارجی کائنات کی کنہ و حقیقت دریافت کرنے کی کیا کیا کاوشیں کی ہیں۔ شروع میں انسان نے یہی سمجھا کہ یہ کائنات فضا کی پہنائیوں میں مٹی کے ایک بے جان اور غیر متحرک ڈھیر کی طرح پڑی ہے۔ اس کے سامنے نہ کوئی مقصد ہے نہ غایت۔ نہ اس مقصد کے حصول کیلئے کسی حرکت کی صلاحیت۔ لیکن اب وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ خود مادہ کے متعلق یہ تصور غلط ہے۔ مادہ کسی ٹھوس شے کا نام نہیں۔ یہ تو خود مجرد توانائی اور بسیط حرکت سے عبارت ہے۔ اس سے یہ سوال سامنے آیا کہ اگر مادہ کی اصل و حقیقت یہ ہے۔ تو اس توانائی کا سرچشمہ اور اس حرکت کا مبداء کیا ہے اتنا تو انسان نے سمجھ لیا ہے کہ یہ توانائی محض ہنگامی طور پر وجود میں نہیں آگئی۔ لیکن یہ بات ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آسکی کہ پھر یہ توانائی آ کہاں سے گئی۔ اور زندگی اور شعور کی اصل ہے کیا۔ انسانی فکر اس باب میں اس وقت اس مقام پر کھڑی ہے اور متحیر کھڑی ہے۔

اس کے بعد مصنف اپنا رخ اخلاقیات، سیاسیات، معاشیات اور باطنیت کی طرف موڑتا ہے۔ اور یہ بتاتا ہے کہ یہ چیزیں انسان کو کس مقام تک لے آئی ہیں! یہ چیزیں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں انسان کو موجودہ معاشرے تک لے آئی ہیں جہاں ہر طرف انتشار و اضطراب ہے۔ اس نے فطرت کے بہت سے پوشیدہ دفائن کو بے نقاب کر لیا ہے۔ لیکن یہ قوتیں اس معاشرتی دنیا میں امن و سکون اور فلاح و بہبود نہیں پیدا کر سکیں۔ اس کے برعکس یہ قوتیں نہ صرف انسانی تہذیب کے مٹا ہی کے درپے ہیں۔ بلکہ خود زندگی ہی کو ختم کر دینے کا تہیہ کئے بیٹھی ہیں۔

یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان سفرِ زندگی کی آخری منزل تک آ پہنچا ہے۔ اور اس کے بعد ہلاکت و تباہی کے اور کچھ نہیں؟ اس سوال کا جواب اگر ہم اس علم سے طلب کریں جو انسانی فکر کا حاصل ہے۔ تو جواب یہی ملے گا کہ اب تباہی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن اگر ہم وحی سے دریافت کریں تو وہاں سے اس کا جواب مایوس کن نہیں ملتا۔ تیس سال ہوئے اقبال

یام مشرق کے دیباچہ میں لکھا تھا کہ فطرت اپنی گہرائیوں سے ایک نئے آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا کی تخلیق ی ہے۔ اس لئے انسان کو زندگی کے نصب العین تک پہنچنے کے لئے کوئی چیز روک نہیں سکتی. لیکن یہ نصب العین کیا ہے اور ک کیسے پہنچا جائے؟ اس کا جواب پرویز صاحب کی کتاب کے دوسرے حصے میں ملے گا. جس کا عنوان ہے "خدا یا کہا؟" یہ دونوں کتابیں اس سوال کا مکمل جواب پیش کریں گی کہ کیا وحی انسانی معاشرہ کی مستحکم بنیاد بن سکتی ہے۔ اور س طرح ایک ایسا ضابطۂ زندگی عطا کرتا ہے جو دنیا میں بے مثل و بے نظیر ہے۔ اور جو انسانیت کو اس کی منزل مقصود تک انے کا ضامن ہے۔ اس اعتبار سے مصنف کی زیر تبصرہ کتاب "انسان نے کیا سوچا؟" خاص اہمیت حاصل کر لیتی ہے لیکن ن خاص مقصد سے ہٹ کر بھی دیکھا جائے۔ تو یہ غیر معمولی تصنیف ایک اور اعتبار سے بھی بڑی خوش آئند ہے۔ اس میں ایک کے اندر انسانی فکر اور اس کے حاصل سے متعلق اس قدر معلومات جمع کردی گئی ہیں کہ وہ کسی اور کتاب میں یکجا نہیں مل سکتیں۔ پھر عتبار سے بھی یہ کتاب ایسی نہیں. جیسی عام طور پر معلومات کی کتابیں ہوتی ہیں. اس میں انسانی فکر کے ذخیرے کو اس انداز تیب دیا گیا ہے کہ ہر شعبۂ علم بالکل نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ جہاں تک مذہبی دنیا کا تعلق ہے. یہ کتاب ان لوگوں کے لئے کے مینار کا کام دیگی جو مذہبی افکار کی تشکیل جدید کے اہم فریضہ میں مصروف کار ہیں۔

پرویز صاحب کا اسلوب بیان بھی بڑا رواں اور دلکش ہوتا ہے۔ انھیں زیر بحث موضوع پر اس قدر عبور ہوتا ہے کہ ان تے میں جس قدر سخت مقام آتے ہیں۔ وہ نہایت آسانی اور بے تکلفی سے انھیں عبور کرتے چلے جاتے ہیں. علم کی اس قدر ل کے باوجود، ان کی تحریر میں ایسی جاذبیت ہوتی ہے کہ ایک عام سطح کا غیر فنی انسان بھی اس سے لطف اندوز ہوئے بغیر رہ سکتا. حقیقت یہ ہے کہ پرویز صاحب کی تصانیف کو اگر محض ادبی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو بھی وہ اس قابل ن کا عام مطالعہ کیا جائے۔

ل قانون

محترم احمد عبداللہ المسدوسی حیدرآباد (دکن) کے علمی اور قانونی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں تھے۔ سقوط حیدرآباد کے بعد وہ کراچی آگئے۔ اور ناسازگار حالات کے باوجود انھوں نے مسلسل محنت اور انتھک وں سے یہاں بھی اپنا مقام پیدا کرلیا۔ انھوں نے اپنا پرچہ الشرق نکالا جس سے اندازہ ہوا کہ بین الاقوامی سیاست ں مشرق وسطی اور مشرق بعید کے الجھے ہوئے مسائل پر ان کی نگاہ کس قدر گہری ہے۔ اب کچھ عرصہ سے وہ اردو کالج لیکچرار کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔ جس سے انھیں اپنی قانونی صلاحیتوں کی نمود کا موقع مل گیا ہے۔ اس سلسلہ میں نے قانون سے متعلق دو کتابیں شائع کی ہیں۔ پہلی کتاب اصول قانون (JURIS PRUDENCE) ہے یہ موضوع کی اہمیت قانون کے طالب علموں کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔ مسدوسی صاحب کی زیر نظر کتاب سامنڈ کی کتاب ہے لیکن یہ نہ تو اس کا بجنسہٖ ترجمہ ہے۔ اور نہ ہی خلاصہ۔ اس میں اصل کتاب کی ترتیب اور مباحث کو باقی رکھا گیا ہے بل مباحث اور مثالوں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور وہ اصطلاحات کے ساتھ ساتھ انگریزی اصطلاحات کو بھی درج کردیا

گیا ہے۔ اور حاشیہ پر کراچی یونیورسٹی کے سابقہ امتحانات کے سوالات دیدیئے گئے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کتاب قانون کے طالب علموں کے لئے بہت مفید رہے گی۔ کتاب مکتبہ خدام ملت فریئر روڈ کراچی کی طرف سے شائع ہوئی ہے (غالباً عجلت میں شائع ہونے کی وجہ سے) طباعت اچھی نہیں ہوئی۔ ضخامت ۲۶۸ صفحات۔ قیمت بلا جلد ساڑھے چار روپے۔

۲۔ قانونِ روما

سدوسی صاحب کی دوسری کتاب قانون روما (ROMAN PRIVATE LAW) سے متعلق۔ دنیا کے مروجہ قوانین پر رومن لا جس حد تک اثر انداز ہوا ہے۔ اس سے قانون کے طالب علم نا واقف نہیں۔ اس اعتبار سے قانون روما کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ سدوسی صاحب کی یہ کتاب خصوص قانونِ روما پر ٹیکچ کی تصنیف پر مبنی ہے۔ اور اول الذکر کتاب کی خصوصیات کی حامل۔ یہ کتاب بھی ایل ایل بی کے طلباء کے لئے بہت مفید ہوگی۔ ناشر اس کا بھی مکتبہ خدام ملت فریئر روڈ کراچی ہے۔ ضخامت ۱۸۰ صفحات۔ قیمت بلا جلد ساڑھے تین روپے۔

۳۔ ماہنامہ بلاغ القرآن

۱۱۰۔ مزنگ (؟) آباد لاہور۔ ضخامت سولہ صفحات۔ قیمت فی پرچہ ۴ر۔ سالانہ تین روپے۔ یہ پنجاب کے فرقہ "اہل القرآن" کا ترجمان ہے جو حال ہی میں لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کا پانچواں شمارہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ مضامین مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ پہلے مضمون کی زیر نظر قسط میں بتایا گیا ہے کہ وحی کی ایک ہی قسم ہے جو قرآن پر مشتمل ہے۔ دوسرے مضمون میں اس قرآنی صلوٰۃ کی تفاصیل ہیں جنھیں محترم عبد اللہ چکڑالوی مرحوم نے مرتب کیا تھا۔ اس مضمون میں مختلف مقامات پر طلوع اسلام کو یہ کہہ کر ہدف تنقید بنایا گیا ہے کہ یہ کہتا ہے کہ اب کسی طور پر کسی کو حق حاصل نہیں کہ ہماری مروجہ نماز وغیرہ میں تبدیلیاں کر کے امت میں مزید انتشار پیدا کیا جائے۔

فرقہ سازی کا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں انسان حقائق کی بجائے اشخاص کی اتباع اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ اہل قرآن حضرات کا بھی یہ عالم ہے کہ جو کچھ محترم چکڑالوی مرحوم لکھ گئے ہیں۔ وہ ان کے نزدیک حرف آخر ہے۔ حالانکہ ہو سکتا ہے کہ قرآن سمجھنے میں انہیں کہیں غلطی لگ گئی ہو۔ مرحوم کے خلوص اور جذبہ صادق کی ہمارے دل میں بڑی قدر ہے۔ قرآن سے ان کا والہانہ عشق بھی درخور ہزار تحسین ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک وہ قرآن کے متعلق بنیادی طور پر ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ اٹھائی ہوئی ان کے فکرِ قرآن کی ساری عمارت کج ہو گئی۔ اور ان کی عمر بھر کی مخلص جگر کاوی اور دیدہ ریزی قرآنی تعلیم کی نشر کے لئے مفید ہونے کی بجائے مضرت رساں نتائج کا موجب بن گئی۔ ہمارے سامنے جب بھی اس کا تصور آتا ہے۔ اس احساس سے بیحد قلق ہوتا ہے۔ ہمیں اگر اس کا یقین نہ ہوتا کہ فرقہ بندی میں انسان اس قسم کی کوئی بات سنا نہیں کرتا۔ تو ہم ان حضرات کی خدمت میں بادب گذارش کرتے کہ جو باتیں وہ پیش کر رہے ہیں۔ ان میں جان نہیں ہے۔ اس لئے بہتر ہو کہ وہ اپنی توانائیوں کو کسی مفید مقصد کے حصول کے لئے صرف کریں۔

سلیم کے نام خط آئندہ پرچے میں ملاحظہ

گزری ہوئی کہانیاں

ہم اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ ہماری نشاۃِ ثانیہ کی کوششوں میں جو مقام سرسید مرحوم کو حاصل ہے، اس سے ہمارے دور کے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ایک مبسوط تاریخی تصنیف کی ضرورت ہے لیکن جب تک ایسا ممکن نہیں، ہماری کوشش یہ رہتی ہے کہ سرسیدؒ کے متعلق جہاں کہیں کوئی قابلِ قدر چیز نظر پڑے اسے پیشِ ناظرین کر دیا جائے تاکہ اس طرح اندکے اندکے، مسلمانوں کے اس محسنِ محسن کا تعارف ہوتا جائے۔ اسی ضمن میں ہم ذیل میں سرسیدؒ کی زندگی کے چند واقعات درج کرتے ہیں، جو ظفیر الدین صاحب صدیقی کے قلم سے، دہلی کے رسالہ برہان میں شائع ہوئے ہیں ان واقعات سے اندازہ ہو سکے گا کہ مبداءِ فیض کی طرف سے سرسیدؒ کو ذہنِ رسا کے ساتھ، کس قدر قلبِ دردآگیں عطا ہوا تھا۔ مقالہ نگار نے ان واقعات کے ساتھ ساتھ جو تبصرہ کیا ہے ضروری نہیں کہ ہم اس سے لفظاً لفظاً متفق ہوں۔ ہمارا مقصد درحقیقت سرسیدؒ کے زندگی کے ان واقعات ہی کو درج کرنا ہے۔ نہ کہ مصنف کے تبصرہ کو۔ مضمون کے بعض غیر متعلقہ حصے حذف بھی کر دیئے گئے ہیں۔ سرسیدؒ کے ساتھ، کچھ واقعات نواب وقار الملک مرحوم کے بھی شاملِ مقالہ ہیں۔ ان سے نظر آ جاتا ہے کہ سرسید نے قوم میں کس قسم کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ [طلوعِ اسلام]

سرسید احمد خاں بانیٔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو علمی دنیا میں جو شہرت حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ان کے مذہبی خیالات کے متعلق لوگوں میں بلاشبہ مختلف رائیں ہیں۔ مگر جہاں تک اپنی معلومات کا تعلق ہے ان کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ ان کے اخلاص و للّٰہیت کے باب میں دو رائیں نہیں ہو سکتی ہیں۔

مولانا حالی مرحوم لکھتے ہیں۔

> جب سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" چار جلدوں میں چھپ کر ہندوستان پہنچی، جس کی نسبت عیسائیوں میں مشہور تھا کہ اس نے اسلام کے استیصال میں تسمہ لگا نہیں رکھا، اس وقت جو حال سرسید کی بے چینی اور جوش و خروش کا تھا وہ ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے۔

اللہ اللہ یہ حال ہے اس مسلمان کا جس کو کہا جاتا ہے کہ بعض مصالح کی بنیاد پر انگریزی حکومت اور خود انگریزوں سے بڑا خاص تعلق تھا، تعلقات اپنی جگہ تھے مگر دین کے معاملہ میں دیکھ رہے ہیں کتنے بے چین ہیں اور کیسا ان میں جوش و خروش ہے آج ان کا نام لینے والے

ہر معاملہ میں ان کا بار بار حوالہ دیں گے، مگر جہاں دین کی بات ہو وہاں ان کا سارا حسن ظن رکھا کا رکھا ہی رہ جاتا ہے، اور ان میں کوئی بے چینی نہیں ہوتی ۔۔۔۔۔ مولانا حالی مرحوم ہی کا بیان ہے

وہ (سرسید) جب کبھی اور کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھتے تھے، اکثر سر ولیم کی کتاب کا ذکر کرتے تھے، اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام پر حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں۔

اس کو بار بار پڑھیے اور سوچیے، سرسید مرحوم میں کتنی اور کیسی غیرت و حمیت دینی پائی جاتی تھی مگر آہ ان کے نام لیواؤں میں اب یہ حمیت دینی کہاں نظر آتی ہے؟ جو دو چار ہیں ان کو کوئی پوچھتا ہی نہیں، بلکہ اب تو خود اسی یونیورسٹی کے فرزندان ارجمند اپنی اپنی جگہ میں بیٹھ بیٹھ کر سر ولیم سے زیادہ سخت حملے کرتے رہتے ہیں، اور ان کو احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ تیر کس کا دل زخمی کر رہا ہے، اور کس کے دل کو چھید رہا ہے

سرسید مرحوم اپنے ایک خط میں اپنے ایک دوست کو لکھتے ہیں

ان دنوں ذرا میرے دل کو سوزش ہے ولیم میور (صاحب) نے جو کتاب آنحضرت صلعم کے حال میں لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں، اس نے دل کو جلا دیا، اور ان کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا۔

یہ اس شخص کی گواہی ہے جو جدید تعلیم یافتوں کا امام ہے۔ کیا اس کے بعد بھی یقین نہ ہوگا کہ عیسائیوں نے مذہب کرنے میں بڑی ناانصافیاں کی ہیں۔ بیجا تعصب سے کام لیا ہے۔ جن جدید تعلیم یافتوں کے دینی معلومات کا بیشتر ذخیرہ ہیں ان کو سوچنا چاہیئے، کہ ان کے "دینی معلومات" کی حیثیت پھر کیا رہ جاتی ہے۔؟

ولیم میور وغیرہ نے کتنی گندگی اچھالی ہوگی، کہ سرسید مرحوم کے قلم سے یہ جملے ٹپک پڑے۔

مصمم ارادہ کر لیا کہ آنحضرت صلعم کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے، خرچ ہو جائے، اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں یہ کہہ کر پکارا جا فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا حاضر کرو ع

"مارا ہمیں تمغۂ شہنشاہی بس است"

اللہ اللہ یہ ہے محبت رسول، اور حمیت دین کا جذبہ، کہاں ہیں وہ لوگ۔ جو سرسید کا نام لے کر اپنی بے حمیتی جواب دے گئی ہے، وہ ہر جائز و ناجائز شعبہ میں تو خرچ کر سکتے ہیں، مگر دین کی عزت و عظمت کی حفاظت حد یہ ہے کہ اس سلسلہ میں زبان کھولنے کی بھی ان کو جرأت نہیں ہوتی، دماغی عیاشی کے لئے سیکڑوں ناول دین کی عظمت اور اس کی سربلندی کے لئے ایک جملہ لکھنے میں بھی شرم محسوس کرتے ہیں، اور سوچتے ہیں اگر سرسید مرحوم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کئے گئے اعتراض کا صرف جواب ہی نہیں لکھا، بلکہ اس سوچی، اور کتابت و طباعت کے اخراجات کی خود ہی فکر کی۔ اس سلسلہ میں سرسید مرحوم لکھتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ آپ اس خط کے پہنچنے کے بعد میر ظہور حسین کے پاس جائیں........ اور دونوں صاحب مل کر کسی مہاجن سے ہزار روپیہ قرض لیجئے، سود اور روپیہ میں ادا کروں گا........ ہزار روپیہ بھیجنے کے لئے دلی لکھا ہے اور میں نے لکھا ہے کہ کتابیں اور مرا اسباب یہاں تک کہ مرے ظروف مسی تک فروخت کر کے ہزار روپیہ بھیج دو۔

اس وقت سودی لین دین کی بحث چھوڑیئے۔ اور ایمانداری سے سید مرحوم کے بے پناہ ایمانی جذبہ اور دینی غیرت و حمیت کا اندازہ لگائیے اور دیکھئے کہ ان کے جوش و خروش کا کیا عالم ہے اور وہ کس قدر بے چین ہیں، اور لندن میں بیٹھ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا کیا حق ادا کر رہے ہیں، اس سلسلہ میں نہ انگریزوں کے علوم و فنون سے مرعوب ہوتے ہیں اور نہ حکومت وقت سے خوف زدہ۔

آہ جس یونیورسٹی کے بانی کے ایمان و عمل کا یہ حال ہے، آج اس ادارہ کے فیض یافتوں کی دینی حالت قابل صد افسوس ہے، دنیاوی لحاظ سے بلاشبہ یہ بہت اونچے، بلند خیال، بلند اقبال اور ہر طرح قابل مدح و ستائش ہیں، مگر جہاں تک دینی غیرت و حمیت اور ایمان و عمل کا تعلق ہے اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ بجز چند افراد بانی ادارہ کے ساتھ ان کو کوئی خاص لگاؤ دیکھا نہیں۔ کاش لوگ سوچتے کہ بانی ادارہ کا مقصد جہاں دنیا کے اونچے عہدے حاصل کرنا تھا، وہاں یہ بھی مقصد تھا کہ مسلمان ان اونچے عہدوں پر رہ کر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی خدمت انجام دیں، اور اس دین پر جہاں سے زد پڑ رہی ہو۔ اس کا دروازہ بند کرنے کی سعی کریں۔

سر سید مرحوم میں جس طرح دینی غیرت تھی، اسی طرح آپ کو مسلمان اور مسلمانی تاریخ سے محبت تھی، چنانچہ کوئی مصنف اگر اپنی کتابوں میں مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کرتا اور آپ کو معلوم ہو جاتا تو برداشت نہیں کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں آپ نے ایک مرتبہ محسن الملک کو لکھا۔

انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں ہے، جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو۔

کہاں ہیں انگریز مصنفوں کے کلمہ گو! آنکھیں کھول کر دیکھیں سید مرحوم جیسے رواداری اور انگریز دوست کا کیا خیال ہے یہ کوئی دقیانوسی مولوی کا بیان نہیں، بلکہ مسلم یونیورسٹی کے بانی کی تحریر ہے، علیگ بھائی بھی اسے غور سے پڑھیں، جو انگریز مصنفوں کی تاریخوں پر بغیر کافی تحقیق یقین کر لیتے ہیں، اور بیچارے مسلمان محقق مصنفوں کو اپنے خیال میں کوئی وقعت نہیں دیتے، اور حد یہ ہے کہ فارسی عربی اور اردو میں صحیح تاریخوں کا پڑھنا ان کو بار گذرتا ہے۔

انگریز مصنفوں کی بے ایمانی کا راز فاش کرنے کے بعد سر سید مرحوم آگے رقمطراز ہیں۔

ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انھیں تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں، جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات ازراہ ناانصافی اور تعصب مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں۔

جس خطرہ کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، افسوس آج تک اس خطرہ کا تشفی بخش انسداد نہ ہو سکا، سرسید مرحوم نے جس زہر سے مسلمان کو بچانا چاہا تھا، بعد میں چل کر اس کے ماننے والوں کو اس کا صحیح احساس باقی نہ رہا۔

علیگ برادری نے جتنا دھیان ناول اور افسانے پر دیا، کاش یہ اس کا کوئی ادنیٰ حصہ تاریخ پر صرف کرتے۔ تو آج اردو میں ہم تاریخوں کا بڑا ذخیرہ ہوتا۔ (.......)

لندن میں رہ کر سرسید مرحوم ایک ایک چیز کو عبرت و بصیرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور مسلمانوں کی حالت پر آنسو بہاتے ہیں، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

مگر ہماری قسمت میں وہی جلنا ہے، یہاں کا حال دیکھ دیکھ کر اپنے ملک اور اپنی قوم کی حمایت اور بیجا تعصب اور تنزل موجودہ اور ذلت آئندہ کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے

جو اپنی قوم کو کہیں نہیں بھولتا، دوسروں کی ترقی دیکھ کر اپنی قوم کے تنزل پر آنسو بہاتا ہے، اور ان اسباب کو تلاش کرتا ہے جن کی وجہ سے قوم پامال ہو رہی ہے —— وقیاس کر سکتے ہیں آجائے گی کہ آج ان کے نام لیواؤں کی بڑی جماعت بے حسی کی زندگی گزار رہی ہے، اور غفلت کی نیند سوتی ہے، آج اس جماعت کے پیش نظر صرف اپنا ذاتی فائدہ ہے اور بس،

یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سب کے سب ایسے ہی ہیں، بلکہ وہ باکمال اور حساس افراد بھی ہیں جو رات دن قوم کی خیر خواہی میں دل و جان سے منہمک ہیں۔

سرسید مرحوم نے مسلمانوں کی اسی حالت کا ماتم کیا ہے۔

افسوس کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کا نکالنے والا نہیں ہے، ہائے افسوس امرت تھوکتے ہیں، اور زہر نگلتے ہیں، ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں، اور مگر کے منہ میں ہاتھ دیتے ہیں۔

مگر آہ کس کو بتایا جائے کہ تم جہاں جا رہے ہو وہاں کھرے سکے نہیں ملتے، کھرے سکوں کی تلاش ہو تو ہمت سے کام لو، مرعوبیت ترک کرو، بہادر ساور نڈر بنو، اور اپنے ملک و قوم کی خیر خواہی میں لگ جاؤ، نتیجہ خدا کے ہاتھ ہے، تمہارا کام جد و جہد کرنا اور قوت کو راہ پر دکھانا ہے۔ سرسید مرحوم نے ایک مرتبہ وقار الملک کو لکھا تھا۔

میں تسمیہ آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے مسلمانوں کی بہتری، ترقی اور درستی اخلاق کی جس پر میں کوشش کر رہا ہوں مطلق توقع نہیں ہے مایوسی محض ہے مگر اس خیال سے کہ ہمارا فرض کوشش کئے جانا ہے کرتا ہوں۔ پس جس چیز کے حصول سے مایوسی ہو، اس مایوسی کے سبب سے اپنا فرض کوشش ترک نہیں ہو سکتا۔

یہ ہے اپنے فرض کا احساس، آج جدید تعلیم یافتوں کو کون بتلائے کہ آپ کی ذمہ داری بھی بڑی اہم ہے، مگر آپ کو احساس نہیں آپ بس پڑھنا اور کمانا کمانا ہی اپنا فرض سمجھتے ہیں، یہ محض غلط ہے، صرف مولویوں کو ہر چیز کا ذمہ دار قرار دے کر مطمئن کرنا یہ ذمہ داری کا احساس نہیں ہے، آزاد ہندوستان میں دینی جذبہ لے کر آگے بڑھنے اور قومی خدمت کی بڑی گنجائش ہے

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ سرسید عربی فارسی کے بالکل خلاف تھے وہ بالکل غلط ہے۔ اسی طرح ہمارے علیگ بھائیوں میں جن کا یہ خیال ہے
عربی فارسی کی کوئی اہمیت ہی نہیں وہ بھی بھول میں ہیں سرسید مرحوم نے ایک بار عماد الملک کو لکھا تھا

اس کے ساتھ یہ تدبیر بھی چاہتا ہوں کہ علوم عربیہ اور درس کتب مذہبی جو معدوم ہوتا جاتا ہے، کسی طرح قائم رہے، اگر عربی فارسی ہم میں سے معدوم ہو جائے۔ تو اس کے ساتھ ہماری قومیت بھی معدوم ہو جائے گی"

آج اب یہ خیال کس کو ہے؟ کہ مذہبی تعلیم اور جس زبان میں اس کا ذخیرہ ہے اس کا حاصل کرنا بھی ضروری ہے، اور اس سے غفلت موت کے برابر ہے۔ آج عربی داں جب تک جدید تعلیم حاصل نہ کرے اور انگریزی داں جب تک علوم مشرقیہ اور دینی معلومات حاصل نہ کرے، اس کا علم ادھورا ہے، تنگ نظری دونوں ہی میں باقی رہ جاتی ہے، کاش لوگ غور کریں۔

سرسید مرحوم ایک زندہ دل اور با اخلاق انسان تھے، اور اُن کا مطمح نظر نیکی کرنا اور برائی دور کرنا تھا، خود فرماتے ہیں:

ہم کو خدا نے دنیا میں اس لئے پیدا کیا ہے کہ سب کی بھلائی چاہیں، بُرا کرنے والے کی برائی سے ہم کو کیا کام، ہم کو اپنا دل اپنی زبان بھلی رکھنی چاہیئے۔ بدوں یا بدطینتوں پر افسوس کرنا چاہیئے، مگر اس سے زیادہ کچھ کرنا خود اپنے کو بھی ویسا ہی کرنا ہے۔ جو لوگ بُرا کہنے والے ہیں، اُن کی نسبت ہم کو صبر و تحمل چاہیئے۔ اگر وہ بُرائی ہم میں ہے تو اس کے دور کرنے میں کوشش لازم ہے

یہ ہیں ہمارے گذرے ہوئے بزرگوں کے اخلاق و اعمال۔ بُرائی اُن کے وہم میں بھی نہیں آتی تھی سب نیکی ہی نیکی اُن کے مدنظر رہتی، برائی کا جواب بھی نیکی ہی سے دیا کرتے، تاکہ بُرائی دور ہو، اب یہ اخلاق و اعمال اور صبر و تحمل ہم لوگوں میں کہاں باقی رہا؟ جو لوگ آپ سے روحانی وابستگی رکھتے ہیں ان کو سوچنا چاہیئے، کہ ہمارے اخلاق و اعمال کیونکر سدھر سکتے ہیں۔

بانی علیگڑھ کا دل میل کچیل اور کینہ کپٹ سے پاک تھا، ایک دفعہ محسن الملک کو ان کے خط کے جواب میں لکھا:

مولوی ... ... کو اب بھی میں اپنے بھائی سے کم نہیں سمجھتا، مگر جو ملال کہ میرے دل میں ہوا، وہ اب تک کم نہیں ہوا۔ پھوٹ جاوے ... جو کسی کو دیکھے اس نگاہ سے، جو اس کے دل میں نہیں ہے، گل جاوے وہ زبان، جو وہ کہے جو اس کے دل میں نہیں ہے ... ٹوٹ جاوے وہ ہاتھ، جو وہ لکھے جو اس کے دل میں نہیں ہے۔

... ... سب ہیں، منافقت سے بیزاری کا اعلان اور اخلاص عمل کا اظہار، اب تو اس نیکی کو لوگ بے وقوفی کہتے ہیں۔ وہ بڑا اگدھا سمجھا جاتا ہے ... کا قول دل کے مطابق ہو، اب کمال یہ ہے کہ دل میں کشادگی ہو، اور زبان شیریں، دل میں بُرائی ہو، اور زبان پر تعریف، علیگ برادری اپنے بانی کی اس تحریر کو بار بار پڑھے اور سوچے کہ کیا ہمارا طرز عمل یہی ہے، جس کی بانی یونیورسٹی تعلیم دے گئے ہیں۔

سرسید مرحوم کو اپنی قوم سے بڑی ہمدردی تھی۔ اور قوم و ملت کا غم اتنا غالب تھا کہ وہ اپنا سارا غم فراموش کر گئے تھے، ایک موقعہ پر انہوں نے ایک انگریز مسٹر شکسپیر کی مدد کی تھی، اس مدد کے سلسلہ میں ان کو ایک جاگیر دینا چاہی مگر انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

جب ہمارے دوست مرحوم شکسپیر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک بعوض اس وفاداری کے تعلقہ

جہاں آباد جو سادات کے ایک نہایت نامی خاندان کی ملکیت تھا اور لاکھ روپے سے زیادہ کی مالیت کا تھا، مجھ کو دینا چاہا، تو مرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا، میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالائق دنیا میں نہ ہوگا، کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو، اور میں ان کی جائیداد لے کر تعلقہ دار بنوں میں نے اس کے لینے سے انکار کیا۔

اللہ اللہ یہ تھا وہ دل قوم و ملت کے باب میں، ایک لاکھ کی جاگیر پر لات ماردی اور اپنی غیرت و حمیت کی لاج رکھ لی، سوچا جائے اب ایسے لوگ کہاں باقی۔ سب اب تو لوگ کوشاں رہتے ہیں کہ کسی کی گردن مروڑ کر ہم اس کی جائیداد پر قابض ہو جائیں۔

کہاں ہیں وہ با اثر حضرات جو رات دن دوسروں کو برباد کرنے کی فکر میں رہتے ہیں اور اپنی ادنیٰ کمائی کی بڑی قیمت مانگتے ہیں، چاہے.... ..... دوسرے کے بال بچوں کی لاشوں کو روند کر ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ اس واقعہ سے سبق حاصل کریں۔

۱۸۵۷ء میں بہت سے لوگ بد دل ہو کر ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ حالات دیکھ کر سر سید مرحوم کو بھی پہلے خیال آیا کہ ہندوستان چھوڑ دیں مگر حالات کا جب انہوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا تو سمجھ میں آیا کہ مرا خیال غلط ہے، چنانچہ خود لکھتے ہیں۔

یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے۔ کہ اپنی قوم کو تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیئے اور جو مصیبت پڑی ہے اس کو دور کرنے میں ہمت باندھنا قومی فرض ہے، میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔

اسے کہتے ہیں اپنی قوم سے سچی ہمدردی، اپنا آرام دیکھ کر پوری قوم کو بھول جانا کسی قومی لیڈر کا کام نہیں ہو سکتا، کسی اور کا ہو تو ہو سکتا ہے، مگر آہ ای بوڑھے سپاہی کی یونیورسٹی کے وہ بلند اقبال فرزندانِ ارجمند، جو کل تک ہندوستان میں تھے، مگر جوں ہی پاکستان کی ان کو اطمینان بخش جگہ ملی۔ یہاں سے بھاگ گئے، یہ بھی نہ سوچا کہ اس یونیورسٹی کا کیا ہوگا۔ کل تک جن غریب عوام مسلمان کا نام لے کر ہم نے لیڈری اور برتری حاصل کی ہے، اس کا کیا حشر ہوگا، یہی نہیں بلکہ جب موقع آیا تو بے دردی سے مسلمانوں کو آگ و خون کی بارش میں ڈھکیل دیا۔ اور خود ہوائی جہاز پر بیٹھ کر اڑ گئے، خدا جزائے خیر عطا کرے ان لیڈرانِ عظام اور علمائے کرام کو، جنہوں نے جان کی بازی لگا کر اس دہکتے جہنم میں مسلمانوں کی جان بچائی۔ اور ساری مصیبتوں سے دوچار ہو کر اب تک یہاں ڈٹے ہیں، اور قوم و ملت کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

مسٹر محمود جو سر سید کے فرزند ارجمند ہیں، بہت ذہین، حاضر الذہن اور دور اندیش تھے، چنانچہ جسٹس محمود کا فیصلہ مدلل و مکمل ہونے میں جو شہرت رکھتا ہے وہ کسی باخبر سے پوشیدہ نہیں، ان کے متعلق بیان ہے کہ ان کے دل میں خدا کا خوف بہت تھا، ملازمت سے سبکدوش ہو کر جب پنشن پانے لگے تو قرآن پاک اپنے خاص انداز میں پڑھتے اور روتے جاتے تھے، شیخ ممتاز حسین۔

گرمی کے موسم میں ایک صبح کو یہ دیکھا گیا کہ سکندر باغ (لکھنؤ) کے سبزہ زار پر پلتھی مار کر محمود صاحب بیٹھے زبانی کچھ پڑھ رہے ہیں، ان کے یہاں رہنے والے ایک صاحب سے معلوم ہوا، کہ ان کو قرآن شریف کا ایک پارہ زبانی یاد ہے۔ کچھ دنوں سے اکثر یہ صبح کو تنہائی میں رب العٰلمین کا دھیان دل میں رکھ کر اسے پڑھتے ہیں۔

اور اس کے بعد چند اشعار دنیا کی بے ثباتی کے جو انہیں یاد ہیں پڑھ کر روتے ہیں ـــــ میں صبح کو ٹہلنے نکلا تھا
دوسرے میں نے خود یہ سماں ایک بار دیکھا کہ محمود صاحب آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہے ہیں اور آنکھوں سے
آنسو رواں ہیں۔

یہ ایک انگریزی داں کا صحیح واقعہ ہے، جو اپنے علم و عقل، اور فہم و تدبر میں مسلّم ہے۔ غور کیجئے اللہ کے بندہ پر اپنے آقا اور مالک کا کیا [اثر] تھا۔ یہ کوئی مُلّا نہیں تھے، بلکہ لندن کے پڑھے ہوئے اور اپنے وقت میں بڑی شہرت و عزت کے مالک۔ آہ اب تو ہمارے انگریزی [داں طبقہ] کو قرآن سے لگاؤ ہی نہیں باقی رہا، اب تو اکثریت ایسی لوگوں کی ہے جنہوں نے کبھی قرآن پاک پڑھا ہی نہیں ہے، بس سنتے چلے آ رہے [ہیں ... یہ] خشیت ایسی دلوں میں اب کہاں پیدا ہوتی؟ اب تو جو لوگ اپنے کو مہذب و متمدن کہتے ہیں، ان کی دنیا ہی اور ہے، بہتوں بوڑھے ہونے [پر بھی] موت کی تیاری نہیں کرتے، کہ قیامت میں ذلت و رسوائی سے رستگاری ہو سکے۔ اس باب میں عالموں کا حال بھی کچھ زیادہ اچھا [نہیں] ہے۔

مولوی بشیر الدین (اٹاوہ) پہلے سر سید کے مخالفوں میں تھے، ان کا بیان ہے کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے چوتھے اجتماع میں میں [نے] ایک تجویز پیش کی، اور اس پر ایک زوردار تقریر کی۔ تجویز یہ تھی کہ ڈیلی فورس کی تاریخ ہندوستان "جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم [کی] تعلیمات کو مسخ کر کے اہانت آمیز انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ نصاب سے حکومت خارج کر دے۔

مولوی بشیر الدین صاحب فرماتے ہیں کہ اس تجویز پر

سر سید بولنے کھڑے ہوئے تو عالم ہی کچھ اور تھا۔ ایک ایک لفظ میں دینی حرارت سمائی ہوئی تھی اور جوش
اسلامی کا دریا تھا جو امنڈ رہا تھا۔ میں کچھ ہکا بکا سا رہ گیا...... اور مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ یہ شخص ناموس اسلام
کا سچا محافظ، دین رسالت مآب کا سچا پیرو، اور قوم کا سچا ہمدرد ہے:

یہ ایک ناقد اور مخالف کی گواہی ہے۔ اس کے بعد سر سید کے اخلاص پر شبہ کرنا ظلم ہوگا۔ غور کیجئے اس مرد مسلمان کے دل میں رسول [کریم] صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی محبت تھی، اور آپ کی تعلیمات سے اس کو کتنا عشق تھا، آہ اب مہذب اور متمدن کہے جانے والوں میں دین کی [عظ]مت کہاں باقی رہی؟ اب تو کچھ لوگ آپ کے نام کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہیں لگاتے۔ "محمد صاحب" کہا کرتے ہیں، اور ان کو [احس]اس تک نہیں ہوتا کہ ہم ادب کے طریقے کو چھوڑ کر گستاخی کر رہے ہیں۔ اور اگر کسی مصلحت وقت کی وجہ سے زبان پر دین کا نام آتا بھی [ہے تو] دل پر اس کا اثر نہیں پڑتا۔

مولوی بشیر صاحب ہی کا بیان ہے کہ سر سید کسی کو دبانا نہیں چاہتے تھے، ہر ایک کو اپنی رائے کے اظہار کا موقع دیتے، اور فریق ثانی [کے] نقطۂ نظر بہت نرمی سے پیش کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

سر سید میں لاکھ روپے کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے ہر نیاز مند کو کھل کر بات کرنے کا موقع دیتے تھے جس بات
کے متعلق ان کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ سچائی کے ساتھ ان کے مشن کی مخالفت کر رہا ہے ...

نگاہ سے دیکھتے تھے اور بڑے اہتمام سے تسکین بخش انداز میں اس کے اعتراضات کے جوابات دیتے تھے۔

اب یہ انداز فکر اور یہ اخلاق ہمارے مہذب دوستوں میں کہاں باقی رہا؟ اب تو کوئی اپنے نقطۂ نظر کے خلاف ایک بات بھی سننے کے لئے تیار نہیں، چاہے کہنے والا کتنا ہی مخلص کیوں نہ ہو۔

مولوی بشیر صاحب فرماتے ہیں

> ایک بار میں نے اُن سے کہا کہ آپ نے مسلمانوں میں جدید تعلیم رائج کرنے کا جو کام شروع کیا ہے یہ تو بہت اچھا ہے یہ بتائیے کہ مذہبی معاملات کو کیوں چھیڑ دیا .... ہنسے اور فرمایا کہ بھائی اگر میں یہ سوال نہ چھیڑتا، تو مسلمان کبھی کالج کی طرف توجہ نہ کرتے۔

اس واقعہ سے کتنی سچائی ٹپکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے سرسید دل کے بہت صاف، اور دماغ کے سلجھے ہوئے آدمی تھے، جھوٹ اور فریب کو برا جانتے تھے۔ اب تو لوگ ایک غلط بات کے لئے سو جھوٹ بولتے ہیں، اور لفاظی سے اسے صحیح ثابت کرنے کی خواہ مخواہ سعی کرتے ہیں، چاہے ان کو اس سلسلے میں ذلت و رسوائی سے دوچار ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔

علی گڑھ مدرسہ کی بنیاد پہلے مولوی سمیع اللہ مرحوم نے ۱۸۷۵ء میں رکھی، اس وقت سرسید بنارس میں تھے۔ مگر اس کی باضابطہ بنیاد ۱۸۷۷ء میں رکھی گئی اور اس میں مولوی سمیع اللہ کے ساتھ سرسید بھی شریک تھے، اس ابتداء کا ایک مؤثر واقعہ مولوی بشیر صاحب بیان کرتے ہیں، خود مولوی سمیع اللہ نے ان سے بیان کیا تھا۔ کہتے ہیں

> خود مولوی سمیع اللہ نے مجھ سے بیان کیا۔ کہنے لگے "میں اور سرسید نماز تہجد کے وقت اٹھ کر میدانِ تعمیر پہ گئے، سہانا روح پرور وقت، فضا کی خاموشی، طبیعتوں میں قومی ہمدردی اور دینی حمیت جوش زن، ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ سرور انگیز بھی تھی، رقت آمیز بھی، اور عبرت خیز بھی، مغلیہ سلطنت کی تباہی کے بعد ارض ہند پر ملت اسلامیہ کی یہ پہلی بنیاد نے تعمیر تھی، زندگی اور ترقی کے خواب کی پہلی تعبیر، جوش سے طبیعت میں گریہ طاری ہو گیا، ہم دونوں روتے جاتے تھے، اور رب ذوالجلال کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے جاتے تھے۔ اور اس کے فضل و بخشش کے لئے زبان پر دعا تھی۔ سرسید نہایت اصرار کرتے تھے کہ میں سنگ بنیاد رکھوں، اور میں سرسید سے اصرار کرتا تھا، آخر میں سرسید کا اصرار غالب آ گیا، میں نے انتہائی رقت قلب کے ساتھ یہ فریضہ مسعود انجام دیا۔

جس ادارہ کی بنیاد رکھنے والوں نے قلب کی اس رقت کے ساتھ رکھی ہو بتایا جائے کہ اس خدمت کی قبولیت میں کیا شبہ ہو سکتا ہے، اللہ اللہ کیسا اخلاص ہے، روتے جا رہے ہیں اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے جا رہے ہیں، خدا جانتا ہے ایسی بنیاد کبھی بھی بے ثمر نہ رہی، آج مسلم یونیورسٹی کی ساری کامیابی انہی بزرگوں اور مخلصوں کی نالۂ صبحگاہی اور گریہ و بکائے نیم شبی کا نتیجہ ہے، کیسے بتاؤں کہ اب یہ گداز، یہ خلوص و للہیت عنقا ہے آدمی کی زبان پر تو سب کچھ ہوتا ہے مگر اس کے دل میں کوئی چیز نہیں ہوتا۔ خدا گواہ ہے آج ہما

ناکامیابی کی بنیادی وجہ یہی اخلاص وللہیت اور خضوع وخشوع کا فقدان ہے۔

ہمارے علیگ بھائی اس واقعہ کو بار بار پڑھیں اور سوچیں ان کے اسلاف میں خشیت الٰہی کیسی رچی ہوئی تھی۔ آہ یہ بے لوث خدمت کا جذبہ قوم کے ساتھ ریسی والہانہ محبت اور اپنی ذلت ومسکنت کا رب العزت کے آگے اس طرح اعتراف اب پچھلوں میں کہاں رہا؟ کاش ہم سمجھتے اور سچائی سے سوچتے،

مولوی سمیع اللہ کا خلوص علی گڑھ کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے لائق ہے بعد میں سرسید اور مولوی سمیع اللہ مرحوم میں اختلاف اس حد تک بڑھا کہ ترک تعلقات کی نوبت آگئی، مگر با ایں ہمہ مولوی سمیع اللہ مرحوم نے کالج کی کبھی برائی نہ چاہی، مولوی بشیر الدین صاحب ہی کا بیان ہے۔

> اس افسوسناک صورتحال کے بعد مولوی سمیع اللہ کالج کے انتظامی امور سے بہت حد تک دستکش رہے، لیکن کالج کے ساتھ ان کی ہمدردیاں اس دور میں بھی باقی رہیں، کالج کے جو طلبا ران سے ملنے جاتے تھے دل کھول کر ان کی مدد کرتے، ان کو بہت مخلصانہ مشورہ دیتے اور خیر وترقی کی تلقین فرماتے۔

میں اپنے علیگ بھائیوں سے ہی پوچھتا ہوں کہ وہ ایمانداری سے بتائیں کہ کیا یہ جذبہ اب ہمارے بڑوں میں باقی رہا؟ اور کیا اب بھی نیک نیتی کا وہی عالم ہے جو ہمارے پہلوں میں تھا؟ اب تو بصد حسرت وافسوس کہنا پڑتا ہے۔ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

محسن الملک نے سرسید مرحوم کا ایک عجیب پُر اثر واقعہ بیان کیا ہے جس کے راوی مولوی بشیر الدین صاحب ہی فرماتے ہیں۔

> یہ واقعہ انہوں نے مجھے خود بتایا ہے، سرسید سے خاصی بحث رہی، رات میں سو رہے تھے کہ گریہ وزاری کی آواز آئی دیکھا تو معلوم ہوا سید احمد خاں رو رہے ہیں، پوچھا کیا گھر سے کوئی تار آیا ہے، سرسید نے جھلا کر جواب دیا کہ پوری قوم تباہ ہو گئی اور تم پوچھتے ہو گھر سے کوئی تار آیا ہے۔

اس سوز وگداز کو ملاحظہ فرمایئے، رات کی تنہائی میں قوم کی بربادی پر رونے والا، اور ملت اسلامیہ کی تباہی پر آنسو بہانے والا اگر کامیاب نہ ہوتا تو پھر دنیا میں کون کامیاب ہوتا، سرسید مرحوم کے اسی خلوص اور سوز وگداز کا نتیجہ تھا کہ رب العزت نے اسے ہر طرح کی کامیابی عطا فرمائی۔ اور ہر طرح کی عزت سے نوازا۔

اس واقعہ میں ہمارے مہذب لیڈروں اور متمدن جوانوں کے لئے بڑا عبرت آموز سبق ہے، کاش وہ پڑھیں اور اثر قبول کریں۔

وقار الملک کا حصہ علی گڑھ کے قیام میں کسی سے کم نہیں، ان کی بڑی خوبی حق گوئی تھی۔ کبھی اس سلسلہ میں رورعایت نہ کی، عموماً مسئلوں میں سرسید کے مخالف رہتے، کیونکہ وقار الملک میں مذہبیت اور آئین وضابطہ کی پابندی بہت تھی، لکھا ہے۔

> سرسید کا انتہائی احترام کرنے کے باوجود انہوں نے اپنی رائے میں فرق نہ آنے دیا، اور کھلے طور پر ان کی مخالفت کی البتہ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ جب اکثریت نے اس کو پاس کر دیا تو انہوں نے انتہائی خندہ پیشانی سے

سرِ تسلیم خم کر دیا۔

یہ وقار الملک کے اخلاص کی دلیل ہے، اپنا نقطۂ نظر پوری قوت سے پیش کرتے، مگر جب اکثریت نے اس کو نہ مانا تو پھر نہ کیا کہ یہی بات کیوں نہ ہوئی۔ ہمارے اس دور میں تو کچھ اور ہی معاملہ ہے۔ اگر کسی کی بات نہ رہی تو وہ ایک مخالف پارٹی کا روپ دھارتا ہے، اور یکسر ادارہ کی ہی مخالفت میں سرگرمِ عمل ہو جاتا ہے، آج کوئی غور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ جو حق اس کو ہے کیا دوسروں کا حق اور بھی حاصل ہے یا نہیں، اگر سب یہی کرنے لگیں تو ادارہ کا کیا حال ہو۔ اور غالباً اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارا کوئی اجتماعی ادارہ آج کامیاب نہیں ہوتا۔

حیدرآباد میں ان (وقار الملک) کی کوٹھی میں ایک کوٹھری تھی، جس میں ایک اندھا فقیر رہتا تھا، اس کو کھانا نواب صاحب ہی کے مکان سے جاتا تھا، ایک دن زور کی بارش ہو رہی تھی۔ انہوں نے نوکروں سے کہا، کہ اندھے کو کھانا پہنچا دیا جائے، بارش کے سبب نوکروں نے تعمیلِ ارشاد میں تامل کیا، اور گویا بات ٹال گئے، نواب صاحب (یعنی وقار الملک) خاموشی سے اٹھے، کھانا لے کر اس اندھے کے پاس گئے۔ اور بڑی محبت سے اسے کھانا کھلایا۔

یہ اخلاق تھا نواب صاحب کا، جو کسی اعتبار سے آج کل کے کسی رئیس اور تعلیم یافتہ سے کم نہ تھے۔ جو کام ان کے نوکروں پر بار تھا، خود بنفسِ نفیس کیا اور کس دلچسپی سے کیا کہ کوئی بار محسوس نہ کیا۔ اور یہ خدمت بھی کس کی کی؟ ایک اندھے فقیر کی۔

غور فرمائیں آج کوئی مالدار تعلیم یافتہ ایسی خدمت کے لئے آپ کو تیار پاتا ہے، خدا گواہ ہے خاص خاص لوگوں کو چھوڑ کر "فقیر نوازی" عنقا ہو چکا ہے، آج کا مہذب طبقہ دوسری دنیا کا انسان ہے۔ اسے انسانی ہمدردی چھو نہیں گئی ہے، ہمارے ہاں میں یہ خدمت ننگ و عار کے مترادف سمجھی جائے گی، ایک ادنیٰ کا کام اعلیٰ کرے؟ کیسے ہو سکتا ہے، اب تو مالدار اپنے سگے غریب سے ملنا اپنی ذلت سمجھتا ہے۔ ایک گریجویٹ بھائی، اپنے جاہل بھائی کو منہ لگانا سب سے بڑا گناہ جانتا ہے، مگر یہ حضرات سوچیں کہ یہ اخلاقی بلندی نہیں انتہائی گراوٹ ہے — اور بڑوں کی بات تو جانے دیجئے آج ایسی "فقیر نوازی" کو معمولی انسان بھی اپنے لئے عار جانتا ہے۔

انہی وقار الملک کا ایک اور واقعہ سننے کے لائق ہے جس سے ان کی مذہبیت کا اندازہ ہوتا ہے، ساتھ ہی ان کی انصاف پسندی پروری کا، راوی مولوی بشیر صاحب ہیں یہ فرماتے ہیں،

وقار الملک نے اپنے لڑکے کو ندوہ میں داخل کرا دیا تھا، میں نے پوچھا کہ آپ نے ندوہ میں کیوں داخل کرا دیا۔ کہنے لگے کچھ مذہبیت آ جائے گی، میں نے فوراً کہا آپ دوسروں کے لڑکوں کو علی گڑھ بلا کر لامذہب بناتے ہیں چپ ہو گئے۔ لڑکے کو ندوہ سے بلا لیا اور علی گڑھ کالج میں نام لکھا دیا۔

طبیعت کی نیکی اور صلاح کی جانب میلان ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ خواہ مخواہ بحث شروع نہ کر دی بلکہ وہی کیا جو اس وقت ان کو کرنا چاہیئے تھا۔

ہمارے بابا

[علامہ اسلم جیراجپوری کا علمی پایہ جس قدر بلند تھا، اسی قدر ان کا مرتبہ بہ حیثیت انسان بھی اونچا تھا۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہ کسی چھوٹے سے چھوٹے آدمی کو بھی کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ اُس سے بلند مرتبت ہیں۔ جب وہ بچوں میں بیٹھتے تو ان کی طبیعت کی سادگی اور سینہ کی کشادگی اپنی پوری وسعتوں کے ساتھ فضا کو گھیر لیتی۔

جامعہ ملیہ (دہلی) سے بچوں کا ایک رسالہ شائع ہوتا ہے "پیام تعلیم"۔ اس کی مارچ سنہ ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں "ہمارے بابا" کے عنوان سے دو چھوٹے چھوٹے مضمون شائع ہوئے ہیں۔ پہلا مضمون ایک چھوٹی سی بچی "عذرا خاتون" کا لکھا ہے۔ جس میں اس نے اپنے بھولے بھالے انداز میں یہ بتایا ہے کہ علامہ مرحوم بچوں کے ساتھ کس طرح پیش آتے تھے۔ دوسرا مضمون علامہ مرحوم کے پوتے عزیزی شمیم کا لکھا ہے۔ جس میں اس نے بتایا ہے کہ علامہ مرحوم جب اپنے وطن تشریف لے جاتے تو بچوں سے کس قدر پیار کرتے۔ ان مضامین سے علامہ مرحوم کی "انسانی شخصیت" جس انداز سے ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ہم قارئین طلوع اسلام کو بھی اس میں شریک کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ چنانچہ یہ دونوں مضامین "پیام تعلیم" (جامعہ نگر۔ دہلی) کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ عزیزہ عذرا خاتون کے مضمون میں جو واقعہ جنوں کے متعلق بیان ہوا ہے اسے ہم نے بھی علامہ مرحوم کی زبان سے کئی مرتبہ سنا تھا۔ طلوع اسلام]

(۱) ہمارے بابا عذرا خاتون

مولانا اسلم جیراجپوری ہم سب کے بابا، بچوں ہی کے کیا ساری جامعہ کے بابا تھے۔ ہمارا گھر بابا کے گھر سے ملا ہوا تھا۔ بابا وقت کے بڑے پابند تھے ہر کام وقت ہی پر کرتے تھے لیکن ہمارے لئے انہوں نے کبھی پابندی نہیں لگائی۔ جب جی چاہتا ہم بابا کے پاس پہنچ جاتے۔ بابا ہمیشہ ہنس کر ہمارا استقبال کرتے۔ جب ہم بیٹھ جاتے تو ایسی مزے مزے کی باتیں کرتے کہ اٹھنے کو دل ہی نہ چاہتا تھا۔

بابا بڑوں سے تو محبت کرتے ہی تھے لیکن انہیں بچوں سے جتنا لگاؤ تھا اس کی مثال کم ہی مل سکتی ہے۔ بچے بھی بابا کو بہت چاہتے تھے کہ دن بابا بچوں کو گرم بلاتے تھے۔ اسی لئے گاؤں کے بچے بابا کو "گڑ والے بابا" کہتے تھے۔ سب بابا کو گھیر کر بیٹھ جاتے۔ اور بابا کے گلے میں

منہ ڈال کر کہانی سننے کے لئے کہتے۔ بابا کہتے: "اچھا بھئی میں تمہیں کہانی سناتا ہوں"۔ سب بچے سمٹ کر اکدم بابا کے اور قریب آجاتے۔ بابا دیر کے لئے سوچتے۔ پھر کوئی اچھی سی کہانی سناتے۔ جب یہ بچے کہانی سن کر چلے جاتے تو ہم لڑکیوں کا غول بابا کے کمرے میں اکٹھا ہو جاتا۔ بابا بھی سنبھل کر بیٹھ جاتے اور ہم میں سے کوئی ایک لڑکی بابا کے سر میں تیل ڈال کر دبانے لگتی اور بابا قصے سناتے جاتے۔ برسات کے دنوں میں جب آسمان پر بادل ہوتے تو ہم لوگوں سے کہتے کہ: "بھئی لڑکیو تم کسی کام کی نہیں ہو"۔ ہم لوگ کہتے: "واہ بابا کیا کام ہے بھلا"۔ کہتے: "تم خود نہیں دیکھ رہی ہو کہ آج کتنے بادل ہیں"۔ اب ہم بابا کا مطلب سمجھ جاتے اور خوش ہو کر کہتے: "تو پھر بابا ہو جائیں پکوڑیاں"۔ بابا نوکر کو بلا کر سارے سامان لانے کے لئے کہہ دیتے۔ اور ہم لوگ انگیٹھی سلگانے پیاز وغیرہ کاٹنے کا انتظام کرنے لگتے اور جب پکوڑیاں پک جاتیں تو ہم سب بابا کے ساتھ کھانے بیٹھ جاتے۔ اور بابا ہماری پکوڑیوں کی تعریفوں کے پل باندھنے لگتے: "واہ واہ پکوڑیاں بنانا تو کوئی ہماری بیٹیوں سے سیکھے"۔ ہم لوگ خوشی سے پھولے نہ سماتے۔

ایک روز ہم سب بابا کے پاس بیٹھے ہوئے تھے میں نے پوچھا: "بابا کیا یہ سچ ہے کہ جن لوگوں کو ستاتے ہیں"۔ کہنے لگے: "میں تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ہمارے گاؤں سے تقریباً دو تین میل دور ایک گاؤں تھا اور چند دنوں سے وہاں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ ایک جن آکر لوگوں کو بہت ستانے لگتا ہے۔ ایک دن گاؤں والے وہاں کے ایک مولوی صاحب کے پاس آئے کہا جاتا تھا کہ وہ بہت جلد جن کو اپنے قبضے میں کر لیتے ہیں۔ اس وقت مولوی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے۔ گاؤں والے جن کی شکایتیں کرنے لگے۔ مولوی صاحب بولے اچھا کل تو یاد رکھنا نیچے کے وقت ایک بکرا اور کچھ مٹھائی وغیرہ رکھ دینا۔ دوسرے دن مولوی صاحب سبز لباس پہن کر میرے پاس آئے اور کہنے لگا مولوی صاحب! آپ بھی چلئے اور دیکھئے کہ میں کس طرح جنوں کو بھگاتا ہوں۔ میں بھی راضی ہو گیا جب وہاں پہنچے تو مولوی صاحب کچھ [illegible] پڑھنے لگے۔ اتنے میں سارے جن بھی آکر جمع ہو گئے اور سوال وغیرہ پوچھنے لگے۔ کہنے لگے کہ اب جن قسم کی شرارت نہ کریں گے۔ اور مولوی صاحب بڑی شان سے گاؤں والوں کو بتانے لگے کہ یہ اب کبھی نہ آئیں گے۔ گاؤں والوں نے خوش ہو کر [illegible] بیٹھے ہی بیٹھے [illegible] کے بعد جب لوگ گھر واپس آئے تو میں نے کہا کہ بھئی مجھے بھی بتا دو کہ کس طرح جن بھاگ جاتے ہیں [illegible] [illegible] کے آدمی ہیں جو ایسا کرتے ہیں۔ میں نے [illegible] [illegible] سے غائب ہو کر بولے ہاں روزی کمانے کے لئے بہت [illegible]

[illegible] تقریباً ایک مہینہ [illegible] لیکن [illegible] بابا سے ملے ہوئے [illegible] بابا کو ہم سے ہمیشہ کے لئے [illegible] کی اچھی اچھی باتیں ہمیں بابا کی ہمیشہ یاد دلا [illegible]

[illegible] (بقلم شمیم)

پیام تعلیم پڑھنے والے سب ہی بچے "بابا" کو جانتے ہوں گے۔ بہت سے لوگ تو ایسے ہوں گے۔ جنہوں نے انہیں دیکھا بھی ہوگا۔ وہ معہ میں استاد تھے۔ انھوں نے جامعہ میں تیس سال سے اوپر مدرسی کی۔ اس لئے بہتوں نے ان سے لکھا پڑھا بھی ہوگا۔ اور میری طرح ایسے بھی خوش قسمت ہیں جو ان کی گود میں بھی کھیلے ہیں۔ بڑے انہیں "مولانا" کہا کرتے تھے۔ ہمارے اعظم گڈھ کے اطراف کے لوگ انہیں افقاجی" کہتے تھے۔ مگر وہ جامعہ کے بچوں اور بڑوں کے بابا تھے۔ اس ایک لفظ میں بڑا پیار تھا۔ جامعہ ان کا گھر تھا اور جامعہ کے لوگ ان کے بیٹے بیٹیاں اور پوتے پوتیاں تھے۔ بابا سب سے محبت کرتے تھے۔ اور بچوں کے لئے تو ان کی محبت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔

میں ان کا پوتا ہوں۔ ہم سب بھائیوں سے انہیں بیحد محبت تھی۔ وہ ہر سال گرمیوں میں چھٹی میں وطن ضرور آتے تھے۔ ان کے آتے ہی ب ہلچل سی مچ جاتی۔ طرح طرح کی تیاریاں ہوتی تھیں۔ ہم لوگ اچھے اچھے کام کرنا شروع کر دیتے۔ اور خوب محنت سے پڑھتے تھے کیونکہ ہم کو بابا سے اپنے اچھے کام کا انعام بھی تو ملتا تھا۔ جس روز ان کے آنے کا دن ہوتا۔ ہم لوگ گاڑی کے وقت اچھے اچھے کپڑے پہن کر اسٹیشن پہنچتے گاڑی کا انتظار کرتے۔ جب گاڑی آتی تو تیسرے درجے کے ڈبے سے ہم کو بابا نظر آتے۔ وہ ہمیں دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ اور ادھر یہ حال کہ آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ اور جیسے ہی بابا اترے ہم نے انہیں گھیر لیا۔ انھوں نے باری باری سے سب کو پیار کرنا شروع کیا۔ ارے رے بادشاہ شمو واہ! واہ واہ اور وہ مجھے گود میں اٹھا لیتے۔ پھر وہ اجو میاں کی طرف بڑھتے اور انھیں اسی طرح کچھ کہہ کر گود میں اٹھا لیتے وہ پھر ننھے چھوٹے بچوں کا امتحان لیتے۔ اور کہتے۔ "ارے واہ رے میرا جوان واہ۔ ارے اس سال تو کیا ٹیں ٹیں بول رہے ہے اچھا سلو ذرا تو یہ کون ہیں اور سلو میاں کہتے "بابا" وہ پھر کہتے "نہیں بھائی میرا نام کیا ہے؟ اب سلو کچھ سوچ کر جواب دیتے۔ "آپ تو مولانا اسلم اجب جیراجپوری ہیں" اور یہ سن کر بابا انہیں گود میں چمٹا لیتے اور کہتے اچھا اب گھر پر چلو تمہارے لئے ایک بہت اچھا کھلونا لایا ہوں۔ ارے شمو ں تم نے مجھے لکھا تھا کہ تم تو اپنے درجہ میں دوم آئے ہو۔ اچھا ہاں دیکھو میں تمہارے لئے کتنا اچھا قلم لایا ہوں۔ اور ہاں عظیم میاں کے لئے بھی ہیں۔ دسو کے لئے گیند ہے۔ وہ بچوں ہی کو نہیں بچیوں کو بھی اسی طرح پیار کرتے۔ اور انہیں اچھے اچھے خطابات دیتے۔ وہ لڑکیوں کے لئے اکثر "دیولا" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ "ارے میری دیولا شوکت تو اتنی بڑی ہو گئی۔"

گھر پر آتے ہی سب سے پہلے بکس کھلتا تھا۔ ہم سب لوگ ان کے بکس کو گھیر لیتے تھے۔ پہلے تو ان کے کپڑے ہوتے پھر دھیرے دھیرے وں کی تہوں کے نیچے سے ہم کو اپنے انعامات نظر آتے تھے۔ اب انعامات بانٹے جاتے کسی کو گیند۔ کسی کو چاقو، کسی کو قلم غرض یک کو کوئی نہ کوئی انعام ملتا۔ لیکن انعامات لینے کے بعد بھی ہم نہ ہٹتے۔ بابا پوچھتے اب کیا چاہیئے۔ ہم کہتے "لیمن ڈراپ" بس وہ پیکٹ ل کر دو دو سب کو تقسیم کرتے تھے۔

وہ دو چار دن تو اعظم گڈھ شہر میں رہتے تھے۔ پھر گھر جانے کا پروگرام بن جاتا۔ گاؤں میں اور زیادہ ہلچل ہوتی۔ کیونکہ وہاں کا تو ہر بچہ بڈھا ان کے استقبال کے لئے تیار رہتا۔ بابا ہر ایک سے ہاتھ ملاتے اور ساتھ ساتھ گھر کا حال چال بھی پوچھنا نہ بھولتے تھے بچے ک بیتا ہے تھے۔ کوئی کرتے کا دامن کھینچ رہا ہے تو کوئی انگلی پکڑ رہا ہے کوئی الف سے اچھل کر بات کرنے کی کوشش رہا ہے۔

گاؤں پر روزانہ صبح سے شام تک آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ پڑھے لکھے نوجوان بابا سے بڑے بڑے مسئلوں پر باتیں

کرتے تھے۔ دن میں چھوٹے چھوٹے بچے گھیر لیتے اور طرح طرح باتیں ہوتی تھیں۔ بھولی بھولی پیاری پیاری، عقل کی کم، بیوقوفی کی زیادہ، بابا ہنس ہنس کر انہیں سنا کرتے تھے۔ شام کو دیہات کے کسانوں کا جمگھٹ رہتا۔ ہل، بیل، کھیت کھلیانوں، شادی، بیاہ اور لڑائی جھگڑے کی باتیں ہوتی تھیں۔ بابا بڑے غور سے سنتے، سمجھاتے اور مشورہ دیتے۔ میں نے آج تک انہیں کسی کو ڈانٹتے نہ دیکھا۔ مغرب کی نماز کے بعد سے عشا تک عورتیں آنا شروع کر دیتیں۔ نماز، روزہ، جنت، دوزخ اور خدا رسول کی باتیں، شادی بیاہ، لڑائی جھگڑے، پیر فقیر، دنیا بھر کی باتیں ہوتیں۔ بابا ہر ایک کو اچھی طرح سمجھا سمجھا کر جواب دیتے۔ میری طبیعت کبھی کبھی جھلا جاتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ دروازہ بند کر دوں اور کسی کو نہ آنے دوں، ہر روز وہی بات۔ مگر بابا کبھی نہ گھبراتے۔ وہ ٹھنڈے دل سے ہر بات کا جواب دیتے۔ بوڑھیاں سنتی کم تھیں اور اپنی زیادہ سناتی تھیں۔

کبھی کبھی ایک خاص پروگرام بھی ہوتا تھا۔ اس دن گاؤں کی ہر لڑکی گھر پر موجود ہوتی تھی۔ ایک بہت بڑا سا احاطہ ہے۔ لڑکیاں آتی گئیں چولھے جلا لیتیں۔ کوئی روٹی پکا رہی ہے۔ تو کوئی پکوڑیاں، کوئی پوریاں تو کوئی سالن اور گوشت۔ کوئی چائے بنا رہی ہے۔ لڑکیاں تو اپنے کام میں لگی رہتیں اور بابا گھوم پھر کر ہر ایک کے پاس جاتے: "اچھا سلمیٰ رانی پکوڑیاں پکا رہی ہیں اے واہ کتنی اچھی ہیں۔ ارے یہ تو گھر کی رانی ہے اپنے گھر جا کر یہ رانی بنے گی رانی۔" شوکت کے پاس آتے تو اس کی چائے کی تعریف کرتے کسی اور کے پاس جاتے تو اس کی پکائی ہوئی چیز کی طرح طرح سے تعریف کرتے۔ اور ان کے دل بڑھاتے۔ یہ تو صرف دیکھ دیکھ کر تعریف تھی۔ جب سب چیزیں پک کر تیار ہو جاتیں تو سب کا نمونہ بابا کے پاس آ جاتا۔ ہم لوگ بھی پاس ہی بیٹھ جاتے۔ بابا ایک ایک چیز کھاتے اور ایسی ایسی تعریف کرتے اور ایسی ایسی دعائیں دیتے کہ بس کچھ نہ پوچھئے منہ سے رال ٹپکنے لگے گی۔ بعض لڑکیاں اتنا خراب پکاتیں کہ منہ کا مزا خراب ہو جاتا تھا۔ مگر بابا مزے لے لے کر کھاتے جاتے اور تعریف کرتے جاتے تھے۔ ایک دن امتحان لینے کے لئے تمام لڑکوں کو جمع کرتے اور سب سے کہتے کہ آج سب لوگ اپنی اپنی بنسی تیار کریں۔ تالاب چلیں گے اور مچھلیوں کا شکار کریں گے جب ہم لوگ اپنی اپنی بنسی لیکر آ جاتے تو وہ ہم سب کو لیکر چلتے۔ راستہ بھر ترکیبیں بتلاتے۔ تالاب پر پہنچکر ہم سب لوگ پانی پر ڈور ڈالکر مچھلی کا انتظار کرتے۔ بابا باری باری سب کے پاس جاتے ہر ایک کی شکار کی ہوئی مچھلی دیکھتے، پیٹھ ٹھونکتے، تعریف کرتے۔ اگر شکار کرنے میں کوئی غلطی ہوتی تو وہ اسے بتاتے وہ لطف ہی پر بس نہ کرتے جو لڑکا سب سے زیادہ اور بڑی مچھلیاں پھنساتا اسے انعام بھی دیتے تھے۔ وہ صرف مچھلیوں کے شکار میں ہی حصہ نہ لیتے تھے بلکہ ہمارے کھیل کود سے بھی بڑی دلچسپی لیتے۔ وہ اس میں خود بھی حصہ لیتے! اسی طرح ہنسی کھیل میں ہی ہماری گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہو جاتی تھیں۔ ہم لوگ تعلیم گاہ چلے جاتے اور بابا بھی چلے جاتے۔ اور پھر ہم سے دس مہینے کے لئے الگ ہو جاتے تھے اور وہاں سے ہمیں ان کے اچھے اچھے خط ملتے رہتے۔ بابا بڑے سے بڑے بڑی کام کی باتیں لکھتے اور پھر ہم گرمیوں کا انتظار کرتے تھے اور سوچتے تھے کہ کاش یہ چھٹیاں کبھی ختم نہ ہوتیں۔ یہ ان کا [illegible] گاؤں والے اور [illegible] لیکن وہ سب ہی سے محبت کرتے تھے۔ نوکروں کی بہت عزت کرتے تھے۔ کسی کو شاید ہی کبھی ڈانٹا ہو۔ چھوٹے [illegible] اپنا سمجھتے تھے۔

انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ جو کچھ آزادی میں اور کچھ [illegible] مگر وہ ہمارے تو صرف بابا تھے۔ اکم محبت کا دریا اور پیار کا سمندر، اور دسمبر کی ... تاریخ کو وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے [illegible] ہے جن بچوں کے ساتھ زندگی میں [illegible]

پاکستان کا دستور منظور ہوگیا

لیکن کیا ہماری مجلس دستور ساز کا منظور کردہ دستور قرآنی تعلیمات کے ان تقاضوں کو پورا کر دیتا ہے جن کا خواب
نے قیام پاکستان کی جدوجہد کے سلسلہ میں دیکھا تھا؟

اس کے جواب کے لئے دستوری سلسلہ میں ادارۂ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتابوں

اسلامی نظام اور قرآنی دستور پاکستان

کا مطالعہ ازبس ضروری ہے

اسلامی نظام میں اسلامی مملکت کے بنیادی اصول بتلائے گئے ہیں۔ نیز یہ کہ اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے۔
ب محترم پرویز صاحب اور علامہ اسلم جیراجپوری کے بلند پایہ مقالات پر مشتمل ہے۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول
... ۱۸۰ صفحات۔ قیمت صرف دو روپے۔ اور

دستور پاکستان میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے، حکومت، علماء، اور جماعت اسلامی کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۲۲۴ صفحات۔ قیمت صرف
پے آٹھ آنے۔

کتابوں کی اہمیت اور وقت کی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے ادارہ کی طرف سے دونوں کتابیں یکجا خریدنے پر

خصوصی رعایت

نا کیا جاتا ہے یعنی بجائے [illegible] روپے علاوہ محصول ڈاک کے دونوں کتابیں مع محصول ڈاک صرف تین روپے

ناظم ادارۂ طلوع اسلام
۱۵۹/۳۔ ایل۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی کراچی

قرآنی انقلاب کا لٹریچر

معراج انسانیت از:- پرویز

سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرور کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات اعلیٰ ولایتی گلیز کاغذ مضبوط و حسین جلد مع گرد پوش۔ قیمت۔۔ بیس روپے

ابلیس و آدم از:- پرویز

سلسلہ معارف القرآن کی پہلی جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق، جنات ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات۔ قیمت ۱۲

جوئے نور از:- پرویز

سلسلہ معارف القرآن کی دوسری کڑی۔ جو حضرات انبیائے کرام کے تذکار جلیلہ پر مشتمل ہے میں حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت شعیبؑ تک تمام انبیائے کرام علیہم التحیۃ والسلام تذکرہ آگیا ہے۔ سائز $\frac{29 \times 22}{8}$ ضخامت ۳۰۴۔ قیمت مجلد مع گرد پوش چھ روپے۔

انسان نے کیا سوچا؟ از:- پرویز

فکر انسانی کی آج تک کی تاریخ کہ اس نے اپنی مشکلات و مسائل کو حل کرنے آج تک کیا سوچا۔ محترم پرویز صاحب کی بلند پایہ تصنیف۔ سائز $\frac{29 \times 22}{8}$ ضخامت ۳۶۸ صفحات۔ قیمت مجلد مع گرد پوش دس روپے۔

سلیم کے نام از:- پرویز

نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ مدلل جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چھ روپے

تاریخ الامت

علامہ اسلم جیراجپوری کی تاریخ کی وہ بے مثل کتاب جو تقسیم سے پہلے بیشتر درسگاہوں میں نصاب میں شامل تھی۔ اب مولف کی اجازت سے طلوع اسلام نے اسے دوبارہ چھاپا ہے۔ قیمت حصہ اول دو روپے۔ حصہ دوم دو روپے آٹھ آنے۔ حصہ سوم دو روپے۔ حصہ چہارم دو روپے آٹھ آنے۔ کتاب آٹھ حصوں میں ہے۔ باقی حصے عنقریب شائع ہو جائیں گے۔ محصولڈاک ہر حالت میں بذمہ

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۱۵۹/۳۔ ایل۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی کراچی



خوشگوار
صحت
کیلئے
مسواک ٹوتھ پیسٹ
استعمال کیجئے
MISWAK
MAKES TEETH PEARLY WHITE
MISWAK


حفاظت کے لئے
مسواک
استعمال کیجئے
Guaranteed
No Animal
Bristles
مسواک
پاکستان میں بنایا
ہر دوکان پر ملتا ہے


چھوٹا مسواک ٹوتھ برش
Hashmi
دانتوں کی صفائی بچوں کو صحت مند اور توانا رکھتی ہے
چھوٹے بچوں کے لئے چھوٹا مسواک
نایاب تحفہ ہے
جو نرم و نازک مسوڑوں کے لئے بے ضرر ہے اور


DURA-GLOSS
Nail Polish
MADE IN U.S.A.
ڈوراجلوس
ناخون کی پالش
تزئینِ حسن کے لئے
ناخون کی آرائش ضروری ہے
ڈوراجلوس
خوش رنگ۔ دیدہ زیب۔ چمکدار اور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ
ہندوستان سے بارہ آنے
پاکستان سے بارہ آنے

بدل اشتراک سالانہ
ہندوستان اور پاکستان سے آٹھ روپے
غیر ممالک سے ۲۰ شلنگ

دفتر کا پتہ
۳/۱۵۹۔ ایل۔ پی۔ ای۔ سی
ایچ۔ سوسائٹی۔ کراچی ۲۹

ٹیلیفون نمبر
۴۱۴۸۸

جلد ۹ | جون ۱۹۵۶ء | نمبر ۵

معاشی مسائل کا قرآنی حل

دورانِ سفر محترم پرویز صاحب نے عنوانِ بالا پر لاہور، سیالکوٹ اور راولپنڈی میں جو تقاریر کی تھیں۔ ان کا محض (ایک سلسلہ) تقریر کی شکل میں آئندہ پرچہ میں شائع ہوگا۔ اس تقریر کی اہمیت کے پیش نظر اسے پمفلٹ کی شکل میں شائع کرنے کا بھی خیال ہے تاکہ اس کی اشاعت عام ہوسکے۔ بزم ہائے طلوعِ اسلام سے گزارش ہے کہ وہ بہت جلد اطلاع دیں کہ انہیں کس قدر پمفلٹ مطلوب ہوں گے۔ قیمت اتنی رکھی جائے گی کہ اخراجات کو پورا کرسکے۔ ان پمفلٹوں کو ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیجئے۔ یہ وقت کے اہم تقاضے کو پورا کریں گے۔

فہرست مضامین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لمعات

پاکستان مسلم لیگ کے جائنٹ سکرٹری محترم منظرِ عالم صاحب نے مسلم لیگ کے منشور کا ایک مسودہ مرتب فرمایا ہے۔ اور اسے اربابِ فکر و نظر کے پاس بغرضِ تنقید و تبصرہ بھیجا ہے تاکہ ان تنقیدات کی روشنی میں مسلم لیگ مجلسِ عاملہ اسے آخری ترتیب دے سکے۔ مسلم لیگ، یا ملک کی دوسری پارٹیوں کے متعلق طلوعِ اسلام کا نقطۂ نگاہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ تحریکِ پاکستان کے دوران میں یہ مسلم لیگ کا سب سے بڑا حامی تھا۔ لیکن حصولِ پاکستان کے بعد سب سے پہلے اس نے یہ آواز بلند کی کہ ملک میں پارٹیوں کے وجود کو قانوناً ممنوع قرار دیا جانا چاہیئے۔ اور اس مقصد کے لئے سب سے پہلے خود مسلم لیگ کو ختم کر دینا چاہیئے۔ اس نقطۂ نگاہ کے پیشِ نظر ہمارے نزدیک مسلم لیگ (یا کسی اور پارٹی) کے منشور کی کوئی اہمیت نہیں رہتی لیکن چونکہ مسودہ زیرِ نظر میں کہا گیا ہے کہ مسلم لیگ کا مقصود یہ ہے کہ وہ مسلمانانِ پاکستان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو قرآن و سنت کے قالب میں ڈھالنے، اس لئے ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ اس صحیفہ کا قرآنی نقطۂ نظر سے جائزہ لے کر اربابِ لیگ کو بتا دیا جائے کہ اگر وہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں تو ارشاداتِ خداوندی کی رو سے ان کی راہِ عمل کیا ہونی چاہیئے۔

سب سے پہلے ہم اس بنیادی حقیقت کو ایک بار پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ قرآن کی رو سے پوری کی پوری ملتِ اسلامیہ ایک جماعت ہے اور غیر مسلموں کے مقابلہ میں ایک پارٹی۔ اس جماعت (یا پارٹی) کے اندر مختلف پارٹیوں کا وجود قرآن کی نصوصِ صریحہ کی رو سے شرک ہے۔ ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً کل حزب بما لدیھم فرحون (۳۲-۳۰)۔ قرآن کا واضح ارشاد ہے اور رسول اللہ سے اس کا کھلا ہوا حکم ہے کہ ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً لست منھم فی شیئ (۶-۱۵۹)۔ اس باب میں مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں میں کوئی فرق نہیں۔ یعنی ملتِ اسلامیہ یا مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں دونوں کا وجود شرک ہے۔ ہم مسلسل آٹھ برس سے قرآن کے اس فیصلے کو پیش کرتے چلے آ رہے ہیں اور پوری تحدی اور چیلنج کے ساتھ پیش کرتے چلے آ رہے ہیں، لیکن آج تک نہ ہمارے مذہبی فرقوں میں سے کسی نے اس کی تردید کی جرأت کی ہے اور نہ ہی سیاسی پارٹیوں میں سے کسی نے اس کا جواب دیا ہے۔ اس کے باوجود سیاسی پارٹیوں میں سے بھی ہر ایک اپنے آپ کو اسلام کا محافظ قرار دیتی ہے اور مذہبی فرقوں میں سے ہر ایک اپنے آپ کو اسلام کا صحیح نمائندہ ٹھہراتا ہے (اور اب تو خیر سے جمعیۃ اسلامیہ پاکستان کے آئین نے بھی ان فرقوں کے وجود کو آئینی سند عطا فرما دی ہے)۔ چونکہ زیرِ نظر مسودۂ منشور میں بھی قرآن و سنت کو سرِ عنوان رکھا گیا ہے۔ اس لئے ہم اربابِ لیگ سے یہ دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ وہ بتائیں

کہ قرآن کریم کی رو سے مسلم لیگ کا وجود کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے؟ ہندوستان میں صورت حالات یہ تھی کہ پورے ملک کے (مسلم و غیر مسلم) باشندے انگریز کے محکوم تھے۔ جب انگریز نے ان باشندگان ملک کو آزادی دینے کا ارادہ کیا تو ہندوؤں نے یہ مطالبہ پیش کیا کہ چونکہ تمام ملک کے باشندے ایک قوم ہیں اس لئے مجوزہ آزادی اس قوم کو ملنی چاہیئے۔ اس کے برعکس، مسلمانوں کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ بربنائے مذہب ایک الگ قوم کے افراد ہیں اس لئے انہیں جداگانہ مملکت ملنی چاہیئے۔ ہندوؤں کا مطالبہ ایک سیاسی پارٹی (کانگریس) کی طرف سے پیش ہوا تھا اس لئے ضروری تھا کہ مسلمانوں کا مطالبہ بھی ایک پارٹی کی طرف سے پیش ہو۔ اس پارٹی کا نام مسلم لیگ تھا اور اس کا مقصد ہندو کے خلاف مقدمہ لڑنا تھا۔ یہ مقدمہ اس کے جری، بیباک اور دیانتدار وکیل (قائداعظم مرحوم) نے نہایت کامیابی سے لڑا اور مسلمانوں کو ایک جداگانہ مملکت عطا ہو گئی۔ اب نہ کوئی مقدمہ ہے نہ نزاع۔ نہ فریق ثانی (ہندو) موجود ہے نہ جج (انگریز) لیکن فریق اول (مسلم لیگ) ہے کہ اپنے آپ کو بحیثیت فریق مقدمہ زندہ و پائندہ رکھنے پر مصر ہے اور اس کے اصرار کی دلیل یہ ہے کہ ہم نے یہ مقدمہ جیتا تھا (چنانچہ اس مسودۂ منشور میں بھی یہ کہا گیا ہے کہ مسلم لیگ وہ جماعت ہے جو حصول پاکستان کی ذمہ دار ہے) آپ سوچئے کہ کیا یہ پوزیشن انتہائی مضحکہ انگیز نہیں؟ خود زیر نظر مسودہ میں یہ مذکور ہے کہ

مسلم لیگ اپنے اس عقیدہ کی توثیق کرتی ہے کہ مسلمانان پاکستان ایک ملت ہیں

اور اس ملت کا اپنا جداگانہ ملک ہے۔ اپنی جداگانہ مملکت ہے۔ اپنا جداگانہ آئین ہے۔ اپنی جداگانہ حکومت ہے۔ سوچئے کہ اس کے بعد اس پارٹی کی ضرورت کیا باقی رہ جاتی ہے جس نے اس ملک اور مملکت کے حصول کی کوشش کی تھی؟ اگر مقصد اس پارٹی کے اس کارنامہ کی یادتازہ رکھنا ہے تو اس کے لئے کوئی یادگار نصب کر دینی چاہیئے۔

کہا یہ جاتا ہے کہ جمہوری انداز حکومت میں پارٹیوں کا وجود ناگزیر ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ پارٹیوں کا وجود مغرب کے جمہوری انداز حکومت کے لئے ضروری ہے یا اسلامی جمہوریت میں بھی؟ آپ لاکھ کہتے رہیئے اسلامی جمہوریت اسلامی جمہوریت کا وظیفہ پڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن عملی نظم و نسق کے لئے آپ کے سامنے ہمیشہ مغرب کی جمہوریت رہتی ہے۔ ہم پوچھتے یہ ہیں کہ جب قرآن نے پارٹیوں کے وجود کو شرک قرار دیا ہے کیا اس قرآن کے نظام جمہوریت میں پارٹیوں کا وجود ناگزیر ہوگا؟ پارٹیوں کے وجود کے سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جمہوری پارلیمان میں حزب مخالف کا وجود بھی لاینفک ہے۔ ذرا اس مفروضہ کا تجزیہ کر کے دیکھئے کہ اس کی حقیقت کیا ہے (مثلاً) الیکشن میں مسلم لیگ تمام کی تمام نشستوں کے لئے اپنے امیدوار کھڑے کرتی ہے اور ہر امیدوار کی کامیابی کے لئے سر توڑ کوشش کی جاتی ہے۔ اگر پارلیمان میں حزب مخالف کا وجود ناگزیر ہے تو پھر یہ پارٹی (یا کوئی اور پارٹی) الیکشن میں اپنی اکثریت کے بعد باقی نشستوں کو فریق مقابل کے لئے کیوں نہیں چھوڑ دیتی؟ بات صرف اتنی ہے کہ ہر پارٹی سو فیصدی نشستوں کے حصول کے لئے انتھک کوشش کرتی ہے لیکن جب اس کے باوجود اس کی مخالف پارٹی کچھ نشستیں لے جاتی ہے تو وہ یہ کہہ کر اپنی شکست کو نیکی (VIRTUE) بنا کر پیش کرتی ہے کہ پارلیمان میں حزب مخالف کا وجود بھی تو ضروری ہے! سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر کسی الیکشن میں ایک ہی پارٹی تمام کی تمام نشستیں لے جائے تو پھر جمہوری انداز حکومت چل سکیگا یا نہیں؟ یاد رکھئے۔ نبی اکرم اور خلافت راشدہ میں جو جمہوری پارلیمان بنی تھی اس میں حزب مخالف کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اس لئے کہ ان کے سامنے یہ حقیقت واضح تھی کہ ملت میں پارٹیوں کا وجود اللہ سے قرآن شریف رسول اللہ کے نزدیک [illegible] مذہبی فرقہ اور سیاسی پارٹی۔ لہٰذا جو علمائے کرام مذہبی فرقوں کے وجود کو اور جو علمائے ملت سیاسی پارٹیوں کو

(فرودی تو الگ طرف) جائز سمجھتے ہیں وہ قرآن اور سنت دونوں کی مخالفت کرتے ہیں اور شرک جلی کے مرتکب ہیں۔ امت اس وقت جس جہنم میں مبتلا ہے (اور صدیوں سے مبتلا چلی آ رہی ہے) وہ اس شرک کا لازمی نتیجہ ہے۔ ہمارے اس دعوے کی بنیاد قرآن کی نصوص صریحہ ہیں۔ اگر کسی کو اس سے انکار ہو تو وہ اپنے قرآنی دلائل پیش کرے جنہیں ہم بمسرت طلوع اسلام میں شائع کریں گے۔

ہم ان ارباب لیگ سے جو اپنے مسلک کی بنیاد فی الواقعہ قرآن و سنت پر رکھنا چاہتے ہیں درخواست کریں گے کہ وہ اس منشور کی تکمیل سے پہلے اس ساسی نقطہ پر غور کریں کہ قرآن جس چیز کو شرک قرار دیتا ہے وہ کس طرح عین اسلام ہو سکتی ہے؟ (ضمناً یہ چیز بجائے خویش مضحکہ انگیز ہے کہ مسلم لیگ اتنے عرصے سے موجود ہے اور اس کا منشور اب مرتب ہو رہا ہے! اس لطیفہ کے بعد آگے بڑھیے۔ زیر نظر منشور کی ابتداء ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

> پاکستان کے درخشندہ مستقبل پر یقین محکم کی بنا پر مسلم لیگ اس کی ضامن بنے گی کہ جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصول جس طرح اسلام نے بیان کئے ہیں۔ ہمارے ملک میں نافذ العمل رہیں گے۔ اور ہماری جمہوریہ کے مسلمان باشندے اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلام کے اس قالب میں ڈھال لیں جو قرآن و سنت نے متعین کیا ہے۔ نیز یہ کہ بنیادی حقوق انسانیت جن میں منصب و مواقع کی مساوات اور قانونی۔ معاشرتی۔ معاشی اور سیاسی میزان عدل میں یکسانیت۔ اور خیالات۔ اظہار رائے۔ عقیدہ۔ ایمان۔ پرستش اور میل جول کی آزادی شامل ہے بشرطیکہ یہ مملکت کے قوانین اور عام اخلاق کے حدود کے اندر ہو، تمام باشندگان مملکت کو حاصل ہوں۔

یہ تمام امور وہ ہیں جو پاکستان کے اس آئین میں شامل ہیں۔ جو اب منظور ہو کر مملکت کا منشور بن چکا ہے اور جس کا سہرا بھی مسلم لیگ اپنے سر باندھ رہی ہو کہ اسی نے ملک کو یہ آئین دیا ہے۔ سوچئے کہ اس کے بعد اسی مسلم لیگ کا ان امور کو اپنے منشور میں شامل کرنا اس کے سوا اور کیا ہے کہ

دعا یہ مانگو الٰہی ہو عمر خضر دراز !

اس آئین کے بعد کرنے کا کام یہ رہ جاتا ہے کہ اسے عملی طور پر نافذ کرنے کے لئے پروگرام بنایا جائے اور اس میں جو جو خامیاں رہ گئی ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش کی جائے

پاکستان میں غیر مسلموں کی حیثیت کا سوال ارباب حکومت اور ارباب لیگ کے لئے سانپ کے منہ میں چھپکلی کی مثل ہو جیسے نہ اگلتے بنے نہ نگلتے چنانچہ یہی کشمکش زیر نظر مسودہ میں بھی جھلک رہی ہے چنانچہ ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ پاکستان کے مسلمان ایک قوم ہیں۔ لیکن اس سے ذرا آگے غیر مسلموں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ قومی اقلیت (NATIONAL MINORITY) ہیں سوال یہ ہو کہ اگر پاکستان کے مسلمان (بربنائے مذہب) ایک قوم ہیں تو غیر مسلم اس قوم کے افراد کیسے بن سکتے ہیں اور جب پاکستان میں ان کی حیثیت ایک قوم کی نہیں تو وہ قومی اقلیت کس طرح قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ یورپ میں ایک ملک میں بسنے والے تمام باشندے ایک قوم کہلاتے ہیں۔ اس قوم کی جو پارٹی [illegible] کے فیصلے اکثریت میں ہوتا ہے وہ "قومی اکثریت" کہلاتی ہے۔ اور جو قلیت میں رہ جاتی ہے۔ وہ "قومی اقلیت" بن جاتی ہے۔ [illegible] الیکشن میں صورت حالات اس سے برعکس ہو جائے اور جو پارٹی پہلے اکثریت میں تھی وہ اقلیت میں آ جائے [illegible] نہیں پڑتا۔ اس کے برعکس [illegible]

صورت حالات بالکل مختلف ہے یہاں مسلمان اپنے مذہب کی بنا پر ایک مستقل قوم ہیں۔ اس لئے غیر مسلم اس قوم کے افراد نہیں کہلا سکتے۔ ہیں ہیں کہ انسان (اور پاکستان کے باشندے) ہونے کی جہت سے ان غیر مسلموں کی ہر متاع عزیز کی حفاظت کی ذمہ داری مملکت پر ہوگی لیکن اس دولت اسلامیہ پاکستانیہ کے افراد نہیں بن سکتے۔ مسلم لیگ اس حقیقت کا کھلے بندوں اقرار نہ کرنے کی وجہ سے عجیب گومگو کے عالم میں مبتلا ہے۔ ایک طرف مسلمانانِ پاکستان کو الگ قوم بھی قرار دیتی ہے۔ اور دوسری طرف غیر مسلموں کو "قومی اقلیت" بھی کہہ کر پکارتی ہے۔ ان حضرات کی کرے بدن و ہم رنگ گلستاں زلیستن کے پالیسی ملک میں عجیب غریب الجھاؤ پیدا کر رہی ہے۔ ان حضرات کے لئے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ وہ اس پر اچھی طرح سے غور و خوض کے بعد اپنے لئے ایک واضح راہ متعین کریں۔ اگر وہ قرآن کی تعلیم کے مطابق مسلمانانِ پاکستان کو ایک منفرد اور جداگانہ سمجھتے ہیں تو پھر کوئی غیر مسلم پاکستانی قوم کا فرد قرار نہیں پا سکتا لیکن اگر وہ پاکستان کے غیر مسلم باشندوں کو (بر بنائے وطنیت) پاکستانی قوم کا فرد سمجھتے ہیں تو یہاں کے مسلمان ایک الگ قوم نہیں بن سکتے اس صورت میں یہاں کے مسلم و غیر مسلم دونوں مل کر متحدہ قومیت تشکیل کریں گے۔ جو اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔ منشور میں اس حقیقت کو واضح کرنا چاہیئے کہ لیگ کے نزدیک پاکستان کے غیر مسلموں کی صحیح پوزیشن کیا ہے۔

یہی کشمکش ذرا آگے چل کر مخلوط اور جداگانہ انتخاب کے مسئلہ پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے۔ منشور میں لکھا ہے کہ مسلمانانِ پاکستان کا ایک جداگانہ قوم ہونا اس کا متقاضی ہے کہ یہاں انتخابات جداگانہ ہوں۔ یہ بھی لکھا ہے کہ مملکتِ پاکستان کے آئیڈیالوجی پر مبنی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کے نمائندے مسلمان ہوں اور غیر مسلموں کے غیر مسلم۔ یہاں تک بات بالکل واضح ہے۔ قرآن کی تعلیم کے مطابق ایسا ہی ہونا چاہیئے لیکن سوال یہ ہے کہ غیر مسلم نمائندے (خواہ وہ جداگانہ انتخاب کے مطابق ہی کیوں نہ منتخب ہوں) پاکستان کی مجلس قانون ساز میں ان قوانین کی تدوین میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں جن کی بنیاد خالصتہً آئیڈیالوجی (کتاب و سنت) پر ہے۔ یہ پوزیشن عجیب ہے کہ غیر مسلم کسی مسلم کو اپنا نمائندہ تو نہیں بنا سکتے لیکن غیر مسلم اراکینِ مقننہ مسلمانوں کے لئے قانون سازی کے کام میں برابر حصہ لے سکتے ہیں۔ یا للعجب! یاد رکھیئے یا تو آپ کو سیکولر اسٹیٹ کا داعی بننا چاہیئے۔ اس صورت میں جداگانہ یا مخلوط انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ انتخاب مخلوط ہوں گے اور مسلم و غیر مسلم دونوں مل کر ملک کے لئے قانون مرتب کریں گے۔ اور یا مملکت کی بنیاد آئیڈیالوجی پر رکھنی چاہیئے اس صورت میں کوئی غیر مسلم مملکت کے قوانین سازی کے کام میں شریک نہیں ہو سکے گا۔ اسلام کی رو سے صحیح صورت یہی ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری صورت ممکن نہیں ہو سکتی۔ لیگ کو ان دونوں راستوں میں سے ایک راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ حق و باطل میں شرکت اسلام کی بارگاہ میں کبھی باریاب نہیں ہو سکتی۔

تعلیم کے متعلق منشور میں ایک تفصیلی پروگرام دیا گیا ہے۔ اس باب میں ہماری گذارش یہ ہے کہ تعلیم کا موجودہ نظام جس میں مذہبی تعلیم کے لئے دار العلوم اور دنیاوی تعلیم کے لئے اسکول اور کالج مخصوص کئے جاتے ہیں اسلام کی روح کے یکسر خلاف ہے۔ اسلام درحقیقت اسی ثنویت کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ ہر ملت اسلامیہ کے لئے وہی نظام تعلیم صحیح اسلامی کہلا سکتا ہے جس میں دینی اور دنیاوی تعلیم یکجا دی جائے۔ دینی تعلیم سے بھی ہمارا مقصود وہ مذہبی تعلیم نہیں جس کا شاہکار ملا ہے جس سے خدا تک پہنچنا تو درکنار انسان صرف آدمیت تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مدارس میں مذہبی تعلیم کے نصاب [illegible] اور کالجوں میں ایسی تعلیم دی جائے جس سے طالب علم عصر رواں کے تقاضوں کا حل قرآن کی روشنی میں تلاش کر سکے۔ [illegible] تعلیم کے لئے ایک خاص نصاب مرتب کرنے کی ضرورت ہے لیکن یہ کام وہی فرد یا ادارہ

کر سکتا ہے جو اپنے اندر انقلابی روح لئے ہو جس فرد یا ادارہ کا مقصد عوام کے ووٹوں کے ذریعہ اقتدار حاصل کرنا ہو وہ تعلیم میں اس قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد ہے

منشور میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ آئندہ انتخابات میں امیدوار کے لئے یہ شرط ہونی چاہیئے کہ وہ قرآن کو با ترجمہ پڑھ سکے۔ یہ خیال نیک ہے لیکن اس سے کچھ بنتا نہیں۔ اگر قرآن کو مروجہ ترجموں (بلکہ تفسیروں) کے ساتھ پڑھ لینے سے قرآن سمجھ میں آسکتا تو اگر اس طرح قرآن سمجھ میں آسکتا تو علمائے کرام سے بڑھ کر قرآن کا سمجھنے والا اور کون ہو سکتا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات قرآن سے قطعاً نابلد ہوتے ہیں۔ اور جس چیز کو وہ پیش کرتے ہیں اس میں قرآن کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ قرآن کو سمجھنے کے لئے تاریخ کے علاوہ اپنے دور کی علمی سطح تک پہنچنا نہایت ضروری ہے۔ اگر انتخابات کے لئے اس قسم کی شرط رکھنا ضروری ہے تو قرآن با ترجمہ کے ساتھ یہ بھی لازمی قرار دیا جانے کہ رکنیت کا امیدوار کم از کم گریجویٹ ہو اور ووٹ دینے والے کم از کم میٹرک۔ ورنہ محض قرآن با ترجمہ کی شرط کے ساتھ جس قسم کے امیدوار سامنے آئیں گے۔ ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

تعلیم ہی کے سلسلہ میں منشور میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ضروری ہے کہ اسلامی تاریخ اور اسلامی فلسفہ کی از سر نو تدوین کی جائے۔ یہ خیال اور وقت کی ضرورت کا مظہر۔ لیکن اس کے لئے مسلم لیگ کو انتظار کس بات کا ہے؟ ہمارا دعویٰ ہے کہ اسلام ایک بے مثل و بے نظیر ضابطۂ زندگی ہے۔ لیکن اس وقت دنیا کی کسی زبان میں کوئی کتاب (یعنی انسانی تصنیف) ایسی نہیں جو اس دعوے کا ثبوت بہم پہنچا سکے۔ ثبوت بہم پہنچانا تو ایک طرف یہ کہ اسلام ہے کیا؟ اگر مسلم لیگ اس قسم کی کوئی کتاب مرتب کرا سکے جسے دنیا کے بلند ترین ارباب فکر و نظر کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا جائے کہ اسلام جس کی مثل و نظیر کوئی انسانی ذہن پیش نہیں کر سکتا۔ تو اس کا یہ کارنامہ فی الواقعہ اسلام کی خدمت ہوگا۔

اسی سلسلہ میں منشور میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مسلم لیگ کو اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ نظام سرمایہ داری اور کمیونزم دونوں نوع انسان کو جہنم کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ مسلم لیگ کا عقیدہ یہ ہے کہ اس جہنم سے نجات کا ذریعہ فقط ایک ہے۔ اور وہ ہے اسلامک سوشل آرڈر (نظامِ زندگی) جو ان دونوں راستوں میں اعتدال کی راہ پیدا کرتا ہے۔

ہم مسلسل زبرس سے یہ سنتے چلے آرہے ہیں کہ اسلام ایک ایسا معاشرتی اور معاشی نظام عطا کرتا ہے جو نوع انسانی کو سرمایہ داری اور اشتراکیت سے نجات دلا کر اسے فردوس گم گشتہ کی بازیابی کی صراط مستقیم پر چلا دیتا ہے لیکن یہ نظام ہے کیا؟ اس کے متعلق کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو بار بار دہرائے جاتے ہیں لیکن جو آج تک شرمندۂ معنی نہیں ہوئے۔ زیر نظر منشور میں بھی ان الفاظ کا اعادہ کیا گیا ہے لیکن ان کا عملی مفہوم کیا ہے؟ ہم ارباب لیگ سے درخواست کریں گے کہ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام کیا ہے تو اس کی تفاصیل سے دنیا کو آگاہ کریں تاکہ ہر سمجھنے والا سمجھ سکے کہ آپ کا مفہوم کیا ہے۔ ان الفاظ کو محض سلوگن کے طور پر دہرا دینے سے کام نہیں چل سکتا۔

اس کے بعد منشور کا وہ حصہ سامنے آتا ہے جس کا عنوان ہے: "مذہبی اور ثقافتی اصلاحات"۔ اس ضمن میں حسب ذیل تجاویز پیش کی گئی ہیں:

(۱) اسلامی اقدار کی ترویج اور اسلامی احکام کی تنفیذ کے لئے "وزارت مذہبی امور" کا قیام ضروری ہے

(۲) پاکستانی علماء و مجتہدین کی ایک مجلس کا قیام بھی ضروری ہے جو وزارت مذہبی امور کو مشورہ کا کام دے سکے۔

مساجد وزارت امور مذہبی کے ماتحت ہونی چاہئیں۔ یہ وزارت معقول مشاہرہ پر ائمہ مساجد اور مؤذنوں کا تقرر کرے گی۔

اسی وزارت کے ماتحت ایک ادارہ اصلاح معاشرہ قائم کیا جائے۔ یہ ادارہ علمائے کرام کی راہنمائی سے مبلغین تیار کرے۔

مملکت کا فریضہ ہوگا کہ وہ زکوٰۃ۔ صدقات۔ فطرہ اور قربانی کی کھالوں کو جمع کرے۔ ان مدات کی آمدنی شرعی احکام کے مطابق صرف کرے۔ اوقاف کی آمدنی بھی انہی مدات میں شامل ہوگی۔

آپ نے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ ارباب لیگ کے ذہن میں اسلام کا تصور کیا ہے؟ یہی تھیاکریسی کا عطا کردہ تصور کہ حکومت کی مشینری کا ایک محکمہ امور مذہبی سے متعلق بھی ہونا چاہیئے (ECCLESIASTICAL DEPTT) کہا جاتا ہے۔ یعنی حکومت کے باقی محکمے "دنیاوی امور" سے متعلق ہوں گے اور یہ خاص محکمہ مذہبی امور سے متعلق ہوگا۔ یہی وہ تصور ہے جو ہمارے دور ملوکیت میں پیدا ہوا اور جس کا علمبردار ہمارا مُلّا ہے! اس تصور کی رو سے دین اور دنیا دو الگ الگ شعبوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ دنیاوی امور "مسٹروں" کے سپرد ہوتے ہیں اور دینی امور علماء اور مجتہدین کے تسلط میں۔ یہی تصور ہے جو آئین پاکستان میں پیش کیا گیا ہے اور اسی کا اعادہ زیر نظر منشور میں کیا گیا ہے۔ ان حضرات کو کون بتائے کہ اسلامی حکومت کا ہر محکمہ، محکمہ امور مذہبی کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ وہ جو کچھ کرتا ہے دین کی روشنی میں دین کے متعین فرمودہ مقاصد کیلئے کرتا ہے۔ اس نظام حکومت میں امور مذہبی، امور دنیا سے الگ نہیں ہوتے اس لئے ان امور کے لئے کسی جداگانہ وزارت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس نظام میں زکوٰۃ۔ صدقات، مساجد، خطبات وغیرہ کا تعلق "مذہب" سے نہیں ہوتا "دنیا" ہی سے ہوتا ہے۔ اس دنیا سے جس کا تمام کاروبار خدا کے قوانین کے تابع سرانجام پاتا ہے۔

اس ضمن میں یہ چیز بھی بڑی دلچسپ ہے کہ مرتب تو کیا جا رہا ہے مسلم لیگ کا منشور اور اس میں کہا یہ جا رہا ہے کہ یہ مملکت کا فریضہ ہوگا کہ وہ زکوٰۃ جمع کرے۔ مساجد و اوقاف کا انتظام کرے۔ یتیم خانے کھولے۔ لوگوں کو قرض حسنہ دے وغیرہ وغیرہ۔ غور کیجئے کہ ان دونوں باتوں میں باہمی ربط ... اگر یہ کہا جاتا کہ جب مسلم لیگ کی حکومت قائم ہوگی تو وہ یہ کریگی اور وہ یہ کریگی تو یہ بات قابل فہم ہوتی۔ اور البتہ کہنے کی ضرورت بھی اس وقت آتی جب مملکت پاکستان کے آئین میں یہ چیزیں موجود نہ ہوتیں۔ مملکت کے موجودہ آئین میں یہ سب کچھ موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود لیگ کے منشور میں انہیں شامل کیا جا رہا ہے۔ ہم بالکل نہیں سمجھ سکے کہ اس سے بالآخر مقصد کیا ہے۔ بجز اس کے کہ ان حضرات کے تحت الشعور میں مسلم لیگ اور مملکت ایک ہی چیز بن چکی ہیں۔ اس لئے منشور میں کبھی مسلم لیگ کا نام لے دیا گیا ہے اور کبھی مملکت کا۔

اقتصادی پالیسی کے عنوان سے جو کچھ منشور میں کہا گیا ہے وہ کم و بیش وہی ہے جو یورپ کی رفاہی مملکتیں (WELFARE STATES) موجودہ ... راستہ ہے جس کی انتہا کمیونزم ہے۔ یعنی بڑے بڑے زمینداروں سے زمینیں لے کر کاشتکاروں میں تقسیم کر دی جائیں (منشور میں زمینداروں سے کر زمینیں حاصل کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے) اور بڑی بڑی کلیدی صنعتیں (KEY INDUSTRIES) کو حکومت کی تحویل میں دیدیا جائے (NATIONALISE) کر دیا جائے۔ مزدوروں کے لئے زندگی کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور معاشی نظم و نسق میں سود کو ختم کر دیا جائے۔ سب کے لئے مملکت کام کے مواقع بہم پہنچائے۔ اور گداگری کو یکسر موقوف کر دیا جائے۔ عارضی بیکاری اور بڑھاپے کی ناداری کے لئے انشورنس کا انتظام کیا جائے ... کے لئے مفت ... اور ضروریات زندگی کی قیمتیں ایسی مقرر کی جائیں جو کسی کے دسترس سے باہر نہ ہوں ... ہر ایک کے

سے سکونتی سہولتیں مہیا کئے جائیں اور لیفٹ اندوزی اور سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کی حد بندی کی جائے۔ شمال حکومت کو عوام کا خادم سمجھا جائے۔ کے فیصلے غیر معمولی تاخیر کے بغیر کئے جائیں، سرکاری تقریبات سے اسراف بیجا کو ختم کر دیا جائے اور نمائندگان حکومت کو سادہ زندگی بسر کرنے جائے، وغیرہ وغیرہ اس ضمن میں دو باتیں غور طلب ہیں ایک تو یہ اگر اسلام کا معاشی نظام یہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے تو اس میں وہ کونسی جو ہیٹل ویسے نیلر ہے جیسا کہ اوپر کہا گیا ہو۔ یہ وہی باتیں ہیں جو یورپ کی عام رفاہی مملکتوں (WELFARE STATES) میں اس وقت را کمیونسٹوں کا دعویٰ ہے کہ انکی انتہائی اور مکمل شکل کمیونزم میں ملتی ہے اگر اسلامی نظام بھی یہی ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نظام میں اور ان مملکتوں کے نظام میں کیا فرق ہے! کیا ہم سمجھ لیں کہ یورپ کی رفاہی مملکتوں کا نظام اسلامی نظام ہے! اگر ان میں کوئی فرق ہے تو زیر نظر منشور میں اسے چاہیئے تھی چونکہ منشور میں دعوے یہ کیا گیا ہے کہ اسلامی نظام سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم میں اعتدال پیدا کرتا ہے اس لئے یہ بھی بتانا ضروری تھا کہ

(۱) سرمایہ دارانہ نظام کسے کہتے ہیں اور وہ آج کن ممالک میں رائج ہے

(۲) کمیونزم کا نظام کیا ہے

(۳) اسلامی نظام کیا ہے اور وہ کس طرح (ا) نظام سرمایہ داری (ب) کمیونزم اور (ج) رفاہی مملکتوں کے نظام سے مختلف اور بہتر ہے دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ تشکیل پاکستان کے بعد سے اتنا وقت ایسا گذرا ہے جس میں مرکز میں بھی اور صوبوں میں بھی مسلم لیگ کی وزارت رہی ہے۔ ہے کہ اگر مسلم لیگ کا نصب العین وہی ہے جو زیر نظر منشور میں بیان کیا گیا ہے تو وہ اس نصب العین کو عمل میں کیوں نہیں لائی؟ باقی پارٹیاں تو کہہ سکتی اپنے منشور کو عمل میں لانے کا موقعہ ہی نہیں ملا لیکن مسلم لیگ تو یہ کہہ نہیں سکتی۔ انکی تو اپنی حکومت تھی۔ اب بھی جس جس مقام پر لیگی حضرات برسراقتدار ان سے وہ باتیں کیوں نہیں منوائی جن کا ذکر اس منشور میں کیا گیا ہے؟ مثلاً منشور میں کہا گیا ہے کہ عمال حکومت کی تنخواہوں میں حد بندی کی جائے انہیں مسرفانہ زندگی بسر کرنے سے روکا جائے۔ یہ وہ باتیں ہیں جنہیں لیگ لیگی وزراء اور دیگر اہل مناصب سے ہر وقت منوا سکتی ہے۔ سوال یہ ہے اس نو سال کے عرصہ میں لیا کیوں نہیں کیا؛ اگر کہا جائے کہ یہ باتیں اس منشور میں شامل کی گئی ہیں جو مستقبل کے لئے مرتب کیا جا رہا ہے تو سوال ہوتا ہے کہ اس وقت تک لیگ کا منشور کیا تھا؛ کیا اس منشور میں اس قسم کی کوئی بات درج نہ تھی۔؟

منشور کے باقی حصہ میں مہاجرین کی آبادکاری، آزادانہ انتخابات، عدلیہ کی آزادی، مشرقی و مغربی پاکستان میں مفاہمت پیدا کرنے کی ضرورت، لسانی کا تحفظ، خارجی پالیسی، کشمیر، جوناگڈھ، ماناودر کی بازیابی وغیرہ مسائل کے متعلق گفتگو کی گئی ہے اور اس باب میں وہی کچھ کہا گیا ہے اپنے بیانات اور تقاریر میں اکثر و بیشتر دہراتے رہتے ہیں۔ اسمیں شبہ نہیں کہ جو باتیں کہی [illegible] کہتے رہتے ہیں اور جس کا اعا منشور میں کیا گیا ہے۔ لیکن سوال پھر وہی پیدا ہوتا ہے کہ اس ضمن میں لیگ [illegible] کیا گیا ہے؟ اگر کچھ نہیں کیا تو انہی منشور میں شامل کر لینے سے کیا ہوگا؟ جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں منشور [illegible] اس سے پہلے سینکڑوں بار لیکن منشور میں یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ اس سے پہلے لیگ [illegible] جسکے اور اب اس منشور کے سے وہ کونسی بات پیدا ہو جائیگی جس سے یہ سب کچھ عمل [illegible] سلیقہ سے مرتب کیا گ

نے اس کے مرتب محترم منظور عالم صاحب سزاوار تحسین ہیں) لیکن اس دعوے کے باوجود کہ ہمارا پروگرام محض تخیلاتی تصورات پر مبنی نہیں ہے، یہ محض خوش آئند تصورات کا مجموعہ ہی رہا ہے، کہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ ان حسین تمناؤں اور تابناک آرزوؤں کو عمل میں لانے کیلئے لیگ کے پاس کیا پروگرام ہے۔ اس ضمن میں یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ مسلم لیگ اپنی ہشت سالہ کوششوں کے بعد ملک کو ایک آئین دینے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اس آئین کے متعلق مسلم لیگ نے ملک کو بتایا ہے کہ وہ اسلامی آئین ہے جس میں ہماری تمام مشکلات کا حل موجود ہے۔ مسلم لیگ اپنے اس معرکہ آرا کارنامہ پر پھولی نہیں سماتی۔ لیکن ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ ابھی اس آئین کی روشنائی بھی خشک نہیں ہونے پائی کہ اس مسلم لیگ کی طرف سے ایک مسودہ منشور شائع ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو کچھ اس منشور میں کہا گیا ہے۔ وہ سب کچھ اس اسلامی آئین میں موجود ہے یا نہیں؟ اگر موجود ہے تو پھر اس منشور کی ضرورت کیا ہے۔ اس صورت میں لیگ کو کہنا صرف یہ چاہیئے کہ ہم نے ملک کو یہ آئین دیا ہے۔ اس کے بعد لیگ کا پروگرام یہ ہے کہ اس آئین کو کامیاب بنانے کے لئے عملی اقدامات کرے اور اس میں عملی تجربہ سے جو جو نقائص سامنے آئیں انہیں آئینی طریق سے رفع کرنے کی کوشش کرے (چنانچہ منشور میں کہا گیا ہے کہ مسلم لیگ اس آئین میں ان ترمیمات کے لئے آئینی کوشش کریگی۔ جن کی ضرورت عملی تجارب سے سامنے آئے گی) اور اگر اس آئین میں یہ کچھ موجود نہیں جو اس منشور میں کہا گیا ہے۔ تو پھر ایسے آئین کو اسلامی کیوں کہا جا رہا ہے اسے لیگ اپنا عدیم النظیر کارنامہ کیوں قرار دے رہی ہے؟

منشور کے آخر میں لکھا ہے کہ

ہمارا پروگرام تخیلاتی تصورات پر مبنی نہیں بلکہ ان اصولوں پر مبنی ہے جو ہم نے تحریک آزادی کے دوران میں سیکھے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہماری تحریک آزادی نہایت بلند اصولوں کے دعاوی پر مبنی تھی لیکن۔ معاف فرمایئے، ہم نے اس تحریک سے جو کچھ سیکھا ہے۔ وہ قطعاً اس قابل نہیں کہ اس کا ذکر فخر و مباہات سے کیا جائے جو کچھ ہم نے سیکھا ہے اس کا مظاہرہ نو برس سے پاکستان میں ہو رہا ہے۔ اس مظاہرہ میں اگرچہ کوئی پارٹی بھی مستثنیٰ نہیں لیکن مسلم لیگ اس میں سب سے پیش پیش رہی ہے اس لئے کہ اس کے ہاتھ میں اقتدار تھا۔ مسلم لیگ کی ساری کوششیں اسی میں صرف ہوتی رہیں کہ کسی نہ کسی طرح اسکی پارٹی مضبوط رہے اور اقتدار کی باگ اس کے ہاتھوں سے نہ نکلنے پائے۔ اس کیلئے اس نے جائز و ناجائز ہر قسم کے حربے استعمال کئے اصول فروشیاں کیں۔ اس نے انتخابات کے وقت (مذہبی فرقوں کی طرح) صرف اپنے آپ کو حق پر اور باقی پارٹیوں کو باطل پرست قرار دیا۔ لیکن پھر تشکیل حکومت کے لئے انہی باطل پرست اور تخریبی پارٹیوں کے ساتھ مفاہمت (COMPROMISE) بھی کی۔ ارباب لیگ میں سے قریب قریب ہر ایک کے کارنامے ملک کے سامنے ہیں۔ اسلامی اقدار تو خیر بہت بلند چیز ہے۔ ان کے سامنے قومی مفاد بھی نہ رہا۔ ان کے پیش نظر ذاتی مفاد رہا ہے اور زیادہ سے زیادہ صوبائی مفاد آخر میں اس نے آئین سازی کے سلسلہ میں ان رجعت پسند مذہبی عناصر سے مفاہمت کی ہے جن کی تاریخ سوائے تخریبی کارروائیوں کے اور کچھ پیش نہیں کر سکتی۔ اور یہ کچھ محض اس لئے کیا ہے کہ یہ پارٹی عوام میں مقبول رہے۔ اور ملاؤں کی تائید سے الیکشن جیت سکے۔ کیا یہی ہیں وہ زریں اصول جو ہم نے تحریک آزادی کے دوران میں سیکھے تھے؟ اگر یہ سمجھنا [illegible] ہے تو مسلم لیگ ذرا اس شجرۃ الزقوم پر نگاہ ڈالے جو اسکی مساعی کا نتیجہ ہے اور جس کے پھل ملک میں چاروں طرف بکھرے پڑے ہیں [illegible] تباہی، بربادی، پریشاں حالی، بے سروسامانی، خوف، حزن، مایوسی، ناامیدی، تشتت و انتشار، دوسری طرف نفع اندوزی، مہاجنی [illegible] خود غرضی، نفس پرستی، ایمان فروشی، لوٹ کھسوٹ۔ اس کے ساتھ ہی بے حیائی، فحش کاری

بے غیرتی بے حمیّتی۔ سوچئے کہ جس درخت کے یہ پھل ہیں اس کی آبیاری کس کے ہاتھوں ہوئی ہے؟ ہمیں تسلیم ہے کہ اس درخت کی آبیاری میں ملک کی ہر پا[illegible]
حصہ رسدی ہاتھ ہے لیکن ہم اس وقت مسلم لیگ کو اس لئے نمایاں طور پر سامنے لائے ہیں کہ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ قائد اعظم کے ترکہ کی وارث، اسلام کی نمائندہ اور [illegible]
آزادی کی علمبردار ہے جو بلند ترین اصولوں پر اٹھائی گئی تھی۔ اور جو اپنے اس مقدس سرمایہ کی بنا پر قوم سے مطالبہ کر رہی ہے کہ وہ باقی پارٹیوں کے مقابلہ میں اسے
نمائندہ جماعت سمجھے (جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں) یہ شجرۃ الزقوم پارٹی بازی کا فطری نتیجہ ہے جسے قرآن نے شرک سے تعبیر کیا ہے۔ جس قوم میں قومی شعور بیدار [illegible]
وہ اپنے قومی مفاد کا تحفظ کرتی ہے لیکن بین الاقوامی معاملات میں ہر قسم کی بد دیانتی کرتی ہے اور جس قوم میں قومی شعور بیدار نہ ہو وہ خود اپنے قومی مف[illegible]
سے بھی کچھ کرتی ہے یعنی بین الاقوامی رزمگاہ میں مختلف قومیں پارٹیوں کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ جن کی باہمی نزاع انسانیت کے لئے جہنم تیار کرتی ہے
اکھاڑوں میں مختلف پارٹیاں باہمی کشمکش سے اس جہنم کے لئے ایندھن فراہم کرتی رہتی ہیں۔ لہٰذا جو ابتری ہمارے ہاں پھیل رہی ہے وہ پار[illegible]
فطری نتیجہ ہے اور چونکہ مسلم لیگ خود ملک کی پارٹی ہے۔ اس لئے وہ اس ابتری کے لئے برابر کی ذمہ دار ہے۔ بلکہ اس جہت سے کہ وہ سب سے پہلی پارٹی ہے [illegible]
اقتدار رہی ہے۔ باقی پارٹیوں کے مقابلہ میں زیادہ ذمہ دار۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہے کہ ملک کی فلاح پارٹی کے اصولوں پر منشور مرتب کرنے میں نہیں بلکہ ملک سے پارٹی بازی کی لعنت کو دور کر[illegible]
ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ

(۱) ملک سے پارٹیوں کے وجود کو ختم کر دیا جائے، اور چونکہ مسلم لیگ اس باب میں بزرگ خاندان کی سی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس معاملہ میں پہل [illegible]

(۲) آئندہ الیکشن پارٹیوں کے لیبل کے بجائے ملی سطح پر کئے جائیں۔ یعنی پوری کی پوری ملت پاکستانیہ ایک جماعت کی حیثیت سے اپ[illegible]
افراد کو اپنا ترجمان منتخب کرے

(۳) اس وقت حالت یہ ہے کہ ہماری سیاست ایک مخصوص گروہ کا اجارہ بن کر رہ گئی ہے۔ وہی سو سوا سو افراد ہیں جنہیں ایک دروازے سے نکالئے تو دو[illegible]
دروازے سے اندر آ جاتے ہیں فرق صرف لیبل کا ہوتا ہے افراد وہی رہتے ہیں ان افراد کو آزما آزما کر ملک تنگ آ چکا ہے اور یہ سمجھ کر کہ ان کے علاوہ ہمارے پا[illegible]
ہی نہیں قوم کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو چکا ہے۔ ملک کو اس مایوسی سے نکالنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ان افراد کو آئندہ الیکشن میں کھڑے ہونے [illegible]
جنسے اور مطلع اس عنصر کو اوپر لایا جائے جو سیرت اور صلاحیت کے اعتبار سے موجودہ افراد سے کہیں بہتر ہے لیکن جو اس لئے اوپر نہیں آ سکتا کہ [illegible]
نے قصرِ سیاست کے گرد حصار کھینچ رکھا ہے جب تک یہ حصار نہیں ٹوٹے گا صحت مند عنصر کبھی برسرِ کار نہیں آ سکے گا۔

(۴) رکنیت کے امیدوار کے لئے کم از کم گریجویٹ ہونے کی شرط عائد کی جائے۔ اور ووٹر کے لئے کم از کم میٹرک کی۔ امیدوار سے ان کا [illegible]

(۵) [illegible] تمام مسودات کا فیصلہ قرآنی اصولوں کی روشنی میں کرنے کی کوشش کریگا قرآنی اصول کوئی [illegible]

(۶) جب تک ملک میں موجودہ طبقاتی تفریق موجود ہے نمائندگی کے حلقے (CONSTITUENCIES) آمدنی کے اعتبار سے متعین کئے جائیں
تا جس سے غریب بھی [illegible] امیدواروں کے [illegible] اور ان کی نشستوں کی تعداد آبادی کے تناسب سے ہو۔

(۷) ایوان میں کوئی حزب مخالف نہ ہو اور [illegible]

(۸) مملکت کے بنیادی [illegible] ضروریات زندگی بہم پہنچانے اور ان کی [illegible]

سلیمؔ کے نام

(اسلامی قانونِ شریعت کے مآخذ)

عزیزم سلیم میاں! تمہارا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ میں اتنے عرصہ تک تمہیں خط تک نہ لکھوں۔
غور کرو تو خود یہی چیز تمہاری شکایت کا جواب بھی ہے۔ حالات کچھ ایسے ہی تھے نا جنہوں نے مجھے اتنی بھی فرصت نہ دی کہ میں تمہیں
لکھ سکتا!

ز آسماں بگردشِ مادر میانہ ایم
غالبؔ دگر مپرس کہ بیما چہ می رود

اتنے لمبے عرصہ تک خط نہ لکھنے کے معنی یہ نہیں کہ میں تمہیں بھول گیا تھا۔

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

یہ دونوں کے کئی ایک جواب طلب خطوط میرے سامنے ہیں۔ ان میں سے غیر ضروری امور کو چھوڑ کر باقی استفسارات سے گریز
کروں گا کہ ایک ایک کے جواب لکھتا جاؤں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ تمہارا سوال تو دو ایک فقروں میں ختم ہو جاتا ہے اور مجھے
ان کے صفحے لکھنے پڑتے ہیں۔ مگر اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے!

دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

ہے کہ اسلامی قانونِ شریعت کے مآخذ کیا ہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے۔ بالخصوص اس لئے کہ گزشتہ کچھ عرصہ سے ملک میں آئین
میں ایسی فضا پیدا ہو چکی ہے جس میں اس قسم کے سوالات رہ رہ کر سامنے آتے ہیں۔ اگرچہ مملکت کا آئین اب منظور ہو چکا
کے بعد قانون سازی کے مراحل شروع ہوں گے۔ اس لئے اس سوال کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی۔ بات اہم ہے اس
سنو۔

سے یہ سوال پوچھو اس کا جواب یہی ملے گا کہ اسلامی قانون شریعت کے مآخذ چار ہیں۔ قرآن۔ حدیث۔ اجماع اور قیاس۔
جس نے ایسے مسلّمہ کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے جس پر کسی غور و فکر کی ضرورت اور بحث و نظر کی گنجائش ہی نہیں سمجھی جاتی لیکن

نہ میرے مسلک سے واقف ہو۔ میں ان امور پر بھی غور و فکر کرتا ہوں اور دوسروں کو بھی ان میں تدبر و تفکر کی دعوت دیتا ہوں جو عام طور پر بطور مسلمات مانے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ میرے نزدیک کسی بات کے صحیح ماننے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اسے غور و فکر کے بعد صحیح مانے۔ قرآن نے تو اس باب میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ مومن وہ ہیں کہ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا (۲۵/۷۳) جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی پیش کی جائیں تو وہ ان پر بھی بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے۔ جب قرآن کی خود اپنی آیات کے متعلق یہ تاکید ہے تو عام مسلمات کے متعلق اس کی روش ظاہر ہے۔

سب سے پہلے یہ دیکھو کہ ان اصطلاحات کا مروجہ مفہوم کیا ہے؟ واضح رہے کہ یہ موضوع یکسر فنی اور اصطلاحی ہے۔ لیکن میں کوشش کروں گا کہ تمہیں فنی اصطلاحات میں الجھائے بغیر، عام فہم الفاظ میں بات سمجھا دوں۔

قیاس

پہلے قیاس کو لو۔ اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ جب اسلام دور دراز ملکوں تک پہنچا اور مسلمانوں کا ربط و ضبط مختلف اقوام سے ہوا تو اس قسم کے معاملات سامنے آئے جن کے متعلق نہ قرآن میں کوئی تفصیلی حکم موجود تھا۔ اور نہ ہی احادیث میں ایسا حکم ملتا تھا۔ اس لئے فقہاء نے عقل اور رائے سے کام لے کر قرآن اور حدیث کے ملتے جلتے احکام سے زیرِ نظر معاملات کے متعلق نئے احکام مستنبط کئے اس کا نام قیاس ہے۔ یعنی ایک بات سے دوسری بات کا اندازہ کرنا۔ انگریزی میں اسے (ANALOGICAL REASONING) کہتے ہیں۔ اسے ایک مثال سے یوں سمجھو کہ قرآن کی رو سے خمر (شراب) ممنوع ہے۔ لیکن بھنگ کے متعلق قرآن اور حدیث میں بالصراحت کوئی حکم نہیں ملتا۔ اب ایک فقیہ جو قیاس سے کام لے گا۔ وہ یہ کہے گا کہ شراب اس لئے ممنوع ہے کہ اس میں نشہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر بھنگ میں نشہ ہو تو وہ بھی ممنوع ہے۔ اور اس سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ ہر نشہ آور شے ممنوع ہے۔ اس طرح استنباطِ مسائل کو اجتہاد بھی کہتے ہیں۔ جس کے معنی کوشش کرنا (TO EXERT) ہیں۔

قیاس کے جواز اور عدمِ جواز کے بارے میں بھی دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ اسے بالکل ناجائز قرار دیتا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم ایک مکمل کتاب ہے۔ جس میں ہر بات کا حکم موجود ہے۔ لہٰذا شریعت کے معاملات میں قرآن نے قیاس کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ متقدمین میں ظاہری فرقہ کے مسلمان اسی خیال کے تھے۔ اور متاخرین میں پنجاب کے فرقہ اہلِ قرآن نے اسی مسلک کو اختیار کیا تھا۔ لیکن نہ ظاہری مسلک زندہ رہ سکا۔ اور نہ ہی اہلِ قرآن کا فرقہ آگے بڑھ سکا۔ اس لئے کہ ان کا بنیادی تصور خود منشائے قرآنی کے خلاف تھا۔ اسی خیال کا ایک دوسرا گروہ وہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ تنہا قرآن نہیں بلکہ قرآن اور حدیث دونوں کو اکٹھا کر لیا جائے تو ان میں تمام معاملات کے احکام مل جاتے ہیں۔ اور کوئی بات ایسی نہیں رہ جاتی۔ جس کے لئے کسی نئے فیصلہ کی ضرورت پڑے۔ چنانچہ تمہیں یاد ہوگا کہ فسادات پنجاب کی تحقیقاتی عدالت میں محترم ابوالحسنات صاحب نے یہی کہا تھا کہ اسلام میں ہر معاملہ کے متعلق پہلے سے احکام موجود ہیں۔ اس لئے اس میں قانون سازی کی گنجائش ہی نہیں۔

جو لوگ قیاس کے حق میں ہیں وہ قرآن اور حدیث دونوں سے اپنے مسلک کی تائید پیش کرتے ہیں۔ البتہ ان میں اس باب میں اختلاف ہے کہ قیاس کی کہاں ضرورت پڑتی ہے۔ اور وہ کس حد تک قابلِ اعتماد ہے۔ اہلِ حدیث حضرات کا عام طور پر یہ عقیدہ ہے کہ حدیث خواہ

...ف ہی کیوں نہ ہو اسے قیاس پر ترجیح دی جائے گی۔ ہذا ان کے نزدیک قیاس کے ذریعہ اجتہاد کی وسعت بہت محدود ہے۔ ان کے
...ں دوسرا گروہ (جنہیں اہل الرائے کہا جاتا ہے اور جن کے سرخیل امام ابوحنیفہؒ ہیں) قیاس کو بڑی وسعت دیتا ہے۔ یہ مشہور ہے کہ امام
...نیفہؒ نے اپنی فقہ مرتب کرتے وقت احادیث سے بہت کم مدد لی ہے۔ اتنی کم کہ ان کے ہاں سترہ اٹھارہ حدیثوں سے زیادہ ملتی ہی نہیں
...رآن کو سامنے رکھتے تھے۔ اور اسی کی روشنی میں نئے نئے معاملات کے متعلق استنباطِ احکام کرتے تھے۔ اہل حدیث اور اہل الرائے حضرات میں
...بنیادی وجہ اختلاف ہے۔ چونکہ امام اعظمؒ کوفہ کے رہنے والے تھے (اور کوفہ عراق میں ہے) اس لئے ان کے مسلک کو اہل عراق کا
...ب بھی کہتے ہیں (مذہب کے معنی (RELIGION) نہیں بلکہ (SCHOOL) کے ہیں) اہل حدیث اور اہل الرائے کے اس
...ادی اختلافات کے علاوہ خود اہل الرائے (اہل فقہ) کے مختلف مذاہبِ فکر (SCHOOLS OF THOUGHT) میں
...اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ ان کے ائمہ کے قیاس میں اختلاف ہے۔ چنانچہ ہارٹن ((HORTON)) کی تحقیق کے مطابق
...یں اور بارھویں صدی عیسوی کے دوران میں، مسلمانوں میں کم و بیش ایک سو فقہی مذاہب پیدا ہو چکے تھے۔ اور علامہ اقبالؒ کی تصریح
...کے مطابق پہلی صدی ہجری کے وسط سے چوتھی صدی تک قریب انیس فقہی مذاہب وجود میں آچکے تھے۔

لیکن تم یہ سنکر حیران ہوگے کہ یہی اہل الرائے اور اہل قیاس حضرات جنہوں نے اہل حدیث حضرات سے اس بنیادی نقطہ
...پر اختلاف کیا تھا کہ زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے نت نئے مسائل (PROBLEMS) سامنے آتے رہتے ہیں۔ جن کے لئے فکر
...و قیاس ہی سے احکامات مستنبط کئے جا سکتے ہیں۔ اس لئے اجتہاد ناگزیر ہے۔ خود کچھ عرصہ کے بعد اس عقیدہ کے ہو گئے کہ اب آئندہ کے
...لئے اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ جو کچھ سوچا جانا تھا سوچا جا چکا۔ جتنا کچھ قیاس کیا جانا تھا کیا جا چکا۔ اب آنیوالی نسلوں کے لئے انہی فیصلوں
...کی پابندی لازمی ہے جو ان کے ائمہ اسلاف کر چکے ہیں۔ وہ ان سے ادھر ادھر نہیں ہٹ سکتے۔ تم نے سلیم! اپنے ہاں مقلد اور غیر مقلد
...کی بحثیں سنی ہوں گی۔ ان کے مناظرے دیکھے ہوں گے۔ مقلد یہی لوگ کہلاتے ہیں جو ائمہ اسلاف کے فیصلوں کی تقلید ضروری سمجھتے ہیں
...لیکن اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ غیر مقلد وہ ہوں گے جو اجتہاد کا دروازہ کھلا سمجھتے ہیں۔ بالکل نہیں۔ اجتہاد کا دروازہ تو ان میں سے کوئی بھی
...کھلا نہیں سمجھتا۔ مقلد اور غیر مقلد ـــ مقلد وہ ہیں جو ائمہ فقہ کے فیصلوں کی تقلید کرتے ہیں۔ اور غیر مقلد وہ جو حدیث کی پیروی کرتے
...ہیں۔ اجتہاد کا سوال نہ ان کے ہاں ہے نہ ان کے ہاں۔ یعنی اس اعتبار سے دونوں کا مقام ایک ہی ہے۔ دونوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جو فیصلے
...ہونے تھے ہو چکے۔ اب قیامت تک آنیوالی نسلوں کے لئے انہی فیصلوں کی اتباع لازمی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک گروہ کہتا ہے کہ
...فیصلے فقہ کی کتابوں میں درج ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ یہ احادیث کے مجموعوں میں ہیں۔ ان مقلدین میں بھی مختلف گروہ ہیں بعض صرف
...مطلق اجتہاد کے بند ہونے کے قائل ہیں اور بعض ہر نوع تقلید کے قائل۔ لیکن یہ فنی اور فروعی باتیں ہیں جن کی تفصیل میں جانے کی ضرورت
...نہیں۔ بنیادی چیز وہی ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

تم یقیناً اس مقام پر پوچھو گے کہ اجتہاد کا دروازہ کھولنے والوں نے اسے خود اپنے ہاتھوں سے بند کیوں کر دیا؟ اس کی کئی وجوہات
...ہیں لیکن سب سے بڑی (اور یوں سمجھو کہ آخری) وجہ زوالِ بغداد تھا۔ ملت اسلامیہ کا دینی مرکز تو مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا۔ بغداد کی

تباہی کے بعد (جو تیرھویں صدی عیسوی میں ہوئی تھی) ان کی سیاسی مرکزیت بھی تباہ ہو گئی تھی۔ اور امت میں ہر طرف انتشار پھیل گیا تھا۔ ان حالات میں (علامہ اقبال کے الفاظ میں)

> امت کو مزید انتشار سے بچانے کے لئے جو سیاسی زوال کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ قدامت پسند مفکرین نے یہی سوچا کہ قوم میں معاشرتی وحدت کو قائم رکھا جائے۔ اور اس کا یہی طریقہ تھا کہ شرعی مسائل کے متعلق جو فیصلے فقہائے اسلام پہلے کر چکے تھے۔ سب پرانہی کی پابندی لازم قرار دیدی جائے اور نئے فیصلوں کا دروازہ بند کر دیا جائے۔ یعنی ان کے پیش نظر ملت کا معاشرتی نظم تھا۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس باب میں کسی حد تک بحق بجانب بھی تھے۔ اس لئے کہ جماعتی نظم زوال آور عناصر کی کچھ نہ کچھ روک تھام تو کر ہی دیتا ہے (خطبات صفحہ ۱۴۳-۱۴۴)

اس وقت کے ارباب شریعت کے پیش نظر یہی مصلحت ہو گی لیکن تم نے غور کیا سلیم! کہ اس وقتی مصلحت نے اسلام اور مسلمانوں کو کس قدر مستقل نقصان پہنچایا ہے! اس نے فکر کا دروازہ بند کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ امت میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی مفقود ہو گئی۔ اور اسلام جو ایک حرکت (MOVEMENT) کا نام تھا منجمد اور متحجر (FOSSILISED) رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گیا۔ چنانچہ علامہ اقبال مندرجہ بالا اقتباس کے مسلسل میں لکھتے ہیں۔

> (اس وقت کے ارباب شریعت نے اس مصلحت کو تو پیش نظر رکھا) لیکن انہوں نے اس حقیقت کو نہ سمجھا اور نہ ہی اسے ہمارے موجودہ علماء سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کے مستقبل کا انحصار ان کے جماعتی نظم پر اتنا نہیں ہوتا جتنا افراد کی قوت اور صلاحیت پر ہوتا ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جس میں جماعتی نظم پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے، فرد کی انفرادیت کچل کر رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے معاشرتی فکر کی دولت کا مالک تو بن جاتا ہے۔ لیکن اس کی اپنی روح مردہ ہو جاتی ہے (یاد رکھئے!) قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا۔

سلیم! ان الفاظ کو یونہی سرسری طور پر پڑھ کر آگے نہ بڑھ جانا۔ یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے جسے حضرت علامہ چند الفاظ میں بیان کر گئے ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے تم خود اپنے زمانے کی ان مذہبی جماعتوں پر غور کرو جو اسلام کے احیاء اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا دعوے لے کر اٹھتی ہیں۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ

> (۱) ان کی دعوت کا مرکزی نقطہ یہ ہوتا ہے کہ ہمیں اسلاف کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیئے۔ ہمیں اپنے ماضی کو دوبارہ زندہ کرنا چاہیئے۔ ہماری ترقی کا راز اتباعِ سلف میں ہے۔ اور
>
> (۲) اگر کوئی شخص قوم کو غور و فکر کی دعوت دے تو ان کی طرف سے فوراً یہ آواز بلند ہو جاتی ہے کہ اس

فتنہ کو کچل دو۔ یہ امت میں انتشار پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہ ایک نیا اسلام ایجاد کرنا چاہتا ہے۔

ی وہ اپنے جماعتی نظم کو اسلاف کے نام کی غلط تقدیس اور ان کے مسلک کی متشدد تقلید کے زور پر قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ تم اس ہے جماعتی نظم پر گہری نگاہ ڈال کر دیکھو۔ تمہیں نظر آجائے گا کہ اس میں افراد کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ وہ لام کی سب سے بڑی خدمت اسی میں سمجھتے ہیں کہ اپنے قائدین کے ہر حکم کی اطاعت کی جائے۔ اور ان کے کسی فیصلے پر تنقیدی نگاہ ڈالی جائے۔ وہ اپنے جماعتی تعصب کو مذہب سے والہانہ شیفتگی سمجھتے ہیں۔ اور اس مقدس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہمارے اس جہاد ے ملت کو عروج اور اسلام کو ترقی نصیب ہوگی۔ یہ وہ رجحان تھا جو زوال بغداد کے بعد پیدا ہوا اور ابھی تک بدستور چلا جا رہا ہے۔ پاکستان میں بدقسمتی سے اسے اور بھی شدت کے ساتھ ابھارا جا رہا ہے۔ اسی کو علامہ اقبال نے "جماعتی نظم پر ضرورت سے زیادہ ماضی کا جھوٹا احترام اور اس کا مصنوعی احیاء" قرار دیا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

> جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے کہا ہے: "تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں۔ ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو"۔ لہٰذا زوال آور عناصر کی روک تھام کا موثر طریقہ صرف یہ ہے کہ قوم میں مجرد خود بیں (SELF-CONCENTRATED) افراد کو پیدا کیا جائے۔ یہی وہ افراد ہیں جو زندگی کی گہرائیوں کے سربستہ راز کھولتے ہیں۔ وہ ایسے نئے معیارِ زیست سامنے لاتے ہیں جن کی روشنی میں ہم یہ دیکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہمارا ماحول ایسا غیر متبدل نہیں کہ اسے چھوا تک نہ جائے۔ تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی غلط تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔ (ص ۱۴۹)

نے دیکھا سلیم! کہ اتنے بڑے اہم مسئلہ کو حضرت علامہؒ نے چند الفاظ میں کس حسن و خوبصورتی سے حل کر دیا ہے! یہی وجہ ہے میں بار بار اس پر زور دیتا چلا آرہا ہوں کہ تم "خطبات اقبال" کا گہری نظر سے مطالعہ کرو۔ لیکن تمہیں عذر یہ ہے کہ تم ان کا مطالعہ ں وقت کرو گے جب میں ان کا تشریحی ترجمہ شائع کروں۔ ایک حد تک تم بھی سچے ہو۔ مجھے تمہاری دقت کا احساس ہے۔ میں [illegible] قرآن کریم کے لغات اور مفہوم کے کام سے فارغ ہو چکا ہوں۔ اب تھوڑی سی صحت اور توانائی اور مل جائے تو بقایا کام بھی ہاتھ میں لوں گا۔

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

شریحات بالا سے تم نے سلیم! دیکھ لیا ہوگا کہ قیاس درحقیقت شرعی قوانین کی تدوین کا ایک طریقہ (PROCESS) تھا ان قوانین کا ماخذ (SOURCE) نہیں تھا۔ لیکن جب ہمارے دورِ انحطاط میں فکر و تدبر کا دروازہ بند ہو گیا تو یہی قیاس قانون

شریعت کا ماخذ قرار پاگئی۔ یعنی اس وقت عقیدہ یہ پیدا کر لیا گیا کہ اسلاف نے اپنے قیاس (اجتہاد) سے جو مسائل مستنبط کئے ہیں۔ وہ ابد کے لیے غیر متبدل قوانین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا فقہ کی کتابیں ہمارے قوانین شریعت کا سرچشمہ ہیں۔

اجماع

قیاس کے بعد قوانین شریعت کا دوسرا ماخذ اجماع قرار دیا جاتا ہے۔ قیاس کے متعلق تو مختلف گروہوں کے اختلافات ایسے اور وسیع نہیں تھے۔ لیکن اجماع کے متعلق صورت عجیب تر ہے۔ اول تو آج تک یہی طے نہیں پا سکا کہ اجماع سے مراد کیا ہے اور جو کچھ طے پایا ہے۔ اس میں مختلف گروہوں کا اختلاف بڑا گہرا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عہد حضرت عمرؓ تک امت میں کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے نظام میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مسئلۂ خلافت حضرت علیؓ کے نام پر میں سب سے پہلا اختلاف رونما ہوا۔ غیر شیعہ حضرات اس اختلاف کو سیاسی کہتے ہیں لیکن شیعہ حضرات کے نزدیک یہ دینی مسئلہ تھا اور بڑا بنیادی۔ بہرحال مسئلہ سیاسی تھا یا دینی، اس کی وجہ سے جو اختلاف پیدا ہوا وہ غیر مندمل تھا۔ اس اختلاف کے بعد کوئی مسئلہ ایسا ہو نہیں سکتا جس کے متعلق کہا جائے کہ اس پر پوری امت کا اجماع تھا۔ لہٰذا اجماع سے مراد ساری امت کا اجماع نہیں۔ فقہا کے نزدیک کسی حکم شرعی پر کسی زمانے کے مسلمان مجتہدین کا متفق ہو جانا اجماع کہلاتا ہے۔ واضح تر الفاظ میں اجماع کی فنی تعریف یہ ہے کہ

> رسول اللہ کی وفات کے بعد کسی بھی دور میں امت محمدیہؐ کے مجتہد کسی پیش آمدہ حادثہ پر خوب بحث و تحمیص کر کے ایک ہی وقت میں ایک ہی جگہ پر ایک ہی جیسے الفاظ میں اعلان کریں۔ اس میں اگر کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا تو یہ اجماع حقیقی کہلائے گا۔

اس قسم کے اجماع کے شرعی دلیل ہونے یا نہ ہونے میں اختلافات تو ایک طرف علماء کے ایک گروہ نے اس کے وجود کے امکان ہی سے انکار کیا ہے۔ اور بات ہے بھی ٹھیک۔ وہ کونسا مسئلہ ہے جس کے متعلق یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ امت میں اس قسم کا اجماع کبھی ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ائمہ نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اس قسم کے اجماع کا مدعی جھوٹا ہے۔

اجماع کی دوسری شکل یہ بیان کی جاتی ہے کہ چند مجتہد ایک بات کہہ کر اس دور کے تمام مجتہدوں میں مشتہر کر دیں۔ اگر کسی نے اس کے خلاف یا تائید میں کچھ نہیں کہا تو اسے اجماع سکوتی کہا جاتا ہے۔ یعنی ان کا چپ رہنا اس کی دلیل ہے کہ وہ اس سے متفق ہیں۔ ایک گروہ نے اس کے بھی حجت شرعی ہونے سے انکار کیا ہے۔ دوسری طرف اس کے موافقین کا گروہ ہے کہ وہ منکرین اجماع کو کافر تک کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک صرف اہل مدینہ کا اجماع شرعی دلیل بن سکتا ہے۔ بعض کے نزدیک صحابہ کا اجماع۔ ان علماء کی بحثوں سے قطع نظر تم سیدھے سادے طور پر یہ سوچو۔ تسلیم! کہ امت میں فرقہ بندی کے بعد اگر کبھی کسی مسئلے میں اجماع ہوگا بھی تو وہ ایک فرقہ کے اندر ہی ہوگا۔ اور فرقہ کا الگ وجود خود اس کی شہادت ہے کہ وہ ان کے کسی فیصلے کو حجت شرعی نہیں مانتا۔ اصل یہ ہے کہ جب امت میں پہلا تفرقہ (شیعہ اور سنی) کا پیدا ہوا تو شیعہ قلیل تعداد میں تھے (اور ہمیشہ قلیل تعداد میں رہے ہیں) اور سنیوں کی اکثریت تھی۔ پھر جب سنیوں میں مختلف گروہ ہوئے تو ان میں اہل فقہ کی اکثریت تھی۔ اہل فقہ میں حنفیوں کی اکثریت تھی۔ ان کی اکثریت ہر دور میں رہی ہے۔ اور آج بھی یہ تمام دنیا

مسلمانوں کا تریب تریب[1] حصہ ہیں۔ اس لئے ان کی طرف سے اس قسم کی احادیث تائیداً پیش کی جاتی ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت کا سواد اعظم کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگا۔[1] یہی جذبہ درحقیقت اجماع کے سرچشمۂ قانون قرار دیئے جانے کا محرک بھی ہے۔ اس اعتبار سے اجماع امت سے مفہوم ہوگا۔ امت کے گروہِ عظیم کا فیصلہ۔ یعنی حنفی مسلمانوں کا مسلک۔ یہ ظاہر ہے کہ ان کا ہر فیصلہ (غیر سنی تو ایک طرف خود سنیوں میں بھی) نہ اہل حدیث کے نزدیک قانون شریعت بن سکتا ہے۔ نہ دیگر ائمہ فقہ۔ امام مالکؒ۔ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے متبعین کے نزدیک۔

یہ ہے اجماع کا مروجہ مفہوم اور اس کی عملی حیثیت۔

حدیث

قیاس اور اجماع کے بعد قوانین شریعت کا تیسرا ماخذ حدیث کو قرار دیا جاتا ہے۔ ویسے تو احادیث کے متعلق شروع ہی سے بڑی طویل طویل بحثیں چلی آرہی ہیں۔ لیکن ہمارے زمانہ میں (بالخصوص پاکستان میں) اس سوال نے خاص اہمیت حاصل کر لی ہے کیونکہ یہاں یہ عملی سوال سامنے آگیا ہے کہ اسلامی مملکت کی قانون سازی میں حدیث کا مقام کیا ہے۔ اس سوال کا ملت کا سامنے آنا بڑی نیک فال تھا لیکن، جیسا کہ تم نے دیکھا ہے، بجائے اس کے کہ اس کے متعلق خالص علمی اور دینی انداز سے گفتگو کی جاتی اسے سطحی جذبات میں الجھا دیا گیا اور (جیسا کہ میں قیاس کے عنوان میں بتا چکا ہوں) سرے سے اس سوال ہی کو ملت میں مزید انتشار پیدا کرنے والا فتنہ قرار دیدیا گیا! بہرحال اس کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ملخص (مختصر الفاظ میں) یہ ہے کہ

(۱) حدیث اسلامی قوانین شریعت میں ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو فیصلے احادیث میں آچکے ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں۔ ان میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) بعض حضرات حدیث کے ساتھ سنت کا لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ سنت کا مفہوم کیا ہے۔ اور اس میں اور حدیث میں کچھ فرق ہے۔ یا دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ ان میں فرق ہے۔ حدیث ہر اس قول یا فعل کو کہتے ہیں جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو اور سنت حضور کے ثابت شدہ طریقہ کو کہتے ہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ ان میں کوئی فرق نہیں یہ دونوں مرادف المعنیٰ ہیں۔

(۳) سنت میں صرف رسول اللہؐ کی سنت ہی داخل نہیں بلکہ سنت خلفائے راشدینؓ بھی شامل ہے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ خلفائے راشدینؓ میں کون کون شامل ہیں۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ان سے صرف اولین چار خلفائے رسول اللہ مراد ہیں۔ دوسرے گروہ نے لکھا ہے کہ نہیں ان میں تمام وہ حکمران شامل ہیں۔ جنہوں نے امت کو اسلامی طریقہ پر چلایا یا جو آئندہ اسے اسلامی طریق پر چلائیں گے۔

(۴) پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا رسول اللہ کا ہر قول یا فعل شرعی حیثیت رکھتا ہے۔ یا ان میں فرق کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ کا کہنا یہ ہے

---

[1] اجماع کے متعلق تفصیلی بحث اور اس حدیث پر تنقید کے لئے طلوع اسلام بابت جولائی ۱۹۵۲ء ملاحظہ فرمائیے۔ (طلوع اسلام)

کہ رسول اللہ اپنی رسالت کے پہلے دن سے زندگی کے آخری سانس تک بہرحال اور ہر حیثیت میں رسول تھے اس لئے حضور کا ہر قول شرعی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ نہیں! رسول اللہ نے جو کچھ بہ حیثیت رسول فرمایا یا کہا تھا۔ وہی دینی حیثیت جو کچھ آپ نے اپنی بشری حیثیت یا تاریخ کے ایک خاص دور میں عرب کے باشندہ ہونے کی حیثیت سے کہا یا کیا تھا۔ وہ شرعی حیثیت

(۵) اس سے یہ سوالات پیدا ہوئے کہ

(ا) کیا رسول اللہ کی سنت (یعنی آپ کا ثابت شدہ طریق) کسی خاص کتاب میں منضبط ہے۔ اور وہ کتاب تمام مسلمانوں کے نزدیک ایسی صحیح اور قابل اعتماد ہے کہ اس پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جا سکتی۔

(ب) کیا احادیث کی کوئی ایسی کتاب ہے۔ جس کی ایک ایک حدیث بلاشک وشبہ رسول اللہ کی حدیث تسلیم کی جائے۔

(ج) کیا کسی کتاب میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ نے فلاں بات بہ حیثیت رسول فرمائی تھی۔ اور فلاں بات اپنی عام بشری یا تاریخی فرد ہونے کی حیثیت سے کہی تھی۔

ایک گروہ نے یہ کہا کہ ہاں! ایسی کتاب (یا کتابیں) ہیں جن کی ایک ایک حدیث یقینی طور پر صحیح ہے اور (چونکہ رسول اللہ کی دو حیثیتیں تھی ہی نہیں اس لئے) ہر حدیث رسول ہی کی حیثیت سے ہے۔ لیکن دوسرے گروہ نے کہا کہ نہیں! جسے تم سب سے زیادہ صحیح اور قابل اعتماد مجموعہ (یعنی بخاری شریف) بھی قرار دیتے ہو۔ اس میں صحیح اور غلط دونوں قسم کی احادیث موجود ہیں۔ اس لئے اس کی بھی ہر حدیث کو بلا تنقید صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ

(۶) صحیح اور غلط حدیثوں کے پرکھنے کا معیار کیا ہے؟ ایک گروہ نے کہا کہ اسلاف ان معیاروں کو مقرر کر چکے ہیں۔ اور ان کے مطابق حدیثوں کی جانچ پرکھ بھی کر چکے ہیں۔ لیکن دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ ان معیاروں کے علاوہ ایک معیار یہ بھی ہے کہ بعض لوگوں اسلام اور سیرت نبوی کے مطالعہ سے ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ رسول اللہ کے مزاج شناس ہو جاتے ہیں۔ ان کی نگاہ بتا دیتی ہے کہ فلاں حدیث صحیح ہے اور فلاں غلط۔ حتیٰ کہ اگر کسی معاملہ میں کوئی حدیث نہ ملے تو بھی وہ بتا سکتا ہے کہ اگر یہ معاملہ رسول اللہ کے سامنے پیش ہوتا تو حضور اس کے متعلق یہ فرماتے۔

(۷) اس آخری بات سے یہ سوال پیدا ہوا کہ کیا زندگی کے تمام معاملات کے متعلق احادیث میں احکام مل جاتے ہیں۔ یا ایسے بھی ہو سکتے ہیں۔ جن کے متعلق احادیث میں پہلے سے احکام موجود نہیں (جیسا کہ تم قیاس کے عنوان میں دیکھ چکے ہو) بعض لوگوں کا ہے کہ احادیث کے ذریعے دین مکمل ہو چکا ہے۔ اب کوئی معاملہ ایسا ہو نہیں سکتا جس کے متعلق پہلے سے فیصلہ موجود نہ ہو لیکن دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ایسے معاملات ہو سکتے ہیں جن کے لئے پہلے سے فیصلہ موجود نہ ہو۔ ایسے امور کا فیصلہ اجتہاد سے کیا جائیگا۔

(۸) یہ سوال بھی اٹھا کہ احادیث میں جو فیصلے مذکور ہیں (خواہ انہیں بالکل صحیح بھی کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے) کیا وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے یا ان میں بہ تقاضائے حالات ردوبدل کیا جا سکتا ہے۔ ایک گروہ نے یہ کہا کہ ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کیا جا سکتا

دسرے گروہ کا کہنا ہے کہ نہیں! ان میں ایسے فیصلے بھی ہو سکتے ہیں جن میں تغیر حالات سے ردوبدل کیا جا سکتا ہے۔

یہ ہے سلیم! مختصر طور پر خلاصہ ان مباحث کا جو حدیث کے متعلق ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ تمام باہمدگر مختلف خیالات
ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ان حضرات کے ہیں جو اپنے آپ کو حدیث کے ماننے والے کہتے ہیں۔ ان میں وہ لوگ شامل نہیں جنھیں منکرین
یث کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ان تمام متضاد خیالات کے ماننے والے (جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے) "حدیث ماننے والے" تسلیم
پاتے ہیں تو منکرین حدیث "صرف وہ لوگ رہ جائیں گے۔ جن کا عقیدہ یہ ہے کہ زندگی کے تمام معاملات کے متعلق تفصیلی فیصلے
ن کریم کے اندر موجود ہیں۔ اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فلاں معاملہ کے متعلق رسول اللہ نے کیا فیصلہ فرمایا تھا۔ یہ گروہ
گوں پر مشتمل ہے جو اپنے آپ کو "اہل قرآن" کہتے ہیں (یعنی ان اصطلاحی معنوں میں اہل قرآن۔ ورنہ عام معنوں میں اہل قرآن تو
مان ہے)

یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ حدیث کے متعلق یہ بحثیں ہمارے زمانہ کی پیدا کردہ نہیں۔ یہ بہت پہلے سے چلی آ رہی ہیں۔ حتیٰ کہ امام شافعیؒ
پیدائش ۱۵۰ھ۔ وفات ۲۰۴ھ) نے اپنی مشہور کتاب (کتاب الام) میں ایک گروہ سے اپنے ایک مناظرے کی روئداد لکھی ہے۔
ہیں وہ منکرین حدیث کہتے ہیں۔

نیز یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ گذشتہ صفحات میں جن مختلف گروہوں کا میں نے ذکر کیا ہے۔ یہ اہل سنت والجماعت کے مختلف الخیال
وہ ہیں جو جمہور مسلمان کہلاتے ہیں۔ ان میں مخصوص معتقدات کے فرقے مثلاً اہل شیعہ یا مرزائی شامل نہیں)

حدیث کے متعلق جو مباحث تمہارے سامنے آ چکے ہیں۔ ان سے تم نے سلیم! اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اس عقیدہ کو محض نظری طور پر
متفق علیہ کہا جا سکتا ہے کہ حدیث قوانین شریعت کا ماخذ ہے۔ ورنہ عملاً آج تک متفقہ طور پر متعین ہی نہیں ہو سکا کہ کونسی احادیث
انین شریعت کا ماخذ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان حضرات سے یہ سوال کیا جائے تو اُس کے متعین، واضح اور قطعی جواب سے ہمیشہ پہلو
یا کرتے ہیں۔ اور "کتاب و سنت" کی غیر متعین اصطلاح سے آگے نہیں بڑھتے۔ اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ جو تصریح ایک گروہ پیش کریگا
دوسرے کے نزدیک قابل قبول نہیں ہوگی۔ آج تک تو یہ معاملہ مساجد اور مدارس کی چار دیواری تک محدود تھا۔ اس لئے کہ وہاں ہر گروہ
نے اپنے مسلک کو حق قرار دیتا اور اس کی تبلیغ کرتا تھا۔ لیکن اب جب یہ سوال سامنے آیا کہ "ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف
نہیں ہوگا" تو لازماً یہ سوال بھی سامنے آنا چاہیئے تھا کہ سنت سے مراد کیا ہے۔ اس کے لئے دشواری یہ تھی کہ اس کا جو جواب ایک گروہ
دے وہ دوسرے گروہ کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ اس کا جواب ہی نہ دیا جائے۔ لیکن
سلیم! تم سوچو کہ عملی دنیا میں کسی سوال کے جواب سے چشم پوشی کرنے سے کیسے کام چل سکتا ہے؟ اس سوال کا تعلق مملکت کی قانون
سازی سے ہے۔ شخصی معاملات کی حد تک تو یہ کر لیا گیا ہے کہ کتاب و سنت کی وہی تعبیر صحیح تسلیم کی جائے گی جو اس فرقے کے نزدیک
قابل قبول ہوگی۔ لیکن جس معاملہ کا تعلق پورے ملک سے ہوگا۔ اس میں تو کتاب و سنت کی ایک ہی تعبیر قابل عمل ہوگی! سوچو کہ اس
مقام پر کیا ہوگا؟

میں نے اس تفصیلی گفتگو کی ضرورت اس لئے سمجھی ہے کہ تم نے اپنے سوال کو اسی ضمن میں پوچھا ہے۔ بہرحال اب آگے بڑھو۔

قرآن قوانینِ شریعت کا چوتھا اور آخری ماخذ قرآن کریم ہے۔ تم یہ سمجھتے ہوگے کہ کم از کم قرآن کی حد تک تو تمام مسلمان (کم از کم سنّی مسلمان) متفق ہوں گے۔ لیکن واقعتہً ایسا نہیں۔ ہماری بدقسمتی کی حد یہ ہے کہ ہمارے ہاں کتاب اللہ بھی اختلا عقائد سے بلند نہیں رہی۔ یہ اختلافات مختصر الفاظ میں حسب ذیل ہیں۔

(۱) ایک گروہ کا کہنا ہے کہ قرآن میں بہت سی آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہے۔ انہیں ثواب کی خاطر پڑھا جاتا ہے۔ لیکن دو گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اس میں کوئی آیت منسوخ نہیں۔ ہر آیت اپنے مقام پر واجب العمل ہے۔

(۲) ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ ایسی آیات بھی ہیں جن پر عمل تو ہوتا ہے۔ لیکن وہ قرآن کے اندر موجود نہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس قسم کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں وحی پر مبنی ہیں۔ حدیث قرآن کے مجمل احکام کی تفصیل بیان کرتی ہے۔ دوسرے گروہ کا یہ کہنا ہے کہ وحی صرف قرآن کے اندر ہے۔ احادیث، رسول اللہ کی خود متعین فرمودہ تفاصیل ہیں۔

(۴) ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ احادیث قرآنی آیات کو منسوخ کر سکتی ہیں۔ اس لئے کہ احادیث بھی قرآن کی طرح وحی پر مبنی ہیں۔ اسی طرح اگر کسی معاملہ میں قرآن اور حدیث میں تضاد نظر آئے تو حدیث کے فیصلہ کو ترجیح دی جائے گی۔ لیکن دوسرا گروہ اس عقیدہ کو صحیح نہیں سمجھتا۔

(۵) احکام کے علاوہ قرآن کی دیگر آیات کے متعلق بھی ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ ان کا جو مفہوم روایات میں بیان ہوا ہے وہی مفہوم صحیح اور حرف آخر ہے۔ اس سے کوئی الگ مفہوم لیا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ جوں جوں زمانہ علم و انکشافات میں آگے بڑھتا جائے گا، قرآن کے معانی کھلتے چلے جائیں گے۔ اس لئے اس میں ہر زمانہ میں تفکر و تدبر کی ضرورت ہے۔

(۶) ایک گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآنی احکام کی جو تفاصیل فقہ کی کتابوں میں آچکی ہیں۔ وہی تفاصیل قابلِ قبول اور قیامت تک کے لئے واجب العمل ہیں۔ دوسرا گروہ اس عقیدے سے اختلاف رکھتا ہے۔

(۷) چونکہ "اہل قرآن" کا ذکر پہلے آچکا ہے اس لئے ان کے اس عقیدہ کا دہرا دینا بھی ضروری ہے کہ تمام معاملات کی جملہ تفاصیل قرآن کے اندر آچکی ہیں۔ اس لئے قرآنی احکام کی تفاصیل کے لئے کسی اور طرف رجوع کرنا صحیح نہیں۔

ان تصریحات سے تم اندازہ کر لو سلیم! کہ یہ عقیدہ کہ "قرآن قوانینِ شریعت کا ماخذ ہے" جب عملی آئینہ میں دیکھا جائے تو اس کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔!

صحیح مفہوم اس وقت تک سلیم! میں نے یہ بتایا ہے کہ اس مسئلہ کی حقیقت کیا ہے کہ قوانینِ شریعت کے چار ماخذ ہیں۔ قرآن حدیث اجماع اور قیاس اور ان اربعہ عناصر کا مروجہ مفہوم کیا ہے۔ اب میں تمہیں یہ بتاؤں گا کہ جہاں تک میری قرآنی بصیرت

اہنمائی کرتی ہے۔ اس مسئلہ کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اور اس کے اجزائے ترکیبی کا ٹھیک ٹھیک مقام کیا۔ ذرا غور سے سنئے کہ اس کا سلامی قوانین شریعت کے ایک ایسے بنیادی سوال سے ہے جس کے صحیح حل کے سامنے نہ ہونے سے امت اس قدر ذہنی انتشار اور نشار میں، مبتلا رہی ہے اور اب بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے۔ جس سے وہ زندگی کے معاملات کے فیصلے کرتا ہے۔ لیکن جب دو انسانوں کے مفاد میں ن تصادم ہوتا ہے تو ہر ایک کی عقل اپنے حق میں فیصلہ دیتی ہے۔ یہی چیز دو افراد سے آگے بڑھ کر دو گروہوں میں۔ اور پھر دو قوموں باہو جاتی ہے۔ اور قوموں سے آگے بڑھ کر اقوام کے مخالف جتھوں میں۔ اس قسم کے معاملات کے تصفیہ کے لئے، اور یہ بتلانے کے نسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ اور اس کا نصب العین کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ راہنمائی دی ہے۔ یہ راہنمائی اپنی اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے۔ اور اس سے باہر کہیں نہیں۔ قرآن کی راہنمائی چونکہ تمام دنیا کے انسانوں کے لئے ام زمانوں کے لئے ہے۔ اس لئے اس میں (چند مستثنیات کو چھوڑ کر) صرف اصول بیان کئے گئے ہیں۔ تاکہ ہر دور کے انسان پنے زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے ان اصولوں کی روشنی میں اپنے مسائل کا حل خود متعین کرتے رہیں۔

ان جزئیات کے متعین کرنے کے طریق کے متعلق بھی قرآن نے راہنمائی دیدی ہے۔ اور وہ یہ کہ امت باہمی مشورہ سے اس اہم فریضہ کو بام دے۔ اس طریق پر سب سے پہلے رسول اللہؐ نے عمل فرمایا (واضح رہے کہ قرآن نے رسول اللہ کو خصوصیت سے اس کی تاکید کی تھی) حضور کے بعد آپ کے خلفاء (جانشینوں) نے ایسا ہی کیا۔ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ رسول اللہؐ نے قرآن کے اصولوں کے مطابق ایک حکومت لی تھی۔ اور یہی حکومت آپ کے جانشینوں کی طرف منتقل ہوئی تھی۔ اس تصور کے ماتحت یہ حقیقت تمہاری سمجھ میں آجائے گی کہ کوئی ت اپنی پیشرو حکومت کی سنت (طرز عمل) سے مستغنی ہو نہیں سکتی۔ جب کوئی حکومت مسلسل قائم رہے تو سابقہ حکومتوں کے فیصلے لی حکومتوں میں مسلسل نافذ العمل رہتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ہر نیا حاکم، سابقہ حاکم کے فیصلوں کو منسوخ کر کے تمام احکام از سرنو ی کرے۔ ایک نئی حکومت جو سابقہ حکومت کا تختہ الٹ کر قائم ہو، اس طرح کرتی ہے، لیکن ایک ہی انداز کی حکومت سابقہ وں کو علی حالہ قائم رکھتی ہے تاوقتیکہ ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت پڑ جائے۔ اس وقت وہ اس میں مناسب تبدیلی کر دیتی ۔ بعینہٖ یہی انداز ہے جسے ہم رسول اللہؐ کے خلفا کے زمانے میں دیکھتے ہیں۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ حضورؐ کے جانشین (خلیفہ) ہوئے تو آپ نے اعلان کیا کہ میں قرآن کریم اور سنت رسول اللہؐ کی اتباع کروں گا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میں کسی نئی حکومت طرح نہیں ڈال رہا۔ میری حکومت سابقہ حکومت ہی کا تسلسل ہے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں سنت رسول اللہؐ اور ت حضرت ابوبکرؓ کی اتباع کروں گا۔ اس سے بھی مقصود وہی تھا۔

اس حد تک تو بات صاف ہے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حضرات کو اگر کسی سابقہ فیصلے میں تبدیلی کی ضرورت س ہوئی تو کیا انہوں نے ایسی تبدیلی کی؟ تاریخ میں ہمیں سلیم! متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں جن میں حضرت عمرؓ نے عہد رسالتمآب فیصلوں میں اور عہد صدیقیؓ کے فیصلوں میں ضروری تبدیلیاں کیں۔ اس طرح یہ سلسلہ ماضی سے وابستہ بھی رہا اور زمانے کے بدلتے

ہوئے تقاضوں کا ساتھ بھی دیتا چلا گیا۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے کوئی قوم جو تسلسل حیات چاہتی ہے۔ اپنے ماضی سے اپنے آپ کو بیگانہ نہیں کر سکتی۔ لیکن ماضی سے وابستہ رہنا اور بات ہے اور ماضی کی زنجیروں میں جکڑے رہنا اور بات۔ ماضی سے وابستہ رہنے کا مفہوم یہ کہ ہم اپنے سابقہ ادوار کے تجربوں سے مستفید ہوتے رہیں۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ جہاں زمانے کے تقاضے کسی تبدیلی کے متقاضی وہ تبدیلی بھی روا نہ رکھی جائے۔ یاد رکھو سلیم! غیر متبدل صرف وہ راہ نمائی ہے جسے خدا نے ہمیشہ کے لئے اور تمام نوع انسانی کے لئے شمع راہ بنایا ہے۔ اس راہ نمائی کا مقصود یہ ہے کہ انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما کر کے انہیں تکمیل تک پہنچایا جائے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انہیں مواقع بہم پہنچائے جائیں تاکہ وہ علم و بصیرت اور غور و تدبر سے زمانہ کے بڑھتے اور بدلتے ہوئے تقاضوں کا حل تلاش کریں۔ اگر انہیں زندگی کے ہر مسئلہ کے متعلق بنے بنائے قوانین دیدیئے جائیں اور انہیں قیامت تک کے لئے غیر متبدل قرار دیدیا جائے تو انہیں اپنی فکری صلاحیتوں کی نشو و نما کا موقع کہاں ملے گا؟ نبوت کا دروازہ بند کرنے سے مقصد ہی یہ تھا کہ ذہن انسانی کی کھڑکیاں کھول دی جائیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں سلیم! ایک مرتبہ پھر اس نقشے کو سامنے لاؤ جس کے مطابق عہد رسالتمآبؐ اور عہد خلفاء راشدین میں معاملات زندگی کے متعلق فیصلے مرتب اور صادر ہوتے تھے۔ اس نقشہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ

(۱) رسول اللہؐ کے زمانے میں جب کوئی معاملہ پیش ہوتا تو یہ دیکھا جاتا کہ قرآن کریم نے اس کے متعلق کیا ہدایت دی ہے۔ اس ہدایت کی روشنی میں حضورؐ اپنے صحابہؓ کے مشورے سے معاملہ کی جزئیات طے فرماتے۔

(۲) حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں جب کوئی معاملہ پیش ہوتا تو دیکھا جاتا کہ حضورؐ کے زمانہ میں اس کے متعلق کوئی فیصلہ ہوا تھا۔ اگر کوئی فیصلہ موجود ہوتا تو اسے اختیار کر لیا جاتا۔ ورنہ طریق بالا کے مطابق اس کی جزئیات خود طے کر لی جاتیں۔ اس کا نام اتباعِ کتاب و سنت تھا۔

(۳) یہی انداز حضرت عمرؓ کے زمانہ میں رہا۔ اس میں رسول اللہؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے کے فیصلوں کی طرف رجوع کیا جاتا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ بڑھا۔ دوسری قوموں سے ربط و ضبط پیدا ہوا۔ معاملات کی نوعیت بدل گئی۔ بعض حالات میں تغیر واقع ہو گیا۔ اس لئے آپ کو بکثرت نئے فیصلے بھی کرنے پڑے اور کئی ایک سابقہ فیصلوں میں ترمیمات بھی کرنی پڑیں۔

تم نے دیکھا سلیم! کہ اس اندازِ حکومت میں کس طرح قرآن، سنت، اجماع اور قیاس چاروں اپنے اپنے مقام پر آ جاتے ہیں۔ کتاب اللہ کی اصولی راہ نمائی۔ سابقہ حکومت کے فیصلے (سنت) ان کی روشنی میں نئے معاملات کے لئے از روئے قیاس نئے فیصلے یا سابقہ فیصلوں میں تبدیلی اور مشاورتی نظام کے ماتحت ان فیصلوں کا اجراء (اجماع) یہ تھا اس وقت صحیح مفہوم کتاب و سنت، اجماع اور قیاس کا۔

جیسا کہ میں سلیم! پہلے بھی لکھ چکا ہوں جب ایک اندازِ حکومت مسلسل آگے چلتی جائے۔ تو اس میں سابقہ فیصلوں سے مستغنی ہوا ہی نہیں جا سکتا۔ اس میں سابقہ فیصلے بھی ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان میں نئے فیصلوں کا اضافہ بھی ہوتا جاتا ہے۔ اور عند الضرورت سابقہ فیصلوں میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اگر خلافت علیٰ منہاج نبوت کا سلسلہ بدستور جاری رہتا تو حکومت کا یہی نقشہ آگے بڑھتا چلا جاتا۔ لیکن

نبی سے ایسا نہ ہوا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی حکومت تو آگے چلی لیکن اس کا انداز مختلف ہو گیا۔ یہی انداز مختلف اسلامی ممالک میں اس وقت تک چلا جا رہا ہے۔ اب اگر کسی خطۂ زمین کے مسلمان چاہیں کہ اپنے ہاں اسی پہلے انداز کی حکومت (خلافت علیٰ منہاج نبوت) قائم کریں تو ان کے ہاں قانون سازی کی وہی صورت پیدا ہو جائے گی۔ جو اس زمانہ میں تھی۔ اس میں کتاب اللہ کی راہ نمائی کو مستقلاً سامنے رکھا جائے گا۔ پھر یہ دیکھا جائے گا کہ معاملہ پیش نظر کے لئے سابقہ دور کے تاریخی نوشتوں میں کوئی نظائر (PRECEDENTS) ملتے ہیں یا نہیں۔ اگر ملتے ہوں اور زمانہ کے اتنے بُعد کے باوجود ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہو تو انہیں علیٰ حالہٖ اختیار (ADOPT) کر لیا جائے گا۔ اگر ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوگی تو تغیر حالات پر قیاس کر کے مناسب تبدیلی سے اسے (ADAPT) کر لیا جائے گا۔ یا عند الضرورت کوئی نیا فیصلہ کر لیا جائے گا۔ اور جب اس فیصلہ کو مرکز ملت (نظام یا حکومت) کی طرف سے نافذ کیا جائیگا تو اس پر سب کا اجماع بھی ہوگا۔ یہ عملی مفہوم ہوگا سلیم! کتاب، سنت، اجماع اور قیاس کا۔ اس میں تم دیکھو گے کہ نہ کسی قسم کی کوئی الجھن پیش آتی ہے نہ سلوٹ۔ نہ فرقہ بندی کی گنجائش رہتی ہے نہ مختلف فقہی مذاہب کی ضرورت۔ سب کی راہ نمائی کے لئے ایک کتاب۔ نمائندگان ملت پر مشتمل ایک پارلیمان جو قیاس اور اجتہاد کے فرائض سرانجام دے۔ اس نظام کے مرکز کی طرف سے جاری شدہ فیصلے سب کے لئے واجب التسلیم! اور ثبات و تغیر کے اس حسین امتزاج کو لئے ہوئے اسلامی نظام امت کا رواں دواں آگے بڑھتے جانا۔

تصریحات بالا سے تم نے دیکھ لیا ہوگا سلیم! کہ جہاں تک قانونِ شریعت کے ماخذ کا تعلق ہے۔ اس کا درحقیقت ماخذ ایک ہی ہے یعنی کتاب اللہ۔ باقی تینوں شقیں دراصل قانون کی تدوین یا تنفیذ کے طریقے ہیں۔ کتاب اللہ کی روشنی میں کئے ہوئے سابقہ فیصلوں کو علیٰ حالہٖ نافذ کر دینا، اتباع سنت کہلائے گا۔ نئے معاملات پر غور و خوض کرنا اجتہاد یا قیاس ہوگا۔ اور امت کے مشورے سے فیصلوں تک پہنچنا اور انہیں نافذ کرنا اجماع کہلائے گا۔ لہٰذا اسلامی قانونِ شریعت کا ماخذ صرف قرآن ہے۔ اور یہی مفہوم ہے حسبنا کتاب اللہ کا۔ والسلام۔

پرویز

مجلسِ اقبال

مثنوی اسرارِ خودی

باب نہم۔ خودی کی تربیت کے تین مراحل

اطاعت۔ ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، مثنوی اسرارِ خودی کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ انسانی خودی کی نشوونما کیسے ہوتی ہے۔ اس میں استحکام وثبات کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ زیرِ نظر باب میں علامہ اقبال نے اس کی تربیت (نشوونما اور تکمیل تک پہنچنے کے) تین مراحل بیان کئے ہیں۔ ان کا پہلا مرحلہ اطاعت ہے۔ یہ سوال بہت اہم ہے۔

ہم شروع میں بیان کر چکے ہیں کہ خودی کی بنیادی خصوصیت آزادی (FREEDOM) ہے جوں جوں خودی کی تربیت ہوتی جاتی ہے۔ اس میں آزادی کا عنصر بڑھتا جاتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ جس قدر خودی آزاد ہوگی۔ اسی قدر اسے نشوونما یافتہ سمجھا جائے گا یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خودی کی بنیادی خصوصیت آزادی ہے۔ تو پھر اطاعت کیسی؟ آزادی اور اطاعت باہمد گر نقیض ہیں جو آزاد ہے۔ وہ کسی کا مطیع وفرماں پذیر نہیں۔ جو کسی کا مطیع ہے۔ وہ آزاد نہیں۔ لہٰذا یہ دو متضاد تصور ہیں۔

لیکن یہ متضاد تصور نہیں۔ اس میں جو ذہنی اشکال (CONFUSION) پیدا ہوتا ہے۔ وہ اطاعت کے صحیح مفہوم کے سامنے نہ ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک اطاعت یہ ہے کہ کسی فرد کا اپنا ارادہ واختیار کچھ نہیں۔ وہ ایک مشین (AUTOMATON) کی طرح ہے۔ دوسرا شخص جو حکم دیتا ہے۔ وہ اس کی تعمیل کرتا ہے۔ اسے اس سے کچھ غرض نہیں کہ اس حکم کا مطلب کیا ہے یا مصلحت کیا۔ جس طرح ایک مشین کے سامنے کوئی مقصد (PURPOSE) نہیں ہوتا۔ وہ مشین چلانے والے کے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ مشینی انسان بھی اپنے سامنے زندگی کا کوئی اپنا مقصد نہیں رکھتا۔ وہ دوسرے انسان کے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے اس اطاعت کو اطاعت نہیں بلکہ غلامی کہتے ہیں۔ یعنی ایسی زندگی جس میں ایک انسان کسی دوسرے انسان کا آلۂ کار (RUMENT

بن کررہ جاتا ہے۔ قرآن اس غلامی کو انسانیت کی سب سے بڑی لعنت قرار دیتا ہے۔ اور واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ اس کے نزول کا مقصد نوع انسانی سے اس لعنت کو دور کرنا ہے۔

اطاعت کے دوسرے (اور صحیح) مفہوم کے لئے یوں سمجھئے کہ (مثلاً) ڈاکٹر نسخہ دیتے وقت آپ سے کہتا ہے کہ دوائی یوں استعمال کرنا اور اتنے دنوں فلاں فلاں چیز بالکل نہ کھانا۔ آپ اس کے اس "حکم" کی تعمیل کرتے ہیں۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ اس "تعمیل حکم" میں اور پہلی قسم کی فرماں پذیری میں کس قدر فرق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو ڈاکٹر کے اس "حکم" کو حکم کہا جائے گا۔ نہ آپ کے اس تعمیل کو فرماں پذیری۔ ڈاکٹر آپ کو ہدایات دیتا ہے۔ اور آپ ان کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

یا اس سے بھی آگے بڑھیے۔ آپ از خود فیصلہ کرتے ہیں کہ مجھے علی الصبح سورج نکلنے سے بہت پہلے اٹھنا اور روزانہ سیر کے لئے جانا چاہیئے۔ اس کے بعد آپ اپنے اس فیصلہ پر کاربند رہتے ہیں اور روزانہ اس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

یا مثلاً آپ فیصلہ کرتے ہیں کہ میرے سامنے جب بھی کوئی معاملہ آئے گا۔ میں اس کا فیصلہ ہمیشہ انصاف کے ساتھ کیا کروں گا۔ اس کے بعد آپ اس اصول پر شدت سے کاربند رہتے ہیں۔

ان مثالوں میں آپ نے دیکھا کہ ان تمام امور میں آپ "اطاعت" کرتے ہیں۔ لیکن یہ اطاعت کسی دوسرے کے حکم کی نہیں۔ بلکہ کسی اصول یا قانون کی اطاعت ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ ان پابندیوں کی اطاعت ہے جنہیں آپ نے از خود اپنے دل کی مرضی اور اختیار سے اپنے آپ پر عائد کر رکھا ہے۔ یہ سب کچھ آپ بطیب خاطر کرتے ہیں۔ طوعاً کرتے ہیں (کرھاً نہیں کرتے) طوعاً اور اطاعت کے معنی بنیادی طور پر ایک ہی ہیں۔ یعنی اطاعت کے معنی "اپنے دل کے اختیار و ارادہ سے (بطیب خاطر) کسی اصول یا قانون کی اتباع ہے۔ یہ ہے اطاعت کا صحیح مفہوم آپ نے دیکھا کہ اس میں انسان کی آزادی سلب نہیں ہوتی۔ وہ کسی کا غلام اور تابع فرمان نہیں بنتا۔ وہ اپنی پوری آزادی سے اپنے اوپر ایک پابندی عائد کرتا ہے۔ اور پھر اس پر کاربند رہتا ہے۔ یعنی غلامی، دوسرے انسان کے احکام کی تابعداری کا نام ہے۔ اور اطاعت کسی اصول یا قانون کی از خود اتباع کا نام۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خودی کی تربیت کے لئے اس قسم کی اطاعت کیوں ضروری ہے۔ اس کا جواب آسان ہے دنیا میں تعمیری نتائج وہی قوتیں پیدا کرتی ہیں۔ جو کسی قاعدے اور ضابطے، اصول اور آئین کے ماتحت صرف کی جائیں۔ پانی اگر ساحلوں کے اندر بہتا ہے تو اس سے ہزار قسم کی نفع بخشیوں کا کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہی پانی جب ساحل کو توڑ کر بے محابا بہنے لگ جائے تو اسے سیلاب کہا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ چونکہ انسانی ذات کی تعمیر، تربیت اور استحکام کے لئے اصول یہ مقرر کیا گیا ہے کہ انسان جس قدر ایسے کام کریگا جو نوع انسانی کے لئے نفع بخش ہوں۔ اسی قدر اس کی ذات کی نشوونما ہوگی۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کی قوتیں، سرکش اور بیباک نہ رہیں، بلکہ اصول و آئین کے ساحلوں کے اندر مصروف عمل رہیں۔ لہٰذا انسان جس قدر اپنے اوپر پابندی عائد کرتا جائے گا۔ اور اس طرح اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو صحیح ساحلوں کے اندر رکھتا ہوا آگے بڑھتا جائے گا۔ اسی قدر اس کی خودی کو آزادی نصیب ہوتی جائے گی۔ اور اس کے اختیارات کی حدیں وسیع سے وسیع تر ہوتی جائیں گی۔ اس طرح جبر سے اختیار پیدا

ہوتا جائے گا۔

یہ ہے وہ حقیقت جسے علامہ اقبال نے زیر نظر باب میں اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ سب سے پہلے وہ "مرحلہ اطاعت" کے زیر عنوان ایک مثال سے آغاز سخن کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

خدمت و محنت شعار اشتر است
صبر و استقلال کار اشتر است

تم اونٹ کو دیکھو کہ اس کا شعار زندگی اور اسلوب حیات محنت اور خدمت ہے۔ اور اس روش میں وہ اس قدر استقامت اور استقلال سے لگا رہتا ہے کہ یہ چیز ضرب المثل بن گئی ہے۔

گام او در راہ کم غوغاستے
کارواں را زورقِ صحراستے

وہ سفر حیات میں نہایت خاموشی سے چلے جاتا ہے۔ اس کے پاؤں کی آہٹ بھی کسی کو سنائی نہیں دیتی۔ ندی کی پرسکوت سطح کی طرح خاموش۔ لیکن ہمیشہ محوِ خرام۔ ایسے جیسے دریا میں کشتی چلی جا رہی ہو۔ اس لئے اہل قافلہ اسے صحرا کا جہاز (SHIP OF THE DESERT) کہتے ہیں۔

نقش پایش قسمتِ ہر بیشۂ
کم خور، کم خواب و محنت پیشۂ

کون سا صحرا اور بیابان ایسا ہے جس کی قسمت میں اس کا نقشِ پا نہیں لکھا! اس کے پاؤں کا نشان ہر بیابان کی پیشانی پر ہے۔ بہت کم کھانے والا۔ بہت کم سونے والا۔ ہمیشہ مصروف سفر۔

مست زیر بارِ محمل می رود
پائے کوبان سمتِ منزل می رود

محمل کا بوجھ پشت پر لادے، ایں و آں سے بے خبر، اپنی رفتار کی مستی میں گم، منزل کی طرف رواں دواں چلا جاتا ہے۔

سرخوش از کیفیتِ رفتارِ خویش
در سفر صابر تر از اسوارِ خویش

اسے خود اپنی رفتار کی کیفیت سے ایسا نشہ حاصل ہوتا ہے کہ اس کی لذت اسے تکان محسوس نہیں ہونے دیتی۔ وہ اپنا صلہ کہیں خارج سے نہیں چاہتا۔ اس کی رفتار کی لذت اس کے لئے خود صلہ بن جاتی ہے۔ اور اسی لئے سفر میں وہ اپنے سوار سے بھی زیادہ صابر ہوتا ہے۔

اونٹ کو یہ سب کچھ اس لئے حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے فرائض کی سرانجام دہی سے کبھی منہ نہیں موڑتا۔ اور یہی چیز اسے

پہنچا دیتی ہے لہٰذا

تو ہم از بار فرائض سر متاب
برخوری از عندہ حسن المآب

ی چاہیے کہ اسی روش کو اختیار کرے۔ اور اپنی ذمہ داریوں کی سرانجام دہی سے پہلو تہی نہ کرے۔ اگر تو نے ایسا کیا تو یقیناً
ی کی بہترین خوشگوار منزل تک پہنچ جائے گا۔ تیرا انجام سفر نہایت حسین و شادکام ہوگا۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار

غفلت شعار! تو آئین و اصول کی اطاعت میں پوری پوری کوشش کر۔ تم اس اصول سے باخبر نہیں ہو کہ حقیقی اختیار اپنے اوپر
یاں عاید کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ پابندیوں کے بغیر آزادی اختیار نہیں بلکہ بے باکی اور سرکشی بن جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ
اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

ناکس از فرمان پذیری کس شود
آتش ار باشد ز طغیان خس شود

نااہل بھی اطاعت کی زندگی بسر کرنا شروع کردے تو اس کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ وہ سزاوار تعظیم و تکریم اور درخور
ستائش بن جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ اصول و آئین سے سرکشی اختیار کرلے تو اس کی آتش سوزاں کی سی توانائیاں خس و خاشاک
بیرن کردہ جاتی ہیں۔

ہر کہ تسخیر مہ و پرویں کند
خویش را زنجیری آئین کند

دیکھیے! چاند، سورج، ستاروں کو وہی مسخر کرسکتا ہے جو پہلے اپنے آپ کو آئین کا پابند کرلے۔ آئین و اصول کی پابندی سے
نانی قوتوں میں اس قدر ارتکاز پیدا ہو جاتا ہے کہ خارجی کائنات کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

باد را زندان گل خوشبو کند
قید بو را نافۂ آہو کند

ام ہوا اگر کچھ وقت کے لیے پھول کے اندر پابند ہو کر رہ جائے تو وہ خوشبو بن جاتی ہے۔ اور اگر خوشبو نافۂ آہو کے اندر مقید
ہو جائے تو وہ رفتہ رفتہ مشک بن جاتی ہے۔

می زند اختر سوئے منزل قدم
پیش آئینے سر تسلیم خم

ئنات کا ایک ایک ذرہ آئین کا پابند ہے ـــــ کیا مرغ و ماہی کیا چاند تارے۔ اجرام فلکی جو ان ناپید اکنار فضا کی وسعتوں میں
س طرح تیرتے پھرتے ہیں. مصروف آوارگی نہیں۔ ان کے سامنے ایک منزلِ مقصود ہے۔ اور ان میں سے ہر ایک اس منزل کی طرف
شاں کشاں چلا جا رہا ہے۔ یہ تمام نظم دلنشیں اس حسن و خوبی کے ساتھ اس لئے چل رہا ہے کہ ان میں سے ہر ایک قانون اور
ئین کا پابند ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک ثانیہ کے لئے بھی آئین کی پابندی سے آزاد ہو جائے تو یہ تمام سلسلۂ کائنات
درہم برہم ہو جائے۔

سبزہ بر دین نمو روئیدہ است
پائمال از ترک آں گردیدہ است

م دیکھتے ہو کہ خشک مٹی سے کس طرح لہلہاتا سبزہ اُگ کھڑا ہوتا ہے! یہ کس طرح ہوتا ہے؟ محض قانون کی پابندی سے فطرت
نے ہر شے کی نشو و نما کے لئے ایک قانون مقرر کر رکھا ہے۔ جب سبزہ اس قانون کی اتباع کرتا ہے تو اس میں روئیدگی پیدا ہو جاتی
ہے۔ جب وہ اس کی پابندی چھوڑ دیتا ہے تو خس و خاشاک میں تبدیل ہو جاتا ہے جسے ہوا کے جھونکے ادھر ادھر لئے پھرتے ہیں اور
س طرح وہ گلیوں کے روندے ہوئے تنکوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

لالہ ہم سوختن قانونِ او
بر جہد اندر رگِ او خونِ او

ل لالہ کے لئے قانونِ حیات یہ ہے کہ وہ اپنے سینے کی آگ کو ہر وقت روشن رکھے۔ اس کے لئے اس کی رگوں میں خون زندگی ہر
وقت متحرک اور موجزن رہتا ہے۔ اس جہد و سوز کا نام لالہ کی رنگینی ہے۔

قطرہ ہا دریاست از آئینِ وصل
ذرہ ہا صحراست از آئینِ وصل

پانی کے قطرے الگ الگ رہیں تو انہیں دریا نہیں کہا جاتا۔ وہ دریا کی شکل اس وقت اختیار کرتے ہیں جب قانونِ اتصال
(ایک دوسرے سے ملنے کے قانون کی اتباع) سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ چلتے اور آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ اسی طرح
ریت کے منتشر ذروں کو صحرا نہیں کہا جاتا۔ ذرے صحرا میں اس وقت تبدیل ہوتے ہیں۔ جب وہ اپنا تشتت و انتشار چھوڑ کر ایک
دوسرے کے ساتھ رہنے کے قانون کی اتباع کرتے ہیں غرضیکہ

باطنِ ہر شے ز آئینے قوی
تو چرا غافل ز ایں ساماں روی

کائنات کی ہر شے کی اندرونی قوت کا اندازہ اس میں ہے کہ وہ آئین و قانون کی پابند ہے۔ لہٰذا جب کائنات کی ہر شے کا مسلکِ زندگی
یہ ہے تو تو اس تقویت بخش ساز و سامانِ حیات سے کیوں غافل ہے! تو کیوں آئین کی پابندی نہیں کرتا! تجھ میں اور کائنات کی دیگر

اشیاء میں فرق یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے آئین کی پابندی نہیں کرتیں۔ انھیں اس پابندی کے لئے مجبور پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو آئین کی پابندی اختیار کرے اور چاہے تو اس سے سرکشی اختیار کرے۔ اگر وہ اس سے سرکشی اختیار کرے گا، تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوگا۔ لیکن اگر وہ اس کی پابندی اختیار کرے گا۔ تو اس کی زندگی کامیابیوں اور کامرانیوں کی جنتی زندگی ہوگی۔ لہٰذہ

باز اے آزادِ دستورِ قدیم
زینتِ پا کن ہماں زنجیرِ سیم

اس مقام پر حضرت علامہ مسلمان سے کہتے ہیں کہ تو نے اس دستورِ قدیم کی پابندی چھوڑ دی ہے جس نے عربوں جیسی بادیہ نشین قوم کو دیکھتے ہی دیکھتے قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت کا وارث بنا دیا تھا۔ تو نے اس آئین کی پابندی چھوڑ دی جسے نبی اکرمؐ کی وساطت سے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے دیا گیا تھا۔ اور جو فرد کی ذات کی تکمیل اور نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا ضامن تھا۔ اگر تو چاہتا ہے کہ دنیا میں تجھے پھر سے وہی مقامِ امامتِ امم حاصل ہو جائے تو اس کا ایک ہی طریق ہے۔ اور وہ یہ کہ تو پھر اسی آئین کا پابند ہو جا۔ اور اس طرح دنیا بھر کی غلامی کی زنجیروں سے اپنے آپ کو آزاد کرلے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ایک آئینِ خداوندی کی پابندی، ہزاروں انسانوں کی غلامی سے چھڑا دیتی ہے۔ لیکن آئین کی یہ پابندی، بطیبِ خاطر ہونی چاہیئے دل کے پورے جذبہ کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ اس میں کسی قسم کی گرانی اور ناگواری محسوس نہیں ہونی چاہیئے۔ اگر گرانی و ناگواری ہوگی تو وہ اطاعت نہیں رہے گی۔ غلامی اور محکومی بن جائے گی۔ لہٰذا

شکوہ سنج سختیٔ آئیں مشو
از حدودِ مصطفےٰؐ بیروں مشو

اس کی کبھی شکایت نہ کر کہ آئین و قوانین سخت ہیں۔ یہ سخت اس وقت تک محسوس ہوں گے۔ جب تک تو ان کی پابندی مجبوراً اختیار کرے گا۔ جب ان کی اطاعت کا جذبہ تیرے دل کی گہرائیوں سے ابھرے گا۔ تو ان کی پابندی تیرے لئے عین حیات بن جائیگی۔

مرحلۂ دوم۔ ضبطِ نفس

اس کے بعد علامہ اقبال تربیتِ خودی کے دوسرے مرحلہ کو سامنے لاتے ہیں۔ یہ ہے ضبطِ نفس۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم اطاعت کے اس مفہوم کو سامنے رکھیں، جس کا ذکر ابتدائے باب میں کیا گیا ہے۔ تو ضبطِ نفس خود اس کے اندر آجاتا ہے۔ ہم نے بتایا؟

۔ اطاعت کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے اختیار و ارادہ اور دل کی رضامندی سے اپنے اوپر آپ پابندیاں عائد کرے۔ اور پھر ان پابندیوں پر استقامت سے کاربند رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کچھ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان اپنے آپ پر ضبط رکھے۔ اگر کسی نے اپنے آپ پر ضبط نہ رکھا تو وہ خود عائد کردہ قیود کی پابندی کر ہی نہیں سکے گا۔ مثلاً آپ نے سوتے وقت آپ نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ صبح سویرے اٹھ کر سیر کے لئے جائیں گے۔ جب صبح آپ کی آنکھ کھلی تو آپ نے دیکھا کہ باہر بہت سردی ہے اور نرم و گرم لحاف میں بڑی راحت۔ اگر آپ پر تن آسانی کا جذبہ غالب آگیا تو پھر آپ لحاف میں منہ لپیٹ کر سو جائیں گے۔ لیکن اگر آپ نے اپنے فیصلہ کی پابندی کو زیادہ اہمیت دی تو آپ ہزار سردی کے باوجود باہر نکل کھڑے ہوں گے۔

یا مثلاً آپ نے فیصلہ کیا کہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اس کے بعد آپ کے سامنے ایک ایسا کاروباری معاملہ آیا کہ جس میں اگر آپ تھوڑے سے جھوٹ سے کام لیں تو آپ کو ہزاروں روپیہ مفت میں مل جاتا ہے۔ دولت کی ہوس آپ کو آمادہ کرتی ہے کہ آپ جھوٹ بول دیں۔ اگر یہ ہوس آپ پر غالب آگئی تو آپ اصول پرست نہ رہے۔ لیکن اگر آپ نے آئین کی پابندی کو اہمیت دی تو آپ حصولِ دولت کے اس خیال کو جھٹک کر آگے نکل جائیں گے۔ اور اصول کو ہاتھ سے نہیں چھوڑیں گے۔ اس کا نام ضبطِ نفس ہے۔ یعنی ہر اس میلان و رجحان کا مقابلہ جو آپ کو اصول شکنی کی دعوت دے۔ اس سے خودی کا استحکام ہوتا ہے۔ خودی کے پرکھنے کا معیار ہی یہ ہے کہ آپ ان داخلی اور خارجی قوتوں کا کس حد تک مقابلہ کرتے ہیں جو آپ کو آئین شکنی پر آمادہ کرتی ہیں۔ ان داخلی قوتوں کو علامہ اقبال نے نفس سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اس لفظ کے خصوصی معنی ہیں۔ جن میں یہ عام طور پر تصوف کے لٹریچر میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے حقیقی معنی یہ نہیں۔ بہرحال، ان معانی کے پیشِ نظر علامہ اقبال کہتے ہیں کہ۔

نفسِ تو مثلِ شتر خود پرور است
خود پرست و خود سوار و خود سر است

تیرا نفس اونٹ (یا ہر حیوان) کی طرح اپنا پیٹ پالنے کی فکر میں ہی رہتا ہے۔ کسی دوسرے کا اسے خیال ہی نہیں آتا۔ اس کا مقصدِ حیات اپنی پرستش کرنا ہے۔ یہ خود اپنی مرضی کے مطابق چلنا چاہتا ہے۔ کسی آئین کے تابع نہیں رہنا چاہتا۔ اگر اسے قانون کی اطاعت کی طرف بلاؤ تو اس سے سرکشی برتتا ہے

اس میں خود پرور کا ٹکڑا بڑی معنی خیز ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ انسانی ذات کی نشوونما کا راز اس میں ہے کہ یہ دوسروں کی نشوونما کی فکر کس حد تک کرتا ہے اسے ربوبیت عامہ کہتے ہیں۔ لیکن انسانی عقل ہر فرد کو یہی تلقین کرتی ہے کہ تجھے اپنی فکر کرنی چاہیئے۔ یہ زندگی حیوانی سطح کی زندگی ہوتی ہے جس میں ہر حیوان صرف اپنی فکر کرتا ہے۔ اسی کو خود پروری کہتے ہیں۔ لیکن وہ آئینِ زندگی جو وحیٔ خداوندی پر مبنی ہے انسان سے یہ کہتا ہے کہ زندگی کا راز ربوبیت عامہ میں ہے۔ بقول اقبال

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر

وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ
در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

اس لئے ضروری ہے کہ عقلِ بےباک کو وحیِ خداوندی کے تابع رکھا جائے۔

مرد شو آور زمامِ او بکف
تا شوی گوہر اگر باشی خزف

تو ہمت مردانہ سے کام لے اور اس اشترِ خود پرور و خودسر کی مہار اپنے ہاتھ میں رکھ۔ اس طرح تیری خام خودی (جو کوڑی کے برابر بھی قیمت نہیں رکھتی) گوہرِ ارجمند میں تبدیل ہو جائے گی۔

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں
می شود فرماں پذیر از دیگراں

جو شخص اپنے نفس پر اپنا حکم نہیں چلاتا وہ ساری دنیا کا محکوم و غلام ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ پر اپنا حکم چلانے سے مطلب ہی یہ ہے کہ انسان اصول و آئین کی پابندی میں ضبطِ نفس سے کام لے۔

سوال یہ ہے کہ انسان نفس پروری کا مسلک اختیار کیوں کرتا ہے؟ اس لئے کہ اس کی عقل اسے قدم قدم پر یہ کہہ کر ڈراتی ہے کہ اگر تیرے پاس کچھ نہ رہا تو تو تباہ ہو جائے گا۔ اگر تو نے اپنی اولاد کے لئے جائدادیں نہ چھوڑیں تو وہ بھوکوں مر جائیں گے۔ اس لئے تجھے زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنی چاہیئے۔ یہ خوف کا جذبہ ہے جو انسان کو مفادِ خویش کا پرستار بنا دیتا ہے۔ اور اس کی نگاہ میں وسعت نہیں پیدا ہونے دیتا۔ اس کے ساتھ ہی مال و دولت اور زن و فرزند میں اتنی کشش و محبت ہے کہ انسان ان کی خاطر جائز و ناجائز سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ ان دونوں جذبات کو طلبِ منفعت اور دفعِ مضرت کہتے ہیں۔ ضرر رساں کا خوف اور نفع بخش کی کشش و محبت۔ چنانچہ علامہ کہتے ہیں۔

طرحِ تعمیرِ تو از گِل ریختند
با محبت خوف را آمیختند

انسان کا خمیر مٹی سے اٹھایا گیا ہے۔ اور اس میں محبت اور خوف کے جذبات پیوست کر کے رکھ دیئے گئے ہیں۔

خوفِ دنیا۔ خوفِ عقبےٰ۔ خوفِ جاں
خوفِ آلامِ زمین و آسماں

دنیا کا خوف، آخرت کا خوف، جان کا خوف۔ ارضی و سماوی بلاؤں کا خوف۔ ہر طرف سے خوف۔ دوسری طرف۔

حبِ مال و دولت و حبِ وطن
حبِ خویش و اقربا و حبِ زن

مال و دولت، وطن، زن و فرزند، اقربا اور خود اپنی ذات کی محبت۔ خوف اور محبت کے اس امتزاج کا نام انسان ہے۔

امتزاجِ ما و طین تن پرور است
کشتۂ فحشا و ہلاکِ منکر است

یہ حیوانی سطح کی زندگی، جس کا نام حیاتِ طبعی یا جسمِ انسانی ہے۔ تن پروری سکھاتی ہے۔ اس کی نگاہ جسم کی پرورش سے ہٹ نہیں سکتی۔ اس لئے ہر وہ شے جو جسم کی راحت و آرام میں ممد ہو۔ اس کے نزدیک محمود ہے۔ اور جس چیز سے جسم کی عیش سامانیوں میں فرق پڑے۔ وہ مذموم ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں کہ سامانِ عیش و تنعم حاصل کس طریق سے کیا جاتا ہے۔ وہ جائز طریق سے ہو یا ناجائز طریق سے، اس میں نفسِ انسانی کوئی تمیز نہیں کرتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ناجائز طریقوں سے سامانِ راحت و آرام آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ ان طریقوں کا گرویدہ رہتا ہے۔

اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ مال و دولت اور زن و فرزند ایسے شجرہائے ممنوعہ نہیں کہ ان کی کشش جرم اور گناہ قرار پا جائے۔ اس قسم کا تصور رہبانیت کا پیدا کردہ ہے جسے اسلام مٹانے کے لئے آیا تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ ان چیزوں میں کشش و جاذبیت رکھی گئی ہے۔ اور ان کا حصول مومن کے لئے ضروری ہے۔ جس مقام پر یہ چیزیں مذموم اور وجہ فتنہ بن جاتی ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ان کی خاطر انسان، زندگی کے کسی اہم اصول کو قربان کر دے۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ جب کبھی ایسا ہو کہ ایک طرف اصول پرستی ہو اور دوسری طرف یہ چیزیں، تو ان چیزوں کی محبت اور کشش اصول پر غالب نہیں آنی چاہیئے۔ اسی طرح جس چیز کو خوف کہا گیا ہے وہ بھی یہ ہے کہ جب اصول اور متاعِ زیست میں تصادم ہو تو انسان اس خیال سے اصول کو چھوڑ دے کہ اس کی پابندی سے مال و دولت، زن و فرزند یا خود انسان کی اپنی جان چلے جانے کا خطرہ ہے۔ یہ ہے وہ خوف جس سے انسان کی خودی کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ قرآن اس قسم کے خوف کو دور کرنے کا سامان پیدا کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کا ابتدائی نقطہ یہ ہے کہ اس کائنات میں خدا کے سوا کوئی قوت ایسی نہیں جس کے سامنے انسان جھکے یا اس سے ڈرے۔ خدا کے سامنے جھکنے سے بھی مراد اس آئین و قانون کی پابندی ہے جسے اس نے تکمیلِ شرفِ انسانیت کے لئے متعین کر کے انسانوں کو دیا ہے۔ لہٰذا دل سے ہر قسم کے خوف کے دور کرنے کا واحد علاج یہ ہے کہ انسان خدا کے علاوہ کسی کو صاحبِ اقتدار تسلیم نہ کرے۔ اس حقیقت کو علامہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

تا عصائے لا الٰہ داری بدست
ہر طلسمِ خوف را خواہی شکست

جب تو اپنے دل میں اس یقین کو محکم کر لے کہ خدا کے علاوہ کائنات میں کوئی اور قوت ایسی نہیں جس کے سامنے جھکا جائے تو پھر خوف کا ہر طلسم تیرے سامنے تارِ عنکبوت کی طرح ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ "خوف" کی حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ وہ محض فریب ہوتا ہے۔ اسی لئے اسے "طلسم" کہا گیا ہے۔

ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش
خم نگردد پیشِ باطل گردنش

شخص کے اندر حق حلول کر جائے۔ اس طرح جیسے رگوں میں خون دوڑتا ہے۔ اور وہ یوں اس کے جسم میں جان کی حیثیت اختیار ہے تو ایسے شخص کی گردن کبھی باطل کے سامنے جھک نہیں سکتی۔

خوف را در سینۂ او راہ نیست
خاطرش مرعوب غیر اللہ نیست

ایسے شخص کے سینہ میں خوف داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ اس کا دل اللہ کے سوا کسی اور قوت سے مرعوب نہیں ہو سکتا۔

ہر کہ در اقلیم لا آباد شد
فارغ از بند زن و اولاد شد

جو شخص بھی لا آلہٰ کی اس حقیقت کو بطور اصول اساسی اختیار کر لے وہ زن و فرزند کی بندشوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ متاہل زندگی کو تیاگ کر جنگلوں میں سنیاس اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مال و دولت یا زن و فرزند اس کی حق پرستی کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہو سکتے۔ اگر کبھی ایسا وقت آئے کہ اسے کسی اصول کی خاطر انہیں چھوڑنا پڑے تو وہ بلا ادنیٰ تامل انہیں چھوڑ دے گا۔

می کند از ما سوی قطع نظر
می نہد ساطور بر حلق پسر

ایسا شخص اس قسم کے تصادم کے مقام پر اللہ کے سوا ہر چیز سے قطع نظر کر لیتا ہے۔ اور اگر اصول پرستی کا تقاضا ہو تو وہ (حضرت ابراہیم کی طرح) خود اپنے بیٹے کے حلق پر بھی خنجر رکھ دیتا ہے۔ جس شخص کا ایمان اس قدر محکم ہو اس میں ایسی قوتیں آجاتی ہیں جن کا ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

با یکے مثل ہجوم لشکر است
جان بچشم او ز باد ارزاں تر است

اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ تنہا بھی ایک لشکر جرار کے برابر ہوتا ہے۔ یہ اس لئے کہ اس کے نزدیک جان ہوا سے بھی کم قیمت رکھتی ہے۔ کمزور وہ ہوتا ہے جسے جان بچانے کی فکر پریشان کر رہی ہو۔ جو شخص جان کی پرواہ نہ کرے اس کی قوتوں کا کیا ٹھکانہ!

لیکن لا الٰہ کی یہ عملی کیفیت (کہ جس سے ایک مردِ مومن تنہا بھی لشکر جرار پر بھاری ہو جاتا ہے) نظام صلوٰۃ کے قیام سے پیدا ہوتی ہے جو مسلمان کو اجتماعی حیثیت سے قانونِ خداوندی کی کامل اطاعت کا خوگر بناتی ہے۔ اس لئے

لا الٰہ باشد صدف، گوہر نماز
قلب مسلم را حج اصغر نماز

لا الٰہ وہ سیپ ہے جس کے اندر گوہر یکدانہ صلوٰۃ کی شکل میں تربیت پاتا اور متشکل ہوتا ہے۔ قلب مسلم کے نزدیک صلوٰۃ حج

ہے یعنی چھوٹے پیمانے پر حج۔ حج تمام دنیا کے مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ کا مظہر ہوتا ہے اور صلوٰۃ کسی خاص مقام کے مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کی آئینہ دار۔ اس لئے یہ چھوٹے پیمانے پر حج ہوتا ہے۔

در کفِ مسلم مثالِ خنجر است
قاتلِ فحشاء و بغض و منکر است

صلوٰۃ مسلمان کی ہاتھ میں شمشیرِ برہنہ کی طرح ہوتی ہے جس سے باطل کی گردن کٹ جاتی ہے۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ صلوٰۃ فحشاء و منکر کو روک دیتی ہے۔ جس معاشرے میں صلوٰۃ کا نظام قائم ہو۔ وہ ہر قسم کی بے حیائیوں اور مذموم حرکات سے محفوظ رہتا ہے۔ اس میں افلاس کا خوف اور عقلِ فریب کار کی دسیسہ کاریاں باقی نہیں رہ سکتیں۔ یہ ہے قرآن کی رو سے صلوٰۃ کا فطری اور لازمی نتیجہ (سوچئے کہ جس قسم کی نمازیں ہم آجکل پڑھ رہے ہیں کیا ان سے کبھی یہ نتائج مرتب ہوتے ہیں؟)

صلوٰۃ کے بعد صوم (روزہ) آتا ہے جو ضبطِ نفس (DISCIPLINE) کے لئے ایک تربیتی نصاب (REFRESHER COURSE) کی حیثیت رکھتا ہے۔

روزہ بر جوع و عطش شبخون زند
خیبرِ تن پروری را بشکند

روزہ، بھوک اور پیاس پر چھاپہ مارتا ہے اور ان کی سختیوں اور تلخیوں کو ختم کر کے انسان کو محنت و مشقت کی زندگی کا عادی بنا دیتا ہے۔ اور اس طرح تن پروری کے محکم قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا ہے۔ روزہ کے بعد حج کو دیکھئے۔

مومنان را فطرت افروز است حج
ہجرت آموز و وطن سوز است حج

حج سے قلبِ مومن کی شمعیں فروزاں ہو جاتی ہیں۔ اس کا سینہ روشن اور تابناک ہو جاتا ہے۔ اس میں وسعت اور کشائش پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کا پہلا سبق یہ ہے کہ وطن کی محبت ایسی چیز نہیں جو اصول پرستی کی راہ میں حائل ہو جائے۔ اگر اصول کی خاطر وطن کو چھوڑنے کی ضرورت پڑ جائے تو ایک مردِ مومن بلا ادنےٰ توقف اپنے دامن سے وطن کی خاک جھاڑ کر اس فضا کی طرف گامزن ہو جاتا ہے جسے وہ نظامِ خداوندی کے لئے زیادہ سازگار سمجھتا ہے۔ مغرب کی نیشنلزم نے دنیا کو سکھایا ہے کہ وطن کی خاطر سب کچھ چھوڑا جا سکتا ہے لیکن قرآن کی سیاست مومن کو یہ سکھاتی ہے کہ حق کی خاطر وطن تک کو بھی چھوڑا جا سکتا ہے۔ نیز حج یہ بھی سکھاتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے وجہِ جامعیت، دین کی حبلِ متین اور قانونِ خداوندی کی اطاعت ہے۔ لیکن یہ اطاعت ایک زندہ مرکز کے بغیر ممکن نہیں۔ حج سے مقصود ملتِ اسلامیہ کے مرکز کا قیام و دوام ہے۔ اس مرکز سے کتابِ ملتِ بیضا کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔

طاعتے سرمایۂ جمعیتے
ربطِ اوراقِ کتابِ ملتے

قوانین الٰہیہ کو عملاً نافذ کرنے والا مرکز اور اس مرکز کی اطاعت، یہ ہے اصل اسلام۔ اس سے ملت میں ربط و ضبط قائم رہتا ہے اگر نظام باقی نہ رہے تو مسلمان انفرادی زندگی بسر کرتا ہے۔ جماعت کی زندگی نہیں۔ اور اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ جماعت کے بغیر اسلام کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔

صلوٰۃ۔ صوم اور حج کے بعد زکوٰۃ کو لیجئے۔

حُبِّ دنیا را فنا سازد زکوٰۃ
ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

زکوٰۃ (یعنی اپنے مال کو نوعِ انسانی کی نشوونما کے لئے خرچ کر کے خود اپنی ذات کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا) انسان کے دل سے مال کی محبت کو فنا کر دیتا ہے۔ دولت اس کے نزدیک مقصودِ زندگی نہیں رہتی۔ بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اس سے انسان اس حقیقت کو پا لیتا ہے کہ خدا کی طرف سے عطا کردہ رزق کے سرچشمے تمام افرادِ انسانیہ کے لئے مساوی طور پر کھلے رہنے چاہئیں۔

دل ز حتّٰی تنفقوا محکم کند
زر فزاید الفت زر کم کند

قرآن کا ارشاد ہے کہ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (۳/۹۲) تم کشادگی کی راہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ تاوقتیکہ تم ان چیزوں کو جو تمہارے لئے اپنے اندر بڑی کشش رکھتی ہیں۔ نوعِ انسانی کی نشوونما کے لئے کھلا نہ رکھو۔ غور کیجئے کہ یہ تعلیم انسان کے دل سے زر و سیم کی محبت کو ختم کر کے اس میں کس قدر لا انتہا وسعتیں پیدا کر دیتی ہے۔

یہ ہیں نظامِ اسلامی کے چند موٹے موٹے احکام۔ غور کیجئے کہ ان کی اطاعت سے انسان میں کس قدر ضبطِ نفس پیدا ہو جاتا ہے۔

ایں ہمہ اسبابِ استحکامِ تُست
پختہ محکم اگر اسلامِ تُست

یہ تمام چیزیں خود تیری خودی کے استحکام کا موجب ہیں۔ لیکن تو محکم اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ جب تیرا اسلام محکم ہو۔

اہلِ قوت شو ز وردِ یا قوی
تا سوارِ اشترِ خاکی شوی

تو "یا قوی" کے ورد سے اپنے اندر قوت پیدا کر۔ اسی قوت کے ذریعے تو اپنے نفس کو اپنے تابع کر سکیگا۔

"وردِ یا قوی" کے معنی یہ نہیں کہ صبح کو اٹھ کر نماز کے بعد یا قوی یا قوی کا ورد شروع کر دیا جائے۔ صفاتِ خداوندی (واسماء حسنیٰ) کے ورد اور ذکر کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے اندر ان صفات کو منعکس کرتا چلا جائے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ہر فرد انسانیہ

ہر ابن آدم کے اندر "روح خداوندی" پھونک دی گئی ہے. اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے اندر، حدِ بشریت کے مطابق صفات خداوندی کی صلاحیت مضمر طور پر رکھ دی گئی ہے. یہ صلاحیت مناسب تعلیم و تربیت سے مضمر (POTENTIAL) سے مشہود (CONCRETE) ہو جاتی ہے. اسلام اس نظام یا معاشرہ کا نام ہے. جس کے اندر انسان کی یہ صلاحیتیں مشہود پیکر اختیار کر لیتی ہیں. یعنی اس کے اندر ودیعت کردہ صفات خداوندی، کی نمود ہوتی چلی جاتی ہے. قوت بھی صفت خداوندی ہے. قرآن نے خدا کو قویؔ عزیزؔ کہا ہے. یعنی غلبہ و قوت کا مالک. لہٰذا خدا کو قوی کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے اپنے اندر غلبہ و قوت پیدا کرتے چلے جائیں. یعنی اس صفت خداوندی کو جو ان کے اندر مضمر ہے میں موجود ہے، بیدار کرتے چلے جائیں. جب فرد میں یہ قوت بیدار ہو جاتی ہے. تو اس کے لئے ضبطِ نفس نہایت آسان ہو جاتا ہے. اور جب انہی افراد کا مجموعہ (یعنی جماعت) میں اس صفت کی نمود ہوتی ہے تو باطل کی ہر قوت اس کے آگے جھک جاتی ہے.

سلسلۂ اصلاح وتذکیر (محترم عمر احمد صاحب عثمانی)

قرآنی معاشرہ

باہمی تعلقات کے متعلق قرآن کی تعلیم

(۲)

[اس مضمون کی پہلی قسط میں یہ بتایا گیا تھا کہ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے اور قرآن کریم کی رُو سے اس ضمن میں اولاد کے کیا فرائض وواجبات ہیں۔ موجودہ قسط میں یہ بتایا جائے گا کہ والدین کو اپنی اولاد کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اور اس سلسلہ میں خود ان کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔]

اَولاد

اولاد کے ساتھ ماں باپ کے تعلق کے دو گوشے ہوتے ہیں۔ ایک گوشہ وہ ہے جس کا تعلق انسانی جبلت سے ہے۔ مثلاً اولاد کے ساتھ محبت اور شفقت کا برتاؤ کرنا۔ ان کی پرورش کرنا۔ ماں کا اپنے بچوں کو دودھ پلانا۔ باپ کا ان کے کھانے کپڑے کے لئے جگر پاش مشقتوں کو برداشت کرنا۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جو ہر انسان میں جبلی طور پر موجود ہوتی ہیں۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ تقاضے کچھ انسانی جبلت کے ساتھ ہی مخصوص نہیں۔ بلکہ حیوانات تک میں بھی یہ چیزیں پائی جاتی ہیں۔ وہ بھی اپنی اولاد کی پرورش میں ان تمام تقاضوں کو پیدا کرتے ہیں۔ چڑیا کی ننھی سی جان کو دیکھیے۔ وہ اپنے بچوں کی حفاظت وصیانت کیلئے اپنی جان جوکھوں میں ڈال دیتی ہے اس چھوٹی سی مرغی کو دیکھیے جس نے ابھی ابھی بچے نکالے ہوں۔ چیل یا کوے کا سایہ بھی کہیں نظر آتا ہے تو وہ عقاب کی طرح دوڑتی ہوئی آتی ہے اور اپنے پروں کے نیچے اپنے بچوں کو سمیٹ لیتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے پرندے صبح صبح دانہ دنکا اکٹھا کرنے کے لئے نکل جاتے ہیں وہ یہ چیزیں جمع کر کے لاتے ہیں اور چوگے کی شکل میں اپنے ننھے منے بچوں کے منہ میں انڈیل دیتے ہیں۔ یہی حال چوپایوں اور دوسرے جانوروں کا بھی ہے۔ یہ گوشہ چونکہ انسانی بلکہ حیوانی جبلت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس کے متعلق کسی ہدایت کی ضرورت ہی نہیں۔ جس طرح

بچی کو کوئی یہ نہیں سکھاتا کہ جب اس کا بچہ پیدا ہو تو وہ اسے کس طرح دودھ پلائے۔ اسی طرح کسی لڑکی کو اس تعلیم کی ضرورت نہیں کہ جب اس کے بچہ پیدا ہو تو وہ اس کو دودھ پلائے اور سردی و گرمی سے اس کی حفاظت کیا کرے۔ اس کے لئے تعلیم و ہدایت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لڑکی جب جوان ہوگی اور اس کے بچے پیدا ہوں گے تو اس کی جبلت اسے خود ہی بتائے گی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے زندگی کے اس گوشہ سے متعلق زیادہ ہدایات دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ البتہ اس جبلی تقاضہ میں بھی چونکہ افراط اور تفریط ہو سکتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے اس کی حدود ضرور مقرر کر دی ہیں۔

اس تعلق کا دوسرا گوشہ وہ ہے جس کا تعلق انسان کی جبلت سے نہیں ہے۔ مثلاً بچہ اگر بے راہ روی اختیار کرنے لگے تو والدین اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ اس کی تعلیم و تربیت کس طریقہ پر کرنی چاہیئے۔ اس کی کن صلاحیتوں کو اجاگر کرنا چاہیئے۔ ہمیں اپنے دلوں میں اپنے بچوں کے لئے کس قسم کی آرزوئیں اور تمنائیں رکھنی چاہئیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ اس قسم کی چیزیں ہیں کہ انسان بسا اوقات جذبات کی رَو میں غلط قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اولاد کی بے جا اور غلط محبت اکثر اسے غلط راستے پر ڈال دیتی ہے۔ زندگی کے ان گوشہ کے متعلق انسان کو وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہے۔ اور قرآن کریم نے اس ضمن میں ہمیں کافی ہدایات دی ہیں۔

اولاد کی خواہش معیوب نہیں

ہر انسان کو فطری طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے اولاد ہو اور وہ اس کو پرورش کرے۔ آپ نے چھوٹی چھوٹی بچیوں کو دیکھا ہوگا کہ جونہی وہ چار پانچ سال کی ہوتی ہیں تو چھوٹی چھوٹی گڑیاں گودوں میں لے کر گھومنے پھرنے لگتی ہیں۔ کسی کو اگر گڑیاں نہیں ملتیں تو اپنے تکیوں ہی سے اپنے اس تقاضے کو پورا کر لیتی ہیں۔ ذرا بڑی ہوتی ہیں تو وہ گڑیوں کے شادی بیاہ کا ڈھونگ رچانے لگتی ہیں۔ بہرحال انسان کا یہ جذبہ بالکل فطری ہے جسے معیوب نہیں کہا جا سکتا۔ یہ خواہش بڑے بڑے انبیاء تک کو بھی ہوتی ہے۔ اور انہوں نے اپنی اس آرزو کا اظہار جناب باری میں بھی کیا ہے چنانچہ قرآن کریم نے حضرت زکریا کی اس دعا کو اپنے دفتین میں محفوظ کیا ہے۔ جس میں وہ عرض کرتے ہیں۔

وَإِنِّي خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِن وَرَائِي وَكَانَتِ امْرَأَتِي عَاقِرًا فَهَبْ
لِي مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا ۝ يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ آلِ يَعْقُوبَ ۖ وَاجْعَلْهُ
رَبِّ رَضِيًّا ۝ (19/5-6)

مجھے اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے اندیشہ ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔ خدایا مجھے اپنے پاس سے ایک ایسا مددگار عطا فرما جو میرا اور آلِ یعقوب کا جانشین ہو، اور خدایا اسے پسندیدہ صورت و سیرت کا مالک بنا۔

اولاد کی خواہش کا پیدا ہونا ایک فطری تقاضا ہے۔ جو انبیائے کرام تک میں بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے اسے معیوب نہیں کہا جا سکتا

اولاد کو حیاتِ جاوید کا ذریعہ سمجھنا غلط ہے

البتہ یہ سمجھنا کہ میں تو کچھ عرصہ کے بعد مر جاؤں گا۔ میرا نام میرے بعد میری اولاد کے ذریعے ہی چلے گا۔ یہ غلط ہے۔ اس خیال کے دونوں

مقدمے غلط ہیں، یہ مقدمہ بھی غلط ہے کہ میں تو کچھ عرصے کے بعد مرجاؤں گا۔ کیونکہ انسان کی زندگی حیات دنیوی کے ختم ہونے کے ساتھ ختم نہیں ہوجاتی۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے جو اس زندگی کے بعد بھی چلتی ہے۔ موت اس کو ختم نہیں کردیتی۔ ہوتا صرف یہ ہے کہ زندگی کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد یہ دوسرا مقدمہ بھی غلط ہے کہ میرے بعد میرا نام میری اولاد کے ذریعے چلے گا انسان کا نام اس کی اولاد کے ذریعے نہیں چلتا بلکہ اس کے صلاحیت بخش اعمال کے ذریعہ سے چلتا ہے۔ یہی وہ فریب تھا جو ابلیس نے آدم کو دیا تھا۔ جب اس نے کہا تھا۔

قَالَ يٰآدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۝ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝ (۲۰/۱۲۰-۱۲۱)

ابلیس نے کہا۔ اے آدم! میں تجھے حیات جاوید کے درخت کا پتہ بتاؤں اور ایسی بادشاہت کا نشان دیدوں جو کبھی پرانی نہیں ہوگی۔ آدم اور اس کی بیوی نے اس درخت سے کھایا ہی تھا کہ دونوں کا جنسی شعور بیدار ہوگیا۔ اور دونوں اپنے اوپر باغ کے پتے گانٹھنے لگے۔ آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور وہ راستے سے بھٹک گیا۔

انسان میں حیات جاوید کی تمنا ابتداء سے چلی آرہی ہے۔ اور یہ کوئی معیوب خواہش نہیں۔ لیکن حیات جاوید حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے صلاحیت بخش اعمال سے اپنی ذات یعنی نفس انسانی (PERSONALITY) کو اتنا مستحکم کرے کہ موت کا ہاتھ اس کو ختم نہ کرسکے حیات جاوید حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ انسان اولاد پیدا کرے اور پھر اولاد کے ذریعہ سے اپنا نام چلانے کی کوشش کرے کیونکہ ساری مفاد پرستیاں اور ذخیرہ اندوزیاں اسی جذبے کے ماتحت فروغ پاتی ہیں تحفظ خویش انسان کا فطری تقاضا ہے۔ وہ اولاً براہ راست اپنے تحفظ کے لئے اور پھر اولاد کے ذریعے اسی اپنے تحفظ کے لئے ذخیرہ اندوزیاں اور سرمایہ داریاں اور جاگیرداریاں فروغ کردیتا ہے۔ جس سے انسانیت میں بے شمار فتنوں اور نا ہمواریوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشو و نما اور بالیدگی ذخیرہ اندوزیوں سے نہیں ہوتی بلکہ اِنْفَاقْ اور دوسرے انسانوں کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچانے سے ہوتی ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝ (۹۲/۵-۱۰)

جو دیتا ہے اور قانون خداوندی سے ہم آہنگ رہتا ہے یعنی توازن بدوش انسانیت کے نظریہ کو سچ کر دکھاتا ہے تو ہم اس کے لئے سہولتوں اور آسانیوں کے لئے دروازے کھول دیتے ہیں۔ لیکن جو لوگ بخل کرتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مالدار بننے کی خواہش کرتے ہیں اور توازن انسانیت کو غلط کر دکھاتے ہیں۔ ان کے لئے ہم دشواریوں کی راہیں کھول دیتے ہیں۔

بہرحال اولاد کی خواہش پیدا ہونا معیوب نہیں۔ البتہ اس کے ذریعہ سے حیات جاویدہ حاصل کرنے کی خواہش رکھنا غلط ہے۔ اولاد کی خواہش، تو حیوانی جبلت کا بھی تقاضا ہے۔ مگر ان کے ہاں چونکہ یہ جذبہ نہیں ہوتا کہ اولاد کے ذریعہ سے ان کا نام چلے گا۔ اس لئے نہ ذخیرہ اندوزیاں کرتے ہیں اور نہ سرمایہ داریوں اور جاگیرداریوں کو پیدا کرتے ہیں۔ لہٰذا اولاد کی خواہش میں کوئی برائی نہیں۔ مگر اس کو حیات جاوید کا ذریعہ سمجھنے میں یقیناً برائی ہے۔

اولاد خدا کی نعمت ہے

انسان کو خدا کی طرف سے اولاد مل جانا خدا کا بڑا انعام ہے جس کی ہمیں ناشکری نہیں کرنی۔ تکمیل مقصد انسانیت کے لئے بقائے نسل انسانی ضروری ہے۔ ہمیں اس نعمت کی قدر کرنی چاہیئے۔ کوشش کرنی چاہیئے کہ ہماری یہ اولاد انسانیت کی نشوونما اور تعارف کا ذریعہ بنے۔ اور اس سلسلہ میں جو کام ہم مکمل نہ کر سکیں۔ اسے ہماری اولاد پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَزْوَاجِکُمْ
بَنِیْنَ وَحَفَدَۃً وَّرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ یُؤْمِنُوْنَ
وَبِنِعْمَتِ اللّٰہِ ھُمْ یَکْفُرُوْنَ ۝ (۱۶/۷۲)

اور اللہ نے تمہارے ہی میں سے تمہارے جوڑے پیدا کئے۔ اور تمہاری بیویوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے (اور دوسرے مددگار) پیدا کئے اور خوشگوار چیزیں تمہیں (بطور رزق) کے عطا کیں۔ کیا وہ لوگ باطل توہمات پر تو یقین رکھتے ہیں۔ اور اللہ کی ان نعمتوں کا صاف انکار کر دیتے ہیں؟

اور رحمت بھی

اولاد خدا کی نعمت ہی نہیں بلکہ اس کی رحمت بھی ہے۔ یعنی بچے کی پرورش کا سامان بھی خود رزاق کائنات کی طرف سے مہیا ہوتا ہے۔ اسی کو رحمت کہتے ہیں خواہ یہ جسمانی نشوونما کے لئے ہو یا انسانی ذات کے استحکام تقاضے کے لئے۔ جہاں تک بچہ کی جسمانی پرورش کا تعلق ہے ذرا غور کیجئے کہ رحم مادر کے اندر جنین کس طرح قانون خداوندی کے تابع چڑھتا ہے۔ ماں کے رحم میں اس کی ضروریات خدا کس طرح مہیا کرتا ہے۔ تاآنکہ وہ ایک مدت معینہ کے بعد ایک جیتا جاگتا مکمل بچہ بن جاتا ہے۔ پھر وضع حمل کے مرحلہ سے گزر کر جب وہ ماں کی گود میں آجاتا ہے تو روشنی، ہوا، پانی اور ماں کی چھاتیوں میں دودھ کس طرح اس کے لئے چشم براہ بلکہ دست بستہ حاضر ہوتے ہیں مختلف مرحلوں میں اس کے تقاضے کس قدر مختلف ہوتے ہیں مگر ہر مرحلہ پر خدا کا خوان یغما کس طرح اسے ہاتھوں ہاتھ لیتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ جوان رعنا ہو جاتا ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ ان تمام مراحل میں انسان نے کیا کیا۔ اور خدا کی شان رحمت نے اس میں کتنا کچھ حصہ لیا ہے۔

ذِکْرُ رَحْمَتِ رَبِّکَ عَبْدَہٗ زَکَرِیَّا ۝ اِذْ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَآءً
خَفِیًّا ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَھَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ ...... فَھَبْ لِیْ

مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝ (۱۹/۵)

یہ تیرے پروردگار کی اس رحمت کا ذکر ہے جو اس نے اپنے بندے زکریا پر فرمائی تھی۔ جب اس نے اپنے پروردگار کو آہستہ سے پکارا۔ اس نے کہا اے میرے پروردگار میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں اور سر بڑھاپے سے سفید ہو چکا ہے۔ میں آج تک کبھی تجھے پکار کر محروم نہیں رہا مجھے اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے اندیشہ ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔ خدایا تو مجھے اپنے پاس سے ایک مددگار عطا فرما!۔

آپ نے دیکھ لیا کہ یہاں حضرت زکریا کی دعا پر ان کو یحییٰ جیسا بیٹا عطا فرمانے کو رحمت ربّانی قرار دیا گیا ہے۔

اجتماعی زندگی میں اولاد تقویت کا باعث ہے

اولاد خدا کی نعمت اور رحمت اس لئے ہے کہ اس سے اس دنیا میں ہمیں تقویت حاصل ہوتی ہے ہماری کارکردگی کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ جب سے انسان نے منزل انسانیت میں قدم رکھا ہے۔ گھریلو زندگی (FAMILY LIFE) اس کا مستقل شعار حیات رہا ہے۔ یہ اس سے کسی دور میں بھی مستغنی نہیں ہوا۔ اس طرز زندگی کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی اولاد اس کے دکھ درد میں شریک ہوتی ہے۔ ایک سے دوسرے کو سکون اور اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے دست و بازو ہوتے ہیں۔ اس لئے آپس میں ایک دوسرے سے تقویت محسوس کرتے ہیں ابتدائی دور کی قبائلی زندگی میں افراد خاندان کی کثرت خاص طور پر وجہ تقویت ہوتی تھی۔ چنانچہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝ (۷۱/۱۰-۱۲)

میں نے ان سے کہا کہ خدا سے اس کے قانون ربوبیت کے مطابق سامان حفاظت طلب کرو بلاشبہ وہی سامان حفاظت عطا کرنے والا ہے۔ وہ تم پر بارش کی دھاریں چھوڑ دے گا اور اموال و اولاد سے تمہاری تقویت کا سامان کرے گا۔ اور تمہارے لئے باغات اور نہریں بنا دے گا۔

قوم بنی اسرائیل کے متعلق بھی یہی فرمایا۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَاَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ اَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝ (۱۷/۶)

پھر تمہارے مخالفین کے خلاف ہم تمہاری باری دوبارہ لے آئے اور ہم نے اموال و اولاد

سے تمہاری تقویت کا سامان کردیا۔ اور ہم نے تمہیں کثیر انبوہ والا بنادیا۔

قوم عاد کو خطاب کرتے ہوئے حضرت ہودؑ نے بھی یہی فرمایا تھا۔

وَاتَّقُوا الَّذِيٓ اَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَدَّكُمْ بِاَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ۝ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ (۲۶)

اس خدا کے قانون سے ہم آہنگ رہو جس نے تمہاری تقویت کے وہ وہ سامان کئے جو تم جانتے ہو۔ اس نے چوپایوں اور اولاد سے اور باغات اور پانی کے چشموں سے تمہاری تقویت کے سامان بہم پہنچائے۔

بہرحال عائلی زندگی کا لازمی نتیجہ ہے کہ ماں، باپ اپنی اولاد کے وجود سے ایک خاص قسم کی تقویت محسوس کرتے ہیں۔ اس سے ان کی خاندانی قوت و ثروت میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔

اولاد زینت کا باعث ہے

زینت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو لوگوں کو دیکھنے میں بھلی معلوم ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ گھر جو اپنے مکینوں سے بھرا ہوا ہو۔ جس میں بچوں کی چہل پہل ہو۔ وہ ہر دیکھنے والی نگاہ کو بہ نسبت ایک اجڑے ہوئے گھر کے زیادہ خوش آئند نظر آئے گا۔ یہ تو گھر کی بات تھی۔ اگر نگاہوں میں ذرا اور وسعت پیدا کرکے دیکھا جائے تو درحقیقت ساری دنیا کی زینت بھی اولاد سے (یعنی بقائے نسل انسانی) ہی سے وابستہ ہے۔ اگر انسانی نسل کا انقطاع ہوجائے تو دنیا دنیاوی زندگی ہنگاموں سے قطعاً خالی ہوجائے۔ دنیا کی گردشِ لیل و نہار میں رنگینی ہے تو اسی کے دم قدم سے ہے۔ بازارِ حیات میں چہل پہل ہے تو اسی کے طفیل ہے۔ یہ نہ ہو تو دنیا پر ایک مرگ آسا خاموشی چھا جائے۔ اور حرکت و اضطراب کی جگہ سکوتِ مرگ لے لے۔ اسی کو قرآن کریم نے فرمایا ہے۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ۝ (۱۸/۴۶)

مال اور اولاد دنیوی زندگی کی زینت ہیں۔ لیکن تیرے پرورش دینے والے کے قانون کے نزدیک وہی اموال اور اولاد بہتر ہیں جو اپنے نتیجہ اور توقعات کے اعتبار سے باقی رہنے والے اور صلاحیت بخش ہوں۔

حیاتِ دنیوی کے اعتبار سے یوں تو ہر اولاد باعثِ زینت ہے۔ لیکن خدا کے قانون میں وہی اولاد بہتر کہی جاسکتی ہے جو اس دنیا پر اچھے اور صلاحیت بخش اثرات چھوڑ جائے۔ لہٰذا ہمیں یہ مقصد ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ ہم اپنی اولاد کی تربیت اس انداز سے کریں کہ وہ دنیا پر باقی رہنے والے اثرات چھوڑ کر جائے۔ اور وہ اثرات ایسے ہوں جو ہر اعتبار سے صلاحیت بخش ہوں۔ اگر ہم یہ نہیں کرسکے تو ہم نے اپنا انسانی فریضہ ادا نہیں کیا۔ فقط حیوانی جبلت کے تقاضوں کو پورا کیا۔ ظاہر ہے کہ انسانیت کو ہماری برخود غلط اولاد کے

ہاتھوں اگر شدائد و مصائب سے دوچار ہونا پڑا تو وہ رہتی دنیا تک ہم پر لعنتیں بھیجے گی۔ لہٰذا اگر ہمیں اس کے ہاتھوں آرام اور سکون مل سکا تو وہ برابر ہمارے لئے نیک آرزوؤں کا اظہار کرتی رہے گی۔ لہٰذا ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنی اولاد کو ایسا اٹھائیں جو سوسائٹی کے اچھے فرد اور دنیا کے بہترین شہری بن سکیں۔ جن سے انسانیت کی گاڑی پیچھے ہٹنے کے بجائے میدانِ ارتقا میں آگے بڑھے۔ یعنی وہ انسانیت کی بھلائی اور بہتری کے لئے کچھ عملی طور پر کر سکے۔

اولاد سے محبت فطری تقاضا ہے

"اولاد دنیوی زندگی کی زینت ہے" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں ان سے محبت نہیں کرنی چاہیئے۔ ملّا کے مذہب میں اولاد ایک حد تک قابل نفرت چیز ہے۔ جس سے ہمیں محبت نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اولاد ارشادِ خداوندی کے مطابق زینت ہے یعنی دنیوی زندگی کی اور دنیا ملّا کے نزدیک مردار ہے۔ اور اس کے طلبگار اور متلاشی کتے ہیں۔ تو جو خود ہی مردار ہے اس کی زیب و زینت بھی مردار ہو گی اور کسی مردار چیز سے محبت کرنا کس طرح محمود ہو سکتا ہے؟ مگر یہ تعلیم قطعاً قرآن کے خلاف ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے اور تو دنیا اور اس کی زیب و زینت کو حرام کس نے قرار دیا ہے۔ تحریم و تحلیل کا حق تو صرف خدا کو حاصل ہے۔ اگر خدا نے حرام قرار دیا ہے تو بتاؤ کہاں حرام قرار دیا ہے۔ اور اگر تم یہ نہیں بتا سکتے تو ایسی باتیں جن کے متعلق تمہیں کچھ علم نہیں خدا کی طرف منسوب کیوں کرتے ہو۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (۷/۳۲)

اے پیغمبر! کہدو کہ خدا کی اس زینت و آرائش کو جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہے اور خوشگوار رزق کی چیزوں کو آخر کس نے حرام کر دیا ہے؟ اے پیغمبر تم کہدو کہ دنیوی زندگی میں بھی یہ انہی لوگوں کا حصہ ہے جو ایمان لاتے ہیں اور قیامت کے دن تو یہ خالص انہی کا حصہ ہو گا۔ ہم اس طرح اپنی آیات کو نکھار نکھار کر ان لوگوں کے لئے بیان کر دیتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

لہٰذا دنیا اور اس کی زینت کی چیزیں نہ حرام ہیں اور نہ مردار۔ اور نہ ہی ان سے محبت کرنے والے کتے ہیں۔ یہ لوگوں کی من گھڑت کہانیاں ہیں۔ جو انہوں نے خود ہی گھڑ لی ہیں اور خدا کی طرف منسوب کر دی ہیں۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اولاد کی محبت ایک فطری تقاضا ہے جسے نہ ختم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے مطلقاً مذموم قرار دیا جا سکتا ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ

اَلْمَاٰبِ ○ (۳:۱۴)

انسانوں کے لئے عورتوں، اولاد، سونے چاندی کے جمع کئے ہوئے ڈھیروں، نشان زدہ گھوڑوں، چوپاؤں اور کھیتی باڑی وغیرہ کی محبت کو مزین کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے انسان دنیوی زندگی میں فائدہ اٹھاتا ہے۔ واضح رہے کہ بہترین نتائج خدا کے قانون کے مطابق عمل کرنے سے ہی مل سکتے ہیں۔

ان چیزوں کی محبت انسان کے دل میں خوشنما بنا کر فطری طور پر ڈال دی گئی ہے۔ اور خدا نے ہی ڈالی ہے۔ اس لئے اسے مطلقاً مذموم اور معیوب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ اس نے اس محبت کی جو حدود مقرر کر دی ہیں۔ انسانوں کو اس سے متجاوز نہیں ہونا چاہیئے یعنی ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ان چیزوں کی محبت قطعاً محمود ہے۔ اور اس پر کسی قسم کی بازپرس یا ملامت نہیں کی جا سکتی۔

اولاد انسانی کردار کی کسوٹی ہے

اولاد تو ایک قسم کی کسوٹی ہے جس سے بڑی آسانی کے ساتھ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسان کا اپنا کردار کس حد تک مستحکم ہوا ہے۔ اگر وہ خدائی حدود کے اندر اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے تو وہ کوئی برائی نہیں کرتا۔ لیکن اگر اولاد کی محبت کے جذبات اس قدر غالب آجاتے ہیں کہ وہ اسے حدود شکنی پر مجبور کر دیتے ہیں تو اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا اپنا کردار مستحکم نہیں ہوا۔ اور کردار کی نا محکمی یقیناً قابل گرفت ہو گی۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ○ (۸:۲۸)

اسے خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولادیں تمہاری آزمائش کی کسوٹی ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اجر عظیم خدا کے قانون کے مطابق عمل کرنے سے ہی مل سکتا ہے۔

"فِتْنَةٌ" کا لفظ عربی زبان میں ابتلاء، امتحان، آزمائش وغیرہ کے لئے آتا ہے۔ یہ لفظ فَتْنٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی سونے چاندی کو آگ پر اس مقصد سے پگھلانے کے ہوتے ہیں کہ کھوٹ الگ ہو جائے اور خالص سونا اور چاندی الگ ہو جائے۔ لہٰذا فتنہ کے اس مفہوم کو ذہن میں رکھیئے اور فتنہ کے اس مفہوم سے دھوکہ نہ کھایئے جو ہمارے ہاں اردو میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے اس آیت کو ہمارے ہاں عموماً مال اور اولاد کی مذمت کے لئے بطور شہادت کے پیش کیا جاتا ہے۔ فتنہ کا وہ مفہوم جو ہمارے ہاں اردو میں مروج ہے وہ عربی کا مفہوم نہیں ہے۔ آیت کا واضح مطلب یہی ہے کہ یہ اموال اور اولاد تمہارے کھرے اور کھوٹے کی پہچان کا ایک ذریعہ ہیں۔ جو لوگ اقدار وحی پر مکمل ایمان رکھتے ہیں اور حدودِ الٰہیہ کے اندر اپنی زندگی اور اس کے تقاضوں کو محدود رکھتے ہیں۔ ان کو اموال و اولاد کے ذریعہ سے ایسے لوگوں سے ممتاز کر کے الگ کر لیا جا سکتا ہے جو اقدار وحی پر مکمل ایمان نہیں رکھتے۔ اور حدودِ الٰہیہ کے تابع اپنی زندگی بسر نہیں کرتے۔ خدا کی مقرر کردہ حدود اور اولاد و اموال کی محبت میں جہاں تصادم ہو گا۔ وہیں انسان کے اپنے کردار کی پرکھ ہو جائے گی۔ اگر اس تصادم کی صورت میں بھی وہ حدود آئینی اور اقدار وحی کی پاسداری کرتا ہے۔ تو یہ اس بات کی شہادت

ان حدود اور اقدار پر صحیح اور مکمل ایمان رکھتا ہے۔ اور اگر وہ اولاد اور اموال کی محبت کی طرف جھک جاتا ہے تو یہ اس بات کی (دلیل ہے) کہ ابھی اس کو خدا کی حدود اور اقدار پر مکمل ایمان حاصل نہیں ہو سکا۔

محبت قانونِ خداوندی سے غالب نہ آجائے

سطورِ بالا میں آپ نے دیکھ لیا کہ اولاد کی محبت ایک فطری جذبہ ہے جو معیوب یا مذموم نہیں مگر اس کی کچھ حدود ہیں۔ سب سے بڑی حد تو یہ ہے کہ اولاد کی محبت کو قانونِ خداوندی پر غالب نہ آجانا چاہیئے۔ جہاں قانونِ خداوندی اور اولاد کی محبت میں ٹکراؤ اور تصادم کی نوبت (آجائے) وہاں ہمیں ہمیشہ اولاد کی طرف نہیں بلکہ قانونِ خداوندی کی طرف ہی جھکنا چاہیئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ
عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝ (۶۳/۹)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تمہارے اموال اور تمہاری اولادیں تمہیں خدا کے قانون کی پاسداری سے غافل نہ کردیں۔ جو لوگ ایسا کریں گے وہ یقیناً نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔

(اولاد) کی محبت قانونِ خداوندی کی اطاعت میں حائل اور حارج ہو جاتی ہے۔ تو یہ محبت اپنی حدود سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اور (اس لی)ئے مذموم ہو جائے گی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا
لَكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ ۚ وَإِنْ تَعْفُوا وَتَصْفَحُوا وَتَغْفِرُوا
فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝ إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ
فِتْنَةٌ ۚ وَاللَّهُ عِنْدَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝ (۶۴/۱۴-۱۵)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تمہاری بعض بیویاں اور تمہاری بعض اولادیں تمہارے لئے دشمن ہو جاتی ہیں۔ ان سے بچتے رہو۔ اگر تم عفو و درگذر اور فروگذاشت سے کام لو تو یقیناً خدا بڑا ہی فروگذاشت کرنیوالا اور مہربان ہے۔ یاد رہے تمہارے یہ اموال اور اولاد تمہاری آزمائش کی کسوٹی ہیں۔ اور اللہ کے قانون کے مطابق عمل کرنے سے ہی اجرِ عظیم مل سکتا ہے۔

(وہ) اولاد جو تمہیں حدودِ خداوندی سے تجاوز پر مجبور کردے۔ اور جس کی وجہ سے تم اقدارِ خداوندی سے ہم آہنگ نہ رہ سکو۔ تمہارے لئے (باع)ثِ رحمت نہیں بلکہ موجبِ زحمت ہے۔ وہ تمہاری دوست اور خیر خواہ نہیں بلکہ تمہاری دشمن ہے۔ یہی موقع ہے جہاں تمہاری کشمکش ہوتی ہے کہ ایسے موقع پر تم قانونِ خداوندی کی پیروی کو ترجیح دیتے ہو یا جذباتِ محبت کی رو میں بہہ جاتے ہو۔

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ

وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا

وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَ

جِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي

الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝ (۹/۲۴)

اے پیغمبر! کہدو کہ اگر تمہارے باپ، بیٹے، بھائی، بیویاں اور خاندان اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑجانے کا اندیشہ ہے۔ اور وہ مکانات جو تمہیں بہت پسند ہیں تمہارے نزدیک خدا، اس کے رسول اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو پھر اس وقت کا انتظار کرو کہ خدا کا فیصلہ صادر ہو جائے۔ یاد رہے کہ خدا ایسے لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا جو صحیح راستے سے کترا کر نکل جانا چاہتے ہوں۔

لہٰذا قانونِ خداوندی سے اگر اولاد کی محبت ٹکراتی ہے تو ایسے موقع پر ہمیں اولاد کی محبت کو لامحالہ خیرباد کہہ دینا ہوگا۔ کیونکہ ایمان کی تو شرط یہ ہے کہ ہر قیمت پر قانونِ خداوندی کی اطاعت کی جائے۔ خواہ اس کی زد ہمارے ماں باپ پر پڑتی ہو یا اولاد پر۔ اس کی زد اپنے بھائی پر پڑتی ہو یا خود اپنے نفس پر۔ جو شخص قانونِ خداوندی کے مقابلہ میں ان رشتہ داروں کی محبت کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ قرآن کی رو سے مومن ہی نہیں ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ

وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ

أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم

بِرُوحٍ مِّنْهُ ۖ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ

خَالِدِينَ فِيهَا ۚ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ أُولَٰئِكَ

حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (۵۸/۲۲)

اے پیغمبر اسلام! تمہیں ایسے لوگ نہیں ملیں گے جو ایک طرف خدا اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہوں اور دوسری طرف ایسے لوگوں سے محبت بھی رکھتے ہوں جو اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی رکھتے ہوں۔ خواہ ایسے لوگ ان کے ماں باپ، بیٹے بھائی یا اہلِ خاندان ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں خدا نے ایمان کی دولت لکھ دی ہے۔ وہ اپنی طرف سے وحی خداوندی کے ذریعے ان کی تائید و نصرت کرتا ہے۔ اور انہیں ایسے سدا بہار باغات میں داخل کر دیتا ہے۔ جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اور

وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ خدا ان سے راضی رہتا ہے اور وہ خدا سے راضی رہتے ہیں۔ یہی
لوگ اللہ کی پارٹی ہیں اور واضح رہے کہ اللہ کی پارٹی ہی کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔

ایک مومن کے دل میں قوانین خداوندی کی کشش و جاذبیت کے ساتھ ایسی اولاد کی محبت یکجا ہو ہی نہیں سکتی۔ جو ان قوانین کے خلاف جا رہی ہو۔ ایک دل میں یا تو خدا اور اس کے رسول کی محبت سما سکتی ہے اور یا اس کے مخالفین کی محبت۔ دونوں کی محبتیں بیک وقت ایک دل میں سما ہی نہیں سکتیں۔

والدین کو یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ خدا کی نافرمان اولاد ایک مومن کے خاندان کا فرد ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر تمہاری اولاد خدا کی مطیع و فرمانبردار نہیں تو تمہارا اس سے کوئی علاقہ نہیں۔ وہ حیاتیاتی طور پر (BIOLOGICALLY) تمہاری اولاد ہو سکتی ہے لیکن وہ تمہارے اہل میں سے ہرگز نہیں کہی جا سکتی۔

وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ فَقَالَ رَبِّ إِنَّ ابْنِي مِنْ أَهْلِي وَإِنَّ
وَعْدَكَ الْحَقُّ وَأَنتَ أَحْكَمُ الْحَاكِمِينَ ۝ قَالَ يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ
مِنْ أَهْلِكَ ۖ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ فَلَا تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ
عِلْمٌ ۖ إِنِّي أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝ (۱۱/۴۵-۴۶)

اور نوح نے اپنے پروردگار کو پکارا اور کہا۔ خدایا میرا بیٹا تو میرے اہل میں سے تھا۔ اور تیرا وعدہ (کہ میرے اہل و عیال طوفان سے محفوظ رہیں گے) تو سچا تھا اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے (پھر میرا بیٹا طوفان میں کیوں غرق ہو گیا) خدا نے جواب دیا۔ اے نوح! تمہارا وہ بیٹا تمہارے اہل میں سے نہیں تھا۔ وہ غیر صالح اعمال کا مرتکب تھا (پھر وہ تمہارے اہل میں سے کیسے ہو سکتا ہے) تم مجھ سے ایسی بات کے متعلق سوال نہ کرو جس کا تمہیں علم نہیں۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ جاہل لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

اس واقعہ کو بیان کرکے قرآن کریم نے اپنے اور پرائے کی وہ تفریق کر دی ہے جس کے بعد کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں ہونی چاہیئے۔ قرآن کریم کی اصطلاح میں اپنا وہ ہے جو تمہارے نظریۂ زندگی یعنی (IDEOLOGY) میں تمہارا ساتھی ہو۔ اور تم سے متفق ہو۔ جو تمہارے نظریۂ زندگی میں تمہارا ساتھی نہیں۔ وہ تمہارا اپنا نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ تقسیم ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ سے چلی آ رہی ہے۔ نسل، خون، زبان، ملک اور زمین کی اپنائیت سے کوئی اپنا نہیں بن جاتا۔ نسلی اعتبار سے بیٹے کے مقابلہ میں اور کون اپنا ہو سکتا ہے۔ لیکن قرآن کی نگاہ میں جب بیٹا بھی نظریۂ حیات کے اعتبار سے باپ سے الگ راہ اختیار کر لے تو وہ بھی اپنا نہیں رہتا بلکہ وہ ہزاروں کا ایک بیگانہ بن جاتا ہے۔

اس حقیقت کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اور بھی واضح کر دیا ہے جہاں انہوں نے جناب باری میں یہ دعا مانگی ہے کہ

إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَاجْنُبْنِي وَ
بَنِيَّ أَن نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ ۝ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ
النَّاسِ ۖ فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي ۖ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ
رَّحِيمٌ ۝ (۱۴/۳۵-۳۶)

یاد کرو جب ابراہیم نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا کہ اے پروردگار اس شہر کو پرامن شہر بنادے۔ اور مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے محفوظ رکھنا۔ خدایا ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کردیا ہے۔ اس کے بعد جو میری پیروی کرے گا وہ میری اولاد ہوگا اور جو میری نافرمانی کرے گا (تو اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا) البتہ خدایا تو سامان حفاظت عطا کرنے والا اور بڑا ہی مہربان ہے۔

اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صاف وضاحت کے ساتھ فرمادیا ہے کہ میری اولادوں سے جو میرا مطیع ہوگا وہ تو میرا ہے۔ اور جو میرا مطیع وفرمانبردار نہیں ہوگا اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ البتہ یہ نیک آرزو ان کے لئے ضرور ہے کہ خدا انہیں سامان مرحمت سے نواز دے۔ اور اس طرح ان کو ہدایت حاصل کرنے کی توفیق دیدے۔

اولاد کی صحیح تربیت

جہاں تک جسمانی تربیت کا تعلق ہے۔ یہ انسان کا جبلی تقاضا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی نشوونما کی فکر کرے۔ مگر ماں باپ کا اتنا ہی فریضہ نہیں ہے کہ وہ ان کو جسمانی طور پر پال پوس کر جوان کردیں یہ کام تو حیوان بھی کردیتے ہیں انسان کا کام تو یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو صحیح معنوں میں انسان بنادے۔ اس کی اخلاقی اور نظریاتی اعتبار سے ایسی تربیت کرے کہ وہ سوسائٹی کے لئے مفید ثابت ہوسکے۔ اس کے اعمال وکردار پر نظر رکھے۔ اور جہاں دیکھے کہ وہ راستہ سے بھٹک رہی ہے فوراً ٹوک دے اور صحیح راہ عمل اختیار کرنے کی تنبیہ کردے۔

إِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّ
الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ۝ (۳۱/۱۳)

یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ خدا کی ہستی کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا۔ بلاشبہ شرک کرنا بڑا ہی ظلم ہے۔

یہی کچھ حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کو وصیت فرمائی تھی۔

وَوَصَّىٰ بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللَّهَ
اصْطَفَىٰ لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ (۲/۱۳۲)

ابراہیم نے اپنی اولاد کو اور پھر یعقوب نے بھی اپنی اولاد کو یہی وصیت کی تھی کہ میرے بیٹو! خدا

نے تمہارے لئے اس دین کو منتخب فرمایا ہے. لہذا تم صرف اسی حالت میں موت سے
ہمکنار ہونا کہ تم اس کے پورے پورے مطیع اور فرمانبردار ہو۔

حتیٰ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے آخری وقت تک بھی اس فریضہ سے بے توجہی نہیں برتی۔ چنانچہ جب کشتی میں سوار ہونے لگے اور بیٹا پیٹھ موڑ کر جانے لگا تو انھوں نے اس وقت بھی اس کو پکارا اور فرمایا۔

وَنَادٰى نُوْحُ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا
وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۱۱/۴۲)

اور نوحؑ نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ وہ الگ کو ایک کنارہ پر کھڑا ہوا تھا (نوحؑ نے کہا) بیٹا! ہمارے ساتھ سوار ہو جاؤ اور کافروں کے ساتھی نہ بنو۔

اولاد کے لئے نیک آرزوئیں والدین کو اپنی اولاد کے لئے ہمیشہ نیک آرزوئیں رکھنی چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ اولاد کے لئے انسان کے دل میں یہ نیک آرزوئیں بھی اسی وقت پیدا ہوتی ہیں جب وہ ان کی اخلاقی اور نظری طور پر صحیح تربیت کرنے کا جذبہ اپنے دل میں رکھتے ہوں۔ اگر یہ جذبہ ہی ان کے دل میں نہ ہو تو اس قسم کی نیک آرزوئیں کہاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے جہاں بیٹے کی پیدائش کی دعا مانگی وہاں ساتھ ہی یہ دعا بھی مانگی۔

فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ
وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝ (۱۹/۵-۶)

خدایا مجھے اپنے پاس سے ایک مددگار عطا فرما دے جو میرا اور اولاد یعقوب کا وارث ہو اور خدایا اسے پسندیدہ صورت و سیرت کا مالک بنانا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا پہلے بھی گذر چکی ہے کہ انھوں نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا تھا۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ
وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (۱۴/۳۵)

یاد کرو کہ جب ابراہیمؑ نے عرض کیا تھا کہ خدایا اس شہر کو پُر امن شہر بنا دینا اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے محفوظ رکھنا کہ ہم بتوں کی پرستش میں لگ جائیں۔

حضرت مریم کی والدہ نے حضرت مریم کی پیدائش کے بعد بارگاہ ایزدی میں عرض کیا تھا۔

وَاِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّيْۤ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ
الرَّجِيْمِ ۝ (۳/۳۶)

میں نے اس بچی کا نام مریم رکھا ہے۔ اور خدایا! میں اس بچی کو اور اس کی اولاد کو

مردود شیطان سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

تمام نیک بندوں کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد اپنے اخلاق اور کردار کے اعتبار سے بھی بلند تر مقام ہو۔

وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ
أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا (۲۵/۷۴)

اور (اللہ کے نیک بندے) وہ ہیں جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنی بیویوں اور
اولادوں میں سے ایسی بیویاں اور اولادیں عطا فرما جن سے ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک
حاصل ہو۔ اور ہمیں ان لوگوں کا امام اور پیشوا بنا جو تقوٰی خداوندی کی نگہداشت
کرنا چاہتے ہیں۔

یہ ہونا اس لئے ضروری ہے کہ انسانیت کی صلاح و فلاح اسی پر منحصر ہے کہ آئندہ نسلیں صحیح بنیاد پر اٹھیں۔ کیونکہ انسانیت برابر ارتقائی مدارج طے کرتی چلی آرہی ہے اور اسے یہ ارتقائی منازل بہرحال طے کرنی چاہئیں۔ یہ ارتقاء بتدریج ہوتا آرہا ہے۔ اور بتدریج ہی ہوتا ہے۔ ہر نسل کی ایک منزل ہوتی ہے۔ جس سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتی۔ آج کی نسل کے وہ امکانات نہیں ہو سکتے۔ جو آنے والی نسل کے لئے ہوں گے۔ اگر ہماری آنے والی نسل اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ان حدود سے آگے قدم نہیں بڑھا سکی جن تک ہم آکر رک گئے تھے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ انسانیت کا ارتقاء رک گیا۔ اور وہ ایک نقطہ پر آکر کھڑی ہو گئی۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ زندگی جہنم کی زندگی ہے جو کسی طرح بھی قابل فخر نہیں کہی جا سکتی۔ ہوتا یہی ہے کہ ہر نسل انسانی ارتقاء میں اپنی ممکنہ حد تک سعی کرتی ہے۔ اور آنے والی نسل اسے اور آگے بڑھاتی ہے تا آنکہ انسانیت کسی نئے انقلاب سے دوچار ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں آج تک کوئی انقلاب بڈھے بوڑھوں کے ہاتھوں نہ برپا ہو سکا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ دنیا میں انقلاب ہمیشہ نئی پود اور جدید نسل (NEW GENERATION) کے ہاتھوں ہی برپا ہو سکا ہے۔

ذرا بنی اسرائیل کی مثال کو سامنے لایئے۔ یہ قوم کس قدر مصائب و آلام میں گرفتار تھی۔ ملوکیت و شہنشاہیت (فرعون) سرمایہ داری اور جاگیرداری (قارون) اور پیشوائیت اور برہمنیت (ہامان) کے تین زبردست پاٹ تھے جن کے درمیان میں صدیوں سے یہ قوم پستی اور کچلتی ہوئی چلی آرہی تھی۔ ہر مصیبت اپنے نقطۂ کمال تک پہونچی ہوئی تھی۔ فلسفۂ تاریخ کے لحاظ سے جس قدر شدید یہ قوتیں تھیں۔ اتنا ہی شدید ان کا ردعمل (RE-ACTION) بھی ہونا چاہیئے تھا۔ انقلاب کے لئے اس سے بہتر سازگار فضا اور کونسی ہو سکتی تھی۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سرزمین میں جو انقلاب پیدا کیا۔ وہ اس قوم کے بڈھے بوڑھوں کے ہاتھوں رونما نہیں ہو سکا۔ جو ساری عمر ان سہ گانہ چکی کے پاٹوں پستے چلے آرہے تھے بلکہ

فَمَا آمَنَ لِمُوسَىٰ إِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّن قَوْمِهِ عَلَىٰ خَوْفٍ مِّن فِرْعَوْنَ وَ
مَلَئِهِمْ أَن يَفْتِنَهُمْ وَإِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ (۱۰/۸۳)

بِمَنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۰ (۲۱)

فرعون اور اس کے سربرآوردہ لوگوں کے اس خوف کے باوجود کہ وہ انہیں کسی نئی آزمائش اور ابتلا میں نہ ڈال دے موسیٰ پر اس کی قوم کی کچھ نئی پود ہی ایمان لا سکی تھی۔ فرعون یقیناً سرزمین مصر میں بڑی قوتوں کا مالک اور بڑا ہی ظالم بادشاہ تھا۔

چونکہ ارتقاء انسانیت کی گاڑی نئی پود کے بل بوتے پر ہی آگے چلتی ہے۔ اس لئے ہر نئی پود اور ہر نئی نسل کی حفاظت از حد ضروری ہو جاتی ہے۔ تاکہ اس کی صلاحیتیں کہیں دب کر نہ رہ جائیں۔ اگر نئی نسل کی صلاحیتیں برگ و بار نہ لا سکیں اور دب کر رہ جائیں تو انسانیت کی گاڑی جہاں کی تہاں رہ جائے گی۔ اور ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکیگی۔ اس لئے ہر نسل کا یہ فرض اولین ہے کہ وہ اپنی آنیوالی نسل کی صحیح تربیت کر کے اس کی صلاحیتوں کو اتنا اجاگر کر دے کہ وہ انسانیت کی اس گاڑی کو اس منزل سے آگے لے جا سکیں جہاں موجودہ نسل اسے چھوڑ رہی ہے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو ہم پوری انسانیت کو جحیم کے اس غار میں دھکیل دیتے ہیں جہاں انسانیت رک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ واضح رہے کہ جحیم قرآن کی اصطلاح میں اس معاشرہ کا نام ہے جہاں کاروان انسانیت رک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ارتقائی مدارج طے کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ عربی زبان میں جَحْمٌ کہتے ہی اس کے ہیں اور جحیم وہ ماحول ہے جہاں کوئی رک کر کھڑا ہو جائے اور آگے نہ بڑھ سکے۔

آنے والی نسل کو صحیح تربیت نہ دینا اور اس کی صلاحیتوں کو اجاگر نہ کرنا قرآن کی اصطلاح میں نسل کشی کہلاتا ہے جو انسانیت کا ایسا جرم ہے جسے کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔

عربوں کے ہاں اولاد کی طرف سے بے اعتنائی اور بے توجہی بڑی عام تھی۔ وہ اولاد کی پرورش کو اسی حد تک ضروری سمجھتے تھے جس حد تک حیوانی جبلت کے مطابق فطری طور پر وہ مجبور ہوتے تھے۔ جہاں بچہ اس قابل ہوا کہ وہ ادھر سے ادھر آ جا سکے اور کچھ کھا سکے۔ وہ بالکل اس سے بے توجہ ہو جاتے تھے۔ بچہ جہاں آٹھ نو سال کا ہوا اور اس قابل ہوا کہ وہ جنگل میں جا کر اونٹ چرا سکے تو وہ اس کی غور و پرداخت سے آزاد ہو جاتے تھے۔ یہ بچے اپنا پیٹ بھرنے بلکہ ماں باپ کے لئے بھی کچھ کما کر لانے کے لئے دوسروں کی نوکری اور مزدوری کرنے کے لئے نکال دیئے جاتے تھے۔ اولاد کی طرف سے بے توجہی اور بے اعتنائی کا یہ عالم تھا کہ ضرورت پڑتی تو وہ ان کو فروخت بھی کر دیتے تھے۔ سرمایہ دار سود خواروں کے ہاں چند دس کھجوروں کے بدلے ان کو رہن بھی رکھ دیتے تھے۔ عربوں کی یہ عام کیفیت تھی اور اسے کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس معاشرہ کی یہ کیفیت ہو وہاں اولاد کی طرف سے ان کی صحیح تربیت کے خیال کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کریم نے اس کو نسل کشی (قتل اولاد) سے تعبیر کیا ہے

—— باقی آئندہ

اسلام کی سرگزشت

اس سے پہلے اسلام پر دیگر اقوام و ملل کے اثرات سے گفتگو کی جا رہی تھی۔ چنانچہ پچھلی قسط میں ایران کے مذاہب میں سے زردشتی مذاہب کے اثرات سے بحث کی گئی تھی۔ موجودہ اشاعت میں ایران کے دیگر مذاہب یعنی مانویت اور مزدکیت کے اثرات زیر بحث آ رہے ہیں

(ب) مانی اور مانویت[1]

ایران کے مشہور ترین مذاہب میں سے جس کے متبعین بکثرت پائے جاتے تھے ایک مذہب مانویت بھی تھا۔ مانی — اس مذہب کے بانی — کی پیدائش جیسا کہ البیرونی نے اپنی کتاب "الآثار الباقیۃ" میں لکھا ہے ۲۱۵ یا ۲۱۶ء میں ہوئی تھی — ان مخالفتوں کے علی الرغم جو اس مذہب کو پیش آئیں — یہ مذہب ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی تک زندہ رہا۔ ایشیا اور یورپ میں اس کے متبعین بکثرت موجود تھے۔ دینی افکار و آراء میں بھی اس کا بڑا گہرا اثر تھا۔ مانویت کی تعلیمات، نصرانیت اور زردشتیت سے مخلوط تھیں۔ اس مذہب کو جیسا کہ پروفیسر براؤن کا خیال ہے — نصرانیت آمیز زردشتیت شمار کرنا زیادہ صحیح ہے۔ بنسبت اس کے کہ اسے زردشتیت آمیز نصرانیت شمار کیا جائے۔ اس مذہب کے متعلق عربی اور یورپین سرچشموں دونوں سے کافی مواد مل سکتا ہے۔ پروفیسر براؤن نے اس سلسلہ میں عربی سرچشموں کی توثیق کی ہے اور کہا ہے کہ وہ صحت سے زیادہ قریب ہیں۔ اس کے بارے میں عربی سرچشموں سے زیادہ اہم کتابیں یہ ہیں۔ ابن حزم کی الفصل فی الملل والنحل۔ شہرستانی کی الملل والنحل ابن الندیم کی الفہرست۔ یعقوبی کی تاریخ۔ البیرونی کی الآثار الباقیۃ ابن نباتہ کی سرح العیون وغیرہ۔

ان کے مذہب کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا — جیسا کہ زردشت نے بھی کہا ہے۔ دو اصلوں سے پیدا ہوئی ہے۔ اور یہ دونوں اصلیں نور اور ظلمت ہیں۔ نور سے ہر خیر اور اچھی چیز پیدا ہوئی ہے اور ظلمت سے ہر بری چیز پیدا ہوئی ہے۔ نور کو شر کے اوپر کوئی قدرت نہیں ہے اور ظلمت کو خیر کے اوپر کوئی قدرت نہیں ہے۔ انسان سے جو کچھ خیر صادر ہوتی ہے اس کا سرچشمہ النور ہوتا ہے۔ اور جو کچھ انسان سے شر صادر ہوتا ہے۔ اس کا سرچشمہ الظلمۃ ہوتا ہے۔ اگر انسان کسی کی طرف رحمت

---

[1] واضح رہے کہ مانی کی طرف نسبت کرتے ہوئے عرب لوگ کبھی تو "منانیۃ" کہتے ہیں اور کبھی "مانویۃ" کہتے ہیں۔ "مانویۃ" کے ساتھ نسبت کو متنبی نے بھی اپنے ایک شعر میں استعمال کیا ہے جہاں اس نے کہا ہے۔ وکم لظلام اللیل عندک من ید تخبر ان المانویۃ تکذب

ـے دیکھتا ہے تو یہ نظر خیر اور نور کی نظر ہوتی ہے۔ اور جب وہ
لی طرف سنگدلی اور قساوت کی نظر سے دیکھتا ہے تو یہ نظر شر
لمت کی نظر ہوتی ہے۔ یہی حال باقی تمام حواس کا ہے۔ اس دنیا
ر اور شر پوری طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل گئے ہیں
کے بعد مانی اور اس کے اصحاب نے اس امتزاج و اختلاط کی جو
ت بیان کی ہے وہ ایسی ہے جسے حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے
ؑ خرافات کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

ان تعلیمات میں — جیسا کہ آپ دیکھ چکے ہیں — زیادہ تر
ردشت کی تعلیمات سے باہر نہیں جاتا۔ لیکن اس کے بعد وہ ایک
دی نظریہ میں زردشت کے خلاف جاتا ہے۔ زردشت کی رائے
ا کہ یہ موجودہ دنیا عالم خیر ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں شر کے اوپر خیر کی
ندی کے مظاہر اور آثار موجود ہیں۔ لیکن مانی کا یہ خیال ہے کہ اس
ہیں خیر اور شر کا خود یہ امتزاج بھی ایک شر ہے جس سے چھٹکارا پانا
بی ہے۔ اپنے نظریے کے ماتحت زردشت کا خیال یہ تھا کہ انسان کو
ا زندگی کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیئے چنانچہ اسے
دی کرنی اور اولاد پیدا کرنی چاہیئے۔ اپنی کھیتی باڑی کرنی اور جانوروں
چوپایوں کی خبرگیری کرنا چاہیئے۔ اپنے بدن کو طاقتور رکھنا چاہیئے یعنی
روزہ بھی نہیں رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ انسان اس طریقہ پر زندگی بسر کرکے
شر کے مقابلہ میں خیر کی مدد کرسکتا ہے۔ لیکن مانی نے اس کے برعکس
یہ دوسرا مسلک اختیار کیا جو رہبانیت سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔
نا — جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے — حران کا ایک راہب تھا۔ اس
نے یہ خیال کیا کہ اس دنیا میں نور کا ظلمت کے ساتھ مل جانا خود ایک شر ہے
انچہ اس نے اس بنا پر نکاح کرنے کو حرام قرار دیدیا۔ تاکہ فنا جلد آجائے
مذہب کی طرف لوگوں کو دعوت دینی شروع کردی۔ ہر مہینہ میں سات
ن کے روزے ہمیشہ کے لئے فرض کردیئے۔ ایسے ہی بہت سی نمازیں بھی

فرض کردیں کہ آدمی کھڑا ہو۔ پانی سے وضو کرے اور سورج کی طرف منہ کرکے
کھڑا ہو جائے۔ قیام کرے۔ سجدے کرے۔ اس طرح بارہ سجدے کرے
اور ہر سجدہ میں مقررہ دعا پڑھے۔ اس نے اپنے اصحاب کو جانور ذبح کرنے
سے بھی منع کیا۔ کیونکہ اس میں جانوروں کو اذیت اور تکلیف دینا ہے۔ مانی
نے حضرت عیسیٰ اور زردشت دونوں کی نبوت کا اعتراف کیا اور کہا کہ وہی
(یعنی مانی ہی) وہ نبی ہے۔ جس کی بشارت حضرت عیسیٰؑ نے دی تھی۔
کہتے ہیں کہ ہرمز شہنشاہ ایران نے مانوی مذہب قبول کیا تھا۔ جس
سے اس مذہب کو بڑی تائید حاصل ہوئی۔ اور لوگ کثیر تعداد میں اس
دین میں داخل ہوگئے۔ لیکن ہرمز کے مرنے کے بعد جب بہرام اول تخت
نشین ہوا تو اسے اس کی تعلیمات نہیں بھائیں۔ اس نے مانی کو قتل کرادیا
اور اس کے ساتھیوں کو منتشر کردیا تاہم ایسا کرنے سے اس کی تعلیمات مر
نہیں گئیں۔ اس کے دین میں یکے بعد دیگرے برابر بڑے بڑے امام ہوتے
رہے۔ امام کا مرکز ابتدا بابل میں ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہ سمرقند کی طرف
منتقل ہوگیا۔ ابن الندیم نے کہا ہے کہ جب ایرانیوں کی حکومت میں انتشار
آگیا اور عربیوں کی حکومت نے قوت پکڑلی تو مانی کے متبعین جو ایران سے
روپوش ہوگئے تھے۔ دوبارہ آکر ایران میں بس گئے — خصوصیت کے
ساتھ ایرانی فتنہ کے دوران میں اور بنو امیہ کے دور حکومت میں — کیونکہ
خالد بن عبداللہ القسری ان پر بڑا ہی مہربان تھا۔ آخری مرتبہ یہ لوگ
مقتدر کے عہد حکومت میں بالکل ہی ایران سے چھوٹ گئے اور خراسان
میں ان لوگوں نے پناہ لی کیونکہ مقتدر کے عہد حکومت میں انہیں اپنی جانوں
کا خوف تھا۔ جو لوگ ایران میں رہ گئے۔ وہ بھی اپنی مانویت کو چھپا کر رہتے
تھے۔ ویسے یہ لوگ تمام اسلامی مقامات پر موجود تھے۔ خود مدینۃ السلام
یعنی بغداد میں معز الدولہ کے زمانہ میں قریب تین سو آدمی ایسے تھے جنہیں
میں خود اچھی طرح پہچانتا تھا کہ یہ مانوی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ
آجکل پایۂ تخت میں ان کے شاید پانچ آدمی بھی نہ مل سکیں۔ اس کے بعد

ابن الندیم نے ان رؤسا کے نام گنائے ہیں جو بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے لیکن درحقیقت زندیق تھے۔ چنانچہ جعد ابن درہم کو جو مروان ابن محمد — بنو امیہ کے آخری خلیفہ — کا استاد تھا۔ ابن الندیم نے انہی لوگوں سے شمار کیا ہے۔ خالد بن عبداللہ القسری کے متعلق بھی لوگوں کو اس کے زندیق ہونے کا شبہ تھا۔ ایسے ہی بشار بن برد۔ سلم الخاسر صالح بن عبدالقدوس بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔ ابن الندیم نے کہا ہے کہ لوگ کہتے ہیں خاندان بنو برمک میں سوائے محمد بن خالد بن برمک کے سب کے سب ہی زندیق تھے۔ بلکہ بعض اہل مذہب کے قلم سے لکھا ہوا میں نے یہ بھی پڑھا ہے کہ مامون رشید بھی انہی لوگوں میں سے تھا۔ لیکن یہ غلط اور جھوٹ ہے۔ بہرحال آجکل ان کی ریاست سمرقند میں قائم ہے

یہ مذہب یورپ میں بھی جنوبی فرانس تک پھیلتا چلا گیا تھا چنانچہ لوگ کہتے ہیں سینٹ آگسٹین عرصۂ دراز تک مانوی مذہب کے پیرو رہے ہیں۔ اور بعد میں انہوں نے نصرانی مذہب کو قبول کر لیا تھا۔

تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی مانوی فرقہ ادبی حرکت کا محرک رہا ہے۔ انہوں نے بہت سے نئے مسائل پیدا کئے۔ اور اپنے ابتدائی عہد سے ہی مجادلہ اور مناظرہ میں مشغول ہے۔ لوگوں نے نقل کیا ہے کہ موبذوں کے سب سے بڑے موبذ (یعنی قاضی القضاۃ) نے مانی سے مناظرہ کیا۔ اور موبذ نے یہ سوال کیا: کیا تم اس کے قائل ہو کہ نکاح اور شادی کرنا حرام ہے تاکہ دنیا جلد از جلد فنا ہو سکے؟ مانی نے جواب دیا کہ "قطع نسل کے ذریعے نور کی مدد کرنا کہ وہ ظلمت سے چھٹکارا حاصل کر سکے، واجب ہے"۔ اس پر موبذ نے کہا کہ "پھر تو ہمارا واجب فریضہ ہے کہ کم از کم تمہیں تو جلد از جلد وہ چھٹکارا دے دیا جائے۔ جس کی طرف تم لوگوں کو دعوت دیتے ہو اور اس مذموم امتزاج کو ختم کرنے میں تمہاری مدد کی جائے"۔ مانی اس جواب پر سٹپٹا گیا اور کوئی جواب نہیں دے سکا۔ بہرام نے فوراً حکم دیا اور مانی کو قتل کر دیا گیا۔ ایسے ہی ایک دوسرا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی مانوی مذہب کے پیرو سے مامون رشید نے مناظرہ کیا اور پو کہ کوئی گناہگار اپنے گناہوں پر کبھی شرمندہ ہوتا ہے؟ مانوی نے جو دیا۔ کیوں نہیں! بہت لوگ شرمندہ ہوتے ہیں۔ مامون نے پ تو پھر بتاؤ کہ بدعملی پر شرمندہ ہونا بدعملی ہے یا نیک عملی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ "بدعملی پر شرمندہ ہونا نیک عملی ہے"۔ مامون نے "اس سے لازم آتا ہے کہ نادم ہونے والا وہی شخص ہوگا جس نے کی تھی"۔ مانوی نے جواب دیا کہ "ہاں وہی شخص ہوگا"۔ مامون نے سے تو نظر آتا ہے کہ صاحب خیر ہی صاحب شر بھی ہوتا ہے۔ اگ ہے تو تمہارا وہ دعوی تو ختم ہو گیا کہ جو شخص دھمکی کی نظر سے د وہ اس شخص کا غیر ہوتا ہے جو رحمت اور شفقت کی نگاہ سے اس پر مانوی نے کہا کہ "میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جس شخص سے برائی تھی وہ اس شخص کا غیر تھا جس سے ندامت سرزد ہوئی"۔ ما کہا کہ پھر وہ شخص کس بات پر نادم ہوتا ہے — آیا وہ ایک نادم ہوتا ہے جو اس سے سرزد ہی نہیں ہوئی بلکہ کسی دوسر سرزد ہوئی ہے۔ یا ایسی چیز پر نادم ہوتا ہے جو خود اسی سے ہے؟۔

مانوی اس بات کا کوئی جواب نہ دے سکا اور لاجو

مسلمانوں میں علم کلام کا ایک بڑا حصہ ان کی تعل متعلق ہے۔ متکلمین ان کی آراء بیان کرتے ہیں اور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے ایسے جو مانوی مذہب والوں نے پیدا کئے جیسے مثلاً معاد کے بار کہ وہ اجسام کے ساتھ ہوگی یا ارواح کے ساتھ اس قسم کے مسائل پیدا کرنے سے مقصد ہی تھا ورنہ ہوا کہ مسلمان بھی گئے اور کوئی کسی فرقہ کی طرف گیا اور کوئی کسی فرقہ کی

یہاں دو مسئلے ایسے ہیں جن کی ہمیں تحقیق کرنی

ام سے پہلے اور اسلام کے بعد مانوی مذہب کی اس قدر
ت کیوں کی گئی ۔!

کا جواب اشارتاً ہم پہلے بھی دے چکے ہیں۔ بہرام کو مانی
ے اصحاب کے قتل پر جس چیز نے برانگیختہ کیا وہ زندگی کا عملی
روشِ عمل کی طرف دعوت دیتا تھا۔ وہ اپنی تعلیمات میں
د جنگی رجحانات کی تائید کرتا تھا جو اس زمانے کے ایرانی رجحانات
لیہ مطابقت رکھتی تھی لیکن مانی کی تعلیمات اس کے برعکس
ں کا رجحان زہد، زندگی کے لذائذ سے نفرت اور جلد فنا ہوجانے
کی طرف تھا۔ یہ تعلیمات —— اس میں کوئی شبہ نہیں ——
ی جنگجو مملکت کے لئے خطرناک تھیں۔ اس کی تائید الآثار
ے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ "بہرام نے کہا کہ یہ شخص تو
کرنے کی دعوت دینے کے لئے نکلا ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ
دیں کچھ بھی کامیابی حاصل کرسکے ہم پر واجب ہے کہ سب سے
داس شخص ہی کو ختم کردیں"۔

اس پر اتنا اضافہ ضرور کرلیجئے کہ اپنی ان تعلیمات کے باوجود
ظاہر نظر آتا ہے —— یہ لوگ اپنے مذہب کی طرف دعوت
بڑی کوششیں کرتے تھے اسلام اور نصرانیت کے پردے میں
پ چھپ کر بھی یہ لوگ اپنی دعوت اور تبلیغ جاری رکھتے تھے
طرح یہ لوگ مخالفت اور گرفت سے محفوظ رہ سکیں۔
دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ مانی کے متبعین کو اکثر
لفظ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تو کیا یہ لفظ ان کے ساتھ
ت رکھتا ہے۔؟

ندیم کی عبارتوں سے بظاہر ایسا مترشح ہوتا ہے کہ "زنادقہ"
اصحاب اور اس کے مذہب کے متبعین پر بولا جاتا ہے یعنی
انہیں سے جو بہر کا فرادر ملحد کے لئے بولا جاتا ہو۔

خیاط معتزلی نے بھی اپنی کتاب "الانتصار" میں اس لفظ کو اسی طرح استعمال کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی خاص فرقہ ہے جو یہودیوں اور نصرانیوں سے قریبی تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ ابن الراوندی نے کہا ہے کہ ثمامہ کا یہ بیان ہے کہ اکثر یہود، نصاریٰ مجوسی۔ زنادقہ اور دہریئے قیامت کے دن خاک ہو جائیں گے اور جنت میں داخل نہیں ہوسکیں گے ..... الخ" خیاط نے اس لفظ کو اپنی کتاب میں پانچ جگہ استعمال کیا ہے۔ اور ہر جگہ کچھ اسی طرح سے استعمال کیا ہے۔

ابن قتیبہ اپنی کتاب "المعارف" میں زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے مذاہب پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "نصرانیت ربیعہ، غسان اور قضاعہ کے ایک حصہ میں تھی۔ اور یہودیت حمیر، بنو کنانہ، بنو حارث بن کعب اور کندہ میں تھی: مجوسیت بنو تمیم میں تھی! چنانچہ زرارہ، حاجب بن زرارہ اور اقرع بن حابس (تینوں تمیمی ہیں) مجوسی تھے اور زندقہ قریش میں تھا جو ان لوگوں نے حیرہ سے لیا تھا"۔ ابن قتیبہ کی اس تعبیر سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ زندقہ سے ان کی مراد ایران کے مذاہب میں سے کوئی خاص مذہب ہے۔ کیونکہ اس کے بعد وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ قریش نے زندقہ کو حیرہ سے لیا تھا اور یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ حیرہ ایرانی حکومت کے ماتحت ہی تھا۔ اس کے قریب قریب وہ بیان بھی ہے جو امام جوہری نے صحاح میں لکھا ہے کہ "زندیق، ثنویت کی ایک شاخ ہے۔ یہ لفظ معرب ہے جس کی جمع زنادقہ آتی ہے قَدْ تَزَنْدَقَ اس سے فعل اور زَنْدَقَةٌ اسم آتا ہے"۔ اس سے بھی یہ مترشح ہوتا ہے کہ زندقہ بھی یہودیت اور نصرانیت کی طرح کوئی خاص مذہب ہے اور عام طور پر الحاد اور بد دینی کے معنوں میں اس کا استعمال ایک نئے معنے ہیں جو بعد میں پیدا ہوئے ہیں۔ لسان العرب میں ہے کہ زندیق اس شخص کو کہتے ہیں جو زمانہ

کے بقا کا قائل ہوتا ہے۔ یہ لفظ فارسی ہے اور زندگر کا معرب
ہے۔ یعنی زمانہ کے بقا کا قائل۔ احمد ابن یحیٰی نے کہا ہے کہ عربی زبان
میں زندیق کا لفظ نہیں تھا۔ عرب لوگ جب اس مفہوم کو ادا کرنا چاہتے
تھے تو "ملحد" یا "دہری" کہا کرتے تھے۔ اس کے بعد اب یہ سوال باقی
رہ جاتا ہے کہ کیا زندقہ کا لفظ ہر ثنویت پر بولا جاتا ہے۔ یا ثنویت
کے کسی خاص مذہب و مسلک مثلاً صرف مانویت پر؟ ابن قتیبہ کے
کلام سے ایسا ہی متبادر ہوتا ہے کہ یہ لفظ کسی خاص مذہب پر ہی
بولا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنی عبارت میں زندقہ کے مقابلہ میں مجوسیت
کا لفظ لائے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ بتایا ہے کہ قبیلہ بنو تمیم مجوسی
ہو گیا تھا۔ اور قبیلہ قریش زندیق ہو گیا تھا۔ اگر زندقہ سے ان کی
مراد محض عام ثنویت ہوتی تو پھر اس مقابلہ کے بیان کوئی معنی
نہیں بنتے۔ اس کی تائید صحاح کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے
جہاں جوہری نے کہا ہے۔ "زندیق ثنویت کی ایک شاخ کا نام
ہے۔ انھوں نے یوں نہیں کہا کہ زندقہ ثنویت کو کہتے ہیں۔ اب اتنی
بات اور رہ گئی ہے کہ کیا یہ لفظ محض مانویت پر ہی بولا جاتا ہے؟
آلوسی نے ابن الکمال سے نقل کیا ہے کہ "یہ لفظ مزدکیت پر بولا
جاتا ہے اور یہ کہ مزدک نے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس کا
نام زند تھا۔ اور یہ کہ مزدکیت مانویت کے علاوہ کوئی مذہب ہے"
مگر یہ بیان قطعاً غلط ہے کیونکہ مزدک نے کوئی کتاب زند کے
نام سے نہیں لکھی۔ بلکہ اس نے زردشت کی کتاب "افستا" کی شرح
لکھی تھی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ زندیق کے معنی فارسی زبان میں در
اصل اس شخص کے ہیں جو "زند" کا اتباع کرتا ہو۔ اس کے بعد یہ لفظ
مانویت پر بولا جانے لگا کیونکہ یہ لوگ بھی زند وغیرہ کتب مقدسہ کو
تسلیم کرتے تھے اور اپنے مذہب کے مطابق تاویل کے طریقہ پر اس کی
شرح میں کرتے تھے۔ استاد "بیقان" کا بیان ہے کہ الفہرست (لابن
ندیم) اور البیرونی کی عبارتوں سے ایسا نظر آتا ہے کہ مانوی فرقہ
سماعین کا لفظ ان لوگوں کے لئے استعمال کرتا تھا جو مانویت کے بلند
درجہ تک ترقی نہیں کر سکتے تھے۔ اور ان تمام واجبات کو ادا کرنے کا
التزام نہیں کرتے تھے جو دین مانویت ان پر فرض کرتا تھا۔ مثلاً رہبانیت
اور زہد وغیرہ۔ اس کے مقابلے میں یہ لوگ "صدیقون" کا لفظ ان
لوگوں کے لئے استعمال کرتے تھے جو ان تمام واجبات کو ادا کرنے کا
التزام رکھتے تھے۔ اور اس دین میں بلند مقام کے مالک ہوتے تھے
یعنی فقر کو مالداری پر فضیلت دیتے اور دنیا اور دنیوی احوال و ظروف
کی طرف کوئی رغبت نہیں رکھتے تھے۔ لفظ صدیق عربی کلمہ ہے
جس کی آرامی اصل یعنی صدیقی (SADDI QAI) موجود ہے۔
اہل ایران نے اس لفظ کو لیا اور اپنے محاورے کے مطابق اسے
زندیق کر لیا۔ انھوں نے مشدّد دال (D D) کی جگہ نون اور دال
کر لیا۔ جیسا کہ یہ لوگ سبّاذ (SABBATH) کو شنباذ
(SHANBATH) کہا کرتے ہیں۔[1] اس قول کی بنا پر یہ لفظ
مانوی مذہب کے پیروکاروں کے ایک خاص طبقہ کے لئے مخصوص تھا
مگر بعد میں تمام مانوی پیروؤں پر استعمال ہونے لگا جو پھر آگے چل کر
علی العموم الحاد اور بددینی کے معنوں میں بولا جانے لگا۔ چنانچہ امام
ابویوسفؒ سے منقول ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے۔ "تین آدمی تین نتائج
سے نہیں بچ سکتے۔ جو آدمی نجوم کو طلب کرے گا وہ زندقہ سے نہیں
بچ سکتا۔ جو کیمیا کو طلب کرے گا وہ فقر و فاقہ سے نہیں بچ سکتا
جو عجیب و غریب حدیثوں کی جستجو میں لگا رہے گا۔ وہ جھوٹ
سے نہیں بچ سکتا۔[2]

---

(۱) ملاحظہ ہو براؤن (۲) العقد الفرید صفحہ ۱۹۹

مزدک

۴۸۵ء کے لگ بھگ ایران میں مزدک کا ظہور ہوا۔ طبری کا بیان ہے کہ "یہ اہل ...یں سے تھا۔ اس نے لوگوں کو ایک نئے ثنوی مذہب کی دعوت دی۔ یہ بھی نور اور ظلمت کا قائل تھا لیکن اس کا ...بڑا امتیاز اس کی اشتراکی تعلیمات تھیں۔ مزدک کا خیال تھا ...انسان یکساں پیدا ہوتے ہیں انہیں یکساں طور پر ہی زندگی ...نی چاہیئے۔ جن چیزوں میں مساوات سب سے زیادہ ضروری ہے وہ ...اور عورتیں ہیں"۔ شہرستانی نے کہا ہے کہ مزدک لوگوں کو ...سے منع کرتا تھا کہ ایک دوسرے کی مخالفت کریں۔ ایک دوسرے ...بغض رکھیں اور ایک دوسرے کو قتل کریں۔ چونکہ یہ چیزیں زیادہ تر ...وں اور مالوں کی وجہ سے پیدا ہوا کرتی تھیں اس لئے اس نے ...ں کو اور اموال کو مباحات میں سے کر دیا۔ اور پورے معاشرے ...س میں شریک ٹھہرا دیا۔ جیسا کہ پانی۔ آگ۔ گھاس اور چارہ کسی ...ملکیت نہیں ہوتا بلکہ سب لوگ ان میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ امام ...ری نے یہ بھی کہا کہ مزدک اور اس کے اصحاب کہا کرتے تھے کہ خدا ...زمین میں رزق اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ بندے اسے آپس میں ...برابر تقسیم کر لیں۔ لیکن لوگوں نے اس کی تقسیم میں ایک دوسرے ...ظلم کرنا شروع کر دیا ہے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہ مالداروں اور ...یر لوگوں سے غریب لوگوں اور فقیروں کے لئے لے سکتے ہیں جس ...شخص کے پاس ضرورت سے زیادہ اموال، عورتیں اور اسباب تعیش ...ہوں اسے ان چیزوں کا دوسرے سے زیادہ کوئی استحقاق حاصل نہیں ...ہے نچلے طبقہ کے لوگوں نے ان تعلیمات کو غنیمت تصور کیا اور مزدک ...اور اس کے اصحاب کے گرد جمع ہو گئے۔ اور ان کی تائید شروع کر دی ...عام لوگ سخت ابتلا میں گرفتار ہو گئے۔ ان لوگوں کی قوت دن بدن ...بڑھتی جا رہی تھی۔ یہ لوگ جس کے گھر میں چاہتے گھس جاتے اور اس کے مکان، عورتوں اور اموال پر قبضہ کر لیتے۔ انہوں نے قباذ (شہنشاہ ایران) کو بھی پھسلانے کی کوشش کی اور اسے سبز باغ دکھائے بلکہ دھمکی دی کہ اگر اس نے ان کا ساتھ نہ دیا تو وہ اسے تخت سے اتار دیں گے۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد حالت یہ ہو گئی کہ نہ آدمی اپنے بچوں کو پہچانتا تھا اور نہ اولاد اپنے باپ کو۔ کسی کے پاس اتنا نہ تھا کہ فراغی کے ساتھ زندگی بسر کر سکے"۔ امام طبری ہی دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ "مزدک نے جس چیز کو بڑا ہی خوش آئند بنایا اور لوگوں کو برانگیختہ کر کے جس چیز کا حکم دیا تھا۔ وہ یہ تھا کہ لوگوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے اموال میں اور عورتوں میں مساوات اختیار کریں۔ وہ کہتا تھا کہ یہی وہ نیک عمل ہے جسے خدا پسند کرتا ہے اور جس پر بہترین ثواب عطا کرتا ہے۔ اگر یہ چیز جس کا وہ لوگوں کو حکم دے رہا تھا اور جس پر لوگوں کو برانگیختہ کر رہا تھا۔ اس کا دین اور نظام کا جزو نہ ہوتی۔ تو یقیناً عملی طور پر یہ مساوات باعث شرف انسانیت اور ذریعہ امن و سلامتی بن جاتی۔ الخ [1]

سطور بالا سے تم نے دیکھ لیا کہ مزدک کی اشتراکی تعلیمات دنیا کی اشتراکی تعلیمات میں سب سے سابق ترین ہیں[2]۔ پروفیسر نولدکہ کہتے ہیں کہ جو چیز مزدک کی اشتراکیت کو جدید اشتراکیت سے ممتاز کرتی ہے۔ وہ صرف اس کی تعلیمات کا دینی رنگ میں رنگا ہوا ہونا تھا"۔ اس کے علاوہ مزدک کی کچھ دوسری روحانی تعلیمات بھی تھیں چنانچہ وہ قناعت اور زہد کی تعلیم دیتا تھا۔ اور جانوروں کی حرمت کا قائل تھا۔ یعنی جانوروں کو ذبح کرنے سے منع کرتا تھا۔

---

[1] تاریخ طبری ص ۸۸ ج ۲ و ما بعد

[2] سابق ترین کہنا صحیح نہیں۔ سب سے پہلے اس کا تصور افلاطون نے پیش کیا تھا۔ (طلوع اسلام)

ہزارہا لوگوں نے اس کے مذہب کو قبول کر لیا۔ لیکن بالآخر قباد شہنشاہ ایران کے بیٹے نوشیروان نے اسے اور اس کی قوم کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس نے ۵۲۳ء میں ان لوگوں کے لئے خفیہ تدبیر سے ایک قتل عام کرایا اور تقریباً ان کی بیخ کنی ہی کر ڈالی۔

تاہم کچھ لوگ اس کے مذہب کی پیروی کرتے رہے حتیٰ کہ اسلام کے بعد بھی ان کے متبعین کا نام و نشان ملتا ہے۔ اصطخری اور ابن حوقل نے بیان کیا ہے کہ کرمان کے بعض دیہات کے باشندے اموی دور حکومت کے آخر تک مزدکیت کے پیروکار چلے آتے تھے۔

صرف مالی جہت کی حد تک ہمیں ابوذر غفاریؓ اور مزدک کی رائے کے درمیان بہت بڑی مشابہت نظر آتی ہے۔ طبری کا بیان ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ شام میں کھڑے ہوتے اور کہنے لگے۔ اے مالداروں کی جماعت! ضرورت مندوں کی خبر گیری کرو خدا کا ارشاد ہے کہ جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں اسے کھلا نہیں چھوڑتے تم انہیں آگ کے بنے ہوئے ان ادواروں کی خوشخبری دیدو جن سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں پر داغ لگائے جائیں گے۔ ابوذر غفاریؓ کی یہی روش رہی حتیٰ کہ فقراء ان باتوں سے ان کے فریفتہ ہو گئے اور انھوں نے ابوذر غفاریؓ کو مالداروں کے خلاف اور بھی بھڑکا دیا۔ حتیٰ کہ مالداروں کو ایذائیں پہنچنے لگیں اور یہ عام لوگوں کی شکایتیں کرنے لگے: پھر معاویہؓ نے ان کو حضرت عثمان بن عفانؓ کے پاس مدینہ میں بھیجدیا تاکہ ابوذرؓ کہیں معاویہ کے خلاف اہل شام کو خراب نہ کر دیں۔ جب حضرت عثمانؓ نے ان سے پوچھا کہ کیا بات ہے ملک شام والے تمہاری زبان درازی کی بہت شکایتیں کرتے ہیں؟ تو ابوذرؓ نے فرمایا کہ مالداروں کو مال جمع نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ حضرت ابوذرؓ کی رائے اموال کے بارے میں مزدک کی رائے سے کس قدر قریب تھی۔ مگر سوال یہ ہے کہ حضرت ابوذرؓ تک یہ رائے کس راہ سے پہنچی؟ امام طبری ہمیں اس سوال کا جواب بھی مہیا کر دیتے ہیں چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ابن السوداء ابوذر غفاریؓ سے ملا اور اس نے انھیں ورغلایا۔ اور یہ ابن السوداء حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت عبادہؓ ابن الصامت کے پاس بھی پہنچا تھا۔ مگر ان دونوں نے اس کی بات نہیں سنی تھی بلکہ حضرت عبادہؓ تو اسے پکڑ کر حضرت معاویہؓ کے پاس بھی لے گئے تھے۔ اور ان سے کہا تھا کہ خدا کی قسم یہی وہ شخص ہے جس نے ابوذر غفاریؓ کو تمہارے خلاف بھڑکا دیا ہے[1]۔ ہمیں معلوم ہے کہ ابن السوداء دراصل عبداللہ بن سبا کا لقب ہے جس سے وہ مشہور تھا۔ یہ صنعاء کا ایک یہودی تھا جو حضرت عثمان کے عہد میں بظاہر مسلمان ہو گیا تھا اس کی اسکیم ہی یہ تھی کہ مسلمانوں کا دین خراب کر دے۔ اس نے مختلف شہروں میں ایسے بہت سے عقیدے پھیلا دیئے تھے۔ جو اسلام اور مسلمانوں کے لئے ضرر رساں تھے۔ ان چیزوں سے ہم آگے چل کر بحث کریں گے یہ شخص بہت سے مرکزی شہروں میں گھوما، حجاز، بصرہ، کوفہ، شام اور مصر میں رہا۔ قرین قیاس ہے کہ اس نے اس نظریہ کو عراق یا یمن کی مزدکیت سے لیا ہو۔ اور اسے اپنے اس زہد کے رنگ میں رنگ لیا ہو جس کی طرف ان کی طبیعت پہلے ہی سے جھکاؤ رکھتی تھی۔ کیونکہ بہرحال حضرت ابوذرؓ غفاری نہایت متقی، پرہیزگار اور زاہد و مرتاض آدمی تھے اور ان محبوب شخصیتوں میں سے تھے۔ جنہوں نے صوفیہ پر بڑا ہی گہرا اثر ڈالا ہے[2]۔

---

[1] طبری ص ۶۶ ج ۵ وما بعد۔

[2] سرمایہ داری کے زمانہ میں مرتب کردہ تاریخ کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہ حضرت ابوذر غفاریؓ کے خیالات کی سراغرسانی کے لئے مزدک تک پہنچی ہے اسے قرآن کی تعلیم قطعاً نظر نہیں آتی جو سرمایہ داری کے لئے پیام مرگ تھی۔ (طلوع اسلام)

جن چیزوں کا تعلق ایرانیوں کے دینی عقائد سے ہے اور جنھوں نے سلمانوں پر گہرا اثر چھوڑا ہے ان میں سے ایک چیز یہ بھی ہے کہ اہل ایران اپنے بادشاہوں کو کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھنے کے عادی تھے گویا وہ الوہیاتی کائنات ہیں جنھیں خدا نے اس لئے منتخب فرمایا ہے کہ وہ وگوں پر حکومت کریں۔ خدا نے انھیں سرداری کے لئے خاص طور پر برگزیدہ کرلیا ہے اور وہ اپنی طرف سے ایک روح کے ذریعے ان کی تائید فرماتا ہے۔ وہ خدا کی زمین میں خدا کا سایہ اور ظل ہیں جنھیں خدا نے اپنے بندوں کی مصلحت کی خاطر پیدا کیا ہے لوگوں کے ان پر کوئی حقوق نہیں ہوتے البتہ بادشاہوں کا یہ حق لوگوں پر جب ہوتا ہے کہ وہ ان کی پوری پوری اطاعت اور فرمانبرداری کریں۔ یہی وہ مفہوم ہے جو یورپ میں حق الٰہی (یعنی DIVINE RIGHT) کے ام سے مشہور ہے۔ اور جس کی سیادت سولھویں اور سترھویں صدی وی میں یورپ میں قائم تھی۔ پروفیسر براؤن کہتے ہیں کہ حق الٰہی کا ظریہ اس شدت کے ساتھ کبھی مقبول نہیں رہا جس شدت کے ایتو ساسانی شہنشاہوں کے دور حکومت میں مقبول رہا ہے: اسرہ کا یہی خیال تھا کہ تنہا ان کو ہی یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ شاہی تاج نا سکیں۔ کیونکہ ان کی رگوں میں خدائی خون دوڑ رہا ہے — پروفیسر مکنے ایرانیوں میں اس عقیدہ کی مقبولیت پر ایک حکایت سے ستدلال کیا ہے جو "الاخبار الطوال" میں مذکور ہوئی ہے۔ حکایت یہ ہے کہ بہرام چوبین — یہ شاہی خاندان سے نہیں تھا اسے حکومت کی خواہش ہوئی اور اس نے کسریٰ پرویز سے جنگ کی۔ مگر کسریٰ نے اس کو شکست دیدی اور وہ بھاگ کھڑا ہوا — اپنے راستہ میں یہ گاؤں پر سے گذرا۔ اس نے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس گاؤں میں قیام کیا۔ اور ایک بڑھیا کے گھر میں فروکش ہوا۔ انھوں نے اپنا ماننا نکالا اور شام کا کھانا کھالیا۔ اور ایک چالیس خوردہ اس بڑھیا کو دیدیا پھر ان لوگوں نے شراب نکالی۔ بہرام نے اس بڑھیا سے پوچھا تمہارے ہاں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں ہم شراب پی لیں؟ بڑھیا نے کہا کہ میرے پاس ایک چھوٹا سا کدو ہے۔ چنانچہ اس نے وہ کدو ان کو لادیا ان لوگوں نے اس کا سر کاٹ کر (اندر سے گودہ صاف کر کے) اس میں شراب پینی شروع کردی۔ اس کے بعد انھوں نے کچھ نُقْل نکالا اور بڑھیا سے کہا کہ کوئی ایسی چیز تو لاؤ جس پر ہم یہ نُقْل رکھ لیں۔ بڑھیا گھر میں سے چھلنی لے آئی۔ انھوں نے اپنا نقل اس چھلنی پر ہی ڈال لیا اور کھانے لگے۔ بہرام کے حکم پر بڑھیا کو بھی شراب پلائی گئی۔ کچھ دیر کے بعد بہرام نے بڑھیا سے پوچھا کہ "بڑی بی! تمہارے پاس کوئی نئی خبر بھی ہے؟ بڑھیا نے کہا ہاں خبر تو یہی ہے کہ کسریٰ روم سے فوج لے کر آگیا ہے۔ اور اس نے بہرام سے جنگ کر کے اسے بھگا دیا ہے اور اپنا ملک اس سے واپس لے لیا ہے۔ بہرام نے پوچھا کہ: بہرام کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ وہ کیسا آدمی ہے؟ بڑھیا نے جواب دیا کہ "نرا جاہل اور بیوقوف ہے۔ شاہی خاندان سے تو ہے نہیں اور چلا ہے حکومت کا دعوی کرنے"؛ بہرام نے کہا کہ "جبھی تو وہ کدو میں شراب پیتا اور چھلنی میں نقل کھاتا ہے۔ چنانچہ یہ بات اہل ایران میں ضرب المثل بن گئی:

ہماری رائے میں یہ استدلال کچھ زیادہ قوی نہیں۔ کیونکہ ہر صاحب حکومت خاندان جب حکومت کرتے کئی پشتیں گذر جائیں تو عام لوگوں کی نگاہوں میں اس خاندان کا یہ الٰہی حق قائم ہو جاتا ہے۔ اور یہ کچھ ایرانیوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر قوم کا یہی حال ہے اگرچہ وہ اپنے بادشاہوں کی تقدیس کے قائل نہ بھی ہوں۔

ہمارے خیال میں اس رائے کی تائید میں کتاب "التاج" کا وہ بیان اس سے کہیں بہتر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ رعایا کو کبھی یہ جرأت بھی نہیں ہوتی تھی کہ وہ ساسانی خاندان کے بادشاہوں کی کنیت یا نام

لے سکیں۔ حتیٰ کہ اشعار میں، خطبوں میں، تقریظ و مدح میں اور نہ اور کسی تقریب میں بادشاہوں کا نام قطعاً نہیں لیا جاتا تھا۔ بادشاہوں کا نام لینا شاہان حیرہ میں پیدا ہو گیا تھا۔

اس سے یہ چیز ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ بادشاہ اپنے آپ کو کس قدر اونچا سمجھتے تھے۔ اور ان کی قوم ان کو کس قدر بلند مرتبہ خیال کرتی تھی۔ حتیٰ کہ یہ چیز انتہائی بے ادبی شمار ہوتی تھی کہ لوگوں کی زبان پر ان کا نام ... کثرت آجائے۔ حتیٰ کہ اشعار تک میں بھی اس کو ... معیوب سمجھا جاتا تھا۔

یہ تھے ایران کے دینی مذاہب جو فتوحات کے بعد اسلامی مملکت میں گھل مل گئے۔ ان میں سے بہت سے لوگ مسلمان تو ہو گئے مگر اپنے ان تمام عقائد و خیالات سے بیگانہ نہیں بن سکے جو پشتہا پشت سے ان میں چلے آرہے تھے۔ زمانہ جوں جوں گذرتا گیا وہ اپنے پرانے افکار و نظریات کو اسلام کے رنگ میں رنگتے چلے گئے۔

غور کیجئے تو حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کے بارے میں شیعوں کا نظریہ بعینہٖ وہی نظریہ ہے جو ان کے اگلے آباؤ اجداد کا نظریہ ساسانی شہنشاہوں کے بارے میں ہوا کرتا تھا۔ ایران کی ثنویت ہی وہ سرچشمہ تھی جس سے اسلام میں فرقۂ رافضہ نے سیرابی حاصل کی۔ اسی چیز نے معتزلہ میں حرکت پیدا کی۔ اور بالآخر وہ رافضہ اور ان جیسے دوسرے فرقوں کے دلائل کے ابطال پر کمربستہ ہوئے۔ اس پر اتنا اضافہ اور کر لیجئے کہ زردشت، مانی اور مزدک کی تعلیمات مسلمانوں کے درمیان تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد مختلف صورتوں میں ابھر سر نکالتی رہیں۔ چنانچہ اموی دورِ حکومت کا آخری حصہ اور دولت عباسیہ کا پورا دور اسی کی ایک رنگین داستان ہے۔ جس پر مسلمان مجبور ہوئے کہ وہ ان لوگوں سے مناظرے کریں۔ اور ان کے دلائل کا ابطال کریں۔ اور منطق اور برہان سے اپنے دین کی تائید کریں۔

ان لوگوں کی طرف سے آئے دن جو نت نئے مسائل پیدا کئے جاتے تھے۔ وہ بسا اوقات خود مسلمانوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ چنانچہ جس طرح وہ مختلف مذہبوں میں بٹ جاتے۔ اور آپس میں ہی لڑنا جھگڑنا شروع کر دیتے تھے۔ یہی وہ بنیادی وجہ تھی جو اسلام میں علم کلام کی پیدائش اور نشوونما کا باعث ہوئی۔ مگر یہ ایک مستقل باب ہے جسے ہم آئندہ کسی موقع پر بیان کریں گے۔

حقائق و عبر

زمینداری

مشرقی بنگال میں آجکل تنسیخ زمینداری کا ہنگامہ برپا ہے اور ہائیکورٹ میں حکومت کے اس فیصلہ کو چیلنج کرنیکے علاوہ اس کے خلاف زمینداروں اور ان کی بیگمات کی طرف سے احتجاجی جلوس بھی نکالے جا رہے ہیں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے جماعت اسلامی کا آرگن معزز معاصر روزنامہ ایشیا لاہور رقمطراز ہے۔

> معاملہ اب ہائیکورٹ کے سامنے ہے اور وہی فیصلہ کرے گا کہ فرمان گورنر اسلام کے اصولوں اور پاکستان کے آئین و دستور کے تقاضوں کے مطابق ہے یا نہیں۔ اور پھر ہر چند زمینداروں کی یہ اسلام پسندی اور دین داری غیر اسلام پسندانہ اور غیر دیندارانہ ذہن پر مبنی ہے۔ تاہم چونکہ ہمارا آئین اسلام کی پیروی کا عہد کر چکا ہے۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ اسلام کے اصولوں کا بے لاگ اطلاق کیا جائے۔ اور جن زمینداریوں کو ضبط کیا جائے اسلام کے دیئے ہوئے حق کی بنا پر کیا جائے۔ اس صورت میں مناسب ہوگا کہ بالاقساط معاوضہ کا سوال بھی باقی نہ رکھا جائے۔ اس سلسلہ میں اس امر کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ بعض لوگ موجودہ عہد کے زمینداروں اور ان کی زمینداریوں کے حالات سے گھبرا کر یہ چاہتے ہیں کہ ان کو بے تحاشا ضبط کر لیا جائے اور اسلام کو معیار فیصلہ نہ بنایا جائے ان کو اندیشہ ہے کہ اگر اسلام سے رجوع کیا گیا تو حق ملکیت کے اصول کی بنا پر شاید زمینداریوں کی تنسیخ ممکن نہ ہوگی۔ لیکن ان کا یہ اندیشہ بالکل باطل ہے۔ اسلام کسی غلط جابرانہ، ناجائز اور مخالفانہ حق ملکیت کو برقرار نہیں رہنے دیتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ باقاعدہ طور پر ان کو ختم کرتا ہے اور غیر اسلامی فلسفے ان کو بے قاعدہ طور پر۔ الخ (ایشیا مورخہ ۲۲ اپریل سنہ ۵۶ء)

اقتباس میں خط کشیدہ عبارت کو ایک مرتبہ پھر غور سے دیکھ لیجئے۔ اور ان نکات کو ذہن میں رکھیے کہ مدیر کے نزدیک

اسلام نے زمینداریوں کو ضبط کرنے کا حق دیا ہے۔ اور

اس میں بالاقساط معاوضہ کا سوال بھی باقی نہیں رہتا

جن لوگوں کو یہ اندیشہ ہے کہ اسلام کو معیار فیصلہ بنا کر زمینداریوں کی تنسیخ ممکن نہیں ہو سکیگی۔ ان کا یہ اندیشہ بالکل

ہے۔

(۴) اسلام زمینداریوں کو باقاعدگی کے ساتھ ختم کرتا ہے۔ جب کہ غیر اسلامی معاشی فلسفے انھیں بے قاعدہ طور پر ختم کر ہمارا خیال ہے کہ (محترم مدیر ایشیا) نے سطور بالا کو حوالہ قلم کرتے ہوئے جماعت اسلامی کے موقف کو ذہن میں نہیں کی توضیح جماعت اسلامی کے امیر محترم سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنی کتاب "مسئلہ ملکیت زمین" میں اس طرح

> ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔ لہٰذا اگر ہمیں اسلامی اصول پر زمین کے بندوبست کی اصلاح کرنی ہو۔ تو ایسی تمام چیزوں کو پہلے قدم پر ہی لپیٹ کر رکھ دینا چاہیئے۔ جن کی بنیاد میں قومی ملکیت کا نظریہ اصول یا نصب العین کی حیثیت سے موجود ہو بات صرف اتنی ہی نہیں کہ اسلام زبردستی مالکان زمین کی ملکیتیں چھین لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور بات صرف اتنی بھی نہیں ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کی اجازت بھی نہیں دیتا جن کے ذریعہ کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ بیچنے پر مجبور کیا جاسکے۔ بلکہ درحقیقت اسلامی نظریۂ تمدن واجتماع سرے سے اس تخیل ہی کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں۔ . . .
>
> اسلام کی حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کرسکتے ہیں۔ اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے حقوق کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں۔ اسلام جس چیز کا آدمی کو پابند کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس کے پاس جو کچھ مال آئے جائز راستے سے آئے۔ جائز طریقے پر استعمال ہو۔ جائز راستوں میں جائے۔ اور خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد کئے گئے ہیں۔ وہ اس میں سے ادا کر دیئے جائیں۔ اس کے بعد جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار۔ اتنا صنعتی کاروبار۔ اتنے مویشی، اتنی موٹریں۔ اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہوسکتے ہو۔ پھر جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت، صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہوسکتے ہو جسے براہ راست تم خود کرو۔ اور جس طرح اس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملے میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی کہ تم کسی ایسے کام پر حقوق ملکیت نہیں رکھ سکتے۔ جس کو تم اجرت پر یا شرکت کے طریقہ پر دوسروں کے ذریعہ کراتے ہو۔ اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بس وہی ہوسکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے اور یہ کہ اجرت یا شرکت کاشت کرانے والوں کو سرے سے زمین پر حقوق ملکیت حاصل ہی نہیں ہیں۔ اس قسم کی قانون سازیاں خود مختار لوگ تو کرسکتے ہیں مگر جو خدا اور رسول کے مطیع فرمان ہیں۔ وہ ایسی باتیں سوچ بھی نہیں سکتے۔

(مسئلۂ ملکیت زمین صفحہ ۴۳-۴۰)

لہٰذا مودودی صاحب کے نزدیک

(۱) ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تصور بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے اور

(۲) اسلام زبردستی مالکان زمین کی ملکیتیں چھین لینے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ

(۳) وہ ایسے قوانین بنانے کی بھی اجازت نہیں دیتا جن کے ذریعہ سے کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ بیچنے پر مجبور کیا جاسکے۔

مگر مدیر ایشیا کے نزدیک اسلام نے زمینداریوں کو ضبط کرنے کا حق دیا ہے اور اس میں بالاقساط معاوضہ کا سوال بھی باقی نہیں رہتا۔ ان کے نزدیک جو اس اندیشہ میں مبتلا ہیں کہ اسلام کو معیار فیصلہ بنا کر زمینداریوں کی تنسیخ ممکن نہ ہو سکیگی۔ ان کا اندیشہ بالکل باطل ہے۔ کیونکہ اسلام تو خود زمینداریوں کو ختم کرتا ہے اور باقاعدگی کے ساتھ ختم کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بدلتے ہوئے حالات اور رجحانات کے ماتحت جماعت اسلامی نے اب اپنی پالیسی میں تبدیلی کرلی ہو جس کے ماتحت مدیر ایشیا نے تنسیخ زمینداری کو عین اسلام کے مطابق قرار دیا ہے جبکہ ان سے پہلے ان کے امیر اسے اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد قرار دے چکے تھے۔ اگر ایسا ہے تو بات صاف ہو جانی چاہیئے تاکہ قارئین تشتت فکر و نظر کا شکار نہ ہوں اور وہ جماعت اسلامی کے موقف کو صحیح طور پر سمجھ سکیں کیا ہم محترم نصر اللہ خاں عزیز صاحب سے یہ امید کریں کہ وہ اس امر کو واضح فرما دیں گے۔

اسلام کی حقانیت کی ایک دلیل

معزز معاصر ایشیا مورخہ ۵ مئی سنہ ۱۹۵۶ء اپنے ایک ایڈیٹوریل نوٹ میں رقمطراز ہے کہ

"سننے میں آیا ہے کہ شاہ ایران ملکہ ثریا کو طلاق دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے بطن سے کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔ طلاق کی یہ وجہ نہ اسلامی ہے نہ اخلاقی۔ اول تو یہ کیا ضرورت ہے کہ شاہ ایران کا ولی عہد ضرور ہی ان کی اولاد میں سے کوئی بچہ ہو۔ تخت و تاج اگر کسی دوسرے شخص کے حصہ میں آتا ہے تو شاہ ایران کو اس پر اعتراض کرنے کا کیا حق ہے۔ دوسرے اگر اس ملکہ کے بطن سے اولاد نہیں ہوئی۔ اور ثابت ہو چکا ہے کہ وہ بانجھ ہیں تو شاہ دوسری عورت سے شادی کر سکتے ہیں۔ وہ بہرحال مسلمان ہیں۔ نہ عیسائی ہیں اور نہ یورپین۔ اسلام کا یہی تو احسان ہے انسانیت پر کہ وہ اس کی مشکلات کا ازالہ کرنے کی تدابیر پہلے سے کتاب قانون میں رکھ دیتا ہے۔ تعدد ازدواج کی اجازت کی ایک وجہ یہ ہے کہ بانجھ بیویاں طلاق کی مصیبت میں مبتلا نہ ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ایک کرشمہ ہے کہ وہ اسلام کی حقانیت کے دلائل خود انسانی زندگی کے نمایاں واقعات سے پیش فرماتی رہتی ہے"۔

جہاں تک اس چیز کا تعلق ہے کہ شاہ ایران کو اس پر اعتراض کا حق ہے یا نہیں کہ تاج و تخت ان کی اولاد کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے حصے میں کیوں آتا ہے۔ اس کا جواب تو شاید شاہ ایران خود ہی دے سکیں۔ ہمارے لئے قابل غور وہ مذکورہ کرشمہ ہے جو خدا نے اسلام کی حقانیت کی یہ مزعومہ دلیل مہیا فرمائی ہے کہ تعدد ازدواج کی اجازت اس نے کتاب قانون میں رکھی ہی اس لئے تھی کہ بانجھ بیویاں طلاق کی مصیبت میں مبتلا نہ ہوں۔ جہاں تک ہم نے قرآن پر غور کیا ہے ہمیں بجز ایسے ہنگامی حالات میں بیوہ اور یتیم لڑکیوں کے ساتھ اس کے بغیر عدل و انصاف کا سلوک نہ ہو سکتا ہو۔ دوسری کسی حالت میں تعدد ازدواج کی اجازت نہیں ملتی۔ معلوم نہیں محترم مدیر ایشیا نے یہ وجہ کہاں سے نکالی ہے کہ تعدد ازدواج کی اجازت کی ایک وجہ یہ ہے کہ بانجھ بیویاں طلاق کی مصیبت میں مبتلا نہ ہوں۔ قانون (کتاب) اور اس کی حکمت (وجہ اور علت) دونوں منزل من اللہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ سورۃ نسا میں ہے۔

وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا ۝ (4/113)

اور خدا نے اسے پیغمبر اسلام تم پر کتاب اور حکمت (دونوں) نازل کی ہیں اور تمہیں وہ چیزیں سکھائی ہیں جو تم نہیں جانتے تھے اور خدا کا تم پر بڑا فضل رہا ہے۔

ہمیں قرآن کریم میں تعدد ازدواج کی اجازت کی یہ حکمت (وجہ اور علت) کہیں نظر نہیں آئی کہ ایسا کرنے سے بانجھ عورتیں طلاق کی مصیبت میں مبتلا نہ ہو سکیں گی۔ قرآن تو قرآن ہے۔ تعدد ازدواج کی یہ مصلحت تو ہمیں حدیث کی کسی روایت میں بھی نظر نہیں آسکی۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم اور آپ کے صحابہؓ میں سے کسی نے اس مقصد سے کبھی دوسری شادی نہیں کی کہ پہلی بیوی سے اولاد نہیں ہوتی تھی۔

اگر اسلام کی حقانیت کے ایسے ایسے خود ساختہ دلائل (خدا کی قدرت کاملہ کا کرشمہ نہیں) جماعت اسلامی کے ہاں پیش فرماتے رہے تو اس دین کا اللہ حافظ ہے۔

اخلاقی جرآت کا نمونہ

معاصر المنیر کے ایک مقالہ بعنوان "تحلیل و تجزیہ" کا اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔ "المنیر ۱۱/۳ جنوری ۵۵ء میں مولانا عبد الغفار حسن صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے "طلوع اسلام" کے ایک مضمون کا تعاقب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

طلوع اسلام اپنی اشاعت مورخہ ۲۵ر جون ۵۵ء میں لکھتا ہے کہ جماعت اسلامی کے نزدیک دین کے ہر معاملہ میں سند ان کے امیر مودودی صاحب ہیں۔ چنانچہ جب وہ جہاد کشمیر کے سلسلہ میں قید ہوئے تو اس جماعت کے قیم محترم طفیل محمد صاحب نے ان کے متعلق لکھا تھا کہ مولانا اس زمانہ میں اسلام کی ایک ہی جیتی جاگتی ہستی تھے۔ اور اسلام کے ہر مسئلہ میں سند تھے اور ہیں (قائد کشمیر بحوالہ الفرقان بابت مئی جون ۵۵ء)

قیم جماعت اسلامی کی طرف منسوب کردہ عبارت قاصد کشمیر نمبر میں تلاش کی گئی لیکن ناکامی ہوئی۔ احتیاطاً الفرقان لکھنؤ بابت ماہ مئی جون بھی دیکھا گیا۔ لیکن اس میں بھی یہ حوالہ نہیں ملا۔ نہ معلوم الفرقان سے کون سا الفرقان مراد ہے۔ بہرحال طفیل محمد صاحب نے اس قسم کی عبارت قاصد کشمیر نمبر تو کجا کہیں بھی نہیں لکھی ہے۔ اور نہ جماعت اسلامی کا کوئی رکن اس نظریہ کا قائل ہے۔ کیا ادارۂ طلوع اسلام اس کا صحیح حوالہ دے سکتا ہے؟ اور اگر یہ الزام غلط ہے (اور واقعۃً غلط ہی ہے) تو کیا اس میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ وہ اپنی اس غلطی کا کھلے بندوں اعتراف کرلے

الفرقان (ربوہ) نے اپنی اشاعت جنوری سنہ ۵۶ء میں لکھا۔

ہمیں حیرت ہے کہ اتنے بڑے مولانا صاحب کو یہ پتہ نہیں کہ رسالہ الفرقان ربوہ سے شائع ہوتا ہے۔ حالانکہ المنیر میں اس الفرقان کا متعدد مرتبہ ذکر آچکا ہے۔ مولانا حسن صاحب اور دیگر اسلامی جماعت کے ارکین کی آگاہی کے لئے عرض ہے کہ یہ حوالہ اخبار طلوع اسلام کراچی نے الفرقان ربوہ بابت مئی جون ۵۰ء یعنی جماعت اسلامی نمبر ص۱۹ سے نقل کیا ہے جسے ہمارے فاضل نامہ نگار دوست محمد صاحب شاہد نے پیش کیا تھا۔

یہ حوالہ میاں طفیل محمد صاحب قیم جماعت کے مضمون "مسئلہ کشمیر اور جماعت اسلامی" میں موجود ہے۔ روزنامہ قاصد لاہور کے کشمیر نمبر مورخہ ۱۰ ستمبر ۵۰ء پر یہ الفاظ ہیں۔

پاکستان، ہندوستان، آزاد قبائل اور کشمیر ہر جگہ کے لوگوں کے نزدیک مولانا (ابوالاعلیٰ صاحب) اس زمانہ میں اسلام کی ایک مانی ہوئی ہستی تھے۔ اور اسلام کے ہر مسئلہ میں سند تھے اور ہیں۔

(اخبار قاصد کا کشمیر نمبر ہمارے پاس موجود ہے۔ اگر جناب اڈیٹر صاحب المنیر چاہیں تو انہیں دکھا سکتے ہیں، مولانا حسن صاحب اب کیا فرماتے ہیں؟) ان دنوں ہم نے قاصد کا کشمیر نمبر تلاش کیا۔ لیکن سعی بسیار کے باوجود ہمیں یہ پرچہ دستیاب نہ ہوسکا۔ اب گذشتہ ہفتہ ہمیں اس نمبر کی ایک کاپی مل گئی ہے۔ ہم نے اس حوالے کو تلاش کیا۔ حسب ذیل الفاظ ملے۔

پاکستان، ہندوستان، آزاد قبائل اور کشمیر ہر جگہ کے لوگوں کے نزدیک مولانا اس زمانہ میں اسلام کی ایک مانی ہوئی ہستی تھے۔ اور اسلام کے ہر مسئلہ میں سند تھے اور ہیں۔ (قاصد کشمیر نمبر ص۱۷)

المنیر کی گذشتہ دو سالہ زندگی شاہد ہے کہ ہم نے ہر مسئلہ میں اس بات کی تائید کی ہے جسے ہم اپنی تحقیق کی حد تک حق و صواب جانتے ہیں۔ اور ہر اس چیز کی تردید کی ہے جو ہمارے علم میں خدا، رسول اور اسلام کی منشاء کے مطابق نہیں، اور ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنا ہمارے اولین فرائض دینیہ میں شامل تھا اور ہے

البتہ ہم اس امر کے قائل نہیں کہ ہمارا تمام تر وقت صرف اسی کام میں صرف ہو کہ کس صاحب قلم اور صاحب علم نے کہاں کیا لکھا ہے۔ اور اس سے اس میں کیا چوک ہوئی ہے۔ اور جونہی ہمارے علم میں کسی کی کوئی غلطی آئے۔ ہم سب کام کاج چھوڑ کر اس کے پیچھے پڑ جائیں! یہ کام تو ان لوگوں کا ہو سکتا ہے جو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مصرف یہی سمجھتے ہیں کہ دوسروں کی فروگذاشتوں اور غلطیوں کا تذکرہ کر کے اپنی دکان تنقید کو چلائیں اور جن کا فکر اہم یہ ہو کہ اپنی غلطیوں کا جائزہ لیا جائے۔ اور اپنے متعلق زیادہ سے زیادہ ٹوہ لگائی جائے کہ خطا و نسیان کہاں کہاں سرزد ہوا۔ ان کے لئے ممکن نہیں کہ ایسا کرسکیں۔

بہر نوع ہم اپنا دینی اور اخلاقی فرض سمجھتے ہیں کہ جب ہمیں یہ الفاظ قاصد کشمیر نمبر میں مل گئے تو سب سے پہلے طلوع اسلام اور الفرقان دونوں کو مطلع کریں کہ الفرقان نے (مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے مضمون کے توسط سے) جو اظہار خیال کیا تھا۔ اگرچہ اس کا انداز استفہامیہ تھا تاہم حوالہ مل چکا ہے اور طلوع اسلام دار الفرقان دونوں نے اس حوالہ میں نہ خیانت کی ہے۔ نہ غلط بیانی۔

ہم معزز معاصر کی اس نیم اخلاقی جرأت پر بھی اسے مبارکباد دیتے ہیں کہ ہمیشہ کی طرح اس نے اس معاملہ میں چپ نہیں سادھی بلکہ اس کا اعتراف کر لیا کہ ہم نے حوالہ میں نہ کوئی خیانت کی تھی اور نہ کوئی غلط بیانی۔ لیکن اچھا ہوتا کہ اخلاقی جرأت کا ثبوت پورے طور پر دیا جاتا اور یہ بھی اعتراف کر لیا جاتا کہ جب جنوری ۱۹۵۵ء میں یہ لکھا گیا تھا کہ

قیم جماعت اسلامی کی طرف منسوب کردہ عبارت قاصد کشمیر نمبر میں تلاش کی گئی لیکن ناکامی ہوئی۔

اس وقت کھلی غلط بیانی سے کام لیا گیا تھا۔ کیونکہ اس وقت قاصد کشمیر نمبر میں محولہ عبارت کو تلاش کرنا تو کجا خود ان کے اعتراف کے مطابق

ان دنوں ہم نے قاصد کا کشمیر نمبر تلاش کیا۔ لیکن سعی بسیار کے باوجود ہمیں یہ پرچہ دستیاب نہ ہو سکا۔ اب گزشتہ ہفتہ ہمیں اس نمبر کی ایک کاپی مل گئی ہے

نیز ان دنوں معاصر موصوف کو قاصد کا کشمیر نمبر سعی بسیار کے باوجود دستیاب ہی نہیں ہو سکا تھا تو پھر یہ کیسے لکھ دیا گیا کہ "محولہ عبارت قاصد کشمیر نمبر میں تلاش کی گئی لیکن ناکامی ہوئی" اور پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ یہاں تک تحدی کے ساتھ لکھا گیا کہ

"بہرحال طفیل محمد صاحب نے اس قسم کی عبارت قاصد کشمیر نمبر تو کجا کہیں بھی نہیں لکھی ہے ...... اگر یہ الزام غلط ہے اور واقعۃً غلط ہی ہے تو کیا اس میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ وہ اپنی اس غلطی کا کھلے بندوں اعتراف کرے۔

اس کے بعد فاضل مدیر نے جو عذر گناہ پیش کیا ہے۔ وہ بدتر از گناہ کا نمونہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "البتہ ہم اس امر کے قائل نہیں کہ ہمارا تمام تر وقت صرف اسی کام میں صرف ہو کہ کس صاحب قلم اور صاحب علم نے کہاں کیا لکھا ہے۔ اور اس میں اس سے کیا چوک ہوئی

ہے: لیکن اس کے ساتھ ہی غالباً وہ اس کے قائل ضرور ہیں کہ جب کوئی انھیں ان کی اپنی غلطی پر متنبہ کرے تو ڈھٹائی کے ساتھ اس سے مکر جائیں اور الٹا غلطی پر متنبہ کرنیوالے کو جھوٹا بنانے کے لئے زمین و آسمان ایک کردیں۔ اگر ان کا فکر اہم یہ ہوتا کہ اپنی غلطیوں کا جائزہ لیا جائے اور اپنے متعلق زیادہ سے زیادہ ٹوہ لگائی جائے کہ خطا و نسیان کہاں کہاں سرزد ہوا؛ تو ان کو یہ ضرور معلوم ہوتا کہ ان کی جماعت کے قیم نے کہاں کیا غلطی کی تھی اور وہ اس سے اس ڈھٹائی کے ساتھ مکر جانے کی جرأت نہ کرسکتے۔ پھر شاید معاصر موصوف کو یہ بھی معلوم نہیں کہ استفہامیہ انداز کسے کہتے ہیں۔ بہتر ہو کہ وہ استفہام اور استفہامیہ انداز کے متعلق خود ہی گرامر کی کسی کتاب میں دیکھ لیں انھیں خود ہی معلوم ہوجائے گا کہ استفہامیہ انداز کیا ہوتا ہے اور تحدی کا انداز کسے کہتے ہیں اس کے بعد معزز معاصر لکھتا ہے۔

> ہماری تحقیق اور رائے اس بارے میں وہی ہے جو المنیر ۳ جنوری ۱۹۵۵ء میں مولانا عبدالغفار حسن صاحب نے بجواب طلوع اسلام لکھی ہے کہ جماعت اسلامی کا کوئی رکن یہ تسلیم نہیں کرتا کہ مولانا مودودی دین میں سند ہیں ۔۔۔۔۔ جماعت اسلامی نے اس عقیدہ کو آئینی حیثیت دی ہے چنانچہ دستور جماعت میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ
>
> رسول خدا کے سوا کسی کی مستقل بالذات پیشوائی و رہنمائی تسلیم نہ کرے۔ دوسرے انسانوں کی پیروی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے تحت ہو نہ کہ ان سے آزاد ۔۔۔۔۔۔۔ اس اہم بات کو صرف زرض کی حد تک ہی قانونی حیثیت نہیں دی گئی بلکہ ہر رکن شوریٰ کو اس امر کا پابند بنایا گیا ہے کہ وہ شوریٰ کے پہلے اجلاس میں ایک حلف اٹھائے جس میں یہ شق بھی شامل ہے۔
>
> میں ۔۔۔ اللہ رب العالمین کو گواہ کرکے اقرار کرتا ہوں کہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و وفاداری کو ہر چیز پر مقدم رکھوں گا (دستور ص ۵۹)

لیکن کون نہیں جانتا کہ کاغذ پر لکھی ہوئی ان دستوری دفعات کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہ جاتی۔ جب کہ ان دفعات کے ساتھ ہی جماعت اسلامی کے ہر رکن کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ

(۱) رسول اللہ صلعم اور آپ کی سنت کی اطاعت اور وفاداری احادیث کی رو سے ہو سکتی ہے اور

(۲) احادیث کے مجموعوں میں صحیح حدیثیں بھی موجود ہیں اور غلط حدیثیں بھی حتیٰ کہ صحیح بخاری تک میں غلط حدیثیں موجود ہیں۔ اور

(۳) اسے صرف مزاج شناس رسول ہی بتا سکتا ہے کہ فلاں حدیث صحیح ہے اور فلاں حدیث غلط ہے اور

(۴) بقول مولانا امین احسن اصلاحی صاحب یہ مزاج شناس رسول سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی ہیں۔

کیا معاصر موصوف کو اس کے بعد بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ ان حقائق کی روشنی میں رسول اللہ صلعم کی اطاعت و وفاداری کی حیثیت تو محض ایک نمائشی پردہ کی رہ جاتی ہے جس کی آڑ میں درحقیقت مزاج شناس رسول کی اطاعت اور وفاداری کا حلف لیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلعم کا نام تو محض برکت کے لئے یا جاہلوں کو فریب دینے کیلئے لیا جاتا ہے ورنہ درحقیقت دین کے ہر معاملہ میں سند مزاج شناس رسول ہی ٹھہر جاتا ہے۔ ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ محترم طفیل محمد صاحب قیم جماعت اسلامی نے جماعت اسلامی کے عقیدہ کے ماتحت قاصد کشمیر نمبر میں جب مودودی صاحب کو دین کے ہر معاملہ میں سند قرار

[illegible]

باب المراسلات

اعتکاف

کراچی سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

پچھلے دنوں نماز جمعہ کے سلسلہ میں ایک بڑے مولوی صاحب کے خطبہ کو سننے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے قرآن کریم سے اعتکاف کا حکم ثابت کیا اور بتایا کہ رمضان کے آخری دس دن کا اعتکاف کرنا بڑی ہی اہم عبادت ہے۔ اعتکاف کے احکام انھوں نے کچھ ایسے انداز سے بیان کئے۔ جن سے خالص رہبانیت جھلکتی تھی کہ ایک آدمی کو کچھ عرصہ کے لئے دنیا ومافیہا سے کاٹ کر مسجد میں بند ہوجانا پڑتا ہے۔ جہاں وہ ہمہ وقت عبادت (پرستش) الہٰی میں مصروف رہتا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اسلام اور قرآن اس قسم کی رہبانیت کی تعلیم کیسے دے سکتے ہیں۔ لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ انھوں نے اپنی ان باتوں کے لئے قرآن کا نام لیا اور سورۂ بقرہ کی آیت

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ط

کا حوالہ دے کر اپنی ساری باتیں قرآن کے سر تھوپ دیں۔

کیا مہربانی فرما کر آپ بتائیں گے کہ قرآن کی رو سے اعتکاف کی کیا حقیقت ہے؟ اور محولہ بالا آیت کا صحیح مطلب کیا ہے؟

طلوع اسلام آپ نے صحیح سمجھا ہے۔ اس قسم کا اعتکاف جو ہمارے ہاں رائج ہے۔ جس میں اعتکاف کرنے والا کسی مسجد کے ایک کونہ میں چادر تان کر دس روز کے لئے آکر پڑ رہتا ہے۔ اور دن رات قرآن کے الفاظ دہرانے یا سونے اور جوئیں مارنے کے اور کوئی کام نہیں رہتا۔ وہ قطعاً غیر قرآنی ہے۔ اور اسلام کی روح کے منافی ہے۔ اسلام اس قسم کی رہبانیت یا پرستش کی تعلیم نہیں دیتا۔ قرآن کریم میں اس قسم کے اعتکاف کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ "عاکفون" اور "عاکفین" کے لفظ قرآن کریم میں متعدد جگہ آئے ہیں جس کے معنی کسی کام پر مسلسل لگے رہنا اور جمے رہنا ہیں۔ کعبہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ طائفین اور عاکفین کے لئے ہے (۲/۱۲۵) وہاں عاکفین کے معنی ایسی جماعت کے ہیں جو نوع انسانی کا شیرازہ بکھرنے نہ دے بلکہ انھیں ایک رشتہ میں پرو کر ان کے حالات کو درست رکھے۔ اور مسلسل اسی دھن میں لگی رہے۔

جس آیت کا آپ نے حوالہ دیا ہے اس میں بھی مسلمانوں کو اعتکاف کرنے کا نہ کوئی حکم دیا گیا ہے۔ اور نہ ہی اس کی کوئی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ مولہ آیت میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے کہ ان کے لئے جو عاکفون فی المساجد ہوں ایک ہدایت دی گئی ہے اور بس

عاکفون فی المساجد کے معنے ہیں ـــ پابندی کے ساتھ مسجدوں میں رہنے والے۔ مسجدوں میں رک جانے والے۔ مسجدوں میں جم کر بیٹھنے والے ـــ یہ عاکفون فی المساجد جن کا تذکرہ ضمناً روزوں کے احکام میں کیا گیا ہے، کون لوگ ہیں؟ اس کو سمجھنے کے لئے مختصراً اتنی بات ذہن میں رکھئے کہ روزے دراصل مسلمانوں میں ضبطِ نفس اور قوت برداشت پیدا کرنے کا ایک ٹریننگ کورس ہیں۔ اور مسجدیں مسلمانوں کی حیات ملّی میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ روزوں کے ضمن میں یہاں مساجد سے مفہوم ٹریننگ سنٹر یا ٹریننگ کیمپ ہیں۔ اس کے بعد یہ سمجھئے کہ اس سالانہ ٹریننگ کورس میں کچھ لوگ ایسے بھی ہو سکتے ہیں۔ جن کو رات کے اوقات میں بھی کچھ ضروری امور کی تکمیل کے لئے ٹریننگ سنٹر یا ٹریننگ کیمپ میں روک لیا جائے۔ جیسا کہ پچھلی آیات میں وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے۔ اس ٹریننگ کورس میں جو لوگ حصے لے رہے ہیں (یعنی عام روزہ دار) ان کو جہاں یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ دن بھر کھانے پینے اور اپنی بیویوں کے پاس جانے سے احتراز کریں وہیں اس کی اجازت بھی دیدی گئی تھی کہ رات کے اوقات میں (جبکہ روزہ نہیں ہوتا) یہ لوگ اپنی بیویوں کے پاس جا سکتے اور جنسی تمتع حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جنہیں کسی خاص ڈیوٹی پر لگایا گیا ہو اور رات کے اوقات میں انہیں ٹریننگ سنٹر یا ٹریننگ کیمپ میں روک لیا گیا ہو۔ ایسے لوگوں کو رات کے اوقات بھی (عام روزہ داروں کے برعکس) اپنی بیویوں سے جدا رہنا چاہیئے۔ اس کے لئے نہ دس دن کی قید ہے اور نہ رمضان کے آخری دنوں کی۔ اس کا مدار نظام پر ہے کہ وہ آدمی کو رات کے اوقات میں کتنے روز یا کتنے وقت کیلئے ٹریننگ سنٹر یا کیمپ میں روکتا ہے۔ بہرحال جب تک یہ لوگ ٹریننگ سنٹر یا کیمپ میں رہیں گے انہیں اتنے عرصہ کیلئے جنسی تمتع سے محترز رہنا ہوگا۔ یہ ہے قرآن کریم کی اس آیت کا مطلب اور محل مگر چونکہ ہماری نگاہوں سے نظام اوجھل ہو چکا ہے اور تمام چیزیں رسمی پرستش کے طور پر کی جا رہی ہیں اسلئے اعتکاف بھی ایک رسمی پرستش کے طور پر باقی رہ گیا ہے۔

سیکولر بھارت

بھارت سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

آپ کے پڑوس میں ایک ایسی حکومت ہے جو سیکولر ہونے کی مدعی ہے۔ لیکن ہر قدم پر مسلمانوں کے خلاف امتیاز برتتی ہے مسلمانوں کو کوئی کلیدی ملازمت نہیں مل سکتی۔ ہر جگہ ہندو مسلم کا سوال ہے مسلمان ہونا سب سے بڑا جرم ہے مسلمانوں کی نہ کوئی آواز ہے نہ قدر و قیمت آج تک چھوٹی سی چھوٹی ریاست کا وزیر اعلیٰ بھی کوئی غیر ہندو نہیں ہو سکا۔ صدر یا وزیر اعظم یا سپہ سالار کا ذکر ہی کیا ہے دکھانے کیلئے گورنر غیر ہندو ہو جاتا ہے کیونکہ گورنر کا عہدہ محض نمائشی ہوتا ہے کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ براہ مہربانی وہاں کی ہندو پبلک سے اپنے پڑوس کی حکومت کے نام ایک وضاحت دلوا دیجئے کہ وہ غیر ہندوؤں کے خلاف امتیاز نہ برتے اور ان کے ساتھ انسانیت کا سلوک کرے۔

طلوعِ اسلام کیا جاتا ہے ارباب حکومت جنہیں مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کا غم ہر وقت کھائے جاتا ہے۔ اور جو ان کے لئے تبلیغی کانفرنسیں منعقد کرتے نہیں تھکتے اس خط کے مندرجات پر توجہ فرمائیں گے اور کیا اس تلخ حقیقت پر غور کر سکیں گے کہ ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کیلئے بھی اس قسم کی کوئی تبلیغی کانفرنس منعقد کرنے کی ضرورت ہے یا نہیں ... کے ساتھ ہی ہم مشرقی پاکستان کے ہندوؤں سے بھی آنا دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا مراسلہ نگار کی خواہش ... انسانیت کا سلوک کرے۔

لمعات (صفحہ ۱ سے آگے)

نشوونما کے اسباب و ذرائع مہیا کرنے کی ذمہ دار ہے۔

(۸) وسائل پیداوار انفرادی ملکیت میں نہ بٹنے دیئے جائیں۔ اور ہر شخص کی جائداد کی حدبندی کی جائے۔ موجودہ حالات میں دیانت اسی سے پیدا ہو سکے گی۔

(۹) تعمیر سیرت کے لئے قرآنی تعلیم کو دل کی گہرائیوں میں اتارا جائے اور رسول اللہؐ کے اسوۂ حسنہ کو جسے قرآن نے بیان کیا ہے، شمعِ بزم بنایا جائے۔

(۱۰) قانون سازی کے سلسلہ میں اس اصول کو ملحوظ رکھا جائے کہ کوئی قانون قرآنی اصولوں سے ٹکرائے نہیں۔

یہ ہے وہ طریق عمل جس سے ہم موجودہ جہنمی زندگی سے نکل سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمیں خدشہ ہے کہ ملک کمیونزم کے سیلاب میں بہہ جائے گا جس میں انسانیت کی کوئی قدر باقی نہیں رہتی۔ اس خدشہ کی بنیاد یہ ہے کہ ملک کے عوام میں مفلسی اور ناداری کے ساتھ مایوسی عام ہو رہی ہے اور پڑھا لکھا طبقہ ملا کے اس مذہبی تصور سے متنفر ہو چکا ہے جس کی بنا پر بدقسمتی سے ہمارے آئین کو اسلامی قرار دیا گیا ہے۔ یہی وہ اسباب ہیں جن سے وہ خلا پیدا ہو جاتا ہے جسے پُر کرنے کے لئے کمیونزم کا جھکڑ آیا کرتا ہے۔ کیا ارباب لیگ ہماری اس مخلصانہ گذارش پر غور کریں گے؟

قرآنی انقلاب کا لٹریچر

راج انسانیت از:- پرویز

سیرت صاحب قرآن علیہ التحیہ والسلام کو قرآن کے آئینہ میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش
مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور
ے کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ۔ مضبوط و حسین جلد مع گردپوش
ت:۔ بیس روپے۔

یس و آدم از:- پرویز

سلسلہ معارف القرآن کی پہلی جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق۔ قصہ آدم۔ جنات
ملائکہ، وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

ئے نور از:- پرویز

سلسلہ معارف القرآن کی دوسری کڑی جو حضرات انبیائے کرام کے تذکار جلیلہ پر مشتمل ہے جس میں
حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت شعیبؑ تک تمام انبیائے کرام علیہم التحیہ والسلام کا تذکرہ آگیا ہے۔
سائز $\frac{۲۹ \times ۲۲}{۸}$ ضخامت ۳۰۴ صفحات۔ قیمت مجلد مع گردپوش چھ روپے

سان نے کیا سوچا؟ از پرویز

فکر انسانی کی آج تک کی تاریخ کہ اس نے اپنی مشکلات و مسائل کو حل کرنے
کے لئے آج تک کیا سوچا! محترم پرویز صاحب کی بلند پایہ تصنیف
سائز $\frac{۲۹ \times ۲۲}{۸}$ ضخامت ۳۶۸ صفحات۔ قیمت مجلد مع گردپوش دس روپے

لیم کے نام از پرویز

نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ اور مدلل
جواب۔ بڑے سائز کے ۴۰۸ صفحات   قیمت چھ روپے

ردوس گم گشتہ از پرویز

ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا ہے۔ خالص ادبی
نقطۂ نظر سے بھی اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف ۴۱۶ صفحات بڑا سائز۔ قیمت چھ روپے

ظام ربوبیت از:- پرویز

انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور دورِ حاضر کی عظیم کتاب
بڑا سائز۔ ضخامت ۳۰۰ صفحات۔ قسم اول چھ روپے۔ قسم دوم غیر مجلد چار روپے

(محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا)

ملنے کا پتہ:۔ **ناظم ادارہ طلوع اسلام ۱۵۹/۳ ایل۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹**

کیا آپ نے یہ کتابیں دیکھی ہیں؟

جشن نامے

ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو، طنز اور تنقید کے گہرے نشتر، سالہ دور آزادی کی ہنستی ہوئی تاریخ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناس رسولؐ

یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول — مزاج شناس رسول کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی قیمت چار روپے

مقام حدیث

حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے۔

قرآنی دستور پاکستان از پرویز

اس میں پاکستان کیلئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت، علما اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۲۲۴ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام

اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے اسکے جواب میں جناب پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوریؒ کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۰۰ صفحات۔ قیمت دو روپے

نوادرات از علامہ اسلم جیراجپوریؒ

علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ

بڑا سائز ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت از پرویز

مسلمانوں کے عادات و اخلاق کا معاشرہ، رہنے سہنے کے ڈھنگ، سرکاری ملازمین کے فرائض و ... انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں ۱۹۲ صفحات قیمت دو روپے

قرآنی فیصلے

روزمرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآنی روشنی میں بحث

۴۰۸ صفحات قیمت چار روپے

اقبال اور قرآن از پرویز

علامہ اقبالؒ کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ ۲۵۶ صفحات قیمت دو روپے

اعجاز القرآن از علامہ تمنا عمادی مدظلہ

جس میں مختلف جہات سے قرآن پر روشنی ڈالی گئی ہے

سائز ۲۰×۳۰/۸ ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ قیمت غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے

(محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا)

ملنے کا پتہ ——— ناظم ادارہ طلوع اسلام ۱۵۹/۲ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹

انڈس

خوبصورت اور پائیدار

شیشے کے برتنوں کا ضامن ہے

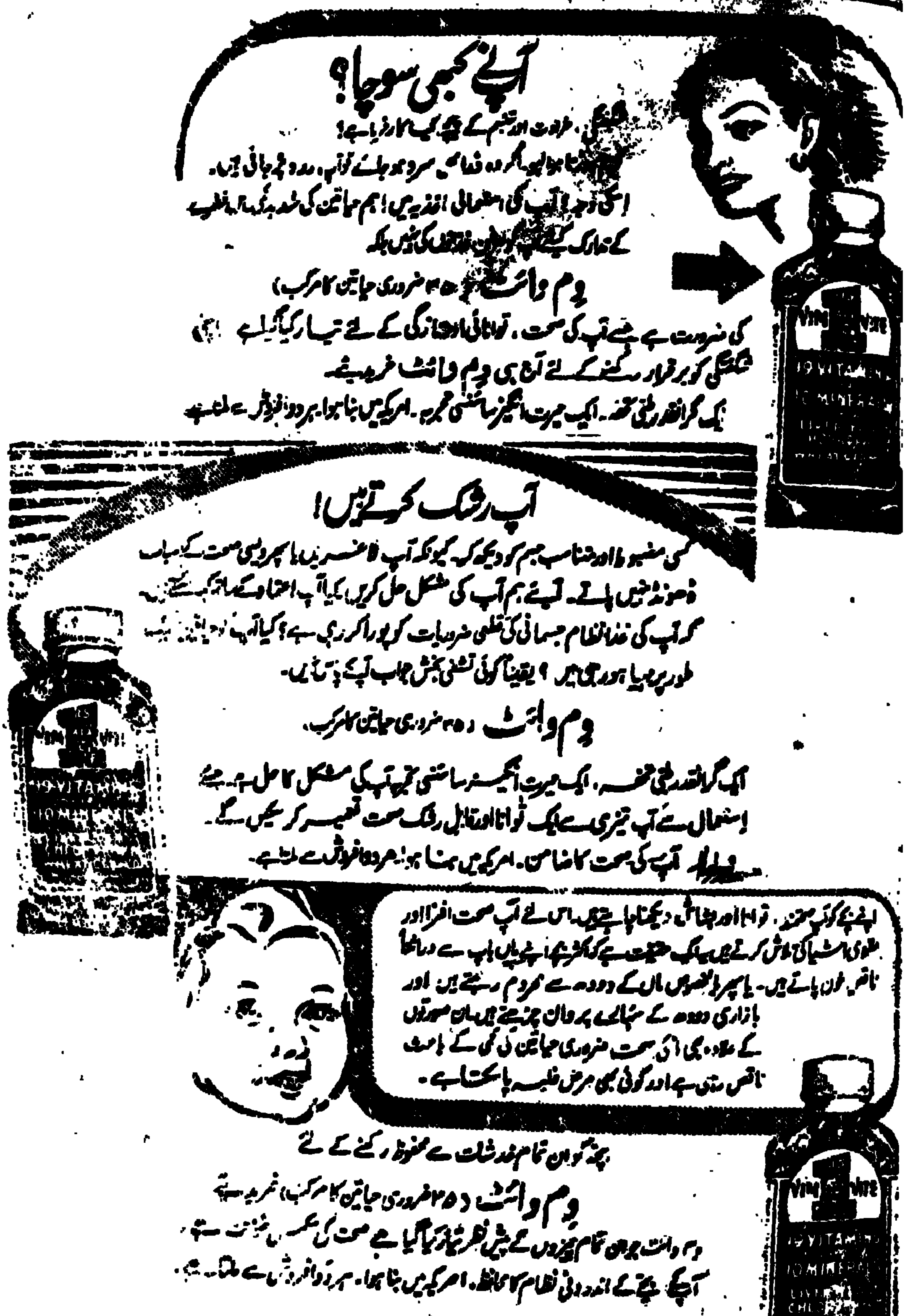
—— ہمارے ہاں ——

ہر قسم کے شیشے. جگ، گلاس، برنیاں وغیرہ رنگین و سادہ منقش و پھولدار چمنیاں وگلوب، بوتلیں و اسٹیشنری اشیاء و بلاگ گلاس تیار ہوتے ہیں۔

انڈس گلاس ورکس پوسٹ بکس ۵

گولیمار روڈ —— حیدرآباد (مغربی پاکستان)


چھوٹا مسواک ٹوتھ برش
Hashmi
دانتوں کی صفائی بچوں کو صحت مند اور توانا رکھتی ہے
چھوٹے بچوں کے لئے چھوٹا مسواک
نایاب تحفہ ہے
جو نرم و نازک مسوڑوں کے لئے بے ضرر ہے اور
جس کا استعمال نو بچوں کیلئے سیفدیری مشغلہ ہے


آپ نے کبھی سوچا؟
حرارت اور تشنج کے پیچھے کیا کار فرما ہے!
وِم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب)
کی ضرورت ہے جسے آپ کی صحت، توانائی اور تازگی کے لئے تیار کیا گیا ہے
شگفتگی کو برقرار رکھنے کے لئے آج ہی وِم وائٹ خریدیئے
ایک گرانقدر طبی تحفہ۔ ایک حیرت انگیز سائنسی تجربہ۔ امریکہ میں بنا ہوا۔ ہر دوا فروش سے ملتا ہے
آپ رشک کرتے ہیں!
کسی مضبوط اور متناسب جسم کو دیکھ کر۔ کیونکہ آپ لاغر ہیں یا پھر ویسی صحت کے اسباب
ڈھونڈ نہیں پاتے۔ آیئے ہم آپ کی مشکل حل کریں۔ کیا آپ اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں
کہ آپ کی غذا نظام جسمانی کی قطعی ضروریات کو پورا کر رہی ہے؟ کیا آپ
طور پر مہیا ہو رہی ہیں؟ یقیناً کوئی تشفی بخش جواب آپ کے پاس نہیں۔
وِم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب)
ایک گرانقدر طبی تحفہ، ایک حیرت انگیز سائنسی تجربہ آپ کی مشکل کا حل ہے۔ جس کے
استعمال سے آپ تیزی سے ایک توانا اور قابل رشک صحت تعمیر کر سکیں گے۔
وِم وائٹ آپ کی صحت کا ضامن۔ امریکہ میں بنا ہوا۔ ہر دوا فروش سے ملتا ہے۔
توانا اور بشاش دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے آپ صحت افزا اور
تلاش کرتے ہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ اکثر بچے اپنے ماں باپ سے ورثے میں
ناقص خون پاتے ہیں۔ یا پھر بالخصوص ماں کے دودھ سے محروم رہتے ہیں اور
بازاری دودھ کے سہارے پروان چڑھتے ہیں۔ ان صورتوں
کے علاوہ بھی ان کی صحت ضروری حیاتین کی کمی کے باعث
ناقص رہتی ہے اور کوئی بھی مرض غلبہ پا سکتا ہے۔
بچے کو ان تمام خدشات سے محفوظ رکھنے کے لئے
وِم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب) خریدیئے
وِم وائٹ جو ان تمام چیزوں کے پیش نظر تیار کیا گیا ہے صحت کی ضمانت ہے
آپ کے بچے کے اندرونی نظام کا محافظ۔ امریکہ میں بنا ہوا۔ ہر دوا فروش سے ملتا ہے۔


حفاظت کے لیے
مسواک
استعمال کیجیے
Guaranteed
No Animal
Bristles
مسواک
انگلینڈ میں بنا ہوا
ہر دکان پر ملتا ہے



کیڑے نہ کھایئے

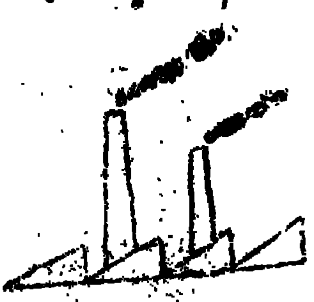
وہ چھالیہ جس کو پیڑ کی شاخوں پر کیڑوں نے اپنا مسکن بنالیا تھا
آپ خوشبوؤں کے سہارے پان میں بلا تکلف استعمال کرلیتے ہیں۔
ممکن ہے یہی کیڑے آپکے گلے کو خراب کردیتے ہوں۔ اور آپ کو
اس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔

پان کھانا ہے

تو ——— پان کے اجزا پر نگاہ رکھیئے

ہنسا چھالیہ

* صاف ہے
* خشک ہے
* پرانی ہے



—— پیکٹ میں ہر جگہ ملے گی ——

ابرکرمیولے محمد [illegible] یونس چھالیہ والے: جونا مارکیٹ کراچی ۲



خوشگوار
صحت
کیلئے
مسواک ٹوتھ پیسٹ
استعمال کیجئے
MISWAK


DURA-GLOSS
Nail Polish
MADE IN U.S.A.
دوراجلوس
ناخون کی پالش
تزئین حسن کے لئے
ناخون کی آرائش ضروری ہے
دوراجلوس
خوش رنگ۔ دیدہ زیب۔ چمکدار اور
خوشبودار پالش ہے۔
ہر بڑے دوکاندار سے ملتی ہے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	خط و کتابت کا پتہ	ٹیلیفون	اشتراک سالانہ
ہندوستان سے بارہ آنے	ایل ۳/۱۵۹ پی۔ای۔سی۔ایچ سوسائٹی کراچی نمبر ۲۹	۴۱۴۶۸	ہندوستان اور پاکستان سے آٹھ روپے
پاکستان سے بارہ آنے			غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ

نمبر ۶	جولائی سنہ ۱۹۵۶ء	جلد ۹

فہرست مضامین

(ضروری اعلان)

(۱) آئندہ پوسٹ بکس کے پتہ پر خط و کتابت نہ کی جائے (۲) اب ہمارا مستقل پتہ یہ ہے۔ تمام مکاتبت اسی پتہ پر ہونی چاہیئے

ادارہ طلوعِ اسلام ۳/۱۵۹ ایل۔ پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی نمبر ۲۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۰

لمعات

آجکل دنیا کی قومیں اپنے پیشِ نظر مقاصد و مصالح کو خاص اسکیموں کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ اپنے سامنے ایک نصب العین رکھتی ہیں، اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے ایک عرصہ متعین کرتی ہیں اور پھر اس عرصہ کے اندر اُس منزل تک پہنچنے کے لئے ایک پروگرام مرتب کرتی ہیں اسے پلاننگ (PLANNING) کہتے ہیں (جس کا عام طور پر ترجمہ منصوبہ بندی کیا جاتا ہے اگرچہ ہمارے نزدیک یہ ترجمہ پلاننگ کے صحیح مفہوم کو سامنے نہیں لاتا) مقاصد پیشِ نظر کے حصول کے لئے یہ طریقِ کار نہایت موزوں (بلکہ اس زمانے میں اشد ضروری) ہے اس سے ترقی کی رفتار ماپی جاسکتی ہے۔ سفر اور آوارگی میں فرق ہی یہ ہے کہ سفر میں منزل متعین ہوتی ہے۔ اور ہم ہر وقت اندازہ کرسکتے ہیں کہ ہم اس منزل سے کس قدر قریب آچکے ہیں۔ آوارگی میں کوئی متعین منزل سامنے نہیں ہوتی۔ اس لئے اس میں قدم تو برابر اٹھتے ہیں لیکن راستہ طے نہیں ہوتا۔

پاکستان کو وجود میں آئے قریب نو سال ہوچکے ہیں لیکن اس نے ابھی تک اپنے کاموں کے لئے کوئی پلان مرتب نہیں کیا۔ مقامِ شکر ہے کہ حکومتِ پاکستان کے پلاننگ بورڈ کی طرف سے اب پہلا پلان ملک کے سامنے آیا ہے۔ لیکن اس پلان کی اشاعت بھی ہمارے نظم و نسق کی خصوصیات کی آئینہ دار ہے۔ پلان پانچ سال کے لئے ہے جس کی ابتدا یکم اپریل ۱۹۵۵ء سے ہوتی ہے یعنی اس پلان کو اپریل ۱۹۵۵ء سے شروع ہونا چاہیئے تھا لیکن عملاً حالت یہ ہے کہ پلان (نہیں بلکہ پلان کا ڈرافٹ یعنی مسودہ) مئی ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا ہے (معاف کیجئے ہم سے غلطی ہوئی) مئی ۱۹۵۶ء میں بھی پلان کا مسودہ نہیں بلکہ پلان کے موٹے موٹے خطوط (OUTLINES) کا مسودہ شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد پلان کا مسودہ شائع ہوگا۔ اس مسودہ پر بحث و تنقید ہوگی۔ پھر وہ اپنی آخری شکل میں شائع ہوگا۔ اس کے بعد اس پر کہیں جاکر عملدرآمد شروع ہوگا۔ جس رفتار سے ہمارے دفاتر میں کام ہوتا ہے۔ اس سے کچھ عجب نہیں کہ پانچ سال کا عرصہ (یا کم از کم اس کا معتد بہ حصہ) اس پلان کی اشاعت ہی میں صرف ہو جائے۔ عجب تک یہ پلان اپنی آخری شکل میں شائع ہو اس وقت حالات میں ایسی تبدیلی آجائے کہ خود اس پلان کو بدلنے کی ضرورت محسوس ہو۔ غور کیجئے کہ جس پلاننگ کی ابتدا اس طرح ہو، اس کی تکمیل کے متعلق کوئی اپنے آپ کو کس حد تک خوش فہمی میں مبتلا رکھ سکتا ہے!

قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ پلاننگ کی بنیاد ہمیشہ اعداد و شمار پر ہوتی ہے۔ جس قدر اعداد و شمار قابل یقین ہوں گے اسی قدر اس پلان کی تکمیل یقینی ہوگی۔ کسی ملک کے ذرائع و وسائل میں انسانی قوت (MAN-POWER) کو جس قدر اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لہٰذا پلاننگ کے اعداد و شمار میں اس اطلاع (INFORMATION) کا ہونا نہایت ضروری ہے کہ ہمارے ہاں بیکاروں کی تعداد کس قدر ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ فلاں اسکیم کو بروئے کار لانے کے لئے ہمیں مناسب آدمی مل سکیں گے یا نہیں۔ یا ان بیکاروں کو کام پر لگانے کے لئے ہمیں کس کس قسم کی اسکیمیں بنانی چاہئیں۔ اس باب میں پلان زیر نظر کے مسودہ میں شروع ہی میں اس امر کا اظہار کر دیا گیا ہے کہ

> گزشتہ چند سالوں میں مختلف صنعتوں اور پیشوں میں کتنے بیکار آدمیوں کی کھپت ہوئی ہے۔ اور اس میں کس قدر اضافہ ہوا ہے۔ اس کے متعلق کوئی قابل یقین اطلاع موجود نہیں۔ نہ ہی ہم اس امر کا کوئی قابل وثوق اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پلان کے پانچ سالہ عرصہ میں کیا کیا تبدیلیاں ہوں گی۔ دیہاتی علاقوں میں کس قدر بیکاری ہے۔ اس کے متعلق سرے سے کوئی اطلاع ہی موجود نہیں۔

آدمیوں کے بعد ملک میں مویشیوں کی اہمیت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں پلان میں لکھا ہے کہ

> ملک میں مویشیوں کی تعداد کس قدر ہے۔ اس کے متعلق بھی کوئی اطلاع موجود نہیں کیونکہ سنہ ۱۹۴۵ء کے بعد مکمل مویشی شماری ہی نہیں کی گئی۔

کس قدر افسوسناک اور الم انگیز ہے یہ حالت کہ کسی ملک کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ اس میں بیکاری اور بیروزگاری کا کیا عالم ہے۔ اور ان بیکاروں میں کس کس فن اور حرفہ کے موزوں افراد موجود ہیں۔ یا اس میں مویشیوں کی تعداد کتنی ہے کتنے ہر سال پیدا ہوتے ہیں اور ختم کر دیئے جاتے ہیں یا ختم ہو جاتے ہیں۔ جس ملک کی حکومت نو سال کے عرصہ میں اتنا بھی نہ کر سکی ہو۔ اس ملک کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ

خدا ایں سخت جاں را یار بادا — کہ افتاد است از بام بلندے

اس تمہیدی تعارف کے بعد ہم اصل پلان کی طرف آتے ہیں۔ لیکن اس تمہید سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم اس پلان پر تخریبی تنقید کی نگاہ سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ تخریبی تنقید ہمارے نزدیک بہت بڑا جرم ہے۔ جس کا مرتکب طلوع اسلام کبھی نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کا حصول طلوع اسلام کے لئے جزو ایمان رہا ہے۔ اور اب اس کے استحکام کی کوشش اس کا مقصد زندگی۔ اس لئے اس کی ہر تنقید تعمیر کے لئے ہوتی ہے اور اس کی نکتہ چینی اور استقام ہماری اصلاح کی خاطر۔ لہٰذا ارباب متعلقہ کی خدمت میں ہماری گذارش ہے کہ وہ ہماری تنقید کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ ہم سب (پاکستانی) ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ اگر کشتی کا کوئی مسافر بتاتا ہے کہ کشتی میں فلاں جگہ سوراخ ہے تو اس سے کشتی کے ملاحوں کو برا نہیں منانا چاہیئے۔ اس سوراخ کے بند کرنے کی تدابیر سوچنی چاہئیں۔ اس مقام پر اتنا اضافہ اور بھی ضروری ہے کہ ہم نے پلان کے صرف اقتصادی پہلو ہی کو سامنے نہیں رکھا اس کے معاشرتی گوشوں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ بلکہ ان گوشوں کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس لئے کہ اقتصادی ترقی سے مقصود بھی معاشرتی فلاح و بہبودی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں بعض امور ایسے بھی سامنے آئیں گے جن کا تعلق براہ راست اس پلان سے نہیں بلکہ مملکت کے دوسرے شعبوں سے ہے جن میں اصلاح

وترمیم کی اشد ضرورت ہے۔ یہ بھی واضح ہے کہ ہماری ہر تنقید اور ہر تجویز قرآن کریم کی تعلیم پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لئے اس تبصرہ کا قرآن ہی کی روشنی میں مطالعہ کیا جانا ضروری ہے۔

دیہی اصلاح

پلان میں درج شدہ اطلاعات کے مطابق (جو ۱۹۵۱ء کی مردم شماری پر مبنی ہے) پاکستان کی آبادی کا قریب نوّے فیصدی حصہ دیہات میں آباد ہے۔ اس لئے اس پلان میں دیہاتی آبادی کی فلاح و بہبود اور اصلاح و تربیت پر خاص زور دیا گیا ہے۔ ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے کوئی ایسی تجویز پیش نہیں کی گئی جو ہمارے ملک کے حالات کے لئے موزوں و مناسب ہو۔ اس میں سارا زور (VILLAGE AID) پر دیا گیا ہے (جس کا غلط العام ترجمہ دیہی امداد کیا جاتا ہے) یہ اسکیم امریکہ کی وضع کردہ ہے اور مغربی ممالک کے دیہات کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ مغربی ممالک (بالخصوص انگلینڈ اور امریکہ) کے دیہات اور ہمارے دیہات کی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مغربی ممالک کے دیہات میں کوئی شخص بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں۔ ابتدائی درجہ تک تعلیم لازمی ہوتی ہے۔ حکومتوں کی طرف سے صدیوں کی مسلسل محنت کے بعد، ان کا عام معیارِ زندگی (بالخصوص معیارِ صحت) بلند ہو چکا ہے۔ زراعت کے سلسلہ میں انہیں نہ صرف مراعات حاصل ہیں بلکہ حکومت خود نت نئے تجربے کرتی رہتی ہے۔ جن سے کم از کم خرچ پر زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو۔ ان کی پیداوار کی فروخت کے لئے منڈیوں کا خاص انتظام ہے۔ اور سلبِ نہب (PLOITATION) کی روک تھام کا مناسب اہتمام۔ ان حالات میں ان لوگوں کے لئے تھوڑے سے فنی مشورے اور ذرا سی مالی امداد بھی ان کی زرعی اور صنعتی ترقی کے لئے کافی نشوونما کا موجب بن جاتی ہے۔ امریکن اسکیم اپنے حالات کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے اس اسکیم کو اگر ہم اپنے ہاں کے دیہات میں لگا بیٹھ جائیں تو اس کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اس سے پیشتر ہم نے (مغرب ہی کی نقالی میں) اپنے دیہات میں امداد باہمی (کوآپریٹو سوسائٹیز) کی اسکیم جاری کر کے دیکھ لیا ہے کہ وہ کس درجہ ناکام ثابت ہوئی ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں دیہات سدھار اور پنچایت کی اسکیمیں بھی جس بری طرح فیل ہوئی ہیں وہ تجربہ ہمارے سامنے ہے۔ اب انہی خطوط پر "دیہی امداد" کی اسکیم کو رائج کرنا "آزمودہ را آزمودن" کے سوا اور کیا ہے؟ ہمیں امریکہ سے روپیہ (امداد) مل گیا لیکن اس روپے کے موزوں اور نتیجہ خیز مصرف کے لئے ذہنی کاوش اور فکری جہد کی ضرورت تھی۔ لیکن ہمارے ہاں اس قسم کی کاوش اور فکر کون کرے! ہم نے ایک منسٹری قائم کر لی اور یہ روپیہ اس کے حوالے کر دیا۔ اب اس کا کام یہ ہے کہ اس روپے کو کسی نہ کسی صورت ختم کرے۔ وہ روپیہ ختم کر رہی ہے۔ باقی رہا نتیجہ! سو وہ (مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق) خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ انسان اس میں کیا کر سکتا ہے! البتہ کانفرنسیں منعقد کر سکتا ہے۔ بیانات دے سکتا ہے۔ شاندار رپورٹیں مرتب کر سکتا ہے۔ سو اس باب میں ہم کسی سے پیچھے نہیں۔

معاف رکھئے! یہ کام منسٹری کے ٹھنڈے ٹھنڈے کمروں میں، نرم و نازک کرسیوں پر بیٹھنے والوں کے بس کا نہیں۔ یہ کام ان "دیوانوں"

ملہ (VILLAGE AID) میں A.I.D. کے تین حروف مخففات ہیں (AGRICULTURAL AND INDUSTRIAL DEVELOPMENT) کے یعنی زرعی اور صنعتی نشوونما کے۔

...ہات میں انسانیت کا وقف لئے ہی اور جون کی چلچلاتی دھوپ اور نومبر اور دسمبر کی کڑکڑاتی سردی میں گاؤں گاؤں پھریں ایک ایک شخص کی ...ت کا مطالعہ کریں۔ دیہاتیوں کی زندگی اور ان کی مشکلات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں۔ ان کے اندر رہیں سہیں اور انہی جیسی زندگی بسر ...یں اور اس کے بعد سوچیں کہ ان کی مصیبتوں کا حل کیا ہوسکتا ہے۔ دیہی امداد کا روپیہ صرف اس طرح نتیجہ خیز ہوسکتا ہے۔ نہ کہ اس صورت میں ...یں یہ اب صرف ہو رہا ہے۔ اس سے کون سے نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے؟

جنوں نہ داری و ہوئے فگندۂ در شہر
سبو شکستی و بزمِ شبانہ می خواہی ؟

...ایجنسیوں سے متعلقہ افسر جس انداز سے گاؤں میں جاکر جلسے کرتے اور کھیل تماشے رچا کر واپس آجاتے ہیں، اسے دیکھ کر ان گاؤں والوں کی ...بسی اور زبوں حالی ایک استہزا آمیز ہنسی ہنستی اور ان مشفقین کرام سے پوچھتی ہے کہ

بہ جہانِ دردمنداں تو بگو چہ کار داری — تپشِ تاب ناشناسی؛ دلِ بیقرار داری؟
چہ خبر ترا ز اشکے کہ فرو چکد ز چشمے — تو بہ برگِ گل ز شبنم دُرِ شاہوار داری؟

...لک دیہات کی حالت جس نازک ترین مرحلہ تک پہنچ چکی ہے۔ اس کے اگلے قدم کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے لیکن ہمارے ارباب نظم و نسق ...ن طوفانوں کا مقابلہ کاغذی ناؤ سے کرنا چاہتے ہیں۔ وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ۔

صنعت کاری

پلان میں کہا گیا ہے کہ گزشتہ چند سالوں میں ملک میں صنعتی ترقی کی رفتار بہت تیز رہی ہے۔ اس پلان میں اس رفتار کو تیز تر کرنے کی تجویز کی گئی ہے بشرطیکہ وہ ترقی متوازن ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ ملک کی ترقی کا راز متوازن صنعتی ترقی میں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس توازن کو برقرار رکھنے کے لئے طریق کار کیا تجویز ...لیگیا ہے۔ پلان میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس پروگرام کی تکمیل کے لئے زیادہ سے زیادہ بھروسہ انفرادی اور ذاتی کارخانہ داری (PRIVATE ENTERPRISE) پر کیا گیا ہے چنانچہ اس ضمن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ پاکستان انڈسٹریل ڈویلپمنٹ کارپوریشن ...پنی مشینری اور کارخانوں کو ذاتی ملکیتوں میں بیچنے کے طریق عمل کو جاری رکھے گی یعنی مملکت کی پالیسی یہ ہوگی کہ ملک کے صنعتی ادارے ...اتی ملکیتوں میں رہیں۔ توازن کے معنی یہ ہیں کہ کارخانے ان چیزوں کو پیدا کریں جن کی ملک کو ضرورت ہے۔ نہ کوئی چیز ضرورت سے زیادہ پیدا کی جائے نہ کم۔ لیکن اقتصادیات کے ادنیٰ طالب علم بھی اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ جب صنعتی ادارے ذاتی ملکیت میں ہوں تو وہ یہ نہیں ...یکھتے کہ ملک کو کن چیزوں کی ضرورت ہے وہ یہ دیکھتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ منافع کن چیزوں کے تیار کرنے میں ہے۔ لہذا کارخانوں کو ذاتی ملکیتوں ...میں دے کر متوازن صنعتی ترقی کی امید رکھنا کیا خود فریبی کے مترادف نہیں؟ کہا جاسکتا ہے کہ صنعتی اداروں کے مالکوں کو مملکت کی پالیسی کے تابع چلنا ہوگا ...لیکن اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ خود مملکت کی پالیسی متعین کرنے میں ان کارخانہ داروں کا کس قدر ہاتھ ہے؟ اور تو اور امریکہ جیسے ...ملک میں بھی پریذیڈنٹ کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ ملک کے سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کا رجحان کس طرف ہے؟ وہ ان کی مرضی کے خلاف جاکر

الیکشن نہیں جیت سکتا۔ وہ اپنی ہستی کے لئے ان کا دست نگر ہوتا ہے۔ جب امریکہ جیسے ملک میں سرمایہ داروں کے اثر کا یہ عالم ہے تو اپنے ہاں اس کی کس طرح توقع رکھ سکتے ہیں کہ ملک ایسی پالیسی اختیار کر سکے گا جو کارخانہ داروں کے خلاف جائے اور یہ لوگ اس پالیسی کا اتباع کریں۔ صنعتی ترقی میں توازن قائم رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ کارخانے مملکت کی تحویل میں رہیں نہ کہ انفرادی ملکیت میں۔ انفرادی ملکیت کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس ایک مثال سے لگائیے کہ ملک میں کپڑے کی پیداوار زائد از ضرورت (OVER PRODUCTION) بتائی جاتی ہے لیکن ملک کے عام باشندوں کو تن ڈھانپنے تک کو کپڑا نصیب نہیں ہوتا۔ یاد رکھئے جب تک ہم حقائق کا سامنا ہمت اور جرأت سے نہیں کرتے اور محض تقلیدی رو میں بہے جانے کا نام ترقی رکھ لیتے ہیں۔ اس وقت تک ہمارا کوئی پلان حقیقی اصلاح نہیں کرے گا۔ اس قسم کے پروگراموں سے امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جائے گا۔

صحت

صحت کی بہتری کے لئے پلان میں کہا گیا ہے کہ ملیریا اور تپ دق کی روک تھام کے لئے مناسب تدابیر عمل میں لائی جائیں گی، ریسرچ (طبی تحقیقات) حفظان صحت سے متعلق تعلیم، ہسپتال اور دواخانوں کی تعداد میں اضافہ اور دیگر اس قسم کے اقدامات کئے جائیں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تمام تجاویز مناسب اور ضروری ہیں لیکن ان سے کہیں زیادہ اہم امور اور ہیں جن کا پلان میں ذکر نہیں۔ طبی امداد اور دوائیاں بیماری کا علاج ہیں۔ صحت کا مدار ان چیزوں پر نہیں ہوتا۔ صحت کا مدار ہے متوازن غذا اور صحت مندانہ ماحول پر۔ ہمارے ملک میں حالت یہ ہے کہ متوازن غذا تو ایک طرف، ملک کی بیشتر آبادی کو پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ باقی رہا ماحول کا طریق۔ سو اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ایک کراچی میں لاکھوں انسان ان جھونپڑیوں میں بستے ہیں جن میں انسان تو انسان حیوان تک تندرست نہیں رہ سکتے جب تک آپ ملک کے باشندوں کی روٹی اور مکانات کا انتظام نہیں کرتے۔ آپ ان کی صحت کو کس طرح ٹھیک کر سکتے ہیں؟ دوسرے یہ کہ ایلوپیتھک طریق علاج، جسے ملک میں خود حکومت کی حوصلہ افزائی (PATRONAGE) حاصل ہے، اتنا گراں ہے کہ وہ ہمارے جیسے غریب ملک کے لئے کبھی سود مند ثابت نہیں ہو سکتا۔ ہمارے لئے صحیح پلان یہ ہونا چاہیئے کہ جراحی (SURGERY) کے لئے تو مغربی طریق سے فائدہ اٹھایا جائے لیکن طبی علاج کے لئے سستے طریق علاج (مثلاً ہومیو پیتھی) کی نشو و نما کی جائے۔ اس کے لئے حکومت کی طرف سے کالج کھولے جائیں اور تحقیقاتی ادارے اور دواسازی کے کارخانے قائم کئے جائیں۔ اس وقت یہ طریق علاج محض اس لئے ناکام سا دکھائی دیتا ہے کہ یہ ان پڑھوں اور نااہلوں کے ہاتھ میں ہے اور اس کی ذمہ داری بھی حکومت پر ہے جس نے اس طرف توجہ نہیں دی، ورنہ جہاں تک اصول علاج کا تعلق ہے یہ طریق محکم بنیادوں پر استوار ہے۔ اس باب میں بھی ہمیں تقلید و تعصب کی بجائے تحقیق و تدبر سے کام لینا چاہیئے لیکن جب تک یہ نہ ہو کم از کم اتنا ہی کیا جائے کہ ایلوپیتھی کی دوائیاں حکومت کی زیر نگرانی اپنے ملک میں تیار کی جائیں۔

مکانات

مکانات کی تعمیر کے سلسلہ میں پلان میں کہا گیا ہے کہ حکومت مناسب مقامات پر بنیادی ضروریات (واٹر سپلائی، گندی نالیوں وغیرہ) کا انتظام کر کے قطعات اراضی لوگوں کو دیدے تاکہ وہ ان پر خود مکانات تعمیر کر سکیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس طریق کار میں اجتماعی مفاد مضمر ہے۔ لیکن اس کا جو تجربہ بعض ہاؤسنگ سوسائیٹیز کی صورت میں ہوا ہے۔ وہ بڑا ہی تلخ ہے۔

پاکستان ایمپلائز ہاؤسنگ سوسائٹی کو لیجئے۔ اس سوسائٹی کا نظم و نسق بالعموم مرکزی حکومت کے افسران بالا کے ہاتھ میں رہا ہے لیکن کروڑوں روپے خرچ ہو جانے کے بعد بھی اس علاقے کی جو حالت ہے وہ ہر اس شخص کے سامنے آجاتی ہے جو ایک بار بھی اس میں سے سرسری طور پر گذر جائے۔ اسلامی مملکت میں ہر شخص کے لئے مکان مہیا کرنا حکومت کا فریضہ ہوتا ہے۔ سو اول تو خود حکومت کو اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا چاہیئے۔ لیکن جب تک حکومت کے وسائل اس کی اجازت نہیں دیتے اسے کم از کم اتنا ہی کرنا چاہیئے کہ ہر شخص کو اس کی ضروریات کے مطابق مکان تیار کر کے دے۔ اور اس کے کرایہ کو لاگت کی طرف محسوب کر کے آخر الامر مکان کو مکین کے حوالے کر دے۔

براڈکاسٹنگ

براڈکاسٹنگ کی مشینری کو وسیع کرنے کے لئے پلان میں ضروری تجاویز پیش کی گئی ہے۔ تجاویز معقول ہیں اور ضرورت پر مبنی۔ دور حاضر میں براڈکاسٹنگ نہایت عمدہ ذریعہ نشر و اشاعت ہے اور اسے جس قدر وسیع کیا جائے کم ہے۔ لیکن یہ ضرورت صرف اس سے پوری نہیں ہو سکتی کہ ہم چار کی جگہ دس اسٹیشن کھول دیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ ان اسٹیشنوں سے براڈکاسٹ کیا ہوتا ہے؟ زندہ ممالک میں اس ذریعہ نشر و اشاعت سے قوم کی تعلیمی اور ذہنی تعمیر کا کام لیا جاتا ہے۔ اس تعمیر میں آرٹ (موسیقی ڈرامہ وغیرہ) کا بھی مناسب حصہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تعلیم و تربیت کا تو ذکر ہی کیا۔ جہاں تک محض تفریح کا تعلق ہے ہمارے پروگراموں کی حالت یہ ہے کہ ایک صاحب اپنے ریڈیو سیٹ پر کوئی اسٹیشن تلاش کر رہے تھے پاس بیٹھے ہوئے دوست نے پوچھا کہ کون سا اسٹیشن مطلوب ہے۔ انہوں نے کہا کہ کراچی ریڈیو اسٹیشن۔ اس نے کہا کہ اس کے تلاش کرنے میں کیا دقت ہے۔ گھنڈی گھماتے جاؤ جس آواز پر جی یہ چاہے کہ ریڈیو سیٹ اٹھا کر باہر سڑک پر پھینک دوں وہی کراچی ہوگا۔ اس نے یہ بات تو مزاحاً کہی لیکن ہے بالکل حقیقت پر مبنی۔ لہذا اگر اس قسم کے اسٹیشن چار کے بجائے دس ہو جائیں تو سوائے اس کے کہ بدمذاقی اور عام ہو، اس سے حاصل کیا ہوگا؟ ضرورت اس کی ہے کہ اس شعبہ کو ان لوگوں کے ہاتھ میں دیا جائے جو اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ اور نہایت سلجھے ہوئے مذاق کے حامل ہوں۔ ان کا مقصد عوام کے سفلی ذوق کی تسکین نہ ہو بلکہ نشری تعلیم و تربیت سے ان کے ذوق کی سطح کو بلند اور ان کے علمی احاطہ کو وسیع کرنا ہو۔

تعلیم

اگر کسی نے اس بات کا اندازہ لگانا ہو کہ کسی قوم کا مستقبل کیا ہے تو اسے دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس قوم کے تعلیمی ادارے کیسے ہیں یہی وہ کارگہ ہیں جن میں قوم کے مقدرات کے سانچے ڈھلتے ہیں۔ جس قسم کی کسی قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت ہوگی۔ اسی قسم کا اس کی آئندہ نسل کا کردار و عمل ہوگا۔ ہم نے اس نو سال کے عرصہ میں جو سب سے بڑا قومی جرم اور انسانیت کا گناہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف سے بری طرح اعراض برتا ہے۔ جہاں تک صرف تعداد کا تعلق ہے۔ قوم کے بچوں کا پچاس فیصدی حصہ محض اسکولوں میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم حاصل نہیں کر رہا۔ جہاں تک نصاب کا تعلق ہے حالت اس سے بدتر ہے انگریز جس قسم کا نصاب ہمیں ورثہ میں دے گیا تھا۔ وہی ابھی تک ہماری درسگاہوں میں رائج ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس کے معیار میں اب خاصی پستی آگئی ہے۔ اور یہ ترقی معکوس ہر سال بڑھتی جا رہی ہے۔ پلان میں اسکولوں اور کالجوں کے بڑھانے اور ٹرینڈ اساتذہ کی تعداد میں اضافہ کرنے

کی تجاویز شامل ہیں۔ یہ امر موجب اطمینان ہے۔ لیکن اس سے قوم کے اصل مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اس کا علاج نصاب تعلیم کے بدلنے ہوگا۔ جہاں تک عصرِ حاضر کے علوم کی تعلیم کا تعلق ہے۔ اس کے لئے ہم یقیناً مغرب کی اعلیٰ درس گاہوں کے نصاب سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لیکن اس سے کہیں زیادہ ضرورت اس تعلیم کی ہے جو ہمارے بچوں کے قلب و دماغ کو صحیح اسلامی قالب میں ڈھال سکے۔ اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تو ہماری مملکت کے اسلامی ہونے کا کچھ بھی مطلب نہیں۔ اس مقصد کے لئے قرآن کریم اور سیرت نبی اکرمؐ کی تعلیم لاینفک ہے۔ قرآن کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اسے عصرِ حاضر کے علوم کی روشنی میں سمجھا جائے۔ اور اس حقیقت کو علیٰ وجہ البصیرت سامنے لایا جائے کہ انسانی زندگی کے جن بنیادی مسائل کو تنہا عقلِ انسانی حل نہیں کر سکی یا نہ کر سکتی ہے۔ قرآن کریم ان مسائل کا حل کیا بتاتا ہے۔ اور حضور نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ کی تعلیم سے مطلب یہ ہے کہ یہ بتایا جائے کہ قرآن کریم جس قسم کے انسانی معاشرے کا تصور دیتا ہے۔ حضورؐ نے اسے کس طرح متشکل فرمایا اور اپنے زیرِ تربیت انسانوں کے دل و دماغ میں وہ تبدیلی کس طرح سے پیدا کر دی جس سے وہ سیرت و کردار کی بلند ترین سطح تک پہنچ گئے۔

تعلیم کے سلسلہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ دینی مدارس اور دنیاوی اسکولوں اور کالجوں کی جو غیر اسلامی ثنویت ہمارے ہاں صدیوں سے چلی آرہی ہے اسے مٹایا جائے۔ اور ہمارے اسکول اور کالج دین اور دنیا دونوں سے متعلق تعلیم کے مراکز ہوں۔ پلاننگ کے معنی یہ نہیں کہ جو کچھ اس وقت ہو رہا ہے اس میں اضافہ کر دیا جائے۔ پلاننگ سے مفہوم یہ ہے کہ حاضر و موجود پر گہری تنقیدی نگاہ ڈالی جائے۔ جو کچھ علیٰ حالہٖ رکھے جانے کے قابل ہے اسے رکھا جائے۔ جو کچھ مٹائے جانے کے لائق ہے اسے مٹایا جائے۔ اور اس طرح اپنے مخصوص تقاضوں کو پورا کرنے کی نئی راہیں متعین کی جائیں۔ جب تک ہم فرسودہ اور پامال راہوں سے ہٹ کر اپنے تیشہ سے اپنا جادہ آپ نہیں تراشیں گے۔ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ زیرِ نظر پلان میں ہمیں جدتِ نظر اور ندرتِ فکر کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ وہی پرانی لکیروں کو جنہیں اور گہرا اور وسیع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ اس حقیقت کا اطلاق زندگی کے تمام شعبوں پر یکساں طور پر ہوتا ہے لیکن تعلیم کے سلسلہ میں کورانہ تقلید ہمیں کبھی صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتی۔ زیرِ نظر پلان میں جو کچھ تجویز کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ تعلیم پر جس قدر روپیہ اس وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اس میں پچاس ساٹھ کروڑ کا اور اضافہ ہو جائے گا جو مسافر غلط راستے پر چل رہا ہو اسے تانگے کی جگہ موٹر میں بٹھا لیا جائے تو کیا اس کا نام ترقی اور نیل المرام (ACHIEVEMENT) ہوگا!

پلان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ملک میں تحقیقاتِ اسلامیہ کے ادارے قائم کئے جائیں گے۔ اور جو پہلے سے موجود ہیں انہیں تقویت دی جائے گی۔ نئے اداروں کے متعلق تو خیر بعد میں دیکھا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے جو ادارے موجود ہیں اگر ان کا کچھ تعارف کرا دیا جاتا تو اس سے اندازہ ہو جاتا کہ تحقیقاتِ اسلامیہ سے مقصود کیا ہے؟ اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ جسٹس منیر کی تحقیقاتی عدالت میں اسلامی علوم کے بڑے بڑے علمبردار اتنا بھی نہیں بتا سکے تھے کہ "مسلمان" کسے کہتے ہیں کیا اسلامیات کی ریسرچ انہی یا انہی جیسے اور دیگر حضرات کے ہاتھ ہوگی؟ ہمارا ملک بڑا غریب ہے یہاں ایک ایک پائی اشرفی سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ اس لئے ہمیں ایک پیسہ خرچ کرنے سے پہلے دس مرتبہ سوچنا چاہیئے کہ اس سے حاصل کیا ہوگا۔ محض "ثواب" یا نیک نامی کی خاطر روپیہ خرچ کرنے کی ہمارے ہاں کہاں گنجائش ہے؟

(باقی ص ۶۶ پر دیکھو)

معاشی مسئلہ کا قرآنی حل

روٹی کا مسئلہ

[گذشتہ اپریل میں محترم پرویز صاحب، خرابیٔ صحت کی بناء پر۔ بغرض تبدیلی آب و ہوا، عازم سوات ہوئے لیکن دسفر کی صعوبت کو کم کرنے اور احباب سے ملنے کی غرض سے) راستہ میں، لاہور، سیالکوٹ، راولپنڈی ٹھیرتے ہوئے گئے۔ ہر چند ان کی صحت خراب تھی۔ لیکن ہر مقام پر احباب کا تقاضا ہوا کہ وہ کم از کم ایک عام تقریر کرتے ہوئے آگے جائیں چونکہ معاشی مسئلہ کو آجکل بڑی اہمیت حاصل ہے اور محترم پرویز صاحب نظام ربوبیت کے قرآنی تصور سے اس مسئلہ کو نکھار کر سامنے لائے ہیں اس لئے ہر مقام پر تقاضہ یہی ہوا کہ وہ معاشی مسئلہ کے قرآنی حل پر خطاب فرمائیں۔ چنانچہ انھوں نے اسی موضوع پر ان مقامات پر تقریریں کیں۔ ان تقاریر کے نوٹس (NOTES) سے ایک مسلسل تقریر مرتب کر لی گئی ہے جسے قارئین طلوع اسلام کے افادہ کی غرض سے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

طلوع اسلام]

شائع کردہ: ادارہ طلوع اسلام ۱۵۹/۳۔ ایل۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم :

برادران عزیز ! جس موضوع پر مجھے تقریر کرنے کے لئے کہا گیا ہے. عام الفاظ میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ مذہب کی رو سے روٹی کے مسئلہ کا حل کیا ہے ؟ یہ عنوان اکثر احباب کے لئے وجۂ صد استعجاب ہوگا. اس لئے کہ روٹی کا مسئلہ خالص دنیاوی مسئلہ ہے جس

مذہب اور روٹی

سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا. مذہب کا تعلق دنیا سے نہیں بلکہ آخرت سے ہے. اور اس کا مقصود انسانی نجات ہے. نجات کس سے ؟ ان بندھنوں سے جن میں انسان پھنسا ہوا ہے. ان مصیبتوں سے جن میں ابن آدم مبتلا ہے. ان مشکلات سے جن میں ہر فرد بشر گرفتار ہے. ان کثافتوں اور غلاظتوں سے جن میں فرزند آدم ملوث ہے. یہ مصیبتیں اور مشکلیں کیوں پیدا ہوتی ہیں ؟ دنیاوی حرص و ہوس سے وفر زندگی کی جاذبیتوں سے. مال و متاع کی دلکشی سے. روٹی کے پیچھے دوڑنے سے ! اور یہ کثافتیں اور غلاظتیں کیا ہیں ؟ مادی دلدل کی آلائش روح کو ناپاک اور انسان کی معصوم فطرت کو گنہگار بنا دیتی ہیں. ان مصیبتوں اور مشکلوں سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ انسان ان سے دور بھاگے. یہاں کی جاذبیتوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے. فطرت کی ہر حسین شے کو غارت گر روحانیت تصور کرے. دنیا کی ہر کشش کا بلاوا سمجھے. یہی وجہ تھی کہ بدھ مت نے کہا کہ انسان کی ہر آرزو تکلیف کا پیش خیمہ ہے اور حقیقی راحت ترک آرزو میں ہے. اسی بنا پر دہرم نے بتایا کہ دنیا مایا (فریب) ہے جس میں پھنسنے والا احمق ہے. اس کے تتبع میں عیسائیت نے کہا کہ دنیا میں ہر ابن آدم اپنے اولیں ماں باپ کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے آتا ہے. لہٰذا اس سے جتنا دور بھاگا جائے اتنا ہی انسان عافیت میں رہتا ہے. آسمان کی بادشاہت غریبوں اور ناداروں کے لئے ہے. اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزر جانا ممکن ہے. لیکن کسی امیر آدمی کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا ناممکن. جتنا کوئی شخص مفلس و نادار، برباد و تباہ حال، بیکس و بے بس، محتاج و لاچار، ضعیف و ناتواں ہوگا اتنا ہی وہ خدا کا مقرب ہوگا. بھوک سے چہرہ زرد، پھٹے پرانے کپڑے، ژولیدہ مو، پریشان حال، جسم گرد و غبار سے اٹا ہوا. افسردہ خاطر، پژمردہ رو. یہ ہیں مقربین بارگاہ خداوندی کی نشانیاں. یہ ہے برادران ! وہ تصور جو مذہب، دنیا اور اہل دنیا کے متعلق پیش کرتا ہے. لہٰذا جن حضرات کے دل میں یہ خیال گزرے کہ مذہب کو روٹی کے مسئلہ سے کیا تعلق ؟ وہ بالکل حق بجانب ہیں.

لیکن دنیا اور مسائل حیات سے متعلق یہ تصور انسانوں کے خود ساختہ مذہب کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے. اسے خدا کے عطا فرمودہ دین سے کوئی واسطہ نہیں. خدا کا دین اس قسم کے تصورات پیش کرنے والوں کو للکارتا ہے. وہ

دین اور روٹی

سے کہتا ہے قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۳۲ : ۷) اللہ کون ہے جو ان زینت و آرائش کی چیزوں کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے. اور خوشگوار سامان حیات کو حرام قرار دے. آپ نے دیکھا برادران ! کہ قرآن نے کس طرح ایک ہی آیت سے انسانوں کے خود ساختہ مذہب کی نگاہ فریب عمارتوں کو نیست و نابود کر کے رکھ دیا ! اس آیت میں اس نے اشیائے زینت کا اجمالی ذکر کیا ہے. دوسری جگہ اسی اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کی ہے. زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَا

مُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ .... (۳/۱۴) زن و فرزند کی محبت، سونے چاندی کے ڈھیر، عمدہ پلے ہوئے گھوڑے، مال مویشی کھیتی باڑی، ان تمام چیزوں کو انسانوں کے لئے وجہ زینت بنایا گیا ہے۔ لہٰذا وہ تصورِ حیات جو ان چیزوں کی کشش و تمتع کو حرام قرار دیتا ہے خداوندی تصور ہے۔ خدا کے دین کا عطا کردہ تصور نہیں۔ قرآن نے قوم (یعنی آدمی) سے کہہ دیا کہ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (۲/۳۶) تمہیں ایک مدت تک اس دنیا میں رہنا ہے لہٰذا اس سر و سامان سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا (۴۵/۱۳) اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ کارگہِ عالم کی ہر شے قانونِ خداوندی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ ان قوانین کا علم حاصل کر کے اشیائے فطرت کو اپنے مصرف میں لائے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں گے لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۱۰/۶۴) ان کے لئے اسی دنیاوی زندگی میں شادابیوں اور سرفرازیوں کی خوشخبریاں ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ قوانینِ الٰہیہ کے خلاف زندگی بسر کریں گے۔ ان کے لئے خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ اس دنیا کی زندگی میں ذلت و خواری ہے۔ اس خیال سے کہ کوئی اس "ذلت و خواری" کو "روحانی پستی" قرار دے کر لوگوں کو بہکا نہ دے۔ اس نے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ جن قوموں

بھوک خدا کا عذاب ہے

نے قوانینِ الٰہیہ سے سرتابی برتی فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۱۶/۱۱۲) اللہ نے ان پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری کر دیا۔ اور یہ عذاب یونہی نہیں آ گیا۔ بلکہ یہ ان کی روشِ زندگی ان کے اعمالِ حیات کا لازمی نتیجہ تھا۔

مجھے امید ہے برادران! کہ ان تصریحات کی روشنی میں کسی کے دل میں یہ خیال باقی نہیں رہا ہوگا کہ قرآن کو بھلا معاشی معاملات سے کیا تعلق! لیکن اگر کسی کے دل میں اب بھی اس کی کوئی رمق یا دھندلا سا نقش باقی ہے تو اس کے لئے قرآن میں ایسی آیت بھی موجود ہے جس میں خود "معیشت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ غور سے سنئے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا.... (۲۰/۱۲۴) جو ہمارے قانون سے اعراض برتے گا۔ اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی وہ روٹی کا محتاج ہو جائے گا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ معیشت کی کشادگی، عزت کی روٹی (رِزْقٌ كَرِيْمٌ) اور سامانِ زیست کی فراوانی ہے۔ اس کے برعکس بھوک اور خوف خدا کا عذاب ہے جو اس کے قانون سے اعراض برتنے اور پہلو تہی کرنے سے مسلط ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا غلط ہے کہ دین کا تعلق محض انسان کی عاقبت سنوارنے سے ہے۔ اس دنیا سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ اور یہ خیال کرنا بھی غلط ہے کہ مفلسی اور ناداری، غریبی اور محتاجی قربِ خداوندی کا ذریعہ ہے۔ جن باتوں کو خدا اپنا عذاب قرار دے وہ اس کے قرب کا ذریعہ کس طرح بن سکتی ہیں! اس کے قرب کا ذریعہ ایمان اور اعمالِ صالحہ ہیں اور ایمان و اعمالِ صالحہ کے متعلق اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ .... (۲۴/۵۵) اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کر رکھا ہے جو اس کے قانون کی صداقت پر یقینِ محکم رکھیں اور اس کے متعین فرمودہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں کہ وہ انہیں اس دنیا میں غلبہ و حکومت عطا کرے گا۔ جس طرح اس نے اس سے پہلے ان قوموں کو استخلاف عطا کیا جنہوں نے اس پروگرام کے مطابق زندگی

بسر کی۔ یہ برادران! خدا کا وعدہ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کا کوئی وعدہ (معاذ اللہ) جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ اس وعدہ کی صداقت پر قرآن نے تاریخی نوشتوں کو بطور شہادت پیش کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس ایمان اور اعمال کا نتیجہ دنیا میں غلبہ و حکومت، تمکن و تسلط نہیں تو کی میزان میں نہ وہ ایمان ایمان ہے نہ وہ اعمال اعمالِ صالحہ۔ پھر یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یہ غلبہ و حکومت ایسا نہیں جو دیگر اقوامِ عالم کو بھی حاصل ہو جائے۔ بلکہ ایسا غلبہ و حکومت جس میں دنیا کی کوئی قوم ان کی برابری نہ کر سکے۔ اس لئے کہ قرآن کا فیصلہ ہے کہ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۹) اگر تم صاحبِ ایمان ہو گے تو تم تمام اقوامِ عالم سے بلند و برتر ہو گے وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (۴/۱۴۱) ایسا ہو نہیں سکتا کہ خدا اس صاحبِ ایمان قوم پر ایسی قوم کو غلبہ عطا کر دے جو صاحبِ ایمان نہ ہو۔ نوعِ انسانی کی امامت (LEADERSHIP) اس قوم کے حصہ میں آئے گی۔ جیسا کہ ان کے موسسِ اوّل حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا تھا کہ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (۲/۱۲۴) میں تجھے نوعِ انسانی کا امام (لیڈر) بنانے والا ہوں۔ یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ ہو گا۔ اس کے برعکس جو اس قانون سے گریز کی راہیں نکالے گا (مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ) تو اسے علاوہ استخلاف، قیادت و امامت کا ملنا تو ایک طرف، وہ روٹی تک کا محتاج ہو جائے گا۔ (فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا)

آپ نے غور فرمایا برادران! کہ قرآن کو معیشت سے کتنا گہرا تعلق ہے؟

معاشی مسئلہ کی اہمیت

اب میں اس سوال کی طرف آتا ہوں کہ قرآن نے معاشی مسائل کا حل کیا بتایا ہے؟ اس سوال تک پہنچنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اگرچہ روٹی کا مسئلہ اس دن سے آدم کے ساتھ ہے جس دن اس نے اپنی مستقر پر آنکھ کھولی لیکن ہمارے زمانہ میں اس نے اس قدر اہمیت حاصل کر لی کہ افراد اور اقوام دونوں اس کی وجہ سے پریشان ہیں۔ مارکس اور لینن کو شہرت حاصل ہوئی ہے۔ وہ بھی اسی عالمگیر پریشانی کی وجہ سے ہے اور بساطِ سیاست پر روس جن توجہات کا مرکز بن رہا ہے۔ وہ بھی اسی مسئلہ کی پیدا کردہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج سیاست، حکومت، تہذیب، تمدن، ملی مسائل اور بین الاقوامی معاملات، سب کی باگ ڈور معاشیات کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارا یہ دعویٰ ہے (اور یہ دعوےٰ ایمان پر مبنی ہے) کہ قرآن نوعِ انسانی کے لئے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ جس میں انسانی زندگی کی تمام مشکلات کا حل موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس میں زندگی کے تمام مسائل کا حل موجود ہے تو اس مسئلہ کا حل بھی ضرور ہونا چاہیئے جس نے اس قدر اہمیت حاصل کر رکھی ہے۔ اور جس کا تعلق انسان کی طبعی موت و حیات سے ہے۔ آج دنیا دو بڑے بڑے بلاکوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک طرف مغربی جمہوریتیں ہیں جو اس نظامِ سرمایہ داری کی وارث ہیں۔ جس نے نوعِ انسانی کو تباہی و بربادی کے جہنم کے کنارے پہنچا دیا ہے۔ دوسری طرف روس کا بلاک ہے جس کے انسانیت سوز استبداد کے ہاتھوں خود وہاں کے اربابِ حل و عقد بری طرح چیخ اٹھے ہیں! ان دونوں جہنموں کے درمیان مظلوم و مقہور انسانیت بری طرح آہی کھڑی ہے۔ آج اگر کوئی قوم روٹی کے مسئلہ کا ایسا حل بتائے جو نوعِ انسانی کو ان دونوں جہنموں سے نکال کر سلامتی کی جنت کی طرف لے جائے تو یقین مانئے کہ اقوامِ عالم کی امامت بلا تامل اس کے ہاتھ آ جائے گی۔ یہ تھا وہ شدید احساس جس کی بنا پر میں نے اس مسئلہ کے حل کے لئے قرآن کے باب عالی پر دستک دی۔ اور یہ اس کی رحمت بے پایاں

دق تھا کہ اس نے اس فقیرِ بے نوا کو اپنے دامانِ سے محروم نہیں لوٹایا۔ مجھے جو راہنمائی قرآن سے حاصل ہوئی ہے میں اسے ایک وقت کے ارباب فکر و نظر کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ بایں امید کہ اگر وہ بھی قرآنی تدبر کے بعد مجھ سے متفق ہوں تو پھر ہم سب مل کر سوچیں کہ اس کی تشکیل کی کیا صورت ہونی چاہیئے۔ میں نے اپنی قرآنی بصیرت کو نہ کبھی سہو و خطا سے مبرا خیال کیا ہے۔ نہ حرف آخر سمجھا ہے۔ اس فکر کے پیش کرنے سے میرا مقصود یہ ہے کہ جو دیگر حضرات اپنی اپنی جگہ اس نہج پر غور و تدبر کر رہے ہوں وہ بھی اس کوشش میں میرے رفیق راہ بن جائیں۔ تاکہ ہم سب مل کر منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں۔

غزل سرائیم و پیغام آشنا گوئیم
بایں بہانہ دریں بزم محرمے جوئیم

رزق کی ذمہ داری

قرآن میں ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶) روئے زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو۔ یہ ایک بہت بڑا اعلان ہے اور بڑا عظیم دعوے۔ اس سے ذرا سمٹ کر خالص انسانی دنیا کی طرف آیئے تو وہاں ارشاد ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲) ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسانوں کی اپنی اور ان کی اولاد کے رزق کی بہم رسانی خدا نے اپنے ذمے رکھی ہے۔ صرف رزق (یعنی سامانِ زیست) ہی کی نہیں بلکہ اس نے اپنے آپ کو ربّ الناس کہا ہے۔ ربوبیت کے معنی ہیں کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے پرورش دیتے دیتے بتدریج اس کے نقطۂ تکمیل تک پہنچا دینا۔ لہٰذا ربّ الناس کا مفہوم یہ ہوا کہ ہر فردِ انسانیہ کی صلاحیتوں کی مکمل نشو و نما کی ذمہ داری بھی خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ اس ذمہ داری کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ اس نے قرآن کی ابتداہی الحمد للہ۔ ربّ العالمین کے اعلان سے کی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کی ستائش اللہ کے لئے ہے۔ اس لئے کہ وہ تمام اقوامِ عالم کی نشو و نما کا ذمہ دار ہے۔ اس کی حمد و ستائش اسی بنا پر ہے کہ وہ تمام افرادِ انسانیہ کی صلاحیتوں کو نشو و نما دینے کا ذمہ دار ہے۔

ایک طرف تو برادران! یہ عظیم اعلان ہے کہ ہر متنفس کے سامانِ زندگی اور اسباب و ذرائع نشو و نما کی ذمہ داری خدا پر ہے لیکن دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ (انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما تو خیر بڑی چیز ہے) دنیا میں کروڑوں انسان ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ اور ایک ایک قحط میں لاکھوں جانیں محض روٹی نہ ملنے سے تلف ہو جاتی ہیں۔ خود اپنے ملک پاکستان کو دیکھئے۔ اس میں کتنے انسان ایسے ہیں جو راتوں کو بھوکے سوتے ہیں اس سے لامحالہ ایک سوچنے والے کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی یہ ذمہ داری کیسی ہے جس میں لاکھوں انسان بھوکے سوتے ہیں؟ آپ اس سوال سے آنکھیں بند کر کے گذر جائیں تو اور بات ہے۔ لیکن اگر آپ ایک سکینڈ کے لئے رک کر اس پر غور کریں تو آپ کے سامنے ایک عجیب سوال اٹھ کھڑا ہو جائے گا۔ جو ہو نہیں سکتا کہ آپ کے دل کو طلسمِ پیچ و تاب نہ بنا دے۔ میں عزیزانِ من! آپ سے گزارش کروں گا کہ آگے بڑھنے سے پیشتر آپ اس سوال کو اپنے دل میں دہرائیں اور سوچیں کہ اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہے؟ آپ اس کا جواب بمشکل دے سکیں گے لیکن ... جواب جس پر اس کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جہاں

یعنی خارجی کائنات (باہر کی دنیا) کا تعلق ہے۔ خدا کی ذمہ داری اس کے قانون کی رُو سے پوری ہو رہی ہے جس سے کسی شے کو مجالِ سرتابی نہیں۔ وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (۱۶/۴۹) کائنات کی ہر شے قانونِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ اور یہ قانون ان کی نشو و نما کی تمام ضروریات کو پورا کئے چلا جاتا ہے۔

اس ذمہ داری کا مفہوم کیا ہے

یَسْئَلُهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۵۵/۲۹) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو شے ہے اپنی نشو و نما کے لئے اس کی محتاج ہے اور ان کی یہ احتیاج ایسی نہیں کہ ہمیشہ ایک ہی جیسی رہے بلکہ کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ (۵۵/۲۹) ہر شے ہر آن میں ایک نیا پہلو بدلتی ہے اس لئے اس کی نشو و نما کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں لیکن خدا کا قانونِ ربوبیت ان بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ان کا سامانِ نشو و نما بہم پہنچائے چلا جاتا ہے۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں حالت جداگانہ ہے۔ انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو خدا کے قانونِ ربوبیت کو اختیار کرے اور چاہے تو اس سے سرتابی اختیار کر کے اس کی جگہ اپنا نظام رائج کرلے۔ جب انسان اپنا نظام رائج کر لیتا ہے تو وہ پھر خدا کی ذمہ داری اپنے آپ کو باہر لے آتا ہے۔ جب وہ اپنی زندگی اس کے قانون کے تابع لے آتا ہے تو اس کی ایک ایک ذمہ داری نہایت حسن کارانہ انداز سے پوری ہوتی چلی جاتی ہے۔ خدا براہِ راست انسانوں کو رزق نہیں پہنچاتا بلکہ اس نظام کی وساطت سے پہنچاتا ہے جو اس کے قانون کے مطابق قائم ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے سورۂ یٰسین کی ایک آیت جلیلہ میں جامع طور پر بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے کہ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ یَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۳۶/۴۷) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے تمہیں سامانِ زندگی دیا ہے اسے (دوسروں کی پرورش کے لئے) کھلا رکھو۔ تو وہ لوگ جو خدا کے قانونِ ربوبیت پر ایمان نہیں رکھتے ان لوگوں سے کہتے ہیں جو اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ کیا ہم اس شخص کے کھانے کا انتظام کریں جسے اگر اللہ چاہتا تو اپنے قانونِ مشیت کے مطابق خود ہی کھانا کھلا دیتا؟ ان سے کہو کہ تم ایسا سمجھنے اور کہنے میں کھلی ہوئی گمراہی میں ہو۔ خدا محتاج انسانوں کے کھانے کا انتظام از خود نہیں کیا کرتا یہ انتظام اس نظام کی رو سے ہوتا ہے جس میں قانونِ خداوندی کے مطابق رزق کو نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے عام کر دیا جاتا ہے اسے قرآنی اصطلاح میں انفاق فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔

نظام کے ہاتھوں

اب سوال یہ ہے کہ یہ نظام قائم کس طرح سے ہوتا ہے؟

قرآن کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ انسان صرف اس کے طبعی جسم کا نام نہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور چیز ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) یا نفس (SELF) یا انا (I) یا ایغو کہتے ہیں۔ انسانی جسم طبعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے۔ اور انہی قوانین کے مطابق اس پر موت طاری ہو جاتی ہے لیکن اگر انسانی ذات کی مناسب نشو و نما ہو جائے تو وہ طبعی موت سے مرتی نہیں بلکہ حیاتِ جاوید حاصل کر سکتی ہے۔ اس اعتبار سے انسان کی زندگی ایک جوئے رواں ہے جو مسلسل آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ انسانی ذات کی نشو و نما، انسانی زندگی کا مقصود ہے اور قرآن ایسا پروگرام عطا کرتا ہے جس سے اس کی نشو و نما ہوتی چلی جاتی ہے۔ دوسرا یہ کہ انسان کے جسم کی پرورش اس چیز سے ہوتی ہے جسے انسان خود کھائے یا خود استعمال کرے۔ لیکن انسانی ذات کی پرورش اس چیز سے

جیسے وہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ انسانی جسم کی پرورش "لینے" میں ہوتی ہے اور انسانی ذات کی پرورش "دینے" میں۔ جو لوگ اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک انسانی زندگی کا مقصود صرف جسم کی پرورش ہوتا ہے۔ اس لئے ہر فرد کی کوشش ہوتی ہے کہ جتنا کچھ سمیٹا جا سکے اپنے (اور اپنی اولاد کے لئے) سمیٹ کر رکھ لے۔ اسی کو نظام سرمایہ داری کہتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ زندگی کے تسلسل پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کی نشوونما کی فکر کرتے ہیں جس کا طریق یہ ہے کہ انسان اپنی پوری پوری محنت سے سب کچھ حاصل کرے لیکن اس میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھے جس سے اس کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ اور باقی سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے کھلا چھوڑ دے۔ اسے انفاق فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔ جو لوگ اس اصولِ حیات پر یقین رکھتے ہیں۔ انھیں جماعت مومنین کہتے ہیں۔ یہ جماعت ایسا نظام قائم کرتی ہے جس میں ہر فرد، فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے مصروف جدوجہد رہتا ہے۔ لیکن اپنی سعی و عمل کے ماحصل کو اس نظام کے سپرد کر دیتا ہے جسے یہ نظام نوعِ انسانی کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے لئے صرف کرتا ہے۔ قرآن نے افراد اور نظام کے اس تعلق کو باہمی معاہدہ سے تعبیر کیا ہے اور یہی معاہدہ درحقیقت اس نظام کی بنیاد ہے۔

اللہ سے معاملہ

آپ دیکھئے کہ اس نے اس حقیقت کو کس قدر مختصر لیکن جامع الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9/111) عام الفاظ میں اس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ جماعتِ مومنین سے ان کے نفوس اور اموال خرید لیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں انھیں جنت عطا کر دیتا ہے۔ اس میں تین چار الفاظ تشریح طلب ہیں اور جب تک ان کی قرآنی تشریح سامنے نہیں آتی اس آیت کا مطلب واضح نہیں ہوتا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں انسانی معاشرہ میں خدا کا نظام، خود انسانوں کے ہاتھوں سے متشکل ہوتا ہے۔ جب ایسا نظام قائم ہو جاتا ہے تو جو کام اس نظام کے ہاتھوں سے سرزد ہوتے ہیں انھیں خدا خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ مثلاً جنگ بدر میں نبی اکرمؐ اپنے رفقا کی جماعت کے ساتھ، مخالفین سے مصروف نبرد آزما ہیں۔ میدان کارزار میں تلواریں چلتی ہیں، تیر اندازی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ انسانوں کے ہاتھوں سے ہو رہا تھا۔ لیکن چونکہ یہ اس نظام کے ماتحت ہو رہا تھا جو قوانین الٰہیہ کے مطابق قائم ہوا تھا۔ اس لئے خدا کا ارشاد ہے کہ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ (8/17) تم مخالفین کو قتل نہیں کر رہے تھے خود خدا انھیں قتل کر رہا تھا۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (8/17) تم ان کی طرف تیر نہیں پھینک رہے تھے۔ خدا تیر پھینک رہا تھا۔ قرآن کریم سے اس قسم کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں لفظ اللہ کا استعمال کیا گیا ہے لیکن اس سے مراد وہ نظام ہے جو اس کے قانون کے مطابق متشکل ہوتا ہے لہٰذا اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ میں بھی اللہ سے مراد وہ نظام ہے جو اس کے قانون (قرآن کریم) کے مطابق قائم ہوتا ہے۔ اس لئے آیت کا مطلب یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ (مومنین) اپنے نفوس اور اموال اس نظام کے سپرد کر دیتے ہیں جو خدا کی صفت ربّ العالمینی کو عام کرنے کے لئے قائم ہوتا ہے۔ "نفوس" میں انسان کی وہ تمام صلاحیتیں آ جاتی ہیں جو اسے خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ از خود عطا ہوتی ہیں۔ اور "اموال" میں وہ سب کچھ آ جاتا ہے جسے انسان اپنی سعی و کاوش سے حاصل کرتا ہے۔

یہ تو ہوا برادران! اس معاہدہ کا ایک حصہ۔ یعنی مومنین اپنی وہبی اور اکتسابی ماحصلِ زندگی کو اس نظام کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اب اس معاہدہ کا دوسرا حصہ۔ وہ حصہ یہ ہے کہ اس کے بدلے میں یہ نظام انھیں جنت عطا کر دیتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جنت سے کیا مراد

جنت ارضی کا مفہوم

اس مقام پر عزیزانِ من! یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس زندگی کے بعد کی زندگی میں جنت اور جہنم کی جو کیفیت ہوگی وہ اپنی جگہ پر برحق ہے۔ اور اس پر ہمارا ایمان۔ لیکن قرآن کی رو سے جنت اور جہنم صرف اسی زندگی سے مخصوص نہیں۔ وہ انسان کی موجودہ زندگی میں بھی جنت اور جہنم کا ذکر کرتا ہے۔ اس دنیا کی جنت کے متعلق وہ آدم سے کہتا ہے کہ اس کی کم از کم خصوصیت یہ ہے کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) اس میں نہ بھوک کا اندیشہ ہے نہ لباس سے محروم رہنے کا ڈر۔ نہ اس میں پیاس ہے نہ سورج کی حرارت۔ یعنی اس میں خوراک، لباس اور مکان کے متعلق کسی قسم کی تشویش اور پریشانی نہیں ہوگی۔ اس میں سامانِ رزق اس افراط سے ہوگا کہ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) انسان جہاں سے جس کا جی چاہے سیر ہو کر کھائے پیئے۔ آپ نے غور فرمایا، برادران! کہ اس معاہدہ کی رو سے بات کیا تھی! بات یہ تھی کہ افرادِ معاشرہ اپنی محنتوں کے ماحصل کو اس نظام کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اور وہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی (ASIC NECESSITIES OF LIFE) کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے اور اس طرح خدا کی وہ ذمہ داری عملاً پوری ہوتی چلی جاتی ہے جس کی رو سے اس نے کہا تھا کہ زمین پر ہر چلنے والے کے رزق کی ذمہ داری ہم پر ہے: اور ہم تمہیں بھی سامانِ زیست دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی: غور کیجئے برادران! اگر کسی معاشرہ میں ہر فرد معاشرہ کو اس کی ضمانت (SECURITY) حاصل ہو جائے کہ وہ اور اس کی اولاد کسی حالت میں بھی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہ سکتے۔ اور یہ ضمانت ایسی محکم ہو کہ لَا انْفِصَامَ لَهَا۔ وہ کبھی ٹوٹے نہیں۔ کبھی دغا نہ دے۔ کبھی عہد شکنی نہ کرے۔ تو اس معاشرے میں انسان کی زندگی کس قدر جنتی زندگی ہوگی۔؟ اور پھر یہ بھی سوچئے کہ جب لوگوں کو اس کا یقین ہو جائے کہ وہ اور ان کی اولاد ضروریاتِ زندگی سے کبھی محروم نہیں رہیں گے۔ تو انہیں مال و دولت جمع کرنے کی ضرورت کیا ہوگی۔ اور وہ بددیانتی اور بے ایمانی کیوں کریں گے! انسان سمیٹتا اور جمع اس لئے کرتا ہے کہ اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر کل کو کوئی ناگہانی افتاد آپڑی تو میں اور میرے بچے بھوکے مر جائیں گے۔ کوئی ہمیں پوچھے گا نہیں۔ وہ اس خطرے سے محفوظ رہنے کے لئے سمیٹتا ہے اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی فکر کرتا ہے۔ اور اس میں پھر جائز و ناجائز کی تمیز بھی باقی نہیں رہتی۔ غور کیجئے کہ جس معاشرہ میں ہر فرد کی یہ کوشش ہو کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے لئے سمیٹ لے! اس معاشرے میں زندگی کس قدر جہنم کی زندگی ہوگی۔ اس جہنم کی آگ جس میں آج ہم سب بری طرح جل رہے ہیں۔ اور اس سے نکلنے کی کوئی صورت کسی کی سمجھ میں نہیں آتی وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّار

اس سے برادران! یہ حقیقت بھی سمجھ میں آجائے گی کہ جس معاشرہ میں افرادِ معاشرہ اپنی محنت کی کمائی اور استعداد کے ماحصل کو اپنی ملکیت نہ سمجھیں بلکہ اپنے نظام کے پاس امانت رکھی ہوئی متاع سمجھیں اس میں وسائلِ پیداوار

وسائلِ پیداوار

یا ذرائعِ رزق کے ذاتی ملکیت میں رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رزق (سامانِ زیست) کے ذرائع کی شکلیں مختلف ہیں لیکن اگر آپ انہیں سمٹا کر دیکھے جائیں گے۔ تو آپ دیکھیں گے کہ اصولی طور پر رزق کا ذریعہ ایک ہی رہ جاتا ہے جسے زمین کہتے ہیں۔ اسی لئے قرآن نے ذرائعِ رزق کو اَرض کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ اور ارض کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ اسے اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ نوعِ انسانی اس سے ایک مدت معینہ تک فائدہ اٹھاتی رہے (مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ) اور یہ تمام ضرورت مندوں

یکساں طور پر کھلی ہے سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (۴۱/۱۰)

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن معاشی مشکلات کے حل کے لئے ایک نظام تجویز کرتا ہے۔ یہ نظام
(۱) ان لوگوں کے ہاتھوں سے متشکل ہوتا ہے جو اس حقیقت کبریٰ پر یقین محکم رکھتے ہیں کہ زندگی صرف انسانی جسم کا نام نہیں حیات
لد جسم کی موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے یہ سلسلہ انسانی ذات سے متعلق ہوتا ہے۔ اور انسانی ذات کی نشوونما کا طریقہ یہ ہے کہ انسان
اپنا جان و مال کو نوع انسانی کی پرورش (ربوبیت) کے لئے عام کر دے۔
(۲) یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان مہیا کرنے کی ذمہ داری
لیتا ہے۔
(۳) اور اس میں ذرائع رزق افراد کی ملکیت میں رہنے کے بجائے اس نظام کی تحویل میں رہتے ہیں۔ جو رزق کو قوانین خداوندی کے
مطابق تقسیم کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

کمیونزم اور اسلام

میں یہ کچھ کہہ رہا ہوں اور میری نگاہیں ان دلوں کو بھانپ رہی ہیں۔ جن میں یہ خیالات اٹھ رہے ہیں کہ یہ تو وہی بات ہے جو کمیونزم کہتی ہے۔ اس لحاظ سے کمیونزم اور اسلام ایک ہی ہیں۔ ان حضرات سے میری گذارش ہے کہ نتیجہ تک پہنچنے میں جلد بازی سے کام نہ لیں۔ ہماری بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم بہت جلد باز واقع ہوئے ہیں۔ کسی بات میں ذرا مشابہت دیکھی اور ہم نے جھٹ سے کہہ دیا کہ یہ عین اسلام ہے۔ اقوام مغرب نے اپنے ہاں جمہوری نظام رائج کیا اور ہم نے شور مچا دیا کہ اسلام جمہوریت کا مذہب ہے کیونکہ قرآن میں لکھا ہے کہ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے) حالانکہ مغربی جمہوریت اور اسلام کی مشاورت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح جب ہم نے دیکھا کہ کمیونزم بھی ذاتی ملکیت کی نفی کرتی ہے اور قرآن بھی ذرائع پیداوار پر ذاتی ملکیت تسلیم نہیں کرتا۔ تو ہم نے کہنا شروع کر دیا کہ اسلام اور کمیونزم ایک ہی ہیں۔ حالانکہ یہ ایک ہونا تو یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں۔ اگر اسی قسم کی جزوی مشابہتوں سے ہم نے اسلام کو دیگر نظام ہائے زندگی سے ملانا شروع کر دیا تو عجب نہیں کہ کل کو کہہ دیا جائے کہ بھارت کا سیکولر نظام بھی عین اسلام ہے کیونکہ انہوں نے شراب کو ممنوع قرار دیا ہے اور اسلام بھی اسے حرام قرار دیتا ہے۔ یا آریہ دھرم اور اسلام ایک ہی ہیں کیونکہ آریہ سماجی بھی بت پرستی کو برا سمجھتے ہیں اور اسلام بھی اسے شرک قرار دیتا ہے میرا مطلب یہ ہے کہ آپ اتنی سی مشابہت سے اسلام اور کمیونزم کو ایک نہ قرار دیجئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی ازم (ISM) ضابطۂ زندگی کی حیثیت سے اسلام کے [illegible] ہے۔ کمیونزم کا فلسفۂ زندگی اور ضابطۂ حیات کیا ہے۔ یہ ایک طویل بحث ہے جسے یہاں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ اس کی تفصیل معلوم کرنا چاہتے ہیں تو میری کتاب "نظام ربوبیت" یا تازہ تالیف "انسان نے کیا سوچا" ملاحظہ فرمایئے۔ [illegible] کمیونزم کا فلسفہ یہ ہے کہ یہ کائنات کسی نہ کسی طرح از خود وجود میں آ گئی۔ اس کا نہ کوئی [illegible] کمیونزم کا فلسفہ [illegible] کوئی مقصد۔ اسی طرح زندگی (LIFE) اور شعور (CONSCIOUSNESS)

بھی مادے سے خود بخود پیدا ہو گئے۔ اس لئے انسانی زندگی بھی کسی پلان (PLAN) کے مطابق وجود میں نہیں آئی۔ زندگی اس طبعی زندگی کا نام ہے اور جسم کے انتشار (DISINTEGRATION) کے بعد انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ دنیا میں جائز و ناجائز اور حق و باطل کے لئے کوئی خارجی معیار مقرر نہیں۔ اس لئے مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کا تصور ذہن انسانی کا خود تراشیدہ ہے۔ دنیا میں ایک نظام قائم ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نظام میں سے اس کی ضد ایک دوسرا نظام ابھرتا ہے جو پہلے نظام کی جگہ لے لیتا ہے۔ یہ سلسلہ تعمیر و تخریب از خود جاری رہتا ہے۔ اس کی قوت محرکہ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) ہے۔ دور حاضرہ سے پیشتر سرمایہ داری کا نظام قائم تھا۔ تاریخی وجوب کا تقاضا تھا کہ اس میں سے اشتراکی نظام پیدا ہو۔ لہٰذا اب اشتراکی نظام کا دور ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ نظام بھی ختم ہو جائے گا۔ اور اس میں سے اس کی ضد دوسرا نظام ہوگا یہ ہے برادران! مختصر الفاظ میں کمیونزم کا وہ فلسفہ جسے مارکس نے پیش کیا اور جسے لینن نے روس میں عمل کر کے دکھایا۔ آپ اس فلسفۂ زندگی کو دیکھئے۔ اور اس کے بعد اس تصورِ حیات پر غور کیجئے جسے قرآن پیش کرتا ہے اور جس کا اجمالی سا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ اور اس کے بعد خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ دونوں تصورات ایک دوسرے کے مطابق ہیں یا ایک دوسرے کی ضد! آپ شاید یہ کہہ دیں کہ جہاں تک کمیونزم کے معاشی پروگرام کا تعلق ہے۔ وہ تو بہرحال قرآنی نظام سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن یہ بھی سطح بینی اور فریب نظر ہے۔

پروفیسر (HAWTRAY) نے کہا ہے کہ

> جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام کرنے پر آمادہ کر رہا ہے۔

جذبۂ محرکہ

آپ دیکھیں گے کہ کمیونزم کے پاس کوئی جذبۂ محرکہ ایسا نہیں جو کسی فرد کو اس پر آمادہ کر دے کہ وہ جان مار کر محنت کرے اور پھر اپنی محنت کا ماحصل بطیب خاطر دوسروں کو دیدے۔ اشتراکیت کے علمبرداروں نے روس میں کیا کیا؟ انھوں نے وہاں کے مفلوک الحال مزدوروں اور نادار و محروم غریبوں کو یہ کہہ کر ابھارا کہ دیکھو! یہ بڑے بڑے سرمایہ دار کس طرح تمہارا خون چوس رہے ہیں تم اٹھو اور ان کے املاک و دولت کو ان سے چھین لو۔ یعنی انھوں نے ان کے دل میں نفرت اور انتقام کے جذبات کو مشتعل کیا اور اس طرح انقلاب برپا کیا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس پر روس کی تاریخ شاہد ہے۔ ظاہر ہے کہ نفرت اور انتقام کے جذبات زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتے۔ جب وہ سرمایہ دار طبقہ ختم ہو گیا جس کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات مشتعل کئے گئے تھے تو لوگوں میں کوئی جذبہ باقی نہ رہا جو انھیں دوسروں کی خاطر کام کرنے پر آمادہ کرے۔ اس کے لئے روس کے ارباب حل و عقد کو استبداد سے کام لینا پڑا۔ اس قسم کے استبداد سے کام لینا پڑا جس سے عوام تو ایک طرف وہاں کے لیڈر بھی چلا اٹھے۔ یہ جو آجکل اسٹالن کے جور و ستم کے داستانیں منظر عام پر آ رہی ہیں۔ اس میں اسٹالن کا ذاتی طور پر کوئی قصور نہ تھا۔ یہ اس نظام کا فطری نتیجہ تھا جس کی بنیاد نفرت اور انتقام کے جذبات پر تھی کسی تعمیری جذبہ پر نہیں تھی۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کا اعتراف لینن نے ان الفاظ میں کیا تھا کہ

انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی وجہ سے آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصے پر اپنا اقتدار تسلط

قوت واستیلا نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھاڑ اور آتشیں گولوں کے دھماکوں سے زبردستی کرایا ہے۔

فریب

نہ صرف جور و استبداد سے بلکہ مکر و فریب سے بھی ((GOLLANCZ)) اپنی کتاب (OUR THREATENED VALUES) میں لکھتا ہے کہ مشہور اشتراکی لیڈر (DR. LUCKNZ) سے پوچھا گیا کہ کیا اشتراکی جماعت کے لیڈروں کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی جماعت کے افراد سے بھی کذب اور فریب دہی سے کام لیں؟ اس نے جواب دیا کہ

> اشتراکی اخلاق کی رو سے یہ فریضہ سب سے اہم ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ عند الضرورت بددیانتی اور بے ایمانی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ سب سے بڑی قربانی تھی جس کا ہم سے انقلاب نے مطالبہ کیا تھا۔

آپ کو اس جواب پر شاید تعجب ہو لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں جس ضابطۂ زندگی میں مستقل اقدار کو تسلیم نہ کیا جاتا ہو اس میں ہر حربہ جس سے مقصد حاصل ہوتا ہو جائز اور بلکہ ضروری قرار پا جاتا ہے۔ اور خدا پر ایمان کے بغیر مستقل اقدار کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

آپ نے غور فرمایا حضرات! کہ کمیونزم کس طرح اس جذبۂ محرکہ سے محروم ہے جو انسان کو دوسروں کی خاطر کام کرنے پر بطیب خاطر آمادہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، قرآن اپنے نظامِ ربوبیت کی بنیاد ایک ایسی ٹھوس حقیقت پر رکھتا ہے جس میں ہر فرد دوسروں کی نشوونما کے لئے اس لئے مضطرب و بیقرار رہتا ہے کہ وہ اس پر ایمان رکھتا ہے کہ اس سے خود اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے مَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا یَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ (۳۵/۱۸) جو دوسروں کے لئے سامان نشوونما مہیا کرتا ہے، وہ خود درحقیقت اپنی ذات کی نشوونما کرتا ہے۔ اس کے برعکس مَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ (۴۷/۳۸) جو دوسروں کو سامانِ زیست سے محروم رکھتا ہے وہ درحقیقت خود اپنی ذات کو نشوونما سے محروم رکھتا ہے۔ یہ ہے برادران! وہ ایمان جس سے ایسی قوم پیدا ہو جاتی ہے جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) وہ ہمیشہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی اور مشکل سے گذارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہی ہے وہ قوم جس سے اس نظامِ خداوندی کا قیام عمل میں آتا ہے۔ جو دنیا کو علیٰ وجہ البصیرت دکھا دیتا ہے کہ "خدا ہر متنفس کو کس طرح رزق دیتا ہے" اور وہ جنت ارضی کس طرح سامنے آ جاتی ہے۔ جس میں کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اور ہر فرزند آدم کی مضمر صلاحیتیں کامل طور پر نشوونما پا لیتی ہیں۔ اسی نظام کا نام اسلامی نظام اور اس کے آئین کا نام اسلامی آئین ہے ——— اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است۔

سرمایہ داری اور پیشوائیت

قرآن اسی ضمن میں یہ بھی کہتا ہے کہ اس نظام کی مخالفت سرمایہ دار، مفاد پرست طبقہ کی طرف سے ہوگی۔ اور سخت مخالفت ہوگی لیکن انہیں آخر الامر شکست مل کر رہے گی۔ اس باب میں قرآن نے ایک ایسی حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ نگہِ بصیرت جوں جوں اس پر غور کرتی ہے، وجد و مسرت سے رقص میں آ جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نظام کی مخالفت صرف سرمایہ دار طبقہ ہی کی طرف سے نہیں ہوگی بلکہ انسانوں کے خود ساختہ مذہب کے راہ نما (PRIESTS) بھی اس کے مخالف ہوں گے اس لئے کہ یہ طبقہ بھی مترفین میں شامل ہے۔ یعنی ان میں جو دوسروں کی کمائی پر

چکے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کا ہر رسول اسی پیغام کو لے کر آیا ہے لیکن سرداران قوم اور پیشوایان مذہب نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی او شریعت یہ کہہ کر عوام کے جذبات کو مشتعل کرتے کہ یہ شخص تمہیں اس روشِ زندگی سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے جس پر تمہارے اسلاف تھے۔ اس لئے تم اس کی بات بالکل نہ ماننا۔ اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ مفاد پرست طبقہ اس پیغام کی مخالفت میں ب راست سامنے نہیں آتا بلکہ ارباب مذہب کو آگے بڑھاتا ہے اور خود ان کی حمایت کرتا رہتا ہے۔ داستان بنی اسرائیل میں ہے کہ جب موسیٰ فرعون کی طرف گئے اور اس سے کہا کہ خدا کے بندوں کو اپنی غلامی سے آزاد کر دے تو اس نے دو چار باتوں کے بعد اس خطرہ کا اند کر لیا۔ جو اس پیغام میں پوشیدہ تھا۔ اس کے لئے اس نے اپنے مہامنتری (HEAD PRIEST) ہامان کو بلایا اور کہا کہ وہ اولشکر کو تیار کر کے لائے۔ اور حضرت موسیٰ کا مقابلہ کرے۔ یعنی وہ خود تو پیچھے ہٹ گیا۔ اور ضرب کلیمی کے مقابلے کے لئے پیشوا کو سامنے لایا۔ مفاد پرست گروہ ہمیشہ سے یہی کرتا چلا آیا ہے اور آج بھی یہی کچھ کر رہا ہے۔ ملوکیت اور برہمنیت کا یہی وہ گٹھ جو جو انسانیت کے لئے تباہی کا موجب بنتا چلا آرہا ہے۔ برہمن، راجہ کو ایشور کا اوتار بناتا ہے۔ اور راجہ برہمن کی رکھشا (حفاظت اپنا دھرم سمجھتا ہے۔ قیصر پوپ کے لئے جاگیریں وقف کرتا ہے۔ اور پوپ، قیصر کے حقوقِ الوہیت (VINE RIGHTS کی سندیں تراشتا ہے۔ مقصد دونوں کا یہ ہوتا ہے کہ غریبوں اور ناداروں کو جہالت آمیز افیون پلا کر مدہوش رکھا جائے۔ اور ان ک پسینہ کی کمائی پر عیش اڑائے جائیں۔ آپ دیکھئے قرآن کریم کس طرح ان دونوں گروہوں کا ذکر ایک ہی سانس میں کرتا ہے۔ ...ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَا وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۔ اے افراد جماعت مومنین! تم نے اس حقیقت کو اچھی طرح سے یاد رکھنا کہ ارباب شریعت اور طریقت کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ وہ بغیر کسی تعمیری کام کرنے کے عوام کی کمائی مفت میں کھا جاتے ہیں۔ اور ہر وقت اس قسم کے تلاش کرتے رہتے ہیں جس سے لوگ اس راستہ کی طرف نہ جا سکیں جو خدا نے ان کے لئے متعین کیا ہے۔ یہ اس آیت کا پہلا حصہ کے بعد ہے وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَ اور یہ سرمایہ دار گروہ جن کی حالت یہ ہے کہ وہ مال و دولت کے انبار و انبار سمیٹ کر جمع کرتے رہتے ہیں۔ اور اسے نوع انسان کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ (اے رسول) تم ان سے کہدو کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ سوائے درد انگیز تباہی کے اور کچھ نہیں ہوگا۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن نے کس حتم و یقین سے کہا ہے کہ نظام سرمایہ داری کا انجام درد انگیز تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ خواہ وہ اس کے تحفظ کے لئے کتنے ہی تعویذ کیوں نہ لکھے۔ قرآن نے اس حقیقت کو مختلف مقامات پر اس قدر واضح الفاظ میں دہرایا ہے انقلاب کے واقع ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ تو ایک طرف ابہام تک بھی باقی نہیں رہتا۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کا کائنا قانون خود اس انقلاب کو بروئے کار لانے میں سرگرم عمل ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ تم دیکھتے نہیں کہ ہم کس طرح زمین کو ان بڑ سرداروں کے ہاتھوں سے سمٹا کر کم کرتے چلے جا رہے ہیں؟ اس کے ساتھ ہی اس نے کہا ہے کہ کائناتی قانون کے ذریعے سے انقلا طول طویل عرصہ میں جا کر ظہور پذیر ہوا کرتا ہے۔ اور خدا کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار اور پچاس پچا

سال کا ہوتا ہے۔ اس لئے اگر تم چاہتے ہو کہ یہ انقلاب جلد رونما ہو جائے تو تم اس کے لئے کوشش کرو اور کائناتی قانون کے رفیق و معاون بن جاؤ۔ پھر یہ انقلاب تمہارے "برسوں کی مدت" میں تمہارے سامنے آجائے گا۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (۴۷/۷) محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے یہی کیا تھا۔ جس کا نتیجہ چند دنوں کے اندر دنیا کے سامنے آگیا تھا۔ جو معاشرہ حضورؐ نے قائم فرمایا تھا۔ اس میں نہ سرمایہ داری کا نام و نشان تھا، نہ مذہبی پیشوائیت کا کوئی پتہ سراغ۔ لیکن جب حضورؐ کی وساطت سے ملے ہوئے دین

ہمارا موجودہ مذہب

کی جگہ اس مذہب نے لے لی جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا۔ تو اس میں سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت دونوں "عین دین" بن گئے۔ یہی وہ انسانوں کا خود ساختہ مذہب ہے جو اس وقت تک ہم میں رائج ہے۔ چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ غیر مسلم دنیا اپنے عقلی تجربات کی بنا پر سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت سے کنارہ کشی اختیار کئے چلی جا رہی ہے لیکن مسلمانوں کے ممالک انہیں اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے ہیں۔ اور اگر کہیں سے اس کے خلاف آواز اٹھتی ہے تو مذہبی اداره اپنی پوری قوتوں سے مفاد پرستی کے تحفظ کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور عوام کے جذبات کو اسی پرانے حربہ سے مشتعل کر دیتے ہیں کہ مَا هٰذَا اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ (۳۴/۴۳) یہ شخص تمہیں تمہارے اسلاف کے طریقے سے ورغلا کر کسی اور طرف لے جانا چاہتا ہے۔ لیکن برادران! ان کے اس قسم کے حربوں سے یہ انقلاب خداوندی رک نہیں سکتا۔ وَاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا (۲۲/۷) یہ انقلاب یقیناً آکر رہے گا۔ اس میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

مقصدِ پیشِ نظر

جی یہ چاہتا ہے برادران! کہ یہ قرآنی انقلاب اس قوم کے ہاتھوں سے رونما ہو جو خدا کی اس انقلاب آفریں کتاب پر ایمان رکھنے کی دعویدار ہے۔ اور اس کی عملی تجربہ گاہ پاکستان کی سرزمین بنے جسے ہم نے خدا کے قانون کو نافذ کرنے کے لئے حاصل کیا ہے۔ میری یہی کوشش ہے اور اس کے لئے میں اس قرآنی پیغام کو عام کرنے کے لئے جدوجہد کر رہا ہوں۔ میری استدعا یہ ہے کہ آپ میں سے جو خود قرآن پر غور و فکر کے بعد مجھ سے متفق ہوں، وہ اس قرآنی فکر کو عام کرنے کے لئے میرا ساتھ دیں۔ یا جس طریقے سے وہ مناسب سمجھیں اسے عام کریں۔ کیا عجب کہ اس طرح یہ سرزمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ اور امامت امم کا جو وعدہ خدا نے کیا تھا وہ ملت پاکستانیہ کے حق میں پورا ہو جائے۔ لیکن اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہم کمیونزم کے اس سیلاب عظیم کی زد میں نہ آجائیں۔ جس میں انسانیت کی تمام قدریں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہیں۔ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا (۱۹/۲۳)

سوالات

تقاریر کے بعد مختلف لوگوں کی طرف سے کچھ سوالات پوچھے گئے۔ یہ سوال اور ان کے مختصر جوابات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ (طلوع اسلام)

(۱) سوال: ہم غریب اس آسرے پر جیتے ہیں کہ اس دنیا میں ہم مصیبتوں میں زندگی بسر کرلیں۔ اگلی دنیا میں تو جنت ہمارے لئے ہے۔ آپ نے وہ جنت بھی ہم سے چھین لی۔ یہ تو بڑا ظلم ہے۔

جواب:۔ یہ جنت میں نہیں چھین رہا۔ جب قرآن بھوک کو خدا کا عذاب قرار دیتا ہے تو میں اسے کس طرح اس کی رحمت قرار دوں۔ بات یہ ہے کہ قرآن کسی کے غلط جذبات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ (۴/۱۲۳) نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہوگا اور نہ ہی تمہارے فریق مخالف (اہل کتاب) کی آرزوؤں کے مطابق۔ ہوگا سب کچھ خدا کے اٹل قانون کے مطابق اور اس کا اٹل قانون یہی ہے کہ مَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ (۱۷/۷۲) یہاں کا اندھا وہاں کا بھی اندھا۔ اتنا اور عرض کردوں کہ کسی ہنگامی حادثہ سے کسی فرد یا قوم کا وقتی طور پر مفلوک الحال ہوجانا اور بات ہے اور اس کا اس مفلسی اور فلاکت کو خدا کی رحمت سمجھ کر اس حالت پر مطمئن ہوجانا اور بات۔ دنیا اور آخرت کی رسوائی اس دوسری صورت کا لازمی نتیجہ

(۲) سوال:۔ اعمیٰ کے معنی عقیدے کی گمراہی ہے اسے معاشی معاملات سے کیا تعلق ہے؟

جواب:۔ قرآن نے معاشی معاملات کے ساتھ اس کا گہرا تعلق بتایا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ (۲۰/۱۲۴) جو ہمارے قانون سے اعراض برتے گا ہم اس کی روزی تنگ اور روزِ قیامت میں اسے اعمیٰ (اندھا) اٹھائیں گے۔ نیز خود سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں یہ آیت آئی ہے کہ وَمَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ (۱۷/۷۲) اس سے پہلے انسان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (۱۷/۷۰) لہٰذا خوشگوار رزق سے محرومی اور دیگر مخلوق کے مقابلہ میں عدم سرفرازی اعمیٰ ہونے کی دلیل ہے۔

(۳) سوال:۔ اس اعتبار سے تو اقوام یورپ جنہوں نے قوائے فطرت کو مسخر کرلیا ہے، مومنین کی جماعتیں قرار پاجائیں گی۔

جواب:۔ اقوام یورپ نے خدا کے طبعی قانون پر عمل کیا ہے اور وہ اس کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہیں۔ مَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (۱۷/۲۰) خدا نے اپنے عطیات کے آگے دیوار نہیں کھینچ دی کہ کسی قوم کے لئے اس کے پھاٹک کھول دیئے جائیں تو اس سے روک دیا جائے۔ اس کے قوانین طبعی پر جو قوم بھی عمل پیرا ہوگی وہ اس کے نتائج سے ثمریاب ہوجائے گی كُلًّا نُمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ (۱۷/۲۰) لیکن اتنے سے کوئی قوم مومن نہیں قرار پاجاتی۔ مومن وہ ہے جو خدا کے طبعی قوانین کے ساتھ اس کے انسانیت سے متعلق قوانین (مستقل اقدار) پر بھی عمل پیرا ہو۔ یہ قوانین قرآن کریم کے اندر ہیں۔ صورت یہ ہے کہ

(۱) جو قوم خدا کے طبعی قوانین پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ اسے طبعی کائنات کے مفاد عاجلہ حاصل ہوجاتے ہیں لیکن اس کا مستقبل تاریک ہوتا ہے۔

(۱) جو قوم طبعی قوانین کے ساتھ مستقل اقدار پر بھی عمل پیرا ہوتی ہے۔ اس کا حال بھی روشن ہوتا ہے اور مستقبل بھی۔ اور
(۲) جو قوم نہ طبعی قوانین پر عمل کرتی ہے نہ مستقل اقدار پر۔ اس کا حال بھی تاریک ہوتا ہے اور مستقبل بھی۔

(۵) سوال:۔ تم نے قرآن کی آیت اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا کا ترجمہ کرتے ہوئے
کہا ہے کہ خدا زمین کو بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے سمٹا کر کم کرتا جا رہا ہے۔ یہ بجز تحریف اور الحاد ہے۔ تم نے اس سے قرآن کو
گندہ بنا دیا ہے قرآن میں من اطرافہا ہے۔ اس میں سرداران قوم کا کہیں ذکر نہیں۔

جواب:۔ آپ عربی کی کوئی مستند لغت اٹھائیے۔ اور اس میں دیکھئے کہ اطراف کے معنی سرداران قوم دیئے گئے ہیں یا نہیں۔

(۶) سوال:۔ آپ نے ہر جگہ قانونِ خداوندی کی اطاعت کا ذکر کیا ہے۔ اس سے خدا کہیں باقی نہیں رہتا۔ صرف اس کا قانون
رہ جاتا ہے۔ یہ تو خدا کا انکار ہے۔

جواب:۔ آپ جب قرآن کی اطاعت کرتے ہیں تو اسے خدا کی اطاعت کہتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ یہ تو کتاب اللہ کی اطاعت
ہے۔ خدا کی اطاعت نہیں تو آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟ کیا کتاب اللہ کی اطاعت سے (معاذ اللہ) خدا کا انکار ہوگا؟ کتاب
بھی قانون ہی ہیں۔ اس لئے میں قانونِ خداوندی کی اطاعت کہتا ہوں۔ قانون خداوندی کی اطاعت اس لئے کہتا ہوں کہ اس
قانون کے دو حصے ہیں۔ ایک قانونِ طبعی ہے جو خارجی کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔ اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا بھی ضروری
ہے۔ دوسرا قانون انسان سے متعلق ہے اور مستقل اقدار پر مشتمل۔ یہ قانون قرآن کریم کے اندر ہے۔ اور اس کی اطاعت بھی نہایت
ضروری۔ لہٰذا قانونِ خداوندی کی اطاعت سے مفہوم یہ ہے کہ انسان خدا کے قانونِ طبعی کے مطابق فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے
اور ان کے ماحصل کو قرآنی قانون کے مطابق نوعِ انسانی کی نشو ونما کے لئے صرف کرے۔ فرمائیے! یہ خدا کا انکار ہے یا اس کا صحیح
اقرار! یاد رکھئے اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق صرف اس کے قانون کے ذریعے ہے۔ لہٰذا اس کے قانون کی اطاعت، عین اطاعت
خداوندی ہے۔ اس کی اطاعت کا اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہیں۔ نہ اس سے تعلق پیدا کرنے کا کوئی اور ذریعہ۔

(۷) سوال:۔ کیا رسول اللہؐ کے زمانہ میں بھی افرادِ معاشرہ کی رزق کی ذمہ داری نظام کے سر تھی۔؟

جواب:۔ اس کا اصولی جواب تو یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے قرآن کے مطابق عمل فرمایا تھا۔ اس لئے اگر آپ اس سے متفق ہیں کہ قرآن
کی رو سے افرادِ معاشرہ کے رزق کی ذمہ داری نظام پر ہے تو حضورؐ نے جو نظام متشکل فرمایا تھا۔ اس میں بھی لامحالہ یہی صورت
ہوگی۔ اتفاق سے اس کے لئے ہمارے پاس تاریخی شہادت بھی موجود ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ حکومت کی طرف سے تمام افراد
کے وظائف مقرر تھے۔ یہی وہ وظائف تھے جو پہلے بچہ کے دودھ چھڑانے کے بعد سے دیئے جاتے تھے۔ لیکن ان کے متعلق بعد میں
حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ وہ بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی ملنے لگ جایا کریں۔

(۸) سوال:۔ کیا خلافتِ راشدہ میں زمینیں حکومت کی مشترکہ تحویل میں تھیں؟

جواب:۔ اس سوال کا اصولی جواب دیا ہے جو میں نے سابقہ سوال کے جواب میں عرض کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تاریخ

ہیں یہ بھی بتاتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا تھا کہ عراق وغیرہ کی مفتوحہ زمینیں افراد میں نہ بانٹی جائیں۔ بلکہ حکومت کی تحویل میں رہیں اس ضمن میں اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ بنیادی سوال یہ ہے کہ تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی کی بہم رسانی اور ان کی صلاحیتوں کے نشو و نما پانے کے اسباب و ذرائع کی فراہمی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ حکومت اس اہم فریضہ کی سر انجام دہی کے لئے زمانہ کے احوال و ظروف کے مطابق عملی تدابیر خود طے کرے گی۔ قرآن نے اس کے لئے اصول یہ دیا ہے کہ ذرائع پیداوار تمام افراد کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کھلے رہنے چاہئیں اور فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کسی کے پاس نہیں رہنی چاہیئے۔

(۹) سوال: آپ نے جو کچھ کہا ہے۔ ہم اس سے متفق ہیں۔ اب یہ بتایئے کہ موجودہ حالات میں اس قرآنی انقلاب کے لئے کیا قدم اٹھایا جائے۔

جواب:۔ اس کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ اس کا فیصلہ باہمی مشاورت سے کیجئے۔ جو لوگ قرآن کے اس پیغام پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور سوچیں کہ اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے کیا عملی قدم اٹھایا جائے۔ لیکن جو قدم بھی اٹھایا جائے۔ وہ کسی حال میں بھی حدود اللہ سے تجاوز نہ کرے۔

امریکہ اور یہودی

[یہودیوں کی فلسطینی حکومت مسلمانانِ عالم کے قلب میں نشتر کی حیثیت رکھتی ہے جس کے درد سے ہر آنکھ پُرنم ہے۔ امریکہ کو بالعموم مسلمان سلطنتیں اپنا دوست سمجھتی ہیں لیکن امریکہ کی ساری ہمدردیاں اسرائیلی حکومت کے ساتھ ہیں امریکہ سے شائع ہونے والے مشہور رسالہ لائف (LIFE) کی ۱۶ راپریل ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں ایک مقالہ افتتاحیہ شائع ہوا ہے جو اس قابل ہے کہ مسلمانانِ عالم اسے نہایت غور سے پڑھیں اور پھر سوچیں کہ مسلمانوں کو اسرائیلی خطرے سے بچانے کے لئے ہم کیا کر رہے ہیں۔ اور اس باب میں امریکہ کا نقطۂ نگاہ کیا ہے۔ ذیل میں اس اہم مقالہ کا آزاد ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔ طلوعِ اسلام]

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سے مشرقِ وسطیٰ کے متعلق اہلِ امریکہ کے خیالات بڑی وسعت اختیار کر رہے ہیں نتیجہ کہ ان میں بعض خیالات باہمدگر متضاد بھی ہیں، چونکہ اہلِ امریکہ ہر مقام پر ترقی کے طرفدار ہیں۔ اس لئے انہوں نے جب دیکھا کہ کرنل جمال عبدالناصر مصر کی جاگیردارانہ شہنشاہیت کا تختہ الٹ کر اس کی جگہ جمہوری نظام کے قیام کے لئے کوشاں ہے تو اہلِ امریکہ نے اپنی ہمدردیاں جمال ناصر کے ساتھ وابستہ کر دیں۔ چونکہ اہلِ امریکہ استعماریت کے قدیمی دشمن ہیں۔ اس لئے جب انہوں نے محسوس کیا کہ شمالی افریقہ کے عرب اور جزیرۂ قبرص کے باشندے آزادی کے خواہاں ہیں تو انہوں نے ان کی کوششوں کو بنظرِ استحسان دیکھا۔ اسی طرح انہوں نے متعدد وجوہات کی بنا پر یہودیوں کے اس حق کی بھی تائید کی کہ وہ اپنی جداگانہ قوم تشکیل کر لیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ امریکہ نے اس مقصد کے حصول کے لئے انہیں مدد بھی دی۔ اور سب سے پہلے ان کی آزاد حکومت کو تسلیم کر لیا۔ ان متعدد وجوہات میں غیر شعوری طور پر یہ جذبہ بھی کارفرما تھا کہ امریکہ میں اکثریت عیسائیوں کی ہے جن کے قوانین کا ماخذ عہد نامہ عتیق ہے۔ اس بنا پر وہ سمجھتے تھے کہ یہودی کلچر کا ہمارے ذمہ ایک قرض ہے۔ جس کی ادائیگی کی یہی صورت ہو سکتی ہے۔ اس سے ذرا نچلی سطح پر حکومت امریکہ کا یہ اقدام اس ملک کی عملی سیاست کے تقاضوں پر مبنی تھا امریکہ میں قریب باون لاکھ یہودی بستے ہیں۔ اور ایک منظم، مؤثر اور طاقتور اقلیت کی حیثیت لئے ہوئے ہیں۔ امریکہ میں کئی شہر اور ریاستیں ایسی ہیں جہاں یہودیوں کے ووٹ الیکشن میں فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ پریذیڈنٹ ٹرومین نے اسرائیلی حکومت کی حمایت امریکن یہودیوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے کی تھی۔

ایک طرف مشرقِ وسطیٰ کی سیاست کے متعلق امریکی رجحانات اس طرح متعین ہو رہے تھے۔ اور دوسری طرف امریکہ کے ایسے اقتصادی

مفاد ابھرتے چلے آرہے تھے۔ جو ان کے رجحانات اور پالیسی دونوں کو متاثر کر رہے تھے۔ امریکہ کی تیل کی کمپنیاں سعودی عرب میں اپنا زور کی تیل کی صنعت کو نشوونما دے رہی تھیں لیکن انہوں نے جلدی محسوس کر لیا کہ وہ مقامات ایسے اہم ہیں کہ اگر کل کو کوئی عالمگیر جنگ ہو تو ان مقامات کا امریکہ کے ہاتھوں میں رہنا عسکری نقطۂ نگاہ سے نہایت مفید ہوگا۔ دوسری طرف سعودی عرب بھی چاہتے تھے کہ وہ اپنے ہاں آنے دیں۔ تاکہ وہاں سے انگریز کا تسلط ٹوٹ جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مشکل یہ تھی کہ سعودی عرب کے باشندے مسلمان، اتحاد کے بالعموم اور عرب مسلمانوں کے اتحاد کے بالخصوص حامی تھے۔ اس لئے اسرائیلی حکومت کی مخالفت ان کے دل میں جنون کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ انہیں تیل کی آمدنی اس قدر ہوتی کہ وہ بے تحاشا خرچ کرنے سے بھی ختم نہیں ہوتی تھی۔ لہٰذا اس بچت کا صحیح مصرف انہوں نے یہی سمجھا کہ وہ اس روپیہ کو مصر، شرق اردن یا اسی قسم کی دوسری سلطنتوں کو دیدیں۔ تاکہ وہ سلطنتیں کسی نہ کسی طرح اس حکومت کو تباہ کر دیں۔

اہل امریکہ کے لئے یہ امر بڑا یاس انگیز ہے کہ مصر کا جمال ناصر مختلف قوتوں کی آماجگاہ بن گیا۔ کہاں یہ صورت تھی کہ اس کے سامنے صرف یہ تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے ملک کو غربت اور افلاس کے پنجے سے چھڑائے۔ اور کہاں یہ صورت پیدا ہو گئی کہ وہ عربی ممالک کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگ گیا۔ جمال ناصر کے دل میں یہودیوں کے خلاف نفرت کا جذبہ اتنا شدید نہیں تھا جتنا دوسروں کے دل میں تھا۔ لیکن قیادت کی ہوس نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اسرائیل کے خلاف اعلان جنگ میں سب سے پیش پیش ہو۔ اس لئے وہ قاہرہ کے ریڈیو اسٹیشن سے نہ صرف یہودیوں کے خلاف بلکہ پوری مغربی دنیا کے خلاف نہایت کذب آمیز پراپیگنڈہ کرتا اور ان افریکنوں کو جو اس کی جنگِ آزادی کی کوشش میں اس کے مؤید تھے مطعون کرتا ہے کہ فرانس شمالی افریقہ کے عربوں کو جو آزاد ہونے دیتا تو وہ اب امریکہ کی شہ پر کر رہا ہے۔ قاہرہ ریڈیو تمام مغربی اقوام کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا ہے وہ انہیں عربوں کی آزادی کا دشمن اور استعمار پسند قرار دیتا ہے۔ اس مقصد کے لئے ناصر نے روس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی کوششیں شروع کر دی ہیں اس نے مشرق وسطیٰ میں بے شمار مشکلات کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ اور اسے اس حالت تک پہنچا دیا ہے کہ وہاں ایک چھوٹی سی چنگاری جنگ کے شعلے بھڑکا دینے کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔

ادھر مشرق وسطیٰ میں اس قسم کے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ اور ادھر یہودیوں کے متعلق اہل امریکہ کی رائے پختہ سے پختہ تر ہو رہی ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہل امریکہ یہ سمجھتے ہیں کہ اب وقت آ چکا ہے کہ عربوں کے دوست لگی لپٹی بغیر کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیں کہ:۔

فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم ہو چکی ہے۔ اور وہ اسی طرح سے قائم رہے گی۔ اہل امریکہ نے یہودیوں کو ایک قوم بننے کے لئے مدد دی تھی۔ انہوں نے سب سے پہلے ان کی حکومت کو تسلیم کیا تھا۔ وہ اپنے دل میں یہودیوں کے لئے گہری دوستی کے جذبات رکھتے ہیں۔ اس لئے اہل امریکہ یہ دیکھیں گے کہ وہ کونسی قوت ہے جو یہودیوں کو فلسطین سے ہٹا سکتی ہے۔ جب تک عرب اس مسلمہ حقیقت کا اعتراف نہ کر لیں کہ یہودی فلسطین میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کے لئے

آباد ہوئے ہیں۔ اس وقت تک عربی ممالک میں کبھی امن پیدا نہیں ہو سکتا۔

امریکن یہ بھی کہیں گے کہ :۔

اے عربو! یہ صرف تم ہی کہہ رہے ہو کہ فلسطین میں امن نہیں ہے۔ اسرائیلی یہ کبھی نہیں کہتے کہ ہم عربی دنیا کو تباہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس تم قدم قدم پر اعلان کرتے پھر رہے ہو کہ ہم یہودیوں کو تباہ کر کے رہیں گے۔ یہ تمہارے مقدس مذہبی پیشوا ہیں جو آئے دن یہودیوں کے خلاف جہاد کے نعرے بلند کرتے رہتے کہ ہم یہودیوں کو سمندر میں دھکیل دیں گے۔ یہ تم ہو جو یہودیوں کے حق زلیست کو تسلیم نہیں کرتے جب تک تم ان کے اس حق کو تسلیم نہیں کرو گے۔ دنیا کے سامنے تمہارے دعوے کی کوئی حقیقت نہیں ہو گی۔

ن سمجھتے ہیں کہ اس وقت مشرق وسطیٰ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ افسوسناک بھی ہے اور خطرناک بھی۔ لیکن اس کی ذمہ داری عربوں پر ہے لانے یہودیوں کے خلاف نفرت کے جو جذبات ابھارے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس خطۂ زمین میں کمیونزم کے پر امن داخلے لئے دروازے کھول دیئے ہیں اور یہ کسے معلوم نہیں کہ روس دورۂ حاضرہ میں سب سے بڑا استعماریت پسند ہے۔ مصر میں روس سے سامان ۔ آدمی بہت پرآنا شروع ہو گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی روسی صنعت کار بھی۔ شام میں کمیونسٹ ایجنٹس پہلے ہی سے گھس آئے ہوئے ۔ان کی کوشش یہ ہے کہ وہاں بھی کمیونزم اسی طرح چھا جائے جس طرح مصر میں چھائی ہوئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کی قیمت کیا لی؟ شام بحیثیت ایک آزاد مملکت کے ختم ہو جائے گا۔

ایک زمانہ تھا کہ جمال ناصر روسی خطرہ کا ڈھنڈورا دیا کرتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ مشرق وسطیٰ میں کوئی مدافعانہ محاذ بنایا جائے۔ جس میں مصر شریک ہو سکے لیکن جب ترکی ایران۔ عراق اور پاکستان نے روس کے پھیلاؤ کو روکنے کے لئے اس قسم کا محاذ بنایا۔ تو ناصر نے اس کے خلاف واز بلند کر دی۔ سعودی عرب۔ شرق اردن کی طرف رشوت کا روپیہ منتقل کر رہا ہے۔ تاکہ اس کی گلیوں میں شورش برپا ہو جائے اور مصر سب کچھ دیکھتا ہوا چشم پوشی کر لیتا ہے۔ اسی رشوت کا نتیجہ ہے کہ شاہ حسین کو گلب پاشا جیسا تجربہ کار جنگ آزما سپاہی، جس نے عرب لیجن کو اس قدر مضبوط بنا رکھا تھا معطل کر دینا پڑا۔

یہ سب کچھ بڑا افسوسناک ہے لیکن اس سے کہیں افسوسناک یہ امر ہے کہ اس تمام انتشار کی ذمہ داری ناصر جیسی شخصیت پر ہے۔ ـر سب کچھ جانتا ہے اور اس میں اس کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ بہترین سیاست داں بن سکے جب ناصر نے اپنے ملک میں انقلاب ـر پا کیا ہے تو امریکنوں کو اس سے بات چیت کا موقع ملا تھا۔ اس بات چیت سے انھیں یقین ہو گیا تھا کہ اسکی دیانتدارانہ خواہش یہ ہے کہ وہ اپنے ملک کو افلاس اور استبداد کے اس جہنم سے نجات دلا دے جس میں وہ صدیوں سے گرفتار چلا آ رہا ہے۔ لیکن یہودیوں کی خالفت کے شور و غوغا نے ناصر کو بھی انہیں راستوں پر چلا دیا جس پر اس سے پہلے کئی ایسے لیڈر چل چکے ہیں جنھوں نے اپنے ملک کی اندرونی حالت اور بہبود کے مقابلے میں خارجی سیاست میں دخل اندازی کو ترجیح دی۔

امریکنوں کا خیال ہے کہ ناصر جیسا اعتدال پسند لیڈر جس نے تشدد پسند اخوان المسلمین کو دبا کر رکھ دیا ہے۔ اب مصر کے مفاد کو

عربی اتحاد کی قربان گاہ پر ذبح کر رہا ہے۔ یہ امر کس قدر افسوسناک ہے کہ جس شخص نے معمار قوم بننا تھا۔ وہ یونہی غوغا پسند بن کر رہ گیا ہے۔ شخص جو اب نسلی منافرت کی آگ کو اس طرح ہوا دیتے رہا ہے۔ وہ یہی ہے جب وہ ۱۹۴۸ء میں یہودیوں کے خلاف لڑتا ہوا زخمی ہوا تھا۔ تو اس نے اپنے سپاہیوں سے کہا تھا کہ "رفیقو! ہمارے لئے جہاد کا میدان یہ نہیں بلکہ خود ہمارے گھر کی سرزمین ہے"۔ جیسا کہ اس نے اس وقت کہا وہ اب بھی جانتا ہے کہ اس کا جہاد در حقیقت اپنی قوم کی جہالت اور فلاکت کے خلاف ہونا چاہیئے۔ ناصر جہاد کے احمقانہ نعروں کو خاموشی سے سن رہا ہے۔ اور اس کے ملک کے نچلے مختلف بیماریوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔ اور وہ امریکن امداد سے انکار کر کے اس تباہی و بربادی میں اور بھی اضافہ کر رہا ہے۔

امریکن جانتے ہیں کہ اس وقت کسی عرب لیڈر کے لئے خواہ وہ ناصر ہی کیوں نہ ہو، یہ ناممکن ہو چکا ہے کہ وہ اس نسلی منافرت کی رو کے خلاف آواز اٹھا کر اقتدار کا مالک رہ سکے لیکن ایک جہالت آمیز رو کے ساتھ بہتے جانا تو کوئی خوبی نہیں ہے۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ عربی اقوام کوئی اتنا بڑا قائد پیدا کریں جو اس رو کی مخالفت کرے اور اس کے باوجود قوم کے دلوں میں اپنی عظمت کا سکہ بٹھا سکے۔ یہی وہ لیڈر ہوگا جسے باقی دنیا خوش آمدید کہے گی۔ اگر اہل امریکہ کو ناصر سے بات کرنے کا موقعہ ملے تو وہ اس سے یہی کہیں گے کہ

> تم اپنی قوم کو روشنی کی طرف لے جاؤ۔ ایسا نہ ہونے دو کہ مذہبی دیوانے تمہیں تاریکی کی طرف ہانک کر لے جائیں۔ کہتے ہیں کہ تم نے کبھی اپنے آپ کو اشتعال میں نہیں آنے دیا۔ تم اپنی قوم کی اس طرح قیادت کرو کہ وہ عقل و خرد کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تم اپنی قوم کو ان شکاریوں کے حوالے نہ کرو جو منافرت کے جذبات بھڑکا کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ تم انہیں اس صبر و استقامت کی تلقین کرو جس کے تم مالک ہو۔ قسمت نے تمہیں عظمت اور بلندی کا ایک نادر موقعہ دیا ہے۔ اسے یونہی سستے داموں بیچ کر ضائع نہ کرو۔

امریکنوں نے جب بھی یہودیوں کو غلطی پر دیکھا تو ہمیشہ ان پر تنقید کی ہے۔ جب یہودی ان دس لاکھ عرب مہاجرین کو آباد کرنے معاوضہ دینے میں ناکام رہے جو ۱۹۴۸ء میں اپنے گھروں سے نکالے گئے تھے۔ تو کتنے ہی امریکن تھے جن کے دل میں اس سے نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ پریسیڈنٹ آئزن ہاور نے جب یہودیوں اور عربوں میں غیر جانبدارانہ پالیسی اختیار کی تو اس کی اس حکمت عملی کو امریکہ طور پر سراہا گیا۔ جب امریکہ نے اسرائیلی حکومت کو تسلیم کیا ہے تو یہ اس لئے نہیں تھا کہ اسرائیلی فی الحقیقت اپنی حکومت قائم کر چکے تھے لئے کیا گیا تھا کہ امریکن یہ سمجھتے تھے کہ ان مصائب کے بدلے میں جو یہودیوں پر دوسرے ممالک میں روا رکھے گئے تھے۔ یہودیوں کو کسی جگہ گھر بنانے کا حق حاصل ہے۔ امریکن یہودیوں کے اس حق کی ہمیشہ حمایت کریں گے کہ وہ اپنے امن کے گھر میں امن سے رہیں۔ جب تک ان کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتے اور یہودیوں کے مٹانے کی ناجائز خواہش کو اپنے دل سے نکال نہیں دیتے۔ عربوں کے ان دو سے ہو جانے کی کوئی شکل پیدا نہیں ہو سکتی جو حق اور عدل پر مبنی ہوں۔

امریکیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ عرب یہودیوں کی حقیقت کو اپنے طور میں جگہ دے کر امن عالم سے جو کھیل رہے ہیں۔

دیے ہیں اہلِ امریکہ کے خیالات اس مسئلہ کے متعلق جو دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے وجہ صد اضطراب بن رہا ہے۔ آپ نے اس منطق ملاحظہ فرمایا جس کی بنا پر اہلِ امریکہ یہودیوں سے اس قدر ہمدردی کر رہے ہیں! منطق یہ ہے کہ چونکہ جنگ کے دوران میں جرمنی ودیوں کو ستایا تھا۔ اور انہیں ان کے گھر سے نکال دیا تھا۔ اس لئے عدل و انصاف کا تقاضا تھا کہ یہودیوں کو کسی خطۂ زمین میں جائے۔ یہ خطۂ زمین فلسطین ہے۔ یعنی انہیں ستایا تھا جرمنوں نے اور اس کی سزا دی گئی عربوں کو! اگر امریکہ کا دل عدل و ت کے لئے ایسا ہی تڑپتا تھا۔ تو انہوں نے یہودیوں کو اپنے ہاں کیوں نہ بسا لیا؟ بہرحال کہنے کی بات صرف اتنی ہے کہ مسلمانوں ایں کوئی دوست نہیں۔ اور یہ بات اچنبھے کی نہیں۔ کمزور کا کوئی بھی دوست نہیں ہوا کرتا۔ اس لئے شکوہ امریکہ سے نہیں خود نوں سے ہے جو اپنی کمزوری دور کرنے کی فکر نہیں کرتے۔ اور تفس کی زندگی کو اطمینان اور آرام کی زندگی قرار دے کر آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔

طلوعِ اسلام

مجلسِ اقبال

مثنوی اسرارِ خودی۔ باب نہم

(مسلسل)

مرحلہ سوم۔ نیابتِ الٰہی

زیرِ نظر باب کے پہلے دو حصوں میں علامہ اقبال بتا چکے ہیں کہ انسانی خودی کی تربیت اور استحکام کے لئے اطاعت اور ضبطِ نفس ضروری ہے۔ یعنی قوانینِ الٰہیہ کی بطیبِ خاطر اطاعت اور اگر اس ضمن میں انسانی نفس کے رجحانات اسے قانون شکنی کی طرف مائل کریں اپنے آپ پر پورے کنٹرول سے ان رجحانات کا مقابلہ۔ اس کے بعد وہ تربیتِ خودی کے تیسرے مرحلہ کی طرف آتے ہیں۔ اس کا نام ان کی اصطلاح میں نیابتِ الٰہی ہے۔ اگر بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو نیابتِ الٰہی تربیتِ خودی کا تیسرا مرحلہ نہیں بلکہ پہلے دو مراحل (اطاعت اور ضبطِ نفس) کا فطری نتیجہ ہے۔ یا یوں کہیے کہ جو اطاعت اور ضبطِ نفس سے اپنی خودی میں استحکام پیدا کرلیں۔ ان کا فریضۂ زندگی

اس ضمن میں سب سے پہلے نیابتِ الٰہی کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ آدم خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ یعنی زمین میں خدا کا خلیفہ اور اس کی سند لائی جاتی ہے اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کی آیت سے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ نہ اس آیت میں اور نہ ہی کسی دوسرے مقام پر قرآن نے آدم کو اللہ کا خلیفہ کہا ہے۔ خلیفہ کے معنی ہیں جانشین (SUCCESSOR) اس آیت میں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ انسان دنیا میں اپنے سے پہلی آبادیوں کا جانشین ہے۔ قصۂ آدم، انسان کی تمدنی زندگی کے آغاز کی داستان ہے۔ اس کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے کہ پہلی (SPECIES) ایامِ حیوانی نیم انسانی زندگی کے بعد اب انسانی زندگی کا آغاز ہو رہا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ جانشین یا نائب ہمیشہ اس کا ہوتا ہے جو خود اس مقام پر موجود نہ ہو۔ جو خود کسی مقام پر ہو، وہاں اس کا قائم مقام یا نائب کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کائنات کے ہر مقام پر [illegible] اس کی رگِ حیات میں بمنزلہ [illegible] ہے اور جب وہ ہر جگہ خود موجود ہو پھر اس کے نائب [illegible]

تیسری بات یہ ہے کہ نائب وہ ہوتا ہے جسے حاکم اعلیٰ اپنے بعض اختیارات تفویض (DELEGATE) کر دے ظاہر ہے کہ جو اختیارات تفویض کر دیئے جائیں تو وہ خود حاکم اعلیٰ کے پاس نہیں رہتے۔ اس بنا پر یہ تصور کرنا بھی غلط ہے کہ خدا نے اپنے بعض اختیارات انسان کو تفویض کر دیئے ہیں اور خود ان اختیارات سے عاری ہو گیا ہے۔

قرآن کی رو سے انسان کی پوزیشن یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر فرد انسانیہ کے اندر ایسی صلاحیتیں رکھ دی ہیں جن کی مناسب نشوونما اور تربیت سے اس کے اندر ایک محدود پیمانے پر وہ قوتیں پیدا (یا بیدار) ہو جاتی ہیں جنھیں لامحدود انداز پر صفات خداوندی (اسماء الحسنیٰ) کہا جاتا ہے۔ یہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں قرآنی پروگرام پر عمل پیرا ہونے سے۔ اس پروگرام کی رو سے ایک ایسا معاشرہ متشکل ہوتا ہے جس میں افراد معاشرہ کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پاتی چلی جاتی ہیں۔ اس معاشرے کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ اس نظام کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جائیں۔ تاآنکہ (قرآنی تصور کے مطابق) یہ تمام نوع انسانی کو محیط ہو جائے۔ یہ جماعت جس کے افراد میں یہ قوتیں بیدار ہو جائیں۔ جماعت مومنین کہلاتی ہے۔ یہ جماعت قوانین خداوندی کو جس پر یہ سب سے پہلے خود عمل پیرا ہوتی ہے دنیا میں رائج کرتی ہے۔ یہ خارجی کائنات کی قوتوں کو مسخر اور اسے نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کرتی ہے۔ اقبال نے نیابت الٰہی کی اصطلاح کو انہی معانی میں استعمال کیا ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ چونکہ اس اصطلاح کو اب غلط معانی پہنا کر اسے خصوصی مفاد کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس لئے بہتر ہو کہ اسے استعمال ہی نہ کیا جائے۔ تصوف کے حامی "نائب حق" سے مراد وہ انسان کامل لیتے ہیں جسے مرشد سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو باطنی قوتوں کا حامل ہوتا ہے۔ حالانکہ قرآن سے نہ اس قسم کے انسانی مرشد کی سند ملتی ہے۔ نہ کسی باطنی قوت کی۔ دوسری طرف "مذہبی سیاست" کے مدعی اس نیابت کے تصور سے حقوق خداوندی (DIVINE RIGHTS) کے دعوے کی بنیاد پر تھیاکریسی (THEOCRACY) "پیشوائیت کی حکومت" قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ نہ رسول اللہؐ نے اپنے آپ کو خلیفۃ اللہ کہا اور نہ ہی حضورؐ کے جانشینوں نے اپنے لئے ایسا لقب تجویز کیا۔ انھوں نے اپنے آپ کو خلیفۃ الرسول (رسول اللہ کے جانشین) یا امیر المومنین کہہ کر پکارا۔ مومن، قرآن کا تجویز کردہ نام اور ان تمام خصوصیات کبریٰ کا حامل ہے جو شرف انسانیت کی آئینہ دار ہیں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ نئی نئی اصطلاحات کے بجائے اسی قرآنی اصطلاح کو استعمال کیا جائے۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے کلام میں مرد مومن کی اصطلاح بالعموم استعمال کی ہے۔ ۔ ۔ نہ ایک مقام پر جہاں انھوں نے مومن کو نائب حق کہہ کر پکارا ہے۔ اس سے ان کی مراد یہی ہے کہ وہ دنیا میں قوانین خداوندی کو نافذ کرتا ہے۔

اس مفہوم کے پیش نظر ان اشعار کا مطلب سمجھئے جو "مرحلہ سوم" کے ضمن میں درج مثنوی ہیں۔ سابقہ مرحلہ (ضبط نفس) میں اقبال نے نفس انسانی کو شتر بے مہار سے تشبیہ دے کر یہ کہا ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ بجائے اس کے کہ اس شتر کو آزاد چھوڑ دے اسے آئین (قوانین) کے تابع کر دے۔ اسی کا نام شتربانی ہے یعنی نفس انسانی کو آئین خداوندی کی حدود کے اندر رکھنا اس کے بعد وہ کہتے ہیں:

گر شتربانی۔ جہانبانی کنی

اگر تو اس قسم کا شتربان ہو گیا تو تو ساری کائنات پر حکمران ہو جائے گا۔ اور اپنے سر پر تاجِ سلیمانی کو مزین دیکھے گا۔ قرآن نے الفاظ میں بتلایا ہے کہ ایمان و اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض۔ دنیا کی حکومت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہنگامی طور قوت حاصل کر لینے سے بھی حکومتیں قائم ہو جاتی ہیں۔ لیکن ملک تو اس قسم کی حکومت اور اس حکومت کی غرض و غایت اور مقصود مطلوب میں بُعد المشرقین۔ جو آئین خداوندی کے نفاذ کے لئے قائم ہوتی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ جو حکومت ایمان و اعمال صالحہ کا نتیجہ ہو وہ زوال پذیر نہیں ہوتی۔ وہ اس وقت تک سرسبز و شاداب اور قائم و دائم رہتی ہے۔ جب تک ایمان و اعمال کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ ابلیس نے آدم کو یہ فریب دے کر بہکا دیا تھا کہ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ (۲۰/۱۲۰)، میں تمہیں حیاتِ جاوید کا سراغ اور ایک ایسی مملکت کا پتہ نشان دیتا ہوں جو تغیر پذیر نہ ہو۔ اس کے لئے اس نے بتلایا کہ یہ چیز انسان کو اولاد کے ذریعے حاصل ہوگی بیٹے سے باپ کا نام قائم رہے گا۔ اولاد سے خاندان کا چراغ جلتا جائے گا قرآن نے بتایا کہ یہ انسان کا فریبِ نفس ہے۔ حیاتِ جاوید استحکامِ خودی سے حاصل ہوتی ہے۔ اور تغیرات سے محفوظ وہی مملکت ہو سکتی ہے جو ایمان و اعمالِ صالحہ کا نتیجہ ہو۔ یعنی مستقل اقدار کی صداقت پر یقینِ محکم اور ایسے کام جن سے انسانوں کی مضمر صلاحیتیں نشو و نما پائیں۔ یہی وہ پروگرام ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

تا جہاں باشد جہاں آرا شوی
تاجدارِ ملکِ لایبلیٰ شوی

جب تک دنیا باقی ہے تو حکمران رہے گا۔ تجھے ایسی مملکت مل جائے گی جو دست بردِ زمانہ سے ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است
بر عناصر حکمراں بودن خوش است

بہترین زندگی مردِ مومن کی ہے جو فطرت کی تمام قوتوں کو مسخر کرتا ہے۔ اور پھر انہیں آئینِ خداوندی کے مطابق صرف کرتا ہے انسانیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ غور کیجئے کہ اقبال نے نائبِ حق کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ عناصر پر حکمرانی کرتا ہے۔ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتا ہے۔ اس نے اس کی کسی باطنی قوت کا ذکر نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوف کی باطنیت اقبال کے الفاظ میں، اسلام میں اجنبی ہے۔

نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است
ہستیِ او ظلِ اسمِ اعظم است

مردِ مومن کو اس مادی کائنات کی جان سمجھئے۔ اس جہانِ آب و گِل میں زندگی اسی کے دم سے ہے۔ اگر اس میں مردِ مومن نہ ہو تو یہ کی دنیا مٹی کے گھروندے سے زیادہ کچھ نہیں۔ مردِ مومن دنیا میں سب سے بڑے نام۔ یعنی خدائے تعالیٰ کا سایہ ہے خدا کی صفات قدیمی مستقل بالذات اور لامحدود ہیں۔ انسانی ذات میں ان صفات کا پرتو، مثل عکس کے ہے اور وہ بھی بشریت کی حدود میں ان صفات کو صفاتِ حقیقی کا سایہ سمجھئے۔ (اقبال کا اشارہ اس تصور کی طرف جس کی رو سے بادشاہ کو ظل اللہ علی الارض ...

لیے اس مردِ مومن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

از رموزِ جزو و کل آگہ بود
در جہاں قائم بامر اللہ بود

اس ہستی کا قیام آئینِ خداوندی کے اتباع سے ہوتا ہے۔ اور اس کے علم کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ان تمام قوانین سے آگاہ ہے جن کے مطابق طبعی قوانین کی یہ عظیم کارگہ مصروفِ تگ و تاز ہے۔ اسے قوانینِ فطرت کا پورا پورا علم ہوتا ہے۔ اور اسی علم کی بنا پر ان پہلے سالے (MATERIAL) سے نئی نئی چیزیں تخلیق کرتا رہتا ہے۔

خیمہ چوں در وسعتِ عالم زند
ایں بساطِ کہنہ را برہم زند

جب اس وسیع و عریض کائنات کی پہنائیوں میں خیمہ زن ہوتا ہے تو اپنی ندرت کاریوں اور جدت طرازیوں سے کائنات کے قدیم نقوش میں تغیر و تبدل سے اسے ایک جہانِ نو میں بدل دیتا ہے۔

فطرتش معمور و می خواہد نمود
عالمے دیگر بیارد در وجود

اس شعر میں حضرت علامہ نے ایک بہت بڑی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مردِ مومن سے یہ تخلیقی کارنامے سرزد کس طرح سے ہوتے ہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ اس کی ذات گوناگوں صلاحیتوں سے بھرپور ہوتی ہے اور چونکہ ہر حقیقت (REALITY) اپنی نمود (MANIFESTATION) کے لئے بیتاب ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی یہ مضمر صلاحیتیں ذوقِ نمود سے ابھرتی ہیں اور مادی پیکروں میں متشکل ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔ انہی کو اس کے تخلیقی کارنامے کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ خودی کی نمود کے مظاہر ہوتے ہیں۔

صد جہاں مثلِ جہاں جزو و کل
روید از کشتِ خیالِ او چو گل

اس کی فکر کی دنیا ایک خاکہ مرتب کرتی ہے۔ اور پھر اس کے قوائے عملیہ اس خاکے میں رنگ بھر کر اسے خیال سے حقیقت بنا دیتے ہیں۔ اس طرح اس کے کشتِ خیال سے ہر آن ایک نئی دنیا وجود کوش ہوتی چلی جاتی ہے لیکن وہ صرف اس خارجی کائنات میں ہی تخلیقی اضافے نہیں کرتا وہ خود انسانوں کی دنیا میں بھی حسین و صالح تغیرات پیدا کرتا چلا جاتا ہے وہ مناسب تعلیم و تربیت سے

پختہ سازد فطرتِ ہر خام را
از حرم بیروں کند اصنام را

وہ انسانیہ کی خام فطرت میں پختگی پیدا کرتا ہے اس کے قلب و نگاہ سے باطل کے تصورات کو دور کر کے، ان کی جگہ ابدی حقائق پیدا کرتا ہے۔ یہ وہ کام ہے جو صرف ایک مردِ مومن ہی کر سکتا ہے۔ انسانیت سازی اس کی خصوصیت کبریٰ ہے۔

نغمہ زاتارِ دلِ از مضراب او
بہر حق بیداری او خواب او

اس کے مضراب سے دلوں کے اندر چھپے ہوئے نغمے نغموں میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کی تربیت سے انسان کی مضمر (جوہر) ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ اس کا جاگنا بھی انسانیت کے تعمیری پروگرام کے لئے ہوتا ہے۔ اور اس کا سونا بھی اسی مقصد کے لئے۔ وہ اس سکون سے تازہ قوتیں اور نئی حرارتیں لے کر بیدار ہوا اور اپنے پیش نظر پروگرام کی تکمیل میں پہلے سے بھی زیادہ سرگرم (ہو جاتا ہے)

شیب را آموزد آہنگِ شباب
می دہد ہر چیز را رنگِ شباب

وہ بڑھاپے کو جوانی کے طور طریق سکھا دیتا ہے۔ وہ ہر شے کو رنگِ شباب عطا کر دیتا ہے۔ اس کی رفاقت سے پست حوصلہ دل میں تازہ ولولے بیدار ہو جاتے ہیں۔ اس کی مضمحل قوتیں حیاتِ نو اختیار کر لیتی ہیں۔ اس کی نگاہوں سے ہر شے پر جا(ن آ جاتی) ہے۔ اس کی مسکراہٹ سے کائنات کی ہر چیز حسین نظر آنے لگتی ہے۔

نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر
ہم سپاہی ۔ ہم سپہ گر۔ ہم امیر

وہ ایسا نظام متشکل کرتا ہے۔ جس میں نوعِ انسانی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی ہے کہ آئینِ خداوندی کے مطابق زندگی بر(کرنے کے) نتائج کیسے شگفتہ و شاداب ہوتے ہیں۔ اور اس کی خلاف ورزی کے عواقب کیسے الم انگیز اور تباہ کن۔ وہ اس نظام کی حفاظت (کرتا ہے) جس سے درحقیقت مقصود خود نوعِ انسانی کی حفاظت ہوتی ہے۔ خود بطور سپاہی کام کرتا ہے۔ اپنے جیسے اور سپاہی تیار کر(تا ہے اور) اس جماعت کی قیادت بھی کرتا ہے۔ یہ کام سب سے پہلے خود رسول کرتا ہے جس کی خودی انسانیت کے بلند ترین مقام پر (ہوتی ہے) اور جو کامل ترین مومن ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد یہی کام جماعتِ مومنین کے افراد کرتے ہیں۔ ان میں کا بہترین فرد ان کا امیر تحند (جماعت ہوتا ہے اور) جماعت کو اسی راستے پر چلاتا ہے۔

مدعائے علم الاسما ستے
سرِ سبحان الذی اسرا ستے

قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو کائنات کے تمام تصورات کا علم دے دیا۔ یعنی انسان میں قوانینِ فطرت معلوم کر(نے کی صلاحیت) رکھ دی۔ مردِ مومن اس آیۂ قرآنی کا مدعا ہے۔ یعنی مردِ مومن تمام قوانینِ فطرت سے آگاہ رہتا ہے۔

قرآن میں دوسرے مقام پر ہے کہ اللہ کی ذات کس قدر بلند و برتر ہے جو اپنے بندے (رسول اللہ) کو رات کے و(قت) (کعبہ) سے دور کی مسجد (مدینہ) کی طرف لے گیا۔ یہ شبِ ہجرت کا بیان ہے۔ ہجرت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک(... نے) کہ جس مقام پر اس نے اپنی دعوت کا آغاز کیا ہے وہ اس کی برومندی کے لئے سازگار نہیں تو وہ اس مقام کو چھوڑ کر ایسے مقا(م ...)

ہے جیسے وہ اس مقصد کے لئے زیادہ سازگار سمجھا ہے ہجرت کہتے ہیں۔ یہ مومن کامل کا مقام ہے۔ جس کے راستے میں وطن کی بھی عناں گیر نہیں ہوتی ۔

از عصا دست سفیدش محکم است
قدرت کامل بعلمش توام است

ان میں حضرت موسٰے کے عصا اور ید بیضا کی طرف اشارہ ہے لیکن اس سے حضرت علامہ نے استعارۃً ایک لطیف نکتہ پیدا کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مرد مومن کا ہاتھ نہایت پاکیزہ، صاف اور نورانی ہوتا ہے۔ یہ اس کی صفت جمالی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں جلالی صفات بھی ہوتی ہیں۔ جن سے اس کی جمالی صفات محکم ہوتی ہیں۔ عصا (قوت) اور ید بیضا (ہاتھ کی نورانیت، سیرت اور پاکیزگی) دونوں کے امتزاج کا نام مومن ہے۔ اس کے ہاں قوت اور علم صحیح توام بچوں کی طرح دوش بدوش رہتے ہیں۔

چوں عناں گیرد بدست آں شہسوار
تیز تر گردد سمند روزگار

وہ شاہسوار زمانہ کے اشہب عناں تاب کی لگام اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ تو اس کی برق رفتاری تیز سے تیز تر ہوجاتی ہے جو منازل جو انسانی معاشرے نے عام رفتار سے صدیوں میں طے کرنے تھے۔ اس کی قیادت میں چند دنوں میں طے ہوجاتے ہیں۔

خشک سازد ہیبت او نیل را
می برد از مصر اسرائیل را

اس کی ہیبت سے دریائے نیل خشک ہوجاتا ہے۔ وہ اپنی قوم کو مستبد قوتوں کے پنجۂ آہنی سے چھڑا کر آزادی کی کھلی فضاؤں کی طرف لے جاتا ہے۔ تاکہ وہاں آئین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔

از قُم او خیزد اندر گور تن
مردہ جانہا چوں صنوبر در چمن

اس کا پیغام زندگی مردہ قوم میں حیات تازہ پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی آواز سے مردے اپنی اپنی قبروں سے اس طرح اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جیسے باغ میں صنوبر کے قد آور درخت ایستادہ ہیں۔

ذات او توجیہ ذات عالم است
از جلال او نجات عالم است

اس کی ذات سے وہ سمت متعین ہوتی ہے۔ جس کی طرف کاروان کائنات نے چلنا ہوتا ہے۔ دنیا اسی رخ کی طرف چلتی ہے جس طرف مرد مومن جارہا ہو۔ اس کے جلال ہی میں تمام نوع انسانی کی نجات کا راز مضمر ہوتا ہے۔ وہ اپنی قوتوں کو اس مقصد کے لئے صرف کرتا ہے کہ تمام افراد انسانیہ جبر و استبداد اور ظالم حکمرانوں کے دست تغلب سے نجات حاصل کرکے آزادی کا سانس لے سکیں۔

لیکن یہ اس کے پروگرام کا حصہ آ ہوتا ہے۔ یہ اس کا منفی پہلو ہے کمزوروں اور ناتوانوں کو بالادست انسانوں کے جبر و استبداد سے چھڑا دینا تخریبی پروگرام ہے۔ تعمیری پروگرام اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ جب ان کی مطابق تعلیم و تربیت سے جوہر انسانیت میں جلا پیدا کرتا ہے۔ اور اس طرح کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

ذرہ خورشید آشنا از سایہ اش
قیمت ہستی گران از مایہ اش

اس کے سائے سے ہر ذرہ ناچیز خورشید بدوش ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح اس کی متاع خودی کے پرتو سے کائنات کی ... بڑھ جاتی ہے۔

زندگی بخشد ز اعجاز عمل
می کند تجدید انداز عمل

وہ ان انسانوں کو عمل کی ایک نئی پٹڑی پر ڈال دیتا ہے۔ اور صحیح اعمال کا اعجاز یہ ہے کہ وہ مردہ انسانوں کو زندگی عطا کر... سامری تو غلام اور محکوم بھی کرتا ہے۔ لیکن ان کے اعمال سے ان میں دن بدن زندگی کم ہوتی جاتی ہے۔ اس کے برعکس وہ ان ... کو عمل کی ایک ایسی نئی راہ پر لگا دیتا ہے۔ جس سے ہر عمل ایک حیات تازہ کا پیغام بر بن جاتا ہے۔

جلوہ ہا خیزد ز نقش پائے او
صد کلیم آوارۂ سینائے او

اس کے نقوش پا کے ہر ذرے میں ہزاروں جلوے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ وہ جس راستے پر چلتا ہے۔ اس کے نشان قدم کے لئے دلیل راہ بن جاتے ہیں۔ اور وہ جان لیتے ہیں کہ یہی راستہ انہیں منزل مقصود کی طرف لے جائے گا۔ وہ جن وادی ... ہے۔ وہ اس طرح نقوش طور بن جاتی ہے کہ ان میں کئی جلوؤں کے تمنائی سراپا شوق دکھائی دیتے ہیں۔

زندگی را می کند تفسیر نو
می دہد ایں خواب را تعبیر نو

وہ کتاب زندگی کی نئی تفسیر پیش کرتا ہے۔ وہ انسانوں کے سامنے زندگی اور اس کے مقاصد کے ایسے معانی بیان ... سے وہ اس سے قبل یکسر نا آشنا ہوتے ہیں۔ وہ اس خواب کی ایسی تعبیر بیان کرتا ہے۔ جس میں ہزاروں بیداریاں ...

ہستی مکنون او راز حیات
نغمۂ نشنیدۂ ساز حیات

بظاہر تو وہ عام انسانوں جیسا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے سینے میں حقائق کی دنیا پنہاں ہوتی ہے۔ اس میں راز زندگی ... یوں سمجھئے کہ وہ بربط ہستی کا ایک نغمہ ہوتا ہے جسے اس سے پہلے کسی نے نہیں سنا ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی ہزار ...

انل طے کرنے کے بعد کہیں ایسا پیکر اختیار کرتی ہے۔

طبع مضموں بہ بند فطرت خوں شود

تا دو بیت ذات او موزوں شود

جس طرح ایک نادر مصرعہ موزوں نہیں ہوتا جب تک خونِ دل شاعر کی رنگینی اس میں شامل نہ ہو۔ اسی طرح زندگی ایسے مردِ مومن کا پیکر اختیار نہیں کرتی جب تک خود فطرت کی طبیعت خون نہ ہو جائے۔

مشت خاک ما سر گردوں رسید

زیں غبار آں شہسوار آید پدید

سوال یہ ہے کہ اس قسم کا مردِ مومن پیدا کس طرح سے ہوتا ہے؟ کیا یہ یونہی ہنگامی طور پر از خود وجود میں آجاتا ہے؟ فطین GENIUS کے متعلق علمائے نفسیات یہی کہتے ہیں کہ اس کی تخلیق سلسلۂ ارتقا میں بالکل خارقِ عادت ہوتی ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔ تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہوتا ہے جو سب سے زیادہ قوانین خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قسم کا مردِ مومن ہر دور کی ملت کا گل سر سبد ہوتا ہے۔ جس سطح پر ملت ہوگی اس سے ابھری ہوئی سطح پر ان کا امیر ہوگا۔ وہ انہی میں کا ایک فرد ہوتا ہے۔ آسمان سے بنا بنایا نہیں اترتا۔ اس قسم کے آنے والے کا تصور (ختمِ نبوت کے بعد) کہیں سے بنا بنایا آجائے، مجوسیت کا دیا ہوا تصور ہے۔ جو دنیا کے قریب قریب ہر مذہب میں پایا جاتا ہے۔ دنیا کی ہر مذہبی قوم اس قسم کے آنے والے کے انتظار میں بیٹھی ہے۔ قوم دن بدن پست سے پست تر حالت میں گرتی چلی جاتی ہے اور اس خیال میں مگن رہتی ہے کہ ہم میں سے ایک ایسا فرد آسمان سے آجائے گا جو ہمیں ساری دنیا پر حاکم و غالب بنا کر ہماری پستیوں کو اوج میں تبدیل کر دے گا۔ بدقسمتی کہ، باقی اقوامِ عالم کی طرح، مسلمان بھی اسی طرح کے ایک آنے والے کے انتظار میں بیٹھے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ختمِ نبوت سے اس قسم کے آنیوالوں کا سلسلہ ہی ختم کر دیا۔ اب جس سطح پر قوم ہوگی۔ اسی سطح کا اس سے ابھرا ہوا ابھرے گا۔ ہم اگر اپنی سطح کو بلند کر لیں گے (اور مسلمانوں میں قرآن کی موجودگی کی وجہ سے یہ صلاحیت اور امکان موجود ہے کہ اپنے سطح کو اوجِ ثریا سے بھی اونچے لے جائیں) تو اس سے پھر ایسے مردِ مومن پیدا ہو جائیں گے۔ جو وجۂ نازشِ روزگار ہوں گے۔

مشت خاک ما سر گردوں رسید

زیں غبار آں شہسوار آید پدید

جب ہماری مشتِ خاک بلند ہوتے ہوتے آسمان بوس ہو جائے گی تو اس غبار سے وہ شاہسوار برآمد ہوگا۔ غور کیجئے کہ اس تصور نے مسلمان کو باقی اقوامِ عالم کے مقابلے میں کس طرح ایک امتیازی خصوصیت عطا کر دی۔ باقی قوموں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہم میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اپنے اندر سے کسی نوع کامل کو پیدا کر سکیں۔ لیکن قرآن نے آنے والے کے تصور کو باطل قرار دے کر امت مسلمہ سے کہہ دیا کہ تم ... ... ہو سکتے ہو۔ جہاں سے تم میں ایسے افراد پیدا ہوں جو باقی قوموں کے نزدیک

صرف انسان سے بنے بنائے اترتے ہیں۔ اسی تصور کے پیش نظر اقبال نے کہا ہے کہ

خفتہ در خاکستر امروز ما
شعلۂ فرداے عالم سوز ما

اس میں شبہ نہیں کہ ہم آج راکھ کا ڈھیر ہیں۔ لیکن ہماری خاکستر میں اس کے امکانات ہیں کہ اس سے وہ شعلہ پیدا ہو جو باطل کے خس و خاشاک کو جلا کر خاکستر بنادے۔

غنچۂ ما گلستاں در دامن است
چشم ما از صبح فردا روشن است

ہماری ملت کا ننھا سا غنچۂ ناشگفتہ اپنے اندر پورے کا پورا گلستان لئے بیٹھا ہے۔ ذرا سی مساعد فضا مل جائے تو آپ دیکھ کہ یہ غنچہ کس قدر بہار آفرینیوں کا موجب بنتا ہے۔ آج ہماری رات بے شک تاریک ہے۔ لیکن ہماری آنکھ اس نور سے روشن ہے جو ہم میں مستقبل میں نمودار ہونے والا ہے۔

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

یہ ہے اقبال کے نزدیک "مہدی" کا تصور، یعنی جب امت کی اپنی سطح بلند ترین ہو جائے۔ تو اس کے منتخب افراد ان خصوصیات کے حامل ہوں گے۔

اس مقام پر پہنچ کر اقبال عالم تصور میں اس قسم کے مرد مومن کو سامنے لاتا ہے جو ملت کے غبار فلک پیما سے پیدا ہوتا ہے۔ تصور اس قدر جذب و وجد کی کیفیت پیدا کرتا ہے کہ اقبال والہانہ طور پر پکار اٹھتا ہے کہ

اے سوار اشہب دوراں بیا
اے فروغ دیدۂ امکاں بیا

یعنی وہ کہ زمانہ تیرا مرکب اور تو اس کا راکب ہے۔ ہم میں آ، اور ہمیں حیات تازہ عطا کر دے۔ اے وہ جو اس عالم امکاں کی آنکھ کے نور و بصیرت کا موجب ہے۔ ہمارے لئے شمع محفل بن جا۔

واضح ہے کہ ان تصریحات کی روشنی میں جو سابقہ اشعار میں سامنے آ چکی ہیں، ایسا سمجھنا قطعاً غلط ہوگا کہ اقبال کسی آنے والے کو پکار رہا ہے، جو اس وقت کہیں موجود ہے۔ اقبال جب خود ہی ابھی ابھی کہہ چکا ہے کہ وہ خود ملت کی بلندی سطح کی تخلیق ہے تو اس سے تصور اس طرف جاتا ہی نہیں چاہیئے کہ اس کی مراد کسی بنے بنائے آنے والے سے ہے۔ بہرحال وہ اس مرد مومن کے متعلق ذوق و شوق سے کہتا ہے کہ

مدتے بخفتہ ایجاد شو
در سواد دیدہ ما آباد شو

اس خاموش کائنات میں آسمانی انقلاب کا ہنگامہ پیدا کردے۔ کروڑوں آنکھیں تیری آمد کی منتظر ہیں۔ اور ان کی آنکھوں پتلیوں میں اپنا نشیمن بنا۔

شورش اقوام را خاموش کن
نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن

عالم میں اس وقت عجیب انداز کی شورش برپا ہے۔ ہر طرف انتشار و اضطراب، ہر سمت چیخ و پکار اور آہ و بکا۔ تو آ۔ اور اس شورش کو مبدل بہ تسکین کردے اس اضطراب و خلفشار میں صرف تیرا ہی پیغام ایسا ہے جو اقوام عالم کے لئے فردوس گوش بن سکتا ہے۔

خیز و قانونِ اخوت ساز دہ
جام صہبائے محبت باز دہ

ان گروہوں اور فرقوں میں بٹی ہوئی دنیا کو وہ قانون عطا کر جس سے تمام نوعِ انسانی ایک برادری کے رشتہ میں منسلک ہو جائے۔ بہکے ہوئے انسانوں کو پھر سے وہی جام محبت پلادے جس نے ایک مرتبہ خوں ریز قبائل کو شیر و شکر کر دیا تھا۔

باز در عالم بیار ایام صلح
جنگجویاں را بدہ پیغام صلح

اس دنیا میں جہاں ہر قوم دوسری قوم کی تباہی کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہے۔ تو پھر وہ بہار آفریں فضا پیدا کردے جس سے ہمت صلح و آشتی کی بساط بچھ جائے۔ اس قسم کی جنگجو قوموں میں مصالحت کرا دینا صرف اس قانون کی رو سے ممکن ہے۔ جس کا تو حامل ہوگا۔ ایسا صرف قرآن کے قانونِ ربوبیت سے ہو سکے گا۔

نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی
کاروانِ زندگی را منزلی

انسان ایک کھیتی ہے۔ اور اس کھیتی کا ماحصل وہ مردِ مومن ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ یہی مردِ مومن حیات کے لئے منزل ہے۔ انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ یہ ہے کہ وہ اس قسم کے مردِ مومن کے پیکر میں ڈھل جائے۔

ریخت از جورِ خزاں برگِ شجر
چوں بہاراں بر ریاضِ ما گذر

ملت زوال و انحطاط کی خزاں سے بالکل بے برگ و بار ہو چکا ہے۔ تو بادِ بہاری کی طرح ہمارے اجڑے ہوئے گلستان میں ام ہو اور اسے پھر سے شگفتہ و شاداب چمنستان میں تبدیل کردے۔

سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر
از جبینِ شرمسارِ ما بگیر

قوم کے بچے۔ نوجوان۔ بوڑھے۔ عقیدت مندیوں کے ہزار سجدے اپنی پیشانیوں میں لئے تیرے استقبال میں ہمہ تن شوق ہیں۔ تو ہماری عرق آلود پیشانیوں سے ان سجدوں کو قبول کر۔

از وجود تو سرا فرازیم ما
پس بہ سوز ایں جہاں سازیم ما

ہماری تمام سرفرازیاں تیری ذات سے وابستہ ہیں۔ تو ایک دفعہ آجا۔ اور پھر دیکھ کہ ہم کس طرح زمانہ کی تمام تلخیوں کو کرکے انھیں نوشابۂ شیریں بنادیتے ہیں۔

یہ ہے وہ مردِ مومن جو اطاعتِ قوانینِ خداوندی سے اپنی ذات کا استحکام کرے۔

سلسلۂ اصلاح وتذکیر

(محترم عمر احمد صاحب عثمانی)

قرآنی مِعاشِرہ

باہمی تعلقات کے متعلق قرآن کی تعلیم

۳

[اس مضمون کی گذشتہ دو اقساط میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ اور والدین کو اپنی اولاد کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں والدین کے واجبات کا بیان ہو رہا ہے۔ موجودہ قسط میں والدین کی ذمہ داریوں پر مزید روشنی ڈالی جا رہی ہے۔]

اولاد

قتل اولاد کا مفہوم

قتل اولاد سے متعلق ہمیں قرآن کریم میں دو طرح کی آیات ملتی ہیں۔ ایک تو وہ آیات ہیں جن میں لَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَکُمْ کے الفاظ کے ساتھ اولاد کشی سے منع کیا گیا ہے۔ اس موضوع کی مختلف آیتوں پر غور کرنے علوم ہوتا ہے کہ یہ جرم فاقہ کشی اور تنگ دستی کے خوف کے ماتحت کیا جاتا تھا۔ اور عربوں میں اس قدر عام تھا کہ رسول اللہ صلعم کو ہدایت ئی تھی کہ جو مومن عورتیں بھی آپ سے بیعت کرنے آئیں آپ ان سے یہ عہد بھی لیا کریں کہ وہ نسل کشی کے جرم کی مرتکب نہیں ہونگی ساتھ ہی قرآن کریم یہ بھی بتا دیتا ہے کہ یہ جرم اکثر مشرکین میں پھیلا ہوا تھا۔ اور ان کے مراکز اطاعت (شرکاء) نے اس جرم کو ان کی وں میں بڑا ہی خوش آئند بنا رکھا تھا۔ جس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ عربوں کو تباہ و برباد کردیں۔ اور ان کے دین کو ان کے لئے مشتبہ ان آیات سے جہاں ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جرم عربوں میں بہت ہی عام تھا۔ وہیں ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے ت کیا تھے۔ عام لوگ فاقہ کشی اور تنگ دستی کے خطرے کے ماتحت اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ اور ان کے دینی پیشوا ان کے سامنے اس جرم نا کر پیش کرتے تھے جس سے ان کا مقصد عربوں کی تباہی اور بربادی اور دین کے بارے میں التباس واشتباہ پیدا کرنا ہوتا تھا۔ اس

کے بالمقابل قرآن کریم کی وہ دوسری آیات ہیں جن میں (عام اولاد نہیں بلکہ) خصوصیت کے ساتھ لڑکیوں کو قتل کر دینے یا زندہ گاڑ دینے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس شنیع جرم کا محرک وہ ذلت و رسوائی کا احساس ہوتا تھا۔ جو ایک عرب کو سوسائٹی میں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑتا تھا۔ اگر کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہو جاتی تھی تو وہ اس دوگونہ مصیبت میں پھنس جاتا تھا کہ آیا اس ذلت کو برداشت کرے یا اس لڑکی کو مٹی میں دبا کر اس رسوائی سے چھٹکارا حاصل کرے۔ کچھ لوگ اس ذلت کو برداشت کر لیتے تھے اور کچھ سنگدل ایسے بھی تھے جو اپنی لڑکیوں کو زمین میں زندہ گاڑ دیا کرتے تھے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ لڑکیوں کو زندہ در گور کر دینے کا عام رواج عام عربوں میں نہیں پایا جاتا تھا۔ بلکہ چند خاندانوں (یعنی ربیعہ اور مضر کی چند شاخوں میں) پایا جاتا تھا[1]۔ اور وہ بھی نہایت کمی کے ساتھ تھا۔ یہ جرم اتنا عام نہیں ہوتا۔ جتنا قتل اولاد کی آیات سے نظر آتا ہے تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ عرب میں عورتوں کی تعداد اتنی ہو سکے کہ ایک مرد کے گھر میں دس دس بارہ بارہ بیویاں ہوتی ہوں۔ حالانکہ اسلام سے پہلے عربوں کی معاشرت میں بیویوں کی یہ کثرت تاریخی مسلمات میں سے ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر سارے عرب میں دختر کشی کی یہ رسم اس قدر عام تھی تو ان کے گھروں میں اتنی کثرت سے عورتیں کہاں سے آ جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ دختر کشی کی رسم کا محرک جذبہ جیسا کہ خود قرآن کریم اور تاریخ سے واضح ہے۔ فقر و فاقہ کا خوف نہ تھا۔ بلکہ ذلت اور رسوائی کا احساس ہوتا تھا۔

ان حقائق کے پیش نظر میرا خیال یہ ہے کہ پہلی قسم کی آیات میں قتل اولاد سے مراد دختر کشی کی رسم نہیں ہے۔ بلکہ فکری اور نظری طور پر ان کو مار ڈالنا ہے۔ اور دوسری قسم کی آیات میں دختر کشی کی رسم مراد ہے۔

چنانچہ قتل اولاد سے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا
مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَاۗءً عَلَى اللّٰهِ ۭ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا
مُهْتَدِيْنَ ۝ (6/140)

وہ لوگ انتہائی خسارہ میں رہے جو اپنی اولاد کو محض اپنی بیوقوفی اور جہالت کی وجہ سے قتل کر ڈالتے ہیں۔ اور جو کچھ خدا انہیں عطا فرماتا ہے۔ اسے خدا کے ذمہ تہمتیں باندھ کر اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ صحیح راستہ سے بھٹک گئے ہیں اور قطعاً درست راستہ پر نہیں چل رہے ہیں۔

یہ لوگ اپنی بیوقوفی اور جہالت سے اخلاقی طور پر اپنی اولاد کو یوں ختم کر دیتے تھے کہ ان کی صلاحیتیں پروان نہیں چڑھتی تھیں۔ اس طرح دب کر رہ جاتی تھیں کہ ان کے پھلنے پھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ زندگی کی دوڑ میں آگے قدم بڑھانے کے قابل ہی نہیں رہتے تھے۔ اسی کو قرآن کریم نے دوسری جگہ ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر المنار صفحہ ۱۴۱ ج ۸

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا
وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ
نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۔۔۔۔۔۔ (پ ۸ ع ۶)

اے پیغمبر اسلام کہدو! کہ آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں۔ خدا نے تم نے پر کیا کیا چیزیں حرام کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ اور فقر وفاقہ کے اندیشہ سے اولاد کو قتل نہ کرو۔ ہم ہی تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انھیں بھی۔

تیں میں قرآن کریم نے یہ بھی وضاحت کردی ہے کہ نسل کشی کے اس جرم کا ارتکاب عربوں میں فقر وفاقہ کے اندیشہ کی ، کیا جاتا تھا جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں وہ اولاد کو فروخت کردیا کرتے تھے۔ اور ضرورت پڑنے پر سرمایہ داروں کے ہاں رہن یا کرتے تھے۔ بہرحال اس نسل کشی کا ارتکاب اس روایتی شرم اور عار کی وجہ سے نہیں ہوتا تھا جو وہ لڑکیوں کے سلسلہ یا کرتے تھے۔ اگر آیات میں نسل کشی کے جرم کے ارتکاب کے یہ معنی لئے جائیں کہ اپنی اولاد کو سچ مچ قتل نہ کرو یا کرو تو یہ واقعہ کے ت ہوگا کیونکہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے فقر وفاقہ کے اندیشہ سے اپنے بچوں کو سچ مچ کوئی بھی ذبح نہیں کرتا تھا۔ لڑکیوں کو ، وہ درگور کیا جاتا تھا تو وہ اپنی روایتی شرم اور عار کے احساس کے ماتحت کیا جاتا تھا۔ فقر وفاقہ کے اندیشہ سے نہیں کیا جاتا رحال اس قسم کی آیات میں نسل کشی سے مراد صرف دختر کشی کی وہ رسم نہیں۔ جو نہ اس قدر عام تھی جو قرآن کے انداز بیان سے ہے۔ اور نہ ہی فقر وفاقہ کے اندیشہ کے ماتحت وقوع پذیر ہوتی تھی۔ اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ عربوں میں ایسا بھی واج ہوگا کہ وہ فقر وفاقہ کے اندیشہ سے اولاد کو سچ مچ ذبح کردیا کرتے ہوں تب بھی قتل اولاد کے عموم میں نسل کشی کی یہ معنوی صورت مل ہے کہ اولاد کی اخلاقی تربیت سے لاپرواہی برتی جائے۔ اور اسے یوں ان گڑھ چھوڑ دیا جائے۔ یا اس کی ایسی غلط تربیت ے کہ وہ بالکل ہی ناکارہ ہوکر رہ جائے۔ انسان کا بچہ اگر حیوان بن جائے کہ اس میں انسانیت کی کوئی بات ہی پیدا نہ ہو تو یہ بت کشی نہیں کہلائے گی تو اور کیا کہلائے گی۔ دوسری جگہ ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ
اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ (پ ۱۵ ع ۴)

اپنی اولاد کو فقر وفاقہ کے اندیشہ سے قتل نہ کردیا کرو۔ ہم ہی انھیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی بلاشبہ اولاد کو یوں قتل کرڈالنا بہت ہی بڑی خطا ہے۔

شی کی یہ رسم کہ اخلاقی طور پر اولاد کو بالکل ناکارہ کرکے ختم کردیا جائے۔ ربیعہ اور مضر ہی میں نہیں تھی بلکہ عربوں میں اس قدر عام یادہ تر مشرکین اس میں گرفتار تھے۔

وَكَذَٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ
لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ دِينَهُمْ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا فَعَلُوهُ فَذَرْهُمْ
وَمَا يَفْتَرُونَ ٥ (۶/۱۳۷)

اس طرح بہت سے مشرکین کی نگاہوں میں ان کے شرکاء نے قتل اولاد کے عمل کو خوشنما بنا رکھا ہے تاکہ وہ انھیں تباہی کے غار میں دھکیل دیں اور اس طرح ان کے دین کو ان پر مشتبہ کر دیں۔ اگر خدا چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ اے پیغمبر آپ انھیں اور ان کی افترا پردازیوں کو چھوڑ دیجیے۔

اس آیت نے قتل اولاد کے مفہوم کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ کیونکہ یہاں بتایا گیا ہے کہ عرب مشرکین میں قتل اولاد کا یہ عمل بہت خوشنما سمجھا جاتا تھا۔ ان کے شرکاء نے ان کی نگاہوں میں اس عمل کو خوشنما بنا رکھا تھا جس سے ان کے دو مقصد تھے۔ پہلا مقصد تو یہ تھا کہ وہ انھیں تباہی کے غار میں دھکیل دیں اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ ان کے دین کو ان پر مشتبہ کر دیں۔ ان دونوں مقصدوں پر غور کرنے سے بات نکھر کر آجاتی ہے۔ فی الواقع اولاد کو ذبح کر دینے سے تباہی تو آسکتی ہے۔ مگر اس سے دین میں کوئی اشتباہ یا التباس پیدا نہیں ہوتا۔ بچوں کو ذبح کر دیا۔ وہ ختم ہو گئے۔ اب وہ دین میں التباس یا اشتباہ پیدا کرنے کہاں سے آئیں گے۔ دین تو دین۔ اب تو وہ زندگی میں بھی کوئی اشتباہ پیدا نہیں کر سکتے۔ ان کا قتل دین میں التباس یا اشتباہ پیدا کرنے کا سبب تو جب ہی بن سکتا ہے کہ ان کو مادی طور پر زندہ تصور اور اخلاقی طور پر مردہ تسلیم کیا جائے۔ غلط تربیت کی وجہ سے اولاد ایسی صورتیں پیدا کر دیتی ہے کہ والدین شکل میں پھنس جاتے ہیں۔ نہ اولاد کا ساتھ دیتے بن پڑتی ہے نہ اس کو چھوڑتے بن پڑتی ہے۔ ایک طرف مامتا ستاتی ہے تو دوسری طرف دین کے تقاضے ہیں بلکہ عموماً دین کے تقاضوں کی طرف تو نگاہ بھی نہیں جاتی۔ عقل حیلہ جو اولاد کی حمایت کے جذبے کے لئے ہزار حیلے بہانے ڈھونڈ کر اسے جائز قرار دیتی ہے۔

ذرا غور کیجیے آپ کا بیٹا لاپرواہی سے موٹر چلاتا ہے اور کسی بچے کی جان لے لیتا ہے۔ آپ کو اس کی اطلاع ملتی ہے تو آپ کا ردعمل یہی ہوتا ہے کہ آپ راہ گیروں کو گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ پبلک کو ٹریفک کا شعور ہی نہیں اندھے بہرے ہو کر چلتے ہیں۔ ہارن پر ہارن دیئے جایئے مجال ہے جو کان پر جوں رینگ جائے یا ادھر سے ادھر ہو جائیں۔ جب بیچ سڑک پر چلیں گے۔ اتنا نہیں ہوتا کہ دائیں بائیں ہٹ کر چلیں۔ گورنمنٹ بھی اندھی ہے کہ پبلک کو کچھ نہیں کہتی۔ موٹر چلانے والا پکڑا جاتا ہے۔ وغیرہ ذٰلک۔ بہرحال عقل حیلہ جو کا تو کام ہی یہ ہے کہ وہ آپ کے جذبات کے تقاضوں کے لئے دلائل مہیا کرتی رہے۔ یہ خیال بھی کہاں آسکتا ہے کہ فلاں معاملہ میں اگر میں ایسا کروں گا تو اس سے دین کی خلاف ورزی ہو جائے گی۔

بہرحال دین میں التباس و اشتباہ اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب آپ کی [illegible] اسکی صحیح تربیت [illegible] وہ ایسے کام کرتی رہتی ہے جن سے آپ [illegible] مشتبہ ہو جاتی ہے ہم [illegible] اولاد اور پیار میں

الدین باپ کے نزدیک خوشنما عمل نہیں ہوتا۔ لہٰذا ان آیات میں بظاہر قتلِ اولاد سے مراد، اولاد کو اخلاقی طور پر مار دینا اور ختم کر دینا ہی یعنی نظری اور فکری طور پر انھیں موت کی گہری نیند سلا دینا۔ لیکن اگر کسی کو پھر بھی اصرار ہو کہ قتلِ اولاد سے مراد سچ مچ بچوں کو ذبح کر دینا ہی ہے۔ تو ہمیں اپنے مفہوم پر اصرار نہیں ہے۔ البتہ اس صورت میں ہم یہ ضرور کہیں گے کہ ان آیات کے مفہوم میں اولاد کو اس طرح معنوی طور پر مار دینا بھی داخل ہے۔

عربوں میں یہ جرم اس قدر عام تھا کہ جو عورتیں رسول اللہ صلعم سے بیعت کرنے کے لئے آتیں تھیں ان سب سے یہ عہد لیا جاتا تھا کہ وہ اولاد کو قتل کرنے کی مرتکب نہیں ہوں گی۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَن لَّا يُشْرِكْنَ
بِاللَّهِ وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ ..... (۶۰/۱۲)

اے نبی! جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لئے آئیں تو وہ ان باتوں پر بیعت کریں کہ خدا کے ساتھ وہ کسی ہستی کو شریک نہیں ٹھرائیں گی۔ چوری نہیں کریں گی۔ زنا نہیں کریں گی۔ اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی۔

قرآن کریم جس شدت تکرار اور عمومیت کے ساتھ اس جرم کا تذکرہ کر رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف ربیعہ اور مضر کی چند شاخوں تک محدود نہیں بلکہ یہ کوئی ایسا جرم ہے جو عام طور پر عربوں میں رائج تھا۔ اس سے صاف نظر آتا ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں قتلِ اولاد سے مراد بچوں کو واقعی ذبح کر دینا نہیں ہے۔ بلکہ فکری، نظری اور اخلاقی طور پر ان کو مار ڈالنا ہے کہ اس طرح پر بچوں کو مار ڈالنا بھی کوئی کم جرم نہیں ہے۔ اس سے پوری انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔ معاشرے میں چند بچے بھی ایسے پیدا ہو جائیں تو وہ پوری سوسائٹی کے لئے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ پوری نئی پود ان کے اعمال و کردار سے متاثر ہوتی ہے۔ آپ اپنے بچوں کو کتنی ہی صحیح تربیت دیں۔ لیکن اگر محلے میں شریر اور بداخلاق بچے بھی موجود ہیں تو آپ کی صحیح تربیت آپ کے بچوں پر وہ اثر نہیں کر سکیگی جو محلے کے ان چند بچوں کے اثرات مرتب ہو جائیں گے۔ یہ انفرادی جرم نہیں بلکہ آہستہ آہستہ یہ اجتماعی جرم بن جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ بڑوں کے متعلق یہ بات صحیح ہو یا نہ ہو مگر بچوں کے متعلق یہ اصول حرف بحرف صحیح ہے۔ اس لئے آپ اگر اپنے بچوں کی صحیح تربیت نہیں کرتے تو اتنا ہی نہیں کہ آپ اپنے بچوں کی زندگی خراب کرتے ہیں بلکہ بالواسطہ آپ پوری سوسائٹی کے بچوں کی زندگیاں خراب کر دیتے ہیں۔ آپ کو یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ معاشرہ میں اگر کچھ بچے بداخلاق اور بدکردار اٹھ رہے ہیں تو آپ کو یہ سوچ کر مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے کہ اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔ یہ ان کے ماں باپ کا فریضہ ہے کہ وہ ان کی دیکھ بھال کریں۔ کیونکہ ان کی بدکرداری اور بداخلاقی ایک متعدی مرض ہے جس سے آپ کے اور آپ کی سوسائٹی کے سارے بچے متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے اس سلسلہ میں اغماض یا چشم پوشی نہیں برتنی چاہیئے ایسے بچوں کے [illegible] ان بچوں کو تنبیہ کرنا ضروری ہے۔ مگر تنبیہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ان سے الجھنے کے لئے تیار [illegible] ہو کہ جس طرح آپ اپنے بچوں کو تنبیہ کرتے ہیں۔ اسی طرح آپ ان کو بھی

تنبیہ کریں۔ اور ان کے والدین کو سمجھائیں کہ وہ بھی ان کی صحیح تربیت کی طرف توجہ دیں۔

لڑکیاں باعث عار نہیں

اولاد کے متعلق سطورِ بالا میں آپ دیکھ چکے ہیں۔ کہ خدا نے انھیں اپنی نعمت، رحمت اور حیاتِ دنیوی کی زینت قرار دیا ہے۔ اولاد میں لڑکے بھی شامل ہیں اور لڑکیاں بھی۔ لڑکے پیدا ہونے پر خوشی منانا اور لڑکی پیدا ہونے پر سوگ منانا یہ وہ جہالت ہے جس کا قرآنی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ عورت اور مرد اپنی اپنی جگہ پر اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ زندگی کی گاڑی نہ مرد تنہا کھینچ سکتا ہے۔ نہ عورت تنہا کھینچ سکتی ہے۔ زندگی کے تقاضے کچھ اس قسم کے ہیں کہ نہ تنہا مرد ان کو پورا کر سکتا ہے نہ تنہا عورت انھیں پورا کر سکتی ہے۔ یہ دونوں مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے عورت اور مرد کے تعلق کو ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۲/۱۸۷)

عورتیں تمہارا لباس ہیں۔ اور تم ان کا لباس ہو

لباس کا ایک کام یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ جسم کے نقائص اور عیوب کو ڈھانپ لیتا ہے۔ اسی طرح مرد اور عورت ایک دوسرے کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ اور اس طرح ایک دوسرے کی تکمیل اور حفاظت کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے حقوق کے معاملہ میں مرد اور عورت میں فرق نہیں کیا۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ...... (۲/۲۲۸)

مردوں کے ذمہ عورتوں کے بھی ویسے ہی حقوق ہیں جیسے عورتوں کے ذمہ مردوں کے حقوق ہوتے ہیں جانے پہچانے طریقہ پر۔

اولاد خدا کے قانون کے مطابق ملتی ہے۔ کسی کو لڑکے ہی لڑکے ملتے ہیں اور کسی کو لڑکیاں ہی لڑکیاں ملتی ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کے ہاں نہ لڑکے پیدا ہوتے ہیں اور نہ لڑکیاں ہوتی ہیں کچھ انسان کی اپنی منشا مندی کو کوئی دخل نہیں ہوتا اس لئے اگر کسی کے ہاں لڑکے ہی لڑکے پیدا ہوتے ہیں تو اس پر اسے اترانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اگر کسی کے ہاں لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں تو اسے قطعاً کبیدہ خاطر ہونے کی یا شرم اور عار کی ضرورت نہیں۔ حتےٰ کہ اگر کسی کے ہاں اولاد ہی نہیں ہوتی تو اس میں بھی شرمانے یا رنجیدہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔

لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ يَهَبُ لِمَن يَشَاءُ إِنَاثًا
وَيَهَبُ لِمَن يَشَاءُ الذُّكُورَ ۝ أَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَإِنَاثًا ۖ
وَيَجْعَلُ مَن يَشَاءُ عَقِيمًا ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ قَدِيرٌ ۝ (۴۲/۴۹-۵۰)

بلندیوں اور پستیوں کی حکومت خدا ہی کے لئے ہے۔ وہ نئی نئی ترکیبیں دے کر جو چاہتا ہے۔ پیدا کرتا رہتا ہے جسے اس کا قانون تقاضا کرتا ہے لڑکیاں ہی لڑکیاں دے دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے

(اپنے قانون کے مطابق) لڑکے ہی لڑکے دیدیتا ہے۔ یا ان کو جوڑ جوڑ کر دیتا ہے۔ یعنی لڑکے اور لڑکیاں
دونوں پیدا کر دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا خوب جانتا ہے اور
ہر چیز کے لئے اس نے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔

"قانون" کے مطابق ملنے سے یہ مراد نہیں کہ یہ باتیں انسان کی تقدیر میں پہلے سے لکھی ہوتی ہیں جنہیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ خدا کے
ان میں "طبعی قوانین" بھی شامل ہیں۔ اولاد کی پیدائش اس کے طبعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ جن کا مطالعہ کر کے ان کی
علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر ان کی رو سے دیکھا جائے کہ کسی مقام پر کوئی طبعی نقص یا کمی ہے، تو اس کا علاج بھی کیا جا سکتا
قرآن کریم اس آیت میں جس نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ لڑکے یا لڑکی میں کوئی امتیاز نہیں کہ لڑکا خدا کی نعمت ہے
لڑکی اس کا عذاب۔ یہ غلط ہے۔ لہٰذا جیسے لڑکیاں ملتی ہیں اسے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اور جیسے لڑکے ملتے ہیں اسے بھی خدا کا سپاس
ہونا چاہیئے۔ بلکہ بعض لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں جو ہزار لڑکوں پر بھاری ہوتی ہیں۔ اور بعض لڑکے ایسے ہوتے ہیں جو ماں باپ کی زندگی کے لئے
وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مریمؑ کے متعلق قرآن کی شہادت ہے کہ

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ
مِنِّیْ ۚ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ
اُنْثٰی ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا
مَرْیَمَ ؕ ...... (۳/۳۵-۳۶)

یاد کرو جب عمران کی بیوی نے عرض کیا۔ اے میرے پروردگار! میں تیرے لئے نذر مانتی ہوں کہ جو کچھ میرے پیٹ
میں ہے وہ تیرے لئے آزاد کر کے چھوڑ دوں گی۔ تو اسے مجھ سے قبول فرما لے۔ بلاشبہ تو سننے والا اور جاننے والا
ہے۔ جب عمران کی بیوی کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو وہ کہنے لگی۔ پروردگار! میرے تو بچی ہوئی ہے۔ اور خدا
خوب جانتا تھا کہ اس کے ہاں کیا پیدا ہوا ہے۔ اور یہ بھی کہ لڑکا اس لڑکی کے برابر نہیں ہو سکتا۔ عمران کی بیوی
نے کہا۔ میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے۔

دیکھ لیا کہ قرآن نے خود یہ شہادت دی ہے کہ اگر عمران کی بیوی کے لڑکا پیدا ہوتا تو وہ اس لڑکی کے برابر نہیں ہو سکتا تھا کون نہیں
یہ لڑکی اور اس لڑکی کا بیٹا ہی تو تھا جس نے دنیا میں اتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ اور بالآخر دنیا بھر کے لئے خدا کی نشانی (آیۃ
للعالمین) قرار پا گئے۔

لیکن اس کے برعکس ایسے لڑکے بھی ہوتے ہیں۔ جن کے جرائم ان سے آگے بڑھ کر ان کے ماں باپ کے لئے بھی تباہی کا موجب
ہیں۔ سورہ کہف میں ہے کہ صاحب موسیٰ نے جب ایک لڑکے کو قتل کر دیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کیا کہ آپ نے بلا وجہ ایک
ان کو کیوں قتل کر دیا۔ یہ کام تو آپ نے بہت برا کیا تو اس پر انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو بتایا تھا کہ

وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَنْ يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۝

فَأَرَدْنَا أَنْ يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْمًا (۸۰-۸۱/۱۸)

رہا وہ لڑکا تو اس کے ماں باپ مومن تھے۔ ہمیں اندیشہ تھا کہ یہ لڑکا ماں باپ کو سرکشی اور کفر پر مجبور کرے گا۔ لہٰذا ہم نے چاہا کہ خدا اس کی جگہ انھیں کوئی دوسری اولاد عطا فرمائے جو نشوونما میں اس سے بہتر اور صلہ رحمی میں اس سے قریب تر ہو۔

لہٰذا قرآن کی رو سے نہ لڑکے کچھ زیادہ فضیلت کے مالک ہوتے ہیں۔ اور نہ لڑکیاں کچھ کوتاہ دست ہوتی ہیں۔ خدا کے قانون کے جو بھی اپنی صلاحیتوں سے صحیح کام لیتا ہے۔ وہ انسانیت کے لئے سودمند بن سکتا ہے لہٰذا لڑکوں اور لڑکیوں میں اس قسم کی تفریق کرنا کہ لڑکوں کی پیدائش پر خوشی منائی جائے اور لڑکیوں کی پیدائش پر سوگ قطعاً غیر قرآنی نظریہ ہے۔ صرف غیر قرآنی ہی نہیں بلکہ خلاف قرآن ہے۔

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۝ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۗ أَلَا سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ ۝ (۵۸-۵۹/۱۶)

جب ان میں سے کسی کو یہ خوشخبری دی جاتی ہے کہ اس کے لڑکی پیدا ہوئی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ اندر ہی اندر گھٹتا رہتا ہے اس بری خبر کی وجہ سے جو اسے سنائی گئی ہے۔ وہ لوگوں سے چھپا پھرتا ہے کیا اس ذلت و رسوائی کے باوجود اسے رکھے یا مٹی میں دبا ڈالے۔ اُف! کتنا برا فیصلہ ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

بڑے افسوس کا مقام ہے کہ آج مسلمانوں کے کچھ خاندانوں میں بھی اسی قسم کا نظریہ پایا جاتا ہے۔ لڑکی کی پیدائش کو برا سمجھا جاتا ہے کہتے ہیں کہ لیجئے صاحب ہمارے خلاف تو ڈگری ہو گئی ہے۔ دایہ جونہی آ کر یہ خبر سناتی ہے کہ آپ کے لڑکی پیدا ہوئی ہے تو ساری خوشی خاک میں مل جاتی ہے۔ جذبات پر اوس سی پڑ جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے عربوں کے بعض قبیلوں (مضر اور ربیعہ کی) شاخوں میں یہ قبیح رسم بھی تھی کہ لڑکیوں کو وہ زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ سورۂ تکویر میں قرآن کریم نے اس قبیح رسم کا ذکر کیا ہے۔

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ۝ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ۝ (۸-۹/۸۱)

اور خیال تو کرو جب اس لڑکی کے متعلق پوچھا جائیگا جسے زندہ دفن کر دیا گیا تھا کہ آخر وہ کس جرم کی پاداش میں قتل کی گئی تھی۔

کتنے سنگدل اور شقی القلب ہوتے ہوں گے وہ ماں باپ جو محض ایک رسمی عار سے بچنے کے لئے ایک بے گناہ بچی کو اپنے ہاتھ سے درگور کرتے ہوں گے۔ اور اُف کتنے شقی اور بد بخت ہیں وہ ماں باپ جو اگرچہ آج لڑکیوں کو زندہ درگور تو نہیں کرتے

رنے سے بدتر کر دیتے ہیں۔ نہ انھیں تعلیم دیتے ہیں۔ نہ انھیں اس قابل بناتے ہیں کہ وہ آئندہ زندگی میں اپنا مقام حاصل کر سکیں کہتے ہیں لڑکیوں کو پڑھانا لکھانا نہیں چاہیئے۔ اس سے ان کی چار آنکھیں ہو جاتی ہیں۔ انھیں گھروں کی چار دیواری میں بھیڑوں بکریوں کی طرح بند رکھنا چاہیئے کہیں باہر کی ہوا ان کو نہ لگ جائے۔ اور جب وہ جوان ہو جاتی ہیں تو بھیڑوں بکریوں کی طرح ان کو فروخت کر دیتے ہیں جس گھر میں وہ جاتی ہیں وہاں ان کا مقام ایک زرخرید باندی سے زیادہ نہیں ہوتا۔ شادی سے پہلے وہ باپ کے گھر میں ایک بچن ہاری کی طرح زندگی بسر کرتی ہیں۔ اور شادی کے بعد شوہر کے گھر میں بھی ان کا یہی مقام ہوتا ہے۔

یسے لوگوں پر واضح رہنا چاہیئے کہ یہ بھی ان بچیوں کو زندہ درگور کرنا ہی ہے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر اس لئے وہ قرآن کریم کی اس سے بچ نہیں سکتے جو اس جرم کے سلسلہ میں اس نے دی ہے۔

جیسا کہ لڑکوں کو تعلیم دلانا اور ان کی صحیح تربیت کرنا ماں باپ کا فرض ہے ایسے ہی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت بھی ان کا فریضہ جیسے لڑکے کی پیدائش باعث عار نہیں ایسے ہی لڑکی کی پیدائش بھی باعث عار نہیں ہے جیسے لڑکے کی پیدائش خدا کی نعمت ، اور دنیوی زندگی کی زینت ہے ایسے ہی لڑکی کی پیدائش بھی خدا کی نعمت ، رحمت اور دنیوی زندگی کی زینت ہے۔ ان دونوں فریق کرنا قرآن کی ہدایت کی خلاف ورزی ہے

ادکو اپنی مصیبتوں کی بھینٹ چڑھا دینا مجرموں کا شیوہ ہے

سطور بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ ماں باپ پر اولاد کے سلسلہ میں قرآن کریم کی روسے کتنی بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ انسان کو زندگی میں بعض اوقات دشواریاں بھی پیش آتی ہیں۔ مصائب و آلام سے دوچار ہونا بھی پڑتا ہے مگر مصائب و آلام میں اولاد کی تو کوئی خطا نہیں ہوتی۔ ایسے موقعوں پر اولاد کو ان مصائب و آلام کی بھینٹ چڑھا دینا انتہائی پست ت کا مظاہرہ ہے بعض شقی القلب لوگ فقر و فاقہ سے تنگ آکر اولاد کو فروخت کر دیتے ہیں۔ یا ان کی شادی کر کے بڑی بڑی رقمیں ل کر لیتے ہیں۔ یا ان کی صحیح تربیت اور پرورش سے پہلو تہی کرنے لگتے ہیں۔ ایسا کرنا سراسر ظلم ہے۔ قرآن کی میزان میں یہ روش ایک لی تو ہو سکتی ہے مگر ایک مومن کی نہیں ہو سکتی۔

يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ۝ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ۝
وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ۝ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنجِيهِ ۝ (۷۰ : ۱۱-۱۴)

مجرم کی یہ تمنا ہو گی کہ اس دن کی تکالیف سے وہ اپنی اولاد کو فدیہ میں دے دے۔ اپنی بیوی اور بھائی کو فدیہ میں دے ڈالے۔ اس قبیلہ کو بدلے میں دیدے جو خود اُسے پناہ دیتا ہے۔ بلکہ زمین کی پوری آبادی کو اپنے بدلے میں دیدے۔ اور اس طرح خود اپنے آپ کو نجات دے لے۔

نہ ذہنیت رکھنے والے کسی شخص کی تو یہ روش ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی اولاد وہ بیوی اور بھائی وغیرہ کو اپنی جگہ مصیبت میں پھنسا کر خود ت حاصل کرلے۔ لیکن مومن سوسائٹی کے کسی فرد کی یہ روش نہیں ہو سکتی۔ مومن ان مصائب کو خنداں پیشانی سے برداشت کرتا ہے

اور اپنے بیوی بچوں اور بھائیوں کو یہ محسوس بھی نہیں ہونے دیتا کہ وہ خود کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔

اولاد کو نصیحت

علم اور عقل اور تجربہ کی کمی کی وجہ سے بعض مرتبہ اولاد ایسے کام کرنے لگتی ہے جو اس کے لئے مفید نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں والدین کا فرض ہے کہ وہ خیر خواہانہ طور پر اپنی اولاد کو نصیحت کر دیں اور انہیں اونچ نیچ سے اچھی طرح واقف کرادیں اور واضح طور پر سمجھا دیں کہ ایسا کرنے میں ان کے لئے کیا خطرات ہیں۔ اور انہیں کونسا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں کچھ آیات اوپر گزر چکی ہیں۔ جن میں حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت لقمان اور حضرت نوح علیہم السلام کی نصیحتیں اپنی اولاد کو بیان کی جا چکی ہیں۔ اسی سلسلہ کی کچھ دوسری آیات اب بیان کی جاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب اپنے والد سے اپنا خواب بیان کیا کہ انہوں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے کہ وہ انہیں سجدہ کر رہے ہیں تو چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کا بچپن تھا اور وہ اس چھپے ہوئے کینہ اور حسد کو محسوس کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے جو ان کے بھائیوں کے سینہ میں سلگ رہا تھا اور جسے حضرت یعقوب علیہ السلام سمجھ رہے تھے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو تاکید فرمادی تھی کہ وہ اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کریں۔ مبادا اس سے سلگتی ہوئی آگ پر تیل نہ پڑ جائے۔ چنانچہ سورہ یوسف میں ہے

إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ۝ قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا ۖ إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ (پ ۱۲ ع ۱۰)

یاد کرو جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا۔ ابا جان میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور سورج اور چاند کو دیکھا میں نے انہیں دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ تو باپ نے کہا۔ بیٹا! اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کر دینا۔ کہیں وہ تیرے لئے خفیہ تدبیروں میں نہ لگ جائیں۔ شیطان تو انسان کا کھلا دشمن ہے ہی۔

ایسے ہی جب برادران یوسف غلہ کی خریداری کے لئے سرزمین مصر کی طرف روانہ ہونے لگے ہیں تو حضرت یعقوب کے دل میں خیال ہوا کہ میری اولاد ایک نئے ملک میں جا رہی ہے۔ معلوم نہیں وہاں کے حالات کس قسم کے ہوں بچے ایک دو نہیں پورے گیارہ ہیں۔ یہ سارے لڑکے ایک ساتھ کسی شہر میں داخل ہوں تو شہر والوں کو خواہ مخواہ وہم اور شبہ کرنے کے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں اس لئے رخصت کے وقت حضرت یعقوب نے ان کو نصیحت فرمائی کہ

وَقَالَ يَا بَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِن بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۖ وَمَا أُغْنِي عَنكُم مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ ۖ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ۝ (پ ۱۳)

اور یعقوب نے کہا اے میرے بیٹو! سب کے سب ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ متفرق دروازوں سے داخل ہونا۔ خدا کے قانون کے مطابق پیش آنیوالی کسی چیز کی میں پیش بندی نہیں کرسکتا۔ فیصلہ تو خدا ہی کا ہے۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے۔ اور اسی پر بھروسہ کرنیوالوں کو بھروسہ کرنا چاہیئے۔

مگر نصیحت خیرخواہانہ ہونی چاہیئے آمرانہ نہیں۔ اولاد جب بڑی ہو جائے تو ماں باپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خواہ مخواہ اپنی مرضیاں ان پر مسلط کرتے رہیں۔ اس نصیحت کی حیثیت مشورے سے زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔ اگر اولاد آپ کے مشورہ پر عمل نہیں کرتی۔ وہ آپ کی نصیحت کو قبول نہیں کرتی۔ تو اس کی وجہ سے آپ کو دلگیر نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ حقیقت آپ کو سامنے رکھنی چاہیئے کہ خدا نے اسے بھی عقل دی ہے اور اپنے برے بھلے کو سمجھنے کا حق رکھتی ہے ہم نے جو کچھ مناسب سمجھا اسے بتادیا اس کے بعد بھی اگر اس نے اس کے خلاف عمل کیا ہے تو ہو سکتا ہے کوئی دوسری مصلحت اس کے ذہن میں ہو جو ہمارے ذہن میں نہ ہو۔ لہذا ہمیں اس کا شاکی نہیں ہونا چاہیئے۔ حضرت زید بن حارثہؓ کو رسول اکرم صلعم نے بالکل اولاد کی طرح پرورش فرمایا تھا اور آپ ان کو اولاد کی طرح ہی چاہتے تھے۔ سارا عرب حضرت زید کو رسول اللہ صلعم کا بیٹا ہی سمجھتا تھا حضرت زیدؓ بھی رسول اکرم صلعم کو اپنا باپ ہی سمجھتے تھے۔ بلکہ باپ سے بھی کہیں زیادہ۔ رسول اللہ صلعم نے حضرت زید کی شادی اپنی پھوپی زاد بہن سے فرمائی۔ جس پر عمائدین قریش کو اعتراض ہوا اور ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ حضرت زید رسول اللہ صلعم کے متبنیٰ ہونے کے باوجود ایک اسیر جنگ کی حیثیت سے گرفتار ہو کر آئے تھے۔ اور عربی معاشرہ میں ان کا مقام ایک غلام سے زیادہ نہیں تھا۔ اسلام نے اس تفریق کو مٹایا اور یہ سبق دیا کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں رنگ نسل زبان یا جغرافیہ کی بنا پر انسان اور انسان میں کوئی تفریق نہیں یا جاتی خاندانی شرافت و شہامت کی کوئی قیمت نہیں۔ اصل قیمت انسان کے اپنے اعمال و کردار کی ہے۔ لیکن یہ تعلیم سارے قریش نے تسلیم نہیں کرلی تھی۔ قریش کی اکثریت ابھی تک اسلام سے بیگانہ تھی۔ جو لوگ مسلمان ہوچکے تھے۔ ان کے دلوں میں بھی اس نئی تعلیم نے برا اثر نہیں کیا تھا کہ وہ فوری طور پر اس خاندانی بے عزتی کو برداشت کرلیتے، غرضیکہ قریش نے اس نکاح کی مخالفت کی اور رسول اللہ نے پورے ثبات کے ساتھ اس مخالفت کا مقابلہ کیا اور حضرت زیدؓ کا نکاح حضرت زینبؓ سے کردیا۔ سوء اتفاق کہ یہ سمجھوتہ نہ ہوسکا۔ اور حضرت زیدؓ نے فیصلہ کرلیا کہ وہ حضرت زینبؓ کو طلاق دیدیں۔ رسول اکرم صلعم کو اس کا علم ہوا ظاہر ہے کہ آپ کو کس قدر ملال ہوا ہوگا۔ چنانچہ رسول اکرم صلعم نے حضرت زید کو نصیحت فرمائی کہ وہ ایسا قدم نہ اٹھائیں۔

إِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ ...... (۳۳/۳۷)

یاد کرو جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر خدا نے بھی انعام فرمایا تھا۔ اور تم نے خود بھی اس پر انعام کیا تھا کہ اپنی بیوی کو اپنے ساتھ ہی رکھو۔ اسے طلاق نہ دو۔ اور قانون خداوندی کی نگہداشت کرو......

حضرت زیدؓ نے رسول اکرم صلعم کے اس مشورے یا نصیحت کی تعمیل نہیں کی اور حضرت زینب کو طلاق دیدی۔ اور رسول اللہ صلعم

نے اس کا وفا بھی پورا نہیں منایا۔ خدا نے اس پر حضرت زیدؓ کو کوئی تنبیہ نہیں فرمائی۔ رسول اللہ صلعم نے ان کا دوسرا نکاح کر دیا۔ اور زندگی ان سے ویسی ہی محبت فرماتے رہے جیسی اس سے پہلے فرمایا کرتے تھے۔ نہ صرف ان سے بلکہ ان کے بیٹے حضرت اسامہؓ سے بھی ویسی ہی محبت کرتے رہے۔ ایسی محبت کہ صحابہ کرام میں حضرت اسامہؓ حِبّ رسول اللہؐ (رسول اللہؐ کے محبوب) کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔

لہٰذا والدین اپنی اولاد کو نصیحت تو کر سکتے ہیں اور مشورہ تو دے سکتے ہیں۔ مگر اولاد کو اپنی نصیحت یا مشورے کا پابند نہیں بنا سکتے۔ بیٹوں میں حضرت زیدؓ سے زیادہ فرمانبردار کون سا بیٹا ہو سکتا ہے اور باپوں میں حضرت خاتم النبیین صلعم سے زیادہ واجب الاحترام اور کون باپ ہو سکتا ہے۔ مگر ان دونوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اور ہمیں چاہیئے کہ ہم اس واقعہ سے سبق لیں۔

اولاد سے مشورہ کرنا چاہیئے

جب اولاد صاحب عقل و شعور ہو جائے۔ اور عاقل و بالغ ہو جائے تو والدین کو چاہیئے کہ اپنے معاملات میں ان سے مشورہ لے لیا کریں۔ عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ والدین اپنی اولاد کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ ان سے اپنے اہم معاملات میں مشورہ لیں۔ وہ کتنے ہی بڑے ہو جائیں مگر ماں باپ انھیں بچہ ہی سمجھتے رہتے ہیں۔ والدین کے مشورہ لینے سے اولاد اور ماں باپ کے درمیان بزرگی اور خوردگی کا جو ایک حجاب یا فرق مراتب کی ایک خلیج حائل ہوتی ہے۔ وہ دور ہو جاتی ہے۔ اولاد ماں باپ سے زیادہ قریب ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ان کی صحیح تربیت بھی ہو جاتی ہے۔ اگر وہ کوئی غلط مشورہ دیں تو ان کی غلطی کو ان پر واضح کر سکتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی فکر و نظر کی ناہمواریوں کو دور کر کے انھیں سکھا سکتے ہیں کہ معاملات پر کس طرح غور کرنا چاہیئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک خواب دیکھا اور اپنے فرزند ارجمند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے مشورہ فرمایا۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۚ قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ۝ (۳۷/۱۰۲)

جب اسماعیلؑ اس قابل ہو گئے کہ اپنے باپ کے ساتھ سعی و عمل میں حصہ لے سکیں تو ابراہیم نے ان سے کہا بیٹا! میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ ذرا اس پر غور کرو۔ تمہاری کیا رائے ہے! اسماعیل نے کہا۔ ابا جان! جو حکم آپ کو دیا جا رہا ہے۔ اس کی تعمیل فرمایئے۔ انشاءاللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔

اتنا ہی نہیں کہ ماں باپ کو اپنے اہم معاملات میں اولاد سے مشورہ کرنا چاہیئے بلکہ گھر میں ایسی فضا پیدا کر دینی چاہیئے کہ موقع جب مناسب سمجھے خود بھی مشورہ دے سکے۔ اور ایسا کرنے میں انھیں کوئی حجاب مانع نہ آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب تشریف لائے۔ اور پانی کے گھاٹ پر دیکھا کہ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں۔ مگر سب کے پیچھے دو لڑکیاں کھڑی ہیں۔ کہ پانی کی طرف بڑھنے سے رک رہی ہیں۔ حضرت موسیٰ نے ان لڑکیوں سے دریافت کیا کہ وہ اپنے جانوروں کو پانی کیوں

نے حضرت موسیٰ کو بتایا کہ ان کا باپ کافی بوڑھا ہوچکا ہے اور کمزور ہے۔ ہماری یہ مجال کہاں ہوسکتی ہے کہ ان چرواہوں سے پہلے انوروں کو پانی پلاسکیں۔ ہم انتظار کررہی ہیں کہ یہ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلاکر ہٹ جائیں تو بچا کھچا پانی ہم بھی اپنے جانوروں کو دیں۔ حضرت موسیٰ کے دل درد آگیں نے اس داستان مظلومیت کو سنا اور بیتاب ہوگئے۔ اور آگے بڑھ کر انھوں نے ان لڑکیوں انوروں کو خود پانی پلایا۔ دونوں لڑکیاں اپنے گھر گئیں اور بوڑھے باپ سے پوری داستان بیان کرنے کے بعد کہا

قَالَتْ اِحْدٰهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ○ (پ ۲۰)

ایک لڑکی نے کہا۔ ابا جان! اس آدمی کو آپ اپنے یہاں ملازم رکھ لیجئے۔ بلاشبہ بہترین ملازم وہی ہوسکتا ہے جو قوی ہو اور امانت دار ہو۔ (اور موسیٰ میں یہ دونوں صفتیں موجود ہیں)

ہو معلوم ہے کہ یہ دونوں لڑکیاں اور یہ ان کے بوڑھے باپ کون ہیں؟ یہ دونوں لڑکیاں حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادیاں ہیں اور کے بوڑھے باپ قوم مدین کے اولوالعزم پیغمبر حضرت شعیب علیہ السلام ہیں۔ اس واقعہ سے ان حضرات کو سبق لینا چاہیئے جو لڑکیوں کو کسی ہی نہیں سمجھتے چہ جائیکہ وہ گھر کے نظم ونسق اور دیگر معاملات میں باپ کو مشورے دے سکیں۔ یہاں حضرت شعیب علیہ السلام نے جزادی کے اس مشورے کو قبول فرمایا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملازم ہی نہیں بلکہ اپنا داماد بھی بنالیا ہے۔

لاد کی پرورش اور رضاعت

مغربی تہذیب کے اثر کے ماتحت آجکل ہمارے اونچے گھرانوں میں عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ مائیں اپنی اولاد کی دیکھ بھال اور ان کو دودھ پلانے کی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھتی ہیں بچے عموماً ماماؤں کے ہاتھوں میں پلتے ہیں۔ اور ٹین کے ڈبوں میں ولایت سے جو خشک دودھ آتا ہے۔ اس پر یا گائے کے دودھ بچوں کی پرورش ہوتی ہے۔ حالانکہ جس خیر خواہی اور دلسوزی کے ساتھ بچوں کی پرورش ان کی ماں کرسکتی ہے۔ وہ مائیں نہیں کرسکتیں انھی اپنی ماں کا دودھ بچہ کی غذا کے لئے جس قدر مفید ثابت ہوسکتا ہے۔ ڈبوں کے دودھ یا گائے کے دودھ میں وہ بات نہیں ہی بڑی مصیبت بالائے مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ہاں جہالت کی وجہ سے مائیں نہایت پست اخلاق ہوتی ہیں۔ ان کے ہاتھوں بچوں کو دیدینا ان کی اخلاقی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ دینا ہے۔ قرآن کریم نے یہ فریضہ ماں کا بتایا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی دیکھ بھال ے اور ان کو دودھ پلائے۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ۔۔۔۔۔۔۔ (پ ۲)

مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں۔ یہ مدت ان لوگوں کے لئے ہے جو رضاعت کی پوری مدت دودھ پلانا چاہیں۔

ضرورت ہو تو قرآن نے اس کی بھی اجازت دی ہے کہ اجرت پر کسی انا کو رکھ کر اس سے دودھ پلوا لیا جائے۔

ہے کہ ڈاکٹری معائنہ کے بعد ماں کا دودھ صحت منشا بیت نہ ہو یا ماں کے دودھ ہی نہ ہو۔ یا وہ اس قدر کمزور ہو کہ دودھ پلانے سے کمزوری بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورتوں میں دوسروں سے بھی دودھ پلوایا جاسکتا ہے۔ مگر محض فیشن کے طور پر اس ذمہ داری سے جان اس پابندی سے آزاد رہنا قطعاً مناسب نہیں ہے۔

وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ .... (2/233)

اگر تم اپنے بچوں کو کسی اور سے دودھ پلوانا چاہو تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ جو کچھ تمہیں اس کا معاوضہ دینا ہو جلنے پہچانے طریقہ پر دیدو۔

رضاعت اور استرضاع کے یہ احکام اگرچہ طلاق کے ضمن میں بیان ہوئے ہیں۔ لیکن بہ تقاضائے ضرورت ان کا اطلاق دوسرے بھی ہو سکتا ہے۔

اولاد سے تکلفات نہیں ہونے چاہئیں

تمہاری اولاد تمہارے جسم کا ایک حصہ اور تمہارے گھر کا ایک فرد ہیں۔ ان سے کوئی غیریت چاہیئے۔ ان سے کوئی ایسا تکلف کا برتاؤ نہیں کرنا چاہیئے۔ جس سے غیریت اور اجنبیت کی بلاشبہ عورتوں کے لئے حیا داری ان کا زیور ہے۔ جس عورت میں حیا نہیں اس میں نسائیت عورتوں کی حیا کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنے آرائش اور زینت کے مقامات کو مردوں کے سامنے ظاہر نہ کریں۔ لیکن اپنی اولاد پردہ کی ضرورت نہیں ہے۔

وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ .... (24/31)

عورتوں کو اپنے زینت و آرائش کے مقامات مردوں کے سامنے ظاہر نہیں کرنے چاہئیں۔ لیکن اپنے شوہروں، والدوں، خسروں، بیٹوں اور سوتیلے لڑکوں کے سامنے ظاہر کر سکتی ہیں۔

(باقی)

باب المراسلات

اور قرآن

راولپنڈی سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ میرا تجربہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی جوآیات ایک معمولی لکھے پڑھے آدمی کی سمجھ میں بھی آسانی سے آجاتی ہیں وہ ہمارے مولوی صاحبان کی سمجھ میں بالکل نہیں آتیں اور جن معنوں کو وہ بیان کرتے ہیں وہ ایسے ہوتے ہیں جنہیں سنکر معمولی فہم وبصیرت کا انسان بھی ہنس دے لیکن ان مولوی صاحبان کو اس کا حس نہیں ہوتا کہ وہ کس قسم کی مضحکہ خیز باتیں کرتے ہیں۔ بالآخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا یہ لوگ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں یا ان کی سمجھ بوجھ ہی نہیں ہوتی؟

ج اسلام

ہمارے مولوی صاحبان میں ایک گروہ تو ان کا ہے جو درحقیقت مولوی نہیں ہیں بلکہ "بنے ہوئے" مولوی ہیں۔ ...پ کاری اور پیرودگاری نے مولوی بنا دیا ہے۔ ان لوگوں کا نہ قرآن پر ایمان ہے نہ حدیث پر۔ یہ قرآن وحدیث کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ قرآن کے متعلق انہوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ وہ حدیث کے بغیر سمجھ ہی نہیں آسکتا۔ اور حدیث کے متعلق ...نوں نے یہ ہے کہ ان میں غلط بھی ہیں اور صحیح بھی۔ جو حدیث ان کے مطلب کے موافق ہو اسے یہ صحیح قرار دے لیتے ہیں اور جو اپنے مطلب کے خلاف جائے اسے غلط کہہ دیتے ہیں۔ اس طرح انہوں نے قرآن کو اپنی مطلب براری کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ یہ شریعت کے متعلق ...انگیز باتیں جان بوجھ کر کرتے ہیں تاکہ عوام سمجھیں کہ یہ لوگ واقعی بڑے پختہ ایمان کے ہیں کیونکہ ایمان کی پختگی کے متعلق انہوں نے ...ے کہہ رکھا ہے کہ ایمان یہ ہے کہ جو بات تمہاری سمجھ میں نہ آئے اسے بھی صحیح مانو۔ یہ لوگ صرف شریعت کے متعلق اس قسم کی مضحکہ ... ہیں گے۔ اپنے دنیاوی کاروبار کے متعلق کبھی ایسی بات نہیں کریں گے جس سے بیوقوفی ٹپکتی ہو۔

...ی قسم ان مولوی صاحبان کی ہے جو اس قسم کی مضحکہ انگیز باتوں پر دلی ایمان رکھتے ہیں اور انہیں سچا سمجھتے ہیں۔ یہ سمجھنے کے لئے ...کہتے ہیں آپ کسی مذہبی "دارالعلوم" میں جائیے اور دیکھئے کہ وہاں داخل ہونے کے لئے جس قسم کے طالب العلم آتے ہیں وہ ...ت ونطانت اور عقل وخرد کے مالک ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں مشہور تھا کہ خاندان میں جو لڑکا سب سے غبی اور کند ذہن ہوتا اور ...ں بھی کامیاب ثابت نہ ہوتا اسے مذہبی تعلیم کے لئے بھیجدیا جاتا۔ یہ تو ہے وہ (STUFF) جو ہمارے مذہبی مدرسوں میں جاتا ہے۔ ...ن مدرسوں کے نصاب تعلیم پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے اس میں بھی غور وفکر اور فہم وتدبر کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ساری تعلیم ...ر پر ہوتی ہے اور تقلید کے معنی ہی یہ ہیں کہ انسان اپنی عقل وفکر سے کبھی کام نہ لے۔ ان میں سے جو طالب العلم سب سے زیادہ کتابیں

میں زمانے وہی سب سے بڑا عالم سمجھا جاتا ہے۔ یعنی جو یہ بتا سکے کہ فلاں مسئلہ کے متعلق فلاں کتاب میں کیا لکھا ہے اور فلاں نے کیا کہا ہے! یہ ہوتا ہے ان کا مبلغ علم! آپ سوچئے کہ اس قسم کی بنیادی ذہنی سطح اور اس قسم کی تعلیم کے بعد کبھی قرآن مجید میں اسکا۔ قرآن سرتاپا علم وبصیرت کی کتاب ہے۔ اور وہ قدم قدم پر غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان بڑا صاحب عقل وخرد ہو۔ اس کے بعد علم کی دنیا میں اسے معلوم ہو کہ زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق انسان نے کیا کیا تحقیقات کی ہیں۔ اپنے زمانے میں علم کس سطح تک پہونچ چکا ہے۔ اور اس کے دور کے تقاضے کیا ہیں۔ اسی کو قرآن "انفس وآفاق میں آیات اللہ کا مشاہدہ" قرار دیتا ہے۔ اس کے بغیر قرآنی حقائق کبھی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کا سمجھ لینا ان بیچارے کے بس کی بات نہیں۔ ان کی اس بے بسی پر غصہ نہیں آنا چاہیئے۔ ان پر ترس کھانا چاہیئے۔ یہ بیچارے معذور ہیں۔ افسوس کہ اس قوم پر جو اس قسم کے فہم وفراست اور علم وبصیرت کے مالکوں کو اپنا امام (LEADER) سمجھتی ہے۔ اور زندگی کے معاملات میں ان سے راہنمائی (GUIDANCE) طلب کرتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ تاسف ہونا چاہیئے قوم کے ارباب حل وعقد پر جو عقل وعلم کے اعتبار سے یقیناً اس قابل ہیں کہ سمجھ سکیں لیکن وہ نہ اس کی ضرورت سمجھتے ہیں نہ انھیں اس کی فرصت ہے۔ وہ اپنی اس عدم توجہی، بیگانگی اور کم نگہی کو یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ شریعت کے امور علمائے دین ہی سمجھ سکتے ہیں (حالانکہ وہ اپنی خلوتوں میں ان علمائے دین کی ایک ایک حرکت کا مضحکہ اڑاتے ہیں) اور نہیں سوچتے کہ اس سے وہ قوم اور دین دونوں کو کس قدر نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان کی اس روش کا نتیجہ ہے کہ

(۱) تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ خیال پختہ ہوتا جاتا ہے کہ مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہیں۔

(۲) عوام بے عقلی، جہالت اور اندھی تقلید کو قابل قدر متاع سمجھنے لگ گئے ہیں۔ کیونکہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایسے ایسے اور ارباب سیاست ان مولوی صاحبان کو علوم شریعت کا حامل قرار دیتے اور ان معاملات میں اپنے آپ کو ان کا دست نگر سمجھتے ہیں تو ان کے دل میں یہ بات پختہ ہو جاتی ہے کہ ان مولوی صاحبان کا علم اور ان کی عقل ان "انگریزی خوانوں" سے بہت آگے ہے۔ اور

(۳) ان مولوی صاحبان میں جو "بنے ہوئے مولوی" ہیں۔ وہ اس صورت حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر قانون سازی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ اور جو سچ مچ کے مولوی ہیں۔ وہ اپنی مضحکہ انگیز باتوں کو نظرثانی کا محتاج نہیں سمجھتے اور جو انھیں مضحکہ انگیز قرار دیتا ہے اسے دشمنِ دین اسلام ٹھہراتے ہیں۔

یہ ہے صورت حالات جو اس وقت اس بدقسمت ملک میں پیدا ہو رہی ہے۔ اور اس کے ذمہ دار وہ ارباب حل وعقد ہیں جو محض قوم میں مقبول بننے کے لئے ان مولوی صاحبان کو اپنے سر چڑھاتے ہیں۔ اور اس طرح جہالت وحماقت کو سند، توہم پرستی اور مضحکہ انگیزی کو فروغ دے رہے ہیں۔ اور اسلام جیسے مبنی برعلم وبصیرت دین کو دنیا بھر میں اضحوکہ بنا رہے ہیں۔

منکرین حدیث کہاں ہیں؟

لاہور سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔

کچھ عرصہ سے دیگر مذہبی اخبارات میں بالعموم اور جماعت اسلامی کے رسائل میں بالخصوص، ایک ایسی جماعت کا ذکر بار بار کیا جاتا ہے جسے یہ منکرین حدیث کہتے ہیں، اور اس کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ لوگ پنج وقتہ نماز کو وبال جان سمجھ کر اس کی تعداد کم کر رہے ہیں۔ اور اس کی ہیئت میں کتر بیونت کر رہے ہیں۔ یہ تو دن کے روزے رکھتے ہیں۔ اور حج کو فرض نہیں سمجھتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیا آپ بتائیں گے کہ اس قسم کی جماعت پاکستان نہیں تو دنیا کے کس حصہ میں بستی ہے؟ ہمیں تو یہاں لاہور میں اہل قرآن بھی یہ کچھ کرتے نظر نہیں آتے تا بدیگراں چہ رسد؟

طلوع اسلام اس قسم کی جماعت کا اس خارجی دنیا میں تو کہیں وجود نہیں۔ البتہ یہ ان لوگوں کے ذہنوں میں بستی ہے جو اس کے کذب و افترا میں اپنے رزق کا سامان پاتے ہیں۔ جن لوگوں کی طرف ان کا روئے سخن ہوتا ہے۔ ان کے متعلق یہ اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ کی بنا پر بھی جانتے ہیں کہ وہ نہ کوئی نئی قسم کی نماز پڑھتے ہیں۔ نہ مہینے بھر کی جگہ نو دن کے روزے فرض سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود مسلسل و متواتر اپنے پروپیگنڈے میں لگے رہتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں اس کے ثبوت میں کسی کی تحریر یا کوئی حوالہ پیش نہیں کرتے۔
ارک کے متعلق مشہور ہے کہ جب اس نے دیکھا کہ جرمنی کے باشندے اس کی بات پر کان نہیں دھرتے تو اس نے فرانس کی طرف سے ایک اعلان جنگ (جرمنی کے خلاف) وضع کیا۔ اور ملک میں ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ فرانس جرمنی پر حملہ کرنے کی ٹھان رہا ہے اور جرمنی خطرہ میں ہے... گ جھٹ بسمارک کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ اس سے ہمارے ہاں کے ارباب سیاست نے فائدہ اٹھایا۔ اور جہاں اپنے مفاد کی خاطر لوگوں کو اپنے پیچھے لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی فوراً اعلان کر دیا کہ اسلام خطرے میں ہے۔ اب یہی حربہ یہ نیم مذہبی ارباب سیاست بھی استعمال کر رہے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے اپنے ذہن سے ایک نئی جماعت کا وجود تراشا ہے جو دنیا میں کہیں موجود نہیں۔ پھر اس جماعت کے متعلق یہ مشہور کر رکھا ہے کہ اس کے ہاتھوں دین خطرے میں ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ دین کو اس خطرے سے بچانے کے لئے اپنے آپ کو بطور محافظ دین پیش کرتے ہیں۔ اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر ہم نہ رہے تو اس (مزعومہ) جماعت کے ہاتھوں دین ختم ہو جائے گا اور معاذ اللہ، ناموس رسالت خطرے میں پڑ جائے گی۔ اور اس "جہاد عظیم" کے لئے لاکھوں روپے بٹور لیتے ہیں۔ فرمایئے کہ اگر یہ لوگ یہ کہہ دیں کہ اس جماعت کا وجود ہی کہیں نہیں تو پھر یہ سارا کاروبار کس طرح سے چلے؟

ان کے اس "سبحان متی کے پٹارے" کا پردہ فاش کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب یہ لوگ اس قسم کی بات کریں تو ان سے پوچھا جائے کہ آپ متعین طور پر بتایئے کہ وہ کون لوگ ہیں جو دین کے متعلق اس قسم کی باتیں کہتے ہیں اور جب وہ کسی کا نام لیں تو ان سے کہئے کہ اس شخص یا جماعت کی کوئی تحریر پیش کیجئے جس سے ثابت ہو کہ وہ ایسا کہتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس قسم کے متعین سوالات پر یہ حضرات بغلیں جھانکنے لگ جائیں گے۔ ان لوگوں کے فروغ کا راز یہ ہے کہ مسلمان اس درجہ سہل انگار واقع ہوا ہے کہ وہ کسی بات کو سنتا ہے تو اس کی [illegible] ایک قدم تک اٹھانا بھی اس کے لئے دو بھر ہوتا ہے۔ یہ حضرات لوگوں کی اس نفسیاتی

کیفیت سے واقف ہیں۔ اس لئے بڑے دھڑلے سے جھوٹ بولتے چلے جاتے ہیں۔ اگر ہماری قوم جو کچھ سنے اس کی تحقیق کرنے کی عادت کر لے تو آپ دیکھیں گے کہ اس قسم کے ملّاؤں کے کھیل کس طرح چند دنوں میں ختم ہو جاتے ہیں۔

ایک ماں کا خط

موقر روزنامہ پاکستان ٹائمز کی ۲۶ مئی کی اشاعت میں "ایک ماں" کی طرف سے ایک خط شائع ہوا ہے ترجمہ درج ذیل ہے:-

میں دو بچوں کی ماں ہوں جس کا مستقبل ان بچوں کی خوشی سے وابستہ ہے۔ جنھیں میں نے جنم دیا ہے۔ میں نے ان بچوں کو یہ سمجھ کر جنم دیا تھا کہ وہ ملک جو ان کی پیدائش کا ذمہ دار ہے، وہ ان کی خوش حالی اور مسرت کا بھی ضامن ہوگا۔ میں نے اس امید پر انھیں جنم دیا تھا کہ ان کا مستقبل محفوظ ہوگا۔ ان کی تعلیم پختہ بنیادوں پر ہوگی۔ ان کی صحت نہایت عمدہ ہوگی اور انھیں اس ملک پر فخر ہوگا جسمیں انھوں نے اپنی آنکھ کھولی ہے۔

لیکن (میں حیران ہوں کہ) اس ملک کو کیا ہو گیا ہے؟ اس کا قدم کہاں سے غلط اٹھا ہے۔ کیوں ایسا ہوا ہے؟ کس طرح ایسا ہوا ہے۔ کس کی غلطی سے ایسا ہوا ہے؟ کس کی وجہ سے ایسا ہوا ہے؟ وہ امیدیں کیا ہوئیں جن کے آسرے پر ہم زندہ تھے؟ ہم ان وعدوں کو جو ہم نے اپنے بچوں سے ان کی پیدائش کے وقت کئے تھے کس طرح پورا کریں؟ ہم ان سوالات کا جواب کیا دیں جو یہ بچے ہم سے ہر روز پوچھتے رہتے ہیں۔ اس لئے پوچھتے رہتے ہیں کہ یہ اب دن بدن بڑے ہو رہے ہیں۔ اور محسوس کر رہے ہیں کہ وہ زندگی کے اس ساز و سامان سے محروم ہیں۔ جو ایک باترتیب معاشرے میں بچوں کو بطور استحقاق ملتا ہے۔ کمزور صحت کے ازالہ اور بیماریوں کی مدافعت کا سامان کہاں ہے؟ ان کے لئے کھیل کے میدان کہاں ہیں؟ وہ ادارے کہاں ہیں جو ان بچوں کو مفید اور معاون شہری بنا دیں؟ وہ ہسپتال کہاں ہیں جن کی انھیں ضرورت ہے؟ کتابیں کہاں ہیں مدرسے کہاں ہیں؟ ان مدرسوں کو کون تعمیر کرے گا؟ کون ان کے نقشے بنائے گا؟ کون ان وعدوں کو پورا کرے گا جو اس تمام عرصے میں ہم سے کئے جاتے رہے ہیں۔ آپ تو حضور! باہمی دھینگا مشتی میں مصروف ہیں۔ ان وعدوں کو کون پورا کرے گا؟ کیا آپ میں بچوں کے باپ بھی ہیں؟ کیا آپ نے اپنے بچوں سے کوئی وعدے کئے تھے؟ کیا آپ میں بچوں کی مائیں بھی ہیں؟ جس وقت آپ اپنا قیمتی وقت اور توانائی پارٹی بازی کے جھگڑوں اور جوڑ توڑ میں ضائع کرتے ہیں، کیا اس وقت آپ کو اپنے بچوں کے تاریک مستقبل کا کوئی خیال نہیں آتا؟ کیا آپ کے سینہ میں ضمیر ہے؟ اگر ہے تو کیا کبھی آپ سے اتنا نہیں کہتی کہ قوم کو آپ کی ضرورت ہے؟

جب کسی انسان کو ایسے بچے نظر آئیں جن کا کوئی پرسان حال نہ ہو۔ جن کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ ہو جن کا ضروریات زندگی کا بہم پہنچانے والا کوئی نہ ہو۔ تو ایسے بچوں کو دیکھ کر اگر اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائے

دل نہیں پتھر ہے۔ خواہ وہ بچے اس کے اپنے ہوں یا کسی دوسرے کے۔ کوئی ماں اپنے بچوں میں اور اپنی قوم کے بچوں میں امتیاز نہیں کر سکتی۔ اگر میرے اپنے بچے ابھی تک بیمار نہیں ہوئے۔ یا ان کی ضروریاتِ زندگی رک نہیں گئیں اور وہ بھوکے نہیں مر رہے تو اس سے میرے دل کو کبھی اطمینان نہیں ہو سکتا اس لئے کہ قوم کے لاکھوں بچے ہیں جو بیمار بھی ہیں اور بھوکے بھی۔ اور جنہیں ان کے والدین نے اپنی امیدوں کے ساتھ جنم دیا تھا۔ جن امیدوں کے ساتھ میں نے اپنے بچوں کو جنم دیا تھا ابھی وقت ہے کہ ان وعدوں کو پورا کیا جائے جو ماؤں سے آٹھ سال قبل تشکیل پاکستان کے وقت کئے گئے تھے ابھی وقت ہے کہ ملک کو اس تباہی کے جہنم سے بچا لیا جائے جس کی طرف اسے بدنظمی، پارٹی بازی اور بددیانتی دھکیل کر لئے جا رہی ہے۔ ابھی وقت ہے کہ قوم کی تمام ماؤں سے کہا جائے کہ تم مایوس مت ہو جو وعدے ہم نے اور تم نے ان بچوں سے کئے تھے وہ سب پورے ہو کر رہیں گے۔ انہیں یہ بچے اپنی آنکھوں سے پورا ہوتے دیکھیں گے۔ وہ وقت آئے گا کہ جب یہ بچے اپنے ملک کا قومی ترانہ سنیں تو فخر اور مسرت سے اپنے سر کو اونچا کر کے چلیں۔ جو کچھ ہم ان بچوں کے لئے کریں گے یہ بچے اس کی پاسداری کے لئے زندہ رہیں گے۔

لیکن اگر حالات ایسے ہی رہے تو پھر تو اس کی امید نہیں کی جا سکتی کہ یہ بچے زندہ بھی رہ سکیں گے۔

کیا میری یہ اپیل اسمبلی کی پتھر کی دیواروں کو چھید کر اندر جا سکے گی۔ کیا اس نقار خانے میں طوطی کی یہ آواز کسی کے کان تک پہنچ سکے گی؟ میں اپنی اس پکار کا جواب سننے کے لئے انتظار کروں گی، اس لئے کہ مغربی پاکستان کی اسمبلی میں کچھ تو ایسے لوگ ہوں گے ہی جو فہم و شعور سے کام لیں، اور سوچیں کہ وہ کس کھیل میں مصروف ہیں۔ اور قوم کے تقاضے کیا ہیں؟)

طلوع اسلام | اس خط کو پڑھنے کے بعد اربابِ حل و عقد سے اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ

دل صاحبِ اولاد سے انصاف طلب ہے!

ممتا کی ماری ماں نے صرف اپنے دل کا دکھ ہی بیان نہیں کیا۔ ملک کی لاکھوں ماؤں کے دلِ بے تاب کی ترجمانی کی ہے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہماری یہ بہن اپنی درد بھری صدا کا کوئی جواب اس ایوان سے نہیں سن سکے گی جس کی دیواریں ہی پتھر کی نہیں بلکہ جس میں رہنے والے انسانوں کے دل بھی پتھر کے ہیں۔ اس نے اپنی توقعات غلط جگہ وابستہ کی ہیں۔ اس لئے اس کا انتظار رائیگاں جائے گا۔ اس کی حسرت بھری نگاہیں تھک کر گر پڑیں گی اس کی پکار کا جواب صرف اس نظام کی طرف سے مل سکتا ہے جو قرآن کی محکم بنیادوں پر استوار ہو اور جو ہر صاحبِ اولاد سے پورے حتم و یقین سے کہہ سکے کہ اطمینان رکھو نحن نرزقکم وایاھم ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کے بھی۔ وہ نظام جس میں ہر بچہ خود مملکت کی ذمہ داری بن جاتا ہے کیونکہ وہ مملکت اس خدا کے نام پر وجود پذیر ہوتی ہے جو اپنے آپ کو رب العالمین کہتا ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسانی کی پرورش کا ذمہ دار۔ اس نظام کے علاوہ کوئی اور نظام اس عالمگیر ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکتا۔ خواہ اس کا نام اسلامی ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔

طاہرہ کے نام

تمہارے لئے طاہرہ بیٹی! اس بات کو فی الواقعہ باعثِ تعجب ہونا چاہیئے کہ قرآن ایک طرف تو زندگی کے بڑے بڑے اہم امور میں صرف اصولی ہدایات پر اکتفا کرتا ہے۔ لیکن دوسری طرف معاشرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی جزئیات تک کو بھی خود ہی بیان کر دیتا ہے۔ ترش روئی سے پیش نہ آؤ۔ چلا کر نہ بولو۔ اکڑ کر نہ چلو۔ کسی کے ہاں جاؤ تو اجازت لے کر گھر میں داخل ہو۔ مجلس میں یوں بیٹھو۔ جب تک تو دوسرے کا وقت بیکار باتوں میں ضائع نہ کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن عزیزہ! تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ زندگی میں ان چھوٹی چھوٹی کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ بڑے بڑے معاملات، زندگی میں کبھی کبھی پیش آتے ہیں۔ اور عام طور پر ان کا تعلق بڑے بڑے لوگوں سے ہے۔ لیکن معاشرہ کی روزمرہ کی باتیں قدم قدم پر سامنے آتی ہیں اور ہر شخص کو ان سے واسطہ پڑتا ہے۔ زندگی کے قلعہ کی بنیاد ان حقائق پر استوار ہوتی ہیں جنہیں قرآن نے اصولی طور پر بیان کیا ہے۔ لیکن اس کی اوپر کی عمارت ان اینٹوں سے تعمیر ہوتی ہے کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے ذرات سے تیار ہوتی ہیں۔ ذرا سوچو کہ ایک شخص کتنا ہی اصول پرست کیوں نہ ہو۔ اگر وہ ترش رو ہو تو جن لوگوں کو اس سے واسطہ پڑے تو جس قدر ان کے لئے باعثِ زحمت اس کی اصول پرستی ہوگی۔ اس سے کہیں زیادہ موجبِ بدسلیقگی ہوگی۔ ہر شخص اس کے پاس جانے سے گھبرائے گا۔ وہ کوشش کرے گا کہ اس سے معاملہ ہی نہ پڑے۔ اصل یہ ہے کہ زندگی کی حسینیت کی جھلک ان چھوٹی چھوٹی باتوں ہی سے چھن کر باہر آتی ہے۔ اصول پرستی زندگی کے موٹر میں پٹرول کی حیثیت رکھتی ہے۔ گاڑی پٹرول ہی کے زور سے چلتی ہے۔ لیکن تمہیں معلوم ہے ابا، کہ سلیم میاں پٹرول کے ساتھ موبل آئل کا کتنا خیال رکھتے ہیں کہ پٹرول کے ختم ہونے سے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ گاڑی رک جائے گی۔ لیکن موبل آئل کے نہ ہونے سے انجن جل جائیں گے۔ اصول پرستی اگر پٹرول کی حیثیت رکھتی ہے تو یہ چھوٹی چھوٹی معاشرتی جزئیات زندگی کی گاڑی میں موبل آئل ہیں۔ ان کے نہ ہونے سے پرزوں میں ایسی رگڑ (FRICTION) پیدا ہوتی ہے جس سے باہمی تعلقات کے نرم و نازک رشتے جل جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی سوچو کہ معاشرتی زندگی کی جن چھوٹی چھوٹی جزئیات کو قرآن نے بیان کیا ہے یا ان سے ملتی جلتی دوسری کی اہمیت محض ہنگامی اور وقتی تھی۔ یا وہ بھی ابدی حقائق کی طرح مستقل اہمیت رکھتی ہیں؟ کیا بدخلقی اور ترش روئی آج سے چودہ سو برس مذموم تھی، اور آج وہ قابلِ تعریف صفت سمجھی جاتی ہے؟ تم دیکھو گی کہ یہ باتیں جس طرح اس زمانے میں اپنی اہمیت رکھتی تھیں،

. اس لئے ان معاشرتی آداب و اخلاق کا اپنا مقام ہے۔ اور ان کی نگہداشت انتہائی ضروری۔

اس قسم کے معاشرتی ضوابط یوں تو زندگی کے ہر گوشے میں اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن گھر کی زندگی میں ان کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ میرے سامنے کتنے ہی گھرانے ہیں جن میں (میاں بیوی یا دیگر متعلقین ہیں) اصولی طور پر کوئی بات قابل اعتراض نہ تھی۔ لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال نہ رکھنے سے گھر میں سکھ اور سکون نہیں رہا تھا۔ یا کم از کم میاں بیوی میں وہ بات نہیں رہی تھی جسے قرآن نے مودت اور رحمت سے تعبیر کیا ہے۔ ذرا غور کرو بیٹی! کہ جب میاں گھر میں آئے تو اس کی طرف سے مسکراہٹ آمیز سلام اور بیوی کی طرف سے خندہ پیشانی سے اس کا جواب کتنی کلفتوں کو دور اور کتنے غم غلط کر دیتا ہے۔ یا ایک کی نادانستہ غلطی پر دوسرے کا ہنس دینا گھر کی زندگی کو کتنے جہنمی شعلوں کی لپیٹ سے بچا کر جنت در آغوش بنا دیتا ہے۔ یا ایک کی غصے کی حالت میں دوسری طرف سے دھیمی آواز سے جواب کس طرح بھڑکتی آگ پر پانی ڈال دیتا ہے۔ دوسری طرف کسی اختلافی معاملہ پر سنجیدگی سے گفتگو کرنے کی بجائے بیوی کا منہ پھیر کر خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلا دینا۔ دونوں میں کتنی گہری خلیج پیدا کر دیتا ہے یا غلطی کا اعتراف نہ کرنا اور اپنی بات کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے بحث کرتے چلے جانا گھر کی زندگی کو کس قدر سکون فراموش بنا دیتا ہے۔ یہ تو خیر پھر بھی بد خلقی اور ترش روئی یا اسی انداز کی چیزیں ہیں۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا کہ گھر کی چھوٹی چھوٹی سی باتوں میں بے احتیاطی، گھر کی زندگی میں کس طرح بدمزگی پیدا کر دیتی ہے۔ تم نے اپنی ممانی مرحومہ کو تو دیکھا ہوگا لیکن ان کی گھر کی زندگی کے مطالعہ کرنے کا تمہیں موقعہ نہیں ملا ہوگا۔ تم بہت چھوٹی تھیں جب ان کا انتقال ہو گیا۔ مرحومہ کے متعلق میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جسے گناہ یا جرم کہتے ہیں میں نے ساری عمر میں کوئی ایک بات بھی ایسی ان سے سرزد ہوتے نہیں دیکھی۔ ایسی نیک اور پاکباز زندگی جس کی مثال کم ملے۔ دیانت اور امانت کی پیکر۔ دل کی اتنی نرم کہ ملازم تک کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو وہ رات بھر روتی رہیں۔ سیر چشمی کا یہ عالم کہ اس اللہ کی بندی نے ساری عمر میں تمہارے ماموں سے یہ نہیں کہا کہ مجھے فلاں کپڑا بنوا دو یا فلاں زیور خرید دو۔ ماموں تمہارے اتنی آمدنی کے باوجود درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ میرا مطلب سادہ زندگی سے ہے۔ گھر کی عام ضروریات کے بعد جو کچھ باقی بچتا سب نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے تعمیری کاموں میں صرف ہو جاتا۔ وہ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اور ان کے ہمعصروں کے گھروں میں زندگی کا جو ٹھاٹھ باٹھ تھا۔ وہ سب کے سامنے تھا۔ موٹریں، کوٹھیاں۔ نوکر چاکر۔ جھاڑ فانوس۔ چمکتے دمکتے زیور۔ ساڑھیاں۔ غرضیکہ وہ سب کچھ جو موجودہ زمانہ میں متمولوں کی گھر کی زندگی کا لازم قرار پا چکا ہے۔ یہ سب کچھ تمہاری ممانی کے سامنے تھا اور اس کے مقابلہ میں اپنے گھر کی سادہ زندگی جسے تقابل کے لئے غریبانہ زندگی کہنا پڑے گا۔ لیکن اس نے کبھی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اور لب پر حرف شکایت لانا تو ایک طرف کبھی دل میں بھی اس کا خیال نہیں لایا کہ ان کے مقابلے میں ہمارا معیار زندگی کیا ہے۔ تم حیران ہوگی کہ مرحومہ کو بہت کم معلوم ہوتا تھا کہ تمہارے ماموں کی تنخواہ کیا ہے۔ نہ ہی اس کا اسے معلوم کرنے کی ضرورت ہی تھی۔ بس چلو ظاہر ہو! اس قسم کی عورت نہیں آج کہیں دور دور بھی دکھائی دیتی ہے؟ دوسری طرف تمہارے ماموں ہیں جن کے متعلق اب تم مجھ سے بھی زیادہ جانتی ہو۔ اگر وہ عورتوں میں اپنی مثال نہیں رکھتی تھیں۔ تو یہ مردوں میں ان خصوصیات کے واحد مالک ہیں۔ تم انہیں اس بڑھاپے میں بھی دیکھو۔ دل اور دماغ دونوں کے اعتبار سے کتنے بلند ہیں۔ اب ظاہر ہے

کہ اگر اس گھر کی زندگی جس میں میاں بیوی اس انداز کے ہوں جنت کی زندگی نہیں ہوگی تو پھر اس زمین پر جنت اور کہاں مل
لیکن تم یہ سنکر حیران ہوگے کہ اس کے باوجود اس قسم کی رفاقت کا نتیجہ جس قدر خوشگوار ہونا چاہیئے تھا۔ وہ ایسا خوشگوار نہیں تھا
سے تم کوئی غلط مفہوم نہ لے لینا۔ ان کی رفاقت کی پختگی کا تو تم اس سے اندازہ لگا سکتی ہو کہ اگرچہ مرحومہ کا انتقال اس
ہوا تھا جب ماموں ہنوز ادھیڑ عمر کے تھے۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے دوسری شادی کا خیال تک بھی نہیں کیا۔ اور اس کے لئے
بارخود تمہارے سامنے بھی کہہ چکے ہیں کہ میں نے اس لئے پھر شادی نہیں کی کہ مجھے تمہاری ممانی جیسی کوئی دوسری عورت
آئی۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ اتنی خوبیوں کی وجہ سے گھر کا انداز جس قدر جنت آفریں ہونا چاہیئے تھا۔
نہیں تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مرحومہ جہاں زندگی کے بڑے بڑے اصولوں میں اتنے بلند معیار کا ثبوت دیتی تھیں۔ روزمرہ
چھوٹی باتوں میں چنداں محتاط نہیں تھیں۔ وہ ترش رو اور بد خلق بھی نہیں تھیں۔ ایسی رقیق القلب اور ہمدرد عورت بہ مشکل
ہے ؟ لیکن وہ گھر کی معمولی باتوں میں احتیاط نہیں برتتی تھیں۔ اس کے برعکس، ماموں بلند اصولوں کے ساتھ ان چھوٹی
باتوں میں بھی بہت محتاط تھے۔ مثلاً ماموں وقت کے بہت پابند تھے۔ اب تک تم نے دیکھا ہوگا کہ وہ پابندی وقت
اہمیت دیتے ہیں۔۔ اور اس کی کتنی شدت سے احتیاط برتتے ہیں۔ لیکن تمہاری ممانی (جیسا کہ ہمارے معاشرے کی عورتوں
معمول ہے) وقت کا کبھی خیال نہیں کرتی تھیں۔ بات بڑی چھوٹی سی ہے لیکن تم سوچو کہ صبح سے شام تک کتنے مقامات
دونوں کا اسی ایک معمولی نقطہ پر ٹکراؤ ہوتا ہوگا۔ ٹکراؤ سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ لٹھم لٹھا ہو جاتے تھے۔ ٹکراؤ سے
ذہنی ٹکراؤ ہے۔ اور تمہارے ماموں جیسے حساس انسان کے لئے اس قسم کا ذہنی ٹکراؤ لٹھم لٹھا سے بھی زیادہ تکلیف
تھا۔ ہم اکثر دیکھتے کہ ان دونوں نے کہیں باہر جانا ہے۔ ماموں تیار ہو کر باہر کے دروازے میں کھڑے ہیں۔ اور مم
کپڑے بدلنے کا نام نہیں لیتیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوتا کہ ممانی کو جوتے کا ایک پاؤں نہیں مل رہا۔ یہ ان دونوں کی عادتوں کا دوسرا
تھا۔ ماموں کی زندگی کا یہ انداز کہ ان کی ہر شے اپنی اپنی جگہ پر رکھی ہے۔ اس طرح کہ اگر رات کے اندھیرے میں بھی
تو سیدھا شے مطلوب پر جا کر پڑے۔ اس کے برعکس ممانی کی یہ کیفیت کہ اگر نمکدان مل گیا ہے تو مرچوں والے ڈبے کا
نہیں چلتا۔ اور اگر پنسل سامنے رکھی ہے تو اس کا پتہ نہیں ملتا۔ جب گھر میں جاؤ تو سب سے پہلا فقرہ جو کان میں پڑتا یہی
میرے ہاتھ میں تھی یاد نہیں پڑتا کہاں رکھ بیٹھی ہوں"۔ یہ دونوں کی عادات میں تیسرا اختلاف تھا۔ ماموں کے حافظہ
عالم ہے کہ راستہ چلتے چلتے تمہیں بتلاتے جاتے ہیں کہ تیس برس ہوئے یہاں ایک پتھر ہوتا تھا اور وہاں ایک کھمبا اور رما
کی یہ کیفیت کہ ایک شام میں نے دیکھا کہ توا چولہے پر رکھا ہے اور خود پریشان سی ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے کہنے
آٹا گوندھنا ہی بھول گئی۔ توا چولہے پر رکھا تو یاد آیا۔ ادھر ماموں کی طبیعت ایسی کہ اگر کھانا ذرا بھی بے وقت ہو گیا تو پھر
تھے۔ ماموں اپنے کمرے سے نکل کر غسل خانے کی طرف جاتے تو ہم دیکھتے کہ انھوں نے چلتے چلتے چارپائی کو ذرا پیچھے سرکا
بڑھا دیا۔ پردے کو سیدھا کر دیا۔ بچے کی کتاب اٹھا کر اس کے بستے میں رکھ دی۔ لیکن جب وہ غسل خانے میں پہنچے

ہے تو اِلیہ نہیں۔ قمیض ہے تو بنیان نہیں۔ وہ ان باتوں پر طوفان نہیں مچا دیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بیوی کی خوبیوں کا پلڑا کتنا جھکا ہے۔ اور اس کی یہ خامیاں غلط تربیت کا نتیجہ ہیں۔ لیکن انھیں اس سے جس قدر کوفت ہوتی تھی اس کا تو اندازہ لگا یا جا سکتا ہے۔ اس تم یہ نہیں سمجھ لینا کہ تمہاری ممانی پھوہڑ تھیں۔ بالکل نہیں۔ بات صرف یہ تھی کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں جتنی احتیاط برتنی چاہیئے۔ وہ احتیاط نہیں برتی تھیں۔ اگر تمہارے ماموں بھی ایسے ہی بے احتیاط ہوتے تو پھر چنداں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن چونکہ ان کی طبیعت مختلف اس لئے اس سے انھیں کوفت ہوتی تھی۔ اگر ممانی تھوڑی سی بھی کوشش کرتیں تو ان باتوں پر قابو پالینا کچھ دشوار نہ تھا۔ انھیں ایسا چاہیئے تھا۔

اس مقام پر تم نہیں تو تمہاری سہیلیاں ضرور کہیں گی کہ دیکھو نا! پرویز صاحب مرد ہیں نا۔ اس لئے مردوں کی طرفداری کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ممانی کو چاہیئے تھا کہ وہ اپنے اندر تبدیلی پیدا کرکے، اپنی عادات کو ماموں کی عادات سے ہم آہنگ کر لیتیں۔ یہ کیوں نہیں کہ ماموں کو چاہیئے تھا کہ وہ ممانی کے دوش بدوش چلنے لگ جاتے! لیکن عزیزہ! غور کرو اس میں طرفداری، در مخالفت کی کوئی بات نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ممانی کی بے احتیاطی کوئی اچھی عادت نہ تھی۔ اس کے برخلاف ماموں کا انداز زندگی مستحسن تھا۔ یہ وجہ ہے کہ میں کہتا ہے کہ ممانی کو چاہیئے تھا کہ اپنی عادات میں تبدیلی پیدا کرکے اس تصادم کو دور کر لیتیں۔ اگر ماموں بے احتیاط ہوتے اور ممانی با احتیاط ہیں یہی مشورہ ماموں کو دیتا۔

تم پوچھو گی کہ اگر دونوں بے احتیاط ہوتے تو پھر؟ پھر یا تو دونوں باہمی مشورہ سے اپنی عادات میں اصلاح کر لیتے۔ اور اگر ایسا ممکن ہوتا تو پھر وہ دونوں اسی طرح چلے جاتے۔ ٹکراؤ ان میں پھر بھی پیدا نہ ہوتا۔ گھر کی زندگی میں میاں بیوی میں ہم آہنگی نہایت ضروری ہے پہلے اصولوں میں۔ اور اس کے بعد عادات و خصائل کی جزئیات میں۔ تمہیں معلوم ہے کہ قرآن نے مومن مرد اور مشرک عورت یا مشرک مرد اور مومن عورت کی شادی سے کیوں منع کیا ہے؟ اس لئے کہ شرک اور ایمان دو متضاد اصول ہیں جو زندگی کی مختلف راہوں کی طرف لے جاتے ہیں۔ قرآن اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتا ہے کہ متضاد نظریات زندگی رکھنے والے مرد اور عورت کبھی دو قالب یک جان ازدواجی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اگر اس قسم کے متضاد اصول رکھنے والے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے تو ان کی زندگی زندگی بن جائے گی۔ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کے رشتہ کو روا رکھنے والے أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ تمہیں جہنم کی دعوت ہیں وَاللَّهُ يَدْعُوا إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ (۲/۲۲۱) اور اللہ اپنے اس حکم کی رو سے تمہیں اس زندگی کی طرف بلاتا ہے۔ جس میں جنت کی خوشگواریاں اور تباہیوں سے حفاظت کا سامان ہے۔

تم نے غور کیا ہو گا کہ طبیعتوں کے ان جوڑ رشتوں کو خدا کس طرح جہنم کے عذاب سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ تو پھر بھی شرک اور توحید کا فرق زندگی کی یکسر متضاد راہیں ہیں۔ قرآن اس باب میں یہاں تک کہتا ہے کہ الْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے۔ اس کے برعکس وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ (۲۴/۲۶) طیب عورتیں طیب مردوں کے لئے ہیں اور طیب مرد طیب عورتوں کے لئے۔ خبیث اور طیب

قرآن کی بڑی جامع اصطلاحیں ہیں۔ ان میں قلب و نگاہ کی خباثت و لطافت سے لے کر عادات و خصائل کی ناخوشگواری و خوشگواری تک سب کچھ شامل ہے۔ وہ میاں بیوی کی یک رنگی و ہم آہنگی کو بنیادی شرط قرار دیتا ہے۔ وہ جہنمی کو جہنمی کے ساتھ باندھ اور جنتی کا دامن جنتی کی چولی کے ساتھ ٹانکتا ہے۔ لہٰذا ازدواجی زندگی کو جنتی بنانے کے لئے ضروری ہے کہ میاں میں جتنی اچھی ہوں، بیوی انہیں اپنے اندر پیدا کرے۔ اور بیوی میں جتنی خوشگوار باتیں ہوں، میاں اپنے آپ کو ان سے ہم آہنگ کرے باب میں روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر خاص طور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں کے بدخود غلط مردوں کو تو چھوڑیئے کے دماغ پر چونکہ یہ خناس سوار ہے کہ مرد عورتوں پر بہر حال غالب اور فائق ہے۔ اس لئے وہ بیوی کی اچھی عادت کی تقلید میں ذلت سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کی عورتوں کی بھی یہ حالت ہے کہ وہ محض طبیعت کے تساہل سے اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا چاہتیں اور جب ان سے میاں کچھ کہے تو وہ منہ بنا کر کہہ دیتی ہیں کہ ہم تو اچھی بری جیسی بن گئیں ویسی ہی رہیں گی۔ آپ کے بیویاں ولایت سے ملیں گی۔ وہاں سے لے آیئے! تم سوچو بیٹی! یہ ذہنیت کس قدر خراب ہے اور اس قسم کی احمقانہ باتیں تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہیں۔ جب میاں بیوی کا رشتہ جسم اور لباس کا سا ٹھہرا (ھن لباس لکم و انتم لباس لہن) پھر ان کے لئے ایک دوسرے کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ وہ لباس ہی کیا جو بدن پر فٹ نہ آئے۔

اب تم سمجھ گئیں کہ قرآن روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس قدر زور کیوں دیتا ہے۔ اور گھر کی زندگی میں ان باتوں کی کس قدر ہے۔؟ اچھا خدا حافظ! جاوید میاں کو بہت بہت دعا دینا۔

ہاں سننا! اس خط کو کہیں ماموں صاحب نہ دیکھ پائیں۔ وہ ممانی مرحومہ کے خلاف کسی سے ایک لفظ بھی تیار نہیں۔ کیسی بلند خصائل کی تھی وہ محترم خاتون اور کتنے پاکیزہ مزاج ہیں یہ ان کے میاں! ــــ اب ایسے لوگ کہاں

دعاگو

پرویز

سلیم کے نام ــــــــ آئندہ پرچے میں

ایک مفید مشغلہ



شہناز: ارے اتنے سارے ٹکٹ! الطاف یہ کیسے ہیں؟

الطاف: بھئی یہ عام ٹکٹ نہیں ہیں یہ تو سیونگز ٹکٹ ہیں جن سے روپیہ ملتا ہے۔

شہناز: تم ان ٹکٹوں کا کیا کرو گے؟

الطاف: دیکھو اب یہ کارڈ بھر گیا ہے اب میں اسے ڈاکخانے لے جاؤں گا اور اس کے بدلے پانچ روپے کا ایک سیونگز سرٹیفکیٹ لے لوں گا پھر میں اور ٹکٹ جمع کروں گا اور اسی طرح ان کے بدلے بھی سرٹیفکیٹ لے لوں گا۔ دس سال بعد پانچ روپے والا سرٹیفکیٹ سات روپے ایک آنے کا ہو جائے گا۔ دیکھو بچت کا کتنا اچھا طریقہ ہے!

شہناز: کیا میں بھی یہ ٹکٹ خرید سکتی ہوں؟

الطاف: کیوں نہیں، تم بھی پیسے بچاؤ تو خرید سکتی ہو۔ سچ مچ سب لڑکے لڑکیاں اس طرح روپیہ جمع کریں تو کتنے اچھے رہیں۔

پاکستان سیونگز ٹکٹ خریدیئے

تمام ڈاکخانوں سے ملتے ہیں۔

manhattan

بقیہ لمعات (صفحہ سے آگے)

تبدیلیٔ قلب و نظر پلان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ملک کی فلاح و بہبود کے لئے جو اسکیمیں پیش کی گئی ہیں انہیں بڑی کامیاب و نتیجہ خیز بنانے کے لئے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ان کاموں کے اہل ہوں جنہیں ان کے حاصل ہو لیکن

ان باتوں سے کہیں زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ عمالِ حکومت (سرکاری ملازمین) کے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا کی جائے۔

جس سے وہ اپنی ذمہ داریوں کو دیانت و امانت اور حسنِ نیت کے ساتھ سرانجام دیں۔ یہ بہت بڑا اور بنیادی سوال ہے جسے سامنے لایا گیا ہے لیکن حکومت کی طرف سے یہ بات پہلی مرتبہ نہیں کہی گئی (ہم نے "حکومت" اس لئے کہا ہے کہ پلاننگ بورڈ پاکستان کا ادارہ ہے) یہ بات پہلے دن سے اب تک مسلسل دہرائی جا رہی ہے کہ ہمارے عمالِ حکومت نااہل تو نافل پیشہ خائن ہیں لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں بتایا کہ ایسا کیوں ہے۔ اور اس کا علاج کیا ہے۔ ہمیں توقع تھی کہ اس پلان میں اس مرض کے علاج کے متعلق کچھ کہا گیا ہوگا۔ لیکن ہمیں اس میں بھی کچھ نہیں ملا۔ کہا صرف اتنا ہی گیا ہے کہ سرکاری ملازمین میں تبدیلی پیدا ہونی چاہیئے حالانکہ بتانا یہ چاہیئے تھا کہ اس پانچ سال میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے یہ کچھ کیا جائے گا۔ اس سے بات بالکل نکھر کر

(۱) حکومت کو اعتراف ہے کہ اس پلان کی کامیابی کے لئے عمالِ حکومت میں نگاہ کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

(۲) یہ تبدیلی نہ آج موجود ہے نہ ہی اسے پیدا کرنے کے لئے کوئی تجاویز بتائی گئی ہیں۔

(۳) یہ تبدیلی از خود پیدا ہو نہیں سکتی۔ اس لئے نتیجہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے ہزار پلان بنا لیجئے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوں گے

اصل یہ ہے کہ اس ضمن میں جو کچھ ہمارے اربابِ حکومت میں ہو رہا ہے وہ اس سے پہلے اربابِ مذہب میں ہو رہا تھا (اور اب بھی) ہمارے مولوی صاحبان نے جب دیکھا کہ مولویوں کی سیرت و کردار کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے۔ وہ بالعموم حقیقت پر مبنی ہے تو انہوں نے "علمائے سوء" اور "علمائے خیر" کی اصطلاحات وضع کیں۔ اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ ہر مولوی ان تمام خرابیوں کو ایک ایک کر کے گناتا ہے۔ جو مولویوں میں بالعموم پائی جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد کہہ دیتا ہے کہ یہ سب خرابیاں "علمائے سوء" کی ہیں۔ "علمائے خیر" کی نہیں۔ اس طرح وہ باقی مولویوں کو تو علمائے سوء قرار دے دیتا اور اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو علمائے خیر میں شمار کرتا ہے۔ کچھ یہی ہمارے ہاں عمالِ حکومت اور اربابِ سیاست میں ہو رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی تقریروں اور بیانات میں ان خرابیوں کو ایک ایک کر کے شمار کراتا ہے جو ہماری حکومت اور سیاست میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن ان کا تذکرہ اس طرح سے کرتا ہے گویا یہ دوسروں میں ہیں اور یہ خود (اور شاید اس کی پارٹی) ان سے بالکل مبرا ہے۔ ظاہر ہے جب کسی معاشرہ کی حالت یہ ہو جائے تو اس کی اصلاح (DRASTIC MEASURES) کے علاوہ اور کسی طرح ممکن نہیں ہوتی۔

ن کے متعلق

اس پلان میں زرعی اصلاحات' یا زمین سے متعلق مسائل کے بابت جو کچھ کہا گیا ہے ہم نے اسے آخر میں اسلئے رکھا تھا اس لئے کہ خود پلان میں کہا گیا ہے کہ ہماری آبادی کا قریب نوے فیصدی حصہ دیہات میں بستا ہے۔ اس لئے جو مسائل آبادی سے متعلق ہوں گے انہیں ملک میں یقیناً بنیادی حیثیت حاصل ہوگی۔ زرعی اصلاحات کے متعلق پلاننگ بورڈ کے چیرمین محترم …سین صاحب نے' ماہرین معاشیات کی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا

> ہمارا زرعی نظام' ایک جاندار اور ذی قوت معاشرہ کے نصب العین کی راہ میں ایک موثر روک ہے۔ یہ نظام' معاشرہ میں بہت بڑے مظالم اور ان عدم مساوات کا ذمہ دار ہے۔ جن سے معاشرتی فلاح کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ نظام اس قسم کے معاوضہ کی شکل کو مستقل طور پر برقرار رکھتا ہے جو دور حاضرہ کے حالات و کوائف سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ ہماری پستی کا ذمہ دار ہے۔ اس سے معاشرہ میں کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ اور ہماری اقتصادی' معاشرتی اور سیاسی زندگی کو کبھی کبھی استقامت نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس سے وہ جذبہ نہیں پیدا ہو سکتا جو ملک میں زرعی ترقی کا محرک بن سکے۔ یہ مسئلہ درحقیقت پاکستان کے اقتصادی اور معاشرتی مسائل کی فہرست میں اول نمبر پر رکھے جانے کے قابل ہے۔

…سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ خود پلاننگ بورڈ کے نزدیک اس مسئلہ کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ لیکن اس مسئلہ کے حل کے لئے پلان میں …کچھ کہا گیا ہے۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ پیداوار کو قریب ۱۳ فیصدی بڑھانے کی کوشش کی جائے گی اور ایسے قوانین مرتب کرنے …ضرورت ہے جن سے زمین کے حقوق منصفانہ طور پر متعین ہو جائیں اور اشتمال اراضیات کے ذریعے چھوٹے چھوٹے رقبوں کو ملا کر بڑے بڑے …قطعات میں تبدیل کر دیا جائے۔ ہم ارباب فکر و نظر سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ملک کا ایسا اہم مسئلہ' جو خود پلاننگ بورڈ کے چیرمین کے الفاظ میں …اقتصادی اور معاشرتی مسائل میں "نمبر ون" (NUMBER ONE) کی حیثیت رکھتا ہے ان تدابیر سے حل ہو سکتا ہے؟ حقیقت …یہ ہے کہ جس قدر یہ مسئلہ اہم اور بنیادی ہے۔ اسی قدر اس کے حل کے لئے انقلابی اقدامات کی ضرورت ہے۔ اور اس کا امکان صرف ان لوگوں کے ہاتھوں …ہو سکتا ہے جو اپنے سینے میں صحیح انقلابی روح اور اپنے دل میں عزم بلند رکھتے ہوں۔ انقلابی روح سے ہماری مراد ہے قرآن کی پیدا کردہ انقلابی …اور عزم بلند سے مراد ہے ایسا عزم جو قرآنی ایمان پیدا کرتا ہے۔ یہ روح اسی شخص کے قلب میں پیدا ہو اور یہ عزم اسی کے سینے میں۔ مستور …سکتا ہے جو الارض للہ کے قرآنی تصور کو پوری طرح سمجھ سکے نیز اس کی اہمیت کو دل کی گہرائیوں میں اتار چکا ہو۔ نیست ایں کار فقیہاں ایے پسر!

اس ضمن میں ایک بات اور بھی قابل غور ہے آجکل ہمارے ہاں کا سرمایہ دار طبقہ از خود زمینداری کو چھوڑ کر کارخانہ داری کی طرف آرہا ہے۔ …مصلحین نے یہ روش اختیار کر لی ہے کہ وہ زمینداروں کے مظالم کو ایک ایک کر کے گنانے اور زمینداری کی اصلاح کے لئے نت نئی تجاویز پیش کرتے …ہیں لیکن کارخانہ داروں کے متعلق ایک حرف بھی نہیں کہتے۔ حالانکہ خرابی حالات دونوں جگہ یکساں ہے۔ چڑھتے سورج کی پرستش اسے کہتے …اب اقتدار زمینداروں کے ہاتھ نہیں۔ کارخانہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔

طریقِ کار

پلان میں جو تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ انھیں پورے کا لانے کے لئے وسائل و ذرائع کی ضرورت ہوگی۔ ان کے بغیر کوئی تجویز کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس ضمن میں پلان میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ما حصل یہ ہے کہ اس قسم کے (ANS کی کامیابی کے لئے دو قسم کے طریق اختیار کئے جا سکتے ہیں ایک طریق یہ ہے کہ

یہ سمجھ لیا جائے کہ ملت کے تمام وسائل و ذرائع (RE SOURCES) ان مقاصد کے حصول کے لئے موجود ہیں۔ پھر تمام افراد ملت سے کہا جائے کہ وہ محنت شاقہ سے کام کریں۔ ان مصائب و تکالیف کو برداشت کریں جو ان بلند پایہ مقاصد کے حصول کی راہ میں پیش آئیں۔ اپنی ضروریات زندگی کو کم از کم حد تک سمیٹ لیں۔ حکومت جس فرد کے متعلق سمجھے کہ وہ فلاں قسم کا کام کرنے کا اہل ہے اسے اس کام پر حکماً لگا دے اس طریق کار کا مطلب یہ ہوگا کہ افراد ملت پر زیادہ سے زیادہ پابندیاں عائد کی جائیں تاکہ ان کی جسمانی اور انسانی صلاحیتیں بڑی سے بڑی حد تک پیش نظر نصب العین کے حصول میں صرف کی جا سکیں۔

آپ دل میں خوش ہو رہے ہوں گے کہ شکر ہے کہیں سے یہ آواز تو کان میں آئی کہ ہمارے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ انفرادی مفاد اور نظام کو پس پشت ڈال کر ملک کے تمام وسائل و ذرائع کو ملت کے اجتماعی مقاصد کے لئے وقف کر دیا جائے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی یہ خوشی چشمک برق سے زیادہ نہ ہوگی اس لئے کہ مذکورہ صدر طریق کی وضاحت کے بعد ہمارے سامنے یہ الفاظ آتے ہیں کہ

ہمارا ملک فرد کی آزادی اور جمہوری انداز حکومت کا قائل ہے اور مذکورہ بالا طریق ان دونوں کے منافی۔ اسلئے یہ ہمارے ملک کے مزاج کے سازگار نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ہم نے اس طریق کار کو مسترد کر دیا ہے۔

اس کے بجائے ہم نے دوسرے طریق کار کو ترجیح دی ہے۔ جس کی رو سے لوگ ترقی کے کاموں کے لئے اپنے دل کی مرضی سے جو کچھ دیں۔ اسی کے مطابق تخمینے مرتب کئے جائیں۔

"فرد کی آزادی" کا جو مفہوم ان حضرات نے سمجھ رکھا ہے اس کے احساس سے ہمیں نہ صرف تاسف بلکہ سخت صدمہ ہوا۔ چار آدمی پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر رہے ہیں ایک شخص کے پاس پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ ہے جس میں سے وہ صرف ایک چلو بھر پانی اپنی مرضی سے دینے کو تیار ہے۔ ان حضرات کے نزدیک "فرد کی آزادی" کا تقاضا یہ ہے کہ ان چار انسانوں کو العطش العطش کہتے ہوئے ہلاک ہونے دیا جائے لیکن اس کا وہ مشکیزہ زبردستی نہ لیا جائے۔ باقی رہا "جمہوری انداز حکومت" کا تقاضا سو اس ضمن میں ہمیں انگریزی کی یہ مثل یاد آگئی کہ (MORE LOYAL THAN THE KING : یعنی خود بادشاہ سے بڑھ کر بادشاہ کا وفادار)

ہم نے جمہوری انداز حکومت اہل مغرب (بالخصوص انگریزوں) سے سیکھا ہے گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد جنگ کے خلا کو پورا کرنے کے لئے انگریزوں نے اپنے ملک کے افراد پر جس جس قسم کی پابندیاں لگائیں اور ان کے معیار زندگی کو جس حد تک ۔۔۔ ہر وہ شخص باخبر ہے جس نے ان تفصیلات کا مطالعہ کیا ہے یا جس نے اس زمانہ میں اس ملک کو ایک نظر دیکھا ہے ملک میں ۔۔۔ [illegible]

یا چاکلیٹ کے ایک ٹکڑے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ ٹیکسوں کا یہ عالم تھا کہ ایک روسی تنقید نگار کے الفاظ میں ایک ٹیکس دہندہ ٹیکس افسر سے درخواست کرتا تھا کہ میری ساری آمدنی آپ لے لیجئے اور اس میں سے انکم ٹیکس آپ مجھے دے دیجئے۔ اس لئے مختلف ٹیکسوں کی مجموعی تعداد بعض حالات میں متعلقہ آمدنی کے اسی فیصدی تک پہنچ جاتی تھی اور ٹیکس مرنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ ان تمام قانونی پابندیوں سے نہ تو ان لوگوں کی انفرادی آزادی پر کوئی حرف آیا اور نہ ہی جمہوریت میں کوئی جھول پڑا۔ ہمارے ملک کے حالات کسی طرح بھی ان حالات سے کم شدید اور نازک نہیں جو حالات جنگ یا جنگ کے بعد ان ممالک میں رونما ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم گذشتہ آٹھ سال سے ایک سرد جنگ (COLD WAR) کی حالت سے گذر رہے ہیں۔ ان حالات کو سدھارنے کے لئے ملک کے سرمایہ دار طبقہ نے مطلب خاطر جو کچھ کیا ہے اس سے کون بے خبر ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے ارباب حل و عقد کا ارشاد ہے کہ ان لوگوں سے زبردستی کچھ نہ لیا جائے کیونکہ یہ جمہوریت کے منافی ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ اگر یہ ذہنیت اسی طرح کارفرما رہی اور کل جنگ چھڑ جانے کی صورت میں ہمیں جبری بھرتی (CONSCRIPTION) کی ضرورت پیش آئی تو یہ حضرات کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ یہ اقدام فرد کی آزادی کے منافی ہے۔ اگر فرد کی آزادی کا مفہوم یہی ہے تو ہم ان حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ لوگوں سے انکم ٹیکس کیوں وصول کیا جاتا ہے۔ جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ (باستثنائے چند) کوئی شخص دل کی رضامندی سے انکم ٹیکس ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اور ہزار قسم کے حیلوں بہانوں سے اس سے بچ نکلنے کی راہیں تراشتے رہتا ہے۔ اس حد تک تو ان حضرات کے نزدیک انفرادی آزادی پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ لیکن اگر اس سے ایک قدم اور آگے بڑھنے کی نوبت آئے تو پھر فرد کی آزادی بھی سلب ہو جاتی ہے اور جمہوری انداز کا حلیہ بھی بگڑ جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس قسم کی ذہنیت عام طور پر کن تاثرات کی غمازی کرتی ہے؟ مغرب کی جمہوری حکومتوں نے روس کے خلاف جو پروپیگنڈہ کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم لوگ ان پابندیوں کو جمہوری سمجھتے ہیں جنہیں یہ مغربی ممالک جائز قرار دیں اور اس سے ایک قدم آگے بڑھنے کو ڈکٹیٹرشپ سمجھ لیتے ہیں حالت تو بلکہ یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ملک میں کوئی بھوکا ننگا نہیں رہنا چاہیئے تو اس کے متعلق اس طرح کنکھیوں سے اشارے ہونے لگ جاتے ہیں گویا وہ روس کا ایجنٹ ہو۔ ضرورت ہے کہ ہم اس قسم کی ذہنیت کو اپنے قلب و دماغ سے جھاڑ کر نکال دیں اور ہر معاملہ کا فیصلہ آزادانہ طور پر کریں۔ اسلام فرد کی آزادی اور احترام انسانیت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ وہ معاشرہ کو فرد کی ذات کی نشوونما کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کرتا کہ معاشرہ فرد کے تحفظ و بقا کے لئے جو کچھ کرے گا وہ انہیں وسائل و ذرائع سے کریگا جنہیں وہ افراد سے حاصل کرے گا۔ اس مقصد کے لئے وہ افراد کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کرتا ہے کہ ہر فرد دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتا ہے۔ اس قسم کے معاشرہ میں افراد سے کچھ لینے کے لئے کسی قسم کی زبردستی کی ضرورت ہی نہیں پڑتی لیکن جس معاشرہ کی حالت یہ ہو کہ

ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

تو وہاں یہ کہنا کہ بھیڑیوں کو قانونی سلاسل کا پابند کرنا ان کی انفرادی آزادی کے منافی ہے معاشرے کو درندگی کی آماجگاہ بنا دینا اور کیا ہے۔ بنابریں پاکستان کو تباہی اور بربادی سے بچانے کیلئے ہر فرد سے وہ کچھ لے لینا جو اس کی جائز ضروریات سے زیادہ ہو انفرادی

آزادی کے منافی قرار نہیں پاسکتا۔ ان افراد سے یہ کچھ لے لینا درحقیقت خود ان کی اور ان کی نسلوں کی حفاظت کے لئے ہے۔ اس میں دیکھنا یہ چاہیئے کہ قوم سے یہ کچھ لینے والے ارباب نظم ونسق اسے قوم کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کریں۔ اپنے مفاد اور اقتدار کے لئے غصب کرلیں اور کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی چاہیئے کہ اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت صحیح قرآنی خطوط پر کریں تاکہ وہ اپنے معاشرہ ہی کی نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے اپنا سب کچھ وقف کردیں۔ یہ وہ جماعت مومنین ہوگی جن سے کچھ بھی زبردستی لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ (از ایک طرف) وہ اپنے سر کو بھی ہتھیلی پہ لئے لئے پھریں گے کہ وہ کس طرح انسانیت کی فوز و فلاح کے کام آسکتے ہیں۔ اسلام جس معاشرہ کا تصور پیش کرتا ہے وہ کمیونزم سے کہیں آگے اور بلند ہے اسلئے ہمیں اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے اس احساس سے شرمانا نہیں چاہیئے کہ مغربی جمہوریتیں ہمارے متعلق کیا کہیں گی۔ یہ لوگ اسلام کی، اخوت و مساوات کی تعلیم کو جان بوجھ کر کمیونزم قرار دیتے ہیں، تاکہ مسلمان اپنے ہاں وہ قرآنی معاشرہ قائم نہ کرلیں جو سرمایہ داری کی حرکات دے۔ یہ روش کچھ عصر حاضر کی اقوام ہی کا شیوہ نہیں بلکہ خود نبی اکرمؐ کے زمانہ میں بھی دیا جاتا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے جاوید نامہ میں لکھا ہے کہ ابوجہل کعبہ کا غلاف تھام کر اپنے خداؤں سے نوحہ کرتا تھا کہ

این مساوات، این مواخات اعجمی است   خوب می دانم کہ سلماں مزدکی است

لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ نہ مزدکیت اسلام تھی اور نہ کمیونزم اسلام ہے کیونکہ کمیونزم جن بنیادوں پر قائم ہے ان کی رو سے ایک مسلمان کمیونسٹ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اسلام مساوات نہیں سکھاتا۔

اس ضمن میں ایک اور بات بھی ہمارے سامنے آتی ہے جس کا تذکرہ اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ محترم زاہد حسین صاحب نے اپنی اس تقریر میں جس کا حوالہ اوپر دیا جاچکا ہے یہ بھی فرمایا کہ

"میں سمجھتا ہوں کہ اسلام اس عدم مساوات کو تسلیم کرتا ہے جس کی بنیاد جوہر ذاتی (MERIT) پر ہو جیسا کہ قرآن نے کہا ہے کہ خدا نے بعض انسانوں کو دوسروں پر فضیلت دی ہے۔ میرے خیال میں کسی نظام معاشرہ کے متحرک اور ذی قوت ہونے کے لئے اس قسم کی عدم مساوات ضروری ہے لیکن اس اختلاف اور تفاوت کو معقول حدود کے تابع رہنا چاہیئے وہ عدم مساوات جو غیر معاشرتی رسوم و مسالک کی پیدا کردہ ہو یا جو اس وجہ سے پیدا ہو کہ مختلف افراد کو یکساں مواقع نہیں ملتے تھے یا وہ عدم مساوات جو معاشرہ کی ضروریات سے زیادہ ہو یا اس کے خلاف جائے وہ ناجائز بھی ہے اور نقصان رساں بھی"۔ (پاکستان ٹائمز ۳ جون ۱۹۵۶ء)

اس ضمن میں گذارش ہے کہ قرآن مختلف افراد میں اکتساب رزق کی استعداد کے فرق کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ اس فرق کو نہ تو معاشرہ میں کسی عزت و تکریم کا موجب قرار دیتا ہے اور نہ ہی افراد کو اس زائد کمائی کا مالک۔ جہاں تک معاشرہ میں عزت اور تکریم کا تعلق ہے وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ قانون کی رو سے وہ فرد سب سے زیادہ واجب التکریم ہے جو سب سے زیادہ قانون خداوندی کی اطاعت اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقکم باقی رہا استعداد کے فرق کی بنا پر کمائی میں فرق تو اس کے متعلق قرآن کی پوری آیت (جس کے صرف ابتدائی چند الفاظ زاہد حسین صاحب نے اپنی تقریر میں پیش کئے ہیں) یوں ہے۔

وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ أَفَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ (۱۶/۷۱)

مختلف افراد میں رزق پیدا کرنے کی استعداد کا فرق خدا کی طرف سے ہے (یعنی اپنا پیدا کردہ نہیں) جس کی وجہ سے مختلف لوگوں کے حصول (فضل) میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن جن لوگوں کو اس طرح معاشی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے وہ اس زائد پیداوار کو ان لوگوں کی طرف نہیں لوٹاتے جو اپنی کم استعداد کی وجہ سے ان لوگوں کی زیر نگرانی کام کرتے ہیں۔ وہ ایسا اس لئے نہیں کرتے کہ ان کا ذہن اس تصور کو قبول نہیں کرتا کہ اس طرح معاشرہ میں سب برابر ہو جائیں۔ یہ ذہنیت درحقیقت خدا کی طرف سے دی ہوئی نعمتوں سے انکار کرنا ہے۔

اس وقت اس حقیقت کی تشریح کی گنجائش نہیں کہ قرآن نے یہ کہہ کر کہ یہ لوگ اپنی زائد کمائی کو دوسروں کی طرف نہ لوٹا کر خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے انکار کرتے ہیں۔ اس طرح اس کے خلاف محاذ جنگ قائم کر لیتے ہیں کس قدر عظیم اتفاقی حقیقت (FACTUAL REALITY) کا اعلان کیا ہے۔ چنانچہ اس سے کچھ ہی پہلے کہا گیا ہے کہ جب نظام سرمایہ داری کے نمائندہ، قارون سے کہا گیا کہ وہ ضرورت سے زائد رزق کو اپنی ملکیت کیوں سمجھتا ہے تو اس نے کہا کہ میں ایسا کیوں نہ سمجھوں؟ مجھ میں کمانے کی استعداد زیادہ ہے اس لئے میں نے زیادہ کما لیا ہے یعنی یہ سب کچھ مجھے اپنی ہنرمندی سے ملا ہے (قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِي) (۲۸/۷۸) یہی کچھ ہر سرمایہ دار کہتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہی ذہنیت درحقیقت اس تمام فتنہ و فساد کی جڑ ہے (بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ) لیکن مشکل یہ ہے کہ اکثر لوگ اس حقیقت کو جانتے نہیں (وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ) (۳۹/۴۹) کسی انسان کا ذہین ہونا اس کی اپنی پیدا کردہ خوبی نہیں یہ خوبی خدا کی عطا کردہ ہے لہٰذا اس خوبی کی بنا پر جو کچھ زائد حاصل ہوا اسے اپنی ذاتی ملکیت سمجھ لینا خدا کی عطا کردہ نعمت سے انکار اور خدا کے خلاف جنگ ہے۔ بہرحال یہ بات ضمناً سامنے آ گئی تھی جس کا بیان کرنا ضروری سمجھا گیا۔ (ان امور کی تفسیر ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "نظام ربوبیت" میں ملے گی)

ہونا کیا چاہیئے؟

ہمارے نزدیک ایک اسلامی جمہوریہ کے لئے پلان مرتب کرنے کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس جمہوریہ کے فرائض اور ذمہ داریاں کیا ہیں۔ قرآن کی رو سے ایک ایسے نظام مملکت کے فرائض جو اپنے آپ کو خدا کے نام پر قائم کرتا ہے یہ ہیں کہ

(۱) اس مملکت میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریات زندگی (روٹی۔ کپڑا۔ مکان وغیرہ) سے محروم نہ رہے۔

(۲) ہر فرد کی صلاحیتوں کی پوری پوری نشوونما کیلئے ضروری اسباب مہیا کئے جائیں۔ تاکہ کسی فرد کی کوئی استعداد دبی ہوئی نہ رہ جائے۔

(۳) افراد معاشرہ کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کیا جائے کہ ہر فرد نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے اپنا سب کچھ دے دینے کو اپنی زندگی کا فریضہ سمجھے۔

(۴) تمام افراد معاشرہ کو پورا پورا انصاف ملے اور بلا قیمت ملے۔

یہ ہیں ایک اسلامی مملکت کی ذمہ داریاں۔ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داریاں پوری نہیں ہو سکتیں جب تک رزق کے سرچشمے اس مملکت کی تحویل میں نہ ہوں جو اس نظام کے قیام کے لئے وجود میں آتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ایک دن میں نہیں ہو سکتا۔ یہ منزل بہ منزل ہوگا۔ اس کے لئے بہترین طریق پلاننگ ہے۔ یعنی جو کچھ کرنا مقصود ہے اس کی ایک تفصیلی فہرست مرتب کی جائے۔ پھر اسے تین تین سال یا پانچ پانچ سال کے حصوں میں

بانٹ لیا جائے۔ اور یہ متعین کر لیا جائے کہ پہلے تین (یا پانچ) سال میں ہمیں کہاں تک پہنچنا ہے۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوگا کہ اس پروگرام کو عمل میں کون لائے۔ ایک ناپختہ قوم میں مغربی انداز جمہوریت جو گل کھلاتی ہے۔ اس کا تماشہ ہم نو برس میں دیکھ چکے ہیں۔ اس لئے اس طریق عمل کو مسلسل قائم رکھنا حماقت ہوگا۔ اسے بہرحال بدلنا ہوگا۔ جتنی جلدی اسے بدل لیا جائے اچھا ہوگا۔ ہمارے نزدیک بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ

(۱) ہم اپنے پلان کو مکمل شکل میں مرتب کر کے اس کا تعین کر دیں کہ ہم نے پہلے تین (یا پانچ) سال میں کہاں تک پہنچنا ہے اس کے بعد ملک کر دیا جائے کہ جو لوگ اپنے اندر اس تین (یا پانچ) سالہ پروگرام کی تکمیل کی ہمت اور صلاحیت پاتے ہوں وہ رئیس مملکت کے منصب کے لئے اپنا

(۲) ان امیدواروں میں سے ایک کو عام انتخاب کے ذریعہ بطور رئیس مملکت چن لیا جائے اور اسے کلی اختیارات دیدیئے جائیں کہ وہ اپنے لئے وزیر، مشیر اور دیگر رفقائے کار خود مقرر کرے۔ کسی کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوگا۔

(۳) وہ اپنے ان رفقاء کی مدد سے جس طرح چاہے اس پروگرام کی عملی تشکیل کرتا جائے۔ تین (یا پانچ) سال کے بعد عام انتخابات نہ ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو اس امر کا جائزہ لے کہ وہ پروگرام اپنی متعین منزل تک پہنچ چکا ہے یا نہیں اگر پہنچ چکا ہو تو ہو المراد۔ اگر کمیشن کہ مملکت کے تساہل، تغافل یا بددیانتی کی وجہ سے پروگرام کی تکمیل نہیں ہو سکی تو پھر اسے سزائے موت نہیں تو کم از کم عمر بھر کیلئے قید کی

(۴) اس کے بعد اگلی منزل کے لئے پھر اسی طریق کار کو دہرایا جائے۔

ہمارے نزدیک بحالات موجودہ یہی طریق کار نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی بات غیر اسلامی بھی نہیں۔

بزم ہائے طلوع اسلام

سے جون سنہ ۱۹۵۶ء کے پرچہ میں استدعا کی گئی تھی کہ محترم پرویز صاحب نے دوران سفر لاہور، سیالکوٹ اور راولپنڈی کے اجتماعات میں کی تھیں۔ ان کا ملخص ایک مسلسل اور مربوط تقریر کی شکل میں بصورت پمفلٹ

"معاشی مسئلہ کا قرآنی حل"

کے عنوان سے علیحدہ شائع کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا اہتمام بزم ہائے طلوع اسلام بہت جلد مطلع فرمائیں کہ انھیں اس پمفلٹ کی کس مطلوب ہیں۔ بعض لوگوں کے جوابات موصول بھی ہو چکے ہیں۔ پمفلٹ اب چھپ کر تیار ہے۔ بزم ہائے طلوع اسلام سے ان کہ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق یہ پمفلٹ فوراً طلب فرمالیں۔ یہ پمفلٹ ۲۰×۳۰ سائز میں سفید کاغذ پر چھپا ہے۔ ضخامت ۱۶ صفحات قیمت فی کاپی صرف ایک آنہ ہے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم اداره طلوع اسلام

اسکیم پیشگی خریداران ادارۂ طلوع اسلام

...ہت ۱۹۵۳ء میں نافذ کی گئی تھی۔ اسکیم میں قارئین طلوع اسلام سے اپیل کی گئی تھی کہ چونکہ طلوع اسلام کی آواز بہت محدود ہے اور زمانے
...ضرورت ہے کہ اسے دور دور تک پھیلایا جائے۔ اور اس کام کو ادارہ تنہا سرانجام نہیں دے سکتا۔ اس لئے آپ کی معاونت کی ضرورت ہے
...معاونت کی شکل یہ ہے کہ آپ

پیشگی خریداران کے حلقے میں

...ل ہو جائیں۔ یعنی آپ ایک سو روپیہ دیکمشت یا چار ماہانہ اقساط میں ادا فرما دیں اس کے معاوضہ میں رسالہ طلوع اسلام اور ادارہ کی
...وعات اس وقت تک آپ کو ملتی رہیں گی جب تک آپ کی یہ رقم پوری نہ ہو جائے۔ قارئین طلوع اسلام نے سے کچھ حضرات نے ہماری آواز
...یک کہا اور ان کی معاونت سے قرآنی نظام ربوبیت سے متعلق بہت سا لٹریچر اب تک شائع اور ملک کے اطراف و جوانب میں پھیلایا جا چکا
...لیکن یہ سلسلہ ختم نہیں ہو گیا ہے۔ مفہوم القرآن اور لغات القرآن جیسی کئی اہم اور ضخیم کتابوں کی اشاعت کا سوال ادارہ کے پیش نظر ہے
...تے ہوئے

ہمیں بڑی ہی مسرت ہوتی ہے

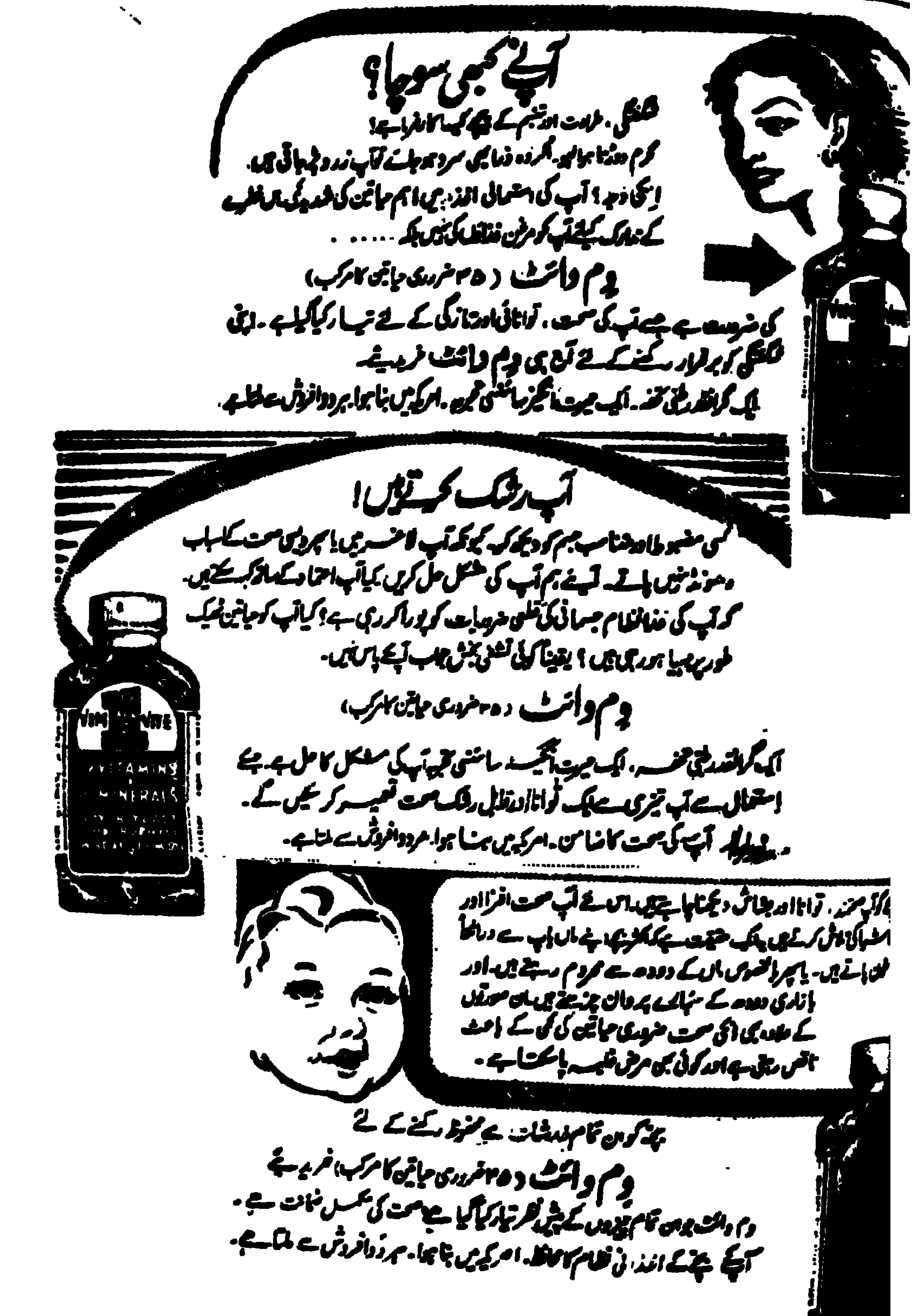
...ی یہ اسکیم اس حیثیت سے بہت کامیاب رہی کہ بیشتر پیشگی خریداران کی وصول شدہ رقم ادا ہو چکی ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۵۵ء کے حسابات
...شوارے تمام خریداران کی خدمت میں بھیجے جا چکے ہیں اور ۵۶ء کا خرچ شامل کرنے کے بعد بعض خریداران کے کھاتہ میں رقم ختم ہو گئی ہے اور
...کے کھاتہ میں رقم موصولہ سے زیادہ خرچ ہو چکا ہے۔ ان تمام حضرات سے تجدید رقم کی درخواست کی جا چکی ہے کہ انہیں مزید

ایک سو روپے جلد از جلد بھیج دینے چاہئیں

...نی لٹریچر کی اشاعت کا یہ سلسلہ جاری رکھا جا سکے اور ادارہ نے جو قدم اٹھایا ہے وہ مسلسل آگے بڑھتا رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ
...تے ہیں افسوس ہے کہ ہماری یہ اسکیم اب تک اتنی عام نہیں ہو سکی جس قدر ہماری خواہش تھی اس لئے اس سلسلے میں مزید کوشش کرنے
...ورت ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ حضرات اس اسکیم میں شریک ہو سکیں۔ یاد رکھیئے! اس سلسلہ میں جتنی زیادہ سے زیادہ آپ ہماری معاونت
...گے۔ اتنا ہی زیادہ سے زیادہ ہم آگے قدم بڑھانے کے قابل ہو سکیں گے۔ ہم اپنے مقدور کے مطابق کوشش کر رہے ہیں آپ اپنے
...کے مطابق ہمارا ساتھ دیجئے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ ہمیں مایوس نہیں کریں گے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام ۳/۱۵۹- ایل- پی- ای- سی- ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۲۹


چھوٹا مسواک ٹوتھ برش
دانتوں کی صفائی بچوں کو صحت مند اور توانا رکھتی ہے
چھوٹے بچوں کے لئے چھوٹا مسواک
نایاب تحفہ ہے
جو نرم و نازک مسوڑوں کے لئے بے ضرر ہے اور
جس کا استعمال بچوں کیلئے مفید


آپ نے کبھی سوچا؟
شگفتگی، طراوت اور تبسم کے لئے کیا کیا فرمایا ہے!
گرم دن ڈھلتا ہوا ہو۔ اگر وہ فضا بھی سرد ہو جائے تو آپ زرد پڑ جاتی ہیں۔
اس کی وجہ؟ آپ کی استعمالی اغذیہ میں اہم حیاتین کی قلت۔ اس کے تدارک کیلئے آپ کو صرف غذا کی نہیں بلکہ .....
وٹم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب)
کی ضرورت ہے جسے آپ کی صحت، توانائی اور تازگی کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اپنی شگفتگی کو برقرار رکھنے کے لئے آج ہی وٹم وائٹ خریدیئے
ایک گرانقدر طبی تحفہ۔ ایک حیرت انگیز سائنسی تجربہ۔ امریکہ میں بنا ہوا۔ ہر دوافروش سے ملتا ہے۔
آپ رشک کرتے ہیں!
کسی مضبوط اور متناسب جسم کو دیکھ کر۔ کیونکہ آپ لاغر ہیں یا پھر اس کی صحت کے اسباب ڈھونڈ نہیں پاتے۔ لیجئے ہم آپ کی مشکل حل کریں۔ کیا آپ اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی غذا نظام جسمانی کی قطعی ضروریات کو پورا کر رہی ہے؟ کیا آپ کو حیاتین ٹھیک طور پر مہیا ہو رہی ہیں؟ یقیناً کوئی تشفی بخش جواب آپ کے پاس نہیں۔
وٹم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب)
ایک گرانقدر طبی تحفہ، ایک حیرت انگیز سائنسی تجربہ آپ کی مشکل کا حل ہے۔ جسے استعمال سے آپ تیزی سے ایک توانا اور قابل رشک صحت تعمیر کر سکیں گے۔
آپ کی صحت کا ضامن۔ امریکہ میں بنا ہوا۔ ہر دوافروش سے ملتا ہے۔
VIM VITE
VITAMINS
MINERALS
اگر آپ تندرست، توانا اور بشاش دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے آپ صحت افزا اور اشیا کی تلاش کرتے ہیں لیکن حقیقت ہے کہ اکثر بچے ماں باپ سے ورثہ میں پاتے ہیں۔ یا پھر بالخصوص ماں کے دودھ سے محروم رہتے ہیں۔ اور بازاری دودھ کے سہارے پروان چڑھتے ہیں ان صورتوں کے علاوہ بھی اکثر صحت ضروری حیاتین کی کمی کے باعث ناقص رہتی ہے اور کوئی بھی مرض غلبہ پا سکتا ہے۔
بچے کو ان تمام خدشات سے محفوظ رکھنے کے لئے
وٹم وائٹ (۲۵ ضروری حیاتین کا مرکب) خریدیئے
وٹم وائٹ جو ان تمام چیزوں کے پیش نظر تیار کیا گیا ہے صحت کی مکمل ضمانت ہے۔
آپ کے بچے کے اندرونی نظام کا محافظ۔ امریکہ میں بنا ہوا۔ ہر دوافروش سے ملتا ہے۔


DURA-GLOSS
Nail Polish
MADE IN U.S.A.
ڈوراجلوس
ناخنوں کی پالش
تزئینِ حسن کے لئے
ناخنوں کی آرائش ضروری ہے
ڈوراجلوس
خوش رنگ۔ دیدہ زیب۔ چمکدار اور
پائیدار پالش ہے۔
ہر اچھے دوکاندار سے ملتی ہے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

کراچی

ل اشتراک: ہند و پاکستان سے سالانہ
ھ روپے: غیر ممالک سے ۱۴ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہند و پاکستان سے
بارہ آنے

ٹیلیفون نمبر: ۴۱۴۹۸
خط و کتابت کا پتہ: ۱۵۹/۳ - ایل-پی-ای سی
اؤسنگ سوسائٹی کراچی نمبر ۲۹

جلد ۱۰ | جنوری سنہ ۱۹۵۷ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

نغمۂ محمدؐ

علامہ اقبال کے پیام مشرق میں "جوئے آب" کے عنوان سے ایک نظم شامل ہے جس کے نیچے حسب ذیل نوٹ شائع ہوا ہے:

"جوئے آب" گوئٹے کی مشہور نظم موسومہ بہ "نغمۂ محمدؐ" کا ایک نہایت آزاد ترجمہ ہے۔ اس نظم میں جو دیوانِ مغربی سے بہت پہلے لکھی گئی تھی، المانی شاعر نے زندگی کے اسلامی تخیل کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ اصل میں یہ ایک مجوزہ اسلامی ڈرامے کا جزو تھی جس کی تکمیل اُس سے نہ ہو سکی۔ اس ترجمے سے صرف گوئٹے کا نقطۂ نگاہ دکھانا مقصود ہے۔

جی چاہتا تھا کہ گوئٹے کی اس نظم کی اصل مل جائے تو کسی جرمن زبان جاننے والے سے اس کا لفظی ترجمہ سنا جائے۔ بار (دہلی) پروفیسر محمد مجیب صاحب نے اس نظم کا ترجمہ اخبار مدینہ (بجنور) میں شائع کرایا ہے جسے ہم جریدہ مذکور کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل کرتے ہیں۔ عنوان ہے: "محمدؐ کا گیت":

"اُس چشمے کو دیکھو جو ستاروں کی کرنوں کی طرح ہنستا ہوا صاف شفاف چٹانوں سے نکلا، بچپن میں اسے قدسیوں نے دنیا میں پالا جو بادلوں سے پرے ہے۔ شباب کی تازگی اور جوش لئے ہوئے وہ ایک خرام ناز کے ساتھ بادلوں سے نکل کر اور چٹانوں کے بیچ میں سے جھاڑیوں سے گزر کر مرمریں چٹانوں پر گرتا ہے اور پھر مسرت کے نعرے لگاتا ہوا آسمان کی طرف اُچھلتا ہے۔

وہ چوٹیوں کے درمیان دروں میں سے ایک رنگین پتھر سے دوسرے کی طرف لپکتا ہے۔ اس کے قدم کو شرع ہی کی صنعت عطا ہوئی ہے اور وہ اپنے بھائی بندوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔

نیچے وادی میں جہاں اس کا قدم پڑتا ہے پھول کھلنے لگتے ہیں اور اس کے دم سے سبزہ زار میں جان پڑ جاتی ہے۔ اُسے نہ سایہ دار وادی روک سکتی ہے نہ وہ پھول جو اُس کے گھٹنوں سے لپٹ لپٹ کر محبت بھری آنکھوں کی خوشامد کرتے ہیں۔ اس کا بہاؤ اسے میدان کی طرف چکر دیتا ہوا لے جاتا ہے۔

چھوٹے چشمے اس کے دامن سے لپٹ کر چلتے ہیں۔ اب وہ چاندی کی طرح چمکتا ہوا میدان میں پہنچا ہے اور میدان اس کی آب و تاب سے چمک اٹھتا ہے۔ اب میدان کے دریا اور پہاڑوں کے چشمے پکار پکار کر کہتے ہیں:

"بھائی! اے بھائی! ہمیں بھی اپنے رب کے پاس لئے چل۔ ہمیں بھی بے پایاں سمندر کی گود میں پہنچا دے۔ وہ ہمارے

ہاتھ پھیلائے ہے۔ اور افسوس، ہم اس کے مشتاق اس کی گود تک پہونچ نہیں پاتے۔ ہمیں ریگستانوں کی پیاسی ریت سوکھے لیتی ہے۔ اوپر سے سورج ہمارا خون چوسے لیتا ہے۔ کوئی پہاڑی راستہ روک کر ہمیں تالاب بنا دیتی ہے۔
اے بھائی، اپنے میدان والے بھائیوں کو، اپنے پہاڑ والے بھائیوں کو اپنے ساتھ اپنے رب کے پاس لئے چل"۔
"آؤ سب کے سب آؤ ——— اب وہ بڑی شان سے موجیں مارتا بڑھتا ہے۔ ساری قوم اپنے بادشاہ کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے چلتی ہے اور فتح کے ریلے میں وہ ملکوں پر اپنا سکہ بٹھاتا جاتا ہے، جہاں اس کا پیر پڑتا ہے شہر آباد ہو جاتے ہیں۔
اُس کا بہاؤ کسی کے روکے نہیں رکتا، وہ زور شور سے میناروں کی چمکتی چوٹیوں، مرمریں عمارتوں کو پیچھے چھوڑ کر تخلیق کے جوش میں آگے بڑھا چلا جاتا ہے، گویا اطلس ایک دنیا کو کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے۔ اس کے سر پر ہزاروں جھنڈے لہراتے اور سرسراتے ہیں، اور یہ سب اس کی شان و شوکت کے نشان ہیں۔
اس طرح وہ اپنے بھائیوں، اپنے عزیزوں، اپنے بچوں کو اُن کے رب کے پاس، جو ان کے انتظار میں تھا، پہنچا دیتا ہے اور وہ انھیں مسرت کے جوش میں گلے لگا لیتا ہے"۔
پاکیزہ ہیں یہ خیالات اور کیسی بلند پایہ ہے یہ نعت۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظی ترجمہ کے ساتھ علامہ اقبال کا منظوم ترجمہ سامنے آجائے۔ وہو ہذا۔

جوئے آب

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ می رود — مانند کہکشاں بگریبانِ مرغزار
درخوابِ ناز بود بہ گہوارۂ سحاب — واکرد چشمِ شوق بآغوشِ کوہسار
از سنگریزہ نغمہ کشاید خرامِ او — سیمائے او چو آئینہ بے رنگ و بے غبار

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
درخود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

در راہِ او بہار پریخانہ آفرید — نرگس دمید و لالہ دمید و سمن دمید
گل عشوہ داد و گفت یکے پیشِ ما بایست — خندید غنچہ و سرِ دامانِ او کشید
ناآشنائے جلوہ فروشانِ سبز پوش — صحرا برید و سینۂ کوہ و کمر درید

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
درخود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

صد جتے دشت و مرغ دکستان و باغ و راغ گفتند اے بسیط زمیں با تو سازگار
ما کہ راہ از تنک آبی نہ بردہ ایم از دستبردِ ریگِ بیاباں نگاہ دار
وا کردہ سینہ را بہ ہوا ہائے شرق و غرب در بر گرفتہ ہمسفراں زبون و زار

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
باصد ہزار گوہرِ یک دانہ می رود

دریائے پُر خروش! ز بند و شکن گذشت از تنگنائے وادی و کوہ و دمن گذشت
یکساں چو سیل کردہ نشیب و فراز را از کاخِ شاہ و بارہ و کشت و چمن گذشت
بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بیقرار در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گذشت

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

کتنا حسین اور دلکش ہے یہ منظوم ترجمہ۔ شاہاں بہ شاہاں می دہند اسی کو کہتے ہیں۔

طلوعِ اسلام اس سالِ نَو کا آغاز اسی کہکشانی مقدس یادگار سے کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان جو جی میں آئے منزلِ مقصود تک صرف وہی راستہ پہنچا سکے گا جس پر محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے نقوشِ قدم درخشندہ ستاروں کی طرح جگ مگ جگ مگ کر رہے ہیں۔

منزل ملی۔ مقام ملا۔ مدعا ملا
سب کچھ مجھے ملا جو ترا نقشِ پا ملا

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان نقوش کو اپنے دامن میں اس طرح محفوظ کر رکھا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اگر کسی معاشرہ میں ہر طرف فسادہی فساد رونما ہو جائے اور کوئی شے اپنی اصلی حالت پر نہ رہے تو اس کا لازمی نتیجہ عالمگیر مایوسی ہوتا ہے۔ مایوسی کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو سوجھتا نہیں کہ ان حالات کو سدھارنے کیلئے کیا کیا جائے۔ ساری قوم ایکدوسرے کو مورد الزام قرار دینے میں مصروف رہتی ہے۔ ہر شخص ان بگڑے ہوئے حالات کا شکوہ سنج ہوتا ہے اور دوسروں کو اس کا ذمہ دار قرار دیکر مطمئن ہو جاتا ہے کہ میں اپنے فریضہ سے سبکدوش ہو گیا۔ لیڈر اپنی تقریریں قوم کو کوستے ہیں کہ وہ کچھ نہیں کرتی اور قوم لیڈروں کو مطعون کرتی رہتی ہے کہ وہ بالکل نکمے اور بے ایمان ہیں۔ قرآن نے جہنم میں عوام اور لیڈروں کی باہمی گفتگو کا ذکر کیا ہے جو اسی حقیقت کی ترجمان ہے۔ یَقُولُ الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا لِلَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا لَوْلَا أَنتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ۔ جو کمزور تھے وہ اپنے بڑوں سے جو متکبر تھے کہیں گے کہ (تم نے ہمارا بھی بیڑا غرق کیا) اگر تم نہ ہوتے تو ہم یقیناً سچائی کو ماننے والے ہوتے ہم غلط راستے پر نہ چلتے۔ اسکے جواب میں لیڈر کہیں گے کہ أَنَحْنُ صَدَدْنَاكُمْ عَنِ الْهُدَىٰ بَعْدَ إِذْ جَاءَكُم بَلْ كُنتُم مُّجْرِمِينَ تم کیا کہتے ہو؟ کیا ہم نے تمہیں روکا تھا کہ جو سچی راہنمائی تمہارے پاس آچکی ہے اسے قبول نہ کرو؟ کیوں خواہ مخواہ الزام ہمارے سر دھرتے ہو تم خود مجرم تھے اور اب ہمیں اس کا ذمہ دار ٹھہراتے ہو۔ وہ جواب میں کہیں گے کہ تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ بَلْ مَكْرُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِذْ تَأْمُرُونَنَا أَن نَّكْفُرَ بِاللَّهِ وَنَجْعَلَ لَهُ أَندَادًا (۳۴/۳۱-۳۳) تم دن رات اس قسم کی سازشیں اور تدبیریں کرتے رہتے تھے اور ایسے احکام مدون اور نافذ کیا کرتے تھے جن سے ہم خدا کے قانون سے انکار کر کے انسانوں کے خودساختہ قوانین کو ان کے ساتھ ملا دیں۔ اسلئے بتاؤ کہ اس جہنم کے ذمہ دار ہم ہیں یا آپ؟ اسی طرح دوسرے مقام پر ہے کہ عوام کہیں گے کہ رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا۔ اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے مذہبی پیشواؤں اور سیاسی لیڈروں کی اطاعت کی۔ سو انہوں نے ہمیں راستے سے گمراہ کر دیا۔ رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا (۳۳/۶۷-۶۸) اے ہمارے پروردگار! تو انہیں دگنا عذاب دیجیو۔ اور انہیں زندگی کی خوشگواریوں سے بالکل محروم رکھیو۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآن قوموں کی تباہی کے لئے بنیادی طور پر ان کے لیڈروں ہی کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا۔ جنہیں اللہ نے اس قدر نعمتوں سے نوازا لیکن انہوں نے ان کی قدر نہ کی۔ جس کے ہاتھوں میں جو کچھ آیا دبا کر بیٹھ گیا۔ اور اس طرح وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ

انھوں نے اپنی قوم کے کاروان کو تباہی اور بربادی کی منزل میں جا اتارا جَهَنَّمَ یعنی جہنم میں۔ یَصْلَوْنَهَا اور خود بھی اسی جہنم پر وَبِئْسَ الْقَرَارُ۔ اور وہ کیسا برا ٹھکانہ ہے۔ اس کے بعد اسی الزام کو دہرایا گیا ہے جو عوام ان پر عائد کرتے تھے یعنی وَجَعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِیُضِلُّوْا عَنْ سَبِیْلِهٖ (۲/۱۴-۳۰) یہ لوگ قوانین خداوندی کے ساتھ اپنے (اور دوسروں کے) خود ساختہ قوانین کرتے تھے تاکہ لوگوں کو خدا کے راستے سے گمراہ کریں۔ اسی لئے کہا کہ یہ لوگ اپنے جرائم کا بھی خمیازہ بھگتیں گے اور ان لوگوں میں سے بعض کا خمیازہ بھی جنھیں یہ گمراہ کیا کرتے تھے (۱۶/۲۵)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ اس سے یہ عوام سے نہیں نکل سکیں گے۔ انھیں اس کی حسرت ہی رہے گی کہ انھوں نے ان لیڈروں سے قطع تعلق کر کے صحیح راستہ کیوں نہیں کیا تھا؟ (۲/۱۶۶-۱۶۷)

عوام اور لیڈروں کی باہمی الزام دہی کے علاوہ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ ہر نسل (عصر یا زمانہ) کے لوگ اپنی تباہی کے لئے ان لوگوں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں جو ان سے پہلے ہو گذرے تھے۔ وہ ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے پہلوں نے یہ کچھ کیا اس کی پاداش میں جہنم میں گل سڑ رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ان کی یہ عذر تراشیاں بے بنیاد ہیں۔ اگر پہلوں نے کوئی غلطی کی اسے درست کیوں نہیں کرتے؟ انھیں کیا مجبوری ہے کہ یہ غلط روش چھوڑ کر صحیح روش اختیار نہ کرلیں؛ اس لئے اس کے نتیجے بھی برابر کے ذمہ دار ہیں۔ سورۂ اعراف میں ہے كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا جب کوئی جماعت جہنم میں داخل ہو اپنی ساتھی جماعت پر لعنت کرے گی حَتّٰۤى اِذَا ادَّارَكُوْا فِیْهَا جَمِیْعًا حتیٰ کہ جب یہ سب جہنم میں ایک دوسرے کو پالیں گے تو قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ بعد میں آنے والے اپنے پیشروؤں کے متعلق کہیں گے کہ رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ اے ہمارے پروردگار! یہ ہیں جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا۔ سو تو انھیں تباہی کا دگنا عذاب دے۔ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ خدا ان سے کہے گا کہ تم میں سے ہر ایک کے لئے دگنا عذاب ہے۔ تم جو ایک دوسرے پر ہو تو یہ چیز تمہاری لاعلمی کی دلیل ہے۔ اگر پہلوں کا قصور یہ ہے کہ انھوں نے اپنی آنے والی نسل کی تعلیم و تربیت غلط فضا میں کی اس طرح جس جہنم میں خود تھے اُسے ان آنے والے لوگوں کی طرف بھی منتقل کر دیا۔ تو بعد میں آنے والوں کا جرم یہ ہے کہ انھوں نے بوجھتے اس غلط معاشرے کو قائم کیوں رکھا۔ جس کا نتیجہ ذلت و رسوائی کا جہنم تھا۔ انھوں نے اسے بدلنے کی کوشش کیوں نہ کی اس اعتبار سے پہلے اور پچھلے سب برابر ہیں۔ وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ (۷/۳۸-۳۹) پہلے ان پچھلوں سے کہیں گے کہ تمہیں ہم پر کوئی فوقیت نہیں تم اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہو۔ سو ان کے نتائج بھگتو۔ ان کے لئے ہمیں کیوں مورد الزام ٹھہراتے ہو؟

مندرجہ بالا آیات میں جو کچھ کہا گیا ہے غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ ان میں گویا خود ہماری ہی نقشہ کھینچا گیا ہے۔ پاکستان متاعِ گراں بہا تھی جو ہمیں فطرت کی طرف سے بطور نعمت ملی۔ لیکن ہم نے اس نعمت کی سخت ناقدری کی اور اپنی قوم کا کاروان سرائے میں آن اتارا۔ اب اس جہنم میں بھی ہم مرنے والوں کو کوستے ہیں کہ انھوں نے فلاں فلاں غلطی کی اور فلاں نے

ہیں کی وجہ سے ہم اس عذاب میں مبتلا ہیں۔ اور کبھی عوام لیڈروں کو کوستے ہیں اور لیڈر عوام میں کیڑے ڈالتے ہیں۔ یہ کچھ کرنے کے بعد ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے۔ ہم مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اور جہنم کے شعلے دن بدن بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس جہنم سے نکلنے کی کوئی صورت بھی ہے۔ اور اگر ہے تو اسے عمل میں لانے کا طریق کیا ہے؟

جب آپ پاکستان کے موجودہ معاشرے پر نگاہ ڈالیں گے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ اس میں کوئی خاص پرزہ خراب نہیں جس کے بدلنے سے معاشرے کی اصلاح ہو جائے گی۔ یہ خرابی اس پورے نظام (SOCIAL ORDER) کی ہے جو یہاں کارفرما ہے۔ اسلئے ہمارے معاشرے کے اصلاح کی ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ یہاں موجودہ غیر قرآنی نظام کی جگہ قرآنی نظام متشکل کیا جائے۔ قرآنی نظام کی تفاصیل تو طول طویل ہیں۔ لیکن اس کا ملخص یہ ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کے سامان و ذرائع بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ذمہ داری کا لفظ خاص طور پر قابل غور ہے۔ یعنی وہ نظام یہ کہہ کر فریب نہیں دے سکتا کہ ہم اس کے لئے کوشش کرینگے۔ وہ اس کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر، اگر اس نظام میں کوئی ایک فرد بھی بھوکا رہ جائے یا اسے سامان نشوونما میسر نہ آئے تو وہ قرآنی نظام نہیں کہلا سکے گا۔ ظاہر ہے کہ اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے، ضروری ہوگا کہ ملک کے تمام ذرائع پیداوار کا نظم و نسق خود اس نظام کے ہاتھوں میں ہو اور فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کسی جگہ بھی جمع نہ ہونے پائے۔ یہ قرآنی نظام کی بنیادی خصوصیات ہونگی۔ قرآن اس کے لئے جذبۂ محرکہ یہ بتاتا ہے کہ انسانی ذات (انا۔ خودی۔ نفس۔ ایگو (PERSONALITY) کی نشوونما اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ فرد کسی دوسرے کی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔ جب انسانی ذات کی نشوونما اس طرح ہو جائے تو وہ حیات جاوید حاصل کر لیتی ہے۔ اور اس طرح وہ مرنے کے بعد زندگی کی اگلی ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔

یہ تو ہوا مقصد۔ یعنی موجودہ نظام کی جگہ قرآنی نظام کا قیام۔ اب سوال یہ ہے کہ بحالات موجودہ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ کیا ہوگا۔ یعنی پاکستان میں اس قسم کا نظام کس طرح قائم ہوگا؟ پاکستان ایک آئینی مملکت ہے۔ اس لئے اس میں ایک نظام کی جگہ دوسرا نظام لانے کا طریق بھی آئینی ہی ہوگا۔ آئینی تبدیلی کے معنی یہ ہیں کہ ملک کی مجالس قانون ساز میں اکثریت ان لوگوں کی ہو جو اس قسم کے نظام کو اپنے ایمان کا جزو سمجھتے ہوں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ملک کی ان مجالس میں (وہ مرکزی ہوں یا صوبائی) اراکین انتخاب کے ذریعہ آتے ہیں اور ان انتخابات میں آراء (VOTES) کی اکثریت عوام کی ہوتی ہے۔ حالات کے اس تجزیے سے آپ نے دیکھ لیا کہ اس امر کا بنیادی اختیار عوام کے ہاتھ میں ہے کہ وہ ملک میں کس قسم کا نظام قائم کریں۔ لہٰذا عوام کا ان لوگوں کو مورد الزام قرار دینا جو پہلے کسی قسم کا نظام قائم کر گئے ہوں یا اپنے لیڈروں کو کوسنا کہ وہ غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ اپنے اختیارات سے غفلت کی دلیل ہے۔

لیکن کہا یہ جائے گا کہ عوام بیچارے جاہل ہیں۔ ان کا سیاسی شعور بیدار نہیں۔ وہ صحیح اور غلط نظام کو سمجھ نہیں سکتے۔ وہ اچھے اور برے نمائندے میں تمیز نہیں کر سکتے۔ وہ اس قدر غریب اور مفلس ہیں کہ روٹی کا دھندا انہیں کسی دوسری طرف توجہ ہی نہیں کرنے

دیتا۔ معاشی مجبوریوں نے انھیں اس قدر کچل دیا ہے کہ انھیں ملک کے آئینی اور سیاسی معاملات میں دلچسپی ہی نہیں۔ جیسا کہ قرآن نے خود کہا ہے کہ مفاد پرست گروہ اس قسم کی سازشیں اور تدبیریں کرتا رہتا ہے جن سے عوام کا شعور بیدار ہی کیا جائے تو کیا کیا جائے ؟

یہ ظاہر ہے کہ جب تک آپ کے ہاں جمہوری نظام ہے اس وقت تک عوام کے تعاون کے بغیر کوئی آئینی انقلاب رونما لہٰذا عوام میں صحیح نگاہوں کا پیدا کرنا معاشرہ کی اصلاح کے لئے لاینفک ہے۔ اس کے بغیر آپ قیامت تک بھی کوئی نہیں کر سکتے۔

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مفاد پرست گروہ کی انتہائی کوشش یہ ہوگی کہ عوام میں صحیح نگاہ پیدا نہ ہو سکے۔ لہٰذا عوام میں یہ کرنے کی ذمہ داری ان پر عاید ہوتی ہے جو

(۱) خود قرآنی نظام سے واقف ہوں اور اس کے قیام کے لئے مضطرب و بیقرار ہوں۔ اور

(۲) جن کے سامنے اپنا مفاد کوئی نہ ہو۔

پاکستان میں قرآنی نظام ربوبیت کی نشاندہی طلوع اسلام نے کرائی ہے۔ اس لئے وہی طبقہ اس نظام سے اچھی طرح باخبر اور اسکے شائع کردہ لٹریچر کو اپنے دل کی گہرائیوں میں اتار چکا ہے۔ ہمارے پاس ایسا باور (بلکہ یقین) کرنے کے لئے کافی شو کہ ملک میں اس قسم کے حضرات کی اب کمی نہیں۔ طلوع اسلام کی سالانہ کونشن خود اس حقیقت کی زندہ شہادت تھی۔ نیز بھی کہ ان کے دلوں میں اس نظام کی تشکیل کے لئے بڑی تڑپ ہے۔ اور ان کے سامنے اپنا کوئی مفاد نہیں۔ حتیٰ کہ نام اور نم نہیں۔ وہ ملک کے ایسے دور دراز گوشوں میں جن کے نام تک سے بھی باہر کی دنیا کم واقف ہے، نہایت خاموشی سے اس آگے بڑھانے میں مصروف رہتے ہیں۔ اور اس میں جس قدر تکالیف سامنے آتی ہیں انھیں نہایت خندہ پیشانی سے برداشت یہی ہے وہ طبقہ جس پر یہ فریضہ عاید ہوتا ہے کہ وہ عوام میں ایسی صحیح نگاہ پیدا کریں کہ وہ برے اور بھلے میں تمیز کر سکیں اور میں صرف ان لوگوں کو کامیاب بنائیں جو قرآنی نظام پر ایمان رکھتے ہوں۔

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ آپ پر کتنی بڑی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو کو کس قدر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ ملک کے ایک ایک فرد کو نظام ربوبیت سے آشنا کرایا جائے چیت سے بھی ہوگا اور لٹریچر کی تقسیم سے بھی۔ طلوع اسلام کی طرف سے جو کچھ اس وقت تک شائع ہو چکا ہے وہ اس کرنے کے لئے بہت کافی ہے (اس میں مزید اضافہ بھی بدستور اور مسلسل ہوتا رہتا ہے) ضرورت اس کی ہے کہ اس پہنچایا جائے۔ اس کا ترجمہ علاقائی زبانوں میں کیا جائے۔ پھر اسے ذاتی طور پر مختلف گروہوں اور گوشوں میں پہنچایا جا میں اس کے متعلق گفتگو کی جائے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ کو اس کی دھن لگ جائے آپ میں۔ اپنے مکان پر ہوں یا کسی دوسرے کے، شادی کی تقریب میں ہوں یا غمی کی مجلس میں ہوں یا سفر میں۔ آپ

مقام پر ہوں، یہی نقطہ آپ کا موضوعِ گفتگو ہو۔ یعنی قرآنی نظامِ ربوبیت کا تعارف۔ اور اس ابتدائی تعارف کے بعد جب آپ سننے والوں میں کچھ دلچسپی دیکھیں تو ان تک ضروری لٹریچر پہنچایا جائے۔ اور اس تمام جدوجہد اور سعی و کاوش سے آپ کا ذاتی مفاد کوئی بھی پیشِ نظر نہ ہو۔ آپ کا قول و فعل، سیرت و کردار اس عظیم حقیقت کا اعلان ہو کہ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۶/۱۰۹)، میں اس کے لئے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر صرف خدا کی ربوبیت عالمینی کے ذمہ ہے۔

لیکن یہ کام انفرادی طور پر کماحقہٗ نہیں ہو سکیگا اس کے لئے اجتماعی اور منظم کوشش (ORGANISED EFFORT) کی ضرورت ہوگی۔ ان کوششوں کا مرکز اور محور ہر شہر اور قریہ کی مقامی بزمِ طلوعِ اسلام ہوگی جو وقتاً فوقتاً مرکزی بزم سے راہنمائی حاصل کرتی رہے گی۔ لہٰذا سب سے پہلے مقدم کام ان بزموں کو زندہ۔ فعال۔ متحرک اور منظم بنانا ہے۔ آپ اپنی اپنی جگہ مل کر بیٹھیے اور سوچیے کہ اس ضمن میں آپ نے کیا کچھ کیا ہے اور کیا کچھ کرنا ہے۔

اسے بھی نہ بھولئے کہ اس کام میں آپ کی سخت مخالفت ہوگی۔ یہ بات بظاہر بڑی تعجب انگیز سی معلوم ہوگی کہ جب آپ خالص قرآنی نظام کی طرف دعوت دیتے ہیں اور دعوت بھی مسلمانوں ہی کو دیتے ہیں جن کا قرآن پر ایمان ہے۔ اس میں کسی فرقہ یا پارٹی سے متصادم نہیں ہوتے۔ اس کے بدلے میں کسی سے کچھ نہیں چاہتے۔ اپنے سامنے کوئی ذاتی مفاد نہیں رکھتے تو پھر آپ کی مخالفت کیوں ہوگی اور کن لوگوں کی طرف سے ہوگی؟ آپ کی مخالفت مفاد پرست گروہ کی طرف سے ہوگی اور اس لئے ہوگی کہ آپ ان کی ہوسِ خوں آشامی کی تسکین کی راہ میں حائل ہوں گے۔ آپ ان کے شکار کو ان کے فولادی پنجوں سے چھڑانے کی کوشش کرینگے آپ ان کی جھوٹی سیادت و قیادت کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ خدا اور ان کے بندوں کے درمیان کوئی طاقت حائل نہ رہے اس سے سرمایہ داری اور اس کی محافظ مذہبی پیشوائیت دونوں متحدہ طور پر آپ کی مخالفت میں محاذ بنالیں گی۔ ایک طبقہ اپنا پیسہ خرچ کرے گا اور دوسرا مذہب کے نام پر عوام کے جذبات کو مشتعل کرے گا۔ قرآن اس کی شہادت دیتا ہے اور ہمارا اپنا تجربہ اس کی تائید کرتا ہے۔ جب سے طلوعِ اسلام نے اس آواز کو بلند کیا ہے مذہبی اجارہ داروں کا ایک گروہ ہے جس نے اس کی مخالفت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے رکھا ہے چونکہ اس سے ان کا مقصود اپنے مفاد کا تحفظ ہے اس لئے وہ اس مخالفت میں ہر قسم کا حربہ استعمال کرتے ہیں۔ دروغ بافی اور بہتان تراشی ان کا عام شیوہ ہے۔ انھیں یہ کہنے کی تو جرأت نہیں ہوتی کہ ہم اس آواز کی مخالفت اس لئے کرتے ہیں کہ یہ سرمایہ داری کی خون آشامی اور پیشوائیت کی کفن دزدی کی مخالف ہے۔ وہ عوام کو یہ کہہ کر فریب دیتے رہتے ہیں کہ یہ ایک نئے مذہب کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ شانِ رسالت کے منکر ہیں۔ تین نمازوں کے قائل ہیں۔ نو دن کے روزے ہیں۔ مسلمانوں میں فتنہ پھیلاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ سرمایہ داروں کے پیسے کے زور پر اپنے اس پراپیگنڈہ کو وسیع سے وسیع بنانے پر لگے جاتے ہیں۔ ان کے رسالے ہیں۔ اخبارات ہیں۔ پمفلٹ ہیں۔ کتابیں ہیں۔ تنخواہ دار کارندے ہیں۔ وظیفہ خوار ائمہ مساجد ہیں وہ اپنی ان بہتان تراشیوں کو لوگوں تک مسلسل پہنچاتے رہتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی انھیں تاکید کرتے رہتے ہیں کہ تم نے طلوعِ اسلام اور اس کا لٹریچر ہرگز نہ دیکھنا۔ اس سے تمہارے عقائد خراب ہو جائیں گے۔ اور عاقبت بگڑ جائے گی۔ مقصد اس سے

یہ ہوتا ہے کہ لوگوں پر کہیں ان کے جھوٹ کا پردہ فاش نہ ہو جائے۔

یہ ہے وہ مخالفت جس سے آپ کو بچنا ہوگا۔ اس سے بچنے کا طریق یہ ہے کہ آپ ان لوگوں سے کبھی نہ الجھئے۔ ان کی اسکیم یہ ہے کہ وہ آپ کو ان بے کار مباحث میں الجھائے رکھیں تاکہ آپ قرآنی نظام کا پیغام لوگوں تک نہ پہنچا سکیں۔ آپ اس سے بچیں اور اپنا مثبت پروگرام جاری رکھیں۔ ان کے اتہامات کی تردید اپنے عمل و کردار سے کریں۔ آپ کی زندگی آپ کی صداقت کی شہادت اور آپ کے دعوے کی دلیل ہو اپنے مقصد کے حصول کے لئے کوئی ناجائز حربہ استعمال نہ کریں۔ کوئی غلط قدم نہ اٹھائیں جھوٹ کا کوئی کلمہ اپنی زبان پر نہ لائیں۔ مداہنت یا منافقت کو پاس تک نہ پھٹکنے دیں۔ کبھی ایسا نہ کریں کہ آپ کا عقیدہ کچھ اور ہو اور مصلحت بینی کی بناء پر زبان پر کچھ اور لائیں۔ قرآنی پیغام کی نشر و اشاعت کے لئے قلب و زبان کی ہم آہنگی نہایت ضروری ہے۔ اپنے کسی سیاسی مقصد کو حاصل نہیں کرنا کہ آپ کے نزدیک اس مقصد کے حصول کا نام کامیابی ہو خواہ اس کے لئے کوئی ذریعہ بھی استعمال کیوں نہ کر لئے جائیں۔ قرآن کی رو سے ذریعہ اور مقصد یا راستہ اور منزل میں کوئی فرق نہیں۔ غلط راستہ انسان کو کبھی صحیح منزل تک نہیں لے جاتا۔

ان شرائط کے ساتھ آپ قرآنی پیغام کو عام کرتے جائیں۔ تاکہ عوام اچھی طرح سمجھ جائیں کہ صحیح اسلامی زندگی کسے کہتے ہیں اور قرآنی نظام کیا ہوتا ہے اور جب انتخابات کا وقت آئے تو وہ صرف انہی لوگوں کو اپنا نمائندہ منتخب کریں جو اس نظام کو جزو ایمان سمجھیں۔ اگر آپ نے زیادہ سے زیادہ تعداد میں ایسے لوگوں کو منتخب کرا دیا جو اس نظام پر ایمان رکھتے ہوں تو مجلس قانون ساز میں اکثریت انہی لوگوں کی ہوگی۔ اس سے وہ موجودہ آئین پاکستان میں (جو سرمایہ دار ارباب اقتدار اور مذہبی پیشواؤں کی ملی بھگت کا مظہر ہے اور جسے محض فریب دہی کی خاطر اسلامی نام دے دیا گیا ہے) ضروری ترمیم کر لیں گے۔ اس کے بعد ملک میں صحیح قرآنی نظام نافذ کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ بحالات موجودہ، پاکستان میں صحیح معاشرہ کے قیام کی یہی ایک صورت ہے۔

امید ہے طلوع اسلام سے متفقین حضرات تاریخ کے اس نازک دور میں اپنی اہم ذمہ داری کا پورا پورا احساس کریں گے
اگر انہوں نے اس موقع کو کھو دیا تو معلوم ایسے حالات پھر کب پیدا ہوں۔ فھل من مدکر۔

مجلسِ اقبال

بارھواں باب

دریں باب کہ مسلمان کی زندگی کا مقصد قانونِ خداوندی کا غلبہ اور جہاد ہے۔
اور اگر جہاد کا جذبۂ محرکہ ہوسِ زمین گیری ہو تو وہ اسلام میں حرام ہو جاتا ہے۔

اس باب کی ابتداء اس شعر سے ہوتی ہے۔

قلب را از صبغۃ اللہ رنگ دہ
عشق را ناموس و نام و ننگ دہ

عشاق کا یہ فخریہ اعلان قریب قریب ہر زبان پر رہا ہے کہ

ما نمی خواہیم ننگ و نام را

اور اس حقیقت کو میر اس انداز میں بیان کرتا ہے کہ

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

نا یہ اس عشق کی باتیں ہیں جس کا نتیجہ کوچہ گردی ہوتا ہے۔ عشق کو اس پستی سے اٹھا کر انسانیت کے بلند ترین مقام پر لے جانے
[...]یہ ہے کہ انسان کے دل میں قوانینِ خداوندی کا عشق پیدا ہو اور اس طرح وہ اپنے آپ کو صبغۃ اللہ (اللہ کے رنگ) میں رنگتا چلا جائے
[...] ذات کی نشو و نما کی پہچان یہ ہے کہ اس میں صفاتِ خداوندی (علیٰ حدِ بشریت) منعکس ہوتی چلی جائیں۔

طبعِ مسلم از محبت قاہر است
مسلم ار عاشق نباشد کافر است

[...]ان کے دل میں غلبہ اور قوت درحقیقت اپنے مقصدِ بلند کے ساتھ والہانہ عشق سے پیدا ہوتی ہے۔ عشق سے مراد یہ ہے کہ اس
[...]صد کے حصول کے لئے انسان اپنی عزیز ترین متاع تک کو بھی قربان کرنے کے لئے ہر وقت تیار ہے۔ اگر مسلمان کو اپنے مقصد سے

اس قدر شیفتگی نہیں تو وہ درحقیقت مسلمان نہیں۔ اور اس شیفتگی کا مظاہرہ اس روش زندگی سے ہوتا ہے جس میں مسلمان کی یہ ہوتی ہے کہ

تابع حق دیدنش، نادیدنش
خوردنش، نوشیدنش، خوابیدنش

اس کا کسی چیز کو درخورِ توجہ سمجھنا اور کسی طرف سے آنکھ بند کر کے گذر جانا۔ اس کا کھانا پینا۔ سونا سب قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کی ساری زندگی اس حقیقت کبریٰ کی جیتی جاگتی تصویر ہوتی ہے کہ قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین۔ ان سے کہہ دو کہ میری صلوٰۃ اور مناسک۔ میری زندگی اور موت سب اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔ ایک عبد مومن اس درجہ قوانین الٰہی کا پابند ہو جاتا ہے تو اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

در رضائش مرضئ حق گم شود
ایں سخن کے باور مردم شود

خدا کی مرضی خود اس مومن کی مرضی میں گم ہو جاتی ہے۔ عام طور پر کہا یہ جاتا ہے کہ انسان کو ایسی زندگی بسر کرنی چاہیئے کہ اس کی مرضی کچھ نہ ہے بلکہ وہ مرضئ مولا میں گم ہو جائے۔ لیکن اقبال کا تصور اس سے مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک عبد مومن کو ایسی زندگی بسر کرنی چاہیئے کہ کسی معاملہ میں جب اس کے فیصلہ اور کردار پر نظر ڈالی جائے تو اس سے واضح ہو جائے کہ اس معاملہ میں خدا کی مرضی یہی ہے جو اس کے فیصلے اور کردار سے ظاہر ہو رہی ہے۔ یعنی

فطرت کے مقاصد کے عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

اس طرح "قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

خیمہ در میدان الا اللہ زد است
در جہاں شاہد علی الناس آمد است

وہ ساری دنیا کے معبودانِ باطل سے منہ موڑ کر صرف ایک خدا کی محکومی اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح ساری دنیا کی چوکھٹ سے قلندرانہ بے نیاز گذر جاتا ہے۔ اس سرفرازی و سربلندی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام اقوام عالم کے اعمال کا محاسب بن جاتا ہے۔ قرآن نے امت مسلمہ کی یہی خصوصیت بتائی ہے جب کہا ہے کہ وکذالک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس۔ تمہیں ہم نے اس طرح ایک بین الاقوامی امت بنا دیا ہے کہ تم تمام نوع انسانی کے اعمال کے محاسب بن کر رہو۔ یعنی یہ دیکھتے رہو کہ کون کونسی قوم زندگی کی صحیح شاہراہ پر چل رہی ہے اور کونسی اس سے ادھر ادھر ہے۔ ویکون الرسول علیکم شھیدا۔ اور خود تمہارے اپنے اعمال پر تمہارا مرکزِ ملت نگراں و محاسب ہو۔

شاہدِ حالش نبی انس و جاں
شاہدے صادق ترین شاہداں

...ملت کے اعمالِ حیات کی نگرانی کا فریضہ سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے ادا کیا۔ حضورؐ وہ شاہد تھے جو دنیا بھر کے تمام شاہدین سے سچے تھے۔ اقوامِ عالم کا شاہد و نگران بننے کے لئے ضروری ہے کہ

قال را بگذار و بابِ حال زن
نورِ حق بر ظلمتِ اعمال زن

...باتیں بنانا چھوڑ کر عمل کی طرف آجاؤ۔ اور اپنے اعمال کی تاریکیوں کو قوانینِ خداوندی کی روشنی میں پرکھتے چلے جاؤ۔ تاکہ معلوم ہوتا ...رہے کہ کہاں کہاں غلطی ہے اور کہاں کہاں کمزوری۔ اس طرح

در قبائے خسروی درویش زی
دیدہ بیدار و خدا اندیش زی

...سلطنت شاہانہ کے اندر درویشانہ زندگی بسر کرو۔ ایک عظیم مملکت تمہارے پاؤں کے نیچے ہو لیکن خود تمہارے اوپر قوانینِ الٰہی کا ...ہو۔ تم نظامِ خداوندی کے ماتحت ہو اور ساری دنیا تمہاری ماتحت۔ اس طرح آنکھیں کھول کر اور ہر وقت قوانینِ خداوندی کو ...سامنے رکھ کر زندگی بسر کرو۔

قربِ حق از ہر عمل مقصود دار
تا ز تو گردد جلالش آشکار

...اور ہر کام سے تمہارا مقصود یہ ہو کہ تمہارے اندر صفاتِ خداوندی زیادہ سے زیادہ حد تک منعکس ہوتی جائیں۔ تمہاری زندگی ...قوانینِ الٰہیہ سے یک رنگ و ہم آہنگ ہوتی جائے۔ اور اس طرح خدا کا جلال۔ اس کے نظام کا غلبہ و تمکن۔ تمہارے اعمال سے ...آشکار ہوتا جائے۔ لیکن اس باب میں اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ

صلح شر گردد چو مقصود است غیر
گر خدا باشد غرض، جنگ است خیر

...اگر تمہاری سعی و کاوش سے مقصود یہ ہے کہ دنیا میں نظامِ خداوندی کا قیام ہو جائے۔ تاکہ انسانیت کو صحیح آزادی اور سرفرازی ...نصیب ہو جائے تو اس مقصد کے لئے جنگ بھی خیر ہو جائے گی۔ لیکن مقصد اس کے علاوہ کچھ اور ہو تو پھر جنگ تو ایک طرف ...صلح بھی شر بن جائے گی۔

گر نہ گردد حق ز تیغِ ما بلند
جنگ باشد قوم را نا ارجمند

اگر ہماری تلوار سے حق کا قانون بلند نہیں ہوتا تو ہمارے لئے جنگ کبھی جائز قرار نہیں پا سکتی۔

حضرتِ شیخ میاں میر ولی

ہر خفی از نورِ جانِ او جلی

اس کے بعد علامہ اقبالؒ لاہور میں مدفون، حضرت شیخ میاں میر اور شاہنشاہِ ہندوستان (اورنگزیب) کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ واقعہ سے پہلے حضرتِ شیخ کی تعریف میں چار شعر لکھے ہیں۔ ایک اوپر گذر چکا ہے باقی تین یہ ہیں۔

برطریقِ مصطفیٰ محکم پئے ۔۔۔ نغمۂ عشق و محبت را نئے

تربتش ایمانِ خاکِ شہرِ ما ۔۔۔ مشعلِ نورِ ہدایت بہرِ ما

بر درِ او جبہ فرسا آسماں ۔۔۔ از مریدانش شہِ ہندوستاں

یہ تو رہا حضرت شیخ میاں میر کے متعلق۔ دوسری طرف شاہنشاہ تھا جس کی کیفیت یہ تھی کہ

شاہ تخمِ حرص در دل کاشتے ۔۔۔ قصدِ تسخیرِ ممالک داشتے

از ہوس آتش بجاں افروختے ۔۔۔ تیغ را ہل من مزید آموختے

بادشاہ کے دل میں حرص و ہوس کی تخم کاری ہو چکی تھی وہ ملک گیری کے جذبہ میں سرشار تھا۔ وہ سلطنت پر سلطنت فتح کرکے، اپنی مملکت کی وسعتیں بڑھائے چلا جاتا تھا۔ اس کی تلوار کی ہوس خون آشامی کی سیرابی ہی نہیں ہوتی تھی۔

در دکن ہنگامہ ہا بسیار بود

لشکرش در عرصہ پیکار بود

اس وقت دکن میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ اور اسے فرو کرنے کے لئے شہنشاہ کی فوجیں مصروفِ جنگ و قتال تھیں۔

رفت پیشِ شیخِ گردوں پایۂ

تا بگیرد از دعا سرمایۂ

شاہنشاہ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ ان سے اپنی فتح و نصرت کے لئے دعائیں حاصل کرے۔ اس لئے

مسلم از دنیا سوئے حق رم کند

از دعا تدبیر را محکم کند

مسلمان [illegible] ہوتا ہے کہ وہ تمام مادی وسائل [illegible] جمع کر لینے کے بعد، تائید خداوندی کو پکارتا ہے لہذا [illegible] ہے۔ [illegible] کی دعا سے مقصود [illegible] اس آرزو کا اظہار ہوتا ہے کہ اس کا ہر قدم قانون خداوندی کے مطابق [illegible] سے [illegible] اس کے اندر ایک نفسیاتی [illegible] ایک ضمنی بات آگئی

تاہے)

شیخ از گفتار شہ خاموش ماند
بزمِ درویشاں سراپا گوش ماند

ں میرے بادشاہ کی تمام باتیں سنیں لیکن بالکل خاموش رہے۔ وہ بھی خاموش ہے اور ان کی وجہ سے یہ ساری بزمِ درویشاں
وش۔

تا مریدے سکۂ سیمیں بدست
لب کشود و مہرِ خاموشی شکست

موشی کو ایک مرید نے توڑا۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کا ایک سکہ تھا۔ اس نے اسے حضرت شیخ کی خدمت میں پیش کیا اور کہا کہ

گفت ایں نذرِ حقیر از من پذیر
اے زحق آوارگاں را دستگیر
غوطہا زد در خوئے محنت تنم
تا گرہ زد درہمے را دامنم

میرے گاڑھے پسینے کی کمائی ہے۔ آپ اس نذرِ حقیر کو قبول فرمائیے۔

گفت شیخ ایں زر حقِ سلطان ماست
آنکہ در پیراہنِ شاہی گداست

شیخ نے فرمایا کہ یہ درہم ہمارے بادشاہ کا حق ہے وہ بادشاہ جو اگرچہ خلعتِ خسروی میں ملبوس ہے لیکن درحقیقت ایک گداگر
و بھکاری ہے۔

حکمرانِ ماہ و مہر و انجم است
شاہِ ما مفلس ترینِ مردم است

کی وسعتیں حدود فراموش ہیں لیکن یہ بیچارا سب سے زیادہ مفلس انسان ہے۔

دیدہ بر خوانِ اجانب دوختہ است
آتشِ جوعش جہانے سوختہ است

محتاجی کا یہ عالم ہے کہ اس نے اپنی آنکھیں ادھر ادھر دوسروں کے دسترخوان پر جما رکھی ہیں کہ کہیں سے کوئی لقمہ ل
ک کی آگ نے دنیا بھر کو خاکستر بنا دیا ہے۔

قحط و طاعون تابعِ شمشیرِ او
عالمے ویرانہ از تعمیرِ او

پہلے اس کی تلوار لوگوں کو فنا کے گھاٹ اتارتی ہے۔ اور اس کے بعد جو بچ جاتے ہیں۔ انہیں قحط اور وبائیں گھیر لیتی ہیں۔ تعمیر کی آرزو کے ہاتھوں ایک دنیا ویرانہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔

خلق در فریاد از نادارِیش
از تہیدستی ضعیف آزاریش

یہ اپنی محتاجی اور مفلسی کی وجہ سے ہر کمزور انسان کو ستاتا ہے اور اس سے ایک دنیا آہ و فغاں میں مصروف ہے۔

سطوتش اہلِ جہاں را دشمن است
نوعِ انساں کارواں این رہزن است

اس کی قوت و حشمت، شوکت و سطوت ساری دنیا کی دشمن ہے۔ یہ انسانیت کے قافلہ کو لوٹنے والا رہزن ہے

از خیالِ خود فریب و فکرِ خام
می کند تاراج را تسخیر نام

اس کی خود فریبی اور فکر کی ناپختگی کا یہ عالم ہے کہ یہ دنیا کو تباہ و برباد کر رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں تسخیرِ کائنات

عسکرِ شاہی و افواجِ غنیم
ہر دو از شمشیرِ جوعِ او دو نیم

اس کی ہوسِ ملک گیری کے ہاتھوں دشمن کی فوجیں اور خود اپنے لشکر ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں۔ اور یہ خون کا سلسلہ بڑھ رہا ہے۔

آتشِ جانِ گدا جوعِ گداست
جوعِ سلطاں ملک و ملت را فناست

اگر کوئی گداگر، بھکاری بھوکا ہو تو اس کی بھوک کا عذاب خود اس کی اپنی جان پر پڑتا ہے۔ لیکن اگر کوئی بادشاہ، ہو جائے تو اس کی اس ہوس سے ملک اور ملت دونوں تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔

ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید
تیغِ او در سینۂ او آرمید

یاد رکھو! جس نے غیر اللہ کی خاطر تلوار اٹھائی۔ اس کی تلوار خود اس کے اپنے سینہ میں پیوست ہو گئی۔ تلوار ہمیشہ چاہیئے۔ نہ کہ ملک گیری کی خاطر۔

اس شعر پر اس باب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

باسمہٖ تعالیٰ

میں تجھ کو بتاتا ہوں

تقدیرِ اُمم

کیا ہے؟

(محترم پرویز صاحب کا بصیرت افروز مقالہ جسے انھوں نے "سلیم کے نام خط"
کے دلکش انداز میں لکھا)

اِدارۂ طلوعِ اسلام کراچی

سلیم کے نام

(قوموں کے عروج و زوال کا ابدی قانو

نہیں سلیم! تاریخ کا علم اور اس کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ وسیع اور اس سے کہیں زیادہ عمیق ہے. تاریخ محض ماضی کے حوادث کا ریکارڈ نہیں. وہ صرف اتنا بتلانے کے لئے نہیں کہ اکبر فلاں سال تخت پر بیٹھا اور فلاں سال مرگیا. وہ ہمیں یہ بتا کس اصول کے ماتحت زندہ رہتی ہیں اور کس قانون کے ماتحت مرتی ہیں. وہ یہ بتاتی ہے کہ فلاں قوم نے اس قسم کی روش کی تو اس کا یہ نتیجہ نکلا اور فلاں قوم اس قسم کے نہج پر چلی تو اس کا انجام یہ ہوا. اسے سائنس آف ہسٹری یا فلسفہ تاریخ کہتے ہیں متعجب ہوگے کہ تاریخ کو ایک سائنس یا فلسفہ کی حیثیت سے سب سے پہلے قرآن نے پیش کیا.

سائنس آف ہسٹری

بتایا کہ قوموں کی موت اور حیات یونہی اتفاقی طور پر واقع نہیں ہو جاتی ان کا عروج و زوال طریق پر ظہور میں نہیں آجاتا. اس کے لئے خاص قانون اور اصول مقرر ہیں. یہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات کوئی خاص قوم یا جمع کرلیتا ہے. اور اس کے ذریعے وقتی طور پر اقتدار حاصل کرلیتا ہے. لیکن یہ ہنگامی حادثہ ہوتا ہے جو ایک شعلۂ مستعجل کی کر خاموش ہو جاتا ہے جسے قوموں کا عروج و زوال کہا جاتا ہے وہ ارتقائی طور پر نمودار ہوتا ہے اور اسی طرح تدریجی طو ہٹ جاتا ہے اور یہ سب کچھ ایک لگے بندھے قانون کے مطابق ہوتا ہے.

یہاں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جب ہم کسی قوم کی موت کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ اس قو ارض سے مٹ گئی. اس میں شبہ نہیں کہ بعض اوقات ایک نسل کی نسل طبعی طور پر (PHYSICALLY.) دنیا. لیکن اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک قوم کے افراد طبعی طور پر زندہ رہتے ہیں (اور ان کی نسل بھی آگے چلتی رہتی ہے) لیکن اس قو میں نہیں ہوتا. اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کسی قوم کی موت اور حیات سے مقصود کیا ہے

قوموں کی موت

ہر قوم ایک خاص نظریۂ حیات، ایک خاص تصورِ زندگی، ایک خاص نقطۂ نگاہ کی حامل ہوا سامنے زندگی کا ایک خاص مقصد اور جد و جہد حیات کے لئے ایک خاص نصب العین ہوتا ہے. اس تصورِ حیات اور نق کی اصطلاح میں کلمہ اور دورِ حاضر کی اصطلاح میں (یوں سمجھو کہ) کلچر کہا جاتا ہے. اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر قوم نمائندہ ہوتی ہے. لہٰذا ایک قوم کی موت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ جس کلچر کی حامل تھی اس میں اتنی صلاحیت نہیں کہ تقاضات (CHALLENGES) کا مقابلہ کرسکے. اس مقام پر اس نقطہ کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگر

عروج پر ہے۔ اور اس کے بعد اس پر زوال آگیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ (۱) یا تو اس کلچر میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے سامنے ٹھہر سکتا اور یا (۲) یہ کہ اس قوم نے اُس پہلے کلچر کو چھوڑ کر کوئی اور کلچر اختیار کر لیا تھا جس میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھو کہ جس وقت کوئی قوم زوال پذیر ہوتی ہے، اُس وقت وہ کسی ایسے کلچر کی حامل ہوتی ہے جس میں زمانے کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کے لئے صلاحیت نہیں ہوتی۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ دنیا میں کلچر اور زمانہ کے تقاضوں میں مسلسل کشمکش جاری رہتی ہے۔ جب تک ایک کلچر ان تقاضوں کا مقابلہ کرتا رہتا ہے اس کی حامل قوم زندہ رہتی ہے۔ جب زمانے کے تقاضے اس پر غالب آجاتے ہیں تو وہ قوم مصافِ زندگی سے پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جو ایسے کلچر کی حامل ہوتی ہے۔ جس میں ان تقاضوں کے سامنے ٹھہرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس قانون کو قرآن کی اصطلاح میں قانونِ استبدال و استخلافِ قومی (LAW OF SUBSTITUTION AND SUCCESSION OF NATI) کہا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جس طرح دنیا میں کوئی فرد مرنا نہیں چاہتا۔ اسی طرح کوئی قوم بھی مرنا نہیں چاہتی۔ وہ ہمیشہ زندہ اور برسرِ اقتدار رہنا چاہتی ہے۔ لیکن جس طرح کوئی فرد محض اس لئے زندہ نہیں رہ سکتا کہ اسے زندہ رہنے کی آرزو ہے اسے زندہ رہنے کے لئے قانونِ حیات کے مطابق چلنا ضروری ہے۔ اسی طرح کوئی قوم بھی محض مقدس آرزوؤں اور حسین تمناؤں کے بل بوتے پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اُسے زندہ رہنے کے لئے اس اٹل قانون کی اتباع کرنی ہوگی جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ جب (صدرِ اول کے) مسلمانوں کا مقابلہ ان قوموں کے ساتھ ہوا جو ایسے کلچر کی حامل تھیں جن میں آگے چلنے کی صلاحیت نہیں رہی تھی (انھیں اہل کتاب کہہ کر پکارا گیا ہے) تو قرآن نے انھیں واضح الفاظ میں بتا دیا کہ یہ ٹھیک ہے کہ تم میں سے ہر فریق کی یہ دلی آرزو ہے کہ وہ اس کشمکش میں غالب آئے اور آگے بڑھ جائے۔ لیکن یاد رکھو۔ اس بات کا فیصلہ محض آرزوؤں پر مبنی نہیں۔ لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتٰبِ۔ اس کا فیصلہ نہ تو تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہوگا اور نہ ہی تمہارے فریق مقابل (اہل کتاب) کی آرزوؤں کے مطابق۔ اس کا فیصلہ اس اٹل قانون کے مطابق ہوگا کہ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ۔ جو قوم بھی ناہمواریاں پیدا کرنے والے پروگرام پر عمل پیرا ہوگی۔ اُس کی اس روش کے تباہ کن نتائج اس کے سامنے آکر رہیں گے وَلَا یَجِدْ لَہٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا (۴/۱۲۳) اور ان نتائج و عواقب سے انھیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔ بجز اس کے کہ وہ قانونِ خداوندی کو اپنی مدافعت کے لئے سپر بنائیں۔ یہ اس لئے کہ کائنات میں لاقانونیت (LAWLESSNESS) اور دھاندلی نہیں۔

قانون کی حکومت

یہاں زندگی اور موت کا فیصلہ قاعدے اور قانون کے مطابق علیٰ وجہ البصیرت ہوتا ہے لِیَہْلِکَ مَنْ ھَلَکَ عَنْ بَیِّنَۃٍ وَّیَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْ بَیِّنَۃٍ (۸/۴۲) جسے ہلاک ہونا ہے وہ بھی دلائل و براہین کی رو سے ہلاک ہو۔ اور جسے زندہ رہنا ہے وہ بھی دلائل و براہین کی رو سے زندہ رہے۔ یہاں نہ کسی کو زندگی مراعاتِ خسروانہ (بادشاہوں کی بخشش کے) طور پر ملتی ہے۔ نہ کسی کی موت انتقامِ شاہانہ (بادشاہوں کی برہمیٔ مزاج) کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہاں ہر بات کے لئے قاعدہ قانون مقرر ہے جس میں کسی کے لئے کوئی استثناء نہیں ہوتی۔

اس تمہید کے بعد سلیم! آگے بڑھو۔ نظریاتِ زندگی کی باہمی کشمکش کے متعلق ہمارے زمانہ میں ہیگل نے ایک فلسفہ پیش کیا جسے فلسفۂ تضادات کہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ایک نظریہ (IDEA) پیدا ہوتا ہے۔ وہ بڑھتا، پھولتا، پھلتا ہے۔

ہیگل کا فلسفہ

جب وہ شباب تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے ایک اور نظریہ اُبھرتا ہے جو پہلے نظریہ کی ضد ہوتا ہے۔ اب وہ سابقہ نظریہ مضمحل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور یہ نیا نظریہ پروان چڑھنے لگتا ہے۔ آہستہ آہستہ، وہ پہلا نظریہ محو ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ یہ نیا نظریہ لے لیتا ہے۔ یہ نیا نظریہ اسی طرح بڑھتا، پھولتا، پھلتا ہے اور پھر اس کے اندر سے ایک نیا نظریہ ابھرتا ہے جو اس کی ضد ہوتا ہے۔ ہیگل کا کہنا یہ ہے کہ نظریات کی یہ گردش دولابی (کہ ایک آتا ہے، ایک جاتا ہے) مسلسل اور پیہم جاری رہتی ہے۔ ہر ابھرنے والے نظریہ کو کچھ وقت کے بعد مضمحل ہونا اور دوسرے نظریہ کے لئے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔

ہیگل کے بعد مارکس آیا۔ اس نے بھی ہیگل ہی کے فلسفہ کی اتباع کی لیکن اس فرق کے ساتھ کہ مارکس نے کہا کہ یہ تبدیلی نظریات (IDEAS) میں نہیں ہوتی بلکہ نظامہائے حیات (SYSTEMS) میں۔

مارکس کا فلسفہ

ایک دور میں زندگی کا ایک نظام (مثلاً نظامِ سرمایہ داری) کارفرما ہوتا ہے۔ کچھ عرصے کے اندر سے ایک اور نظام پھوٹتا ہے۔ جو اُس پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ یہ نظام اُس سابقہ نظام کی جگہ لے لیتا ہے۔ اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس فلسفہ کو DIALECTICS کہتے ہیں۔ یہ کشمکش، تصورات (IDEAS) میں ہو یا نظامہائے (SYSTEMS) میں ایک چیز دونوں میں مشترک ہے۔ اور وہ یہ کہ (اس فلسفہ کی رو سے) کوئی تصور یا نظام نہ ذاتی طور پر اچھا ہوتا ہے نہ بُرا۔ نہ ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت ہوتی ہے نہ فوقیت۔ یا یوں کہو کہ کسی تصور یا نظام میں ذاتی طور پر اس کی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ہمیشہ کے لئے باقی رہ سکے یا اپنے متضاد نظریہ یا نظام پر ہمیشہ غالب رہ سکے۔ (غالب کے الفاظ میں) ہر نظریہ اور ہر نظام کی بنیاد میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ وہ اپنے سے پہلے نظریہ یا نظام کی جگہ لیتا ہے۔ کچھ عرصہ تک اس کا دور دورہ رہتا ہے۔ اس کے بعد یہ کہہ کر ختم ہو جاتا ہے کہ

میں اسی لئے بنا تھا کہ خدا مجھے بگاڑے

ہیگل اور مارکس کا خیال ہے کہ قوموں کی موت و حیات کا سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔ یہی وہ چکر ہے جس کے مطابق کلچرز آتے اور جاتے ہیں۔ نہ کوئی کلچر بنیادی طور پر فنا آمادہ ہوتا ہے نہ بقا در آغوش۔ ہر ایک کی موت کا ایک دن مقرر ہوتا ہے۔ اس سے ایک دن زیادہ زندہ رکھ سکتا ہے۔ نہ اس سے ایک دن پہلے مار سکتا ہے۔

قرآن کا فلسفہ

اس کے برعکس، قرآن بھی کلچرز کے محو و ثبات کا ایک فلسفہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہاں تک ٹھیک ہے کہ دنیا میں متضاد نظریات کی کشمکش جاری ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ سب نظریے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ایک نظریہ ایسا ہوتا ہے جس میں بنیادی طور پر غالب آنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اور اس کے نظریہ وہ ہوتا ہے جس میں بنیادی طور پر اس کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ وہ اول الذکر نظریہ کو حق کہہ کر پکارتا ہے۔ اور ثانی

تعبیر کرتا ہے۔ قرآن کا خدا کہتا ہے کہ ہم اپنے کائناتی قانون سے کرتے یہ ہیں کہ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ۔ حق کو باطل پر پھینکتے ہیں۔ ان کی باہم کشمکش رہتی ہے فَيَدْمَغُهُ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق اس باطل کا بھیجا توڑ دیتا ہے۔ اس کا بھرکس نکال دیتا ہے فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸) اور وہ (باطل) بری طرح شکست کھا کر بھاگ جاتا ہے۔ اس لئے کہ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (۱۷/۸۱) باطل کی بنیاد میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ وہ حق کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتا۔ وہ بنا ہی ایسا ہے کہ جب حق کے سامنے آئے منہ موڑ کر بھاگ جائے۔ لہٰذا جو قوم حق کے کلچر کی حامل ہوگی۔ وہ ہمیشہ اس قوم پر غالب رہے گی جو باطل کے کلچر کی نمائندہ ہوگی۔ اور اس وقت تک غالب رہے گی جب تک وہ حق پر قائم ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ حق کا کلچر کچھ مدت کے بعد خود بخود مرجھا کر گر پڑے۔ اور باطل کا کلچر اسکی جگہ لے لے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ حق کی حامل قوم پر وہ قوم غالب آجائے جو اُس کلچر کے صحیح ہونے پر ایمان نہیں رکھتی۔ وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا (۴/۱۴۱) حق اور

حق و باطل

باطل کی قرآنی اصطلاحات کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے متعلق میں باتیں اس سے پہلے کئی بار بتا چکا ہوں۔ مختصر الفاظ میں پھر دہرا دوں کہ حق اس نظریہ (کلمہ) کا نام ہے جو انسانیت کی بلند اور مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کی حامل بنے۔ حقیقت (REALITY) پر مبنی ہے۔ جس کے نتائج ہمیشہ تعمیری (CONSTRUCTIVE) ہوتے ہیں جس کے سہارے کائنات کی ہر شے اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی، ابھرتی اور بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ حق ہے اور جو کچھ اس کی ضد ہے۔ وہ باطل ہے۔ یعنی تخریبی نتائج کا حامل نظریۂ زندگی۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے تصورات حیات یا نظامہائے زندگی یا کلچرز کی کشمکش کا جو فلسفہ پیش کیا ہے وہ ہیگل یا مارکس کے فلسفے کے کس قدر خلاف ہے؟ (یہی وہ بنیادی اختلاف ہے جو اسلام کو کمیونزم کی ضد قرار دیتا ہے) وہ کہتا ہے کہ قوموں کی حیات و موت کے فیصلے اس فلسفہ اور اس قانون کی رو سے ہوتے ہیں۔ یہی کلچرز کے محو و ثبات کا معیار ہے۔ قرآن نے اقوام سابقہ کی جس قدر داستانیں (یعنی تاریخی یادداشتیں) پیش کی ہیں، ان سے مقصود ہی یہ بتانا ہے کہ فلاں قوم نے حق کی روش اختیار کی تو وہ کس طرح اس قوم پر غالب آگئی جو باطل پر دوش تھی۔ اور جب اُس قوم نے جو حق پر تھی، حق کی روش کو چھوڑ دیا تو وہ کس طرح ذلیل و خوار ہوگئی۔ اس وقت مجھے اس کی فرصت نہیں سلیم! کہ میں ان تمام تاریخی نوشتوں کو اس نقطۂ نگاہ سے سامنے لا کر بتاؤں کہ قرآن نے تاریخ کو کس طرح ایک سائنس اور فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ کبھی فرصت ملی تو یہ بھی ہو جائے گا۔ اس وقت میں صرف وہ چند ایک مقامات تمہارے سامنے لاسکوں گا جن میں قرآن نے اپنے اس اصولی قانون کی مختلف انداز سے وضاحت کی ہے۔ یا یوں کہو کہ جن میں وہ اس اصل الاصول کے مختلف گوشوں (FACETS) کو سامنے لایا ہے۔ ان مقامات میں اس نے وضاحت سے بتایا ہے کہ قوموں کے استبدال و استخلاف کے قوانین کیا ہیں؟ کون سی قومیں مٹتی ہیں۔ اور کونسی ان کی جگہ لیتی ہیں۔ ذرا غور سے سنو کہ یہ حقائق ایسے نہیں جنہیں سطحی طور پر دیکھ کر انسان آگے بڑھ جائے۔ ان کا تعلق خود ہماری (اجتماعی) زندگی و حیات سے ہے۔ اور انہی مقامات سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ خود مسلمانوں کے زوال کے اسباب کیا ہیں اور

ان کی بازآفرینی کی صورت کیا۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

حیوانی سطح کی زندگی

سب سے پہلے قرآن یہ کہتا ہے کہ جو کلچر انسانی زندگی کو حیوانی سطح (ANIMAL LEVEL) ہی پر رکھتا ہ
ثبات وبقا نصیب نہیں ہو سکتی۔ وہ کلچر باطل کا حامل ہے۔ قرآن کی رو سے انسان
میں اتنا ہی فرق نہیں کہ انسان سلسلۂ ارتقا میں حیوان سے اگلی کڑی ہے۔ وہ یہ کہتا
کی سطح پر پہنچ کر زندگی ایسے نئے امتیازات کی حامل ہو جاتی ہے جو حیوانی سطح پر قطعاً موجود نہیں ہوتے۔ انہی ا
نام شرفِ انسانیت ہے اور انہی کی نشوونما مقصودِ حیات۔ ہمارے دور میں اس نظریۂ زندگی کو جو انسانی زندگی کو
زندگی کی ایک بڑھی ہوئی شکل قرار دیتا ہے۔ مادی نظریۂ زندگی یعنی ERIALISTIC CONCEPT
OF LIFE) کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس نظریہ کی حامل قومیں خواہ کتنی ہی قوت
کیوں نہ جمع کرلیں، کامیاب و کامران نہیں ہو سکتیں۔ سورۂ محمد میں ہے اَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوا
كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ کیا ان لوگوں نے دنیا میں چل پھر کر دیکھا نہیں کہ ان قوموں کا انجام ک
سے پہلے گذر چکی ہیں؟ تم نے دیکھا سلیم! قرآن تاریخی نوشتوں کے مطالعہ پر کس قدر زور دیتا ہے اور اس مط
ایک سائنس کی حیثیت دیتا ہے۔ یعنی اس نے آگے چل کر جو اصول بیان کرنا ہے اس کی صداقت کے لئے وہ اقو
کو بطور شہادت پیش کرتا ہے ان اقوام کے متعلق وہ کہتا ہے کہ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ۔ قانونِ خداوندی نے انھیں تبا
اس کے بعد ہے وَلِلْكَافِرِيْنَ اَمْثَالُهَا۔ اقوام سابقہ کی جس تباہی و بربادی کا ذکر کیا گیا ہے اسکے متعلق ی
چاہیئے کہ یہ محض ماضی کی داستانیں ہیں جنھیں قصے کہانیوں کی طرح دہرایا جا رہا ہے۔ اور ہم سے ان کا کوئی تع
یہ چیز بطور اصول بیان کی جارہی ہے کہ جن اقوام نے حق کی روش سے انکار کیا۔ ان کا حشر یہ ہوا۔ لہٰذا اب بھی
کی روش اختیار کرے گی۔ اس کا انجام ایسا ہی ہوگا۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكَافِرِ
یہ اس لئے ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے دھاندلی سے نہیں ہوتا۔ یہاں سب کچھ قاعدے اور قانون کے م
سو جو قوم خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے، اُس کی اِس روش کے نتائج اُس کے پشت
ہیں لیکن جو قوم اس قانون سے انکار کر کے کوئی دوسری روش اختیار کرتی ہے تو اس کا محافظ و کارساز کوئی نہ
اصول ہے جو شروع سے چلا آتا ہے اور آج بھی اسی طرح کارفرما ہے۔ اسی اصول کے مطابق اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّ
وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ۔ جو لوگ اس قانون کی صداقت پر یقین رکھتے
کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں وہ شادکامیوں اور کامرانیوں کی سدا بہار جنتی زندگی بسر
برعکس وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ۔ جو ا

۔۔۔ات سے انکار کرتے ہیں۔ ان کی زندگی حیوانی سطح پر ہوتی ہے۔ جس میں مقصودِ حیات کھانا، پینا اور طبعی زندگی پوری کر کے ۔۔۔نا ہوتا ہے۔ اس روش زندگی اور نظریۂ حیات کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کا خیال یہ ہوتا ہے ۔۔۔ہم بہت سی قوت اور جمعیت اکٹھی کر لیں گے تو ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ یہ اُن کی خام خیالی ہے انھیں معلوم ہونا ۔۔۔ہیے کہ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِيَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِيْٓ اَخْرَجَتْكَ ۚ اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ (۴۷/۱۳) ۔۔۔ہی قومیں ان سے پہلے ایسی گذر چکی ہیں۔ جن کے پاس اِن (موجودہ لوگوں) سے جنھوں نے اے رسول تجھے تیرے وطن سے نکال دیا ۔۔۔کہیں زیادہ) قوت تھی۔ ہمارے قانونِ مکافات نے انھیں ہلاک کر دیا اور ان کا کوئی ایسا حامی و مددگار نہ نکلا جو انھیں اس تباہی ۔۔۔بچا سکتا۔ سو جب اُن کا حشر یہ ہوا تو ان کا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ غلط روش سابقہ زمانہ میں تو تباہی و بربادی ۔۔۔نتیجہ ہو اور وہی روش اس زمانہ میں کامیابی و کامرانی عطا کر دے۔

اس سے ہم نے دیکھ لیا سلیم! کہ جن تصورات حیات کی رو سے یہ سمجھ لیا جائے کہ انسانی زندگی محض حیوانوں کی طرح طبعی ۔۔۔زندگی ہے اور اسکے سامنے خورد و نوش سے بلند کوئی مقصد نہیں۔ اس تصور (کلچر) کو بقا اور دوام نصیب نہیں ہو سکتا اور جو معاشرہ ۔۔۔ن خطوط پر تشکل ہو۔ ان میں انسان کبھی امن و سکون کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ انسانی سطح پر زندگی کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے ۔۔۔اپنے زندگی کے مستقل اقدار ہوں۔ اور ان کا حصول اس کا نصب العین حیات۔ یہی وہ اقدار ہیں جن کے حصول سے انسان طبعی موت ۔۔۔سے بھی مر نہیں سکتا بلکہ حیاتِ جاوید حاصل کر سکتا ہے۔

مترفین کی نظریۂ زندگی

اب آگے بڑھو۔ قرآن نے دوسرا اصول یہ بتایا ہے کہ جس نظام میں حالت یہ ہو کہ معاشرہ میں نچلا طبقہ دن رات محنت کر کے پیدا کرے۔ اور اوپر کا طبقہ ان کی محنت پر مفت میں عیش اڑائے۔ وہ نظام کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا حق پر مبنی نظام میں کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک محنت کش طبقہ کے خون کی رنگینی دوسرے (بیکار) طبقہ ۔۔۔عشرت گاہوں کی تزئین و آرائش میں صرف ہو۔ سورۂ انبیاء میں ہے وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا ۔۔۔بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ. کتنی ہی قومیں ایسی گذری ہیں کہ ہمارے قانونِ مکافات نے انھیں ان کی زیادتیوں کی وجہ سے تباہ کر دیا۔ اور ان ۔۔۔جگہ اور قوموں نے لے لی۔ چنانچہ ان کے ساتھ ہوا یہ کہ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ. جب انھوں ۔۔۔محسوس کیا (یعنی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا) کہ ہمارا عذاب سامنے آرہا ہے تو وہ اس سے بھاگنے لگے۔

موضوع کے تسلسل کا تقاضا ہے کہ اس سے اگلی آیت فوراً سامنے لے آئی جائے۔ لیکن، اس آیت میں سلیم! ایک نکتہ ایسا آگیا ۔۔۔جس کی وضاحت کے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ غور سے سنو۔ آیت میں ہے فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ جب انھوں نے محسوس ۔۔۔کہ ہمارا عذاب آرہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا عذاب تو بہت پہلے سے آرہا تھا لیکن وہ ابھی محسوس شکل میں ان کے سامنے نمودار ۔۔۔ہوا تھا۔ وہ ان کے حواس (SENSE PERCEPTION) کی زد میں نہیں آیا تھا۔ وہ ابھی غیر مرئی شکل میں مرتب ہو رہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر عمل کا نتیجہ اسی وقت مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے جب وہ عمل سرزد ہو. لیکن یہ نتیجہ اپنے ابتدائی مراحل میں غیر محسوس
مرئی ہوتا ہے اور انسان سمجھتا نہیں کہ اسکے عمل کا نتیجہ مرتب ہو رہا ہے۔ یہ بات اسکی سمجھ میں اس وقت آتی ہے. جب وہ نتیجہ محسوس
میں سامنے آجاتا ہے۔ عمل کے ارتکاب اور اسکے نتیجے کے محسوس شکل میں سامنے آنے کے درمیانی وقفہ کو اجل یا میعاد کہتے ہیں. اس
کا وقفہ بھی کہا جاتا ہے (اسکی پوری تشریح ذرا آگے چل کر آئے گی) غلط نظام کی حامل قومیں، اپنی عقل و فکر اور تدبر و سیار
رُو سے ان تمام دروازوں، کھڑکیوں، روشندانوں اور رخنوں کو بند کر لیتی ہیں جن کے راستے وہ سمجھتی ہیں کہ بربادی اسکی
جب اس طرح سے بربادی فوراً سامنے نہیں آتی تو وہ مطمئن ہو جاتی ہیں کہ ہمارا انتظام بڑا محکم اور (OOL-PROOF
ہے. لیکن خدا کا قانون ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج کو آہستہ آہستہ بتدریج ان راستوں سے لئے آتا ہے جو ان کے فہم
بھی نہیں آسکتے۔ (سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ۱۸۲/۷) اور وہ اسے اُس وقت دیکھ پاتے ہیں. جب وہ
میں ان کے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ یہ مطلب ہے فَلَمَّا أَحَسُّوا بَأْسَنَا کا۔

بہرحال قرآن کہہ یہ رہا تھا کہ جب ان لوگوں کے سامنے ہمارا عذاب محسوس شکل میں آگیا تو وہ لگے بھاگنے. لیکن ہمارے قانون
نے انھیں آواز دی کہ لَا تَرْكُضُوا مت بھاگو. کھڑے ہو جاؤ۔ رکو. ٹھہرو. تم بھاگ کر جا کہاں رہے ہو؟ وَارْجِعُوا إِلَىٰ مَا أُتْرِفْتُمْ
فِيهِ وَمَسَاكِنِكُمْ. رکو اور لوٹ کر وہیں چلو جہاں تم نے اپنے عیش و عشرت کے سامان جمع کر رکھے تھے. اور غریبوں کی کمائی سے بڑے
ذی شان محلات تعمیر کر رکھے تھے. چلو لوٹ کر وہیں چلو لَعَلَّكُمْ تُسْأَلُونَ تاکہ تم سے پوچھا

تاکہ تم سے پوچھا جائے

تم نے یہ چیزیں دوسروں کی کمائی سے کیسے بنالیں؟ تمہیں اس کا حق کیسے پہنچتا تھا؟

اس نکتے پر ذرا غور کر و سلیم! کہ قرآن نے کیا بات کہدی ہے. غلط نظام میں اوپر کا طبقہ سمجھتا ہے کہ ہم جو کچھ جی چاہے
ہیں کوئی پوچھنے والا نہیں. اول تو وہ اپنے آپ کو قانون کی زد سے باہر سمجھتے ہیں. وہ ایسی تدابیر اختیار کرتے رہتے ہیں جن سے
کی گرفت میں آہی نہ سکیں. اور اگر کہیں ایسا ممکن نہ ہو تو وہ قانون ہی ایسا بنا لیتے ہیں جس کی رُو سے وہ سب کچھ جائز ق
جو کچھ وہ کرتے ہیں (اَلَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۳۷/۴) چنانچہ نظام سرمایہ داری میں یہی کچھ ہوتا ہے
کا طبقہ اس قسم کے قوانین بنا لیتا ہے کہ وسائل پیداوار پر انفرادی ملکیت بے حد و نہایت (LIMITED-
جائز ہے. دوسری طرف وہ ارباب شریعت کو اپنے ساتھ ملا لیتا ہے اور وہ فتوے دے دیتے ہیں کہ اس قسم کی ذاتی ملکیت
حد بندی عائد کرنا مداخلت فی الدین ہے. اس طرح یہ سب کچھ قانوناً اور شرعاً جائز قرار پا جاتا ہے۔ اور اس کے متعلق ان
پوچھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا. لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان حیلوں اور بہانوں ان روباہ بازیوں اور دسیسہ کاریوں. ان
اور خود فراموشیوں سے تم خدا کے قانون مکافات کی گرفت سے نہیں بچ سکتے. ان سے تم اس خطرے سے محفوظ نہیں
اگر کسی نے پوچھ لیا تو اس کا کیا جواب دینگے. خدا کا قانون تو پائی پائی کا حساب لیلے گا. جب تم جہنم کو اپنی آنکھوں سے
(لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ) تو اس وقت لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ (۸/۱۰۲) تم سے ہر نعمت کے متعلق پوچھا جائے

حاصل کی گئی تھی اور کہاں صرف ہوئی تھی۔

اس وضاحت کے بعد پھر اصل آیت کی طرف لوٹو۔ قرآن کہتا ہے کہ جب ان قوموں کی طرف تباہی کا عذاب آیا۔ اور یہ دیکھکر بھاگنے لگے تو ہمارے قانون نے انھیں للکارا اور کہا کہ رک جاؤ۔ اور لوٹ کر اپنے عشرت کدوں کی طرف چلو تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ ان پر تمہارا کیا حق تھا۔ اس کے بعد ہے کہ قَالُوْا یٰوَیْلَنَآ اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیْنَ اس کے جواب میں انھوں نے زبان سے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم واقعی زیادتی کیا کرتے تھے۔ دوسرے کے حق پر غاصبانہ قبضہ جمالیا کرتے تھے۔ اور یہ تباہی اسی وجہ سے آئی ہے۔ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِیْدًا خٰمِدِیْنَ۔ لیکن اُس وقت اُن کے اس اعتراف و اقرار سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ وہ یہ کہتے رہے۔ اور ہمارا قانون انھیں تباہ و برباد کرتا رہا تا آنکہ وہ ایسے ہوگئے جیسے کوئی کٹا ہوا کھیت یا بجھا ہوا انگارہ ہو۔

اس کے بعد سلیم! قرآن ایک ایسی بات کہتا ہے جو فکر و نظر کی پوری کائنات کو اپنی طرف مرکوز کر لیتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ کچھ ہنگامی طور پر نہیں ہوتا۔ بلکہ ہمارے قانونِ مکافات کی رو سے ہوتا ہے جسے نتیجہ خیز بنانے کے لئے یہ ساری کی کائنات مصروف تگ و تاز ہے وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ (۲۱/۱۶) یہ کائنات یہ ارض و سما کا سلسلہ ہم نے یونہی کھیل تماشے کے طور پر نہیں بنا دیا۔ یہ عظیم کارگہ ایک خاص مقصد کے لئے مصروف تگ و تاز ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی عمل اپنا نتیجہ مرتب کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور اس کے ایک آیت بعد وہ آیت ہے جسے پہلے بھی درج کیا جا چکا ہے بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ (۲۱/۱۸) یہ سلسلہ کائنات اس لئے سرگرم عمل ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں حق غالب رہے اور باطل کا سر کچلا جائے۔ لہٰذا قوموں کے عروج و زوال کے لئے جو قانون ہم نے مقرر کیا ہے۔ وہ نتیجہ خیز ہو کر رہتا ہے۔ اس کے راستے میں کوئی قوت مزاحم نہیں ہو سکتی۔

تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے قوموں کی تباہی اور بربادی کے متعلق دوسرا اصول کیا بیان کیا ہے؟ اس نے کہا ہے کہ جس نظام کی رو سے ایک طبقہ دوسرے طبقہ کی محنت پر عیش کی زندگی بسر کرے، وہ نظام کبھی دیرپا نہیں ہو سکتا۔

تدبر کی فسوں سازی سے قائم رہ نہیں سکتا   جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

اب اور آگے بڑھو۔ نظام سرمایہ داری کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ ایک طبقہ محنت کرتا ہے اور دوسرا طبقہ ان کی محنت پر مفت میں عیش اڑاتا ہے۔

دانہ ایں می کارد آں حاصل برد   لقمتے بر اُمتے دیگر چرد

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ایک طبقہ دولت کو سمیٹ کر اپنے لئے مخصوص کئے جاتا ہے اور اسے نوع انسانی کی نشو و نما کیلئے کھلا نہیں رکھتا۔

دولت سمیٹنے والے قرآن کی اصطلاح میں اسے بخل کہتے ہیں۔ قرآن کا کہنا ہے کہ جو نظام بخل کے نظریہ کو دلیل راہ بنا لے اس کی حامل قوم کبھی زندہ و پائندہ نہیں رہ سکتی، اسے مٹا دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے۔ سورۂ محمد میں ہے۔

هَآ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ۔ سن رکھو کہ تمہاری کیفیت کیا ہے! تم وہ لوگ ہو کہ تمہیں کہا جاتا ہے کہ تم اپنا نظام ایسا رکھو جس میں تمہاری محنت کا ماحصل نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے اس طرح کھلا رہے کہ تم اس کے عوض میں کسی سے کچھ لینے کے طلبگار نہ ہو۔ لیکن تم میں ایسی ذہنیت رکھنے والے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو سب کچھ سمیٹ کر اپنے لئے رکھ لیتے ہیں۔ یاد رکھو وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ جو شخص دوسروں کو مال و دولت سے محروم رکھتا ہے وہ درحقیقت اپنی ذات کو اور نشوونما سے محروم رکھتا ہے۔ اس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ۔ اللہ تمہارے مال و دولت سے بے نیاز ہے اور تم اپنی نشوونما کے لئے اس کے محتاج ہو۔ بہرحال اسے اچھی طرح سن رکھو کہ اِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ اگر تم نے حق کے نظام سے منہ موڑ کر غلط روش اختیار کرلی تو وہ تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ وہ قوم تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ آیت کے آخری ٹکڑے میں قرآن نے کتنی گہری بات کہہ دی ہے! اس نے کہا کہ قوموں کی ادلا بدلی یونہی اندھا دھند نہیں ہو جاتی کہ ایک قوم مٹا دی جاتی ہے اور اس کی جگہ اس جیسی ایک اور قوم آ جاتی ہے۔ اس کی جگہ اسی جیسی قوم نے آنا ہو تو پہلی قوم کو مٹایا ہی کیوں جائے! محض تبدیلی کی خاطر تبدیلی (CHANGE FOR CHANGE SAKE) کی تجویز خدائے رب العالمین کے شایانِ شان نہیں) ایک قوم مٹتی ہی اس وقت ہے جب اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ لہٰذا اس کی جگہ وہی قوم آسکتی ہے جس میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت ہو۔ یہاں گردش دولابی نہیں کہ ایک کلچر نے کچھ وقت کے بعد مٹنا ہے اور اس کی جگہ دوسرے کلچر نے لینی ہے۔ خواہ یہ دوسرا کلچر اس پہلے کلچر جیسا یا اس سے بدتر ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں حق و باطل کی کشمکش ہے۔ مٹتی وہ قوم ہے جو حق پر نہ رہے اور اس کی جگہ آتی وہ قوم ہے جو اس کے مقابلہ میں حق پر ہو۔ یہ ہیں معنی ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ یعنی وہ قوم تمہارے جیسے کلچر کی حامل نہیں ہوگی۔

اس کے بعد قرآن ایک ایسی حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ نگہ بصیرت جوں جوں اس پر غور کرتی ہے، وجد و مسرت سے جھوم اٹھتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں قوموں کی موت و حیات کا ایک ایسا راز پوشیدہ ہے جس تک بہت کم نگاہیں پہنچتی ہیں۔ دنیا میں ہر پروگرام کے دو حصے ہوتے ہیں۔ پہلا حصہ پلان اور اسکیم کا ہوتا ہے۔ اس میں پروگرام کے مختلف پہلوؤں پر فکری طور پر غور کیا جاتا ہے۔ اس کے ماعلیہ و مالہ (PROS & CONS) کو سامنے لایا جاتا ہے۔ اس کی عملی تشکیل کے مختلف نقشے بنائے جاتے ہیں۔ اس پر پوری پوری تمحیص کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حصہ محض لفظوں اور باتوں، کاغذوں اور لکیروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن اس پروگرام کی تکمیل کے لئے یہ ہوتا ہے نہایت ضروری۔ جب اس حصہ کی تکمیل ہو جاتی ہے، تو پھر اس پروگرام کا عملی پہلو شروع ہو جاتا ہے اور جو چیزیں اس وقت تک باتوں تک محدود تھیں وہ اب رفتہ رفتہ محسوس پیکروں میں سامنے آنے لگ جاتی ہیں۔ جو قوم اس طرح پروگرام بناتی اور انھیں تکمیل تک پہنچاتی ہے

محض باتیں بنانے والے

کامیاب و کامران رہتی ہے لیکن اگر کوئی قوم ساری عمر اسکیمیں ہی بناتی رہے، تمام وقت سوچتی ہی رہے، زندگی بھر باتیں ہی کرتی رہے۔ اور عملاً ایک قدم نہ اٹھائے۔ وہ قوم تباہ و برباد ہو کر رہتی ہے۔

فکر کتنی ہی ثریا بوس اور اسکی نگاہ کیسی ہی فلک رس کیوں نہ ہو۔ بالفاظ دیگر قومیں محض فلسفے کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتیں۔ زندگی عمل سے ہے۔ فلسفہ فکری صلاحیتوں کو جلا دیتا ہے تاکہ ان سے عمل کی راہیں روشن ہو جائیں۔ لیکن اگر کوئی قوم محض فلسفی بن کر رہ جائے اور عمل کے کوئی قدم نہ اٹھائے تو اسکی مثال اس راہگذر کی ہوگی جو رات چلنے کے لئے شمع روشن کرے لیکن اس شمع کو لیکر اپنی کوٹھڑی میں بیٹھ رہے ظاہر ہے کہ یہ مسافر عمر بھر اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکیگا۔ اور اسکی لالٹین کا تیل بھی بیکار جلے گا۔ جو قومیں عمل سے بیگانہ ہو جائیں ان کے مفکر مابعد الطبیعاتی مسائل (METAPHYSICAL PROBLEMS) کے حل کرنے میں دماغ سوزی کرتے رہتے ہیں۔ اور ان کے لیڈر اسکیمیں بنانے میں مصروف اور بیانات دینے اور تقریریں کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ اور دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بڑے کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہیں۔ حالانکہ نہ ان مفکرین کے افکار اور نہ ان لیڈروں کے الفاظ قوم کو تباہی سے بچا سکتے ہیں۔ جو قوم زندگی کے عملی مسائل کی طرف سے آنکھیں بند کرکے نظری مباحث میں الجھ کر رہ جاتی ہیں، اس کی موت یقینی ہے۔ اسی لئے اقبال نے کہا ہے کہ

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے   بری ہے مستی اندیشہ ہائے افلاکی

قرآن نے اسے خوض سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی ہیں بیکار باتوں میں الجھنا۔ یونہی نظری طور پر مسائل کی گہرائیوں میں اترنا۔

اب اس حقیقت کے دوسرے پہلو کو لو۔ زندگی کا تعلق بیشتر ان معاملات سے ہے جن کی کوئی نہ کوئی افادی حیثیت (UTILITARIAN VALUE) ہو لیکن انسانی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ اسے کام کے ساتھ ساتھ اعصاب کے سکون کی بھی ضرورت ہے۔ فنونِ لطیفہ (FINE ARTS) کا زیادہ تعلق زندگی کے اسی پہلو سے ہے۔ انسانی زندگی میں کام کی حیثیت اگر پٹرول کی ہے تو فنونِ لطیفہ کی حیثیت موبل آئل کی ہے۔ اس سے زندگی کے موٹر کے پرزے آپس میں رگڑ نہیں کھاتے۔ ان میں (FRICTION) نہیں پیدا ہوتی۔ لوچ اور لچک رہتی ہے لیکن آپ

فنونِ لطیفہ

سوچئے کہ اگر کسی موٹر میں پٹرول کی جگہ بھی موبل آئل ہی ڈال دیا جائے تو وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکیگا۔ یہی حالت ان قوموں کی ہوتی ہے جو زندگی کے عملی پہلوؤں کو یکسر نظر انداز کر دیں اور اپنی ساری توجہ فنونِ لطیفہ کی ترقی اور نشو و نما پر مرکوز رکھیں۔ وہ قوم مصافِ زندگی میں دوسری قوموں کا مقابلہ کبھی نہیں کر سکتی۔ قرآن نے اسے لعب سے تعبیر کیا ہے۔ جس کے معنی کھیل تماشے کے ہوتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ جو کلچر خوض اور لعب ہی کو مقصودِ حیات سمجھے اس کی حامل قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ سورۂ معارج میں ہے کہ إِنَّا لَقَادِرُونَ أَن نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ۔ ہم اس پر قادر ہیں کہ اس مخاطب قوم کی جگہ ایک ایسی قوم کو لے آئیں جو ان سے بہتر ہو۔ یہ ہمیں ایسا کرنے سے روک نہیں سکتے فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتَّىٰ يُلَاقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ (۴۱-۴۲ / ۷۰) سو تو انھیں خوض و لعب میں مشغول رہنے دے۔ تا آنکہ وہ روز بد ان کے سامنے آجائے جس کے متعلق ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ آکر رہے گا۔

تاریخ کے اوراق پر یونان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس قوم کا حکمت و فلسفہ میں یہ عالم تھا کہ ان کے مفکرین کا شمار آج تک دنیائے فکر کی صفِ اول میں ہوتا ہے۔ اسکے ساتھ ہی فنونِ لطیفہ (مصوری، مجسمہ تراشی، موسیقی اور شاعری) میں بھی وہ جس مقام تک پہنچ چکے تھے بہ حیثیت مجموعی اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی لیکن عملی اور افادی دنیا میں ان کی یہ حالت تھی کہ وہ ایک سوئی تک بھی اپنے ہاں تیار نہیں کر سکتے تھے نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ قوم اس طرح نیچے گری کہ اسے پھر ابھرنا نصیب ہی نہیں ہوا۔ ان کا بلند ترین فلسفہ اور لطیف ترین فنون انھیں اس

اس تباہی سے قطعاً نہ بچا سکے۔ ان کی جگہ ان قوموں نے لے لی جو خیر منہم (ان سے بہتر) تھیں۔ استبدال اور استخلافِ قومی کا یہ بھی ایک اہم پہلو ہے جسے قرآن نے اس انداز سے پیش کیا ہے۔

جدوجہد سے جی چرانے والے

اسکے بعد قرآن نے ایک ایسا قانون پیش کیا ہے جسے ان تمام قوانین کا اصل الاصول اور ان تمام اصولوں کا لب لباب کہنا چاہیئے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ مسلسل جدوجہد، پیہم سعی و عمل، غیر منقطع و تازہ۔ ان تھک کوشش اس کا نام ہے زندگی۔

گردشِ پیہم سے پختہ تر ہے جامِ زندگی ۔۔۔ ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

جو قوم جس سانس میں جدوجہد (جہاد) سے جی چراتی ہے اسی سانس میں اس پر موت طاری ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ موت درحقیقت نام ہی ترکِ عمل کا ہے۔

مگر کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری ۔۔۔ جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

قرآن نے اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ جو قوم جہادِ زندگی سے جی چراتی ہے۔ تباہ و برباد ہو جاتی ہے سورۃ توبہ میں ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِیْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ اے جماعت مومنین! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں باہر نکلو تو تمہارے پاؤں بوجھل ہو کر زمین کیر ہو جاتے ہیں اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَةِ کیا تم مستقبل کو چھوڑ کر مفادِ عاجلہ پر ریجھ گئے ہو فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ۔ اگر ایسا ہی ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تمہارے مستقبل کے مفاد کے مقابلہ میں کچھ حیثیت ہی نہیں رکھتا اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا اگر تم جہادِ زندگی کے لئے باہر نہ نکلو تو تم پر سخت تباہی آ جائیگی وَّیَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ اور خدا کا قانونِ مکافات تمہاری جگہ ایک دوسری قوم لے آئیگا وَلَا تَضُرُّوْهُ شَیْـًٔا اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۹/۳۸-۳۹) اللہ کا قانون نافذ العمل ہے، اس میں اس کی قدرت ہے۔

ان مقالات میں تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ قرآن نے قوموں کے عروج و زوال اور انکی موت و حیات کے لئے کیا قوانین وضع کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تم تاریخِ انسانیت پر غور کرو اور دیکھو کہ ہر قوم کی داستان کس طرح انہی قوانین کی صداقت کی شہادت بہم پہنچاتی ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ جب پہلے یہی کچھ ہوتا رہا ہے تو اب بھی یہی کچھ ہوگا۔ وراثتِ ارض نہ آباؤ اجداد سے ترکہ میں مل سکتی ہے نہ بخشش میں۔ اس کے لئے ایک اٹل قانون مقرر ہے۔ وہ قانون کیا ہے اسے قرآن نے چند الفاظ میں یوں سمٹا کر رکھ دیا ہے جیسے آنکھ کے تل میں پہاڑ۔

صلاحیت بنیادی شرط ہے

سورۂ انبیاء میں ہے: وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ ہم نے ہر آسمانی صحیفہ میں قوانین اور تاریخی یادداشتیں درج کر دینے کے بعد اس اصول الاصول کو محکم طور پر بیان کر دیا اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے زمین کے وارث وہی لوگ ہو سکتے ہیں جن میں اسکے لئے ضروری

ِی ھٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ (۲۱/۱۰۶) یہ قانون ایسا ہے جس میں ہر اس قوم کے لئے جو اپنی زندگی کو نظامِ خداوندی کے تابع رکھنا
ایک دور رس حقیقت پوشیدہ ہے۔ اسی محکم اصول کے مطابق خود مسلمانوں سے کہدیا کہ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ۔ جو لوگ تم میں سے خدا کے قانون کی محکمیت پر یقین رکھ کر اسکے

اف فی الارض متعین فرمودہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں گے۔ ان کے متعلق خدا کا فیصلہ ہے کہ وہ انھیں زمین میں
ت عطا کرے گا۔ اور یہ چیز انھیں کسی خصوصی رعایت (AS A SPECIAL FAVOUR) نہیں ملیگی۔ یہ خدا کے اس اٹل قانون کی رو سے ہوگی جسکے مطابق
ابقہ کو بھی حکومت ملتی رہی ہے کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ (جیسا کہ اس نے اقوامِ سابقہ کو حکومت عطا کی تھی) یہ اسلئے ہوگا کہ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ
ی ارْتَضٰی لَھُمْ تاکہ وہ نظامِ زندگی (دین) جسے انکے لئے تجویز کیا گیا ہے متمکن ہو جائے (اس سے واضح ہے سلیم! کہ حکومت کے بغیر دین متمکن 'ABLISHED
ہیں ہو سکتا) وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا۔ اور تاکہ وہ انکے خوف کو امن سے بدل دے۔ اس سے ہوگا یہ کہ یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ
. وہ صرف میرے قوانین ہی کی محکومیت اختیار کرسکینگے اور ان میں کسی اور کے قوانین کو شریک نہیں کرینگے (اس سے یہ بھی واضح ہے کہ خدا کی
ے مقصود کیا ہے اور وہ کس طرح اپنی حکومت میں ہی ادا ہو سکتی ہے۔ اگر عبادت سے مقصود محض نماز روزہ کی ادائیگی ہو تو اسکے لئے اپنی حکومت
رت ہی نہیں۔ انھیں تو محکوم مسلمان بھی اسی طرح ادا کرتے رہتے ہیں جس طرح آزاد) اسکے بعد ہے وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ
لْفٰسِقُوْنَ (۲۴/۵۵) اور جس قوم نے اس قسم کے ایمان و عملِ صالح کے بعد پھر انکار کی راہ اختیار کرلی تو ان کے متعلق سمجھ لو کہ وہ سیدھے راستے سے
ے۔ اس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ فَھَلْ یُھْلَکُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (۴۶/۳۵)

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رو سے قوموں کی موت اور حیات کے لئے ایک محکم قانون مقرر ہے۔ جو قوم اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرتی
ے زندگی کی توانائیاں مل جاتی ہیں۔ جس کا نتیجہ عروج و اقبال ہوتا ہے۔ جو اس قانون کے خلاف زندگی بسر کرتی ہے اسکے حصہ میں تباہیاں اور بربادیاں
ا نے یہ قانون مقرر کر دیا اور انسان کو اس کا اختیار دیدیا کہ وہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کرلے۔ اگر وہ چاہے تو زندگی بخش اصولِ حیات
رکرلے اگر چاہے تو فنا در آغوش راستے پر چل پڑے۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ اس باب میں قرآن نے کسقدر واضح تعلیم دیدی ہے۔ لیکن تم حیران
ہ کہ اسی قرآن کی حامل قوم (مسلمان) اب یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ یہاں اختیار و ارادہ کا سوال ہی کوئی نہیں۔ انسان مجبورِ محض واقع ہوا ہے۔ افراد کی
ہوموں کی موت اور زندگی کا بھی ایک وقت مقرر ہے اور جب وہ وقت آجاتا ہے تو اسمیں ایک ساعت کی بھی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ نہ کوئی قوم اپنی
شوں سے اس مدت کو بڑھا سکتی ہے۔ نہ اپنی کوتاہیوں اور لغزشوں سے اسمیں کمی کر سکتی ہے۔ اور حیرت بالائے حیرت یہ کہ اپنے اس (یکسر غیر قرآنی عقیدہ)
ائید میں سند بھی قرآن ہی سے پیش کرتی ہے۔ سچ کہا تھا قرآن نے کہ یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا وَّیَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا (۲/۲۶)۔ اقبال کے الفاظ میں۔

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم — جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز — تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا — کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اس عقیدہ کی تائید میں قرآن کی جو آیت پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ. فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَا

ہر قوم کی اجل

يَسْتَقْدِمُوْنَ. (۷ ؍ ۳۴) ہر قوم کیلئے ایک اجل ہے جب انکی اجل آجاتی ہے تو ایک ساعت کی بھی کمی بیشی
میں انہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ ہر عمل اور اسکے نتیجے کے ظہور میں ایک وقفہ ہوتا ہے اس وقفہ کی مدت
کہا جاتا ہے اس اجل (ظہور نتائج کے وقت) سے پہلے پہلے اگر وہ قوم اپنی روش بدل لے تو وہ اپنی سابقہ غلط روش کے تباہ کن نتائج سے
جب وہ نتائج مرتب ہو کر سامنے آجائیں تو پھر انھیں کوئی نہیں ٹال سکتا. مختلف اعمال کے لئے یہ مہلت کا وقفہ (اجل) مختلف ہوتا ہے
کے بعد پھل دیدیتا ہے اور کھجور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ چالیس سال کے بعد پھل لاتی ہے یا مثلاً تھوڑی مقدار میں افیون کھانے سے (NING
ہوتی ہے اور ایک ہی بار زیادہ کھا لینے سے فوری موت واقع ہو جاتی ہے جسے ہم موت کہتے ہیں وہ درحقیقت ظہور نتائج کا وقت ہوتا ہے
سے مرتب ہونا شروع ہو چکے ہوتے ہیں. انکی نمود ایک خاص وقت پر جاکر ہوتی ہے اسے اجل کہتے ہیں.) اور اسکے لئے بھی قانون مقرر ہے
اعمال کے ظہور نتائج کے لئے کتنی مدت (اجل) درکار ہے اور فلاں قسم کے اعمال کے لئے کتنی. دیکھو، قرآن نے اس حقیقت کو
میں بیان کیا ہے. جیسا کہ تم دیکھ چکے ہو، سورۂ اعراف میں ہے لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ (۷ ؍ ۳۴) (ہر قوم کیلئے ایک اجل ہے) اور
وَلِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳ ؍ ۳۸) (ہر اجل کیلئے ایک قانون مقرر ہے) يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ. خدا کا یہی قانون مشیت ہے
کا محو و ثبات عمل میں آتا رہتا ہے. قومیں مٹتی رہتی ہیں اور ثابت و قائم رہتی ہیں. یہ قانون مشیت انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہے.
قانون ہے جس کی اصل و بنیاد (سرچشمہ ROOT) خود خدا کے پاس ہے. وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ (۱۳ ؍ ۳۹) لہٰذا کوئی اس میں تغیر و تبد
یہ انسانوں کی دسترس سے باہر ہے. اب سوال یہ ہے کہ وہ قانون کیا ہے جس کی رو سے قوموں کا محو و ثبات عمل میں آتا رہتا ہے؟
يَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ (۴۲ ؍ ۲۴) خدا اپنے قانون کی رو سے باطل کو محو کرتا رہتا ہے اور حق کو محکم اور اٹل بناتا ہے
جاتا ہے جو باطل پر مبنی ہو اور وہ باقی رہتا ہے جو حق پر استوار ہو.

اگرچہ یہ اصول بالکل واضح طور پر سامنے آچکا ہے کہ وہ کونسا کلچر ہے جس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور وہ کونسا کلچر
کی صورت مضمر ہے لیکن قرآن تجریدی اصولوں (ABSTRACT PRINCIPLES) کو محسوس مثالوں (E EXAMPLES
سے واضح کر دیتا ہے تاکہ ان کا صحیح مفہوم متعین کرنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہو اور ان میں کوئی ابہام یا ایہام نہ ہے چنانچہ اس نے
محسوس مثال سے فیصلے واضح کر دیا ہے کہ وہ کونسا کلچر یا نظام ہے جس میں دوام و استمرار کی صلاحیت ہوتی ہے

بقا کا محکم اصول

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا اللہ بادلوں سے بارش برساتا ہے تو ندی نالے
مطابق بہنے شروع ہو جاتے ہیں فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا تو یہ سیلاب زمین کے خس و خاشاک کو پرکاہ کی طرح بہا کے لے جا
منفعت بخش مٹی زمین میں جذب ہو جاتی ہے اور کوڑا کرکٹ جس میں نفع رسانی کی صلاحیت نہیں ہوتی، نذر سیلاب ہو جاتی ہے.
یہ پہلی مثال ہے. دوسری مثال ہے وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ سونے یا
سنار اپنی کٹھالی میں ڈال کر آگ میں تپاتا اور گلاتا ہے تاکہ اس سے زیور یا اور سامان بنائے تو اس میں ملا ہوا کھوٹ جھاگ کی

یَضۡرِبُ اللّٰہُ الۡحَقَّ وَ الۡبَاطِلَ ۔ اسی طرح خدا کے قانون کے مطابق حق و باطل کی کشمکش جاری رہتی ہے فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذۡهَبُ
جُفَآءً جو جھاگ کی طرح اوپر آجاتا ہے رائیگاں چلا جاتا ہے۔ وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ ، اور جو چیز نوع انسانی
نفع بخش ہوتی ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ کَذٰلِکَ یَضۡرِبُ اللّٰہُ الۡاَمۡثَالَ (۱۳/۱۷) اسی طرح اللہ محسوس مثالوں کے
مجرد حقائق کی وضاحت کرتا ہے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے بقاء دوام کے لئے کیا قانون بتایا ہے؟ یہ قانون کہ مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ
فِی الۡاَرۡضِ۔ اسی کلچر اور نظام میں باقی رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو تمام نوع انسانی کی نفع رسانی کا موجب ہو۔ کسی خاص خاندان،
گروہ، خاص پارٹی، خاص جماعت یا خاص قوم کی نفع رسانی کا موجب نہیں۔ تمام نوع انسانی کی نفع رسانی کا موجب۔
میں سمجھتا ہوں سلیم! کہ یہ وہ اصول ہے جسے خورشید کی شعاعوں سے صفحۂ آسمان پر لکھ دینا چاہیئے تاکہ یہ حقیقت دنیا کی ہر قوم کے
پر واضح ہو جائے کہ بقاء دوام کا ابدی قانون کیا ہے۔ مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ۔

باز آفرینی کی صورت!

اس کے بعد تمہارا یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ذلت و خواری کی جس پستی میں ہم (مسلمان) گر چکے ہیں، کیا ہمارے لئے اس سے نجات کی بھی کوئی صورت ہے یا ہم ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہلاک ہو چکے ہیں اور ہماری باز آفرینی کی کوئی
صورت باقی نہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں! اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ تمہیں دوبارہ زندگی مل سکتی ہے۔ تم پھر عروج تک پہنچ سکتے ہو بشرطیکہ ......
یہ ٹکڑا بہت غور طلب ہے۔ بلکہ یہی تو اس ساری کہانی کی جان ہے۔ بشرطیکہ ...... لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے چند چیزیں بطور تمہید سامنے لانا ضروری ہیں۔
تم نے دیکھا ہے کہ قوموں کی موت اور حیات کے معنی ہیں مختلف کلچرز کا باہمی ٹکراؤ۔ قرآن نے مختلف کلچرز کو دو بنیادی شقوں (CATEGORIES)
میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک کلچر وہ ہے جس میں ایک قوم قوانین خداوندی کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ اسے قرآن نے صلوٰۃ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ دوسرا کلچر
وہ جس میں انسان خود اپنے خیالات اور خواہشات کی اتباع کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ حضرات انبیاء کرام اور ان کی متبع جماعتیں صلوٰۃ کے کلچر
پر قائم ہوتی ہیں جس کا نتیجہ ہر قسم کی شادکامی اور کامرانی ہوتا ہے لیکن پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہو جاتے ہیں جو اس روش زندگی کو چھوڑ
کر دوسرا کلچر اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اس طرح یہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ سورۂ مریم میں مختلف انبیاء کرام کے تذکار جلیلہ کے سلسلہ میں فرمایا کہ یہ وہ حضرات
تھے جنہیں اللہ نے زندگی کی ہر قسم کی آسودگیوں اور خوشحالیوں سے نوازا (اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡهِمۡ) لیکن ان کے بعد

فَخَلَفَ مِنۡۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ یَلۡقَوۡنَ غَیًّا (۱۹/۵۹)

ان کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہو گئے جنہوں نے صلوٰۃ کے نظام کو ضائع کر دیا اور اپنے خیالات اور خواہشات ہی کے پیچھے
چل پڑے۔ سو ایسا کرنے والوں کی سرکشی کے نتائج ان کے سامنے آکر رہتے ہیں۔

انجام

ظاہر ہے کہ نظام صلوٰۃ کے قیام کا نتیجہ نعمائے زندگی سے سرفرازی ہے اور اسے ترک کر دینے کا انجام ان آسودگیوں سے محرومی ہے۔
اس کے بعد مسلمانوں کی طرف آیئے۔ سورۂ فاطر میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو وحی کے ذریعے اپنا آخری پیغام دیدیا اور حضورؐ کے بعد ثُمَّ
اَوۡرَثۡنَا الۡکِتٰبَ الَّذِیۡنَ اصۡطَفَیۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا۔ ہم نے اپنے بندوں میں سے ایک منتخب قوم کو اس کتاب کا وارث بنایا۔ یہ قوم اپنے اولیں ایام

میں اس نظام کو قائم کرنے میں پیش پیش رہی۔ پھر اگلا دور آیا تو ان کی حالت بین بین کی سی ہوگئی۔ اور اس کے بعد یہ بالکل دوسرے چل پڑے فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ وَمِنۡهُمۡ مُّقۡتَصِدٌ وَمِنۡهُمۡ سَابِقٌۢ بِالۡخَيۡرٰتِ بِاِذۡنِ اللّٰهِ (۳۵/۳۲) ہم اس تیسرے دور میں ہیں۔ اسی قرآن نے سورۂ عمران میں زیادہ وضاحت سے بیان کیا ہے۔ اس میں پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی راہ کون سی ہے اور اسے حضرات انبیاء کرام نے اختیار کیا۔ اسکے بعد اس حقیقت کا اعلان ہے کہ فلاح و فوز اور سعادات و برکات کی یہی ایک راہ ہے۔ وَمَنۡ يَّبۡتَغِ غَيۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِيۡنًا فَلَنۡ يُّقۡبَلَ مِنۡهُ ۚ وَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ (۳/۸۵)۔ جو قوم اس راہ کو چھوڑ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرلیگی تو اسکی یہ راہ قابلِ قبول نہ ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ آخر الامر تباہ و برباد ہو جائیگی۔ اس کے بعد مسلمانوں کی تاریخ سامنے لائی گئی ہے جسمیں کہا گیا ہے کہ كَيۡفَ يَهۡدِى اللّٰهُ قَوۡمًا كَفَرُوۡا بَعۡدَ اِيۡمَانِهِمۡ بھلا سوچو کہ خدا اس قوم پر زندگی کی راہیں کس طرح کشادہ کردیگا جس نے ایمان کے بعد کفر کی راہ اختیار کرلی ہو وَشَهِدُوۡۤا اَنَّ الرَّسُوۡلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الۡبَيِّنٰتُ۔ حالانکہ ان کی طرف خدا کا واضح ضابطۂ حیات آچکا تھا۔ اور وہ آنکھوں سے مشاہدہ کرچکے تھے کہ ان کے رسول نے اس ضابطۂ حیات پر عمل پیرا ہو کر کس طرح تعمیری نتائج پیدا کر دکھائے تھے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد اس قوم نے کفر کی راہ اختیار کرلی وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ۔ سو ایسی ظالم قوم کو خدا کس طرح سعادتوں کی راہ دکھائے! اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمۡ اَنَّ عَلَيۡهِمۡ لَعۡنَةَ اللّٰهِ وَالۡمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِيۡنَ۔ ان کی اس روش کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قوم ان آسودگیوں سے محروم ہوگئی جو نظامِ خداوندی سے وابستگی سے حاصل ہوئی تھیں۔ اور ان تمام آسائشوں سے بھی محروم ہوگئی جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے سے ملتی تھیں حتیٰ کہ انکی ذلت و پستی کی وجہ سے دوسری قومیں بھی انھیں اپنے پاس نہیں آنے دیتیں۔ دور دور رکھتی ہیں لَا يُخَفَّفُ عَنۡهُمُ الۡعَذَابُ وَلَا هُمۡ يُنۡظَرُوۡنَ اس بنا پر کہ انھوں نے اپنا نام مسلمان رکھ چھوڑا ہے انکی اس تباہی میں کسی طرح کمی واقع نہیں ہوسکتی۔ نہ ہی اس سے زیادہ مہلت مل سکتی تھی جتنی مہلت خدا کے قانونِ امہال و تدریج کی رو سے ملا کرتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ان کی یہ محرومی ابدی اور یہ تباہی ہمیشہ کے لئے ہے یا اس سے رستگاری کی صورت ممکن ہے قرآن کہتا ہے کہ مندرجہ بالا آیات کے بعد ہے اِلَّا الَّذِيۡنَ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ وَاَصۡلَحُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ (۳/۸۹-۸۵)۔ ہاں اگر یہ اپنی روش کو چھوڑ کر پچھلے پاؤں مڑ جائیں اور پھر اس مقام پر پہنچ جائیں جہاں سے ان کا قدم غلط راستے پر پڑ گیا تھا اور وہاں پہنچ کر پھر خدا کے عطا کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو جائیں تو خدا کا قانون اس تباہی و بربادی سے ان کی حفاظت بھی کردے گا اور ان کا پورا پورا سامان بھی مہیا کردے گا۔ بس یہی ان کی بازآفرینی کی صورت ہے۔

تم دیکھو سلیم! قرآن نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ اس امت کو جو سرفرازیاں شروع میں نصیب ہوئی تھیں وہ ان بینات (قرآن کے قوانین) پر چلنے کا نتیجہ تھیں جو انھیں خدا کی طرف سے ملے تھے۔ پھر جب انھوں نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تو یہ ان تمام برکات سے محروم ہوگئے اور اب ان کی بازیابی کی صورت فقط ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ پھر قرآن کے مطابق نظامِ زندگی متشکل کریں۔ سوا ان کی نشاۃ ثانیہ کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی خواہ یہ کچھ ہی کیوں نہ کریں۔

کیوں سلیم! بات آئی سمجھ میں! اچھا خدا حافظ۔ والسلام۔

کنونشن کے بعد

(محترم عبد الرب صاحب)

لوع اسلام کنونشن کی روئداد دسمبر ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں قارئین کی نظروں سے گذر چکی ہے۔ کنونشن کے بعد مختلف مقامات کے اپنے اپنے مستقر کی طرف لوٹ گئے لیکن محترم پرویز صاحب احباب کے تقاضہ اور مقصد کی اہمیت کے پیش نظر سابقہ پنجاب اور ے مختلف مقامات میں گئے اور ۵ر دسمبر کو کراچی واپس آئے۔ میں ان کی رفاقت میں تھا۔ اسلئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ جو کچھ میں نے ہوں سے دیکھا اس کے اثر و کیف میں (ایک حد تک ہی سہی) قارئین طلوع اسلام کو بھی شریک کر لیا جائے۔ ایک حد تک اس و کچھ آنکھیں دیکھتی ہیں اور دل محسوس کرتا ہے۔ اسے اُسی طرح الفاظ میں بیان کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

کنونشن ۱۰ر نومبر کو ختم ہو گیا تھا۔ ۱۹ر کی صبح کو بزم طلوع اسلام لاہور کے ارباب ہمم اس مقصد کے لئے جمع ہوئے کہ جو ذرا کچھ کنونشن میں الفاظ میں کہا گیا ہے اسے عملاً متشکل کرنے کے لئے باہمی مشورے کئے جائیں اور ان میں پرویز صاحب دگی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ یہ تمام احباب یکسر تازہ دم نظر آتے تھے۔ حالانکہ انھوں نے گذشتہ دو ہفتے جس محنت اور مشقت ن رات ایک کر دیا تھا اس کا طبعی نتیجہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وہ تکمیل کار کے بعد تھکان محسوس کرتے۔ لیکن کنونشن نے زندگی اور ی جو فضا پیدا کر دی تھی اس نے، اُن جیسے جواں سال احباب کے دل میں تو ایک طرف، ہم جیسے پیران کہن سال کے عروق بھی خون زندگی دوڑا دیا تھا۔ دن بھر باہمی مشوروں اور مذاکروں میں گذرا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک مقصد کی تکمیل کے بعد ہوئے بلکہ ایک پروگرام کی ابتدا کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔ زندگی اسی کا نام ہے کہ جہاں پچھلا سانس ختم ہو وہیں سے نس کا آغاز ہو جائے۔

پروگرام کے مطابق ۱۹ر کی شام کو اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں پرویز صاحب کی عام تقریر تھی جس کا عنوان تھا "جنسیات ں کی تہذیب و تمدن پر"۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اس ضمن میں، اصل واقعہ تک آؤں، چند الفاظ تمہیداً عرض کرنا ضروری ۔ قرآن نے کہا ہے کہ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ (۲۳/۱۱۷) جو شخص قوانین خداوندی کے ساتھ ے قوانین کو بھی شامل کرے گا اسے اپنے اس مسلک کی تائید میں کوئی دلیل و برہان نہیں مل سکے گی۔ طلوع اسلام کی دعوت ااعت و فرماں پذیری خالص قوانین خداوندی کی کی جائے۔ اور ان میں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو قطعاً شریک ۔ اس دعوت کے مخالفین، ان قوانین کے ساتھ اپنے خود ساختہ قوانین کو بھی شامل کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن کے دعوٰ

صرف قوانین خداوندی کی اطاعت کرتا ہے اور ہر فرد معاشرہ کی تمام ضروریات زندگی بغیر کسی پریشانی کے از خود پوری ہوتی جاتی ہیں

جلالپور جٹاں

۲۳ کی صبح ہم جلالپور جٹاں کی طرف روانہ ہوئے۔ سیالکوٹ سے محترم صدر صاحب (خان بخت جمال خاں) بھی شریک سفر ہو گئے۔ اور بزم طلوع اسلام کراچی کے اولین سکریٹری (محترم سعید صاحب) نے بھی اپنے وطن کی سرحد تک مشایعت کی۔

جلالپور جٹاں گجرات سے قریب آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک قصبہ ہے۔ جب لاہور میں وہاں کی بزم کے نمائندگان نے پرویز صاحب کو آنے کی دعوت دی تو خیال ہوا تھا کہ ایک مختصر سے قصبہ میں قرآنی فکر کا چرچا مختصر سا ہی ہو گا۔ لیکن ان احباب کا تقاضائے شوق اس قدر شدید تھا کہ ان کی دعوت کو قبول کرنا ضروری سمجھا گیا۔ جلالپور پہنچ کر معلوم ہوا کہ ہے تو یہ ایک قصبہ ہی لیکن ایک عرصہ سے مختلف سیاسی تحریکات اور مذہبی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا ہے اس اعتبار سے اس مقام میں قرآنی فکر کا چرچا خاص اہمیت رکھتا تھا اراکین بزم نے بتایا کہ ہم یہاں صرف پانچ چھ افراد ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک کے منہ سے ایسی بات نکلی جس سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آگئی کہ زندگی اور حرارت کے لئے تعداد کے مقابلہ میں کیریکٹر کی پختگی کس قدر زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس نے کہا کہ ہم ہیں تو پانچ چھ ہی لیکن ہماری "الف بین قلوبکم" کی کیفیت یہ ہے کہ جہاں بھی ہم میں سے کوئی ایک ہو وہاں باقی ماندہ دوستوں کو پورا پورا اطمینان ہوتا ہے کہ ہمارا ہر قسم کا مفاد اور ہر قیمتی قدر اسکے ہاتھوں میں بالکل محفوظ ہے۔ اور اسی میں ہماری قوت کا راز ہے۔ کتنی بلند بات تھی جو اس دوست نے ایسے سادہ سے الفاظ میں کہہ دی! حقیقت یہ ہے کہ جیسا کہ ایک روایت میں آیا ہے مسلمان وہی ہے جس کے ہاتھ میں دوسرے بھائیوں کا ہر مفاد محفوظ ہو۔ انہی رفیقوں کی اس یگانگت کا نتیجہ تھا کہ جلالپور جیسے قصبہ میں شدت مخالفت کے باوجود، قرآن کا یہ دیا اس تابانی سے روشن تھا۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی احباب کا ایک گروہ منتظر تھا۔ پہنچتے ہی مختلف عنوانات پر سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور جب لوگ نماز مغرب کے لئے اٹھے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا شک و شبہات کے بہت سے بادل چھٹ گئے ہیں۔ رات کو اسلامیہ اسکول کے ہال میں جلسہ عام ہوا۔ پرویز صاحب کی تقریر حسب معمول بڑی مدلل فلسفہ اور موثر تھی۔ تقریر کے بعد سوالات کے لئے کہا گیا۔ اگرچہ بزم طلوع اسلام کے اراکین کو اس کا خیال تھا کہ مخالفین کی طرف سے اعتراضات کی یورش ہو گی لیکن ان کی اور ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب یہ دیکھا کہ مخالفت کی کوئی ایک آواز بھی نہ اٹھی۔ حقیقت یہ ہے کہ (جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے) مخالفین کی چال (STRATEGY) ہی یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کے کانوں تک قرآن کی آواز نہ پہنچنے پائے لیکن جب وہ اس میں ناکام رہتے ہیں اور لوگوں تک قرآن کا پیغام پہنچ جاتا ہے تو ان میں ہمت ہی نہیں رہتی کہ سامنے آسکیں۔ قرآن کی روشنی ہر تاریکی پر غالب آجاتی ہے۔ جلسہ کے بعد بہت سے حضرات قیام گاہ پر آگئے اور وہاں قریب آدھی رات گئے تک باتیں ہوتی رہیں۔ جن میں زیادہ حصہ محترم صدر صاحب نے لیا جو ہم سب کے مقابلے میں زیادہ جواں ہمت ہیں۔

پشاور

۲۴ کی صبح کو ہم نہایت خوشگوار اثرات لئے ہوئے جلالپور سے روانہ ہوئے۔ پروگرام کے مطابق ہمیں اسی شام پشاور پہنچنا تھا۔

احباب کو معلوم ہے پرویز صاحب کی صحت کراچی میں ہمیشہ خراب رہتی ہے۔ اور یہ چیز ہم تمام رفقاء کے لئے بڑی پریشانی تی ہے۔ یہ تو اُن شدید احتیاطوں اور پابندیوں کا نتیجہ ہے جو انھوں نے اپنے آپ پر عائد کر رکھی ہیں جو وہ اس کے باوجود اس قدر تے رہتے ہیں۔ مگر ہم ان کی طرف سے کبھی مطمئن نہیں ہوتے۔ کنونشن کے سلسلہ میں ہماری یہ تشویش اور بھی بڑھ گئی تھی کہ کے علی الرغم اس قدر تگ و تاز اور رستاخیز کو کس طرح برداشت کر سکیں گے لیکن ہماری حیرت اور اسکے ساتھ ہی مسرت) جب ہم نے دیکھا کہ انھوں نے کس ہمت اور توانائی سے کنونشن کے پرہجوم پروگرام کو تکمیل تک پہنچایا۔ کنونشن کے کے سلسلہ میں بھی ہمیں بڑی تشویش تھی لیکن ہم دیکھ رہے تھے کہ اس قدر تھکا دینے والے سفر اور مصروف پروگرام کے تکان کا کوئی اثر نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی زندگی اس مقصد میں اس قدر سموئی جا چکی ہے کہ مقصد میں انہماک ان توانائی پیدا کر دیتا ہے۔ یہی وہ توانائی تھی جس سے وہ لمبے لمبے سفر اس اطمینان اور خندہ پیشانی سے کئے جاتے تھے ٹھ بجے کے قریب پشاور پہنچ گئے۔

ن میں پشاور سے صرف دو دوست شریک ہوئے تھے۔ مرزا علی احمد صاحب اور مرزا نصیر الدین صاحب۔ انھوں نے لاہور تھا کہ پشاور میں مخالفت سخت ہے اور موافقت میں گنتی کے چند افراد ہیں۔ اس لئے وہاں کی دعوت صرف قلب رانی اور تحکم کاری جائے۔ مخالفت کا یہ عالم تھا کہ جب ان حضرات نے چاہا کہ مقامی اخبار میں ہماری آمد کی خبر شائع ہو جائے تو پہلے تو اس نکار ہو گیا اور جب خاص اصرار کے بعد یہ خبر شائع ہوئی بھی تو بایں نمط کہ اخبار کے آخری صفحہ پر بغیر کسی عنوان یا سرخی کے کالم کے میں یہ بیچاری اس طرح دبکی ہوئی بیٹھی تھی۔

چو زاہدے کہ بہ بزم شراب می آید

م یہ تھا کہ صبح کو قیامگاہ کے باہر کھلے احاطہ میں ان احباب سے خطاب کیا جائے جنھیں انفرادی طور پر دعوت دی گئی تھی۔ پہنچتے ہی دیکھا گیا کہ وہاں "الغوثیہ" کا سلسلہ شروع ہے۔ مخالفین میں سے ایک صاحب نے اپنے ریڈیو کے ساتھ لاؤڈ اسپیکر جس کا شور سارے احاطہ کو سر پر اٹھا رہا تھا۔ مجبوراً یہ اجتماع اپنے ہی صحن خانہ تک محدود رکھنا پڑا۔ اجتماع مختصر لیکن تھا۔ اثر اس کا یہ تھا کہ اس کے فوراً بعد طے پایا کہ سہ پہر کو اسی انداز کا اجتماع ایک اور دوست کے ہاں کیا جائے۔ دوسرا اجتماع کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا پہلے اجتماع کی خبر شہر میں پھیل گئی تھی۔ اور مختلف اطراف و جوانب سے ملنے والوں کا ع ہو گیا تھا جو رات کے کھانے تک جاری رہا۔ اس طرح پشاور کی برفانی سلوں کو توڑ کر قرآنی آواز کے لئے راستہ تراشا گیا لیکن بن گیا تو وہاں سے چشموں کا بہہ نکلنا کچھ مشکل نہ تھا۔ چنانچہ جب اگلی صبح کو وہی اخبار سامنے آیا جس کا ذکر کیا جا چکا ہے تو اس صفحہ پر جلی سرخی کے نیچے اجتماع دیروزہ کا ذکر اس حسن و خوبی سے کیا گیا تھا جو قرآنی اجتماعات کے شایان شان ہو سکتی ہے ے احباب کے خلوص و محبت اور ہمت و استقلال کا نتیجہ تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ایک مقامی کالج کے طلباء کی طرف نہ موصول ہوا کہ دوپہر کو پرویز صاحب ان سے خطاب کریں۔ لیکن چونکہ دوپہر کے لئے پہلے سے مردان کا پروگرام طے پا چکا تھا

سالئے ان عزیزوں کے تقاضۂ شوق کو دوسرے وقت پر ملتوی رکھ کر ہم ۲۶؍ کی صبح کو مردان روانہ ہو گئے۔

مردان

قارئین کو معلوم ہے کہ مردان کی بزم پہلے نمبر پہ ہے۔ مخلص اور ٹھوس کام کرنے والے خاموش احباب کی ایک بنیان مرصوص جو قرآن کے جذبہ سے سرشار ہیں۔ ہنستے ہوئے چہرے چمکتے ہوئے قدم۔ بڑھتے ہوئے ہاتھ۔ سینے روشن۔ ٹھنڈے سر۔ لیکن ان کے مقابلہ میں مخالفت بھی سخت و سنگین۔ ایسی سنگین کہ اس سے پہلے وہاں کوئی پبلک اجتماع ممکن نہ ہو سکا۔ اس مرتبہ مقامی کالج کے پرنسپل صاحب رضامند ہو گئے کہ پرویز صاحب طلباء سے خطاب کریں۔ لیکن بعد میں انھوں نے انکار کر دیا۔ ہمیں تو اس سے کچھ افسوس سا ہوا لیکن ان احباب کے رد ح رواں (یادش بخیر ڈاکٹر ٹی۔ ایم خاں صاحب) اس سے بالکل متاثر نہیں ہوئے۔ انھوں نے اپنے فطری تبسم کے ساتھ فرمایا کہ کچھ بات نہیں! یہ خود اپنے اس فیصلہ پر متاسف ہوں گے۔

مردان میں شروع ہی سے یہ انداز چلا آتا ہے کہ پرویز صاحب کی آمد کی خبر علاقہ میں پھیل جاتی ہے اور بیس بیس، تیس تیس میل دور سے احباب خیل در خیل آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہی سلسلہ اب بھی شروع ہو گیا۔ اور صبح سے رات تک قرآنی فکر و تصورات کی جوئے نور مسلسل جاری رہی۔ کس قدر جاں پرور و حیات بخش تھی یہ فضا جس میں ہر سمت سے قرآن کی آواز فردوس گوش بن رہی تھی۔

ڈاکٹر ٹی۔ ایم خاں صاحب (اور ان کے دیگر رفقاء) کے حسنِ تدبیر نے ایسی صورت پیدا کر دی کہ ۲۷؍ کی شام کو مردان کلب ہال میں ایک ایسا اجتماع ہوا جو مردان کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ اس اجتماع میں مردان کے قریب قریب تمام اعلیٰ افسر وکلاء، پروفیسر، تعلیم یافتہ طبقہ کا منتخب گروہ شامل تھا۔ مخالفین بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود تھے جن کی وجہ سے بعض چہروں پر پریشانی کے آثار دکھائی دیتے تھے اسلئے کہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ فتنہ پردازی کا کونسا پروگرام دل میں لے کر آئے ہیں۔ جو دین کی خدمت کے لئے جائز و ناجائز ہر حربہ کو عین جہاد سمجھتے ہیں۔ ان سے سب کچھ ممکن ہو سکتا تھا۔ ان حالات میں پرویز تقریر کے لئے اٹھے اور قرآن کا اعجاز دیکھئے کہ تقریب ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر میں کسی طرف سے کھانسنے تک کی آواز بھی آئی۔ سرِ اکثر آنکھیں تھیں جو اشکبار تھیں اور بیشتر سر تھے جو احترام سے نگوں تھے۔ تقریر کے بعد چاروں طرف سے تبریک و تہنیت کے غلغلے بلند ہوئے اور متفقہ طور پر کہا گیا کہ ہمیں افسوس ہے کہ مخالفین کی طرف سے اس قدر جھوٹ بولا گیا کہ ہم ان کے فریب میں آ گئے تھے اور اس لئے پہلے اس قسم کے قرآنی حقائق و معارف سے مستفید ہونے سے محروم رہے۔ ان متاسف ہونیوالوں میں وہ حضرات بھی شامل تھے جن کی وجہ سے کالج میں تقریر نہیں ہو سکی تھی بحمد اللہ کہ مردان کا یہ اجتماع اس حسن و خوبی سے اختتام تک پہنچا۔ اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ قیام گاہ پر شہر کے ارباب فکر و نظر کا تانتا بندھ گیا۔

قرآن کے مخالفین کا یہ اندیشہ بجا ہے کہ اگر کسی کے کانوں تک قرآن کی آواز پہنچ گئی تو اس کا متاثر ہوئے بغیر رہنا ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کی آواز کوئی سننے ہی نہ پائے!

راولپنڈی

۲۸؍ کی صبح کو ہم عازم راولپنڈی ہوئے۔ اور ہمارے ساتھ ہی بزم طلوع اسلام مردان کے نمائندے

ریف لائے۔ کس قدر محبت کے پیکر ہیں یہ احباب!

لپی میں بھی قرآنی پیغام کی مخالفت کم نہ تھی۔ چنانچہ اس سے قبل جب بھی پرویز صاحب وہاں تشریف لے گئے ہیں ستی لیسیار کے باوجود پبلک اجتماع کا انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ صرف ایک دوست کے ہاں (الکوثر میں) اجتماعات ایک مرتبہ تو ملا ہوا ہال بھی چھن گیا تھا۔ لیکن اس مرتبہ گارڈن کالج کے ہال میں جلسہ کا انتظام ہوا اور ریڈیو پر اس کا اعلان۔ قرآنی پیغام کے لئے سازگار ہو رہی ہے! شب کو جلسہ ہوا۔ تقریر بڑے انہماک سے سنی گئی۔ اور جلسہ کے بعد قرآن سے والے احباب نے دیر تک پرویز صاحب کو گھیرے رکھا۔ مخالفین میں سے کسی کو اعتراض کی جرأت نہ ہوئی۔ اعتراض ہو بھی سکتا تھا؟ کس کی ہمت ہے کہ قرآن کے خلاف دلیل کی بنا پر آواز اٹھائے!

ڈی کے احباب بھی خلوص و محبت میں یگانہ ہیں۔ اور ان کے یہ جذبات الوداعی اجتماع کے وقت چھلک کر اوپر آجاتے نھوں نے جس گرمجوشی سے استقبال کیا تھا۔ اسی سوز و گداز سے الوداع کہا۔ ان کے ساتھ ہی مردان کے احباب سے غم رخصت ہوئے۔

سلام کے لئے راولپنڈی سے لوٹے تو راستے میں وہ گاؤں پڑتا تھا۔ جہاں پرویز صاحب کی والدہ محترمہ اور ہمشیرہ قیام پذیر ہیں۔ مشرقی پنجاب کی تباہی کے بعد پرویز صاحب تو بسلسلہ ملازمت کراچی ان کے اعزہ اس گاؤں میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ پرویز صاحب اس تمام عرصہ میں یہاں شاید ایک دو مرتبہ آئے ہوں گے یات انہیں باہر نکلنے کی اجازت ہی نہیں دیتیں۔ اب جو ادھر سے گذرنا ہوا تو انھوں نے والدہ کے سلام کے لئے گاؤں میں ندی سمجھا۔ چنانچہ ہم ۲۹ر کی شام کو گاؤں پہنچ گئے۔ گئے تو تھے صرف والدہ کے سلام کے لئے لیکن معلوم ہوا کہ گوجرانوالہ سے شوق جمع ہیں۔ چنانچہ رات گئے تک۔ ان سے گفتگو رہی اور پچھلی رات کا باقیماندہ وقت ماں اور بیٹے کے حصہ میں آیا سے چل کر ۳۰ر کی سہ پہر کو ہم لاہور واپس پہنچ گئے۔ اور شام کو ارباب بزم اسی جذبۂ شوق اور ہمت و ولولہ سے ہو گئے۔ سفر کے کوائف اور نتائج نے احباب کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دی بالخصوص اس لئے کہ وہ انہی کی ان کوششوں ین کی وجہ سے کونشن کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔

بر کی شام دیال سنگھ کالج کے ہال میں وہ ملتوی شدہ جلسہ ہوا جس کا ذکر شروع میں کیا جا چکا ہے۔ موضوع سخن تھا۔

جنسیات کا اثر قوموں کے کلچر پر

ن سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص کالج کے طلباء کشاں کشاں آگئے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر میں ایسا تھا گویا خود سامعین کی ذہنی سطح بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی ہے۔ عفت و عصمت کے متعلق قرآن کے قوانین۔ ان کی ور حاضر کے محققین و مکتشفین کی تحقیقات کی روشنی میں ان کی تائید۔ بہت ہی بصیرت افروز اور حقیقت کشا انداز میں تی۔ تقریر کے بعد صدر جلسہ۔ محترم شیخ عبدالحق صاحب نے فرمایا کہ اگر پرویز صاحب اس تقریر کو قلمبند کر کے بھجوا دیں تو وہ

سے کالج میگزین میں چھپوائیں گے اور اپنے خرچ پر پمفلٹ کی صورت میں بھی شائع کر کے اسے قوم کے نوجوان طبقہ تک زیادہ سے زیادہ تعداد میں پہنچانے کا انتظام کریں گے۔ یہ جلسہ کالج کے ہسٹاریکل سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا۔ چنانچہ سوسائٹی کے سکریٹری صاحب نے کہا کہ پمفلٹ کو زیادہ سے زیادہ طلباء تک پہنچانے کا انتظام سوسائٹی کریگی۔ اس کے بعد پرویز صاحب سے اس کا وعدہ لیا گیا کہ وہ جب کبھی لاہور آئیں گے تو دیال سنگھ کالج کے "حق" کو فراموش نہ کریں گے۔ طلباء نے اصرار کیا کہ آئندہ پرویز صاحب کے توسیعی لیکچر بھی ہوا کریں۔ بعض طلباء نے اپنے آپ کو تربیتی مرکز میں زیر تعلیم و تربیت رہنے کے لئے پیش کیا۔ غرضیکہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ اس لیکچر سے ایسا گہرا اثر لے کر گیا جو جلدی سے محو نہیں ہو سکتا۔ یہی طبقہ درحقیقت قرآنی پیغام کا اولیں مخاطب ہے۔ اور ان کے دلوں تک قرآن کے پیغام کا اس طرح پہنچ جانا دور رس نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔

منٹگمری

منٹگمری میں بزم کا قیام حال ہی میں عمل میں آیا تھا اور کنونشن کے موقعہ پر وہاں سے دو احباب تشریف لائے تھے ایک چودھری عطاء اللہ صاحب (پلیڈر) اور دوسرے کہن سال و جوان ہمت غلام احمد خاں جالندھری۔ انھوں نے جب منٹگمری آنے کی دعوت دی تو ہم نے یہی سمجھا تھا کہ اس سے ان احباب کی ہمت افزائی ہو جائے گی۔ لیکن جب لاہور میں ان کی طرف سے پروگرام موصول ہوا تو ہم ایک طرف، خود ارباب لاہور کو رشک تھا کہ منٹگمری کی بزم ہم سے بھی آگے بڑھ گئی ہے! ہم ۲ر دسمبر کی سہ پہر کو منٹگمری پہنچ گئے۔ طلوع اسلام کے السابقون الاولون میں سے ڈاکٹر عبدالقادر خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ بڑے مخلص دوست ہیں۔ اسی شام کو روٹری کلب میں اجتماع ہوا۔ وہاں کے مختصر لیکن نہایت شستہ اجتماع میں علم کے عنوان پر تقریر ہوئی جلسہ کے اختتام پر عام ریمارکس یہ تھے کہ ہمیں اس کا علم ہی نہ تھا کہ قرآن کریم علم کی دنیا میں اتنے بلند حقائق پیش کرتا ہے! اس جلسہ میں البتہ ایک خامی محسوس ہوئی جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تقریر میں پرویز صاحب نے قرآن کی ایک آیت میں "جن وانس" کا ترجمہ "شہری اور دیہاتی آبادیاں" کیا۔ اور دوسرے مقام پر آدم کو نوعِ انسانی کا ترجمان بتایا (ان امور کی تشریح ان کی کتاب ابلیس و آدم میں کی جا چکی ہے) تقریر کے بعد دو ایک نوجوانوں نے اصل موضوع کو نظر انداز کر کے صرف انہی نکات کو سامنے رکھا اور اعتراض شروع کر دیئے۔ پرویز صاحب نے بھی کہا اور صدر صاحب نے بھی کہ یہ نکات ایسے ہیں جن پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے اور مختصر وقت میں ان کے متعلق اطمینان بخش طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن وہ اپنے اعتراضات کو برابر دہراتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ اس پر بھی رضامند نہ ہوئے کہ ان امور کی تشریح پہلے "ابلیس و آدم" میں دیکھ لیں۔ اور اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو مزید دریافت کی کاوش کریں۔ میں نے اس واقعہ کا ذکر اسلئے ضروری سمجھا ہے کہ علمی مباحث میں یہ انداز کسی صورت میں نفع بخش نہیں ہو سکتا۔ اور متلاشیان حقیقت کو اس پہلو کا خیال رکھنا چاہیئے۔

۳ر دسمبر کی سہ پہر کو بار ایسوسی ایشن کی طرف سے دعوت تھی۔ اس سنجیدہ اجتماع میں علاوہ وکلاء کے، دیگر حضرات ایسے بھی تھے جن کا تعلق قانون سے تھا۔ اس نسبت سے تقریر کا موضوع ہوا "اسلامک کانسٹی ٹیوشن"۔ اس موضوع پر پرویز صاحب کا نقطۂ نگاہ قارئین طلوع اسلام سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن وہاں کے اجتماع میں یہ چیز بالکل نئی تھی۔ تقریر چونکہ مدلل اور قرآنی تائیدات سے

لئے اس کا اثر بڑا حقیقت کشا ثابت ہوا۔ سوالات بھی موضوع سے متعلق تھے اور اچھے سلجھے ہوئے تھے۔ عصرانہ کے بعد یہ تقریب ہوئی۔

ت کو ایک عام جلسہ ہوا جس کی صدارت وہاں کے ڈپٹی کمشنر (مسٹر سی جعفری) نے کی۔ اجتماع کثیر بھی تھا اور اُجلا بھی۔ تقریر مقام محمدی تھا۔ جس کے ضمن میں نظام ربوبیت کی ایک جھلک بھی سامنے آگئی تھی۔ یہ تقریر بڑی موثر اور بصیرت افروز تھی اپنے پیچھے نہایت خوشگوار نقوش چھوڑے جن کا تذکرہ دوسرے دن متواتر ہوتا رہا۔

رکی سہ پہر کو ایک دلچسپ تقریب ہوئی۔ یہ ایک نجی قسم کا اجتماع تھا۔ جس میں ہر شخص کو اجازت تھی کہ وہ جو سوال چاہے کرے۔ چنانچہ روٹی کے مسئلہ سے لے کر انسانی ذات کے منتہیٰ اور نکاح و طلاق کے مسائل سے لے کر ذات و صفات کے شئون تک مختلف گوشوں سے متعلق سوالات سامنے آئے اور ایک ایک کے متعلق قرآن کی روشنی میں نہایت وضاحت بتیے گئے۔ یہ پرمغز اور شگفتہ محفل اس وقت تک قائم رہی، جب تک ہماری گاڑی کا وقت نہیں ہوگیا۔ چنانچہ وہاں سے اسٹیشن پر آگئے (موٹر ہم نے منٹگمری سے واپس بھیج دیا تھا) اور شام کے سات بجے کے قریب تیز گام میں سوار ہو گئے۔ کے روانہ ہونے تک سوالات کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ انہی حسین مذاکرات کی فضاؤں میں ہم نے منٹگمری کے احباب کو الوداع کہا

بازگشت

تیز گام۔ ایم ہاسمی۔ فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔ گذشتہ تین ہفتہ تک کے کوائف ایک ایک کرکے میری آنکھوں کے سامنے سینما کے فلم کی طرح آرہے تھے۔ دو باتیں بالکل نمایاں تھیں۔ ایک تو یہ کہ پرویز صاحب سے میرے تعلقات بیس برس سے ہیں۔ اس تمام دوران میں ان کے خیالات۔ ان کے قرآنی تصورات۔ طلوع اسلام اور اس کے مشن سے مسلسل رہا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ان خیالات کی ابتداء ہوئی تھی تو یہ آواز کس قدر نامانوس اور غریب الدیار تھی لیکن یہ فرد کے قرآن سے والہانہ عشق۔ کوہکن کی سی محنت اور بے پناہ استقامت نے آج یہ کیفیت پیدا کر دی ہے کہ خیبر سے مالی تک کوئی شہر، کوئی قصبہ، کوئی گاؤں، کوئی کوچہ ایسا نہیں جس تک یہ آواز نہ پہنچ چکی ہو اور دوسری بات یہ کہ نظام کے متعلق جو کچھ اس وقت تک کہا جا چکا ہے وہ کم نہیں ہے اب ضرورت یہ ہے کہ اس کی اشاعت کو زیادہ وہ وسیع کیا جائے۔ بس یہی ایک کام کرنے کا ہے۔ اگر ہم نے یہ کام کر دیا تو پھر اس نظام کے متشکل ہو کر سامنے آجانے میں دیر نہیں لگ سکتی۔ دنیا اس نظام کے لئے بےحد تشنہ ہے۔

یہ تھے وہ خیالات جن میں میں مستغرق تھا کہ ۹ دسمبر کو بارہ بجے کے قریب کراچی چھاؤنی کا اسٹیشن آگیا۔ جہاں قرآنی احباب موش خندہ پیشانی کے ساتھ موجود تھے۔ رفقاء کو بخیریت دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اور اس امر سے بے حد اطمینان کہ پرویز صاحب ر طول طویل سفر اور ایسے پرہجوم پروگرام کو بحسن و خوبی تکمیل تک پہنچا کر بعافیت واپس آگئے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک لیکن معلوم ہوا کہ ان کی یہ خیریت صرف اس جذب و انہاک کی وجہ سے تھی جو اپنے مقصد کی تکمیل کے سلسلہ میں ان کو اس نیط تھی۔ کیونکہ یہاں پہنچ کر اگلی ہی صبح کو ان کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ اور ان سطور کے سپرد قلم کرنے تک وہ علیل ہیں اگرچہ

[redacted]

اب حالت نسبتاً بہتر ہے۔

یہ ہیں کنونشن کے بعد کے کوائف و تاثرات جنہیں میں نہایت مختصر الفاظ میں پیش خدمت کر سکا ہوں۔ بعید از سپاس گذاری ہوگا اگر میں اپنی طرف سے اور اپنے دیگر رفقائے سفر (منجملہ پرویز صاحب) ان احباب کا دلی شکریہ ادا نہ کروں۔ جنہوں نے اس سفر میں ہمارے راحت و آرام کا اس قدر خیال رکھا اور سفر کے اس مقصد کو کامیاب بنانے میں اس قدر زحمت اٹھائی۔

چند احباب کے نام نامی برسبیل تذکرہ اوپر آچکے ہیں۔ ورنہ بحمداللہ ان رفقاء کی فہرست طول طویل ہے۔ مثال کے طور پر لاہور میں محترم چودہری عبدالرحمٰن صاحب۔ عبداللطیف نظامی صاحب۔ آفتی راحمد صاحب۔ مرزا محمد خلیل صاحب۔ عبدالرؤف صاحب۔ ڈاکٹر احمد حسن صاحب۔ ڈاکٹر عبدالودود صاحب وغیرہم۔ سیالکوٹ میں محمود سبحانی و فیض احمد صاحبان اور ان کے ساتھی۔ جلالپور میں مرزا غلام حسین صاحب اور ان کے رفیق۔ پشاور میں ڈاکٹر یوسف علی اور ضیا صاحبان۔ مردان میں ڈاکٹر آر۔ ایم خاں صاحب۔ ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب۔ ڈاکٹر انور صاحب۔ مولانا عبدالحی صاحب اور مستری محمود صاحب۔ راولپنڈی میں عزیز احمد قریشی صاحب فیروز علی بھٹی صاحب۔ قدرت اللہ صاحب۔ آصف صاحب اور راولپنڈی بزم کے جواں ہمت سکریٹری مع دیگر رفقائے کار۔ ان سب کی یاد ہمارے لئے بہترین تحفہ ہے۔ ہاں محترم زبیر عزیز صاحب کا نام تو رہ ہی گیا جنہوں نے کنونشن میں شرکت کے بعد منٹگمری کے اجتماعات میں بھی ازکارہ تشریف لاکر شرکت کی۔

ایک معذرت

بعض دوستوں نے کنونشن کے بعض مناظر کی تصاویر کھینچ لی تھیں۔ کنونشن کے بعد بعض احباب نے مشورہ دیا کہ ان تصاویر کو طلوع اسلام میں شائع کیا جائے۔ تاکہ کنونشن کے ماجریات جو الفاظ و حروف کی شکل میں منضبط کئے گئے ہیں، آثار و نقوش کے رنگ میں محفوظ ہو جائیں۔ اور اس اعتبار سے طلوع اسلام کا کنونشن نمبر یادگار بن جائے۔ مشورہ عمدہ تھا اسلئے وہیں سے تصاویر کراچی بھیج دی گئیں تاکہ ان کی مناسب درستی کے بعد انھیں کنونشن نمبر میں شائع کر دیا جائے۔ جب ہم منٹگمری پہنچے ہیں تو طلوع اسلام کا کنونشن نمبر ملا اور یہ دیکھ کر بیحد رنج ہوا کہ اس میں تصاویر ایسی خراب چھپی ہیں جو طلوع اسلام کے قطعاً شایانِ شان نہیں۔ ہم قارئین کے حسن نظر اور جن احباب کی تصاویر اچھی نہیں شائع ہوئیں ان کی نزاکت احساس سے معذرت خواہ ہیں کہ جس کوشش کے متعلق اندازہ تھا کہ وہ ان کے ذوقِ لطیف کے لئے وجہ نشاط ہوگی۔ وہ الٹا باعث تکدر بن گئی ـــــ اتفاقات ہیں زمانے کے۔

کبھی دوسرے موقع پر تلافی کی کوشش کی جائے گی۔ والسلام۔

ایک اعلان

دو پیشگی خریداروں صاحبان نے لاہور میں کنونشن بکسٹال سے چند کتب اپنے حساب میں لی تھیں۔ یہ کتب جس سلپ پر نوٹ کی گئی تھیں وہ اتفاق سے گم ہوگئی ہے۔ لہٰذا وہ براہ مہربانی بذریعہ [illegible]

رابطۂ باہمی

مرکزی بزمِ طلوعِ اسلام کراچی

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خاں صاحب صدر مرکزی بزم طلوع اسلام کراچی تحریر فرماتے ہیں کہ طلوع اسلام کنونشن لاہور کی قراردادوں پر جو دسمبر کے طلوع اسلام کے صفحات ۱۴ تا ۱۶ شائع ہو چکی ہیں مرکزی بزم طلوع کراچی نے حسب ذیل کارروائی کی۔

(۱) (قرارداد ۲) سالانہ چندہ :۔

جملہ اراکین بزم کراچی نے اپنے اپنے ماہانہ چندہ کا تعین کر دیا ہے اور ادائیگی شروع ہو گئی ہے۔

(۲) (قرارداد ۳) کراچی کے قرآنی احباب کا نام بدل کر بزم طلوع اسلام کراچی رکھ دیا گیا ہے۔

(۳) (قرارداد ۵) حلقہ وار کمیٹیاں :۔

بزم کراچی کی علاقہ وار کمیٹیاں پہلے سے قائم ہیں۔ ان میں خدمت خلق کی ایسی شکلوں پر غور کیا جا رہا ہے جنہیں ابتداءً آسانی سے عمل میں لایا جا

(۴) (قرارداد ۶-۷-۹-۱۰) مرکزی بزم کراچی نے نشر و اشاعت کے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دی ہے۔ جو اس اہم فریضہ کے مختلف گوشوں کو ایک ایک کر کے اپنے سامنے رکھے گی۔

(۵) (قرارداد ۱۱) بزم خواتین :۔ کراچی میں بزم خواتین قائم کرنے کے لئے کوششیں شروع کر دی گئی ہیں۔

(۶) (آخری قرارداد) عملی نمونہ :۔ اس پر عمل درآمد شروع کر دیا گیا ہے۔

(۷) مندرجہ بالا ریزولیوشنز کے علاوہ ایک چیز اور بھی قابل ذکر ہے۔ ایک "مجلس رابطہ" قائم کی گئی ہے۔ اس کے اراکین تعلیم یافتہ طبقہ اور خاص طور پر طلباء سے مل کر ان سے رابطہ قائم کریں گے۔ اور انہیں قرآنی فکر سے قریب تر لا کر اپنا ہم خیال بنائیں گے۔ کیونکہ ہمارے خیال میں اس ملک کے مستقبل کا بڑی حد تک انحصار انہیں طلباء اور تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ پر ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی فکری تربیت کر دی جائے۔

(۸) مختلف اضلاع کی بزموں سے گذارش ہے کہ وہ اپنے مشوروں سے مرکزی بزم کو مستفید کریں۔ اور جن امور میں کام مشکل پیش آتی ہے۔ اس کی بابت مرکزی بزم کو لکھیں۔ ان امور میں ہمیں کوتاہی نہیں برتنی چاہیئے۔ خط و کتابت کے لئے پتہ کافی ہو گا۔

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خاں صاحب۔ صدر بزم طلوع اسلام۔ ۱۵۹/۳۔ ایل (پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی!

بزمِ سیالکوٹ

محمد سبحانی صاحب سیالکوٹ سے تحریر فرماتے ہیں کہ

[illegible]

کی قرارداد مطالبہ پر لبیک کہتے ہوئے اور محترم پرویز صاحب کی سیالکوٹ میں تشریف آوری پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے ہم نے یہاں خواتین کی بزم کا انعقاد ۳ر نومبر ۱۹۵۶ء کو بروز جمعہ کر دیا ہے اور محترمہ بیگم ریاض شیخ صاحب کو اس کا ترجمان بھی بنا دیا گیا ہے۔

بزم ہنگو ضلع کوہاٹ

محمد اجمل صاحب آشفتہ گورنمنٹ ہائی اسکول ہنگو ضلع کوہاٹ ترجمان بزم طلوع اسلام تحریر فرماتے ہیں کہ

بزم طلوع اسلام ہنگو کی باقاعدہ تشکیل ۳۰ر نومبر ۱۹۵۶ء کو عمل میں آئی اور تیرہ حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی نامزد کی گئی ہے۔ جدید احباب سے باہمی رابطہ قائم کرے گی۔

بزم دیونہ منڈی

چودہری محمد اکبر صاحب دکاندار سکریٹری بزم طلوع اسلام دیونہ منڈی ڈاک خانہ دیونہ جلیانی تحصیل و ضلع گجرات تحریر فرماتے ہیں کہ

ہم نے یہاں موضع منڈی دیونہ ضلع گجرات میں بزم طلوع اسلام قائم کر لی ہے۔ اور باہمی صلاح و مشورہ سے چودہری محمد اکبر دوکاندار کو سکریٹری بزم طلوع اسلام چنا گیا ہے۔ اس علاقہ کے احباب کو چاہیئے کہ وہ بزم سے رابطہ قائم کریں۔

بزم چنیوٹ

کریم بخش صاحب دوکاندار محلہ راجاں والہ ترجمان بزم طلوع اسلام چنیوٹ ضلع جھنگ تحریر فرماتے ہیں کہ

ہم اہل چنیوٹ کے معاونین نے بزم کی تشکیل کر لی ہے۔ لہٰذا تحریک طلوع اسلام سے دلچسپی رکھنے والے حضرات محلہ راجاں والہ سے رجوع فرمائیں۔

بزم چک 2/6 E.B.

ولایت اللہ صاحب مجنون سکریٹری بزم طلوع اسلام چک 2/6 E.B. ڈاک خانہ خاص براستہ وہاڑی ضلع ملتان تحریر فرماتے ہیں کہ

چند مخلصین نے یہاں بزم طلوع اسلام قائم کی ہے اور لائبریری بھی قائم کر دی گئی ہے۔ لہٰذا علاقہ وہاڑی میں طلوع اسلام تحریک سے دلچسپی رکھنے والے [illegible] پتہ پر رجوع فرمائیں۔

بزم ضلع سکھر

[illegible] بخاری سکریٹری بزم طلوع اسلام مالک سردار انجینئرنگ ورکس بالمقابل ڈیملا فلور ملز [illegible] تحریر فرماتے ہیں کہ

غریب خانہ پر سکھر اور روہڑی [illegible] جس میں بزم طلوع اسلام ضلع سکھر قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور بندہ کو ترجمان یا سکریٹری منتخب کیا [illegible] ایک لائبریری کے قیام اور لٹریچر کی اشاعت کا سوال بھی زیر بحث آیا۔ ضلع سکھر کے وہ حضرات جو [illegible] طرف مائل یا اسے سمجھنے کے مشتاق ہوں براہ کرم ہماری بزم کی طرف رجوع فرمائیں۔ بندہ سوموار [illegible] دن بھی صبح دس بجے سے بارہ بجے تک اور شام کو چھ بجے سے آٹھ بجے تک مل سکتا ہے۔

اسلامی تعلیمات اور دورِ حاضر کے علومِ جدید

(از فاضل ازہر مولانا عبد المنعم النمر۔ رکن بعثۂ ازہر و موتمر اسلامی برائے دار العلوم دیوبند)

[طلوع اسلام بابت ستمبر ۱۹۵۶ء میں "علماء کون ہیں؟" کے عنوان سے ایک حقیقت افروز مقالہ شائع ہو چکا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی رو سے علماء وہ لوگ ہیں جو علوم سائنس کے ماہر ہیں۔ ذیل میں ہم اسی ضمن میں ایک مصری عالم کے افکار درج کرتے ہیں جو اسی حقیقت کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں۔ یہ مقالہ اخبار مدینہ کے شکریہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔　　طلوع اسلام]

وہ کون سے علوم ہیں جن کا حاصل کرنا مسلمان طالب علم کے لئے ضروری ہے؟ اس سوال پر اکثر بحث ہوا کرتی ہے۔ آج بھی ہم اس بحث میں حصہ لے رہے ہیں۔ بحث کا بنیادی نقطہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ علوم کو یہ حیثیت دی جاتی ہے کہ وہ آخرت میں کارآمد ہوں گے اور قیامت کے روز اُن کے بارے میں ہم سے بازپرس ہوگی۔ مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ۔ یہ علوم ہمارے لئے آخرت میں کارآمد ہیں ان کا سیکھنا ہم پر فرض ہے۔ ان میں کوتاہی ہوگی تو یوم الحساب میں ہم سے بازپرس ہوگی۔ ان کے ماسوا دوسرے علوم جن کو علوم الیہ یا دنیاوی علوم کہا جاتا ہے۔ وہ آخرت کے بارے میں کارآمد نہیں لہٰذا اخروی کامیابی کے پیش نظر ان کا سیکھنا بھی ضروری نہیں اور اُن کے حاصل کرنے میں عمر عزیز کا صرف کرنا بیکار ہے۔ جغرافیہ، حساب، سائنس وغیرہ اسی قسم کے علوم بتلائے جاتے ہیں۔

اس نظریہ کا پس منظر ایک حد تک قابل قدر ہے۔ ان بزرگوں کی خوش اعتقادی میں بھی کلام نہیں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس طریقے سے وہ دین کی خدمت کر رہے ہیں اور دینی تعلیمات کے بموجب ایک رائے قائم کر رہے ہیں۔ ان کے حسن نیت پر بحث نہیں ہے۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ انسان کے اعمال و افکار اور اس کی جدوجہد کو صحیح اور کارآمد بنانے کے لئے فقط حسن نیت کافی نہیں بلکہ حسنِ نیت کے ساتھ حسن بصیرت اور فکر صحیح بھی ضروری ہے۔ تاکہ قول و عمل سے وہ نتیجہ مرتب ہو سکے جو مفاد ملت کے لئے مطلوب ہے اور بقول شخصے

"نیکی برباد گناہ لازم" نہ آئے۔

نقطۂ فکر کا صحیح یہ ہونا چاہیے کہ اسلام کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہے اور یہی حقیقت ہے کہ وہ ایک زندہ مذہب اور ایسا پروگرام

ہے جو ملت کو دینی کامیابی کے ساتھ دنیاوی برتری اور سربلندی بھی عطا کرتا ہے۔ وہ قوم میں ایک کامل زندگی پیدا کرتا ہے۔ اسلام باقی تمام مذاہب سے اسی بنا پر ممتاز ہے کہ وہ انسان کے دنیوی مصالح کا بھی ایسا ہی لحاظ رکھتا ہے۔ جیسا کہ اس کی دینی ضروریات کا بلکہ دینی فرائض کی وہ ایک ایسی نوعیت قائم کرتا ہے کہ وہ دنیوی مصالح کے لئے تقویت و ترقی کا باعث بن سکیں وہ تمام صورتیں اور وہ تمام افکار جن سے بہتر معیشت اور اُخروی مفاد میں تصادم واقع ہو۔ یا مذہب اور مذہبی طبقہ کی سربلندی۔ اس کی شوکت و حشمت اور اس کی عزت اور وقار میں فرق آئے۔ ایسے تمام افکار اور نظریات مذہب کا نام لینے والے کوتاہ اندیش لوگوں کی کوتاہی نظر کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان کی نیتیں صحیح ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ بصیرت اور تفقہ بھی صحیح ہو۔ اسی بناء پر کہا جاتا ہے کہ "افة الادیان من جھل الدعاة" ہم بلاشک و شبہ پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ہر ایسے علم کی تائید کرتا ہے جو دنیاوی ترقیات کے لئے ناگزیر ہوں بلکہ آگے بڑھ کر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دنیاوی علوم کا سیکھنا مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے۔ پس ایسے تمام علوم جو مسلمانوں کو صحت، زراعت صنعت اور ایسے طریقے سکھائیں۔ جن سے وہ زمین کے خزانے برآمد کر سکیں، پٹرول اور دوسرے عناصر تلاش کر سکیں مسلمانوں پر جنگی قوت اور مقاومت کی طاقت پیدا کر سکیں۔ یا ان کی دولت میں اضافہ کر سکیں۔ ایسے تمام علوم جو قوم کی معاشیات کے لئے معاون اور مفید ہوں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمان ان کو بھی حاصل کریں۔ ان میں برتری اور مہارت پیدا کریں۔ تاکہ ملت اسلامیہ زندگی کے ہر گوشہ میں تنومند اور طاقتور ہو اور کسی بھی لحاظ سے غیروں کی دست نگر اور محتاج نہ رہے۔ کیونکہ دست نگری اقتدار اعلیٰ کی زمام دوسروں کے سپرد کر دیتی ہے اور "الاسلام یعلو ولا یعلی علیہ" کے برخلاف پیشانی ملت کو دوسروں کے سامنے سرنگوں کر دیتی ہے۔ ہمارے نزدیک اس تفریق کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں کہ ہم کچھ علوم کو آخرت کے واسطے نافع مانیں اور کچھ کے متعلق یہ خیال رکھیں کہ آخرت میں ان کے بارے میں کوئی بازپرس نہ ہوگی۔

ہم ایک اور عقیدہ بھی پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے وہ تعجب خیز ہو۔ مگر ہم اس کے صحیح تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔ اس تعجب انگیز عقیدہ کی تفسیر یہ ہے کہ جو چیزیں دنیا کی بہتر معیشت کے لئے مضر ہیں وہ یقیناً حیات اُخروی کے لئے بھی نقصان رساں ہیں اس کی دلیل واضح ہے کیونکہ جو چیز دنیوی زندگی میں امت اسلامیہ کے لئے نقصان رساں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام قرار دیا ہے وہ علم ہو یا عمل ہو، اس کے ارتکاب پر خدا کے ہاں بازپرس ہوگی۔ اس لئے کہ اوامر و نواہی کا مقصد یہ ہے کہ ایک صالح زندگی پیدا ہو اور انسان دنیا میں امن و امان کے ساتھ بھائی بھائی بن کر خوشگوار زندگی گذار سکیں۔ پس جب یہ صورت حال جس کو ہم دنیوی سعادت کہہ سکتے ہیں پیدا ہوگی تو لامحالہ اُخروی سعادت اور کامیابی بھی میسر آئے گی اور جب بھی اس دنیاوی سعادت میں خلل واقع ہوگا اُخروی کامیابی میں بھی فرق آئے گا۔ انتہا یہ کہ صرف معاملات ہی نہیں بلکہ نماز اور روزہ جیسے امور جو محض عبادت ہیں ان کا منشاء بھی سب سے پہلے نفوس انسانی کی تہذیب۔ اخلاق کی اصلاح اور دنیوی معیشت میں فلاح و بہبود پیدا کرنا ہے۔

جب ان عبادتوں سے یہ مقاصد نہ پیدا ہوں یعنی اخلاق کی اصلاح نہ ہو، اجتماعی زندگی درست نہ ہو۔ نوع انسان کی ہمدردی اور آپس میں تعاون کی روح پیدا نہ ہو تو یہ عبادتیں اخروی کامیابی کے لئے بھی نفع بخش نہیں۔ چنانچہ کتاب اللہ کی شہادت موجود ہے۔ مثلاً نماز کے متعلق ارشاد ہے اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ یہ فحش اور منکر جن کو نماز روکتی ہے لامحالہ دنیوی معاملات ہی کے اندر ظہور پذیر ہوں گے۔ اور اسی کے متعلق آیہ کریمہ کی تصریح ہے۔ اگر نماز ان کا سدباب نہیں کر سکتی اور انسان نماز پڑھنے کے باوجود ایسی چیزوں میں مبتلا رہتا ہے جو اس کی اخلاقی اور جماعتی زندگی کے لئے نقصان رساں ہوں۔ جن سے دنیوی معیشت خراب ہو تو یہ نماز وہ نماز نہیں ہے جو شریعت کا مقصود ہے۔ یہ نماز جب اپنی تاثیر سے محروم ہے تو حقیقی روح سے بھی ہم کنار نہیں ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلعم ارشاد فرماتے ہیں کہ جو نماز فحشاء و منکر سے نہ روکے وہ اللہ تعالےٰ سے قرب کے بجائے بُعد پیدا کرے گی۔ اسی طرح روزہ دار کے متعلق ارشاد ہے کہ اگر وہ روزہ رکھ کر بھی مکر فریب اور دھوکہ بازی کے کام نہیں چھوڑتا۔ تو خدا کو اس کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ وہ دن بھر بھوکا پیاسا رہے۔ نبی کریم صلعم کا یہ ارشاد بھی اہل علم کو معلوم ہے کہ آپ نے ایک عبادت گذار عورت کے لئے جو پڑوسیوں کے حق میں بدخلق تھی فرمایا کہ وہ دوزخ میں جائے گی۔ غرض اس قسم کی بہت سی مثالیں و احادیث صاف اعلان کر رہی ہیں کہ عبادتوں کا مفاد اور ان کا نتیجہ اگر دنیاوی معاشرت کی اصلاح نہیں ہے تو ان سے اُخروی مفاد بھی خاطر خواہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ بہرحال جب انسانی معاشرت کی اصلاح۔ اہل ملت کی برتری اور سربلندی اسلامی تعلیمات اور اس کے احکام و عبادات کا اہم ترین مقصد ہے تو کیا ہمارے لئے جائز ہو سکتا ہے کہ ہم دینی اور دنیوی علوم میں فرق پیدا کریں اور یہ کہہ سکیں کہ جن علوم سے دنیا میں ہماری برتری اور جماعتی زندگی کی سربلندی ہوتی ہے وہ فرض نہیں اور ان کے متعلق خدا کے ہاں بازپرس نہیں ہو سکتی۔ کیا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے کہ ہم دنیا اور اس کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر لیں۔ کیا اسلام کی تعلیم کسی بھی نوع سے رہبانیت کو برداشت کر سکتی ہے؟ اللہ تعالےٰ کا اس امت کے متعلق ارشاد ہے خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (بہترین امت جو لوگوں کے لئے وجود میں لائی گئی) اللہ تعالےٰ نے اعلان فرمایا ہے کہ عزت، اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کے لئے ہے۔ یہ آیتیں ہمارے سامنے ہیں اور ہم صبح و شام ان کو پڑھتے ہیں۔ پھر کیا کوئی ذی ہوش اور صاحب عقل یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ ایک ایسی امت اور ایک ایسی جماعت جو "خیر امت" ہو اپنے معاشی تقاضوں سے ناواقف اور ضروریات معیشت سے نابلد اور اُن علوم و فنون سے بے بہرہ ہو جن کو حاصل کر کے دوسری امتیں ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہیں۔ اور نہ صرف ترقی کی منزلیں بلکہ وہ چیزیں پیدا کر رہی ہیں جو انسانیت کے لئے کارآمد اور نفع بخش ہیں۔ اور اس طرح اپنی برتری کا پرچم پورے عالم میں لہرا رہی ہیں۔

کیا آج دنیا میں وہ امت عزت پا سکتی ہے جو انجینیرنگ، طب، زراعت و صنعت۔ طبقات الارض۔ ہوائی اور بحری صنعتوں ان تمام چیزوں سے بے بہرہ ہو جو دور حاضر میں قومی زندگی اور قومی عروج و استحکام کے لئے سنگ بنیاد کا درجہ رکھتی ہیں؟

وہ قوم جو اپنی تمام ضروریات کے لئے دوسروں کا محتاج ہو۔ عزت کے کسی زینہ پر اپنا قدم رکھ سکتی ہے؟

ایک تلخ حقیقت کبھی نظر انداز نہیں ہونی چاہیئے۔ آج ہماری یہ عظیم الشان تعداد جو کروڑوں سے متجاوز ہے۔ اس طرح بے بس دپا افتادہ اور پسماندہ کیوں ہے؟ کیا اس بنا پر کہ ان علوم عصریہ اور فنون جدیدہ میں وہ مہارت حاصل نہ کئے ہوئے ہے یا اس بنا پر کہ جس طرح وہ دین صحیح اور اخلاق کریمہ سے محروم ہے۔ ان فنون کی واقفیت سے بھی محروم ہے۔

بلاشبہ مسلمانوں کا اخلاقی تنزل قرن اولیٰ کے بعد ہی شروع ہوگیا تھا۔ مگر پھر بھی مسلمان عروج و ترقی سے ہم کنار رہے۔ اور مشرق و مغرب کے ممالک میں اپنے عروج اور شوکت و سطوت کے قطب مینار اس وقت تک تعمیر کرتے رہے۔ جب تک اپنے زمانے کے بنیادی علوم و فنون میں وہ دوسری تمام قوموں سے پیش پیش رہے اور جب سے ان فنون کی مہارت دوسروں کے حصہ میں آئی عروج و ترقی نے بھی مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ کر انہی کی آغوش گرم کی جن کے پاس علوم عصریہ اور فنون جدیدہ کی دولت ترقی پذیر تھی۔ تاریخ ہمیں ایک نہایت دردناک اور تکلیف دہ حقیقت یاد دلا رہی ہے۔ کچھ مسلمان حکومتوں نے ملک کی ترقی کا منصوبہ بنایا۔ لیکن اس ترقی کی ضروریات فراہم کرنے سے وہ حکومتیں قاصر رہیں تو اغیار سے امداد حاصل کی۔ اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا؟ غلامی اور ذلت و خواری! ایسی ہی صورتیں دوسری اسلامی مملکتوں میں بھی پیش آئیں۔ بس کیا ہمارے لئے درست ہوگا کہ تاریخ کی ان تلخ حقیقتوں کو ہم فراموش کر دیں اور اس بات کا یقین نہ رکھیں کہ ملت کی تنومندی اور کامیابی صرف اسی صورت میں ہے جب ہر لحاظ سے وہ خود متکفل اور دوسروں سے بے نیاز ہو۔

اللہ تعالیٰ کا حکم ہے: اعدوا لھم ما استطعتم الآیۃ۔ اس کی تعمیل کس طرح ہو سکتی ہے۔ کیا اس آیت کا یہ تقاضہ نہیں ہے کہ مسلمان نہ صرف یہ کہ آلات حرب فراہم کریں بلکہ وہ تمام استعداد و صلاحیت اور مہارت پیدا کریں جس سے وہ ہوائی جہاز، ٹینک، پیراشوٹ، تارپیڈو، بم، ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم سب کچھ تیار کر سکیں۔ تاکہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں ایک دفاعی قوت ہوں، اور اس سیاسی دنیا میں ایک محاذ کی حیثیت سے قائم رہ سکیں۔

کیا اس آیت کی روشنی میں ان تمام علوم جدیدہ اور فنون عصریہ کا حاصل کرنا مسلمان پر فرض نہیں ہوگا؟ اور کیا اس فریضہ سے غفلت برت کر جس ذلت و خواری میں آج مسلمان پڑے ہوئے ہیں وہ عند اللہ بری الذمہ ہوں گے اور بارگاہِ خداوندی میں جواب دہی نہیں کرنی ہوگی!

یہ ایک فرض کی ایجابی شکل ہے۔ ترغیب کے سلسلہ میں رسول کریم صلعم کا وہ ارشاد یاد کیجئے۔ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ایک تیر پر تین کو جنت میں داخل کرتا ہے (۱) بنانے والے کو (۲) مجاہد تک پہنچانے والے کو (۳) پھینکنے والے کو۔ کیا اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ قومی زندگی کے واسطے جس طرح اخلاقِ عالیہ کی ضرورت ہے ایسے ہی قوت کی بھی ضرورت ہے اور ذرائع قوت کی بھی۔ اور یہ سب ثواب کے کام ہیں۔

بیشک کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے قوت کا استعمال انسانیت پر، انسانی اخلاق پر، دنیا کے امن و امان پر ظلم ہے۔ لیکن اپنے تحفظ و بقا کے لئے، اپنی خود دار اور باوقار زندگی کے واسطے قوت کا تحفظ اہم ترین ملی، قومی اور

فرض ہے

بلاشبہ جنگی آلات کی صنعت ایک جہاد ہے۔ اسی طرح ہر وہ صنعت جو قومی زندگی کے بقاء و تحفظ کے لئے ضروری ہو اس کو تیار کرنا بھی یقیناً جہاد ہے۔ کاشتکار ملک اور قوم کے لئے غلہ پیدا کرکے جہاد کر رہا ہے۔ ڈاکٹر ڈاکٹری سیکھ کر سرجری حاصل کرکے قوم کے لئے جہاد کر رہا ہے۔ طبقات الارض کی تعلیم حاصل کرنا اور اس علم کو کام میں لانا قومی جہاد ہے اسی طرح ملک و ملت کے جس تقاضہ کو بھی جو جماعت انجام دے رہی ہے وہ ایک جہاد کر رہی ہے۔

پس اسلام کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کے پیرو، اس کے ماننے والے اور احترام کرنے والے ہر علم و فن میں بہترین مہارت کے مالک ہوں۔ اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ اس کے ماننے والے زندگی کے ہر شعبہ میں پیش پیش ہوں۔ وہ تمام دنیا کو علم کے خزانے تقسیم کریں۔ تہذیب و اخلاق کے معلم بن کر دنیا کو ایک بہتر اور بلند تر معیشت سے پُر رونق بنائیں۔ تاکہ وہ بین الاقوامی قیادت کے مالک ہوں اور اس فرض کو انجام دے سکیں جو ارشادِ خداوندی کنتم خیر امۃ اخرجت للناس کے بموجب ان کے ذمہ عائد ہوتا ہے۔

حضرات علماء کرام، فقہاء ملت۔ مدبرین اور مفکرین رہنما غور فرمائیں کہ کیا ان کوتاہیوں پر اللہ تعالیٰ کے ہاں باز پرس نہ ہوگی اور جب کہ یہ دنیاوی علوم بھی مقاصد کے لحاظ سے ضروری ثابت ہوں تو کیا عنداللہ یہ بھی نافع اور ان سے لاپرواہی موجب گرفت اور باعث مواخذہ نہ ہوگی؟ پس اس تفریق بے معنی کا مدار غرض اور نیت پر رہا۔ اگر خاص دینی علوم بھی دنیا ہی کے لئے پڑھے جائیں تو حرام ہیں۔ اسی طرح دنیاوی علوم اگر دینی مقاصد کے لئے ہوں تو وہ موجب اجر و ثواب ہیں۔ واللہ اعلم۔ و اخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔


DURA-GLOSS
Nail Polish
MADE IN U.S.A.
ڈوراجلوس
ناخنوں کی پالش
تزئینِ حسن کے لئے
ناخنوں کی آرائش ضروری ہے
ڈوراجلوس
خوش رنگ۔ دیدہ زیب۔ چمکدار اور
ہر بڑے دوکاندار سے ملتی ہے

سلسلۂ اصلاح وتذکیر (محترم عمر احمد صاحب عثمانی)

قرآنی معاشرہ

باہمی تعلقات کے متعلق قرآن کی تعلیم

(۷)

[اس مضمون کی گذشتہ پانچ اقساط میں یہ بتایا گیا تھا کہ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ اور والدین کو اپنی اولاد کے ساتھ نیز بھائی بہنوں کو آپس میں کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اور اس سلسلہ میں ہر ایک کے فرائض وواجبات کیا ہیں؟ اس کے بعد چھٹی قسط میں یہ بتایا گیا کہ میاں بیوی کے تعلقات کی کیا نوعیت ہے؟ اور ان کے ایک دوسرے پر کیا حقوق وواجبات ہیں۔ بہذا ان کو آپس میں کس طرح رہنا چاہیئے۔ یہ عنوان ہنوز جاری ہے۔ طلوع اسلام]

میاں بیوی

نکاح ایک معاہدہ ہے اور اس معاہدہ کے وقت مرد کو کچھ مقررہ رقم بیوی کو ادا کرنی چاہیئے جو بطور تحفہ کے اسے دی جاتی ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے عورت اور مرد کے میدان ہائے عمل الگ الگ ہیں۔ مرد کو قرآن نے نان ونفقہ کا سبب قرار دیا ہے۔ اور عورت کے تمام اخراجات اسی پر ڈالے گئے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ عورتوں کو کچھ کمانے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ مطلب عام حالات میں عورت کی جو ذمہ داریاں ہوتی ہیں ان کے ساتھ اسے اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ اپنی یا اپنے بچوں کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ بدیں حالات زیادہ تر ایسی صورتیں پیش آئیں گی کہ عورتیں روپیہ پیسہ کے معاملہ میں مردوں کی دست نگر اور محتاج ہوں۔ عام طور پر وہ خود کما نہیں سکتیں۔ انہیں ایک ایک پیسہ کے لئے مردوں کا منہ تکنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ عورت کسی موقع پر کچھ خرچ کرنا چاہے لیکن مرد اس کو کوئی اہمیت نہ دے۔ کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد جب میاں بیوی ایک دوسرے کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ جائیں اور ایک دوسرے سے بے تکلف ہو جائیں تو پھر اس قسم کی دشواریاں بہت کم پیش آتی ہیں۔ لیکن شادی کے بعد ابتدائی دور میں لڑکی کو اس قسم کی پریشانیاں قدم قدم پر پیش آسکتی ہیں۔ نیز ہو سکتا ہے کہ شادی کے بعد یہ محسوس ہو کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ گذارہ نہیں

(ر)سکیں گے اور نوبت طلاق تک پہنچ جائے۔ عدت گذارنے کے بعد ضروری نہیں کہ اس عورت کو فوراً ہی کوئی دوسرا مناسب شو(ہر م)ل جائے۔ اس عرصہ میں بھی اس کو دشواریاں پیش آسکتی ہیں۔ چونکہ عورت فرد کاسب نہیں ہے اسلئے اسکے حال اور مستقبل کو ممکنہ حد تک محفوظ کردینا نہایت ہی ضروری تھا۔ اس لئے قرآن نے مرد کے ذمہ یہ لازم قرار دیا ہے کہ وہ باہمی معاہدہ کے مطابق جس قدر مال طے پاجائے بطور تحفہ کے بیوی کو ادا کردے جو اسی کی ملکیت ہوگا اور وہ جس طرح چاہے اسے صرف کرسکتی ہے۔ قرآن کریم میں محرمات نکاح بیان کرنے کے بعد آیا ہے۔

وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَاءَ ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسَافِحِیْنَ

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِیْضَةً (۴/۲۴)

مذکورہ بالا عورتوں کے علاوہ باقی عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں۔ یعنی اپنے مال ادا کرکے تم ان کو عفت وعصمت کی حفاظت کے لئے طلب کرو نہ کہ محض شہوت رانی کے لئے۔ اسکے بعد جن عورتوں سے متمتع ہوتے رہے ہو انھیں ان کے مہر جو تم پر واجب تھے ادا کردیا کرو۔

مہر میں کمی بیشی

ہوسکتا ہے کہ نکاح کے وقت گرانقدر مہر باندھ لیا گیا ہو۔ اور اس کے بعد بیوی اپنے شوہر کی طبیعت کا اندازہ کرکے اس کی ضرورت نہ سمجھے کہ وہ اپنی ملکیت میں اس قدر کثیر رقم رکھے۔ نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نکاح کے وقت مہر کم باندھا گیا ہو اور بعد میں ضرورت محسوس ہو کہ اس میں اضافہ کیا جائے۔ بہرحال باہمی رضامندی سے مہر کی مقدار میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔ یعنی مہر کو فریضہ کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ باہمی رضامندی سے اس میں بعد میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ ضرورت کے مطابق تبدیلی کی جاسکتی ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ فِیْمَا تَرَاضَیْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِیْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ

عَلِیْمًا حَکِیْمًا ○ (۴/۲۴)

اس میں کوئی حرج نہیں کہ مہر ایک مرتبہ مقرر کرلینے کے بعد تم اس میں باہمی رضامندی سے کچھ (تبدیلی) کرنا چاہو۔ یقیناً خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اس سے یہ چیز واضح ہوجاتی ہے کہ یہ کوئی سودے بازی کا معاملہ نہیں کہ مرد عورت کو کسی چیز کا معاوضہ ادا کرتا ہو۔ معاوضہ اور قیمت تو وہی ہوتی ہے جو معاملہ کے وقت طے پاجاتی ہے۔ مگر یہاں حالات اور ضروریات کے پیش نظر بعد میں کمی بیشی اور تبدیلی بھی کی جاسکتی ہے

مہر معاوضہ نہیں

اس لئے مہر کو استمتاع کا معاوضہ سمجھنا غلط ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں بعض فقہاء نے مہر کو استمتاع کا معاوضہ ہی قرار دیا ہے مگر قرآن کریم نے دوسری جگہ اس کو بالکل صاف کردیا ہے۔ جہاں بتایا ہے کہ یہ محض ایک تحفہ ہوتا ہے۔ سورۃ نساء ہی کی آیت ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَکُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا

فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا (۴/۴)

اور عورتوں کو ان کے مہر بطور تحفہ اور عطیہ کے دے دیا کرو۔ پھر اگر وہ اپنے دل کی رضامندی سے
اس میں سے کچھ تمہیں واپس کر دیں تو تم اسے خوشگوار چیز کی طرح کھا سکتے ہو۔

س طرح ادا کرنے چاہئیں جس طرح شہد کی مکھیاں بلا کسی معاوضہ کے تمہیں شہد مہیا کرتی ہیں (نِحْلَةً، نَحْلٌ ہی سے مشتق
نی شہد کی مکھی کے ہیں اسی سے نُحْلٰی آتا ہے جس کے معنی عطیہ ہی کے ہوتے ہیں) لہٰذا مہر قرآن کی رو سے معاوضہ نہیں بلکہ تحفہ اور

مقدار

عطیہ ہے۔ قرآن کریم نے مہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی۔ یہ کم سے کم بھی ہو سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ بھی لیکن بہر حال اتنا ضرور ہونا چاہئے کہ اسے مال کہا جا سکے۔ کیونکہ قرآن نے بِاَمْوَالِكُمْ کے لفظ سے یہ بتا دیا ہے کہ وہ کم از کم مال
ور زیادہ کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے۔ وہ سونے کا ایک ڈھیر بھی ہو سکتا ہے۔

وَإِنْ أَرَدْتُمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنطَارًا
فَلَا تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا (۴/۲۰)

اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی تبدیل کرنا چاہو تو اگر تم نے ایک بیوی کو مہر میں سونے کا ایک
ڈھیر بھی دے دیا تھا تو اس میں سے بھی کچھ واپس نہ لو۔

یا سونے کا ایک ڈھیر بھی دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مہر گراں سے گراں تر باندھے جائیں اتنے گراں کہ انھیں شوہر ادا
سکے۔ جیسا کہ ہمارے ہاں عام طور پر ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ محض ایک رسمی چیز ہے جس کو ادا کرنے کا کوئی سوال
نہیں ہوتا لہٰذا دس بیس ہزار اور لاکھ دو لاکھ جتنا جی چاہے، باندھ دیا جائے۔ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ یہ خیال قطعاً غلط
ی جو مقدار مقرر کر کے باندھی جائے وہ اس نیت سے باندھی جائے کہ اس کو بالضرور ادا کرنا ہوگا۔ اور یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ جتنی مقدار
رھا جا رہا ہے شوہر کی حیثیت اس کی متحمل بھی ہے یا نہیں۔ مہر نکاح کے بعد رخصتی کے وقت ادا کر دینا چاہیئے۔ البتہ اگر بیوی کی رضامندی
ادائیگی کو مؤخر کر دیا جائے تب بھی جائز ہے۔ لیکن بہرحال اگر خدانخواستہ جدائی کی نوبت آ جائے تو اس وقت تو اس کو ادا کرنا

...ت سے نکاح جائز نہیں

ہر عورت سے نکاح نہیں کیا جا سکتا۔ بعض عورتیں ایسی بھی ہیں جن سے نکاح کرنا جائز نہیں
چنانچہ سورۂ نساء میں ان کی پوری تفصیل دے دی گئی ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ
وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُم
مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي حُجُورِكُم مِّن
نِّسَائِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُم بِهِنَّ فَإِن لَّمْ تَكُونُوا دَخَلْتُم بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ

عَلَيْكُمْ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ
إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ
أَيْمَانُكُمْ ۖ كِتَابَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَأُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ (پ ۴ - ۲۳)

تم پر حرام قرار دی گئی ہیں تمہاری مائیں، بیٹیاں، بہنیں، پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں، بھانجیاں، دودھ پلانے والی مائیں، دودھ شریک بہنیں اور ساسیں، اور وہ لڑکیاں جو تمہاری ان بیویوں سے ہوں جن کو تم ہاتھ لگا چکے ہو اور جو تمہارے دامن تربیت میں ہیں۔ البتہ اگر ایسی بیوی کی لڑکی ہو جسے تم نے ہاتھ نہیں لگایا تو کوئی حرج نہیں ہے نیز تمہارے ان بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری صلب سے ہوں۔ اور یہ کہ تم بیک وقت دو بہنوں کو جمع کرو۔ بجز اسکے جو اس سے پہلے ہو چکا ہو۔ یقیناً خدا انسان حفاظت دینے والا اور مہربان ہے۔ ایسے ہی وہ عورتیں بھی حرام قرار دی گئی ہیں جو شادی شدہ ہوں۔ بجز ان عورتوں کے جن کے تمہارے ہاتھ مالک ہو چکے ہوں۔ یہ خدا کا قانون ہے جو تم پر نافذ کیا گیا ہے۔ اور ان مذکورہ عورتوں کے علاوہ باقی عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں۔

ان کے علاوہ، ان عورتوں سے بھی نکاح نہیں کیا جا سکتا جن سے تمہارے والد نکاح کر چکے ہوں۔ اسی سورت میں ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۚ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً
وَمَقْتًا وَسَاءَ سَبِيلًا (پ۴)

اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں۔ جو اس سے پہلے ہو چکا ہے وہ مستثنیٰ ہے۔ یقیناً یہ بات بڑی ہی بے حیائی اور برائی کی ہے۔ اور یہ بہت ہی برا راستہ ہے۔

ساتھ ہی ان عورتوں سے بھی نکاح نہیں کیا جا سکتا جو شرک کی آلودگی میں گرفتار ہوں۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ ۚ وَلَأَمَةٌ مُؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ ۗ
وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ۚ وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ (پ۲)

اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو تاآنکہ وہ ایمان لے آئیں۔ بلاشبہ ایک مومن باندی ایک مشرک عورت سے کہیں بہتر ہوتی ہے۔ خواہ وہ تمہیں کتنی ہی بھلی معلوم ہوتی ہو۔ ایسے ہی اپنی عورتوں کا مشرک مردوں سے نکاح نہ کرو تاآنکہ وہ ایمان لے آئیں۔ ایک مومن بندہ ایک مشرک سے کہیں بہتر ہے۔ خواہ وہ تمہیں کتنا ہی اچھا معلوم ہوتا ہو۔

یہی مضمون سورۂ ممتحنہ میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ ۖ اللَّهُ أَعْلَمُ
بِإِيمَانِهِنَّ ۖ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ۖ لَا هُنَّ حِلٌّ

لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۖ وَآتُوهُم مَّا أَنفَقُوا ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَن تَنكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۚ وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَاسْأَلُوا مَا أَنفَقْتُمْ وَلْيَسْأَلُوا مَا أَنفَقُوا ۚ ذَٰلِكُمْ حُكْمُ اللَّهِ ۖ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (۶۰/۱۰)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جب تمہارے پاس ہجرت کر کے مومن عورتیں آئیں تو ان کی آزمائش کر لیا کرو خدا کو ان کے ایمان کے متعلق خوب معلوم ہے۔ اگر تم انھیں مومن جانو تو انھیں کافروں کے پاس واپس نہ کرو۔ نہ وہ ان کے لئے حلال ہیں اور نہ ہی وہ مشرکین ان کے لئے حلال ہیں۔ جو کچھ انھوں نے (مہر میں) خرچ کیا ہو وہ ان کو دے دو۔ تم پر کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر تم ان کے مہر ادا کر کے ان سے نکاح کر لو۔ اور کافر عورتوں کے ہاتھ نہ پکڑو۔ جو کچھ تم نے کافر عورتوں پر (مہر میں) خرچ کیا ہو وہ ان سے مانگ لو اور جو کچھ انھوں نے (مسلمان عورتوں کے مہر میں) خرچ کیا ہو وہ تم سے مانگ لیں۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے جو وہ تمہارے درمیان کرتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور خبردار ہے۔

مسلمان مردوں کے لئے اہلِ کتاب (یہودی اور نصرانی) عورتوں کے ساتھ نکاح کر لینا جائز ہے۔

الْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ ۖ وَطَعَامُ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۖ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِي أَخْدَانٍ ۗ (۵/۵)

آج تمہارے لئے سب دل پسند اور عمدہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اور اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال کر دیا گیا ہے۔ نیز پاکدامن مومن عورتیں ان لوگوں کی پاکدامن عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی حلال کر دی گئی ہیں۔ جب کہ تم انھیں اُن کے مہر دے کر ان سے نکاح کرو عصمت کی حفاظت کے لئے نہ کہ شہوت رانی کے لئے۔ یا در پردہ آشنائیاں کرنے کے لئے۔

ان آیات سے یہ معلوم ہو گیا کہ کن کن عورتوں سے قرآن کی رو سے نکاح نہیں کیا جا سکتا اور کن عورتوں سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔ ان کے ساتھ ایک مسلمان مرد نکاح کر سکتا ہے اگر وہ مقررہ مہر ادا کر کے ان سے نکاح کرے تو اب یہ دونوں معاہدۂ نکاح کے پابند ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد مرد کے حقوق عورت کے ذمہ اور عورت کے حقوق مرد کے ذمہ واجب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

حقوقِ زوجین چونکہ مردوں اور عورتوں کے میدان ہائے عمل الگ الگ ہیں اس لئے ان حقوق و واجبات کی شکل کتنی ہی مختلف کیوں

نہ ہو لیکن ان کی نوعیت ایک سی ہی ہوتی ہے۔ عورت کے ذمہ مرد کے بھی ایسے ہی حقوق و واجبات ہوتے ہیں جیسے خود مرد کے ذمہ عورت کے حقوق و واجبات ہوتے ہیں۔ گھر میں شوہر اور بیوی کی حیثیت یکساں سی ہوتی ہے اور دونوں باہمی تعاون و تناصر ایک دوسرے کی تکمیل کرتے اور ایک دوسرے کی کوتاہیوں کو ڈھانپتے ہیں۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۲/۱۸۷)

وہ تمہارے لئے لباس کا درجہ رکھتی ہیں اور تم ان کے لئے

لباس کا کام جہاں انسانی جسم کی زینت و آرائش میں اضافہ کرنا ہے وہیں ساتھ ہی جسم کے نقائص و عیوب کی پردہ پوشی کرنا ہے۔ ایسے ہی گھر میں مرد عورت کے لئے وجہ زیبائش ہے تو عورت مرد کے لئے باعث آرائش ہے۔ عورت مرد کے نقائص کا کرتی ہے تو مرد عورت کے نقائص کا ازالہ کرتا ہے۔ اور اس طرح اپنی اپنی مضمر صلاحیتوں کا کام لے کر اپنے چھوٹے سے گھر کو جنت بنا مناسب ہوگا کہ یہاں لفظ لِبَاسٌ کی کچھ تشریح کردی جائے۔ تاکہ شوہر اور بیوی کے تعلقات کی تصویر سامنے آجائے۔

لِبَاسٌ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جسے پہنا جائے۔ لَبِسَ اِمْرَأَةً کے معنی ہوتے ہیں کہ اس نے اس عورت سے زمانہ دراز تک اور استمتاع کیا لِبْسٌ اس باریک جھلی کو کہتے ہیں جو گوشت اور کھال کے درمیان ہوتی ہے۔ ابن عرفہ کا قول ہے کہ لباس مُلَابَسَةٌ کا اسم مصدر ہے جسکے معنی اختلاط اور اجتماع کے ہوتے ہیں لَبِيسٌ مثل اور نظیر کو کہتے ہیں لَابَسَ فُلَانًا ہوتے ہیں وہ اس کے اندر گھس گیا۔ اور اسکی اندرونی کیفیات تک کا اس نے پتہ لگا لیا۔

ان تصریحات سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ لِبَاسٌ کے مفہوم میں زمانہ دراز تک استمتاع اور استفادہ۔ اندرونی اتصال۔ اختلاط مثل و نظیر ہونا اور رازداری وغیرہ سب چیزیں شامل ہیں۔ لہذا هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ کے یہ معنی شوہر اور بیوی کا تعلق اس قسم کا ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے زمانہ دراز تک فائدہ اٹھاتے اور استمتاع کرتے ہیں۔ ایک دوسرے ان کا تعلق محض ظاہرداریوں کا نہیں بلکہ اندرونی اتصال کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ باہم مختلط اور مجتمع ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں زندگی انفرادی نہیں ہوتی وہ اجتماعی بلکہ اختلاطی ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے مثل اور نظیر ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے اندر تک سے واقف ہوتے ہیں۔ بہرحال یہ تعلق ہوتا ہے جو ایک میاں اور بیوی کے درمیان میں ہونا چاہیئے۔

معاشی ذمہ داری شوہر پر ہے

جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے قرآن کی رو سے عورت فرد کا سب نہیں ہوتی ذمہ داریاں چونکہ اس قسم کی ہوتی ہیں کہ ان کو پورا کرنے کے بعد اسکے پاس نہیں ہوتا کہ وہ معاشی ذمہ داریوں کو بھی کماحقہ پورا کرسکے۔ اسلئے قرآن کریم نے شوہر پر یہ ذمہ داری رکھی ہے کہ وہ گھر کے (بیوی اور بچوں) کی معاشی ذمہ داریوں کو پورا کرے۔ وہ انکیلئے کھانا۔ لباس۔ مکان۔ علاج تعلیم و تربیت وغیرہ مہیا کرے اور سرمایہ پیدا کرے۔ کیونکہ وہ ان ذمہ داریوں کو باحسن وجوہ پیدا کرسکتا ہے۔

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ وَبِمَا

اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔ (۴/۳۴)

مرد عورتوں کی معاشی دیکھ بھال کرنے والے ہیں۔ کیونکہ خدا نے بعض کو بعض پر مختلف جہات سے برتری دی
ہے (چنانچہ کچھ خصوصیات میں مرد برتر ہیں تو کچھ خصوصیات میں عورتیں برتر ہیں۔ معاشی ذمہ داریوں کو مرد
زیادہ سہولت سے پورا کر سکتا ہے) لہٰذا مردوں کو اپنے اموال گھر والوں کی ضروریات پوری کرنے کے
لئے کھلے رکھنے چاہئیں۔

عَلَى النِّسَاءِ کے معنی ہر طریق پر عورتوں کا متکفل اور ذمہ دار ہونے کے ہیں۔ چنانچہ تاج العروس (لغت کی ایک مشہور اور ضخیم
یں ہے قَامَ الرَّجُلُ الْمَرْأَةَ اور قَامَ عَلَيْهَا کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مرد نے عورت کی تمام ضروریات کو پورا کیا۔ اور اس کے
کا متکفل ہوا۔ قَوَّامٌ عَلَيْهَا کے معنی ہوتے ہیں کہ وہ اس کی تمام ضروریات کو پورا کرنے والا ہے قَامَ عَلَىٰ اَهْلِهِ کے معنی ہیں
اپنی بیوی کی تمام ضروریات کو پورا کر دیا (ص ۳۵/۹ج) لہٰذا قَوَّامُوْنَ کے عموم میں عورتوں کی حفاظت، دیانت، ان کی معاشی
ت کی کفالت۔ ان کے راحت و آرام کی فکر، ساری چیزیں آجاتی ہیں۔ معاشی ضروریات میں کھانا، کپڑا، مکان، بیمار ہوں تو
علاجہ۔ غرضیکہ ساری ذمہ داریاں داخل ہیں۔ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ کے معنی عورتوں کے حاکم نہیں۔ جیسا کہ ہمارے عام تراجم میں
کئے گئے ہیں۔ ان تراجم کے زیر اثر مسلمانوں میں عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ مرد عورتوں کے حاکم ہیں۔ خدا نے انہیں ان پر داروغہ مقرر کر دیا
ورتیں ان کی محکوم ہیں وہ جس طرح چاہیں ان پر حکومت کر سکتے ہیں۔ حالانکہ قَوَّامُوْنَ کے یہ معنے خود زبان اور لغت کے خلاف ہیں
بان میں قَامَ عَلَىٰ کے یہ معنی نہیں ہوتے۔

یں اپنی کمائی کی مالک ہیں

بہرحال یہ تمام ذمہ داریاں مرد پر عائد ہوتی ہیں لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ عورتوں کو کچھ
کمانے کی ممانعت ہے۔ اگر وہ کچھ پیدا کر سکتی ہیں اور اس مقصد کے لئے کچھ وقت نکال
یں تو انہیں ایسا کرنا جائز ہے، اس طرح پر جو کچھ وہ پیدا کریں گی۔ وہ خود اسکی مالک ہونگی۔ انہیں مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی محنت
کی ہوئی دولت کو بھی اپنے شوہر کے حوالہ کر دیں۔

ت ازدواج

قرآن کی رو سے قانون یہی ہے کہ ایک وقت میں ایک مرد کی ایک ہی بیوی ہو (اس قانون میں استثناء کی صورت
کو آگے چل کر بیان کیا گیا ہے) اگر اس کی بیوی اسکی مرضی کے مطابق نہیں۔ وہ اسے پسند نہیں کرتا۔ اور اسے
یہ نہیں کہ وہ اس کے ساتھ گذارہ کر سکیگا۔ یعنی اگر ایسی کوئی معقول وجہ موجود ہے جس کی بنا پر اسے کسی دوسری عورت سے نکاح
ضرورت ہے۔ تو قرآن کریم ایسی صورت میں اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس بیوی کی موجودگی میں دوسری عورت سے شادی
البتہ وہ اس کی اجازت دیتا ہے کہ اس بیوی کو چھوڑ کر کسی دوسری عورت سے شادی کر لی جائے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا
تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ (۴/۲۰)

اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ (اسے چھوڑ کر) دوسری بیوی کرنا چاہو۔ اور تم ایک بیوی کو (مہر کا) ایک ڈھیر (دھن میں) دے چکے ہو تو اس سے اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔ کیا تم بہتان لگا کر اور واضح گناہ کا ارتکاب کر کے اسے لینا چاہتے ہو۔؟

(ایک بیوی کو کن حالات میں چھوڑا جا سکتا ہے اس کا ذکر طلاق کے عنوان میں آئے گا)

تعدد ازدواج

البتہ اگر ایسے ہنگامی حالات پیدا ہو جائیں جن میں بجز اس کے اور کوئی مناسب حل ہی نہ ہو کہ تعدد ازدواج کی اجازت دی جائے۔ مثلاً معاشرہ میں ایسی عورتوں کی تعداد بہت بڑھ جائے جو شادی کے قابل ہوں (طویل جنگوں کی وجہ سے) معاشرے میں اتنے مرد موجود نہ ہوں جو ان سے شادی کر سکیں۔ کیونکہ آپ اس سے پہلے بھی یہ دیکھ چکے ہیں کہ عورتوں کے لئے قرآن نے کفار و مشرکین حتیٰ کہ اہل کتاب سے بھی شادی کرنے کو جائز قرار نہیں دیا۔ لہذا معاشرے میں جتنی عورتیں ہونگی انھیں مسلمانوں کے معاشرے میں کھپانا ضروری ہے۔ اس کا حل اس کے سوا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا کہ ایسی صورت میں تعدد ازدواج کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا (۴/۳)

اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ "یتامیٰ" کے بارے میں تم عدل و قسط کا سلوک نہیں کر سکو گے تو ان عورتوں میں سے جو تمہارے لئے حلال یا پسندیدہ ہوں ان سے دو دو، تین تین، چار چار کی تعداد میں شادیاں کر لو۔ پھر اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ ان بیویوں میں عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی شادی کرو۔ یا ملک یمین پر اکتفا کرو۔ یہ صورت اسکے قریب تر ہے کہ تم کسی ایک طرف نہ جھک جاؤ۔

آیت مذکورہ بالا کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے "یتامیٰ" کا مفہوم سمجھ لیا جائے: یَتِیْمٌ کے بنیادی معنی تو اس شخص کے ہیں جو اپنے آپ کو معاشرہ میں تنہا محسوس کرے۔ لیکن استعمال میں ان بچوں کو یتیم کہا جاتا ہے جن کا باپ مر گیا ہو۔ مگر ساتھ ہی یہ تفصیل بھی سامنے رہنی چاہیئے کہ۔

قَالَ اللَّيْثُ هُوَ يَتِيْمٌ مَا لَمْ يَبْلُغِ الْحُلُمَ فَإِذَا بَلَغَ زَالَ عَنْهُ اِسْمُ الْيُتْمِ وَقَالَ اَبُوْ سَعِيْدٍ يُقَالُ لِلْمَرْأَةِ يَتِيْمَةٌ لَا يَزُوْلُ عَنْهَا اِسْمُ الْيُتْمِ اَبَدًا وَاَنْشَدُوْا وَيُنْكِحُ الْاَرَامِلَ الْيَتَامٰى۔ وَقَالَ اَبُوْ عُبَيْدَةَ تُدْعٰى يَتِيْمَةً مَا لَمْ تَتَزَوَّجْ فَاِذَا تَزَوَّجَتْ زَالَ عَنْهَا اِسْمُ الْيُتْمِ...... وَجَاءَ فِيْ حَدِيْثِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَتْ لَهٗ بِنْتُ خِفَافٍ الْغِفَارِيِّ اِنِّيْ امْرَأَةٌ مُؤْتِمَةٌ تُوُفِّيَ زَوْجِيْ۔ (تاج العروس صفحہ ۱۱۳ ج ۹)

لیث نے کہا ہے کہ لڑکا اس وقت تک یتیم کہلاتا ہے جب تک وہ بالغ نہ ہو جائے۔ چنانچہ جب لڑکا بالغ ہو جائے تو اس کے بعد اس کو یتیم نہیں کہا جاتا۔ ابوسعید نے کہا ہے کہ عورت کو برابر یتیمہ کہا جاتا ہے۔ اور اس سے یہ نام کبھی بھی ختم نہیں ہوتا۔ سندھ میں وہ لوگ یہ شعر پڑھتے ہیں کہ بیوہ عورتوں اور یتیم عورتوں کا نکاح کیا جاتا ہے۔ ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ یتیم لڑکی کو اس وقت تک یتیمہ کہا جاتا ہے جب تک اسکی شادی نہ ہو جائے۔ چنانچہ جب اس کی شادی ہو جاتی ہے تو پھر اس کو یتیم نہیں کہا جاتا۔۔۔۔۔۔

حضرت عمرؓ کی حدیث میں آیا ہے کہ خفاف غفاری کی لڑکی نے ان سے عرض کیا تھا کہ میں ایک یتیم عورت ہوں کیونکہ میرا شوہر مر گیا ہے۔

نیا اس سے یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ یتامیٰ کے مفہوم میں لغت اور زبان کے اعتبار سے

(۱) چھوٹے بچے جن کا باپ نہ رہا ہو۔

(۲) جوان کنواری لڑکیاں جن کے باپ مر گئے ہوں۔

(۳) بیوہ عورتیں جن کے شوہر مر گئے ہوں۔

، داخل ہیں۔ لہذا آیت کا مطلب اب یہ ہوگا کہ

اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیم بچوں اور بے باپ کی کنواری جوان لڑکیوں اور بیوہ عورتوں کے ساتھ تم عدل و قسط کا سلوک نہیں کر سکو گے تو تمہیں اجازت ہے کہ تم ان میں سے ان عورتوں سے جو تمہارے لئے حلال اور پسندیدہ ہوں۔ دو دو، تین تین، چار چار کی تعداد میں نکاح کر لو۔

رہے کہ یہ حکم قرآن کے الفاظ میں عام نہیں ہے بلکہ مشروط ہے اور شرط یہ ہے کہ اگر ایسے حالات پائے جاتے ہوں کہ یتیم بچوں بے باپ واری یا بیوہ جوان لڑکیوں کے ساتھ عدل و قسط کا برتاؤ نہ کئے جا سکنے کا اندیشہ ہو۔ تو پھر ان عورتوں سے نکاح کرنے کے لئے ...تعدد ازدواج کی اجازت ہے۔ یہاں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ "اَلنِّسَاءِ" میں وہ عورتیں ہی مراد ہیں جو یتیم کنواری لڑکیاں ...جوان عورتیں ہوں۔ کیونکہ "اَلنِّسَاءِ" میں الف ولام آرہا ہے۔ اس لئے اس سے لامحالہ وہی عورتیں مراد ہونگی جن کا اس سے ...تذکرہ آچکا ہے۔ ان کے علاوہ کوئی دوسری عورتیں مراد نہیں ہو سکتیں۔ ہمارے مفسرین اور مترجمین نے اس نکتہ پر غور نہیں کیا اور ...طرح ترجمہ کر دیا ہے کہ "اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیموں کے ساتھ عدل و انصاف کا سلوک نہیں کر سکو گے تو <u>ان کے علاوہ دوسری عورتوں</u> ...ے دو دو، تین تین، چار چار جو تمہیں پسند آئیں نکاح میں لے لو۔ حالانکہ یہ ترجمہ عربیت کی رو سے بھی صحیح نہیں ہے۔ قرآن کی ...یں کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔ جس کا ترجمہ "ان کے علاوہ دوسری عورتوں" کے الفاظ سے کیا جا سکے۔ لہذا اس قسم کا ترجمہ قرآن ...پر اضافہ ہے۔ اگر قرآن کریم کا مقصد یہی ہوتا تو وہاں "فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنْ نِسَاءٍ اُخَرَ" کے الفاظ ہوتے۔ "نِسَاءُ" ...لفظ پر الف ولام لانے سے مقصد ہی یہ ہے کہ ان عورتوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ جن کا ذکر یتامیٰ کے ضمن میں پہلے

آچکا ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے اسے سمجھنے کے لئے غالباً قرآن کریم کی یہ مثال زیادہ مفید ثابت ہوگی جسمیں اسی ہیئت ترکیبی (CTION
کو اختیار کیا گیا ہے۔ رمضان کے روزوں کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن کریم میں کہا گیا ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ (۲/۱۸۵)

رمضان کا مہینہ جسمیں قرآن کو نازل کیا گیا ہے، لوگوں کے لئے ہدایت اور ہدایت کی واضح اور تمیز کن آیات پر مشتمل ہے لہٰذا تم میں سے جو شخص اس مہینہ (مذکورہ) میں اپنے گھر پر ہو وہ اس کے روزے رکھے اور جو شخص مریض یا مسافر ہو وہ دوسرے دنوں سے اس کی گنتی پوری کرے۔

اس آیت میں دیکھئے اَلشَّھْر سے مراد وہی مہینہ رمضان ہے جس کا پہلے ذکر آچکا ہے کوئی دوسرا مہینہ مراد نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ الشھر پر الف لام آیا ہے جس سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ مہینہ سے مراد وہی مہینہ ہے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اور اسکے بعد جہاں ان دنوں کے علاوہ دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں من الایام (الف ولام کے ساتھ) نہیں کہا گیا بلکہ من ایام (بغیر الف لام کے) کہا گیا ہے اور ساتھ ہی اُخَر کی قید بھی لگا دی گئی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح اگر آیت نکاح میں بیوہ عورتوں کے علاوہ دوسری عورتیں مراد ہوتیں تو قرآن میں اَلنِّسَاءِ (الف لام) کے ساتھ نہ آتا بلکہ بغیر الف ولام کے نِسَا آتا بلکہ ساتھ ہی اُخَر کی قید بھی لگائی جاتی یعنی مِنْ نِسَاءٍ اُخَر کہا جاتا۔

رہ گئی یہ بات کہ اگر قرآن کریم کا مطلب وہی کچھ ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔ تو قرآن کریم نے من النساء کا لفظ کیوں کہا، الیتامیٰ کا یا منھن کا لفظ کیوں نہ کہدیا؟ تو اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ یتامیٰ کے مفہوم میں لڑکے اور لڑکیاں، یتیم بالغ اور کنواری لڑکیاں، اور بیوہ عورتیں سب شامل ہیں۔ اور نکاح ظاہر ہے کہ نابالغ لڑکیوں اور لڑکوں سے تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بالغ عورتوں ہی سے کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے من النساء کا لفظ کہنا ضروری تھا۔ یہاں اس خصوصیت کے ساتھ غور فرمایئے کہ یتامیٰ کے مفہوم میں چونکہ نابالغ لڑکیاں بھی آجاتی تھیں جن سے نکاح کرنا بالاتفاق جائز نہیں ہے۔ اس لئے من النساء کے لفظ سے ان نابالغ لڑکیوں کو بھی خارج کر دیا گیا۔ اور بتا دیا گیا کہ نکاح انہی سے کیا جا سکے گا جو النساء جوان عورتوں کی حد میں داخل ہو چکی ہوں۔ نابالغ لڑکیوں سے نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن کو شان نزول کا پابند نہیں کیا جا سکتا

عام طور سے حضرات علمائے کرام کی طرف سے قرآن پر اس اضافہ کے جواز میں جو وہ "ان کے علاوہ دوسری عورتوں" کا ترجمہ کرتے ہیں بخاری کی وہ حدیث پیش کی جاتی ہے۔ عائشہؓ سے مروی ہے کہ

عروہ بن زبیر نے حضرت عائشہ سے حق تعالیٰ کے اس ارشاد وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ

کے متعلق سوال کیا تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ بھتیجے! یہ یتیم لڑکی ہوتی تھی جو اپنے ولی کی پرورش میں ہوتی تھی اور اپنے ولی کے مال میں شریک ہوتی تھی۔ ولی کو اس کا مال اور اس کا حسن پسند آتا اور وہ چاہتا کہ خود اس سے نکاح کر لے۔ مگر مہر کے بارے میں وہ اس کے ساتھ انصاف نہیں کرتا تھا کہ اسے اتنا ہی مہر دے جتنا دوسرے لوگ دیتے۔ لہٰذا لوگوں کو ان یتیم لڑکیوں کے ساتھ نکاح کرنے سے روک دیا گیا مگر اس صورت میں کہ وہ ان کے ساتھ انصاف کا سلوک کر سکیں اور انھیں وہ بلند سے بلند مہر دے سکیں جو ان کے لئے ہونا چاہیئے تھا۔ اس لئے ایسے لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے شادیاں کریں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ لوگوں نے اس آیت کے بعد رسول اللہ صلعم سے سوال کیا تو خدا تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ دوسری آیت میں حق تعالےٰ کا یہ ارشاد کہ وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ یعنی اپنی یتیم لڑکی سے جبکہ اس کا مال اور حسن کم ہو نفرت و بے رغبتی کا بیان ہے۔ لہٰذا ان یتیم عورتوں کے ساتھ نکاح کرنے کو بھی منع کر دیا گیا جن کی طرف ان کے اولیاء کو ان کے مال و جمال کی وجہ سے رغبت ہوا کرتی تھی۔ مگر یہ کہ یہ اولیاء مہر کے معاملے میں انصاف کا برتاؤ کریں۔ کیونکہ جب ان عورتوں کے پاس مال اور حسن نہیں ہوتا تھا تو ان کے اولیاء ان سے شادی کرنے کی کوئی رغبت ظاہر نہیں کرتے تھے۔ (بخاری جزو سوم ص۳۷ مطبوعہ مصر)

حضرت عائشہؓ کی اس حدیث سے جو آیت نکاح کا شان نزول بیان کر رہی ہے یہ مطلب نکالا جاتا ہے کہ لوگ چونکہ اپنے زیر تربیت یتیم لڑکیوں سے کم مہر دے کر یا بلا مہر کے شادیاں کر لیتے تھے۔ اور اس طرح انصاف کا برتاؤ نہیں کرتے تھے۔ اس لئے آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر ایسی صورت ہے تو تم ان یتیم لڑکیوں سے شادیاں نہ کرو بلکہ ان کے علاوہ دوسری عورتوں سے شادیاں کر لیا کرو اور وہ شادیاں دو دو تین تین چار چار کی تعداد میں کی جا سکتی ہیں۔

اس کا اصولی جواب تو یہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کو شانِ نزول کی روایات کا پابند نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ قرآن کریم عہد رسول اللہ صلعم سے لے کر قیامت تک کے لئے ہدایت اور ضابطۂ حیات ہے۔ لہٰذا اسے چند واقعات کے ساتھ جکڑ بند نہیں کیا جا سکتا علمائے اصول اور فقہائے امت نے خود تصریح کی ہے کہ اَلْعِبْرَةُ بِعُمُوْمِ الْاَلْفَاظِ لَا بِخُصُوْصِ الْمَوْرِدِ (الفاظ کے عموم کا اعتبار کیا جائے گا خاص واقعہ کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا) علاوہ ازیں اگر قرآن کریم کے معانی و مطالب کو شان نزول کی روایات کا پابند بنایا گیا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم قرآن کریم کے ایک قطعی حکم کو ظنی بنا دینا چاہتے ہیں کیونکہ شان نزول کی روایات بہر حال ظنی ہیں اور قطعی اور ظنی کے امتزاج سے جو نتائج برآمد ہوں گے وہ کبھی قطعی نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا قرآنی احکام کی قطعیت کی حفاظت کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کی آیات کو شان نزول کی روایات کا پابند نہ کیا جائے۔

علاوہ ازیں اگر دقت نظر سے حضرت عائشہؓ کی اس حدیث پر غور کیا جائے تو وہ سرے سے اس آیت کا کوئی شان نزول

ہی بیان نہیں فرما رہی ہیں بلکہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جو واقعات پیش آئے ہیں ان کو بیان فرماتے ہوئے ایک دوسری آیت کے شانِ نزول کی طرف اشارہ فرما رہی ہیں۔ راویوں نے روایت بیان کرنے میں کس قدر اختصار سے کام لیا ہے جس سے بات واضح نہیں ہو سکی۔ حضرت عائشہؓ کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو لوگوں نے اس قسم کی یتیم اور بیوہ عورتوں سے شادیاں کرنی شروع کر دیں۔ اور اس ضمن میں ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ لوگوں نے مال اور حسن و جمال کے لالچ میں ایسی لڑکیوں سے شادیاں کر ڈالیں جو خود ان کے دامنِ تربیت میں پرورش پا رہی ہوتی تھیں۔ ان کے ساتھ انہوں نے یہ ناانصافی شروع کر دی کہ یا تو ان کو وہ مہر ہی کچھ دیتے ہی نہیں تھے۔ یا دیتے تھے تو بہت کم۔ اس قسم کے واقعات پیش آئے تو لوگوں نے رسول اللہ صلعم سے سوالات کئے کہ اس مشکل کا کیا حل ہونا چاہیئے چنانچہ قرآن کریم کی ایک دوسری آیت نازل ہوئی جو یہ ہے۔

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ ۖ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ
فِي يَتَامَى النِّسَاءِ اللَّاتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ
وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتَامَىٰ بِالْقِسْطِ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا
مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِهِ عَلِيمًا ۝ (۴/۱۲۷)

اور اے پیغمبر اسلام! لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں حکم پوچھتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ اللہ اور کتاب اللہ کی وہ آیات بھی جو ان یتیم عورتوں کے بارے میں جنہیں تم وہ مہر ادا نہیں کرتے جو ان کے لئے مقرر کیا گیا ہو اور اس کے باوجود تم ان سے نکاح کرنے کے خواہشمند ہو اور کمزور و ناتواں بچوں کے بارے میں تم پر تلاوت کی جاتی ہیں، یہی حکم دیتی ہیں کہ تم یتامیٰ کے لئے انصاف اور قسط کو قائم کرو اور جو کچھ تم بھلائی کرو گے تو یقیناً اسے خدا اچھی طرح جانتا ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس آیت نے یہ بات صاف کر دی کہ ان یتیم اور بیوہ لڑکیوں سے جو تمہارے دامنِ تربیت میں پا رہی ہوں محض مال اور حسن کے لالچ کی وجہ سے نکاح نہیں کیا جا سکتا۔ یا تو ان کے ساتھ پورے پورے عدل اور قسط کا سلوک کرو اور ان کو ان کا پورا پورا مہر ادا کر دو، ورنہ ان یتیم اور بیوہ لڑکیوں کے ساتھ جو تمہارے زیر تربیت ہوں خود نکاح ہی نہ کرو۔ کیونکہ اس صورت میں دباؤ، دھاندلی اور ظلم کا زیادہ اندیشہ ہے بلکہ ان کے علاوہ دوسری یتیم اور بیوہ لڑکیوں سے نکاح کرو جو تمہارے زیر تربیت نہ ہوں اور جن کے ساتھ تم اس قسم کی ناانصافیاں نہ کر سکو۔ البتہ اگر تم ایسی یتیم اور بیوہ لڑکیوں کے ساتھ بھی جو تمہارے زیر تربیت ہوں عدل اور قسط کا سلوک کر سکو اور ان کو ان کا پورا پورا مہر ادا کر دو تو ان سے شادی کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

لہٰذا حضرت عائشہؓ کی یہ حدیث در اصل آیت (۴/۱۲۷) کا شانِ نزول بیان کر رہی ہے۔ آیت نمبر (۴/۳) کا شانِ نزول نہیں بیان کر رہی۔ اس تفصیل کے بعد یہ امر بھی بخوبی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث میں سِوَاهُنَّ سے مراد وہ یتیم اور بیوہ لڑکیاں ہیں جو دوسروں کے دامنِ تربیت میں پرورش پا رہی ہیں؛

ے ساتھ اس قسم کی بے انصافیوں اور دھاندلی بازیوں کا اندیشہ نہ ہو۔ یتیم اور بیوہ لڑکیوں کے علاوہ عام عورتیں مراد نہیں یا کہ ہمارے علمائے کرام نے سمجھا ہے۔

بہرحال حضرت عائشہؓ کی اس حدیث میں قرآن کریم کی دونوں آیتوں کو سامنے رکھکر صورت حال اور اس کے متعلق رسول سلم کا فیصلہ بیان کیا گیا ہے چنانچہ حدیث میں دونوں آیتوں کا حوالہ موجود ہے مگر اختصار کی وجہ سے بات صاف نہیں ہو سکی تفصیل کے بعد جو ہم نے بیان کی ہے حضرت عائشہؓ کی حدیث کا دوبارہ مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ بات وہی کچھ ہے جو ہم بیان کی ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور ہے اگر یہ مطلب نہیں ہے جو ہم نے بیان کیا ہے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ حدیث مذکورہ ر میں آیت (۱۲۷/۴) کے حوالہ کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی اور اس کا تذکرہ وہاں بالکل ہی بے جوڑ ہے۔

تعدد ازدواج اور اسلاف

یہاں یہ سوال کیا جاتا ہے کہ صحابہ کرام کے عہد سے لے کر آج تک ہمارے بزرگ تعدد ازدواج کے قائل چلے آئے ہیں تو کیا انھوں نے قرآن کریم کی اس آیت کا صحیح مطلب نہیں سمجھا تھا اور تمام حضرات غلط اور ناجائز طور پر متعدد نکاح کرتے چلے آئے ہیں؟ یہ سوال اپنی جگہ پر بڑا اہم ہے مگر اس کی نوعیت دینی نہیں یخی ہے۔ آپ مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد تک فتوحات اسلامیہ کا سلسلہ برابر جاری رہا اور مختلف پر اسلامی افواج سرگرم نبرد آزمائی رہیں جس میں آئے دن مسلمان مرد شہید ہوتے اور بیوہ اور یتیم لڑکیوں کی تعداد میں ہ ہوتا رہتا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے واقعہ فاجعہ کے بعد خود مسلمانوں کے درمیان تلواریں چل نکلیں۔ جنگ جمل، صفین، واقعہ حرہ، اور عبدالملک اور عبداللہ بن الزبیر کی جنگ۔ خارجیوں کے خلاف حضرت علیؓ کی جنگیں۔ اس کے بعد و بنو عباس کی آویزشیں، ان خانہ جنگیوں کے نمونے تھے جن میں لاکھوں مسلمان دونوں طرف سے برابر شہید ہوتے ر یتیم اور بیوہ لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ کا باعث بنتے رہتے تھے۔ ان المناک حادثات کے ہوتے ہوئے یہ تصور بھی نہیں کیا گزشتہ حالات کی تلافی ہو گئی ہو گی اور اب امت مسلمہ میں یتیم اور بیوہ لڑکیوں کا کوئی مسئلہ ہی باقی نہیں رہا ہوگا۔ خلافت کے استحکام کو کچھ عرصہ اطمینان کے ساتھ گزر جاتا تو اس قسم کے حالات پیدا ہو سکتے تھے کہ یہ مسئلہ نظر ثانی کا محتاج ہوتا مگر لافت کو وہ استحکام کچھ زیادہ عرصہ نصیب نہ ہو سکا۔ آئے دن علویوں اور فاطمیوں کی طرف سے بغاوتیں ہوتی رہتی تھیں کچھ نجات ہوئی تو ترکیوں اور ایرانیوں اور عربوں کی آویزشیں شروع ہو گئیں کچھ فرقہ وارانہ فسادات نے خوفناک شکلیں اختیار بلکہ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ اسی اندرونی آویزشوں سے پر چلی آتی ہے۔ لہٰذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس عرصہ میں وہ مدت آئی ہو گی جن میں اسلامی معاشرہ ان ہنگامی حالات سے دوچار نہیں رہا ہوگا۔ جب تک مسلمانوں کے ہاتھوں ت واقتدار رہا وہ برابر اغیار سے یا خود اپنوں سے نبرد آزما رہے البتہ اب چند صدیوں سے حکومت و سلطنت کو کھو چکنے یہ حالات ضرور پیدا ہو گئے ہیں کہ اسلامی معاشرہ میں عورتوں اور مردوں کی تعداد میں کسی نہ کسی حد تک توازن اور پیدا ہو گیا ہے اور ماضی کے ان ہنگامی حالات کی کسی حد تک تلافی ہو سکی ہے۔ اور جس دن سے حالات نے یہ پلٹا

کھا رہا ہے اس وقت سے حساس طبیعتیں برابر کوشش کر رہی ہیں کہ ان مسائل پر نظرِ ثانی کی جا سکے۔ لیکن صدیوں کے بعد جب مسلمانوں پر جمود و غرور کے گہرے بادل چھا چکے تھے۔ اور ملت مسلمہ کا کاروان اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا ان تمام بادلوں کو ایک دم نہیں ہٹایا جا سکتا تھا۔ مسلمانوں پر عرصہ دراز سے جامد تقلید چھائی ہوئی تھی۔ اولاً اس کے خلاف آواز بلند ہوئی اور ہر طرف حدیث رسول کا شور برپا ہوا اور غیر مقلدین یا اہل حدیث کا ایک فرقہ پیدا ہو گیا۔ ائمۂ فقہ کی تقلید کا بت ٹوٹا تو حدیث رسول کے نام سے ائمۂ حدیث کی تقلید شروع ہو گئی بالآخر اس کے مفاسد کچھ عرصے کے بعد سامنے آنا شروع ہوئے تو آہستہ آہستہ قرآن کی آواز بلند ہونا شروع ہوئی اور ہمارے دور میں ائمۂ حدیث کا طلسم بھی ٹوٹ رہا ہے اور ملت اسلامیہ قرآن کریم کے قریب تر آتی جا رہی ہے۔ لیکن جو حضرات دین میں اپنے آپ کو (AUTHORITY) سمجھتے ہیں وہ اس نظرِ ثانی کے مطالبے کے راستے میں سنگِ گراں بنے ہوئے ہیں۔ وہ خالی ہو کر نہ قرآن کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ اور نہ ہی زمانہ کے تقاضوں کو، اور نہ ان کے مطابق اپنی سابقہ روش میں کسی تبدیلی کے لئے تیار ہیں۔

بہرحال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ کچھ اس قسم کی گذری ہے کہ خصوصیت کے ساتھ اس مسئلہ پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی کیونکہ جن ہنگامی حالات میں تعددِ ازدواج کی اجازت دی گئی تھی وہ ہنگامی حالات بدستور سوسائٹی پر مسلط رہے۔ البتہ جب سے حالات نے پلٹا کھایا ہے۔ اس وقت سے برابر مذہب کے موجودہ ڈھانچے میں تبدیلی و اصلاح و ترمیم کی کوشش کی جا رہی ہیں۔ لیکن علمائے کرام کا ایک مخصوص طبقہ اپنی کوتاہ نگہی یا ذاتی مفادات کی خاطر مسلمانوں کو اس پر سوچنے سے روکے ہوئے ہے ورنہ اس قسم کی تبدیلیاں کبھی کی ہو چکی ہوتیں جو کچھ اوپر کہا گیا ہے۔ اگر اس کے بعد بھی کوئی یہ کہے تاریخ میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے بغیر مخصوص حالات کی شرط کے ایک سے زائد شادیاں کیں اور وہ ان مثالوں کو بالکل یقینی ہیں تو اس باب میں با ادب گذارش ہے کہ ہماری تاریخ میں کتنی باتیں ایسی ملتی ہیں جو یکسر اسلام کے خلاف ہیں لیکن ان ہزار سال سے متواتر چلی آ رہی ہیں۔ ایک ملوکیت ہی کو لیجئے کیا اس کے خلافِ اسلام ہونے میں دو آراء بھی ہو سکتی ہیں؛ لیکن اس کے باوجود کیا یہ نہیں کہ ہماری اس ہزار سال کی تاریخ میں ملوکیت ایک مسئلہ کی حیثیت سے چلی آ رہی ہے اور کسی نے اس کے خلاف لب کشائی کی۔ آج بھی جہاں جہاں ملوکیت موجود ہے ہمارے علماء ان کے خلاف ایک لفظ تک نہیں کہتے۔ لہٰذا یہ دلیل کہ ایسا ہزار سال سے چلا آ رہا ہے کسی چیز کو اسلامی نہیں بنا دیتا۔ کسی چیز کا اسلامی ہونے کے لئے اس کا خدا کی کتاب کے مطابق ہونا بنیادی شرط ہے


کام محنت سے
کھیل ہمت سے




سب کی پسند
MISWAK
MAKES
TEETH
PEARLY
WHITE

حقائق و عبر

مستقبل کا مذہب

۵ دسمبر کی شام، ریڈیو پاکستان سے عصر حاضر کے مشہور مؤرخ ڈاکٹر آرنلڈ ٹوئن بی کی ایک ریکارڈ کردہ تقریر نشر ہوئی جس میں انھوں نے منجملہ دیگر امور مذہب کے متعلق اپنے خیالات کا ان الفاظ میں اظہار کیا۔

دور حاضر کی روح میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ کسے کس طرح سے پُر کرے گا؟ یہ خلا سائنس کی ترقی کا پیدا کردہ ہے۔ سائنس نے روایتی مذہب کو میدان سے نکال باہر کیا ہے لیکن سائنس اس خلا کو پُر نہیں کر سکتی (جو خود اس کا پیدا کردہ ہے) سائنس نے انسان کو خارجی کائنات اور خود انسان کے جسم پر ایسا کنٹرول عطا کیا ہے جس کی نظیر اس سے پیشتر کہیں نہیں ملتی۔ لیکن سائنس اس بات میں انسان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی کہ وہ خود اپنی ذات پر کس طرح کنٹرول رکھے اور حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ وہ اپنے آپ پر کس طرح کنٹرول رکھے۔ یہ مسئلہ اہم بھی ہے اور فوری توجہ کا مستحق بھی۔ فوری توجہ کا اس لئے کہ خارجی کائنات پر انسان کا کنٹرول بہت زیادہ وسیع ہو گیا ہے جس کی وجہ سے انسان کی حالت آج ایسی ہو چکی ہے جیسے بچے کے ہاتھ میں چاقو دے دیا جائے۔ یعنی ایسے انسان کو جسے ذہنی پختگی حاصل نہ ہوئی ہو ایسے ہتھیار دے دیئے جائیں۔ جن کے استعمال کے لئے بہت زیادہ ذہنی اور قلبی پختگی کی ضرورت ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا انسان دوسرے انسانوں کے لئے اور خود اپنے آپ کے لئے بھی بے حد خطرناک ثابت ہوگا تاوقتیکہ وہ روحانی طور پر اتنا آگے نہ بڑھ جائے کہ وہ ان ہتھیاروں کا صحیح استعمال کر سکے۔ لیکن روحانی پختگی سائنس کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتی۔ مذہب کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ بنا بریں، میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ بیسویں صدی کا انسان مذہب کی تلاش میں نکلے گا۔ اور مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ اپنی تلاش میں کامیاب ہوگا۔ اور مذہب کو پالے گا لیکن وہ نیا مذہب اس کے روایاتی مذاہب سے اس قدر مختلف ہوگا کہ پہلی نظر میں وہ شاید پہچانا بھی نہ جا سکے۔

اس کے بعد ڈاکٹر موصوف کہتا ہے۔

وہ کون سی کسوٹی ہوگی جس پر پرکھ کر یہ معلوم کیا جا سکے کہ یہ نیا مذہب فی الواقعہ سچا مذہب ہے۔ اس کی

کسوٹی یہ ہوگی کہ یہ مذہب انسانی مصائب و مشکلات کو حل کرنے کی قدرت اپنے اندر رکھے گا۔ اگرچہ
آنے والی مشکلات موجودہ مشکلات سے بھی بڑھ چڑھ کر ہوں گی۔

(ٹائمز آف کراچی مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۵۶ء)

ظاہر ہے کہ جب موجودہ روایاتی مذاہب مٹ جائیں گے (اور مٹنا ان کے لئے مقدر ہے) تو دنیا میں خدا کی وحی (جو حقیقی دین کی ضامن ہو سکتی ہے) قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں ملے گی۔ اس لئے مستقبل کا مذہب وہ دین ہوگا جسے قرآن نوع انسانی کے لئے تجویز کرتا ہے۔ یہ دین فی الواقعہ مروجہ مذاہب سے مختلف ہوگا (اور مروجہ مذاہب میں ظاہر ہے کہ خود ہمارا مروجہ مذہب بھی شامل ہے جو قرآن پر مشتمل نہیں ہے) اس دین میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ نوع انسانی کی تمام مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کر سکے اس لئے کہ اس نے خود یہ کہا ہے کہ

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)

دنیا میں بقا اسی کے نصیب ہو سکتی ہے جو نوع انسانی کے لئے منفعت
بخش ہو۔

اس لئے وہ سب سے پہلے یہ کرے گا کہ رزق کے سرچشموں کو تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلا چھوڑ دے گا اور پوری نوع انسانی کو ایک عالمگیر برادری قرار دے کر تمام افراد انسانیہ کی نشوونما کے اسباب و ذرائع مہیا کرے گا۔

طلوع اسلام اسی قرآنی دین کے احیاء کے لئے کوشاں ہے۔ زمانے کے تقاضے اس پر شاہد ہیں کہ یہ دین متمکن ہو کر رہے گا اس کے بغیر انسانیت رہ ہی نہیں سکتی۔

۲۔ "بناسپتی نبوت" کے ستون

دوسری جنگ عظیم کے دوران میں، مرزا محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان نے ایک الہامی بیان، ۳ر جون سنہ ۱۹۴۰ء کے اخبار الفضل میں شائع کیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے:

انگریزوں کی مثال درحقیقت ایسی ہی ہے جیسے کہ قرآن کریم میں آتا ہے کہ دو یتیم بچوں کا خزانہ ایک دیوار کے نیچے دبا ہوا تھا۔ ایک مدت کے بعد دیوار بوسیدہ ہو کر گرنے کے قریب ہو گئی۔ مگر حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھی نے اس دیوار کو پھر بنا دیا۔ اسی طرح ظاہر حالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریز اور فرانسیسی وہ دیواریں جس کے نیچے احمدیت کی حکومت کا خزانہ مدفون ہے اور خدا تعالیٰ نے چاہتا ہے کہ یہ دیوار (یعنی فرانس اور برطانیہ) اس وقت تک قائم رہے جب تک خزانہ کے اصل حقدار جوان نہیں ہو جاتے۔ ابھی احمدیت چونکہ بالغ نہیں ہوئی ہے اور بالغ نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس خزانہ پر قبضہ نہیں کر سکتی اس لئے اگر اس وقت یہ دیوار گر جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے لوگ اس پر قبضہ جما لیں گے۔ پس اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہم پھر ایسی دیوار بنا دیں۔ تا جب احمدیت اپنی بلوغت کا عمر کو پہنچ جائے تو اس وقت وہ اس خزانہ کو سنبھال لے۔ پس

اس وقت احمدیت کا فائدہ انگریزوں کی فتح میں ہے۔ حضرت مسیح موعود نے بھی دعا کی ہے کہ اللہ تعالیٰ جنگ میں انگریزوں کو فتح دے۔ پس حضرت مسیح موعود کی سنت کی اتباع میں ہمارا فرض ہے کہ ہم انگریزوں کی کامیابی کے لئے دعا کریں۔ اس وقت انگریزوں یا فرانسیسیوں کا سوال نہیں بلکہ احمدیت کی تبلیغ کی آزادی کا سوال ہے۔ پس نہایت ہی درد اور کرب کے ساتھ دعا کریں۔ کیونکہ معاملہ معمولی نہیں بلکہ نہایت ہی خطرناک ہے۔

(بحوالہ نوائے پاکستان۔ ۱۳ر دسمبر ۱۹۵۶ء)

سچ کہا تھا حکیم الامتؒ نے کہ

اگر ایں آب و جلے از فرنگ است　　جبینِ خود مسنر جز بردرِ او

شریں را ہم بہ چوبش دہ کہ آخر　　حقے دارد بہ خرس پالان گر او

تین نئی کتابیں

۱۔ طاہرہ کے نام خطوط

قارئین کو یہ معلوم کرکے خوشی ہوگی کہ طاہرہ کے نام خطوط کا مجموعہ بھی اب پریس میں جارہا ہے
والوں کی سہولت کی غرض سے اسے دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ حصہ اول میں قریب دو
حصہ دوم میں بقایا خطوط اور ان کے ساتھ میرج کمیشن کے سوالنامہ کا جواب۔ اس کے بعد ایک نہایت مفید باب ہے۔ محترم پرو
قرآن کریم کے ان تمام احکامات کو جو عورتوں (عائلی زندگی) سے متعلق ہیں مختلف عنوانوں کے تحت مربوط مضامین کی شکل میں یکجا کردیا
یہ تمام مضامین اس باب میں آگئے ہیں۔ اس اعتبار سے کتاب ایک نادر مجموعہ بن گئی ہے جس کی روشنی میں ہماری بچیاں اور بہنیں اپنے حقوق
فرائض کے متعلق وہ سب کچھ معلوم کرلیں گی جو قرآن میں بیان ہوا ہے۔

ہر حصہ قریب سوا دو سو صفحات پر مشتمل ہوگا اور قیمت فی حصہ دو۔ اڑھائی روپے کے درمیان۔ اپنی فرمائشیں جلد بھیجدیجئے اور
بات کی تصریح کردیجیے کہ آپ ایک ہی حصہ چاہتے ہیں یا دونوں۔

۲۔ برقِ طور

جوئے نور کے بعد اب برقِ طور شائع ہورہی ہے۔ جس میں حضرت موسیٰؑ سے لیکر حضرت زکریاؑ سے قبل
انبیائے بنی اسرائیل کا تذکار جلیلہ آگیا ہے۔ یہ کتاب اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ اس میں قوموں کے ع
زوال کے ابدی قوانین، داستانِ بنی اسرائیل کی شکل میں ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

کتاب قریب ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔

۳۔ تاریخ الامت حصہ ششم

یہ کتاب ایک عرصے سے پریس میں رکی ہوئی تھی۔ بارے اب چھپ گئی ہے
عنقریب شائع ہوجائے گی۔ اس کے بعد ساتویں اور آٹھویں حصہ کی اشا
سے تاریخ الامت کے سلسلہ کی تکمیل ہوجائے گی۔

یہ تینوں کتابیں، پیشگی خریداران کی خدمت میں از خود بھیجدی جائیں گی۔ بجز ان حضرات کے جو اس امر کی اطلا
کہ انہیں فلاں کتاب درکار نہیں۔ باقی حضرات اپنی اپنی فرمائشیں جلد بھیجدیں۔ ان کی تعمیل فرمائشیں موصول ہونے کی تر
کی جائے گی۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام
۱۵۹/۳۔ ایل (پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی)

نقد و نظر

نقوش۔ شخصیات نمبر ۲ پچھلے سال لاہور سے شائع ہونے والے ماہنامہ نقوش نے اپنا شخصیات نمبر شائع کیا تھا۔ اس سال اس نے اسی نمبر کا دوسرا حصہ شائع کیا ہے۔ پہلا حصہ قریب سات سو صفحات پر مشتمل تھا (اور اس پر ہفتہ وار طلوع اسلام کی ۲ مارچ ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں تبصرہ کیا گیا تھا) یہ دوسرا حصہ قریب آٹھ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی قیمت آٹھ روپے ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نقوش کی یہ ہمت اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ اس نے عصر رواں کی اس قدر متنوع ہستیوں کے کوائف حیات یک جا جمع کر دیئے۔ لیکن اس حصہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں اب اشخاص تو ہیں، شخصیتوں (PERSONALITIES) کا دور اب سے کچھ عرصہ پہلے قریب قریب ختم ہو گیا تھا۔ اس حصہ میں بھی جو حضرات اس دور سے متعلق ہیں ان کی زندگی میں شخصیت کی جھلک ملتی ہے۔ باقی اشخاص ہی اشخاص ہیں۔ قوموں کی پستی کے دور میں یہی ہوتا ہے۔ اشخاص بہت زیادہ شخصیتیں شاذ و نادر۔ یہ بہرحال نقوش کا قصور نہیں۔ ہمارے دور کی کمی ہے۔ یہ البتہ نقوش کا قصور ہے کہ اس نے بعض پیروں کی کہانیاں ان کے مریدوں سے لکھوا کر شائع کر دیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہر مرید اپنے پیر کے متعلق یہی کہے گا کہ

> اگر ہم ہمالیہ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر ارض پاک کے آدمیوں پر نگاہ ڈالیں تو شاید پہلی نگاہ اسی شخصیت کے حصے میں آئے گی۔

سنجیدہ نوشتوں میں اس قسم کی عقیدتمندیوں کو بار نہیں پانے دینا چاہیئے۔

محترم ابوالخیر مودودی صاحب نے اس شمارہ میں بھی ایک شگفتہ مقالہ لکھا ہے۔ ان کے علاوہ، یہ دیکھ کر بھی حیرت اور مسرت ہوئی کہ حکیم نیر واسطی صاحب اس قدر کیف بار و نشاط آور قلم کے مالک ہیں۔ اختر شیرانی کا حق تھا کہ اس پر اسی انداز سے جھومتے ہوئے لکھا جائے۔ شخصیت کے اعتبار سے ہمارے نزدیک اس مجموعہ کا حاصل نواب وقار الملک پر قہر صاحب کا مقالہ ہے۔ قارئین سے اس کا تفصیلی تعارف کسی آئندہ اشاعت میں کرایا جائے گا۔

۱۔ نوائے فردا حکومت پاکستان کی وزارت مواصلات میں ایک صاحب نائب مشیر مالیات کے عہدہ پر فائز ہیں۔ شیخ محمد ایوب نام۔ عربی۔ فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں کافی دستگاہ۔ ذوق نہایت شستہ۔ طبع بلند

برسوں ساتھ رہنے والوں میں سے بھی بہت کم ایسے ہوں گے جنھیں یہ معلوم ہو کہ وہ شعر بھی کہتے ہیں۔ حالانکہ شعر ایسے پاکیزہ کہتے اس دور میں باید و شاید۔ اقبال سے انھیں عشق ہے۔ ایسا عشق کہ انھوں نے شعر میں قدم قدم پر ان کی اتباع کو اپنا شعار بنا لیا۔ کا نتیجہ "نوائے فردا" کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اس میں ایوب صاحب نے "زبور عجم" کے شعر پر شعر اور غزل پر غزل کہی ہے زمین۔ اُسی قافیہ اور اسی ردیف میں۔ مضامین بھی وہی اور اصطلاحات و تراکیب حتیٰ کہ تشبیہات و استعارات بھی (ساز جدید کا حصہ اس میں نہیں ہے)

اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک ایوب صاحب کے اپنے ذوق کا تعلق ہے، اس سے اس کی تسکین ضرور ہوگی، سوال یہ ہے کہ ان کی اس کوشش اور محنت سے قوم کو کیا فائدہ پہنچا؟ ظاہر ہے کہ ان نظموں میں پیغام وہی ہے جو اقبال نے دیا ہے اسلئے اس اعتبار سے ہمارے ملی سرمایہ میں اس سے کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اور اس قدر کوشش کے باوجود اقبال کی سی بلندی اور گہرائی پیدا نہیں ہو سکی اور نہ ہی ہو سکتی تھی۔ اسلئے کہ ابھی وقت چاہیئے کہ کوئی اقبال کی سی فکر اور احساسات کی گہرائی تک پہنچ سکے۔ لہٰذا اس اعتبار سے اس کا پایہ زبور عجم سے یقیناً کمتر ہے۔ بنا بریں زبور عجم کے بعد "نوائے فردا" کے مطالعہ سے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ مثلاً زبور عجم کی مشہور نظم ہے۔ یا چناں کن یا چنیں۔ اس زمین میں کی نظم کے ایک دو بند ملاحظہ فرمایئے۔

اے مسلماں یا بروں نہ پائے خود را از حرم　　　یا قیامے در حدودِ آں بہ صدقِ دل گزیں

یا چناں کن یا چنیں

یا بکن از تیشۂ تفریقِ خود مار یز ریز　　　یا بشو با ہمدماں وابستۂ حبل المتیں

یا چناں کن یا چنیں

اقبال کی نظم اور اس میں جو بین فرق ہے وہ ارباب ذوق و نظر سے پوشیدہ نہیں۔ فطرت نے ایوب صاحب کو صلاحیتیں دی ہیں۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ ان صلاحیتوں کو کسی تخلیقی کام میں صرف فرمائیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ شاعر پر جذبات کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ اس قسم کے مشورے اس کے نزدیک درخورِ اعتنا نہیں ہوتے اگر کہیں ہمارے شاعر جذبات سے الگ ہو کر سوچنا شروع کر دیں تو ہزاروں شاعر آج ہی شاعری چھوڑ دیں۔

"نوائے فردا" زبور عجم کی تقطیع اور انداز پر فیروز سنز نے شائع کی ہے۔ اور مجلد کی قیمت پانچ روپے ہے

اسلام اور موسیقی

انسان اور حیوان میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ انسان کے تقاضے صرف طبعی جسم کے نہیں بلکہ وہ حسن و زیبائی بھی رکھتا ہے۔ حسن صحیح تناسب کا نام ہے اور چونکہ انسانی ذات کی خوبی یہ ہے کہ اس کی مختلف صلاحیتوں کی نمود اس انداز سے ہو کہ اس میں کامل ہم آہنگی اور تناسب قائم رہے، اس لئے

کی بنیادی خصوصیت ہے۔ قرآن جو انسان کی تمام نشوونما کا ضابطہ ہے وہ بھلا زندگی کے جمالیاتی پہلو کو کس طرح نظر انداز کر سکتا
ں نے ان لوگوں کو جو زندگی کے زینت افزا پہلوؤں کو "روحانیت کا حریف" سمجھتے تھے للکارا اور کہا کہ ان سے پوچھو کہ مَنْ حَرَّمَ
ةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ (۷:۳۲) کون ہے جو ان زینت کی چیزوں کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے حرام
بتاتا ہے؟

قرآن نے یہ کہا تھا لیکن جب قرآن نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور اس کی جگہ انسانوں کے خود ساختہ مذہب نے لے لی تو ہمارے
ب مذہب نے خدا کے اس چیلنج کا بڑے دھڑلے سے جواب دیا اور کہا کہ ہم ہیں جو زینت کی ہر قسم کی چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں! یوں ہمارے
فطرت کا ہر حسین اور شگفتہ گوشہ شجر ممنوعہ قرار پا گیا۔ اور فنونِ لطیفہ کو گہری قبروں میں دبا دیا گیا۔ لیکن انسانی تقاضوں کو کیا جاتا ہے
ہیں اس طرح دبا دیتے ہیں! ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

پری رو تاب مستوری ندارند — چو در بندی زروزن سر بر آرند

ی نہ کسی شکل میں باہر آتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں جب ان تقاضوں نے سر ابھارا تو خود اپنے ہاتھوں سے عائد کردہ پابندیوں
ہ جواز کی راہیں تلاش ہونا شروع ہو گئیں۔ اب کہا یہ گیا کہ مصوری حرام ہے لیکن صرف جاندار اشیاء کی۔ موسیقی حرام ہے لیکن
رف مزامیر کے ساتھ۔ یعنی اگر انسان اپنے گلے سے آواز نکالے تو ایسا کرنا بالکل جائز اور درست ہو گا لیکن اگر وہی آواز تانبے کی تار سے
ال لی جائے تو وہ حرام ہو جائے گی! ہمارے ہاں

منکرے بودن و ہم رنگ مستاں زیستن

ایہی انداز چلا آ رہا تھا کہ محترم محمد جعفر شاہ صاحب ندوی نے جرأت کی اور اپنی کتاب اسلام اور موسیقی میں بتایا کہ موسیقی (گلے سے ہو یا
سازوں کے ذریعے) نہ اسلام نے حرام قرار دی ہے نہ اسلاف نے اسے ایسا سمجھا ہے۔ کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن محنت سے لکھی گئی ہے۔
اس میں شبہ نہیں کہ محترم شاہ صاحب کی یہ جرأت قابل داد ہے لیکن (اپنی دیگر تصانیف کی طرح) وہ اس میں بھی کھل کر بات نہیں
رتے بلکہ محفل میں آتے ہیں تو با ایں نمط کہ:

چو زاہدے کہ بہ بزم شراب می آید

الٰہی بات صاف ہے کہ حرام حرام ہے اور حلال حلال۔ اور ان کے بین بین کوئی راستہ نہیں حلال پر پابندی ہے تو صرف اتنی کہ اس کا
ستعمال حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے کیا جائے۔

لیکن ایک بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی اور وہ یہ کہ پاکستان میں اس کتاب کی اشاعت سے کیا فائدہ تھا؟ اگر موسیقی بہ نصوص صریحہ حلال
طیب ثابت کر دی جائے تو بھی جو موسیقی یہاں (ریڈیو پاکستان کے تصدق) وجہ عذاب گوش بنتی ہے وہ تو کسی صورت میں حلال نہیں قرار
پا سکتی۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ اسی قسم کی موسیقی ہو گی جسے سن کر ہمارے متقدمین نے موسیقی کو حرام قرار دیا تھا ہمارے ارباب حل و عقد کے کانوں تک اقبال کا یہ پیغام کون پہنچائے کہ

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام — حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

شاہ صاحب کی یہ دلچسپ اور پُر از معلومات کتاب ادارۂ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور سے سوا تین روپے میں مل سکتی ہے۔

باب المراسلات

حضرت عائشہؓ کی عمر شادی کے وقت

محترم پرویز صاحب زاد لطفہٗ السلام علیکم۔

ماہ نومبر کے طلوعِ اسلام میں آپ کا مقالہ "حضرت عائشہؓ کی عمر شادی کے وقت" پڑھا۔ اس میں آپ نے ایک ایسی حقیقت کا انکشاف کیا ہے جس پر کم و بیش ایک ہزار سال سے پردہ پڑا ہوا تھا۔ مولوی کی روایت پرستی نے تحقیق و تفحص کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔ زمانے نے سینکڑوں کروٹیں بدلیں۔ اور مخالفین و اعدائے اسلام نے آنحضرت صلعم کی سیرتِ طیبہ کے اس گوشہ پر ناپاک حملے کئے۔ مگر مولوی ٹس سے مس نہ ہوا۔ حضور اکرم صلعم کی سیرت کا مطالعہ کرتے وقت سلیم الطبع مسلمان حضرت عائشہؓ کے متعلق THE CHILD WIFE OF MOHAMMAD (محمدؐ کی صغیر السن بیوی) کا طعن آمیز خطاب سنتا، پیچ و تاب کھاتا تھا اور اس کو ایک عقدہ لاینحل خیال کر کے شرم سے آنکھیں نیچی کر کے آگے بڑھ جاتا تھا۔ لیکن آپ کے ناخنِ گرہ کشا نے معجزانہ طور پر انھیں کتب سے جن کو مولوی اپنی ڈھال بنائے بیٹھا تھا اس حقیقت کو واشگاف کیا کہ حضرت عائشہؓ کی عمر آنحضرت صلعم سے نکاح کے وقت سترہ سال کی اور رخصتی کے وقت تقریباً انیس سال کی تھی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

حضرت عائشہؓ کا نکاح آنحضرت صلعم سے کس سال ہوا؟ آپ جس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ اس کو ایک دوسرے طریقہ سے ثابت کیا جا سکتا ہے میری تحقیق میں نکاح اور رخصتی دو دو الگ الگ واقعات ہیں۔ نکاح کو منگنی سے تعبیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک عام اور مشہور روایت ہے کہ آنحضرت صلعم سے حضرت عائشہؓ کا نکاح سنہ ۱۰ نبوت میں ہوا۔ یہ غلط ہے۔ صحیح یہ ہے کہ نکاح ہجرت کے سال ہوا۔ اس کا ثبوت صحیح بخاری کی ایک حدیث سے ملتا ہے جو خود حضرت عائشہؓ سے مروی ہے:-

عن عائشۃ قالت ما غرت علی امرأۃ ما غرت علی خدیجۃ من کثرۃ ذکر رسول اللہ صلعم قالت وتزوجنی بعدھا بثلاث سنین وامرہ ربہ عزوجل او جبریل علیہ السلام ان یبشرھا ببیت فی الجنۃ من قصب (بخاری فضائلِ صحابہ)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے فرمایا کہ میں نے کسی عورت پر اتنا رشک نہیں کیا جتنا میں نے خدیجہؓ پر کیا۔ رسول اللہ صلعم کا بکثرت ان کا ذکر کرنے کی وجہ سے۔ (نیز) فرمایا کہ رسول اللہ صلعم نے ان کی وفات کے تین سال بعد مجھ سے نکاح کیا ... اللہ عزوجل، نے یا جبریل علیہ السلام نے حکم دیا کہ ان (خدیجہؓ) کو جنت میں ایک محل کی خوشخبری دیں جو موتی

رت خدیجہ رضی کا سن وفات بالاتفاق سنہ۱۰ نبوت ہے۔ یعنی ہجرت سے تین سال قبل (بخاری) لہٰذا اس حدیث کے مطابق حضرت
شہ رضی کا نکاح وفات خدیجہ رضی سے تین سال بعد یعنی مکہ میں ہجرت کے واقعہ سے متصل زمانے میں ہوا۔

اب صورت یہ ہوئی کہ کتب تاریخ و سیر سے جن میں سیرت کے متعلق قوی اور ضعیف دونوں طرح کی روایات ملتی ہیں استمداد
کے بغیر ہم کو صحیح بخاری اور اسماء الرجال سے یہ حقائق مل جاتے ہیں۔

(۱) حضرت عائشہ رضی کا نکاح سنہ۱۳ نبوت میں ہجرت سے قریب تر زمانے میں ہوا۔　(بخاری)

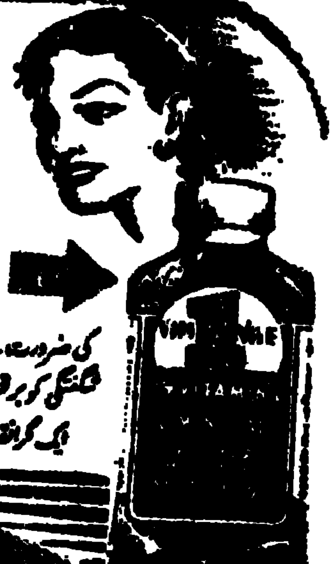
(۲) اُس وقت ان کی عمر سترہ سال کی تھی۔　(اکمال فی اسماء الرجال)

ہا رخصتی کا سوال۔ یہ مدینہ میں ہوئی۔ سنہ۲ھ کی روایات اس کے متعلق صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ اس وقت حضرت عائشہ رضی کی
قریباً انیس سال کی تھی۔ رخصتی میں تاخیر کی وجہ وہ احوال و حوادث ہیں جو مدینہ پہنچ کر آنحضرت صلعم اور خاندان ابوبکر کو
پیش آئے۔

(نیازمند)　بشیر احمد سوی　(راولپنڈی)

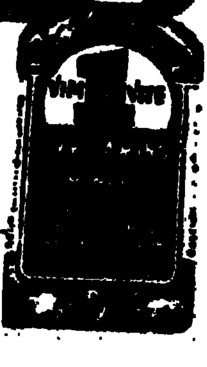
---

* نبت خدیجة قبل مخرج النبی صلعم الی المدینة بثلاث سنین فلبث سنین او قریباً من ذالك ....(بخاری)
آنحضرت صلعم کے مدینہ ہجرت فرمانے سے تین سال قبل فوت ہوئیں۔ پھر وہ دو سال یا اس کے قریب مدت میں تنہا بغیر زوج کے رہے۔ یہ دو سال
ن شماری کے طریقہ سے خالی کے دو سال ہیں جو سنہ۱۰ نبوت اور سنہ۱۳ نبوت کے درمیان آتے ہیں۔









مطبوعات طلوع اسلام کی

شرائط ایجنسی

رح کمیشن ۔ سلسلۂ معارف القرآن ۔ (۱) معراج انسانیت
بلیس و آدم (۳) جوئے نور (۴) انسان نے کیا سوچا ؟
۲ فیصدی ۔ دیگر مطبوعات ، ۳۳ فیصدی
ابعد وضع کمیشن بذریعہ وی پی وصول کی جائیگی ۔ غیر فروخت شدہ
ں نہیں لی جائیں گی پہلی فرمائش پچاس روپے بعد وضع کمیشن
م نہیں آنی چاہیئے ۔ ہر آرڈر کے ہمراہ کم از کم چوتھائی رقم پیشگی آنی
یئے ، ورنہ تعمیل نہ ہو سکیگی ۔ کراچی کے ایجنٹ صاحبان دفتر
ع اسلام سے معاملے کریں ۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

خط و کتابت کرتے وقت

خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجیئے ۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف ۔

ناظم ادارہ


چھوٹا مسواک ٹوتھ برش
Hashmi
دانتوں کی صفائی بچوں کو صحت مند اور توانا رکھتی ہے
چھوٹے بچوں کے لئے چھوٹا مسواک
نایاب تحفہ ہے
جو نرم و نازک مسوڑوں کے لئے بے ضرر ہے اور
جس کا استعمال بچوں کیلئے مفید ترین مشغلہ۔

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

کراچی

بدل اشتراک
ہندوستان اور پاکستان سے سالانہ آٹھ روپے
غیر ممالک سے سالانہ ۱۴ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوستان اور پاکستان سے
بارہ آنے

ٹیلیفون نمبر: ۴۱۴۸۸
خط و کتابت کا پتہ: ۱۵۹/۳ - ایل
پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی ۲۹

جلد ۱۰ | اپریل سنہ ۱۹۵۷ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

غالب نے جب کہا تھا کہ

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا۔ کیجئے ہائے ہائے کیوں

تو اس نے ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ کسی کی موت پہ پہلے آنسو تو وہ ہوتے ہیں جو ہنگامی طور پر بے اختیار نکل پڑ ہیں لیکن اس کے بعد اس کی یاد میں آنسو وہی بہاتا ہے جو اس کی کمی محسوس کرتا ہے۔ جتنی شدید اس کی کمی ہو۔ اتنی ہی گہر کی یاد ہوتی ہے اور جس جس مقام پر اس کی کمی نمایاں ہوتی ہے اسی مقام پر آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔

انیس سال کا عرصہ ہوا، علامہ اقبال ہم سے رخصت ہوگئے۔ اور ہنگامی طور پر ساری قوم کی آنکھیں باہیں نمط اش ہوگئیں کہ دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ ایسا ماتم شاید ہی کسی اور کی موت پر ہوا ہوگا۔ ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا۔ اقبال ملت ک والا دل تھا۔ اس کے رک جانے سے قوم کی نبضِ ہستی ساکت ہوجانی چاہیئے تھی۔ لیکن اس کے بعد قوم کے آن ہونے لگ گئے، اور اب ان کی آنکھیں اس طرح بے نم ہوگئی ہیں کہ کسی کو خیال تک بھی نہیں گذرتا کہ انہی آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپکے تھے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ قوم کو اس کا احساس ہی نہیں کہ

"غالب خستہ کے بغیر کون (کون) سے کام بند ہیں۔

جن قوموں میں زندگی کا صحیح نظام قائم ہو، ان میں افراد کی موت سے کوئی کام بند نہیں ہوتا۔ افراد آتے ہیں اور افراد جا لیکن وہ نظام اپنے زورِ دروں سے بدستور آگے بڑھے چلا جاتا ہے۔ لیکن جن قوموں میں نظام زندگی مفقود ہو ان زندہ (یعنی صحیح معنوں میں زندہ اور زندگی بخش) فرد کی موت ——— اور ایسے وقت میں موت جب کہ اس کا ابھی ناتمام ہو ——— بہت بڑا سانحہ ہوتا ہے۔ ایسی اقوام میں دیدہ ور افراد پیدا ہی بڑی مشکل سے ہوتے ہیں۔ ا کوئی ایسا فرد اپنے پیش نظر مقصد کی تکمیل سے پہلے مرجائے تو یہ اس قوم کی انتہائی بدقسمتی ہوتی ہے۔ لیکن ا

احساس تو اُسے ہی ہو سکتا ہے جو یہ سمجھے کہ

"غالب خستہ کے بغیر کون (کون) سے کام بند ہیں"

ری قوم نے اقبال کو ایک شاعر سمجھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ شاعر کے بغیر قوم کا کوئی کام رکا نہیں رہتا۔ اس لئے اگر اقبال کی
ین قوم کے دل سے ہوک نہیں اٹھتی تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس میں قصور قوم کا نہیں۔ قصور ان کا ہے جنہوں
نے قوم کو بتایا ہی نہیں کہ اقبال کیا تھا اور کیا کرنا چاہتا تھا۔

علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس (منعقدہ ۱۹۳۲ء) کے صدارتی خطبہ میں کہا تھا کہ

جو قومیں فکر سے عاری ہو جاتی ہیں۔ تباہ ہو جاتی ہیں۔

اقبال کی موت سے، قوم فکر سے محروم ہو گئی۔ اور یہ قوم کا اتنا بڑا نقصان تھا جس کی تلافی نہیں ہو سکی۔ اقبال کی فکر نے
م کو پاکستان کا تصور دیا۔ یہ اتنی بڑی نعمت تھی جس کی مثال ہماری تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ لیکن جب پاکستان حاصل ہوا
قوم اس فکر سے محروم ہو چکی تھی۔ اس فکر کی محرومی سے قوم کی حالت کیا ہوئی ہے، اس کا اندازہ وہی آنکھیں لگا سکتی ہیں
ین خدا نے بینائی عطا کی ہے۔ حصولِ پاکستان کے بعد سب سے پہلا مسئلہ دستور پاکستان کی تدوین کا تھا۔ اس مسئلہ
ے حل کے لئے بکامل نو برس تک قوم ایک راہ گم کردہ مسافر کی طرح جس بری طرح سے مصروفِ دشت پیمائی رہی ہے
س سے بنی اسرائیل کی چالیس سالہ صحرا نوردی کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ پھر اس نو سالہ دشت پیمائیوں کے بعد اس نے
دستور مرتب کیا ہے اسے دیکھ کر ہر وہ آنکھ پُرنم ہو جاتی ہے جو یہ جانتی ہے کہ اقبال نے پاکستان کا تصور کس مقصد کے
لئے دیا تھا۔ اگر حصولِ پاکستان کے وقت اقبال زندہ ہوتا تو وہ نو سال نہیں نو دنوں میں بتا دیتا کہ اس کا دستور کن خطوط پر
ل ہونا چاہیئے۔ اور جب وہ دستور مرتب ہوتا تو دنیا پکار اٹھتی کہ ——— اما تو چیزے دیگری۔

دستور پاکستان کے بعد اب قوم کے سامنے قانون سازی کا مرحلہ آیا ہے اور ایسا نظر آتا ہے کہ جو کچھ دستور سازی
سلہ میں ہوا تھا وہی کچھ قانون سازی کے ضمن میں ہوگا۔ حکومت نے اس مقصد کے لئے ایک کمیشن کی تعیناتی کا اعلان
ہے۔ ان سطور کی تسوید کے وقت تک اس کمیشن کے عناصر ترکیبی کا اعلان نہیں ہوا۔ لیکن اندازہ یہی ہے کہ اس
تو ماڈرن طبقہ کے ایسے نمائندے ہوں گے جن کے ذہن میں سیکولر انداز کے ضابطۂ قوانین کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اور یا
قدامت پرست اربابِ شریعت ہوں گے جنہیں اس کا احساس ہی نہیں کہ وہ کہاں کھڑے ہیں اور زمانہ کہاں سے
پہنچ گیا ہے۔ کسی اسلامی مملکت کی آئین سازی ہو یا قانون سازی، اس کے لئے وہی افراد موزوں ہو سکتے ہیں جن کی
رآن کریم کے ابدی اصولوں پر اور انگلیاں نبضِ زمانہ پر ہوں۔ ہماری تاریخ میں (یعنی امتِ مسلمہ کی تاریخ میں)
ہے کہ کسی مملکت نے اس کی کوشش کی ہو کہ ہمارے قوانین شریعت ایک ضابطہ (CODE) کی شکل میں مرتب
اس وقت جسے ہم قانون شریعت سمجھتے ہیں وہ متفرق فتاوے سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور وہ فتاوے بھی اس زمانے

سکے ہیں جس کے تقاضے ہمارے دور کے تقاضوں سے یکسر مختلف تھے۔ اگر ہماری حکومت نے ہوشمندی اور جرأت سے کام لیا اور قانون سازی کا کام ایسے افراد کے سپرد کیا جو روحِ اسلامی کی روشنی میں عصرِ حاضر کے تقاضوں کا مطالعہ کر سکتے ہوں تو ہمارا کاروانِ ملت زندگی کی صراطِ مستقیم پر گامزن ہو سکے گا۔ لیکن اگر اس نے اس ضمن میں بھی وہی روش اختیار کی جو آئین سازی کے سلسلہ میں اختیار کی گئی تھی تو ہمارا شمار انہی میں ہوگا جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ کُفْرًا وَّاَحَلُّوْا قَوْمَھُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۔ جَھَنَّمَ (۱۴/۲۸) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جنہوں نے خدا کی دی ہوئی نعمت کی ناسپاس گذاری کی اور اپنی قوم کے کاروان کو تباہی کی منزل میں جا اتارا۔ یعنی جہنم میں!

گذشتہ اشاعت کے لمعات میں ہم نے اسلامی مملکت کی قانون سازی کے سلسلہ میں کچھ اشارات پیش کئے تھے۔ یہ شمارہ چونکہ علامہ اقبالؔ کی یاد میں شائع ہو رہا ہے۔ اس لئے اسے انہی کے کوائف کے لئے وقف کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے، خطباتِ تشکیلِ جدیدہ سے، اس باب کا رواں ترجمہ پیش کیا گیا ہے جس میں علامہ مرحوم نے خصوصیت سے اس موضوع سے بحث کی ہے۔ اس خطبہ کے مطالعہ کے بعد آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ اس سلسلہ میں ان کے تصورات کیا تھے (اس موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر اس مقالہ کو الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع کیا جا رہا ہے) اس کے بعد باقی اوراق میں علامہ مرحوم کی نثر و نظم کے بہت سے ٹکڑے پیش کئے جا رہے ہیں جو زندگی کے اہم گوشوں کے متعلق ان کے تصورات کے مظہر ہیں۔ ان میں سے بعض چیزیں ۱۹۵۵ء میں ہفتہ وار طلوع اسلام میں آ چکی ہیں۔ لیکن اکثر احباب نے اُس وقت شکایت کی تھی کہ ہفتہ وار طلوع اسلام کا سائز ایسا تھا کہ ان پرچوں کی جلد بندی سے انہیں محفوظ رکھنا دشوار تھا۔ لہٰذا ہم نے انہیں دوبارہ شائع کر دیا ہے تاکہ صاحبِ ذوق احباب انہیں محفوظ رکھ سکیں۔ آپ ان گہر ہائے درخشندہ کو دیکھ کر یقیناً ہم سے متفق ہوں گے کہ علامہ اقبالؔ نے کس قدر صحیح کہا تھا کہ۔

پس از من شعرِ من خوانند و می یابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

ہماری آنکھیں جو اقبالؔ کی یاد میں اب تک شبنم فشاں ہیں تو اس کی یہی وجہ ہے۔ کہنے والے نے انہی جیسوں کے لئے کہا تھا کہ

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ
چو من از دودۂ آتش نفساں می خیزد (غالبؔ)

طلوع اسلام اپنی اس سعادت پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے کہ جس چراغ کو علامہ اقبال نے اپنے خونِ

روشن کیا تھا؛ اس نے اسے زندہ ہی نہیں رکھا بلکہ اس کی روشنی کو دور دراز گوشوں تک بھی پھیلایا ہے۔ اس لئے نہیں کہ طلوع اسلام شخصیت پرستی کا قائل ہے (بلکہ وہ تو اس کا سخت مخالف ہے) بلکہ اس لئے کہ یہ شمع قرآن کی روشنی کے عام کرنے کا موجب ہے۔ اور ہمارا مقصد قرآن کی روشنی کو عام کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس مقام پر ہمیں خود حضرت علامہ سے اختلاف ہوتا ہے ہم اس کے اظہار میں بھی ذرا تامل نہیں کرتے۔ یہی وہ راہ ہے جس کی طرف قرآن راہ نمائی کرتا ہے۔ اور اسی کی راہ نمائی، بس ایک راہ نمائی ہے۔ ان هدی الله هو الهدیٰ۔

پرچہ پریس میں جارہا تھا کہ حکومت کی طرف سے اعلان ہوا کہ مجوزہ لا کمیشن کے لئے عدالت عالیہ کے جج جسٹس محمد شریف صاحب کو بطور چیرمین مقرر کیا گیا ہے اور ارکان کمیشن کا تقرر ان کے مشورہ سے ہوگا۔ ہمیں اس سے اطمینان ہوا کہ چیرمین کے انتخاب میں حکومت نے بالغ نظری سے کام لیا ہے۔ جسٹس شریف صاحب کی قانونی قابلیت تو ان کے موجودہ منصب سے ظاہر ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے وہ اسلامیات سے خاصی دلچسپی رکھتے ہیں اور (اقبال کے الفاظ میں)

نے ابلہ مسجد ہیں نہ تہذیب کے فرزند

ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے اہم فریضہ کی سرانجام دہی میں کامیاب رہیں گے۔

لیکن یہ بظاہر ہے کہ کمیشن کی کامیابی کا دارومدار اسکی ہیئت ترکیبی پر ہے۔ اور چونکہ اب کمیشن کے ارکان کے انتخاب میں جسٹس شریف صاحب کے مشورہ کو بھی دخل ہوگا اسلئے ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی ذمہ داری اور بھی بڑھ گئی ہے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ کمیشن کے ممبر کونسے افراد ہوں گے لیکن ہم اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کی بنیادی خصوصیات کیا ہونی چاہئیں۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اُن حضرات کو کمیشن کا ممبر قطعاً نہیں ہونا چاہیئے جو پاکستان میں سیکولر انداز کی حکومت چاہتے ہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ علمی قابلیت کے علاوہ، ان حضرات کی ذہنیت کا پیش نظر رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ حکومت نے اعلان کیا تھا کہ اس کمیشن میں ملک کے مختلف مکاتب فکر کے ارباب فکر ونظر کو شامل کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے اس کمیشن میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے نمائندے بھی ہوں گے اور وہ ارباب فکر بھی جو فرقوں سے بلند ہو کر خالص اسلامی نقطہ نگاہ سے حالات کا مطالعہ کرنے اور مملکت وملت کے تقاضوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ جہاں تک فرقوں کے نمائندوں کا تعلق ہے، یہ ظاہر ہے کہ وہ قدامت پرست ہوں گے۔ اسلئے کہ قدامت پرستی اور فرقہ پرستی ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں لیکن انفرادی افتاد طبع کے اعتبار سے اس طبقہ میں ایسے حضرات بھی ہیں (اور بدقسمتی سے اکثریت ایسے ہی حضرات کی ہے) جو دوسروں سے نفرت اور تنگ نظری کو عین دین، تخریبی ہنگامہ خیزیوں کو اسلام کی خدمت، دل آزاری اور دشنام طرازی کو حق گوئی دیبا کی، اور فی سبیل اللہ فساد کو جہاد قرار دیکر اپنا بازار گرم رکھتے ہیں۔ اگر کمیشن میں ایک بھی اس ذہنیت کا حامل آگیا تو وہ مچھر کی طرح کسی کو بھی آرام کی نیند سونے نہیں دے گا۔ کمیشن میں ایسے لوگوں کو لینا چاہیئے جو ہنگامی جذبات سے الگ ہٹ کر مسئلہ زیر نظر پر علمی انداز سے (Academically) سوچنے اور بات

ے کے اہل ہوں. جو اپنی ہی نہ کہے جائیں بلکہ دوسروں کے نقطۂ نگاہ کو سمجھنے Appreciate کرنے) کی بھی صلاحیت رکھتے
ں. جو اپنی ہمہ دانی کے زعم میں یونہی پھنکارتے نہ پھریں بلکہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ دین کی سمجھ بوجھ کسی ایک فرد کی اجارہ
ی نہیں ہے دوسروں کو بھی مل سکتی ہے. فرقہ پرست حضرات سے اسکی توقع تو نہیں کی جاسکتی کہ وہ اسکے معترف ہوں کہ ان کے فرقے سے باہر
کوئی مسلمان صحیح راستہ پر ہو سکتا ہے لیکن وہ دوسروں کو کم از کم انسان تو سمجھیں. جہاں تک علمی قابلیت کا تعلق ہے ان میں اس
کا تو شاید ہی کوئی ہو جو علوم حاضرہ میں بھی دستگاہ رکھتا ہو لیکن یہ حضرات ایسے بھی تو نہ ہوں جنھیں (اکبر مرحوم نے) "چاہ زمزم کے
ک" کہا تھا. ان کی نگاہیں کچھ تو عصر رواں کے تقاضوں پر ہوں. اگر کمیشن میں اس قسم کے حضرات لئے گئے تو توقع کی جا سکتی
کہ انکی کوشش اور تعاون سے کچھ نہ کچھ تعمیری کام ہو سکے گا. اگر ایسا نہ ہوا تو نہ صرف یہ کہ یہ تمام محنت رائگاں جائے گی بلکہ اس سے
ے نتائج مرتب ہوں گے جن کی مضرت رسانی بہت دوررس ہو گی۔

امید ہے کہ لاء کمیشن کے چیرمین اور دیگر متعلقہ ذمہ دار حضرات ہماری ان گذارشات کو درخور اعتنا سمجھیں گے. ہم ان کی (اور جو حضرا
ارکان مقرر ہوں ان کی) خدمت میں ایک بار پھر عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جو فریضہ ان کے سپرد کیا جا رہا ہے وہ بڑا اہم مشکل اور
ب ہے. ہم تاریخ کے نازک ترین دور میں سے گزرتے ہوئے زندگی کے ایک ایسے دوراہے پر آ کھڑے ہوئے ہیں جہاں سے اگر ہمارا ایک
م بھی غلط سمت اٹھ گیا تو معلوم ہمارا کاروان ملت کہاں سے کہاں جا پہنچے گا. اسلئے جن حضرات کے ذمے اس قافلہ کی رہنمائی کا کوئی
بھی سپرد ہو انھیں بڑے حزم و احتیاط سے قدم اٹھانے کی ضرورت ہے. اسمیں شبہ نہیں کہ کمیشن کا دائرہ عمل بہت محدود ہے لیکن ان
ود کے اندر بھی بڑی حد تک مفید کام ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگر اس کمیشن نے اس محدود دائرہ میں اطمینان بخش نتائج مرتب
کھائے تو اسکے عمل و اختیارات کے دائرہ کو زیادہ وسیع کر دیا جائے. لیکن یہ اطمینان بخش نتائج اسی صورت میں مرتب ہو سکتے ہیں
یشن کے ارکان جو قدم اٹھائیں خدا کی کتاب منیر کی روشنی میں اٹھائیں کہ وہی نورانی قندیل اس قافلہ کو منزل مقصود تک لے
تی ہے. اگر انھوں نے ایسا کیا تو دنیا اور آخرت کی خوشگواریاں ہمارے حصے میں آئیں گی. اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو خدا کا قانون مکافات
ں جھٹک کر الگ کر دے گا اور ہماری جگہ کوئی اور قوم لے لیگی جو (قرآن کے الفاظ میں) ہماری طرح نہیں ہو گی. ویلیت مت
بل ھذا وکنت نسیا منسیا. اقبال کے الفاظ میں.

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است — سازِ قرآں را نواہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر — آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکرِ حق از امتاں آمد غنی — از زمان و از مکاں آمد غنی
حق اگر از پیشِ ما بردارد ش — پیشِ قومے دیگرے بگذاردش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن — ہر زماں جانم بلرزد در بدن
ترسم از روزے کہ محرومش کنند — آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

رابطۂ باہمی

جملہ بزمہائے طلوعِ اسلام کی خدمت میں

طلوعِ اسلام کی پہلی کنونشن میں آپ کے نمائندگان شریک ہوئے۔ انھوں نے وہاں کچھ عزائم کا اظہار فرمایا (جنھیں ریزولیوشنز کہتے ہیں)، کچھ مقاصد اپنے سامنے رکھے۔ ان کے حصول کے لئے پروگرامِ عمل تجویز کیا۔ اور ان تمام عزائم و مقاصد کو اپنے سینوں میں لئے، باچشمِ نم کنونشن سے رخصت ہوئے۔

کنونشن کے انعقاد پر چار ماہ سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے ان مقاصد کے حصول کے لئے اس وقت تک کیا کیا ہے؟

جب محترم پرویز صاحب کے سامنے کنونشن کی تجویز رکھی گئی تھی تو انھوں نے فرمایا تھا کہ آپ ان اجتماعات کی طرح تو ڈال رہے ہیں لیکن مجھے خدشہ ہے کہ بزمِ طلوعِ اسلام کہیں "بزمِ مشاعرہ" بن کر نہ رہ جائے۔ آپ سوچئے کہ ہماری بےعملی اور دون ہمتی کہیں اُن کے مزعومہ خدشہ کو حقیقت نہ بنا دے۔ جو پروگرام ہم نے اپنے سامنے رکھا تھا اس میں سب سے اہم شق یہ تھی کہ عوام سے زیادہ سے زیادہ رابطہ پیدا کیا جائے۔ اور خدمتِ خلق کو ہر فریضہ پر مقدم سمجھا جائے۔ سوچئے کہ ہم نے اس باب میں اب تک کیا کیا؟

دوسری شق یہ تھی کہ قرآنی فکر کی عام اشاعت کے سلسلہ میں، ادارہ کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ زیادہ سے زیادہ تقسیم کئے جائیں اور عوام کو ان کا مفہوم ذاتی طور پر بھی سمجھایا جائے۔ غور کیجئے کہ اس سلسلہ میں ہم نے کیا کیا ہے؟

تیسری شق مرکزی فنڈ کا جمع کرنا تھا تاکہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا دائرہ وسیع ہو جائے۔ محاسبہ کیجئے کہ اس ضمن میں کتنا کچھ کیا جا چکا ہے؟

ایک قابلِ غور تجویز

بہت سے احباب کی تجویز یہ ہے کہ محترم پرویز صاحب کے ہفتہ وار درسِ قرآن کو Tape (Recorder) میں محفوظ کر کے (Tapes) باری باری مختلف بزموں کو بھیجا جائے تاکہ یہ تقاریر دوسرے مقامات پر سنائی جا سکیں۔ آپ مطلع فرمائیں کہ

(۱) کیا آپ کے ہاں (Tape-Recorder) ہے جس پر ان تقاریر کو (peproduce) کیا جا سکیگا؟

(۲) اگر ریکارڈر ہے تو وہ کس (Make) کا ہے کیونکہ ایک ریکارڈر پر ریکارڈ کی ہوئی تقریر ہر (Make) کے ریکارڈر پر نہیں سنی جا سکتی۔

اطلاعات

بحمداللہ مرکزی بزم کے زیرِ اہتمام ایک عربی کلاس کھولدی گئی ہے جس میں جدید سائنٹفک طریق سے عربی کی تعلیم

دی جاتی ہے ہفتہ میں دو دفعہ کلاس کا اجتماع ہوتا ہے۔ اور اندازہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ چھ ماہ میں اس قدر عربی سکھائی جا سکے گی جس سے قرآن کریم بآسانی سمجھ میں آسکے۔ کلاس میں قریب پچاس احباب شامل ہو رہے ہیں۔

۲۔ بزمِ طلوعِ اسلام لاڑکانہ کے سکریٹری اطلاع دیتے ہیں کہ بزمِ خواتین کی تشکیل کے لئے کوشش کی جا رہی ہے اور پمفلٹ "پاکستانی عورت تیری منزل کہاں ہے؟" کو منظم طریقے سے تعلیم یافتہ خواتین میں تقسیم کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔

۳۔ بزمِ طلوعِ اسلام پشاور کے ترجمان اطلاع دیتے ہیں کہ عنقریب لائبریری کا قیام عمل میں آجائے گا۔ فی الحال قصہ خوانی بازار میں عبدالمجید صاحب کی دوکان پر قرآنی مطبوعات رکھے گئے ہیں جہاں سے ہر صاحبِ ذوق مطالعہ کر سکتا ہے۔ قرآنی پمفلٹ اسکولوں اور کالجوں میں منظم طریقے سے تقسیم کئے گئے ہیں۔

۴۔ بزمِ طلوعِ اسلام منٹگمری کے ترجمان لکھتے ہیں کہ ان کے اراکین نے قصبوں میں خدمتِ خلق کا کام شروع کر دیا ہے۔ نیز قرآنی پمفلٹ تقسیم کئے جاتے ہیں اور لوگ اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہفتے میں ایک باری نہ کسی قصبے میں قرآنی فکر کی اشاعت کی جاتی ہے۔

۵۔ بزمِ طلوعِ اسلام جام پور ضلع ڈیرہ غازی خاں کے ترجمان لکھتے ہیں کہ ان کے ہاں دارالمطالعہ قائم ہے جس سے عام پبلک مستفید ہو رہی ہے۔ بزمِ خواتین کی تشکیل کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور قرآنی مطبوعات باقاعدگی سے لوگوں تک پہنچائی جاتی ہیں۔

۶۔ بزمِ طلوعِ اسلام مردان کے سکریٹری لکھتے ہیں کہ دارالمطالعہ کے لئے جگہ کرائے پر لے لی گئی ہے جس میں تمام قرآنی مطبوعات اور دیگر کتب موجود ہیں اور جس سے کافی صاحبان مستفید ہو رہے ہیں قرآنی پمفلٹ کی تقسیم کے لئے سلسلہ قائم ہے۔ بعض پمفلٹوں کا پشتو ترجمہ عنقریب شائع کیا جائے گا۔ بزم میں گذشتہ چھ سال سے قرآن کا درس ہوتا تھا جو اب ختم ہوا ہے۔ اب اس کو دوبارہ شروع کیا جائے گا۔

(۷) مرکزی بزم (کراچی) کے دفتر میں، غریبوں اور ناداروں کو طبی اور قانونی مشورہ مفت دینے کا انتظام کیا گیا ہے۔

تاکید (۱) بزمہائے طلوعِ اسلام سیالکوٹ۔ راولپنڈی۔ دیونا منڈی۔ دیونا جلیانی۔ مظفر گڑھ۔ دادا کلری۔ ملتان۔ گوجرانوالہ سے درخواست ہے کہ آپ اپنی ماہوار رپورٹ مرکزی دفتر کو باقاعدگی سے بھیجا کریں۔ کافی مدت سے آپکے ہاں کی کوئی خبر نہیں ملی۔

(۲) تمام بزموں سے درخواست ہے کہ اپنے حلقوں کے اراکین کی فہرست مع پتہ اور دیگر ضروری معلومات، مرکز کو بہت جلد بھیج دیں۔

سکریٹری مرکزی بزمِ طلوعِ اسلام
۱۲۵۔ مجلس منزل۔ گارڈن ویسٹ۔ کراچی نمبر ۳

باسمہ تعالیٰ

نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر
با نگاہِ دیگرے او را نگر

ملامی مملکت میں

قانونِ شریعت

کس طرح مُرتب ہو گا؟

(علّامہ اقبالؒ)

شائع کردہ: ادارہ طلوع اسلام۔ کراچی

اسلامی قانونِ شریعت میں اصولِ ارتقاء

(علامہ اقبالؒ)

[جیسا کہ طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں لکھا جا چکا ہے، اس وقت پاکستان کے سامنے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ تدوینِ فقہ کے لئے حکومت کی طرف سے جو کمیشن مقرر کیا گیا ہے، اُسے کون سے اصولِ اساسی کے مطابق کام کرنا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کی اہمیت صرف پاکستان تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ پورے کے پورے عالمِ اسلامی کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اسلئے کہ جو ملک بھی اسلام کے ساتھ اپنی نسبت رکھتا ہے اسکے سامنے زود یا بدیر، یہ سوال آئیگا کہ اسلام میں قانون سازی کا بنیادی اصول کیا ہے؟ مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ کسی مملکت نے ایک خاص کمیشن اس مقصد کیلئے مقرر کیا ہو کہ وہ ملک کے قوانین کو اسلامی قوانین کے مطابق وضع کرے۔ اس کمیشن کی کوششوں کے نتائج دنیا کے سامنے اس حقیقت کو کر دینگے کہ اسلام میں اس کی صلاحیت ہے کہ یہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے یا یہ بھی (دوسرے مذاہب کی طرح) انسانیت کو تاریخ کے ایک مقام پر روک کر کھڑا کر دینے کا موجب ہے؟ قدامت پرست طبقہ کا عقیدہ و مسلک یہ ہے کہ انسانی تقاضوں کے متعلق جو فیصلے اس سے پہلے ہو چکے ہیں، ان میں کسی قسم کا رد و بدل نہیں کیا جا سکتا۔ بالفاظِ دیگر ان کا عقیدہ یہ ہے کہ انسانیت، تاریخ کے ایک خاص دور میں جس مقام تک پہنچ چکی اُسے اس سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ نہ صرف قرآن کی کھلی ہوئی تعلیم کے خلاف ہے بلکہ پوری کی پوری انسانیت کا بھی دشمن ہے۔ قرآن نے نبی اکرمؐ کی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ آپ سے انسانیت ان اطواق و سلاسل سے آزاد ہو جائے گی جن میں وہ جکڑی چلی آ رہی تھی۔ اس کے لئے وہ قدم قدم پر عقل و فکر اور غور و تدبر پر زور دیتا ہے۔ قدامت پرستی کا یہ مسلک، ایک عرصہ دراز سے تمام عالمِ اسلامی پر چھایا چلا آ رہا ہے۔ بزرگوں نے سب سے پہلے اس کابوس کو سینے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ لیکن بدقسمتی سے ان کے ہاں کوئی ایسا صاحبِ بصیرت نہیں تھا کہ ایسے نازک وقت میں یہ بتا سکتا کہ انہیں تجدیدِ معاشرہ کی کوشش قرآن کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے کرنی چاہیئے۔ یہ سعادت ہندوستان کو حاصل ہوئی کہ یہاں (تشکیلِ پاکستان سے بہت پہلے سے) ایسے اربابِ فکر و نظر پیدا ہوئے جنہوں نے قرآنی فکر کو عام کر کے یہ بتایا کہ اسلام میں سرچشمہ کتاب اللہ ہے۔ ان طالع مند اربابِ بصیرت کی صف میں علامہ اقبالؒ کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ طلوعِ اسلام اپنی اس خوش بختی پر جتنا بھی ناز کرے کم ہے کہ اب یہی سعادت اسکے حصہ میں آئی ہے۔ کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مشیت کا خاص پروگرام تھا کہ قرآن کی یہ آواز اُس خطہ میں بلند ہو جس میں تا آخر الامر ایک ایسی مملکت (پاکستان) کو قائم ہونا تھا جس نے اسلامی تصورات کو اپنے معاشرہ کی اصل و بنیاد قرار دینا اور اسکے لئے تدوینِ قوانین جیسے اہم فریضہ کو اپنے ہاتھوں میں لینا تھا۔ چنانچہ آپ بھی دیکھیں گے کہ اس وقت تمام عالمِ اسلام میں صرف پاکستان کی فضا ایسی ہے جس میں یہ تصورات اس سرعت سے عام ہو رہے ہیں۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (طلوع)

قدامت پرست طبقہ کی طرف سے قرآنی تصورات کی جو مخالفت ہو رہی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں. عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی یہ مخالفت حمیتِ دینی کا نتیجہ ہے. لیکن اگر اس مخالفت کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ مخالفت دراصل اپنے اپنے فرقہ کو قائم و دائم رکھنے کی غرض سے کی جا رہی ہے. ایک فرقے کا وجود صرف اس صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ وہ اپنے معتقدات اور رسوم و شعائر کو نہایت سخت، متصلب اور ناقابلِ تغیر و تبدل قرار دے اور اس پر شدت سے اصرار کرے. جس وقت اس باب میں اسکے شکنجے ڈھیلے پڑ جائیں تو اس کی جداگانہ ہستی مٹنی شروع ہو جاتی ہے اور آخر الامر اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے. طبیعیاتی دنیا میں اسے جہد للبقاء (Struggle For Existence) کہتے ہیں. مختلف فرقوں کی باہمی جنگ و نزاع، اسی جہد للبقا کی مظاہر ہے. قرآن چونکہ تمام فرقوں کو مٹا دیتا ہے، اسلئے قرآنی آواز کے خلاف تمام فرقے متحدہ محاذ بنا کر نبرد آزما ہو جاتے ہیں. اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) بھی قرآن کی مخالفت اس لئے کرتے تھے کہ یہ ان کی گروہ بندیوں کو مٹاتا تھا. بنا بریں قدامت پرست طبقہ کے مختلف فرقوں کی یہ مخالفت بالکل قابلِ فہم ہے۔

سابقہ اشاعت میں ہم نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر ہم میں علامہ اقبالؒ موجود ہوتے تو ان کی قرآنی بصیرت، تدوینِ قوانین کے سلسلہ میں قوم کی بڑی راہنمائی کرتی. یہ زمانے کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ اقبالؒ ساری عمر ایک ایسے خطۂ زمین کی آرزو کرتے رہے جس میں قرآنی تصورات کی بنیادوں پر معاشرہ کی تشکیل کی جائے (اسی کے لئے انہوں نے پاکستان کا تصور دیا تھا). لیکن آج جب کہ ایسا خطہ بھی موجود ہے اور اس میں معاشرہ کی تشکیل جدید کا سوال بھی در پیش، اقبال یہاں خود موجود نہیں. لیکن یہ امر موجب مسرت ہے کہ اس سلسلہ میں ان کے خیالات ہمارے پاس محفوظ ہیں. (چھوٹے چھوٹے رسائل کو چھوڑ کر) نثر میں ان کی ایک ہی اہم کتاب (یعنی لیکچرز کا مجموعہ) ہے اور یہی وہ کتاب ہے جو مغرب کی دنیائے فکر میں ان کے تعارف اور شہرت کی باعث بنی ہے. اس کتاب کے چھٹے باب میں انہوں نے اس اہم مسئلہ سے بحث کی ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت جامد اور ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں، یا ان میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق رد و بدل کیا جا سکتا ہے. ہم ذیل میں اس اہم باب کا آزاد ترجمہ پیش کرتے ہیں. جن لوگوں نے اقبال کے ان خطبات کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کی زبان کس قدر فلسفیانہ، ادق اور ایجاز دار تکاز کی حامل ہے. ایسے مضامین کے ترجمہ میں جو دشواریاں پیش آسکتی ہیں وہ ظاہر ہیں. ہم نے کوشش کی ہے کہ ہمارے ترجمے سے بات سمجھ میں آجائے. اس کے لئے بعض مشکل مطالب کی وضاحت قوسین میں مندرج عبارت سے اور بعض کی حاشی رفٹ نوٹس) سے کرنے کی کوشش کی گئی ہے. اسکے باوجود یہ ضروری ہے کہ اس مقالہ کو سرسری نظر سے نہ دیکھا جائے بلکہ اس کے ایک ایک فقرہ کو بہت غور و خوض سے پڑھا جائے اور جب تک اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں نہ آجائے آگے نہ بڑھا جائے. اگر آپ نے اس طرح اس مقالہ کا مطالعہ کیا تو آپ کے سامنے یہ حقیقت آجائے گی کہ قوانینِ شریعت کی تجدید کے متعلق اقبال نے کس قدر گہری نظر سے غور کیا تھا. ضمناً اس چیز کو مد نظر رکھیے کہ یہ خطبات آج سے تیس سال پیشتر (۱۹۲۸ء میں) مرتب کئے گئے تھے. ظاہر ہے کہ علامہ اقبال آج زندہ ہوتے تو بعض ایسے مقام جن میں کچھ ابہام یا الجھاؤ سا محسوس ہوتا ہے، زیادہ واضح ہو جاتے. اس لئے کہ

پ مفکر کی زندگی میں مزید تیس سالہ مشاہدات اور تدبر و تفکر، بہت سی الجھنوں کو واضح اور پیچیدگیوں کو صاف کر دیتے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہمارے نزدیک دین میں سند صرف خدا کی کتاب ہے۔ اس بارے میں اگر ہم کسی انسان کا کوئی قول پیش کرتے ہیں تو وہ صرف تائیداً ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے اس خطبہ کو بھی ہم اسی لئے پیش کر رہے ہیں کہ اس میں جزئیات سے قطع نظر، اصولی طور پر جو بات کہی گئی ہے وہ قرآن کی تعلیم کے مطابق ہے۔

اب آپ علامہ اقبالؒ کے خطبات تشکیلِ جدید کے چھٹے باب کا رواں ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔ جس کا عنوان ہے

The Principle Of Movement In The Structure Of Islam

"ایک ثقافتی تحریک کی حیثیت سے، اسلام نے کائنات کے متعلق قدیم سکونی تصور کو رد کر کے اس کی جگہ حرکیاتی تصور کیا ہے۔ دوسری طرف، ایک جذباتی نظامِ وحدت کی حیثیت سے وہ فرد کی قدر و منزلت کا پورا پورا اعتراف کرتا ہے اور نوعِ انسانی کی وحدت کی بنیاد خون کے رشتوں پر نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ خون کے رشتے کو انسانی وحدت کی بنیاد قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم مادی علائق کی زمین گیری سے بلند نہیں ہونا چاہتے۔ وحدتِ انسانی کے لئے (مادی علائق سے بلند ہو کر) ایک نفسیاتی بنیاد کی تلاش و جستجو اسی صورت میں ممکن ہے جب ہمیں اس کا احساس ہو جائے کہ زندگی کی اصل و بنیاد (مادی نہیں بلکہ) روحانی[1] ہے۔ اس احساس و تصور سے انسانی وفاشعاری و اطاعت پذیری کے نئے مراکز سامنے آتے ہیں جنہیں زندہ و پائندہ رکھنے کے لئے کسی قسم کی رسوم پرستی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ یہی وہ احساس و تصور ہے جس سے انسان کے لئے مادی زمین گیری سے رستگاری ممکن ہے[2]۔ شاہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت کو جو ابتداءً ایک خانقاہی نظام کی حیثیت سے منصۂ شہود پر آئی تھی، وحدتِ انسانی کی بنیاد قرار دینے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اس میں ناکام رہا۔ عیسائیت کی یہی وہ ناکامی تھی جس سے مجبور ہو کر شاہنشاہ جولین کو پھر سے قدیم رومی اصنامیات کی طرف رجوع کرنا پڑا[3]، اس فرق کے ساتھ کہ اس نے اسے فلسفیانہ تعبیرات کا لبادہ اوڑھا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلام کا ظہور ہوا ہے۔ اس زمانے میں مہذب دنیا کی حالت کیا ہو چکی تھی، اس کا نقشہ ایک مغربی مؤرخِ تہذیب نے ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی حالت

اس وقت ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصرِ رشید جو چار ہزار سال میں جا کر

---

[1] اس خطبہ میں متعدد مقامات پر روحانی Spiritual کا لفظ آئیگا۔ ان مقامات میں (Spirit) کا لفظ مادہ (Matter) کے مقابلہ میں استعمال ہوا ہے۔ خانقاہی روحانیت کے معنوں میں نہیں۔

[2] مادہ سے رستگاری سے مراد یہ نہیں کہ مادی کائنات ایک جیل خانہ ہے جس سے نجات حاصل کرنا مقصودِ زندگی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے سامنے صرف حیوانی زندگی کو نہ رکھے بلکہ انسانی زندگی کو رکھے جو مادی علائق سے بلند ہو کر (حیاتِ اُخروی کی شکل میں) آگے چلتی ہے۔

> تعمیر ہوا تھا منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اور نوع انسانی پھر اسی بربریت کی طرف لوٹ جانے والی ہے جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کے خون کا پیاسا تھا اور آئین و ضوابط کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ قدیم قبائلی آئین اپنی قوت و احترام کھو چکے تھے۔ اس لئے اب ملوکیت کے انداز کہن کا سکہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن آئین و ساتیر کو رائج کیا تھا، وہ نظم و ضبط اور وحدت و یکجہتی کے بجائے تشتت و افتراق اور ہلاکت و بربادی کا موجب بن رہے تھے۔ غرضیکہ وقت وہ آچکا تھا جب ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند و بالا درخت جس کی سرسبز اور شاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں اور آرٹ، سائنس اور لٹریچر کے زریں ثمرات سے بہرہ یاب ہو چکی تھیں۔ اب لڑکھڑا رہا تھا۔ عقیدت و احترام کی زندگی بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہو چکی تھی۔ اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ سلسلہ حرب و ضرب کے طوفانوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے، اور یہ ٹکڑے صرف رسومات پارینہ کے بندھن سے ایک جگہ قائم تھے لیکن ان کے متعلق ہر وقت خطرہ تھا کہ نہ معلوم کب گر پڑیں۔

ظہور اسلام کے وقت دنیائے تہذیب و تمدن کا یہ نقشہ کھینچنے کے بعد یہ مؤرخ سوال اٹھاتا ہے کہ

> کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر کہیں سے پیدا کیا جا سکتا تھا جو نوع انسانی کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دیتا اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لیتا؟ اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہیئے تھا اس لئے کہ پرانی رسومات اور آئین و ضوابط سب مردہ ہو چکے تھے اور ان ہی جیسے اور آئین کا مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا۔

اس کے بعد یہ مورخ لکھتا ہے کہ اُس وقت دنیا کو ایک ایسے کلچر کی ضرورت تھی جو "تخت و تاج کے کلچر" اور وحدت انسانی کے ناتمام تقاضائے کہن کی جگہ لے لیتا جن کا مدار خون کے رشتوں پر تھا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ امر موجب حیرت و استعجاب ہے اس قسم کا نیا کلچر سرزمین عرب سے پیدا ہوا اور عین اُس وقت پیدا ہوا جب دنیا کو اس کی اشد ضرورت تھی۔

لیکن اس میں حیرت و استعجاب کی کوئی بات نہیں۔ حیات کائنات وجدانی طور پر اپنے تقاضوں کا احساس کر لیتی ہے اور نازک ساعتوں میں وہ اپنا رخ آپ متعین کر لیتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے مذہب کی زبان میں وحی نبوت کہا جاتا ہے۔ یہ بالکل قدرتی امر تھا کہ اسلام کا خورشید جہانتاب ایک ایسی سادہ قوم کے افق شعور سے طلوع ہوتا جسے کسی قدیم ثقافت کی ہوا تک نہ لگی تھی اور جو ایک ایسی سرزمین میں بستی تھی جہاں تین بڑے براعظم بغل گیر ہوتے تھے۔ اس جدید ثقافت

دنیا کو بتایا کہ وحدتِ انسانیت کی بنیاد صرف اصولِ "توحید" پر رکھی جا سکتی ہے۔ نظامِ سیاست کی حیثیت سے اسلام، اصولِ توحید کو نوعِ انسانی کی جذباتی اور فکری زندگی میں ایک جیتا جاگتا عنصر بنانے کا عملی ذریعہ ہے۔ اس کا مطالبہ تخت و تاج کی اطاعت نہیں۔ صرف خدا کی اطاعت ہے۔ اور چونکہ ذاتِ خداوندی، حیاتِ کلی کی روحانی اساس ہے، اس لئے خدا کی اطاعت سے مفہوم، انسان کا خود اپنی مثالی فطرت کی اطاعت ہے۔ نہ کسی غیر کی محکومیت۔

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی یہ روحانی اساس، ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر

ثبات و تغیر کا امتزاج

متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر رہنے والے متضاد عناصر میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے پاس، اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دَور دَورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں ——— وہ تغیر جسے، قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے[1] ——— تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے، یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کون سا اصولِ حرکت کارفرما ہے۔ یہ اصول وہی ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔

اجتہاد

اجتہاد کے لُغوی معنی جد و جہد اور پوری پوری کوشش کے ہیں۔ اور اسلامی قانون کی اصطلاح میں، کسی مسئلہ پر آزادانہ رائے قائم کرنے کے لئے جد و جہد کا نام اجتہاد ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ تصور قرآن کریم کی اس آیۂ جلیلہ سے مستنبط ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۲۹؎ جو لوگ ہماری متعین کردہ منزل تک پہنچنے کے لئے پوری پوری کوشش کرتے ہیں، ہم انہیں اس منزل تک پہنچنے کے راستے دکھا دیتے ہیں۔ اس کی تشریح نبی کریمؐ کی ایک حدیث میں ملتی ہے۔ روایت ہے کہ جب حضرت معاذؓ کو یمن کا گورنر مقرر کیا گیا تو رسول اللہؐ نے اُن سے پوچھا کہ وہ معاملات کے فیصلے کس طرح کریں گے۔ انھوں نے جواب میں کہا کہ میں تمام امور کے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کروں گا۔ اس پر رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر کسی معاملہ میں کتاب اللہ سے راہ نمائی

[1] اِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ …… لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ (۱۰؍۶)

لے تو پھر؟ اس کے جواب میں حضرت معاذ نے کہا کہ ایسی صورت میں، میں رسول اللہؐ کے نظائر کی طرف رجوع کروں گا۔ مکرر ارشاد ہوا کہ اگر اس باب میں یہ نظائر بھی خاموش ہوں، تو؟ "تو میں اپنے اجتہاد سے فیصلہ دوں گا!" یہ تھا حضرت معاذ کا جواب۔

(یہ تھی اس تصور کی ابتدا۔ لیکن) تاریخ اسلام کے طالب العلم کی نگاہ سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ اسلامی مملکت کی توسیع کے ساتھ، ایک منظم اور باضابطہ قانونی فکر کی ضرورت لاینفک ہو گئی۔ یہی وہ ضرورت تھی جس کے ماتحت ہمارے قدیم فقہا ——— عرب اور غیر عرب دونوں ——— اس باب میں برابر محنت کرتے رہے تا آنکہ ان کی اجتماعی فکر ہماری فقہ کے مسلمہ مذاہب کے پیکروں میں جلوہ پیرا ہو گئی۔ یہ فقہی مذاہب، اجتہاد کے تین مدارج کو تسلیم کرتے ہیں:۔

اجتہاد کے تین مدارج

(۱) اجتہاد مطلق۔ یعنی قانون سازی کا اختیار کلی۔ جو ان مذاہب کے ائمہ کی ذات تک محدود ہے۔

(۲) اضافی اجتہاد۔ یعنی کسی ایک مذہب فقہ کے اندر رہتے ہوئے، اجتہاد کی ضرورت۔

(۳) خصوصی اجتہاد۔ یعنی ان مسائل میں اجتہاد جنہیں ائمہ فقہ نے غیر معین چھوڑ دیا ہو۔

میں اس خطبہ میں صرف شق اول (اجتہاد مطلق) ہی کے متعلق گفتگو کروں گا۔

سُنی حضرات نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے لیکن ائمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے، اُن کا پورا کرنا کسی فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں، جس کی بنیاد قرآن پر ہو جو زندگی کے متعلق حرکیاتی ارتقائی تصور کا علمبردار ہے، اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی جس نے قانون شریعت کو یکسر منجمد بنا کر رکھ دیا۔

جمود کے اسباب

بعض مغربی مصنفین کا خیال ہے کہ اس جمود کا باعث ترکوں کا اثر ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ خیال سطحی سا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے مذاہب فقہ، ترکوں کے [illegible]ت کی آمد سے بہت پہلے اپنی آخری شکل میں مرتب و متشکل ہو چکے تھے۔ میرے خیال میں اس کے حقیقی اسباب حسب [illegible] ہیں۔

(۱) اس حقیقت سے سب واقف ہیں کہ عباسیوں کے ابتدائی دور میں، اسلام میں معقولیین (معتزلہ) کی ایک تحریک [illegible]ئی تھی جس کی وجہ سے کئی تند و تلخ بحثیں چھڑ گئی تھیں۔ مثلاً ان دو گروہوں (منقولیین اور معقولیین) کے درمیان [illegible]ابہ النزاع مسئلہ یہ بھی تھا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ معقولیین (معتزلہ) نے اس کے غیر مخلوق ہونے سے [illegible] انکار کیا کہ ان کے نزدیک یہ عیسائیت کے اس عقیدہ کی ایک دوسری شکل تھی جس کی رو سے وہ کلمہ کو قدیم مانتے [illegible]۔ اس کے برعکس، قدامت پرست گروہ (محدثین) نے، جنہیں بعد میں عباسی خلفاء کی تائید اس بناء

[illegible]ین کا گروہ

پر حاصل ہو گئی کہ وہ معتزلہ کے سیاسی اثرات سے خائف تھے، معتزلہ کی اس وجہ سے مخالفت کی کہ ان کا خیال تھا کہ قرآن کو مخلوق مان کر وہ اسلامی معاشرہ کی بنیادیں کمزور کر رہے ہیں۔ مثلاً نظام (معتزلی) کو لیجئے۔ اس نے احادیث کا قریب قریب انکار کر دیا اور حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق علانیہ کہدیا کہ وہ قابلِ اعتماد راوی نہ تھے۔ چنانچہ کچھ تو اس لئے کہ ان معتولین کے حقیقی منشاء کے متعلق لوگوں کو غلط فہمی ہوئی۔ اور کچھ اس لئے کہ ان میں سے بعض کے افکار بے باک سے ہو گئے لہٰذا پسند گروہ نے اس تحریک کو اُمت میں انتشار پیدا کرنے کا موجب سمجھا اور اسلام کے نظام تمدن و سیاست کے استحکام کے لئے خطرہ تصور کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح اسلامی معاشرہ کو انتشار سے بچایا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ان کے سامنے ایک ہی طریق کار تھا۔ اور وہ یہ کہ اس کے لئے شریعت کے ڈنڈے کو استعمال کیا جائے۔ اور اپنے ضابطۂ قانون کو شدت کے ساتھ سخت گیر بنا دیا جائے۔ (یعنی اس میں نہ کوئی لچک رکھی جائے نہ کسی تغیر و تبدل کی گنجائش)

(۲) اسلامی قانونِ شریعت کے جامد اور متصلب بن جانے کا یہ پہلا سبب تھا۔ اس کا دوسرا سبب، مسلمانوں میں

تصوف خانقاہیت کے تصوف کی نمود اور فروغ تھا۔ اس نے بحیثیر غیر اسلامی اثرات کے ماتحت، آہستہ آہستہ، ملت کو زندگی کے عملی مسائل سے ہٹا کر: بنا کر، قیاسی اور نظری تصورات میں الجھا دیا۔ خالص مذہبی نقطۂ نگاہ سے، تصوف نے فقہا اور متکلمین کی لفظی موشگافیوں اور نکات آفرینیوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ مثال کے طور پر حضرت سفیان ثوریؒ کو لیجئے۔ یہ اپنے دور کے بڑے فائز بین متقنین میں سے تھے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ ایک خاص فقہی مذہب کے بانی۔ لیکن چونکہ ان کا رجحان شروع سے روحانیت[1] کی طرف تھا اس لئے انھوں نے فقہا کی خشک بحثوں سے تنگ آکر تصوف کی آغوش میں پناہ لے لی۔ تصوف کے تصوراتی پہلو کا تعلق ہے۔ (جس نے بعد میں ایک فلسفہ کی شکل اختیار کر لی) یہ آزاد خیالی کا مظہر اور معتولین کا ہمنوا ہے۔ لیکن اس نے ظاہر اور باطن کے امتیاز پر جس قدر زور دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باطن کی اہمیت بڑھتی گئی اور زندگی کے ظاہری پہلو سے بے اعتنائی اور بے التفاتی کا رجحان راسخ ہو گیا۔ ترکِ دنیا کے اس مسلک نے آگے چل کر مسلمانوں کی نگاہ سے اسلام کے سیاسی اور تمدنی گوشے کو، جو اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتا ہے، یکسر او جھل کر دیا۔ دوسری طرف، اس نے عقائد و افکار کی دنیا میں جس قدر آزادی دے رکھی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ملت کے بہترین دماغوں کو اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ اس طرح کانِ نمک میں جا کر نمک بن گئے۔ جب بہترین دماغ اس طرف چلے گئے تو سیاست لامحالہ کم ادنیٰ صلاحیتیں رکھنے والے افراد کے ہاتھوں میں آگئی۔ باقی رہے عوام۔ سو چونکہ قوم میں بلند پایہ مفکرین کا فقدان ہو گیا تھا (جو ان) کی صحیح فکری راہ نمائی کر سکتے۔ اس لئے انھوں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ مختلف فقہی مذاہب کی اندھی تقلید کرتے رہیں۔

---

[1] اس سے مراد تصوف کی روحانیت ہے۔

زوالِ بغداد

(۳) ان سب پر طرہ یہ کہ تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں بغداد پر تباہی آگئی جو مسلمانوں کی حیات عقلی کا مرکز بن چکا تھا۔ یہ حادثہ فی الحقیقت مسلمانوں کے لئے طامۃ الکبریٰ اور ایسا جانکاہ صدمہ تھا کہ اُس زمانے کے کم و بیش تمام ہمعصر مؤرخین جب تاتاری حملوں کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کا ذکر کرتے ہیں تو دبی زبان سے خود اسلام کے مستقبل کے متعلق مایوسی کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جب اس تباہی نے ملت کا شیرازہ اس طرح بکھیر دیا تو قدامت پرست مفکرین نے، قوم کو مزید انتشار سے بچانے کی خاطر اپنی تمام تر توجہات کو اس ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا کہ کسی نہ کسی طرح معاشرتی زندگی کی یکسانیت کو محفوظ رکھ لیا جائے۔ اس کے لئے انھوں نے فتوے دے دیا کہ فقہائے سلف نے جو قوانینِ شریعت مرتب کر دیئے ہیں، ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کیا جا سکتا۔ (اس طرح ہر قسم کی ندرتِ فکر، بدعت یعنی ضلالت قرار پا گئی) ان حضرات کے پیش نظر صرف ملت کا معاشرتی نظم تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس باب میں کسی حد تک حق بجانب بھی تھے۔ اس لئے کہ جماعتی نظم زوال آور عناصر کی کچھ نہ کچھ روک تھام تو کر ہی دیتا ہے۔ لیکن انھوں نے اس اہم حقیقت کو نہ سمجھا۔ اور نہ ہی اسے ہمارے دَور کے علماء سمجھتے ہیں۔ کہ کسی قوم کے مستقبل کا انحصار ان کے جماعتی نظم پر اتنا نہیں ہوتا جتنا افراد کی قوت اور صلاحیت پر ہوتا ہے۔ ایک ایسے معاشرہ میں جس میں جماعتی نظم پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے، فرد کی انفرادیت کچل کر رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے معاشرتی فکر کے سرمایہ کا تو مالک بن جاتا ہے لیکن

ماضی کا جھوٹا احترام

اس کی اپنی روح مردہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اسکے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے کہا ہے۔

> تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں،
> ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنھوں نے انھیں فرسودہ
> بنا دیا ہو۔

لہٰذا زوال آور عناصر کی روک تھام کا موثر طریقہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ قوم میں خود خزیدہ افراد کو پیدا کیا جائے۔ یہی وہ افراد ہیں جو زندگی کی گہرائیوں کے سربستہ راز کھولتے ہیں۔ وہ ایسے نئے معیارِ زیست سامنے لاتے ہیں جن کی روشنی میں ہم یہ دیکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہمارا ماحول ایسا غیر متبدل نہیں کہ اسے چھوا تک نہ جائے۔ ہم اس میں تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے، اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔ قدامت پرست علماء کا یہی وہ رجحان تھا جس کا ردِ عمل امام ابن تیمیہ کی صورت میں نمودار ہوا۔

امام ابن تیمیہ

ابن تیمیہ بغداد کی تباہی کے پانچ سال بعد سنہ ۱۲۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تربیت حنبلی مذہب

کی روایات کے زیرِ سایہ ہوئی تھی۔ وہ ایک زبردست اہلِ قلم اور نہایت سرگرم مبلغِ اسلام تھے۔ انھوں نے خود مجتہد ہونے کا دعوےٰ کیا اور اس عقیدے کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اور جو کچھ مذاہب فقہ نے مرتب کر دیا ہے وہ شریعت میں حرفِ آخر ہے۔ انھوں نے کہا کہ جس طرح ابتداءً فقہ مرتب ہوئی تھی، ہم بھی انہی اصولوں کے ماتحت اسے ازسرِنو مرتب کر سکتے ہیں۔ فرقہ ظاہریہ کے امام ابن حزمؒ کی طرح، انھوں نے بھی حنفی مذہب کے قیاس اور اجماع کے اس تصور کی تردید کی جو ان کے ہاں شروع سے چلا آ رہا تھا۔ اس لئے کہ ان کی رائے یہ تھی کہ اس طرح کا اجماع درحقیقت توہم پرستیوں کی بنیاد ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام ابن تیمیہؒ کے زمانے میں جس قسم کی ذہنی ابتری اور اخلاقی کمزوری عام ہو رہی تھی، اس کے پیشِ نظر ان کا یہ مسلک بالکل درست تھا۔

سولھویں صدی میں امام سیوطیؒ نے بھی مجتہد ہونے کا دعوےٰ کیا اور اس کے ساتھ ہی اس عقیدہ کا بھی اضافہ کیا کہ ہر صدی کے آخر پر ایک مجدد پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ابن تیمیہؒ کی تعلیم کی روح کا مکمل مظاہرہ اس تحریک میں جا کر ہوا جو اٹھارویں صدی میں، ریگ زارِ نجد سے اٹھی۔ اُس خطہ سے جسے میکڈانلڈ نے "زوال پذیر اسلامی دنیا کا پاکیزہ ترین خطہ" قرار دیا ہے

نجدی تحریک

یہ تحریک عظیم مضمرات و ممکنات کی حامل تھی۔ اس سے اسلام کی حیاتِ تازہ کا آغاز ہوتا ہے چنانچہ اسلامی ایشیا اور افریقہ کی قریب قریب تمام جدید تحریکوں کا سرچشمۂ زندگی، بالواسطہ یا بلا واسطہ، یہی تحریک نجد ہے۔ مثلاً سینوسی کی تحریک۔ پین الاسلامی (پان اسلامک) تحریک۔ یا ایران کی بابی تحریک، جو درحقیقت عربی پراٹسٹنٹ تحریک کا ایرانی عکس ہے۔ ان سب میں وہی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ اس نجدی تحریک کا بانی، محمد بن عبدالوہابؒ سنہ ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوا۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدینہ میں ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے ایران کا سفر کیا۔ اور پھر اپنی مسلسل سعی و عمل سے انھوں نے اپنی روحِ بے قرار کی حرارت کو تمام عالمِ اسلامی کے رگ و پے میں دوڑا دیا۔ ان کا جوشِ عمل، امام غزالی کے شاگرد ابنِ تومارت کے جوش و ولولے کے مشابہ تھا جو اندلس کی تباہی کے بعد، پیدا ہوا اور جس نے اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس وقت ہم اس (نجدی) تحریک کی سیاسی سرگرمیوں سے بحث نہیں کرنا چاہتے جنہیں محمد علی پاشا نے ختم کر دیا۔ اس تحریک کے اس اجمالی سے تذکرہ سے مقصود صرف اُس روحِ آزادی کو سامنے لانا تھا جس کی یہ مظہر تھی، اگرچہ اپنی داخلی سرشت میں یہ تحریک بھی قدامت پرستی ہی پر مبنی تھی۔ یعنی یہ تحریک ایک طرف، اس عقیدہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتی تھی کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ اور اپنے لئے حقِ اجتہاد کی زبردست مدعی ہے۔ لیکن دوسری طرف، ماضی کے متعلق اس کا طرزِ عمل یکسر غیر تنقیدی تھا اور قوانینِ شریعت کے لئے وہ صرف احادیثِ نبویؐ پر دارومدار رکھتی تھی۔[۱]

---

[۱] یہی تحریک ہے جو عوام میں وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی اور جو اب مسلک اہلِ حدیث کی شکل میں متعارف ہے۔ یہ حضرات اہلِ فقہ پر اعتراض کرتے ہیں کہ وہ ماضی پرست ہیں اور خود اپنی حالت یہ ہے کہ روایات سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹنا چاہتے۔ نہ ہی ان پر کسی قسم کی تنقید روا رکھتے ہیں۔

ترکی

اب ترکی کی طرف آیئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اجتہاد کا نظریہ جسے عصر حاضر کے فلسفیانہ تصورات نے بڑی تقویت اور وسعت دیدی ہے، ترکوں کی مذہبی اور سیاسی فکر میں ایک عرصے کار فرما ہے۔ یہ حقیقت قانون شریعت کے متعلق علمائے ثابت کے جدید نظریہ سے بالکل ظاہر ہے جس کی بنیاد جدید عمرانی تصورات پر رکھی گئی ہے۔ اگر اسلام کی نشأۃ ثانیہ ایک حقیقت ہے اور میرا ایمان ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے تو ترکوں کی طرح ایک دن ہمیں بھی اپنی علمی میراث کا از سر نو جائزہ لے کر اس کی صحیح صحیح قیمت متعین کرنی ہوگی۔ اس سے اگر ہم نے عام فکر اسلامی میں کوئی قابل قدر اضافہ نہ بھی کیا، تو ہم کم از کم اتنا تو کر سکیں گے کہ اپنے ماضی پر صحیح تنقید سے بے راہ روی اور مذہب سے برگشتگی کی اس رَو کو تھام سکیں جو اس وقت عالم اسلام میں بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

میں اب ترکی کے مذہبی اور سیاسی افکار و رجحانات کا ایک اجمالی سا خاکہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ اس ملک کے فکر و عمل کے دوائر میں اجتہاد کی قوت کس درجہ نمایاں ہو رہی ہے۔ اب سے کچھ وقت پہلے، ترکی میں دو مکاتب فکر تھے۔ ایک وہ جس کی نمائندگی وہاں کی نیشنلسٹ پارٹی کرتی تھی اور دوسرا وہ جس کی ترجمان مذہبی اصلاح کی علمبردار جماعت تھی۔ نیشنلسٹ پارٹی کے پیش نظر سب سے اہم سوال مذہب نہیں بلکہ مملکت کا مفاد ہے۔ ان کے نزدیک مذہب کا کوئی آزادانہ منصب ہی نہیں۔ قومی زندگی میں مملکت ہی وہ ضروری عنصر ہے جس سے دیگر عناصر کے فرائض و مناصب معین ہوتے ہیں۔ انھوں نے چنانچہ، مذہب اور سیاست کے فرائض کے متعلق قدیم خیالات کو یکسر مسترد کر دیا ہے اور اس امر پر زور دے رہے ہیں کہ مذہب کو ریاست سے الگ کر دینا چاہیئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ایک مذہبی اور سیاسی نظام کی حیثیت سے اسلام کی ہیئت ترکیبی اس قسم کے تصور کی اجازت دیتی ہے[1] اگرچہ میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ سمجھنا غلط ہے کہ مملکت کے تصور کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ یہ تمام دیگر اسلامی تصورات پر غالب اور حاکم ہے (حقیقت

دین اور سیاست کی ثنویت

یہ ہے کہ) اسلام میں روح اور مادہ (دین اور دنیا) دو الگ الگ دائرۂ حیات نہیں اور اس کا فیصلہ کہ فلاں کام دنیاوی ہے یا دینی، اس کام کے کرنے والے کی نیت سے ہوتا ہے، خواہ اس کام کا مقصود کیسا ہی دنیاوی کیوں نہ ہو۔ (بالفاظ دیگر) کسی کام کے دنیاوی یا دینی ہونے کا فیصلہ اُس کام کی نوعیت نہیں کرتی بلکہ وہ ذہنی پس منظر کرتا ہے جو بالکل غیر مرئی (Invisible) ہوتا ہے۔ مثلاً ایک کام "دنیاوی" اُس وقت کہلائے گا جب اسے زندگی کے گوناگوں علائق سے یکسر بے تعلق ہو کر کیا جائے۔ لیکن وہی کام "روحانی" ہو جائے گا اگر اس کا جذبۂ محرکہ حیات کے وہ علائق ہوں۔ اسلام میں ایک ہی حقیقت کو اگر ایک زاویۂ نگاہ

---

[1] عام اس نظریے کا مطلب نہیں سمجھے۔ اس لئے کہ اسکے بعد حضرت علامہ نے شرح و بسط سے واضح کیا ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست کی ثنویت کی قطعاً گنجائش نہیں۔

ے دیکھا جائے تو وہ مذہب (کلیسا) بن کر دکھائی دیتی ہے اور اُسے دوسرے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ مملکت
رجاتی ہے (یعنی اسلام میں مذہب اور سیاست ایک ہی حقیقت ہے) حتیٰ کہ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ مذہب اور مملکت
یک شے کے دو رخ یا دو گوشے ہیں۔ (دو رخ یا دو گوشے نہیں۔ بلکہ یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں)۔ اسلام ایک ناقابلِ
تقسیم اور واحد حقیقت ہے۔ اس حقیقت کو جس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے یہ وہی بن جائے گی۔ یہ نقطہ بڑا دور رس
ہے اور اگر اس کی وضاحت شرح و بسط سے کی جائے تو ہم نہایت بلند اور دقیق فلسفیانہ بحث میں الجھ جائیں گے۔ اس
لئے میں اس مقام پر صرف اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ مذہب اور سیاست کی ثنویت، اس قدیم غلط تصور کی پیدا کردہ ہے
جس کی رُو سے انسان کی وحدت کو ان دو جداگانہ حقیقتوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جن کے متعلق یہ سمجھا گیا کہ ان کا ایک نقطۂ اتصال
تو ضرور ہے لیکن یہ درحقیقت ایک دوسرے سے یکسر متغائر اور متضاد ہیں۔ (یعنی روح اور مادہ کی مغائرت کا تصور) لیکن

روح اور مادہ

حقیقت یہ ہے کہ جب روح (Spirit) کو زمان و مکان کی نسبتوں سے دیکھا جائے تو اُسے
مادہ کہتے ہیں۔ (اس لئے روح اور مادہ الگ الگ حقیقتیں نہیں ہیں)۔ وہ وحدت جسے انسان کہا جاتا ہے
جسم دکھائی دے گی جب ہم اُسے خارجی دنیا میں کام کرتا دیکھیں۔ لیکن جب ہم اُس مقصد اور غایت پر نگاہ رکھیں جس کے لئے وہ
کام کیا جا رہا ہے تو یہی وحدت روح (Soul) یا (Mind) بن جائے گی۔ "توحید" کو جب ایک عملی تصور کی
حیثیت سے دیکھا جائے تو مساوات۔ سالمیت (Solidarity) اور حریت اس کے بنیادی خصائص نظر آئیں گے۔
جس ادارہ کو مملکت کہا جاتا ہے، اسلامی نقطۂ نگاہ سے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ "توحید" کے انہی بنیادی خصائص کو مادی
پیکروں میں متشکل اور کارفرما کرنے کا ذریعہ ہے۔ یا بالفاظ دیگر، اس نصب العین کو انسانی معاشرہ کے قالب میں ڈھالنے کی
آرزو۔ اسلام میں مملکت کے "خدائی حکومت" (تھیاکریسی) ہونے سے مفہوم صرف اتنا ہی ہے۔ اس سے یہ مفہوم نہیں کہ اس

تھیاکریسی

کا رئیس یا صدر، خدا کا نائب ہے جو اپنے مستبدارانہ اور جابرانہ فیصلوں کو مزعومہ معصومیت کے نقاب
میں چھپا کر، خدا کے بندوں پر اپنا حکم چلاتا ہے۔ جو لوگ اسلامی نظامِ حکومت پر تنقید کرتے ہیں ان
کی نگاہوں سے یہ اہم حقیقت اوجھل ہوتی ہے عصرِ حاضر کی سائنس نے اس حقیقت کو منکشف کر دیا ہے کہ مادہ اپنا الگ
وجود نہیں رکھتا۔ اس کی اصل روح (Spirit) کے اندر ہے۔ اس انکشاف نے اسلام (بلکہ دنیا کے مذاہب کی بڑی
بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس نے بتایا یہ ہے کہ مادی دنیا یا محسوس کائنات کوئی نجس اور قابلِ نفرت شے نہیں ہے
مادہ کا یہ عظیم ذخیرہ محض اس لئے وجود میں لایا گیا ہے کہ اسکے ذریعہ انسانی ذات (Spirit) اپنے اندر استحکام پیدا
کر کے اپنے مقام کو پالے۔ لہٰذا مادی کائنات مقدس اور پاکیزہ ہے۔ نجس اور خبیث نہیں۔ رسول اللہؐ کے حسین الفاظ
میں "یہ تمام دنیا مسجد ہے"۔ لہٰذا اسلامی نقطۂ نگاہ سے، مملکت اُس کارگاہ کا نام ہے جس کے اندر انسانی ذات
معاشرہ کی وساطت سے، بیدار اور مستحکم ہو کر اپنے مقام کو پا لیتی ہے۔ اس لحاظ سے ہر وہ مملکت جو تغلب و تسلط پر مبنی

ہو، اور جس کا مقصد ان مثالی اصولوں کا حصول ہو، حکومتِ خداوندی "تھیاکریٹک اسٹیٹ" ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ترک قومیت پرستوں کے ذہن میں مذہب اور ریاست کی تفریق کا خیال، یورپ کے سیاسی

چرچ اینڈ اسٹیٹ

افکار کی تاریخ کے مطالعہ سے پیدا ہوا۔ قدیم عیسائیت ایک سیاسی یا معاشرتی نظام کی صورت میں وجود میں نہیں آئی تھی۔ وہ ایک "نجس اور خبیث دنیا" میں نظامِ خانقاہیت کی حیثیت سے وارد ہوئی تھی جس کا انسان کے عمرانی معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ان معاملات میں وہ رومی اقتدار کے تابع تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب مملکت نے مذہب عیسائیت اختیار کیا تو اسٹیٹ اور چرچ (کلیسا) ایک دوسرے کے حریف بن کر سامنے آئے اور ان میں یہ لامتناہی نزاع پیدا ہو گئی کہ ایک کا دائرۂ اثر و نفوذ کیا ہے اور دوسرے کے حدودِ اقتدار کون سے؟ اسلام میں ایسی صورتِ حالات کبھی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے کہ اسلام شروع ہی سے ایک معاشرتی نظام کی حیثیت سے منصۂ شہود پر آیا تھا جسے قرآن نے ایسے سیدھے سادے قانونی اصولوں کا ضابطہ عطا کر دیا تھا جس

قرآن کے قانونی اصول

میں رومیوں کے مشہور بارہ جدولوں کی طرح، اس امر کی صلاحیت تھی کہ وہ (ہر زمانے کے تقاضوں کے مطابق) نئی نئی تعبیرات کی رو سے پھیلتا چلا جائے۔ چنانچہ بعد کے تجربے نے ثابت کر دیا کہ قرآن نے جو قانونی اصول دیئے ہیں ان میں فی الحقیقت ان وسعتوں کے امکانات ہیں۔ لہٰذا ترکوں کی نیشنلسٹ پارٹی نے مملکت کے متعلق جو نظریہ قائم کیا ہے وہ یکسر گمراہ کن ہے۔ اس لئے کہ وہ مذہب ریاست میں اُس ثنویت کے تصور پر مبنی ہے جس کا اسلام میں کوئی وجود نہیں۔

اس کے برعکس، مذہبی اصلاحات کی پارٹی جس کے سرکردہ، سعید حلیم پاشا تھے۔ اس اصل الاصول پر مُصر تھی کہ اسلام، ...ریت (Idealism) اور ایجابیت Positivism (روح اور مادہ) کا حسین مرکب ہے۔ یعنی اس میں بلند ...تی اصولِ حیات، مادی پیکروں میں عملاً متشکل ہو جاتے ہیں۔ یہ حریت، مساوات اور سالمیت کی مستقل اقدار اور ابدی ...اقتوں کا مجموعہ ہے جسے وطنیت کی چار دیواری میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ سعید حلیم پاشا کے الفاظ میں "جس طرح برطانوی ریاضیات، جرمن فلکیات اور فرانسیسی کمسٹری (کیمیا) کا تصور غلط ہے۔ اسی طرح ترکی، عربی، ایرانی یا ہندی اسلام

...لنیت

کا تصور بھی باطل ہے۔ (یعنی جو حقائق عالمگیر ہوں، وہ وطنی اضافتوں سے ایک دوسرے سے الگ نہیں کئے ...سکتے)۔ جس طرح سائنس کے حقائق کی عالمگیریت، مختلف قوموں میں مختلف سائنٹفک کلچر پیدا کر دیتی ہے اور ان تمام ...کا مجموعہ انسانی علم کہلاتا ہے۔ اسی طرح اسلام کی عالمگیر اقدار، مختلف قوموں میں مختلف ملی۔ اخلاقی اور معاشرتی نصب العین ...ردیتی ہیں (اُن اقدار کو نہیں بدل دیتیں)۔ سعید حلیم پاشا نے یہ بھی کہا ہے کہ موجودہ کلچر جس کی بنیاد قومی انانیت پر ہے، وحشت و بربریت ہی کی دوسری شکل ہے۔ یہ جدید بڑھے ہوئے نظام کارخانہ داری

بت پرستی

(INDUSTRIALISM) کی پیداوار ہے جس کے ذریعے انسان اپنے جبلی (اور حیوانی) تقاضوں

اور رجحانات کی تسکین کر لیتا ہے۔ وہ (سعید حلیم پاشا) معترف ہیں کہ "ہماری تاریخ میں، اسلام کے اخلاقی اور معاشرتی اصول مقامی اثرات اور (جو قومیں مسلمان ہوئیں ان کے) زمانۂ قبل از اسلام کے توہم پرستانہ عقاید و مسالک کی وجہ سے، آہستہ آہستہ غیر اسلامی ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ آج حالت یہ ہو چکی ہے کہ اسلام کے یہ اصول، اسلامی کم اور ایرانی، ترکی اور عربی زیادہ ہیں۔ اسلام کے عالمگیر اور غیر شخصی اخلاقی اصولوں پر مقامی اثرات کا کچھ ایسا رنگ چڑھ گیا ہے کہ اس کی اصلی شکل و صورت اب پہچانی ہی نہیں جاتی۔ حتٰکہ اصولِ توحید کی مقدس جبین پر اصنام پرستی تک کے دھبّے دکھائی دیتے ہیں۔ ان دیں حالات، ہمارے

کشادکار کی راہ

لئے کشادکار کی ایک ہی راہ ہے۔ اور وہ یہ کہ آئینۂ اسلام پر غیر اسلامی زنگ کی جو سخت اور درشت تہیں جم گئی ہیں، اور جس کی وجہ سے اس کا حرکیاتی اور ارتقائی نظریہ یکسر جامد ہو کر رہ گیا ہے۔ انہیں کھرچ کھرچ کر الگ کیا جائے۔ اور حریت، سالمیت اور مساوات کی حقیقی اقدار کو از سرِ نو زندہ کر کے، ان کی بنیادوں پر اپنے اخلاقی، عمرانی اور سیاسی نظام کی تشکیلِ جدید کی جائے جو حقیقی اسلام کی سادگی اور آفاقیت کا آئینہ دار ہو۔

غرض، یہ ہیں ترکی کے جلیل القدر وزیر، سعید حلیم پاشا کے خیالات۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک ایسے راستے پر چلتے ہوئے جو روحِ اسلامی سے زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہے، یہ مفکر قریب قریب اُسی نتیجہ پر پہنچتا ہے جو وہاں کی نیشنلسٹ پارٹی کا موقف ہے۔ یعنی اجتہاد کی آزادی تاکہ جدید فکر اور زمانے کے تجربات کی روشنی میں قانونِ شریعت کو از سرِ نو مرتب کیا۔

[اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے بتایا ہے کہ (مثلاً) الغائے خلافت کے مسئلہ میں ترکوں نے کس طرح اُن خطوط پر اجتہاد سے کام لیا ہے جن کی طرح ابن خلدون اور قاضی ابوبکر باقلانی جیسے مفکر بہت پہلے ڈال چکے تھے۔ پھر انھوں نے ترکی کے مشہور قوم شاعر ضیا کی بعض نظموں کے اقتباسات سے اس نقطہ کی وضاحت کی ہے کہ ترکی فکر کس طرح اپنے لئے نئی نئی راہیں تراش رہی ہے۔ اس شاعر نے اپنے جوشِ تجدد پسندی میں یہ بھی کہا ہے کہ اسلامی قانونِ وراثت کی رُو سے عورت کو جو مرد سے نصف حصہ ملتا ہے، یہ اصولِ مساوات کے خلاف ہے۔ علامہ اقبال نے اُس کے اس خیال کی تردید آگے چل کر کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس کا یہ اعتراض قرآن کے قوانینِ وراثت سے بے خبری کی بنا پر ہے۔

ان تصریحات کے بعد علامہ اقبال لکھتے ہیں]

حقیقت یہ ہے کہ آج مسلمانوں میں ترکی ہی وہ قوم ہے جس نے ملائیت کے خوابِ گراں سے بیدار ہو کر شعورِ ذات حاصل کیا ہے۔ یہی وہ قوم ہے جو بجا طور پر فکری آزادی کا دعوےٰ کر سکتی ہے۔ یہی ہے جو تصورات کی دنیا سے آگے بڑھ کر حقائق کی طرف آ رہی ہے۔[1] اس عبوری دَور سے گذرنے کے لئے ایک شدید ذہنی اور اخلاقی کشمکش ناگزیر تھی۔ اب وسعت طلب

---

[1] واضح رہے کہ اس جوشِ تجدد پسندی میں جہاں جہاں ترکوں کا دامن قرآن سے چھوٹا ہے نہ علامہ اقبال اس کی تائید کرتے ہیں (باقی)

اور حرکت پسند زندگی کی پیچیدگیاں اس کے سامنے نئے نئے مواقع پیش کریں گی۔ جن کے لئے نئے نئے زاویوں سے سوچنے کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لئے اسلام کے (غیر متبدل) اصولوں کی جدید تعبیرات ہونگی ــــــ یعنی اُن اصولوں کی جدید تعبیرات جو ان لوگوں کے لئے جو روحانی کشادگی کی مسرتوں سے ناآشنا ہوں محض نظری حیثیت رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ قول برطانوی مفکر ہابز کا ہے کہ اگر مسلسل اور متواتر ایک ہی قسم کے خیالات اور احساسات پیدا ہوں۔ تو سمجھ لیجئے کہ خیالات اور احساسات سرے سے پیدا ہی نہیں ہو رہے۔ (یعنی اگر ندرتِ فکر و احساس نہ رہے تو انسانی قلب و دماغ مردہ ہوتے ہیں)

مسلم اقوام کی حالت

آج مسلم اقوام کی اکثریت کی حالت ایسی ہی ہو چکی ہے۔ وہ لکیر کے فقیر ہیں جو محض ایک مشین کی طرح پرانی اقدار کی رٹ لگاتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے برعکس، ترک اس راستہ پر گامزن ہو گئے ہیں جس میں نئی نئی قدروں کی تخلیق ہوگی۔ یہ قوم ایسے تلخ تجارب سے گذری ہے کہ اب اس کی عمیق خودی اس پر منکشف ہو رہی ہے۔ اس کی ذات میں روحِ حیات مضطرب و بیقرار نظر آ رہی ہے۔ نئی اُمنگیں پیدا ہو رہی ہیں۔ نئی نئی مشکلات سامنے آ رہی ہیں جن کے حل کے لئے نئی نئی تعبیرات سُجھائی دے رہی ہیں۔ وہ سب سے بڑا سوال جو اس وقت اُس کے ــــــ اور جو زود یا بدیر دیگر مسلم اقوام کے ــــــ سامنے آنے والا ہے۔ یہ ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات (ہاں) میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔

روحِ عمری

وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ

حسبنا کتاب اللہ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

آزاد خیالی کا خطرہ

ہم دنیائے اسلام میں اس قسم کی تحریکِ آزادی کا دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ آزاد خیالی کا یہ رجحان، اسلام کی تاریخ میں بڑا نازک لمحہ ہے۔ آزادیٔ افکار ملت میں تشتت و انتشار پیدا کرنے کا موجب بھی بن سکتی ہے۔ (اس کے ساتھ ہی) عالمِ اسلام میں نسلی تیاز کا جو تخیل آجکل اس زور شور سے ابھر رہا ہے، اس سے یہ خدشہ ہے کہ کہیں عالمگیر انسانیت کا وہ گراں مایہ تصور جسے

یہ نٹ نوٹ صفحہ گذشتہ) نہ طلوعِ اسلام۔ جیسا کہ ہم شروع میں کہہ چکے ہیں یہ امر موجبِ بدقسمتی تھا کہ اس ذہنی انقلاب کے وقت ترکوں میں کوئی ایسا صاحبِ بصیرت نہ تھا جو قرآن کی روشنی میں ان کی راہنمائی کر کے انہیں اعتدال کے راستے پر لے چلتا۔ چنانچہ علامہ اقبال نے اپنی بعد کی تحریروں میں اس پر تنقید بھی کی ہے اور اظہارِ تاسف بھی۔

مسلمانوں نے اپنے دین سے حاصل کیا تھا، اُن کے اُفقِ ذہنی سے ناپید ہی نہ ہو جائے نیز یہ خطرہ بھی ہے کہ اگر ان کی مناسب روک تھام نہ کی گئی تو ہمارے مذہبی اور سیاسی مصلحین، وسیع الخیالی کے جوش میں اصلاح کی حدود سے تجاوز نہ کر جائیں۔[1] ہم آجکل اسی قسم کے دور سے گذر رہے ہیں جس سے یورپ پراٹسٹنٹ تحریک کے زمانے میں گذرا تھا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ لُوتھر کی تحریک کے آغاز و نتائج سے جو سبق ہمیں سیکھنا چاہیئے وہ ہماری نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ تاریخ کے عمیق مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پراٹسٹنٹ تحریک، دراصل ایک سیاسی تحریک تھی جس کا یورپ پر یہ اثر ہوا

وطنیت کا بُت

کہ رفتہ رفتہ عیسائیت کے عالمگیر اخلاق کی جگہ، قومی نظامِ اخلاق نے لے لی۔ اس رجحان کے اثرات ہم نے گذشتہ جنگِ عظیم (پہلی عالمگیر جنگ) میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں۔ اس جنگ نے بجائے اس کے کہ یہ دو متضاد نظام ہائے اخلاق میں ہم آہنگی پیدا کرتی، یورپ کے حالات کو اور بھی ناقابلِ برداشت بنا دیا۔ لہٰذا دنیائے اسلام کے راہنماؤں کا فریضہ ہے کہ یورپ میں جو کچھ ہوا ہے وہ اس کا گہری نظر سے مطالعہ کریں اور اسلام اپنے اور سیاسی نظام کی رُو سے جس نصب العین کی طرف لے جاتا ہے، اُسے نگاہوں کے سامنے رکھتے ہوئے، اصلاحِ حالات کے لئے قدم اٹھائیں۔

میں نے اجتہاد کی تاریخ اور جس طریق سے وہ آجکل عالمِ اسلام میں عمل پیرا ہو رہا ہے، اس کا ایک اجمالی ساخاکہ آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اب میں یہ بتاؤں گا کہ اسلامی قوانینِ شریعت کی تاریخ اور ہیئت ہمیں اس نتیجہ تک پہنچاتی ہے کہ

جدید تعبیرات کا امکان

اسلام کے اصولوں کی جدید تعبیر ممکن ہے یا اس نتیجہ پر کہ ان میں جدید تعبیرات کا امکان نہیں؟ بالفاظِ دیگر، سوال یہ ہے کہ آیا ہمارے قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی صلاحیت ہے یا نہیں؟ یہی سوال، بان یونیورسٹی کے السنۂ سامیہ کے پروفیسر، ہارٹن نے، اسلامی فلسفہ اور الٰہیات کے ضمن میں اٹھایا ہے۔ چنانچہ، یہ پروفیسر، مسلم مفکرین کی ان کوششوں پر تبصرہ کرتے ہوئے جو انہوں نے خالص مذہبی فکر کے سلسلہ میں کی ہیں لکھتا ہے کہ تاریخِ اسلام، آرین علم و ثقافت اور سامی مذہب کی متغائر قوتوں میں تدریجی تعامل، ہم آہنگی اور عمق پیدا کرنے سے عبارت ہے۔ مسلمان ہمیشہ اپنے مذہبی نقطۂ نگاہ کو ان ثقافتی عناصر سے تطبیق دیتے رہے ہیں جو ان کے گرد و پیش کی اقوام سے ان کی طرف آتے رہے ہیں۔ چنانچہ سنہ ۸۰۰ء سے لے کر سنہ ۱۱۰۰ء تک مسلمانوں میں کم از کم ایک سو فقہی مکاتب پیدا ہوئے۔ یہ اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ اسلامی فکر میں کس قدر لچک ہے اور قدیم مفکرین نے اس باب میں کس قدر انتھک کوششیں کی ہیں۔ اس طرح اسلامی فکر اور مسلمانوں کے لٹریچر کے گہرے مطالعہ کے بعد یہ مغربی مستشرق اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ

---

[1] اصلاح کی صحیح حدود یہ ہیں کہ قرآن کریم کی پابندیوں کے اندر رہتے ہوئے اصلاح کی جائے۔ نہ کہ (Secular) بن کر

> اسلام کی روح (اسپرٹ) وسیع ہی نہیں بلکہ قریب قریب لامحدود ہے۔ اس نے دہریت کو چھوڑ کر اپنے گرد و پیش کی اقوام کے باقی تمام تصورات کو نہ صرف اپنایا بلکہ انھیں اپنی مخصوص ساخت میں شاہراہ ترقی پر بھی ڈال دیا ہے۔

اسلام کی یہ "خذ ما صفا" کی اسپرٹ قانون کے دائرہ میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ چنانچہ مشہور ولندیزی ناقد اسلام پروفیسر ہرگرونج، اس باب میں لکھتا ہے۔

> جب ہم اسلامی فقہ کی نشو و ارتقاء کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ایک طرف، ہر دور کے علماء چھوٹی چھوٹی جزئیات کے اختلاف سے مشتعل ہو کر ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگاتے ہیں، اور دوسری طرف وہی علماء، اپنے متقدمین کے باہمی اختلافات میں موافقت اور مطابقت پیدا کرنے کے لئے باہم گر متحدد ہم مقصد ہو کر کوشاں رہتے ہیں۔

روح اسلام کی عالمگیریت

عصر حاضر کے ان مغربی ناقدین کے ان خیالات کی رو سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے وقت، روح اسلام کی اندرونی عالمگیریت، علماء کی شدید قدامت پرستی کے علی الرغم، کارفرما ہو کر رہے گی۔ اور مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ اگر دور حاضر کے ناقدین فقہ اسلامی سے متعلق کثیر لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو انھیں اپنا یہ سطحی خیال بدلنا پڑے گا کہ اسلامی قانون شریعت جامد اور ناقابل ارتقاء ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ فقہ کے متعلق کسی ناقدانہ گفتگو کے لئے تیار نہیں۔ اگر اس قسم کی بحث چھیڑی جائے تو وہ بہت سے لوگوں کے لئے ناگواری کا باعث ہو جائے گی اور فرقہ وارانہ نزاعات چھڑ جائیں گی۔ با ایں ہمہ، میں مسئلۂ زیر نظر کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی جسارت ضرور کروں گا۔

(۱) سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ قرن اول سے لے کر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک مسلمانوں میں، قرآن کے علاوہ اور کوئی تحریری قانون موجود نہ تھا۔

(۲) یہ ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ پہلی صدی ہجری کے وسط سے لے کر چوتھی صدی کے آغاز تک، مسلمانوں میں قریب انیس مکاتب فقہ پیدا ہو چکے تھے۔ صرف اس ایک بات سے پتہ چل سکتا ہے کہ ایک بڑھتی ہوئی تہذیب کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے، ہمارے فقہاء نے کس قدر جد و جہد سے کام لیا تھا۔ جوں جوں اسلامی فتوحات کا سلسلہ پھیلتا گیا اور مسلمانوں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا ہمارے ان قدیم فقہاء کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ ان اقوام کے احوال و ظروف اور عادات و اطوار کا مطالعہ کریں جو حلقہ بگوش اسلام ہوتی تھیں۔ اور اس طرح اپنے ماحول اور اس کے تقاضوں کا وسعت نظر سے جائزہ لیں۔ چنانچہ ہم اس زمانہ کی تمدنی اور سیاسی تاریخ کی روشنی میں مختلف مذاہب فقہ کا دقت نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت ابھر کر

سامنے آجاتی ہے کہ ہمارے فقہاء تعبیرِ احکام کے سلسلہ میں رفتہ رفتہ استخراجی طریق (Deductive) سے استقرائی طریق (Inductive) کی طرف کیسے گئے۔

قانونِ شریعت کے مآخذ اربعہ

(۳) جب ہم شریعتِ اسلامی کے چار مسلمہ مآخذ (قرآن۔ حدیث۔ اجماع اور قیاس) اور ان سے پیدا شدہ نزاعات پر غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے مذاہب فقہ کے جامد ہونے کا مفروضہ بالکل بے اصل و بے بنیاد ثابت ہو جاتا ہے اور فقہ میں مزید ارتقار اور نشوونما کا امکان واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔

آیئے۔ اب ان چار مآخذ شریعت کے متعلق مختصر طور پر غور کریں۔

(۱) قرآن

قرآن اسلام میں قانون کا اصلی سرچشمہ قرآن ہے۔ لیکن قرآن کوئی (تفصیلی) ضابطۂ قانون نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اس کا بنیادی مقصد، انسان کے دل میں، خدا اور کائنات کے ساتھ اس کے تعلق کے بلند شعور کو کرنا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن میں بعض اصول و ضوابط قانونی نوعیت کے بھی موجود ہیں۔ بالخصوص انسان کی عائلی زندگی کے متعلق قواعد و ضوابط، جس پر اس کی معاشرتی زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ جس وحی کے پیش نظر انسان کی بلند ترین زندگی ہے، اس میں یہ معاشرتی قواعد و ضوابط وحی کا جزو کیوں بنا دیئے گئے، تو اس سوال کا جواب عیسائیت کی تاریخ میں ملے گا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ عیسائیت درحقیقت یہودیت کی آئین و رسوم کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی زندگی کے خلاف ردِّ عمل تھی۔ اس کے لئے اس نے انسان کے سامنے دنیا چھوڑ کر عاقبت سنوارنے کا نصب العین رکھا اور اس میں اسے کچھ کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن اس نے اس طرح انفرادی زندگی کا جو تصور پیدا کر دیا۔ اس سے اس نے سمجھ لیا کہ انسان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی کو روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ چنانچہ (جرمن فلاسفر) نومن اپنی کتاب (Brieff Uber Religion) میں لکھتا ہے کہ

> ابتدائی مسیحیت نے مملکت۔ قانون۔ معاشرہ اور پیداوار کے تحفظ کے
> مسائل کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اس نے معاشرتی مسائل کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا

ان تصریحات کے بعد وہ آخر میں لکھتا ہے۔

> اب ہمارے لئے دو ہی صورتیں رہ گئی ہیں۔ یا تو ہم اس کا فیصلہ کریں کہ ہم بغیر کسی
> مملکت کے زندگی بسر کریں گے اور اس طرح اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں لغویت
> اور لاقانونیت کے گرداب میں ڈال دیں گے۔ اور یا ہم اپنے مذہبی مسلک کے
> ساتھ ساتھ ایک سیاسی مسلک کو بھی مقصدِ حیات بنالیں۔

غرض یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ضروری سمجھا ہے کہ مذہب و مملکت۔ اور اخلاقیات و سیاست کو ایک ہی وحی کی لڑی میں

جس طرح افلاطون نے اپنی کتاب ری پبلک (جمہوریت) میں انھیں یکجا رکھنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن اس سلسلہ میں خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل، قرآن کا حرکیاتی نقطۂ نظر ہے۔ میں اس سے پہلے (اس کے آغاز
نمبر کے متعلق تفصیلی طور پر کہہ چکا ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو کتاب اس نقطۂ نگاہ کی حامل ہو، وہ ارتقاء کے تصور کی مخالف
نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ زندگی صرف تغیر و تبدل ہی کا نام نہیں۔ اس کے اندر ایسے ع
(Elements Of Conservati) بھی ہیں جو اپنی حالت پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ انسان کی حالت یہ ہے
اپنے تخلیقی کارناموں سے لذت اندوز ہوتا ہے اور اپنی توانائیوں کو زندگی کی نئی نئی شاہراہوں کے انکشاف پر مرکوز رکھتا
لیکن ان تمام کامرانیوں کے باوجود، اُسے خود اپنی ذات کے انکشاف کے وقت کچھ تردد اور گھبراہٹ ہوتی ہے۔ وہ اپنی
اور پیش قدمی میں اپنے ماضی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اور اپنی ذات کی داخلی کشاد سے اُسے کچھ ڈر سا محسوس ہوتا
ہے[1]۔ وہ جب آگے بڑھتا ہے تو ایسی قوتیں جو اس سے متخالف سمت کی طرف جاتی دکھائی دیتی ہیں، اس کی روح کے سامنے
بن کر حائل ہو جاتی ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ زندگی، اپنے ماضی کے پشتارے کو اپنی کمر پر لادے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ اس
جب بھی معاشرہ میں کسی تبدیلی کا سوال سامنے آئے تو قدامت پسندی کی قوتوں کی قیمت اور جس انداز سے وہ عمل پیرا
تی ہیں اس کی اہمیت کو کبھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے۔ لہٰذا ہمارے ہاں کے معقولیت پسند طبقہ کو چاہیئے کہ وہ جب معاشرہ
مروجہ رسوم و مناسک (Institutions) میں اصلاح و تغیر کا خیال کرے تو قرآن کے اس اہم اصول کو ہمیشہ
نے سامنے رکھے۔ دنیا کی کوئی قوم اپنی ماضی کو یکسر مسترد نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ ان کی ذات کا تشخص ان کے ماضی کی بنا
ہوتا ہے[2]۔

پس اسلام جیسے معاشرہ میں، مروجہ شعائر و مناسک (Institutions) میں تبدیلی کا سوال بہت نازک اور دشوار بن
ہے جس سے ایک مصلح کی ذمہ داری بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے[3]۔ اپنی فطرت کے لحاظ سے اسلام کسی خاص خطۂ زمین سے پا

---

[1] اپنی ذات کے انکشاف و کشود کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی انفرادیت Individuality سے باخبر ہو جاتا ہے اور اس طرح اس
حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ وہ کسی بڑے کل (معاشرہ) کا جزو نہیں بلکہ اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے جس کی نشوونما معاشرہ کے اندر ہو
ہے۔ وہ اپنے اس احساس انفرادیت سے گھبراتا ہے حالانکہ اگر وہ اسے بنظر غائر دیکھے تو یہ چیز اطمینان کا موجب ہونی چاہیئے نہ کہ گھبراہٹ کا سبب۔ وہ اپنی
انفرادیت میں معاشرہ سے کٹ نہیں جاتا بلکہ اس کا اہم رفیق بن جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی یہ گھبراہٹ اس کی کوتاہ نگہی کی دلیل ہے۔

[2] ماضی سے وابستگی اور شے ہے اور ماضی کی پرستش اور چیز۔ ماضی سے وابستگی کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے پاس اسلاف کا جو سرمایہ منتقل ہو کر آتا ہے ہم اس سے
مستفید ہوں۔ لیکن ماضی پرستی کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس سرمایہ پر کبھی تنقیدی نگاہ نہ ڈالیں۔

[3] کسی فرد کو ان تبدیلیوں کی اجازت ہی نہیں دی جا سکتی۔ یہ تبدیلیاں عند الضرورت صرف اسلامی نظام ہی کر سکتا ہے۔

تھیں۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ وہ مختلف نسلوں کے افراد کو (ایمان کے ذریعے) ایک مرکز پر اکٹھا کرے اور چھوٹی ذات ایک ایسی ملت میں تشکیل کرے جسے شعور ذات کی نعمت حاصل ہو۔ اس طرح یہ ملت، تمام دنیا کے لئے ایک نمونہ بنے بتلانے کے لئے کہ تمام نوع انسانی کس طرح ایک امت واحدہ بن سکتی ہے۔ یہ کام کچھ ایسا آسان اور سہل الحصول نہ لیکن اس کے باوجود، اسلام اپنے عدیم النظیر شعائر وارکان (Institutions) کے ذریعے، تضاد وتخالف کے ہجوم (نوع انسانی) میں ایک اجتماعی عزم اور مجموعی ضمیر پیدا کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اس قسم کے ارتقاء میں، (اور تو اور) خورد نوش اور پاک پلید جیسے عام معاملات زندگی کے متعلق قوانین وضوابط کا غیر متبدل ہونا بھی ایک خاص معنی اور قدر خویش رکھتا ہے۔ اس لئے کہ (جب مختلف طبائع اور متضاد اطوار کے افراد) ان کی پابندی سے اپنے اندر یکسانیت پیدا کر لیتے ہیں تو) اس سے معاشرہ میں ایک خاص اندرونی یگانگت پید ہوجاتی ہے۔ نیز، اس سے وہ داخلی اور خارجی وحدت اور ہم آہنگی قائم رہتی ہے جو ان قوتوں کا مقابلہ کرتی ہے جو ا کے مختلف الاوضاع معاشرہ میں تشتت وانتشار پیدا کرنے کے لئے اندر ہی اندر سرگرم عمل رہتی ہیں۔ لہٰذا ان شعائر پر تنقیدی نگاہ[1] ڈالنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس معاشرتی تجربہ کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کرے جس کی اسلام کرتا ہے۔ وہ ان شعائر ومناسک پر غور وفکر کرتے ہوئے یہ نہ دیکھے کہ ان سے فلاں ملک کو کیا کیا معاشرتی فوائد ہوں گے یا نقصانات پہنچیں گے۔ وہ ان کا جائزہ اس عظیم مقصد کی روشنی میں لے جو پوری کی پوری انسانیت میں ہوتا جارہا ہے[2]۔

قانون سازی کیلئے قرآنی اصول

آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہوجائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار رہتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ سے ہمارے قدیم فقہا نے، قانون شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے۔ اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظام زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از

---

[1] جن شعائر ومناسک کا تعین خود قرآن نے کر دیا ہے ان پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس تنقید سے مراد ان مناسک پر تنقید ہے جو خارج از قرآن ہیں۔

[2] مثلاً اذان کو لیجئے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم (یا ملک)، اجتماع صلوٰۃ کی دعوت کے لئے کسی اور طریقہ کے اختیار کرنے کا خیال کرے اور کوئی اپنی ملکی مصلحت دیکھے۔ لیکن اس سے وہ مقصد فوت ہوجائے گا جو تمام عالم اسلام میں اذان کی یکسانیت سے حاصل ہوتا ہے۔

ہانی فقہا کی بالغ نظری کا رہین منت تھا۔ چنانچہ فان کریمر اسی ضمن میں لکھتا ہے کہ

رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس
قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو۔

ن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود، یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انھیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا
سط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم
ہ لیکن نظری طور پر اجتہاد مطلق کے امکان سے انھیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے پچھلے صفحات میں) ان اسباب وعلل
ے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی
ڑتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکر انسانی کی نشوونما اور ارتقاء سے وجود میں آ گئی ہیں، اس لئے مجھے
وئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہب فقہ کے بانیوں پر
ے کسی نے بھی اپنی تعبیرات وتاویلات کو کبھی قطعی کامل، مختتم اور سہو وخطا سے مبری سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دور حاضر
کے اعتدال پسند مسلمان، زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصول اساسی کی نئی تعبیر
کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرز عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر
عمل ارتقا ہے، اس کی متقضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا
کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔

[اس کے بعد علامہ اقبال نے ترکی کے انقلاب پسند شاعر ضیا کے ان سوالات کو لیا ہے کہ طلاق وراثت وغیرہ
کے معاملات میں مردوں اور عورتوں کو مساوات حاصل ہونی چاہیئے اور ان پر مدلل بحث کی ہے۔ اس کے بعد وہ قانون
شریعت کے دوسرے سرچشمہ۔ یعنی حدیث کی طرف آتے ہیں]

---

(۲) حدیث

حدیث | اسلامی قانون شریعت کا دوسرا سرچشمہ حدیث نبوی ہے۔ احادیث، سابقہ زمانے میں بھی اور دور حا
ضر میں بھی کافی بحث ونزاع کا موضوع رہی ہیں۔ زمانہ حال کے نقادوں میں، گولڈزیہر نے، جدید اصول تنقید
کی روشنی میں ان کی کافی جانچ پڑتال کی ہے جس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یہ ذخیرہ بہ حیثیت مجموعی قابل اعتماد نہیں۔
ایک دوسرا مغربی مصنف ان اصولوں کا جائزہ لینے کے بعد جن کے مطابق مسلمان ائمہ جرح وتعدیل نے احادیث کو پرکھا
، لکھتا ہے کہ نظریاتی طور پر ان میں قطعی کا امکان ہے۔ لیکن اس کے بعد لکھتا ہے کہ

آخر میں یہ کہوں گا کہ جن خیالات کا اظہار اوپر کیا گیا ہے۔ ان سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان اصولوں میں غلطی کا امکان نظری طور پر موجود ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب کہ حدیثوں کو اس طرح پرکھنے میں فی الواقعہ کس حد تک غلطیاں سرزد ہوئیں، اس بات پر منحصر ہے کہ جن حالات میں احادیث کی جانچ پڑتال ہوئی وہ کہاں تک اس کی ترغیب دلاتے تھے کہ غلطی کے امکانات سے فائدہ اٹھالیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے حالات بہت کم تھے اور سنن کے ذخیرہ کا بہت کم حصہ ان سے متاثر ہوا ہے۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ جن احادیث کے مجموعوں کو مسلمان قانونی حیثیت دیتے ہیں، ان کا بڑا حصہ اسلام کے آغاز اور ارتقاء کا صحیح ریکارڈ ہے۔

(The Muhammaden Theories Of Finance)

احادیث کی قانونی حیثیت

لیکن مقصدِ زیرِ نظر کے لئے ضروری ہے کہ ہم ان احادیث کو جن کی حیثیت قانونی ہے، ان احادیث سے جن کی قانونی حیثیت نہیں، الگ کرلیں۔ احادیث کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کی حیثیت قانونی ہے اور دوسری وہ جو قانونی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اول الذکر کے بارے میں ایک بڑا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک ان رسوم ورواج پر مشتمل ہیں جو اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھے اور جن میں سے بعض کو رسول اللہ صلعم نے علیٰ حالہٖ رکھا اور بعض میں ترمیم فرمادی۔ آج یہ مشکل ہے کہ ان چیزوں کو پورے طور پر معلوم کیا جاسکے کیونکہ ہمارے متقدمین نے اپنی تصانیف میں زمانۂ قبل از اسلام کے رسوم ورواج کا زیادہ ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی یہ معلوم کرنا ممکن ہے کہ جن رسوم ورواج کو رسول اللہؐ نے علیٰ حالہٖ رکھا (خواہ ان کے لئے واضح طور پر حکم دیا ہو یا ویسے ہی ان کا استصواب فرمادیا ہو) انہیں ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رکھنا مقصود تھا۔ اس موضوع پر شاہ ولی اللہؒ نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جس کا خلاصہ میں یہاں بیان کرتا ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ پیغمبرانہ طریق تعلیم یہ ہوتا ہے کہ رسول کے احکام ان لوگوں کے عادات واطوار اور رسوم ورواج کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں جو اسکے اولین مخاطب ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی تعلیم کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ عالمگیر اصول عطا کردے لیکن نہ تو مختلف قوموں کے لئے مختلف اصول دیئے جاسکتے ہیں اور نہ ہی انہیں کسی اصول کے چھوڑا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے مسلک زندگی کے لئے جس قسم کے اصول چاہیں وضع کریں۔ لہٰذا پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوع انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کے عادات وخصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اسکے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بہت سے خصوصی حالات پر مبنی ہوتی ہے انہیں آنے والی

سلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ نے (جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت کھتے تھے) اپنے فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انھوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا، جس کا مفہوم ہے کہ قانون وضع کرتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے احادیث کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے تدوینِ فقہ میں احادیث سے اس لئے کام نہیں لیا کہ ان کے زمانہ میں احادیث کے کوئی باضابطہ مجموعے مرتب نہیں ہوئے تھے۔ اول تو یہ کہنا ہی درست نہیں کہ ان کے زمانے میں احادیث کے مجموعے موجود نہیں تھے۔ امام مالک اور زہری کے مجموعے ان کی وفات سے قریب تیس سال پہلے مرتب ہو چکے تھے۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ مجموعے امام صاحب تک پہنچ نہیں پائے تھے یا ان میں قانونی حیثیت کی احادیث موجود نہیں تھیں تو اگر امام صاحب اس کی ضرورت سمجھتے تو وہ احادیث کا اپنا مجموعہ مرتب فرما سکتے تھے، جیسا کہ امام مالک اور ان کے بعد امام احمد بن حنبل نے کیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے امام ابو حنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا اور اگر آج کوئی وسیع النظر مقنن یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابو حنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار اسلامی کے بلند ترین مقننین میں ہوتا ہے۔

لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ محدثین نے قانون کے متعلق مجرد فکر و قیاس کے مقابلہ میں ٹھوس ت (Concrete Cases) کو زیادہ اہمیت دینے سے شرعی قانون کی بڑی خدمت سرانجام دی ہے علاوہ بریں اگر احادیث کے لٹریچر کے غائر مطالعہ سے اُس روح (اسپرٹ) کے سمجھنے کا کام لیا جائے جن کے مطابق رسول اللہؐ نے اپنی وحی کی تعبیر فرمائی تھی تو اس سے یہ بھی سمجھ میں آجائے گا کہ قرآن نے قانون سازی کے لئے جو اصول دیئے ہیں، زندگی کے عملی میدان میں ان کی صحیح قدر و قیمت کیا ہے۔ اگر ان اصولوں کی حیاتی قدر (Life-value) کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو اس سے شرعی قانون سازی کے بنیادی اصولوں کی تعبیرِ نو میں بڑی مدد ملے گی۔ یہی ایک چیز ہے جو اس باب میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔

...سے قانون سازی کی
...ح کو سمجھا جا سکتا ہے

(۳) اجماع

قانونِ شریعت کا تیسرا سرچشمہ اجماع ہے جو میرے نزدیک اسلام میں سب اہم قانونی تصور ہے[1]۔ لیکن یہ بات

---

[1] علامہ اقبال نے اس پوری بحث میں اجماع سے مراد اسلام کا مشاورتی نظام لیا ہے نہ کہ فقہا کا مصطلحہ "اجماع"۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر اس بحث کو دیکھنا چاہیئے۔

ں قدر حیرت انگیز ہے کہ ابتدائے اسلام میں اس اہم قانونی تصور کے متعلق نظری بحثیں تو اس قدر ہوئیں۔ لیکن یہ صرف خیال ہی خیال رہا اور مسلمانوں کی کسی مملکت میں بھی ایک مستقل عملی شکل اختیار نہ کرسکا۔ اغلباً اس کی وجہ یہ تھی کہ خلیفۂ چہارم کے بعد مسلمانوں میں جو ملوکیت آگئی تو اس نے سمجھ لیا کہ اجماع کو ایک قانونی حیثیت دینے سے اس کے سیاسی مفاد پر زد پڑے گی۔ میرا خیال ہے کہ بنی امیہ اور عباسی خلفاء نے اپنا مفاد اسی میں سمجھا کہ بجائے اس کے کہ افراد ملت (کے نمائندگان) کی ایک مستقل مجلس مشاورت (اسمبلی) متشکل کی جائے، جس سے وہ اتنا اقتدار حاصل کرلے کہ اُن (سلاطین کے لئے) دردسر بن جائے مجتہدین کو انفرادی اجتہاد کا حق دیدیا جائے۔ لیکن اب یہ دیکھ کر بڑی ڈھارس بندھتی ہے کہ زمانہ کے جدید تقاضوں اور اقوام مغرب کے سیاسی تجربے سے دورِ حاضر کے مسلمانوں کو اجماع کی قدر و قیمت اور امکان کا احساس پیدا ہوتا جارہا ہے۔ مسلمان ممالک میں روحِ جمہوریت کی بیداری اور رفتہ رفتہ مجالس قانون ساز کی تشکیل ایک نیک فال اور ترقی کی جانب صحیح اقدام ہے۔ دورِ حاضر میں جب کہ امت میں متعدد جماعتیں اور پارٹیاں پیدا ہوچکی ہیں اجماع کی ممکن شکل یہی ہے کہ مذاہب فقہ کے انفرادی نمائندگان سے حق اجتہاد چھین کر اُسے مسلمانوں کی مجلس قانون ساز کو تفویض کردیا جائے۔

اجماع کی صحیح شکل

اس سے، (دیگر مفاد کے علاوہ) ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ قانونی مباحث میں وہ غیر فنی ارباب بصیرت بھی حصہ لے سکیں گے جنہیں (فنی نکات آفرینیوں کے مقابلہ میں) معاملات کی (عملی) سمجھ بوجھ کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم اپنے نظامِ قانون کو جمود و تعطل کے پنجہ سے نجات دلا کر اس میں خونِ زندگی دوڑا سکتے اور اسے پھر سے ایک ارتقائی اندازِ نظر عطا کرسکتے ہیں۔ لیکن اس طریقِ کار کے اختیار کرنے میں ہندوستان میں دشواریاں پیدا ہوں گی۔ اس لئے کہ یہ امر مشتبہ ہے کہ ایک غیر مسلم اسمبلی کو اجتہاد کا اختیار دیا جاسکتا ہے[1]۔

قرآن اور اجماع

اجماع کے ضمن میں ایک دو سوال اور بھی پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب دیا جانا ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ کیا اجماعِ امت (جمہور کا فیصلہ) قرآنی احکام کو منسوخ کرسکتا ہے؟ مسلمانوں کے مجمع میں اس سوال کا اٹھانا یکسر غیر ضروری ہے (کیونکہ ان میں سے ہر ایک اس حقیقت سے باخبر ہے کہ قرآنی احکام کو کوئی بھی منسوخ نہیں کرسکتا) لیکن مجھے اس سوال کو اس لئے سامنے لانا پڑا ہے کہ (Mohammedan Theories Of Finance) کے مغربی مصنف نے اپنی اس کتاب میں ایک بڑی گمراہ کن بات لکھدی ہے۔ اس نے بغیر کسی حوالہ اور سند کے لکھ دیا کہ بعض حنفی اور معتزلہ مصنفین کے نزدیک اجماع، قرآن کو منسوخ کرسکتا ہے۔ سارے اسلامی لٹریچر میں اس بات کے جواز و تائید میں کوئی چیز نہیں ملتی۔ (اجماعِ امت تو ایک طرف) قرآن کو تو رسول اللہؐ کی کوئی حدیث بھی منسوخ نہیں کرسکتی۔ میرا خیال

[1] تشکیل پاکستان نے ان دشواریوں کو دور کردیا تھا لیکن ہم نے اپنے آئین کی رو سے غیر مسلموں کو مجالس قانون ساز میں شریک کر کے، ان دشواریوں کو خود اپنے ہاتھوں پیدا کرلیا۔

ا مغربی مصنف کو جس بات نے مغالطہ میں ڈال رہا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے متقدمین نے اپنی تحریروں میں نسخ کا لفظ
ال کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ امام شاطبی نے الموافقات (جلد سوم۔ ص ۹۵) میں لکھا ہے، صحابہ کے اجماع کے سلسلہ میں جب
نسخ کا لفظ آئے تو اس سے مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ انھوں نے قرآن کے فلاں حکم کو فلاں حد تک نافذ کیا یا اسے فلاں
حد تک محدود رکھا (یعنی احکام قرآنی کی تقیید و تعمیم)[1] اس سے ہرگز یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ انھوں نے قرآن کے کسی حکم کو منسوخ
یا اس کی جگہ کوئی دوسرا حکم نافذ کر دیا۔ اس تحدید و توسیع کے سلسلہ میں بھی بقول آمدی، نظریہ قانون یہ ہے کہ صحابہؓ کے پاس
ا کیلئے کوئی نہ کوئی حکم شریعت ضرور ہوگا[2] (آمدی، شافعی امام فقہ ہیں جن کی وفات ساتویں صدی کے وسط میں ہوئی تھی اور
ماہی میں مصر سے ان کی کتابیں شائع ہوئی ہیں)

صحابہؓ کے فیصلوں کی حیثیت

لیکن فرض کیجیے کہ کسی معاملہ میں صحابہؓ نے بالاتفاق ایک فیصلہ کیا۔ تو اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آنے والی نسلیں بھی اس فیصلہ کی پابند رہیں گی؟
م شوکانی نے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے اور مختلف مذاہب فقہ کے ائمہ کی آراء بھی نقل کی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ
سا باب میں ضروری ہے کہ اُن امور میں جن کا تعلق واقعات (Facts) سے ہے اور اُن میں جن کا تعلق قانون
سے ہے، فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ جن امور کا تعلق (عہد رسالت یا زمانہ صحابہ کے) واقعات و حوادث سے ہے اُن
میں صحابہؓ کے فیصلوں کی پابندی ہم پر لازم ہے۔ اس لئے کہ اُس زمانے کے واقعات کا علم صحابہؓ سے زیادہ اور کسی کو
نہیں ہوسکتا تھا۔ مثال کے طور پر اُس واقعہ کو لیجئے جس میں یہ سوال اٹھا کہ کیا قرآن کی وہ سورتیں جنھیں معوذتین کہا جاتا ہے
قرآن کا حصہ ہیں یا نہیں۔ اور صحابہؓ نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ یہ قرآن کا جزو ہیں۔ لیکن جہاں تک ان امور کا تعلق ہے جن
کی حیثیت قانونی ہے، ان کی بابت میری ناچیز رائے یہ ہے کہ بعد میں آنے والی نسلیں صحابہؓ کے فیصلوں کی پابند نہیں ہیں۔
اس لئے کہ اس میں سوال (قرآن کے کسی اصولی حکم کی) تعبیر کا ہے۔ چنانچہ امام کرخی اس خیال کی تائید کرتے ہوئے لکھتے
ہیں کہ "سنت صحابہؓ صرف ان معاملات میں واجب الاتباع ہے جن کا فیصلہ قیاس سے نہیں کیا جا سکتا۔ جن معاملات
کا فیصلہ (اجتہاد و) قیاس سے کیا جا سکتا ہے اُن میں اُن کی سنت کی تقلید لازم نہیں۔"
اس ضمن میں ایک اور سوال پوچھا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ بحالات موجودہ مسلمانوں کی جو مجالس قوانین ساز

---

[1] مثلاً حضرت عمرؓ نے جنگ کے دوران میں حد نافذ کرنے کو ملتوی کر دیا تھا یا قحط کے زمانہ میں ان لوگوں کو چوری کی سزا نہیں دی تھی جنھوں نے
بھوک کی وجہ سے غلہ کی چوری کی تھی۔
[2] یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ صحابہ کے پاس "حکم شرعی" ہونے سے کیا مراد ہے۔ انھوں نے قرآن کی تعلیم سے ایک استنباط کیا ہوگا۔ اور ایسا
استنباط ہو سکتا ہے، ان کا ایسا فیصلہ (جو قرآن کے اصولوں کے اندر ہو) خود حکم شرعی کی حیثیت رکھتا تھا۔

ہماری مجالس قوانین ساز

بنائی جائیں گی ان میں لامحالہ ایسے لوگ آجائیں گے جو قانونِ شریعت کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی مجالس سے قانونِ شریعت کی تعبیرات میں فاش غلطیاں سرزد ہوں گی۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کی غلطیوں کے سدباب، یا ان کے مواقع کو کم کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں؟ (اس سلسلہ میں) ایران نے اپنے سنہ ۱۹۰۶ء کے دستورِ مملکت کی رو سے 'ایسے علماء کی' جو امورِ دنیا سے باخبر ہوں' ایک کمیٹی مقرر کی تھی تاکہ وہ مجلسِ قانون ساز کے کام کی نگرانی کرے۔ یہ تدبیر بڑی خطرناک تھی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اسے ایران کے نظریۂ دستور کے حالاتِ خصوصی کے پیشِ نظر اختیار کیا گیا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ان کا نظریۂ دستور یہ ہے کہ مملکت درحقیقت امام غائب کی مِلک ہے اور بادشاہ صرف اس کا محافظ ہے۔ علمائے مذہب بہ حیثیت نمائندگانِ امام غائب' اپنا حق سمجھتے ہیں کہ وہ ملت کی زندگی کے ہر گوشے کے محاسب و نگراں ہوں۔ اگرچہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ جب امام غائب کی جانشینی کو تسلیم نہیں کیا جاتا تو ان علماء کے حقِ نیابت کو کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ بہرحال ایران کا نظریۂ دستور کچھ ہی ہو' یہ تدبیر خطرات سے خالی نہیں[1] اگر کوئی سُنی مملکت اس تدبیر کو آزمائشی طور پر اختیار کرنا چاہے' تو وہ اسے عارضی طور پر آزما کر دیکھ لے۔ وہ بھی اس طرح کہ علماء کو مجلسِ قانون ساز کا رکن بنا دے تاکہ وہ قوانین شریعت پر آزادانہ بحث و تمحیص میں دوسروں کی معاونت اور راہ نمائی کریں۔ احکامِ شریعت میں غلطیوں کے سدباب کا موثر طریق ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ مسلمان ممالک میں قانونی تعلیم کے موجودہ طریق میں ایسی اصلاح کی جائے جس سے اس کا دائرہ وسیع ہو جائے اور جدید اصولِ قانون سازی کو طلباء کے درس کا لازمی جزو قرار دیا جائے۔

(۴) قیاس

قیاس

فقہ کا چوتھا بنیادی ماخذ قیاس ہے۔ یعنی کسی ایک حکم یا فیصلہ کو' عقل و بصیرت کی رُو سے' اس سے ملتے جلتے حالات پر منطبق کرنا۔ (عہدِ رسالت مآبؐ کے بعد) جو ممالک اسلامی فتوحات کے دائرے میں آئے ان میں معاشرتی اور زرعی حالات' عرب کے لوگوں سے بالکل مختلف تھے۔ ان معاملات کی نزاعات کے تصفیہ میں اُن نظائر سے کچھ مدد نہیں مل سکتی تھی جو احادیث کے مجموعوں میں مندرج تھے۔ اس دشواری کے پیشِ نظر' مذہب حنفی کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہ تھا کہ وہ قانونی تعبیرات میں قیاس اور رائے سے کام لیں۔ عراق میں جو نئے حالات سامنے آئے

ارسطوی منطق

ان کے پیشِ نظر انھوں نے یہی سمجھا کہ اگر قانون سازی میں ارسطوی منطق سے کام لیا جائے تو کامیابی ہو گی لیکن قانونِ شریعت کی تدوین کے ابتدائی مراحل میں یہ طریق کار بہت نقصان رساں تھا۔

---

[1] ہمارے نومسلم مصنف اسد لیوپولڈ نے اپنے مسودۂ دستورِ پاکستان میں اس قسم کی مجلسِ علماء کی تجویز پیش کی تھی جس کی طلوعِ اسلام نے مخالفت کی۔ پہلی مجلس دستور ساز کی کمیٹی نے بھی کچھ اس قسم کی تجویز کی تھی۔ مقامِ شکر ہے کہ دستورِ پاکستان میں اس قسم کی کوئی شق نہیں رکھی گئی۔

منطق کے معنی یہ ہیں کہ عام اصولوں سے ایسے قواعد وضوابط مستنبط کئے جائیں جن میں کہیں لوچ اور لچک نہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ فرق و اعمالِ حیات کچھ ایسے پیچیدہ واقع ہوئے ہیں کہ انہیں اس قسم کے سخت قواعد وضوابط کے شکنجے میں کسا نہیں جاسکتا لیکن اگر زندگی کو ارسطو کی منطق کی عینک سے دیکھا جائے تو وہ ایک مشین محض دکھائی دیتی ہے جس میں کوئی داخلی عامل حرکت کارفرما نہیں۔ مذہب حنفیہ کے ائمہ نے حیات کی تخلیقی آزادی اور خودروی کو نظرانداز کردیا۔ اس سے انھیں امید بندھی تھی کہ خالص منطق کی بنیادوں پر ایک مکمل ضابطۂ قوانین کی تشکیل کی جاسکے گی۔ یہ طریقِ کار فقہائے حجاز کے فطری میلان کے خلاف تھا (عربی فطرت اس قسم کی جامد و یابس جکڑبندیوں کو قبول ہی نہیں کرسکتی تھی)۔ چنانچہ انھوں نے فقہائے عراق کی اس قسم کی قانونی موشگافیوں کے، اور ان کے اس رجحان کے خلاف، کہ محض قیاسی اور فرضی مقدرات کو سامنے رکھ کر قانون بناتے چلے جائیں، صدائے احتجاج بلند کی۔ وہ سمجھتے تھے اور بجا طور پر سمجھتے تھے کہ اس طرح اسلام کا قانون ایک بے جان مشین ہوکر رہ جائے گا۔ ان ائمہ فقہ کی اس قسم کی باہمی نزاعات سے یہ بحثیں چھڑ گئیں کہ قیاس کے حدود کیا ہیں۔ کن حالات میں قیاس جائز ہے۔ غلط قیاس کی تصحیح کس طرح کی جاسکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان بحثوں کی ضرورت اس لئے بھی لاحق ہوگئی کہ شروع میں قیاس کے متعلق صرف اتنا ہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ ایک مجتہد کی ذاتی رائے کا نام ہے۔ لیکن آخرالامر یہی چیز قانونِ اسلام میں سرچشمہ حیات وعمل بن گئی۔ آریائی ذہنیت و رجحانِ طبع یہ ہے کہ انسان تصورات کی خیالی دنیا میں مگن رہے اور واقعات وممکنات کی دنیا سے کم دلچسپی لے۔ یہ ذہنیت زندگی کے عملی مسائل کے مقابلہ میں نظری مسائل کے متعلق بحث وتمحیص سے زیادہ لذت اندوز ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، سامی رجحانِ طبع دنیائے واقعات سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے اور تصورات کی بجائے ٹھوس حقائق پر قابو پانا چاہتا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو امام ابوحنیفہؒ کے اس مسلک پر کہ قیاس، قانون کا ماخذ ہے، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی کڑی تنقید، آریائی ذہنیت پر سامی احتساب ہے[1]۔ بالفاظ دیگر یہ ایک نزاع تھی قانون کی تحقیق میں، استقرائی اور استخراجی اسلوب کے حامیوں کے درمیان۔ شروع میں، فقہائے عراق، تخیلِ قانون کی ابدیت پر زیادہ زور دیتے رہے۔ ان کے برعکس، حجاز کے فقہاء نے اس کے موقتی (Temporal) گوشہ پر زور دیا لیکن انھوں نے اپنی پوزیشن کی اہمیت کا کما حقہٗ احساس نہ کیا۔ وہ چونکہ حجاز کے رہنے والے تھے اس لئے طبعی طور پر وہ حجاز کی قانونی روایات کے طرفدار ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کرلیا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے ان کی نگاہ کا زاویہ تنگ ہو کر رہ گیا۔ انھوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے۔ لیکن انھوں نے

---

[1] امام ابوحنیفہؒ کا تعلق آرین نسل سے تھا اور امام مالکؒ اور شافعیؒ سامی النسل تھے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس میں افرادِ متعلقہ کے ذاتی رجحان کی بجائے حالات کے تقاضے زیادہ ذمہ دار تھے۔ جیسا کہ خود علامہ نے آگے چل کر بیان کیا ہے۔

ایک خاص دَور کے) مخصوص واقعات کو ابدی اور غیر متبدل سمجھ لیا۔ اور خاص واقعات سے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس، ان کی سخت تنقید میں مذہب حنفیہ کے لئے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انھوں نے محسوس کر لیا کہ اصولِ قانون سازی کی تعبیر میں زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتبِ فقہ جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا۔ اپنے خاص الخاص اصولِ فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہب فقہ و تشریع کے مقابلہ میں، حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن جائے حیرت ہے کہ خود حنفی علماء نے خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف، امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جس طرح، امام ابوحنیفہؒ کے ناقدین نے، ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ مقدمات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔

اس مکتبِ فقہ کا خاص الخاص اصول۔ قیاس۔ بشرطیکہ اسے اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے، امام شافعیؒ کے الفاظ میں اجتہاد ہی کا دوسرا نام ہے۔ جس سے وحی کی چار دیواری کے اندر، پوری پوری آزادی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ ایک اصول قانون کی حیثیت سے اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ——— جیسا کہ بعض علماء بالخصوص قاضی شوکانی نے لکھا ہے۔ خود نبی اکرمؐ کی زندگی میں بھی اس کی اجازت تھی۔ اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا، اسلام کے خلاف افتراء ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی۔ اور ایک وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانہ میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین کو (انسانوں کی بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس "افتراء" کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انھوں نے برضاء رغبت اپنی فکری آزادی کو اپنے خود ساختہ معبودوں کی نذر کر دیا تھا، یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علامہ سرخسیؒ (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں:

> اگر اس افتراء کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکرین و مصنفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں، اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستے میں بہت سی دشواریاں ہیں تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس، تعبیرات کے لئے

کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہ تھا)

مجھے امید ہے کہ ان مختصر تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ ہمارے نظامِ قانون کے نہ اساسی
صولوں میں اور نہ ہی ان کے اوپر اٹھی ہوئی موجودہ عمارت میں کوئی چیز ایسی ہے جو ہمارے موجودہ طرزِ عمل کے لئے وجۂ جواز بن

جرأت کی ضرورت ہے

سکے (جس کے مطابق سمجھا جاتا ہے کہ اسلامی قوانینِ شریعت ناقابلِ تغیر و تبدل
ہیں)۔ بنابریں دنیائے اسلام کو چاہیئے کہ وہ جرأت و بسالت سے کام لے اور فکرِ
عمیق اور تجرباتِ جدید کی روشنی میں نظامِ شریعت کی تشکیلِ نو کے اہم کام کو اپنے ہاتھ میں لے۔ اس سلسلہ میں اس نکتہ
کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ تشکیلِ جدید کے معنی صرف اسی قدر نہیں کہ زمانہ کے موجودہ حالات سے مطابقت پیدا کر لی
جائے۔ اس کا ایک گوشہ اس سے بھی زیادہ اہم اور نازک ہے۔ گذشتہ جنگِ عظیم (پہلی جنگِ عظیم) اپنے پیچھے دو اہم
اثرات چھوڑ گئی ہے۔ ایک تو ترکی کی بیداری ––– جس کے متعلق ایک فرانسیسی مصنف نے کہا ہے کہ وہ دنیائے
اسلام میں ثبات واستحکام کا عنصر ہے ––– اور دوسرے وہ معاشی تجربہ جو مسلم ایشیا کے پہلو (روس) میں ہو رہا
ہے۔ یہ وہ کوائف ہیں جن سے ہمیں اس امر پہ غور کرنا چاہیئے کہ اسلام کا حقیقی مفہوم کیا ہے اور وہ انسانیت کو کس
منزل کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ آج عالمِ انسانیت کو تین چیزوں کی ضرورت ہے۔

عالمِ انسانیت کے تقاضے

(۱) کائنات کی روحانی تعبیر۔
(۲) فرد کی روحانی آزادی۔ اور
(۳) عالمگیر اصولِ اساسی جو انسانیت کو روحانی بنیادوں پر نشوونما ارتقاء کے راستے پر
ڈال دیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ جدید یورپ نے ان بنیادوں پہ چند تصوراتی نظام قائم کئے ہیں۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ جن
صداقتوں کو محض عقل کی رو سے دریافت کیا جاتا ہے ان سے (قلبِ انسانیت میں) زندہ و پائندہ ایمان کا وہ شعلہ
کبھی بیدار نہیں ہوتا جو وحیٔ نبوت کی رُو سے ظہور میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محض عقل، لوگوں کو بہت کم متاثر کر سکی
ہے۔ اس کے مقابلہ میں مذہب نے ہمیشہ افراد کو بھی بلندیاں عطا کی ہیں اور پورے کے پورے معاشرے میں بھی انقلاب
پیدا کر دیا ہے۔ یورپ کی تصوریت (جسے اس نے خالص عقل کی رُو سے قائم کیا ہے) اس کی زندگی میں کبھی ایک زندہ
عنصر نہیں بن سکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں ایک بدنہاد اور مسخ شدہ انانیت (Pervertcd Ego) ان
جمہوریتوں کے پیکر میں نمودار ہوگئی ہے جو باہمدگر متصادم ہیں اور جن کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ دولتمندوں کی
عیش سامانیوں کی خاطر غریبوں کو لوٹا کھسوٹا جائے۔ یقین مانیئے! انسانیت کی اخلاقی ترقی کے راستے میں آج سب سے بڑی

اوٹ یا روپ ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے پاس وحی کے تصدق وہ بنیادی تصورات موجود ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور جن کی آج انسانیت کو اس قدر ضرورت ہے، وحی کا سرچشمہ اخلاقِ حیات ہے۔ اس کے حروف و الفاظ کے لباس میں اسکی اہم حقیقتیں مستور ہیں۔ اس میں الفاظ و معانی میں وہی اختلاط ہے

جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

زندگی کی روحانی بنیاد مسلمان کا ایمان ہے۔ ایسا ایمان جس کی خاطر، ہم میں سے کم سے کم پڑھا لکھا آدمی بھی بلا توقف و تامل اپنی جان تک دے دینے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ اسلام کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ اب وحی کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اس بنا پر ہمیں دنیا کی سب سے زیادہ آزاد قوم ہونا چاہیئے پہلے زمانے کے مسلمان جو ایشیا کے قبل از اسلام کی روحانی غلامی سے (نئے نئے) آزاد ہوئے تھے، اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ (ختمِ نبوت کے) اس بنیادی تخیل کی اہمیت کا صحیح صحیح اندازہ کر سکتے۔ لیکن دورِ حاضر کے مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن کو اچھی طرح سے سمجھے۔ (قرآن کے) غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں اپنے معاشرہ کی تشکیلِ جدید کرے۔ اور وہ عالمگیر جمہوریت قائم کر کے دکھائے جو اسلام کی اصل و غایت ہے۔ لیکن جو ابھی تک پورے طور پر بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے نہیں آئی۔ (ختم شد)

[اگر پاکستان نے یہ کچھ کر دیا تو وہ اسلام کی روح کا سب سے بہتر ترجمان، اور نوعِ انسانی کا سب سے بڑا محسن ہوگا۔ اگر وہ اس میں ناکام رہا تو یہ خود اپنے خلاف سب سے بڑی دشمنی اور انسانیت کے خلاف بہت بڑی غداری ہوگی۔

جیسا کہ ہم شروع میں لکھ چکے ہیں، حکومت پاکستان کی طرف سے ایک کمیشن مقرر کیا جانے والا ہے جس کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ بتائے کہ ملک کے موجودہ قوانین کو "کتاب و سنت" کے مطابق کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ملک میں اس مسئلہ کو وہ اہمیت نہیں دی جا رہی جس کا یہ متقاضی ہے۔ قوم کے عوام بیچارے روٹی کے دھندے میں اس قدر الجھے ہوئے ہیں کہ انہیں کسی اور طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں۔ خواص کو اپنی اپنی جاگیریں اور کرسیاں سنبھالنے کی فکر چین نہیں لینے دیتی۔ لہٰذا ملت اور ملک کے مستقبل کے متعلق سوچے تو کون سوچے؟ ہمارے ارباب اقتدار کے سامنے ایک ہی سوال ہے اور وہ یہ کہ آئندہ الیکشن میں انہیں زیادہ سے زیادہ ووٹ کس طرح مل سکتے ہیں ظاہر ہے کہ (۱) ووٹ عوام سے ملیں گے اور (۲) عوام پر قدامت پرست اربابِ شریعت کا اثر ہے۔ اس لئے ہمارے اربابِ اقتدار، قدامت پرست طبقہ

سلہ یعنی ہم صرف ان غیر متبدل اصولوں کے پابند ہیں جو خدا نے آخری بار قرآن میں متعین کر دیئے ہیں۔ ان اصولوں کی چار دیواری [illegible] آزادی کہ زندگی کے نئے تقاضوں کے مطابق اپنے معاشرہ میں مناسب تغیر و تبدل کرتے رہیں۔

کو ضرور ساتھ رکھنا چاہتے ہیں (جیسا کہ انھوں نے دستور سازی کے سلسلہ میں کیا ہے)۔ ہمیں اس سے کچھ واسطہ نہیں کہ کون کسے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اس سے ملت اور مملکت پر جو اثر پڑے گا، ہمیں اس کا شدید احساس ہے۔ ہمیں خطرہ یہ ہے کہ اگر قانون سازی کا کام قدامت پرست طبقہ کے سپرد کر دیا گیا تو یہاں بھی وہی کچھ ہوگا جو ٹرکی میں ہوا تھا۔ آپ کو معلوم ہے ٹرکی میں کیا ہوا تھا؟ مصطفےٰ کمال نے علماء حضرات سے کہا کہ وہ ایک متفقہ علیہ ضابطہ قوانین مرتب کر کے دیں جو دورِ حاضر کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکے۔ علماء حضرات چھ ماہ تک باہمی سر پھٹول میں مصروف رہے اور (جیسا کہ ظاہر ہے) ایسے قانون کی کوئی مشق بھی تیار نہ کر سکے۔ مصطفےٰ کمال نے تنگ آ کر کہا کہ میں ملک کو کب تک لاقانونیت کی حالت میں رکھوں! آپ اپنی نزاعات میں الجھے بیٹھے۔ ہم اپنی سوچ بچار سے خود قانون مرتب کر لیں گے۔ اس طرح ٹرکی نے حکومت سے مذہب کو الگ کر کے سیکولر انداز اختیار کر لیا۔ اگر یہاں بھی قانون سازی کا کام قدامت پرست طبقہ کے سپرد کر دیا گیا تو اول تو وہ کوئی متفقہ علیہ قانون بنا ہی نہیں سکیں گے۔ اور اگر کوئی ایسا قانون بنا بھی لیا گیا تو وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکے گا۔ اسلئے ناقابلِ عمل ہوگا۔ اس سے ہمارے اربابِ اقتدار کو ایک (جائز) عذر مل جائے گا کہ یہاں بھی سیکولر انداز کا قانون کیوں نہ رائج کر لیا جائے۔

ان تمام مشکلات کا حل فقط ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ قانون سازی کے لئے وہی اصول اختیار کیا جائے جس کی نشاندہی علامہ اقبالؒ نے کی ہے اور جس کی طرف طلوعِ اسلام شروع سے دعوت دیتا چلا آ رہا ہے۔ یعنی سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ اسلامی معاشرہ کی تشکیل کے لئے قرآن کریم کون سے غیر متبدل اصول دیتا ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ ہمارے دور کے تقاضے کیا ہیں۔ اور انھیں ہم ان غیر متبدل اصولوں کی حدود کے اندر کس طرح پورا کر سکتے ہیں۔ بایں نمط کہ پہلے پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی معاشرہ بنا سکیں اور اس کے بعد، پوری انسانیت کو اپنے دامن میں لے سکیں۔ اس کے بعد یہ دیکھنا چاہیئے کہ فقہ اور روایات اور ان سے متعلقہ لٹریچر میں جو کچھ ہمیں ملتا ہے، وہ ان تقاضوں کو پورا کرنے میں کس حد تک ممد و معاون ہو سکتا ہے۔ ان تمام عناصر کی روشنی میں ایک ضابطۂ قوانین مدون کیا جائے۔ اسے کہا جائے گا اسلامی قوانین شریعت کا ضابطہ۔ ظاہر ہے کہ اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے ان لوگوں کی بھی ضرورت ہوگی جو قرآن اور عصرِ حاضر کے تقاضوں پر نگاہ رکھتے ہوں اور ان کی بھی جنھیں ہمارے قدیم لٹریچر پر عبور ہو۔ اس قسم کے اربابِ فکر و نظر اور حضراتِ علم و فن کے باہمی تعاون سے یہ ضابطۂ قوانین مرتب ہو سکے گا۔ اگر ہمارا مجوزہ لاء کمیشن اس قسم کے عناصر کا مجموعہ اور ایسے تعاون کا مظہر ہوا، تو اس سے درخشندہ نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ورنہ

— کارِ طفلاں تمام خواہد شد۔

[طلوعِ اسلام]

اس پمفلٹ کے علاوہ

حسب ذیل پمفلٹس بھی دیکھئے

جن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارے اہم اور ضروری سوالات کے متعلق اسلام کیا کہتا ہے۔

روٹی کا مسئلہ ایسا مسئلہ نہیں جس سے مسلمان کچھ جھینپ محسوس کریں۔ اسلام نے معاشی مسئلہ کو جس قدر اہمیت دی ہے اس کا اندازہ اس پمفلٹ سے لگ سکے گا۔ قیمت ۲ر

علماء کون ہیں؟ عربی مدرسوں کے فارغ التحصیل نہیں بلکہ وہ حضرات ہیں جو ارض وسماوات میں خدا کی پھیلی ہوئی آیات پر غور وفکر کرتے ہیں اور ان سے صحیح نتائج تک پہنچتے ہیں۔ قیمت ۲ر

تکذیب دین کون کرتا ہے؟ وہ لوگ نہیں جو علانیہ اسلام کا انکار کر دیتے ہیں بلکہ وہ لوگ ہیں جو زبان سے اسلام کا اقرار کرتے ہیں۔ لیکن معاشرتی زندگی میں گریز کی راہیں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ قیمت

اطاعت رسول! اسلام میں رسول کی اطاعت سے کیا مراد ہے۔ ایک نہایت اہم سوال کا بہت واضح جواب قیمت ۲ر

بادۂ زندگی محترم پرویز صاحب کا وہ بصیرت افروز خطبہ جس سے موصوف نے طلوع اسلام کنونشن لاہور کو خطاب کیا۔ حسن وحقائق کا مرقع۔ قیمت ۲ر

تقدیر اُمم قوموں کی موت وحیات کے قرآنی اصول کیا ہیں۔ صلاحیت اور جدوجہد کی اہمیت۔ دولت کی صحیح تقسیم اور استخلاف فی الارض جیسے اہم مباحث۔ قیمت ۲ر

جنسیات قوموں کے تمدن (کلچر) پر جنسیات کا کیا اثر پڑتا ہے۔ دور حاضر کی جدید تحقیقات کی روشنی میں قرآنی نظام کی ابدیت وصداقت کا اثبات۔ ایک نازک مسئلہ کا لطیف ترین تجزیہ۔ قیمت ۲ر

مقام محمدی حضور سرور کائنات انسانیت کے کس بلند مقام پر فائز تھے۔ اور معراج محمدی سے کیا مقصود ہے! نہیں بلکہ جناب پرویز کو حضور رسالت مآب سے جو والہانہ عشق ہے اس کا بادہ لبریز ہے جو ہر جگہ چھلک پڑتا ہے۔ قیمت ۲ر

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

۱۰۹/۴-ایل (پی۔ای۔سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی نمبر ۲۹

روٹی کا مسئلہ

(اقبال کی نظر میں)

اقبال نے اپنے آپ کو "شاعرِ فردا" کہا تھا چونکہ قوموں کی زندگی میں امروز و فردا صدیوں کے پیمانے سے ماپے جاتے ہیں اسلئے نہیں کہا جا سکتا کہ اُس فردا کا طلوع کب ہوگا جب مسلمان اقبال کے صحیح مقام اور اسکے پیغام کے صحیح مفہوم سے آشنا ہو سکے گا لیکن حقیقت تو ابھی سے بے نقاب ہونا شروع ہو گئی ہے کہ اقبال "دیارِ غیر" کا شاعر تھا۔ چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ انگلستان، فرانس جرمنی اور اٹلی میں اقبال کے کلام کے ترجمے شائع ہو رہے ہیں اور اسکی شرحیں لکھی جا رہی ہیں۔ لیکن خود پاکستان میں یہ حالت ہے کہ سال بھر کے بعد اپریل کے مہینے میں دو چار مقامات پر انفرادی طور پر "یوم اقبال" کے جلسے منعقد کر لئے جاتے ہیں اور اس کے بعد اس "دفترِ بے معنی" کو بالائے طاق رکھدیا جاتا ہے۔ دورانِ سال میں اتنا ہوتا ہے کہ کبھی کسی قوال نے اقبال کی کوئی غزل گا دی یا کبھی ریڈیو والوں نے اپنے پروگرام کا خلا پُر کرنے کے لئے اس کی کوئی نظم سُنا دی۔ حتیٰ کہ وہ بزمیں اور اکاڈمیاں جنہیں اقبال کے نام پر لاکھوں روپے مل رہے ہیں، وہ بھی کھیل تماشے سے زیادہ کچھ نہیں کر رہیں۔ یوں یاد قائم رکھی جا رہی ہے اُس شخص کی جس نے (اور تمام باتوں کو چھوڑیئے) اس قوم کو اُس پاکستان کا تصور دیا جس سے اب اسکی زندگی وابستہ ہے اور جس کی وجہ سے اسے وہ مواقع حاصل ہو گئے ہیں کہ اگر یہ چاہے تو دنیا کی ممتاز ترین قوموں کی صف میں جگہ پا سکتی ہے۔ اتنی بڑی احسان فراموشی مسلمانوں ہی سے ظہور میں آسکتی تھی!

ہمارے نزدیک اقبال کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے قوم کو پھر سے قرآن سے آشنا کرانے میں مسلسل جدوجہد کی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مملکت پاکستان بھی ایک گراں بہا نعمت ہے لیکن اقبال کے الفاظ میں مملکت ایک کوشش ہوتی ہے (قرآنی) نصب العینی اصولوں کو زمان و مکان میں صورت پذیر کرنے کی۔ یہ آرزو ہوتی ہے ان اصولوں کو کسی خاص انسانی ادارہ میں رو بہ عمل نے کی۔ یعنی اسلامی نقطۂ نگاہ سے مملکت کی اہمیت محض اس لئے ہوتی ہے کہ وہ انسانیت کے ان بلند مقاصد کو جنہیں لانے عطا کیا ہے عملی پیکروں میں ڈھالنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اقبال کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے قرآن کے ان بلند مقاصد کو

ہ کے سامنے بے نقاب کیا اور انھیں بتایا کہ ان کی زندگی اور سرفرازی کا راز انہی مقاصد کی عملی تشکیل میں ہے۔

قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے بلند مقاصد کو اصولی طور پر بیان کرتا ہے اور ان کی جزئیات کو بالعموم غیر متعین چھوڑ دیتا ہے۔ تاکہ قرآن پر عمل کرنے والی قوم ان جزئیات کو اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں خود متعین کرتی جا ں کا نتیجہ یہ ہے کہ جس دور میں زندگی کا کوئی تقاضہ نمایاں حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس تقاضے سے متعلق قرآن کے اصو لی نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ ہمارے دور میں انسانی زندگی کے جس تقاضے نے سب سے زیادہ نمایاں حیثیت اختیار کی ہ روٹی کا مسئلہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب سے انسان نے تمدنی زندگی شروع کی ہے روٹی کا مسئلہ اس کے ساتھ رہا ہے لیکن اس مسئلے نے ایک عالمگیر تقاضے کی حیثیت ہمارے ہی دور میں اختیار کی ہے۔ یہ غیر ممکن تھا کہ اقبال جو زندگی قاضوں پر قرآن کی روشنی میں غور کرتا تھا اپنے دور کے لیے اہم تقاضے سے غیر متاثر رہتا اور قرآن نے اس باب میں راہ نمائی دی ہے اسے پیش نہ کرتا! اقبال کا پہلا دور ان بڑھتے ہوئے تقاضوں سے متاثر ہونے کا ہے۔ دوسرا دور اس حل غور و فکر کرنے اور اسے قرآنی روشنی میں پرکھنے کا ہے جو تنہا عقلِ انسانی نے اس مشکل کے لئے دریافت کیا۔ اور تیسرا دور ہے جس میں اس نے اس مشکل کا قرآنی حل پیش کیا ہے۔ اس دورِ اول کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب وہ خضر سے سوال کر

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے؟　　اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اور اسکے جواب میں خضر کہتا ہے ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے　　خضر کا پیغام کیا! ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر　　شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار　　انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے　　مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اس کے بعد پیامِ مشرق میں دیکھیے۔ وہ "صحبتِ رفتگاں" کے عنوان میں ٹالسٹائی، کارل مارکس، ہیگل، مزدک، کوہکن وغیرہ سب کو جمع کرتے ہیں اور ان کی زبان سے اس اہم تقاضے کی ترجمانی مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے کرتے ہیں۔ ٹالسٹائی کہتا ہے ؎

بارکش اہرمن لشکری شہریار　　از پئے نانِ جویں تیغِ ستم برکشید
دارو رسے پیشِ تاج، کلیسا، وطن　　جانِ خدا داد را خواجہ بجائے خرید

کارل مارکس کہتا ہے ؎

رازدانِ جزو و کل از خویش نامحرم شد است　　آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شد است

ہیگل اپنا فلسفۂ اضداد پیش کرتا ہے، اور ٹالسٹائی اسے "عقلِ ذو رو" کی چابک دستی قرار دے کر اس کی تردید کر مزدک اعلان کرتا ہے کہ ؎

دورِ پرویزی گزشت اے کشتۂ پرویز خیز ‌‌ ‌ نعمتِ گم کردۂ خود را ز خسرو باز گیر

یہی فلاسفر قسمتِ مزدور کو یہ سبق دیتا ہے کہ ـــــ نیاید ز محمود کار ایاز ـــــ اور مزدور ایک پر معنی تبسم سے جواب دیتا ہے کہ ؎

حقِ کوہکن دادی اے نکتہ سنج ‌‌ ‌ بہ پرویز پرکار دنا بردہ رنج

اپنی "قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور" میں وہ ان دونوں کا تقابل نہایت وضاحت اور خوبصورتی سے کرتا ہے۔ جہاں سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے کہ ؎

غوغائے کارخانۂ آہن گری ز من ‌‌ ‌ گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو

نخلے کہ شہ خراج بروی نہد ز من ‌‌ ‌ باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو

ایں خاک و آنچہ در شکمِ او از آنِ من ‌‌ ‌ وز خاک تا بہ عرشِ معلّیٰ از آنِ تو

اور اسکے بعد "نوائے مزدور" میں کہتا ہے کہ ؎

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز ‌‌ ‌ مئے کہ شیشہ گداز د بہ ساغر اندازیم

مغان و دیرِ مغاں را نظامِ تازہ دہیم ‌‌ ‌ بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم

ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم ‌‌ ‌ بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم

یہی دعوتِ انقلاب ہے جسے ہم "زبورِ عجم" میں اس سے بھی تیز انداز میں دیکھتے ہیں، جہاں اقبال کہتا ہے کہ ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب ‌‌ ‌ از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام ‌‌ ‌ آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

بالِ جبریل میں "فرشتوں کا گیت" اسی نظامِ سرمایہ پرستی کی تباہ انگیزیوں کے خلاف صدائے احتجاج ہے، جس میں کہا ؎

خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر ‌‌ ‌ تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی

تیرے امیر مال مست تیرے فقیر حال مست ‌‌ ‌ بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

یہی وہ احتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے کہ ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو ‌‌ ‌ کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

ی کتاب میں لینن کی وہ مشہور درخواست بھی ہے جس میں وہ خدا سے کہتا ہے کہ ؎

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

یہیں نظامِ سرمایہ پرستی کے انسانیت سوز نتائج، جنھیں اقبال کی نگہ بصیرت نے پہچانا اور جو اس کے قلبِ حساس کی گہرائیوں سے نشتروں کی شکل میں سطح سے اوپر ابھرے۔ یہی وہ اشعار ہیں جنھیں کمیونسٹ اپنے جلسوں اور جلوسوں میں گاتے ہیں اور ان سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اقبال بھی کمیونسٹ تھا۔ لیکن اقبال کمیونسٹ نہیں تھا، نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کمیونزم کے دو حصے ہیں۔ ایک تو ان کا یہ دعویٰ کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ رزق کو سمیٹ کر اپنے قبضہ میں لے لے جبکہ غریب اور اس کے بچے بھوکوں مر رہے ہوں۔ جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے اس کا ہر وہ مسلمان ہمنوا ہے جو قرآن سے راہنمائی حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اقبال بھی اس کا ہمنوا تھا۔ اسے اس کا ہمنوا ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن دوسری چیز ہے کمیونزم کا وہ فلسفہ جس پر وہ اس دعوے کی بنیاد رکھتے ہیں۔ یعنی ہیگل کی جدلیت اور کارل مارکس کی تاریخ کی معاشی تعبیر۔ یہ وہ فلسفہ ہے جس کی تائید کوئی مسلمان نہیں کر سکتا۔ اور چونکہ اقبال مسلمان تھا اس لئے وہ اس فلسفہ کا سخت مخالف تھا چنانچہ وہ خواجہ غلام السیدین کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں (جو ۳۶ء میں لکھا گیا تھا) کہ :-

> سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے مخالف ہیں، اور اسے افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخِ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے سیاسی مفہوم کا ...... جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہو یعنی افیونی خواص رکھتی ہے۔ اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال کارل مارکس کو "کلیم" تو کہتا ہے لیکن بے تجلی اور "مسیح" قرار دیتا ہے۔ لیکن بے صلیب۔ حتیٰ کہ وہ جاوید نامہ میں افغانی کی زبان سے یہ کہلاتا ہے ؎

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل — یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل

زانکہ حق در باطلِ او مضمر است — قلبِ او مومن دماغش کافر است

غربیاں گم کردہ اند افلاک را — در شکم جویند جانِ پاک را

دینِ آں پیغمبرِ ناحق شناس　　　برمساواتِ شکم دارد اساس

وہ کہتا ہے کہ جب روٹی کے مسئلہ کو خالص مادی بنیادوں پر حل کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے انسان حیوانی سطح پر زندہ رہ سکتا ہے لیکن اس کی انسانیت یکسر مردہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس قسم کی اشتراکیت ہو، یا مغرب کی ملوکیت انسانیت کے حق میں دونوں کا نتیجہ ایک ہے ؎

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب　　　ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج　　　درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل　　　ہر دو را تن روشن و تاریک دل

زندگانی سوختن با ساختن
در گلے تخمِ دلے انداختن

یہی "سوختن با ساختن" ہے جسے اقبال لَا اور اِلَّا سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ روس کا اشتراکی نظام درحقیقت لَا کے گرداب میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کی تمام کوششیں تخریبی ہی تخریبی ہیں۔ وہ "ساختن" یعنی اِلَّا (تعمیر) کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ چنانچہ وہ "پس چہ باید کرد" میں روس کی اسی کشمکش کے بارے میں کہتا ہے ؎

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں　　　از ضمیرش حرفِ لَا آمد بروں
آں نظامِ کہنہ را برہم زد است　　　تیز نیشے بر رگِ عالم زد است
کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ!　　　لَا سلاطیں لَا کلیسا لَا اِلٰہ
فکرِ او در تندبادِ لَا بماند　　　مرکبِ خود را سوئے اِلَّا نراند

یہاں سے وہ تیسرا دائرہ شروع ہوتا ہے، جہاں اقبال اس اہم تقاضے کے متعلق قرآنی حل کو پیش کرتا ہے۔ وہ سب سے پہلے "سوختن اور ساختن" کے اصول کو لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ؎

نکتہ می گویم از مردانِ حال　　　امتاں را لَا جلال اِلَّا جمال
لَا و اِلَّا احتسابِ کائنات　　　لَا و اِلَّا فتحِ بابِ کائنات
ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون　　　حرکت از لَا زاید از اِلَّا سکون
در مقامِ لَا نیاساید حیات　　　سوئے اِلَّا می خرامد کائنات
لَا و اِلَّا ساز و برگِ امتاں　　　نفی بے اثبات مرگِ امتاں

لَا کے معنی ہیں ہر غلط نظام کو تباہ کر دینا۔ اور اِلَّا کے معنی ہیں اس کی جگہ ایک صحیح نظام قائم کرنا۔ یہ صحیح نظام صرف مستقل اقدار کی بنیادوں پر قائم کیا جا سکتا ہے، اور مستقل اقدار تنہا عقل کی رُو سے کبھی نہیں مل سکتیں۔ یہ اقدار صرف وحی کی رو سے مل سکتی ہیں اسلئے

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر — سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ — در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

اسلئے اقبال نے افغانی کی زبانی (جاوید نامہ میں) روس کو یہ پیغام دیا تھا کہ ؎

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی — دل ز دستورِ کہن پرداختی
کردۂ کارِ خداونداں تمام — بگذر از لا جانبِ اِلّا خرام
در گذر از لا اگر جوئندۂ — تا رہِ اثبات گیری زندۂ
اے کہ می خواہی نظامِ عالمے — جستۂ او را اساسِ محکمے؟

ان کے نزدیک نظامِ عالم کے لئے اس قسم کی محکم اساس قرآن کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے اس نے روس سے کہا ؎

داستانِ کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از امّ الکتاب

اس کے بعد وہ کہتا ہے ؎

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو — لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا
با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ — ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

اقبال کو تخریبی قوت یا تخریبی پروگرام کی ناپختگی پر اس قدر یقین تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ روس زیادہ دیر تک تخریب کے گرداب پر نہیں سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں یہاں تک کہہ دیا کہ ؎

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں — خویش را زیں تند باد آرد بروں

چنانچہ اقبال اپنے ایک خط میں جو انھوں نے سر فرانسس ینگ ہزبنڈ کو ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا (اور جو ۳۱ جولائی کے "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں شائع ہوا تھا) لکھتے ہیں:-

ذاتی طور پر میں نہیں سمجھتا کہ روسی فطرۃً لامذہب ہیں۔ اسکے برعکس میرا خیال ہے کہ روسی عورتیں اور مرد بڑے مذہبی رجحانات رکھتے ہیں اور روسی ذہن کا موجودہ منفی رجحان ہمیشہ باقی نہیں رہے گا کیونکہ کوئی عمرانی نظام دہریت کی اساس پر باقی نہیں رہ سکتا۔ جونہی اس ملک میں حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور اس کے باشندوں کو اطمینان سے غور کرنے کا وقت ملیگا وہ مجبوراً اپنے نظام کی کوئی مثبت بنیاد تلاش کریں گے چونکہ بالشویت کے ساتھ خدا کا قائل ہونا اور اسلام قریب قریب ایک ہی چیز ہیں۔ اسلئے مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوگا اگر کچھ عرصے

کے بعد روس اسلام کو ہضم کرے یا اسلام روس کو۔

یکن اقبال ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو ہمیشہ اسی انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ یورپ کا فلاں ملک مسلمان ہو جائے تو اسلام کا بول بالا ہو جائے اور ہماری بھی قسمت جاگ اٹھے۔ وہ مسلمانوں سے ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ تمہاری قسمت تمہارے اپنے ہاتھوں ہی سے بیدار ہوگی۔ لہٰذا اس نے مسلمانوں سے کہا کہ اس وقت زمانہ کے تقاضوں سے جو معاشی کشمکش پیدا ہو رہی ہے، تم اس کی روشنی میں قرآن پر غور کرو۔ اس سے قرآن تمہیں ایسی راہ نمائی دے دیگا جس سے نہ صرف یہ کہ تمہاری قسمت بیدار ہو جائیگی بلکہ تمام اقوامِ عالم کی قیادت تمہارے حصہ میں آجائے گی۔ چنانچہ وہ "ضربِ کلیم" میں کہتے ہیں کہ:

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم ۔۔۔ بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور ۔۔۔ فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر ۔۔۔ کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں ۔۔۔ اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار
جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک ۔۔۔ اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

چنانچہ جب خود اقبال نے زمانہ کے ان تقاضوں کی روشنی میں قرآن پر غور کیا تو اس کے سامنے یہ حقیقت آگئی کہ قرآن کی رو سے رزق کے فطری سرچشموں پر کسی کی انفرادی ملکیت کا تصور یکسر باطل ہے۔ خدائے رب العالمین نے سامانِ رزق کو تمام نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے عام کر رکھا ہے۔ اس لئے اسے اس مقصد کے لئے عام ہی رہنا چاہیئے۔ رزق کے سرچشمے زمین سے پھوٹتے ہیں۔ اس لئے زمین کے متعلق اقبال صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت ۔۔۔ ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا نکتۂ از من پذیر ۔۔۔ رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
باطنِ الارض للہ ظاہر است ۔۔۔ ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است
رزقِ خود را از زمیں بردن رواست ۔۔۔ ایں متاعِ بندہ و ملکِ خدا است
آب و نانِ ماست از یک مائدہ ۔۔۔ دودۂ آدم کنفسٍ واحدۃ

ابدیل میں قرآن کی اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، جہاں لکھا گیا ہے کہ

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ ۔۔۔ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ ۔۔۔ خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ ۔۔۔ موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں ۔۔۔ تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں

علامہ اقبالؒ پاکستان کا حصول بھی اسی مقصد کے لئے چاہتے تھے کہ یہاں خدا کے اس قانون کو رائج کیا جاسکے چنانچہ انہوں نے اپنی وفات سے صرف ایک سال پہلے قائد اعظمؒ کے نام ایک خط میں لکھا کہ:-

"روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گزشتہ دوسو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جا رہی ہے...... لیگ کا مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کو افلاس کی مصیبت سے نجات دلانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی تو مسلمان پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق ہی رہیں گے........ شریعت اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے...... اسلام کے لئے سوشل ڈیموکریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج، جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا........ .... ان مسائل کے حل کے لئے ملک کی تقسیم کے ذریعہ ایک یا زائد اسلامی ریاستوں کا قیام اشد لازمی ہے۔"

یعنی اقبال کے نزدیک ایک الگ اسلامی مملکت کی ضرورت اس لئے تھی کہ یہاں قرآن کے معاشی نظام کا نفاذ کیا جا سکے جیسا کہ خود اقبال کو اندیشہ تھا لیگ نے اس باب میں کچھ نہ کیا جس کا نتیجہ لیگ اور اس کے ساتھ سارا ملک بھگت رہا ہے۔

طلوع اسلام، قرآن کی اس انقلابی دعوت کو جسے اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا تھا، آگے بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔ مفاد پرستانہ مذہبیت کی طرف سے قرآن کی اس آواز کو دبانے کے لئے جو کچھ کیا جا رہا ہے، اس سے کون واقف نہیں وہ سادہ لوح مسلمانوں کو یہ کہہ کر بھڑکاتا ہے کہ جس قرآنی نظام کی طرف طلوع اسلام دعوت دیتا ہے، وہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے جس کا کچل دینا بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔ وہ زمینداروں، جاگیرداروں اور سرمایہ پرستوں کو اطمینان دلاتا ہے کہ تمہارے لئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

"اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں۔ بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے......... اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے جائز دیئے ہوئے جائز حقوق

کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں۔۔۔۔۔۔ جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں، اور اتنی فلاں چیز، اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔

(مسئلہ ملکیت زمین از ابو الاعلیٰ مودودی ص۵۲)

ہمیں خطرہ صرف یہ ہے کہ اگر اس وقت مسلمانوں نے قرآن کے ان حقائق کو اپنے معاشرہ کی بنیادیں قرار نہ دیا تو کمیونزم کا طوفانِ بدتمیزی نہ معلوم انہیں کہاں سے کہاں لے جائے۔ اسی خطرہ کے پیشِ نظر اقبال نے کہا تھا کہ

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است — سازِ قرآں را نواہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر — آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
حق اگر از پیشِ ما بردار دش — پیشِ قومے دیگرے بگذاردش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن — ہر زماں جانم بلرزد در بدن
ترسم از روزے کہ محرومش کنند — آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

کس قدر دور رس تھیں اس مردِ حق آگاہ کی نگاہیں اور کیسا دردمند تھا اس مردِ مومن کا قلبِ حساس۔ کتنی محبت تھی اسے انسان اور مسلمان سے، اور کیسا عشق تھا اسے خدا کے کلام سے!

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

اقبال کے تصورات

(زندگی کے اہم مسائل کے متعلق)

۱۔ اجتہاد

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے — نہ کہیں لذتِ کردار، نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں — آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں — ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب — کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

(ضربِ کلیم)

۲۔ تخلیق

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود — کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے — اس آبجو سے کیے بحرِ بیکراں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے — جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا
خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں — ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا

(ضربِ کلیم)

۳۔ جدت

[illegible]

خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے
ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے سحر سے
دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے
شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے
اغیار کے افکار و تخیّل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی؟

(ضربِ کلیم)

۴۔ صاحبِ ایجاد

جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد
ہر دَور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ
تقلید سے ناکارہ نہ کر اپنی خودی کو
کر اس کی حفاظت کہ یہ گوہر ہے یگانہ
اس قوم کو تجدید کا پیغام مبارک
ہے جس کے تصور میں فقط بزمِ شبانہ

(ضربِ کلیم)

۵۔ فنونِ غلاماں

بے یقیں را لذتِ تخلیق نیست
بے یقیں را قوتِ تخلیق نیست
بے یقیں را رعشہ ہا اندر دل است
نقشِ نو آوردن او را مشکل است
از خودی دور است و رنجور است و بس
رہبرِ او ذوقِ جمہور است و بس

(زبورِ عجم)

۶۔ مُلّا

دینِ حق از کافری رسوا تر است
زانکہ مُلّا مومنِ کافر گر است
شبنمِ ما در نگاہِ ما یم است
از نگاہِ او یمِ ما شبنم است
از شگرفیہائے آں قرآں فروش
دیدہ ام روح الامیں را در خروش

زاں سوئے گردوں دلش بیگانۂ　　　نزد او ام الکتاب افسانۂ
بے نصیب از حکمت دین نبی　　　آسمانش تیرہ از بے کوکبی
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد　　　ملت از قال و اقولش فرد فرد
مکتب و ملا و اسرار کتاب　　　کور مادر زاد و نور آفتاب

دین کافر فکر و تدبیر جہاد
دین ملا فی سبیل اللہ فساد

(جاوید نامہ)

۷۔ بزبانِ ابلیس

نے حدیث و نے کتاب آوردہ ام　　　جان شیریں از فقیہاں بردہ ام
رشتۂ دیں چوں فقیہاں کس نرشت　　　کعبہ را کردند آخر خشت خشت

(جاوید نامہ)

۸۔ مسلمان کے لئے چار مرگ

چار مرگ اندر پے ایں دیر میر　　　سود خوار و والی و ملا و پیر

(جاوید نامہ)

۹۔ مسلمانانِ فرنگی مآب

عالماں از علم قرآں بے نیاز　　　صوفیاں درندہ گرگ و مو دراز
ہم مسلمانانِ افرنگی مآب　　　چشمۂ کوثر بجویند از سراب
بے خبر از سِرِّ دین اند ایں ہمہ　　　اہل کیں اند، اہل کیں اند، ایں ہمہ
کرگساں را رسم و آئینِ دیگر است　　　سطوتِ پروازِ شاہیں دیگر است

(جاوید نامہ)

۱۰۔ پاکستانی مسلمان

داستانِ او مپرس از من کہ من — چوں بگویم آنچہ ناید در سخن
در گلویم گریہ ہا گردد گرہ — ایں قیامت اندرونِ سینہ بہ
مسلم ایں کشور از خود ناامید — عمرہا شد با خدا مردے ندید
لاجرم از قوتِ دیں بدظن است — کاروانِ خویش را خود رہزن است
پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق — مکتب و ملائے او محرومِ شوق
زشتیٔ اندیشہ او را خوار کرد — افتراقِ او را از خود بیزار کرد
تا نداند از مقام و منزلش — مرد ذوقِ انقلاب اندر دلش

(پس چہ باید کرد)

۱۱۔ اسکے پاس قرآن نہیں

منزل و مقصودِ قرآں دیگر است — رسم و آئینِ مسلماں دیگر است
در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست — مصطفیٰ در سینۂ او زندہ نیست
بندۂ مومن ز قرآں برنخورد — در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ دُرد
خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست — خود سرِ تختِ ملوکیت نشست
تا نہالِ سلطنت قوت گرفت — دینِ او نقش از ملوکیت گرفت

(جاوید نامہ)

۱۲۔ متاعِ شیخ

متاعِ شیخ اساطیرِ کہن بود — حدیثِ او ہمہ تخمین و ظن بود
ہنوز اسلامِ او زنار دار است — حرم چوں دیر بود او برہمن بود

(ارمغانِ حجاز)

۱۰۔ مُلّا

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را — بیفشاں بر دو گیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند — کہ ملّا کم شناسد رمزِ دیں را

(ارمغانِ حجاز)

۱۱۔ بندِ صوفی و مُلّا

بہ بندِ صوفی و ملّا اسیری — حیات از حکمتِ قرآں نگیری
بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست — کہ از "یٰسین" او آساں بمیری

(ارمغانِ حجاز)

۱۲۔ مغز و پوست

گرفتم حضرتِ ملّا ترش روست — نگاہش مغز را نشناسد از پوست
اگر با ایں مسلمانی کہ دارم — مرا از کعبہ می راند حق اوست

(ارمغانِ حجاز)

تاویلِ قرآن

ز من بر صوفی و ملّا سلامے — کہ پیغامِ خدا گفتند ما را
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

(ارمغانِ حجاز)

۱۔ ملائے حرم

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو　　تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال　　تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام!

(ضربِ کلیم)

۱۸۔ فریب ہی فریب

چہ ملائی، چہ درویشی، چہ سلطانی، چہ دربانی　　فروغِ کار می جوید بسالوسی و زراقی

(زبورِ عجم)

۱۹۔ پیشوائیت

شیخِ شہر از رشتۂ تسبیح صد مومن بدست　　کافرانِ سادہ دل را برہمن زنار تاب

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!!

واعظ اندر مسجد و فرزند او در مدرسہ　　آں بہ پیری کودکے، ایں پیر در عہدِ شباب

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!!

(زبورِ عجم)

۲۰۔ نخلِ بے ثمر

شنیدہ ام سخنِ شاعر و فقیہہ و حکیم　　اگرچہ نخلِ بلند است برگ و بر ندہد

(زبورِ عجم)

۲۔ اشتراکیت

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل — یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل!
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است — قلبِ او مومن دماغش کافر است
غربیاں گم کردہ اند افلاک را — در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک — جز بتن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس — بر مساواتِ شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نہ در آب و گل است

(جاوید نامہ)

۱۔ رُوس کا تجربہ

ہم چناں بینی کہ در دورِ فرنگ — بندگی با خواجگی آمد بجنگ
روس را قلب و جگر گردیدہ خوں — از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں
آں نظامِ کہنہ را برہم زد است — تیز نیشے بر رگِ عالم زد است
کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ — لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الٰہ
فکرِ او در تندبادِ لا بماند — مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں — خویش را زیں تندباد آرد بروں
در مقامِ لا نیاساید حیات — سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا سازو برگِ اُمتاں — نفیِ بے اثبات مرگِ امتاں
در محبت پختہ کے گردد خلیل — تا نگردد لا سوئے اِلّا دلیل
اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن — نعرۂ لا پیشِ نمرودے بزن
ایں کہ می بینی نیرزد با دو جو — از جلالِ لا الٰہ آگاہ شو
ہر کہ اندر دستِ او شمشیرِ لا ست — جملہ موجودات را فرمانروا ست

(پس چہ باید کرد)

۲۳۔ الارض للہ

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت ؏		ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا نکتۂ از من پذیر		رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
باطن الارض للہ ظاہر است		ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست		ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست
بندۂ مومن امیں، حق مالک است		غیرِ حق ہر شے کہ بینی ہالک است

اے کہ می گوئی متاعِ ما ز ماست		مردِ ناداں ایں ہمہ ملکِ خداست
ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو		چیست شرحِ آیۂ لا تفسدوا
ابنِ آدم دل بابلیسی نہاد!		من ز ابلیسی ندیدم جز فساد
کس امانت را بکارِ خود نبرد		اے خوش آں کو ملکِ حق با حق سپرد
بردۂ چیزے کہ از آنِ تو نیست		دائم از کارے کہ شایانِ تو نیست
گر تو باشی صاحبِ شے می سزد		ور نباشی، خود بگو کے می سزد
ملکِ یزداں را بہ یزداں باز دہ		تا ز کارِ خویش بکشائی گرہ
زیرِ گردوں فقر و مسکینی چراست		آنچہ از مولاست می گوئی ز ماست
بندۂ کز آب و گل بیروں نجست		شیشۂ خود را بسنگِ خود شکست
اے کہ منزل را ہمی دانی ز رہ		قیمتِ ہر شے ز اندازِ نگہ
تا متاعِ تست گوہر گوہر است		ورنہ سنگ است از شررے کمتر است
زرعِ دیگر بیں جہاں دیگر شود		ایں زمین و آسماں دیگر شود

(جاوید نامہ)

مثالی معاشرہ

ساکنانش در سخن شیریں چو نوش		خوب رویے و نرم خوے و سادہ پوش

فکر شاں بے درد و سوزِ اکتساب — رازدانِ کیمیائے آفتاب
خدمت آمد مقصدِ علم و ہنر — کارہا را کس نمی سنجد بزر
کس ز دینار و درم آگاہ نیست — ایں بتاں را در حرمہا راہ نیست
سخت کوشش دہقاں، چراغش روشن است — از نہابِ دہ خدایاں ایمن است
کشت و کارش بے نزاعِ آبجوست — حاصلش بے شرکتِ غیرے ازوست
اندراں عالم نہ لشکر نے فنوں — نے کسے روزی خورد از کشت و خوں
نے قلم در مرقدیں گیرد فروغ — از فنِ تحریر و تشہیرِ فروغ
نے بہ بازاراں ز بیکاراں خروش — نے صداہائے گدایاں دردِ گوش

کس دریں جا سائل و محروم نیست
عبد و مولا حاکم و محکوم نیست

(جاوید نامہ)

۲۱۔ حاصل مملکتِ اسلامیہ

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتہ شرعِ مبیں ایں است و بس

(جاوید نامہ)

۲۲۔ ابلیس کی زبان سے

جانتا ہوں میں یہ امت حاملِ قرآں نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!
عصرِ حاضر کے [illegible] لیکن یہ خوف — ہو جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر [illegible] سو بار الحذر! — حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
[illegible] — نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں
ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

(ارمغان حجاز)

۲۷۔ حرف آخر

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

درِ منثور

ان موتیوں میں سے چند جو اقبال کے مکتوبات و دیگر تحریرات نثر میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔

داخلی انقلاب

زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔

(دیباچہ پیام مشرق)

نسل پرستی

تاریخ انسانیت میں اسلام کا ظہور ایسے وقت میں ہوا جب وحدت انسانیت کے لئے دنیاوی اصول مثلاً خونی رشتے اور تخت و تاج کے علائق ناکام ہو چکے تھے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک وحدت انسانیت کا اصول گوشت پوست سے متعلق نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ انسانی قلب میں ہے۔ انسانیت کے نام اسلام کا عمرانی پیغام یہی ہے کہ نسلی امتیازات مٹا دو، ورنہ خانہ جنگی میں تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ کہنا مبالغہ آمیزی نہ ہوگا کہ اسلام فطرت کے نسل ساز مظاہر کو پسند نہیں کرتا اور اپنے مخصوص اداروں سے ایسے نقطۂ نگاہ کی تخلیق کرتا ہے جو فطرت کے نسل سازی کو بیکار کر دے۔ انسانوں کے سدھارنے کے لئے اسلام نے ایک ہزار سال میں جو کر دکھایا جو عیسائیت اور بدھ مت سے دو ہزار سال سے اوپر میں بھی نہیں ہو سکا۔

(احمدیت سے متعلق۔ نہرو کے جواب میں)

[illegible]یت

اسلام کا مذہبی [illegible] نظام سے ناقابلِ شکست طریق سے وابستہ ہے، جسے اس نے تشکیل کیا ہے۔ یہاں

یہاں تک کہ ایک کا انکار دوسرے کے انکار کو مستلزم ہے۔ لہٰذا قومی خطوط پر کسی ہیئت اجتماعیہ کا قیام اسلامی اصول وحدت کا نقیض ہے۔ کوئی مسلمان اس کا تصور تک نہیں کر سکتا۔

(خطبۂ صدارت سنہ ۱۹۳۰ء)

مذہب اور سیاست

اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ قدیم زمانے میں دین قومی تھا جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی۔ نہ انفرادی ہے نہ پرائیویٹ۔ بلکہ خالصۃً انسانی ہے۔ اور اس کا مقصد، باوجود تمام فطری امتیازات کے، عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہو جس سے عالمِ انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے، جو ایک امت کی تشکیل اور اس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

(حسین احمد مدنی کے جواب میں بیان)

شریعت کا مقصود

اسلام نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود معین کرتا ہے۔ ان حدود کے معین کرنے کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط سنہ ۱۹۳۶ء)

دورِ انحطاط کے پیشوا

اقوام و ملل کے عروج و زوال کی داستانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوموں کی زندگی کی سوتیں خشک ہونا شروع ہوتی ہیں تو ان کا زوال بجائے خود ان کے شعراء، فلاسفہ، سیاسئین وغیرہم کو ایک نئی تحریکِ خیال سے ابھارتا ہے۔ چنانچہ وہ پیغمبرانہ شان سے اٹھتے ہیں اور استدلال کے گورکھ دھندے تیار کر کے حیاتِ ملی کے رذائل و ذمائم کے گیت گاتے اور انھیں خوش آئند و درخشاں بناتے ہیں۔ یہ پیغمبر غیر شعوری طور پر قنوطیت کو، رجائیت کے نگاہ فریب لباس میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اہلِ قوم کے عملی قویٰ کو شل، اور ان کی روحانی قوت نمو کو یکسر فنا کر دیتے ہیں۔

(بیان متعلقہ احمدیت)

مجوسی کلچر

جب کسی کلچر میں علامات زوال نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں تو اس کی فلسفیانہ بحثیں، اس کے تصورات اور اس کے واردات روحانی کی شکلیں جامد اور غیر متحرک ہو جاتی ہیں۔ مجوسی کلچر ایسے ہی دور سے گذر رہی تھی کہ اسلام کا ظہور ہوا۔ جہاں تک میں تاریخ کلچر کا مطالعہ کر سکا ہوں۔ اسلام نے مجوسی کلچر کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ قرآن میں بین ثبوت اس امر کے ملتے ہیں کہ قرآن کا مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دے بلکہ واردات و کیفیات روحانی کی تشکیل نو کرے۔ لیکن ہمارے مجوسی ورثہ نے اسلام کی زندگی کی سوتیں خشک کر دیں اور اس کی روح کی نشوونما اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے سلسلے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

(احمدیت سے متعلق ــــ اخبار لائٹ کے جواب میں)

اسلام پر نازک وقت

اسلام اس وقت زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

(صوفی غلام مصطفٰے تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

قرآن کی کاملیت

ایک مدت سے ہم یہ سن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادت انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں۔

(صوفی غلام مصطفٰے تبسم کے نام خط ۱۹۲۵ء)

دور حاضر کا مجدد

میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس (اصول فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا۔ وہی اسلام کا مجدد ہوگا۔ اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔

(صوفی غلام مصطفٰے تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

محاورہ عرب

ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے۔ اور قرآن کی تفسیر میں محاورہ عرب سے کامل کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معانی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان میں

ہرگز نہیں۔ (سراج الدین پال کے نام خط ۱۹۱۶ء)

ملت کی حالت

اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آ رہا ہے جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ علماء میں مداہنت آگئی ہے یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیا اسلام سے بے پروا دکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آجکل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں۔

(چودھری نیاز علی خاں کے نام خط ۱۹۳۷ء)

نازک وقت

مسلمانوں پر اس وقت (دماغی اعتبار سے) وہی زمانہ آ رہا ہے جس کی ابتدا یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی مگر چونکہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت راہنما نہیں ہے اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں۔ زعامت المسلمین کو یہ معلوم ہے کہ اصلاح لوتھر نے مسیحیت کے لئے کیا کیا نتائج پیدا کئے ہیں۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط ۱۹۲۶ء)

اضطراب

میرے دل میں ممالک اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کرلے۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط ۱۹۲۶ء)

فکر سے محرومی

قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

لیڈروں کا فقدان

اس وقت ہندوستان کے مسلمان دو امراض میں مبتلا ہیں۔ پہلا مرض ان قائدین کا فقدان ہے جو اسلام کی ز

کو بھی بخوبی سمجھتے ہوں۔ اور تاریخ جدید کے میلانات پر بھی ان کی نگاہ ہو۔ ایسے اشخاص ہی قوموں کی قوتِ متحرکہ ہوتے ہیں لیکن وہ خدا کی دین ہوتے ہیں اور ضرورت کے مطابق پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ دوسرا مرض احساسِ اجتماعیت کا فقدان ہے۔ اس سے افراد اور گروہ اپنی جداگانہ راہیں تلاش کر رہے ہیں اور عمومی فکر اور اجتماعی حرکت میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے۔ اس وقت ہم سیاست میں وہ کچھ کر رہے ہیں جو مذہب میں صدیوں سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ مذہبی تفرقہ بازی قومی وحدت کو زیادہ نقصان نہیں پہنچاتی کیونکہ مذہبی فرقے اس حد تک باغی نہیں ہو جاتے کہ اسلام سے ہی منحرف ہو جائیں۔ لیکن سیاسی انتشار بالخصوص ایسے نازک وقت میں کہ ملت کا اجتماعی مفاد اتحادِ عمل کا متقاضی ہو، مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

(خطبۂ صدارت سنہ ۱۹۳۰ء)

احترامِ آدمیت

انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔　　　(ریڈیو تقریر سنہ ۱۹۳۸ء)

وحدتِ انسانیت

قومی وحدت ہرگز قائم و دائم نہیں ہے۔ وحدت صرف ایک معتبر ہے اور وہ بنی نوعِ انسان کی وحدت ہے۔ جو نسل، زبان، رنگ اور قومیت سے بالاتر ہے۔

(خطبۂ صدارت سنہ ۱۹۳۰ء)

قومیت سے ملبند

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالکِ مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید و تخلیق ہو قابلِ احترام ہے۔

(دیباچہ پیامِ مشرق)

وطنیت

میں یورپی تصور کی وطنیت کا مخالف ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو کم تر مادی فوائد حاصل ہوں گے بلکہ اس لئے کہ اس میں منکرِ خدا مادیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں جسے میں جدید انسانیت کے لئے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں۔

(خطبۂ صدارت سنہ ۱۹۳۲ء)

لم لیگ کے لئے فیصلہ

مسلم لیگ کو آخر کار یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ بدستور سابق مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی تک محدود رہیگی یا مسلمان عوام
نمائندگی کی بھی کرے گی۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ جو سیاسی جماعت عام مسلمانوں کا درجہ بلند کرنے کی داعی نہیں وہ عوام میں کبھی
قبول نہیں ہو سکتی۔
(قائداعظم کے نام خط۔ سنہ ۱۹۳۷ء)

یگ کا مستقبل

آئین کے مطابق اعلیٰ عہدے امراء کی اولاد کے لئے وقف ہیں اور نچلے درجے کے عہدے وزیروں کے دوستوں اور رشتہ
روں کا حصہ ہیں۔ دیگر امور میں ہمارے سیاسی اداروں نے عامۃ المسلمین کا عمومی درجہ بلند کرنے کا کبھی خیال تک نہیں کیا۔ پیٹ کا مسئلہ
نا بدن لاینحل ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ وہ دو سو سال سے ذلیل سے ذلیل تر ہوتا جا رہا ہے سوال
ہے مسلمانوں کے افلاس کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے لیگ کا سارا مستقبل اس مسئلہ کے حل پر منحصر ہے۔ اگر لیگ اس مسئلہ کے حل سے
اصر رہی تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے دور رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اس کا حل اسلامی آئین کی تنفیذ میں ہے۔ طویل غور و فکر
ے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس طرز آئین کو کما حقہٗ سمجھ کر نافذ کر دیا جائے۔ تو کم از کم ہر ایک کا حق معیشت تو محفوظ ہو جاتا ہے
جودہ زمانے کے پیدا کردہ مسائل کا حل ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لئے زیادہ آسان ہے۔
(قائداعظم کے نام خط۔ سنہ ۱۹۳۷ء)

غربی سیاست

جن نام نہاد مدبرین کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی تھی۔ وہ خونریزی۔ سفاکی۔ کمزوری اور ظلم کے دیوتا ثابت ہوئے
ن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاق انسانی کے نوامیس عالیہ کی حفاظت کریں۔ انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت
ی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں۔ انہوں نے ملوکیت و استعمار کے جوش میں لاکھوں۔ کروڑوں مظلوم بندگان خدا کو ہلاک و پامال
ر ڈالا صرف اس لئے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچائے۔
(ریڈیو تقریر سنہ ۱۹۳۸ء)

اریک ترین دور

اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت۔ نیشنلزم۔ اشتراکیت۔ فسطائیت اور خدا جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے
ہیں اور ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدر حریت اور شرف انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا

کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔

(ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

قوانین الٰہیہ کی اتباع

جب تک اقوام کی خودی قانون الٰہی کی پابند نہ ہو۔ امن عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

انحطاط کا جادو

انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔

(سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

ایرانی اثرات

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کر دوں جس کی اشاعت رسول اللہ صلعم سے ہوئی۔

(منشی سراج الدین کے نام خط۔ ۱۹۱۵ء)

تصوف

تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹکل انحطاط کے زمانہ میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ جس قوم میں توانائی فنا ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین شے ہو جاتی ہے اور ترک دنیا موجب تسکین۔ اس ترک دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع للبقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔

(سراج الدین پال کے نام خط ۱۹۱۶ء)

تصوف کا وجود سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط بسنہ ۱۹۱۷ء)

جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے۔ تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔

(علامہ اسلم جیراجپوری کے نام خط بسنہ ۱۹۱۹ء)

ہندی اور ایرانی صوفیا میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفۂ وحدانیت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط بسنہ ۱۹۳۶ء)

حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت (SUBTLE) طریق تنسیخ کا ہے۔ اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعرا ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبع موجود تھا۔ اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشو و نما ہونے نہ دیا تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح ظاہر ہوا یا بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعرا نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو مذموم بیان کیا ہے۔

(سراج الدین پال کے نام خط بسنہ ۱۹۱۶ء)

ابن عربی

تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے جس نے لمعات میں فصوص الحکم محی الدین ابن عربی کی تعلیموں کو نظم کیا ہے جہاں تک مجھے علم ہے فصوص میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔

(سراج الدین پال کے نام خط سنہ ۱۹۱۶ء)

تصوف اور امامت

میں نے کئی دفعہ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ صوفی بننے کی نسبت شیعہ ہو جانا ضروری ہے۔ اگر تقلید ضروری ہے تو اولاد علی مرتضیٰ سے بڑھ کر اور کون امام ہوگا۔ البتہ امامت کے اصول میں ایک نقص ہے اور وہ یہ کہ عوام کو مجتہدین سے تعلق رہتا ہے اور قرآن سے تعلق کم ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بالکل کوئی تعلق نہیں رہتا۔ (اکبر الہ آبادی کے نام خط ۱۹۱۵ء)

خوئے غلامی

جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو وہ ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے جس کا مقصد قوت نفس اور روح انسانی کا ترفع ہو۔ (مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط ۱۹۳۶ء)

قرآن کا مسلک

اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط ۱۹۳۲ء)

شاعری

میرے زیر نظر حقائق اخلاقی و ملی ہیں۔ زبان میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ فن شعر سے بھی بحیثیت فن کے نابلد ہوں۔ (پروفیسر شجاع کے نام خط ۱۹۳۱ء)

شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط ۱۹۱۹ء)

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے میرا کوئی رقیب نہیں۔ اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں۔ جن کے بیان کے لئے ملک کے حالات اور روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ ؎

نہ بینی خیر ازاں مرد فرودست   کہ برمن تہمت شعر و سخن بست

(سید سلیمان ندوی کے نام خط ۱۹۳۷ء)

روزہ کے احکام

چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب آ رہا ہے اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی رُو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کر دیئے جائیں۔ یہ احکام سورۂ بقرہ میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں۔

(۱) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

(۱) اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پہلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کر دیا گیا ہے تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر سکو۔

(۲) أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ

(۲) یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں۔

(۳) فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ

(۳) پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کرلے۔

(۴) وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ

(۴) اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں ان کے لئے روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے۔

(۵) فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔

(۵) اس کے بعد بھی اگر کوئی اپنی خوشی سے زیادہ کرے تو مزید اجر کا موجب ہوگا۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے۔

(۶) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ.....

(۶) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے.......

(۷) فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ....

(۷) لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں سے گنتی پوری کرلے........

(۲ / ۱۸۳-۱۸۵)

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ

(۱) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا نو دن کے نہیں) پورے مہینے کے۔

(۲) روزے اسکے لئے ہیں کہ جو اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کرلے۔

(۳) اب ایک شکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہو اور نہ مسافر ہے لیکن کسی وجہ سے اسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے اور مریض بھی نہیں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے ظاہر ہے کہ اس سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کرے۔ ایسے لوگوں کا حکم نمبر ۳ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں انھیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں وہ روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلادیں۔

غور فرمایئے اوپر کی تینوں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہوگئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے "وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ" کا ترجمہ ــــ "وہ لوگ جو بدشواری روزہ رکھ سکیں" کیا ہے۔ حالانکہ اس کا عام ترجمہ ــــ "اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں!" ــــ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اسلئے کہ اس ترجمہ کی رُو سے مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزے رکھا کریں۔ حالانکہ قرآن کا منشا یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ "طاقت" کا جو مفہوم ہمارے ہاں اردو میں رائج ہے وہ اس مفہوم سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ ہمارے مترجمین نے عربی کے لفظ "طاقت" کا ترجمہ اردو کے لفظ طاقت سے کر دیا اور دونوں زبانوں کے مفہوم میں جو فرق تھا اسے نظر انداز کر گئے۔ عربی زبان میں اس لفظ کا کیا مفہوم ہوتا ہے اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھیے۔ محیط المحیط جلد دوم ص ۱۳۰۴ میں ہے۔

طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں۔ لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں جسے انسان بہ مشقت کرسکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہو۔ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجا لانا ہمیں دشوار ہو۔

ی طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب ص ۱۰۳ ج ۱۲ میں ہے کہ

طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بہ مشقت کرنا ممکن ہو۔

رہ اپنی تفسیر المنار ص ۱۵۵ ج ۲ پر فرماتے ہیں کہ

اَلطَّاقَةُ دراصل مُکْنَتٌ اور قُدْرَتٌ کے بالکل ادنٰے درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب أَطَاقَ الشَّيْءَ اس وقت کہتے ہیں جب اسکی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو یعنی بدشواری اسے برداشت کرسکتا ہو چنانچہ يُطِيْقُوْنَهٗ سے مراد بوڑھے ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہوجانے کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اور وہ لوگ ہیں جو ان ہی کی طرح معذور ہوں۔ یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے ہمیشہ پر مشقت کاموں میں رکھدی ہے..... اسی بنا پر امام راغب نے لکھا

ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بہ مشقت ممکن ہو۔

اسی کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں لکھا ہے کہ:

> طاقتؔ کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بہ تکلیف یا بہ مشقت کیا جاسکے اور "وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ" سے مراد بڈھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر یہ آیت ثابت ہے منسوخ نہیں ہے
>
> (تفسیر کشاف صـ۲۵۵ ج ۱)

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ

> عربی زبان میں "اَلْوُسْعُ" کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور "طَاقَةٌ" کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا آیۂ زیر نظر کے معنی یہ ہوں گے "اور ان لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں۔ ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے۔۔۔۔۔۔۔
>
> (روح المعانی صـ۵۹ ج ۲)

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ "طَاقَةٌ" کا مفہوم کیا ہے۔ اور اس بنا پر "وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ" کا ترجمہ ـــــ "اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں" ـــــ کر دینا کس قدر غلط فہمیوں کا موجب ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کا ترجمہ ـــــ "اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں" ـــــ کیا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں، قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اسے امت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کرلے۔ چنانچہ "عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ" میں بھی یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جاچکی ہیں اور ان پر اب بھی غور کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی کی کتاب جامع احکام القرآن (صـ۲۶۸-۲۶۹ ج ۲) میں ہے کہ

> تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں ان کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمہ کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں۔ البتہ امام مالکؒ نے اتنا کہا ہے کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں تو یہ میرے نزدیک پسندیدہ ہے اور حضرت انسؓ۔ ابن عباسؓ۔ قیس بن السائبؓ اور ابوہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمہ فدیہ ہے۔ امام شافعیؒ اور اصحاب الرائے (حنفیہ) امام احمدؒ اور امام اسحٰقؒ کا قول بھی یہی ہے۔ نیز ابن عباسؓ کی ایک روایت ہے کہ انہوں نے اپنی ام ولد سے فرمایا جو

حاملہ تھی یا بچہ کو دودھ پلا رہی تھی کہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں لہٰذا تیرے ذمہ فدیہ ہے قضا نہیں ہے۔

مفتی سید محمد رشید رضا نے اس فہرست میں اور بھی اضافہ فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

اَلَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ سے یہاں مراد بوڑھے۔ ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی انہی کے زمرہ میں شمار ہوں گے جو مزدور پیشہ ہوں جن کی معاش خدا نے پر مشقت کاموں میں رکھدی ہے۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے۔ اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لئے جاتے ہوں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو........ تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جس کے دور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو روزہ رکھنا گراں گذرتا ہو جیسے بڑھاپا۔ اور پیدائشی کمزوری۔ اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت۔ اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقت کا سبب ہوتا رہتا ہو۔ جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت۔ ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔

(تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵-۱۵۷ ج ۲)

ان تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتب ہو جاتی ہے۔

(۱) بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت

(۲) حاملہ عورتیں

(۳) دودھ پلانے والی عورتیں۔

(۴) اپاہج اور معذور لوگ

(۵) پرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔

(۶) ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی طور پر (Constitutionally) کمزور ہی پیدا ہوئے ہوں۔

(۷) وہ مزدوری پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پُر مشقت کاموں میں ہوتی ہے۔ مثلاً کانوں میں کام کرنے والے اور کارخانوں میں کام کرنے والے۔ یا رکشہ چلانے والے۔

(۸) وہ مجرم جن سے جیل خانوں میں مشقت کے کام لئے جاتے ہوں۔

یہ فہرست جامع اور مانع نہیں۔ بہ حالاتِ موجودہ اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اصول یہ کہ جو شخص بہ مشقت روزہ رکھ سکے وہ روزہ نہ رکھے۔

آپ غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کے معاملہ میں انسان کی طبعی حالت کی کس قدر رعایت رکھی تھی۔ لیکن ہمارے ۓ کرام نے اس رعایت کو منسوخ کر کے کس قدر دشواریاں پیدا کر دی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو بہ مشقت روزہ سکتے تھے وہ یا تو روزے رکھ رکھ کر ایسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جو بعض ان کی جان تک لے لیتی ہیں۔ یا روزے نہ ر چوروں کی طرح چھپے چھپے پھرتے ہیں۔ یا علانیہ خدا اور اس کے دین کے خلاف بغاوت پہ اتر آتے ہیں۔ یہ ہے فرق خدا طرف سے عطا کردہ دین اور ملا کے خود ساختہ مذہب میں۔ اس کے متعلق ہم تفصیل سے طلوع اسلام کی اکتوبر ۵۲ء - اشاعت میں لکھ چکے ہیں (اس مضمون کو بعد میں ادارہ کی طرف سے شائع شدہ کتاب "مزاج شناس رسول" میں مل کر دیا گیا تھا) جو حضرات اس تفصیل کو دیکھنا چاہیں وہ وہاں دیکھ لیں۔

بہرحال یہ ہیں روزوں کے متعلق مختصر الفاظ میں قرآن کے احکام۔ ان آیات کو آپ خود بھی قرآن کریم میں دیکھ ما (یعنی سورۂ بقرہ۔ آیات ۲/۱۸۳ تا ۲/۱۸۵) ہم نے اس مقام پر صرف احکام کی وضاحت کی ہے۔ روزوں کی حکمت ے بحث نہیں کی کیونکہ وہ الگ موضوع ہے۔

نوٹ فرما لیجئے

دفتر طلوع اسلام کا پتہ

خط و کتابت کیلئے

۳/۱۵۹۔ ایل۔ (پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی ۲۹

دفتر آنیوالے حضرات کے لئے

جمشید روڈ سے جیل کے سامنے پہنچکر دائیں طرف جیل کی دیوار کے ساتھ ساتھ اسلام آباد کے چوک میں آنا چاہیئے۔ و" طلوع اسلام کا بورڈ لگا ہوا ہے جو دفتر کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ کراچی صدر سے اسلام آباد چوک کے لئے بس نمبر ۔ ۲۴ کے ۲۶ اور ۲۴ نمبر کے سے سفر کیجئے۔ اور اگر جمشید روڈ پر (جیل کے سامنے) اترنا چاہیں تو اسکے لئے اور بہت سی بسیں مل جائیں

اگر کوئی دقت ہو تو ۴۱۴۵۵ پر ٹیلیفون کیجئے۔

طلوعِ اسلام اور دیگر مطبوعات کی

پوسٹنگ کی تاریخیں

ہر ماہ کی ۳ — ۱۰ — ۲۰ — ۳۰ ہیں۔ طلوعِ اسلام عام طور پر ۳ تاریخ کو پوسٹ کر دیا جاتا ہے۔ طلوعِ اسلام یا اس کا لٹریچر طلب کرنے والے حضرات آرڈر بھیجنے یا شکایتی خطوط لکھنے کے بعد بے تابانہ طور پر پرچہ اور کتابوں کا انتظار شروع کر دیتے ہیں۔ ان کو ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ پرچہ اور کتابیں ان تاریخوں ہی میں بھیجی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا اپنا آرڈر یا شکایت تحریر کرنے کے بعد ان تاریخوں کو ذہن میں رکھیئے اور خواہ مخواہ ادارہ پر ناراض نہ ہوجیے۔

ہماری مجبوریاں

"برقِ طور" اور "طاہرہ کے نام" ہر دو کتابوں کی کاپیاں دو ماہ سے پریس میں ہیں۔ خدا خدا کرکے "برقِ طور" چھپ گئی ہے اور اب وہ جلد ساز کے ہاں ہے۔ مگر "طاہرہ کے نام" اب تک نہیں چھپ سکی۔ توقع ہے کہ اپریل کے مہینہ میں اس کی دونوں جلدیں چھپ کر تیار ہو جائیں گی۔ بہر حال احباب کو ان کتابوں کے لئے کافی عرصہ تک زحمتِ کشِ انتظار رہنا پڑا اس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام

قانونِ شریعت

علامہ اقبالؒ کے چھٹے لیکچر کا آزاد ترجمہ (مع تشریحی نوٹس اور تعارفی شذرات) جو اس اشاعت میں شامل ہے پمفلٹ کی صورت میں علیحدہ بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ مقالہ نہایت اہم ہے اور اس کی عام تقسیم و اشاعت بڑی ضروری ہے۔ اس کی ضخامت (۳۲ صفحات) کے پیشِ نظر اسے محدود تعداد میں شائع کیا جا رہا ہے۔ خواہشمند حضرات جلد طلب فرمائیں۔

قیمت فی کاپی ۸ر

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ کراچی

قرآنی انقلاب کا صحیح تصور

اِن کتابوں سے پیدا ہو سکے گا

عراج انسانیت — حضور صلعم کی ذات اقدس و اعظم شرف و مجد انسانیت کے کس بلند مقام پر فائز تھی۔ اسے قرآن کے آئینہ میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ سیرت مقدسہ کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ بڑے سائز کے نو سو صفحات۔ اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ مضبوط و حسین جلد۔ قیمت بیس روپے

بلیس و آدم — سب سے پہلا انسان کس طرح پیدا ہوا تھا؟ جنات ملائکہ۔ وحی۔ شیطان اور ابلیس جیسے اہم مباحث کے لئے سلسلہ معارف القرآن کی اس پہلی کڑی کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ بڑا سائز ۳۷۶ صفحات۔ مجلد قیمت آٹھ روپے۔

جوئے نور — کاروانِ نبوت کے درخشندہ ستاروں یعنی حضرات انبیائے کرام از حضرت نوحؑ تا حضرت شعیبؑ کے تذکار جلیلہ پر تفصیلی کتاب سلسلہ معارف القرآن کی دوسری کڑی۔ سائز ۲۹×۲۲/۸ ۳۶۸ صفحات قیمت مجلد چھ روپے

نسان نے کیا سوچا؟ — زندگی کے اہم مسائل کے حل کے لئے انسانی فکر نے کیا کیا کوششیں کیں اور اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ بیش بہا معلومات کا ذخیرہ۔ سائز ۲۹×۲۲/۸ ۳۶۸ صفحات۔ قیمت دس روپے

سلیم کے نام خطوط — مذہب کے متعلق نوجوان تعلیمیافتہ طبقہ کے دل میں جو شکوک و شبہات اور اعتراضات پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت شگفتہ اور شاداب جواب۔ بڑا سائز ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چھ روپے

فردوس گم گشتہ — ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیمیافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا ہے اور فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ اردو لٹریچر کی بلند پایہ کتاب بڑا سائز ۴۱۶ صفحات۔ قیمت چھ روپے

نظام ربوبیت — نوع انسانی کا سب سے اہم اور مشکل سوال اس کا معاشی مسئلہ ہے۔ اس مسئلہ کا حل عقل انسانی نے کیا کہا اور قرآن اس کا حل کیا بتاتا ہے۔ دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب۔ بڑا سائز ضخامت ۳۰۰ صفحات
قیمت قسم اول مجلد چھ روپے۔ قسم دوم غیر مجلد چار روپے۔

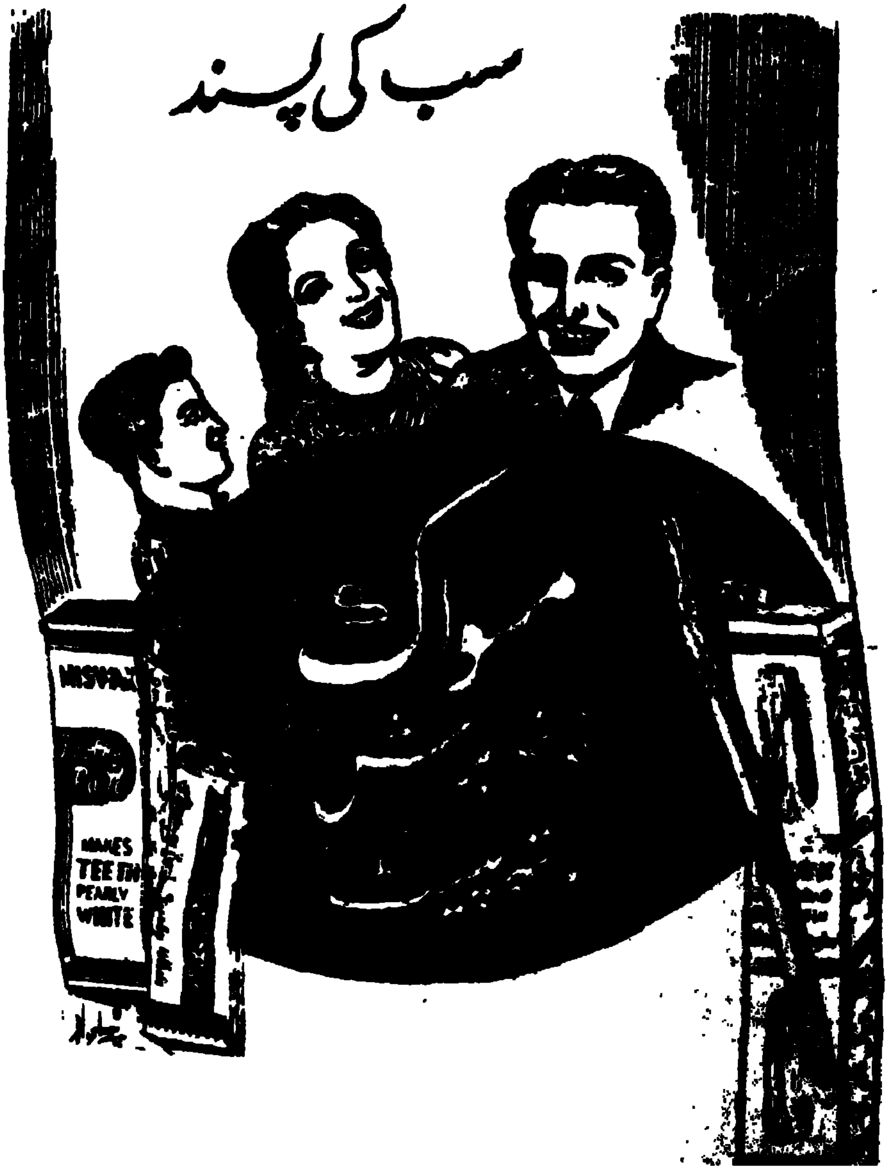
اسباب زوال امت — (دوسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہماری نکبت و زوال کے اسباب کیا ہیں اور ان کا علاج کیا۔ ۱۷۲ صفحات۔ قیمت دو روپے

(یہ تمام کتابیں محترم پرویز صاحب کے تدبر فی القرآن کا نتیجہ ہیں)

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۱۵۹/۳-ایل (پی۔ای۔سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی نمبر ۲۹


تازہ پھلوں سے تیار کردہ
عبدالحنان
کے
خوش ذائقہ
فرحت بخش
مشروبات
جام
جیلی
چٹنی
مربہ جات
وغیرہ
اے۔ایچ۔فوڈ انڈسٹریز کراچی
فون۔ ۳۴۹۱۲
ANP-9/57


DURA-GLOSS
Nail Polish
MADE IN U.S.A.
دوراجلوس
ناخون کی پالش
تزئینِ حسن کے لئے
ناخون کی آرائش ضروری ہے
دوراجلوس
خوش رنگ۔ دیدہ زیب۔ چمکدار۔ اور
پائیدار پالش ہے
ہر بڑے دوکاندار سے ملتی ہے


سب کی پسند
MAKES
TEETH
PEARLY
WHITE


چھوٹا مسواک ٹوتھ برش
دانتوں کی صفائی بچوں کو صحت مند اور توانا رکھتی ہے
چھوٹا مسواک
چھوٹے بچوں کے لئے چھوٹا مسواک
ایک تحفہ ہے
جو نرم نازک مسوڑھوں کے لئے بے ضرر ہے اور


اس نشان کا
مطلب
کوالٹی